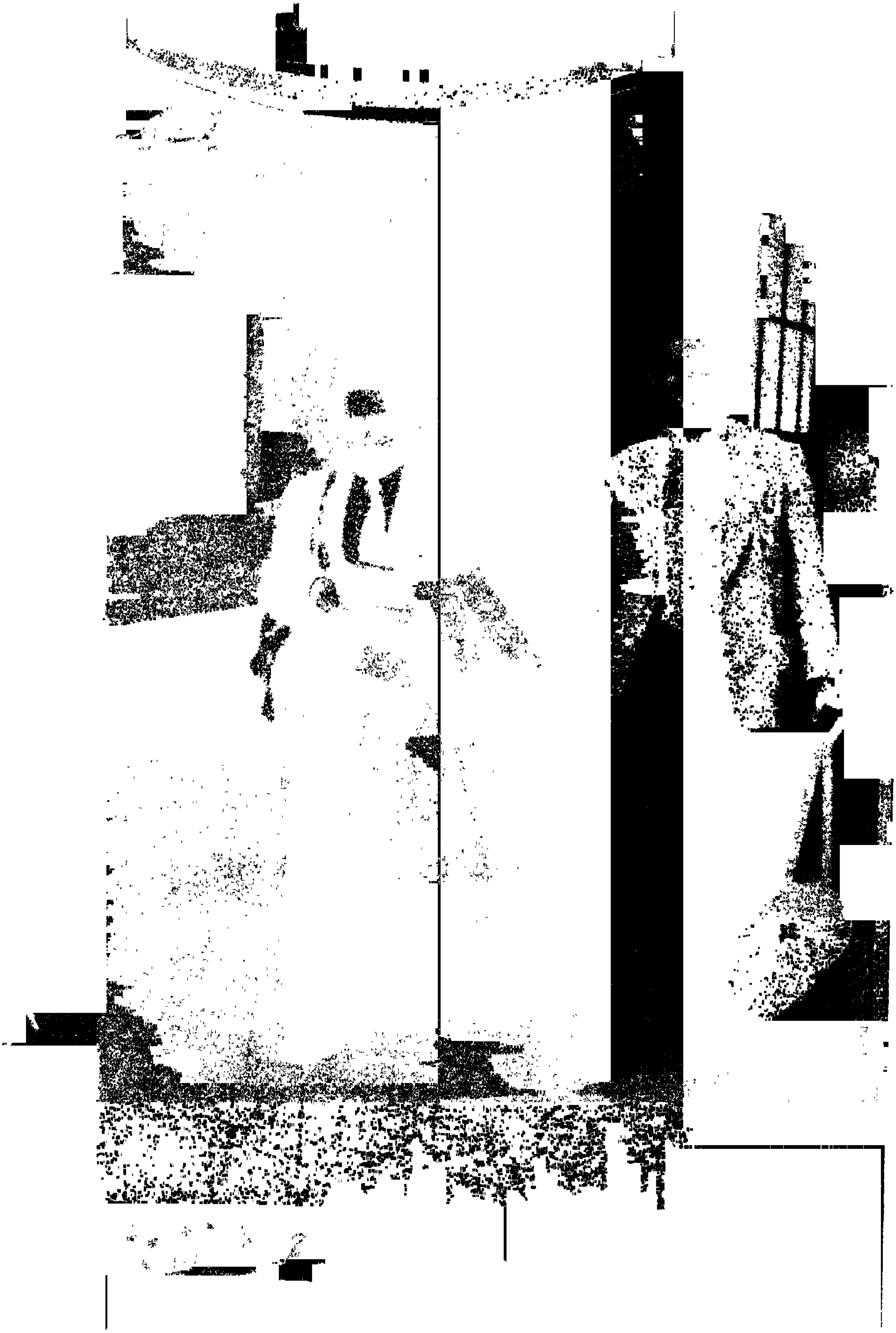


بیادِ حمید نظامی

ہمیشہ تذکرہ کرتے ہیں سب پیر و جواں اس کا ، قلم تھا جرأت اظہار میں شعلہ فشاں اس کا

بہ اسلوبِ نگارش لالہ و گُل مسکراتے تھے کوئی ہمسر نہ پیدا کر سکی اُردو زباں اس کا

بلا کی سادگی اس میں غضب کی دلکشی اس میں ڈھلا تھا کہکشاں کے رُوپ میں طرزِ بیاں اس کا

ہر اک افتاد سے لڑتا رہا سینہ سپر ہو کر رہے گا ملک کی تاریخ میں نام و نشاں اس کا

ہمیشہ سرخرو اُٹھا، ہمیشہ کامراں نکلا شدائد نے لیا ہر معرکہ میں امتحاں اس کا

اسی باعث تو اربابِ سیاست اس سے ڈرتے تھے خدا کے خوف سے لبریز تھا قلبِ طپاں اس کا

وہ رخصت ہو گیا تو اک خلا محسوس ہوتا ہے کوئی ملتا نہیں اب اس چمن میں ترجماں اس کا

نوائے وقت کو لہجہ کی تابانی مبارک ہو ہمیشہ درپئے آزار ہے دورِ زماں اس کا

مجھے اپنے قلم کی جرأتوں پر ناز ہے شورش

مگر اہلِ صحافت میں کوئی ثانی کہاں اس کا

شورش کاشمیری

چٹان
ایڈیٹر
شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ـــــ شمارہ ۹
۳ مارچ ۱۹۷۵ء
قیمت ـــــ ایک روپیہ

شہنشاہِ ایران کی آمد

اعلیٰحضرت شہنشاہ ایران ۲۵ فروری کو پاکستان میں وزیراعظم کے ہاں لاڑکانہ میں تشریف لائے اور دونوں رہنماؤں نے علاقائی مسائل اور بین الاقوامی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ بات چیت انتہائی دوستانہ ماحول میں نہایت خوشگوار رہی۔ پہلے دن دو گھنٹے گفتگو رہی۔ ۲۶ فروری کو پھر گفتگو ہوگی۔ شہنشاہ تین دن کے لیے آئے ہیں۔ یہ چیز واضح اور صاف ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین باہمی اخلاص اور دوستانہ مراسم شروع دن سے چلے آرہے ہیں۔ گفتگو کا متعین موضوع تو اختتامِ مذاکرات ہی پر معلوم ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس شکل میں کہ اس سلسلہ میں سرکاری کمیونک شائع ہو اور اس کے مندرجات و بین السطور سے معلوم ہو۔ اُدھر یہ حقیقت ہے کہ دنیا اس وقت ایک عجیب بحرانی کشمکش کا شکار ہے اور عالمی سیاست کے خطوط مدون و مرتب ہونے کے باوجود متغیر و منقلب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں محض ذہنی خواہشوں کے مطابق نہیں سوچنا چاہیے اور نہ قیاسات کا سہارا لینا چاہیے جب یہ چیز آشکار ہے کہ ایران و پاکستان میں دوستانہ اخلاص مثالی ہے تو نتائج اس کے مطابق ہوں گے ـــــ مقامی اخبارات میں بی بی سی کے حوالے سے جو تبصراتی خبر چھپی ہے اس کے مطابق ایک بات سرمایہ کاری کی ہے کہ ایران پاکستان کی صنعتوں میں [illegible] روپیہ لگا سکے۔ [illegible] ایک بہت اچھی چیز ہے۔ ایران اپنے تیل کی بہتات [illegible] ہے اور اس قسم کی سرمایہ کاری پاکستان [illegible] کے لیے سودمند

باقی صفحہ [illegible] پر

ہندوستان کے سیاسی دماغ

ہندوستان کے سیاسی دماغ آخر اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ پاکستان سے اُن کی ذہنی آویزش جسمانی آویزش سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیا تاریخ نے ہمیں کوئی سبق نہیں دیا؟ جب برعظیم کے ہندو مسلم مسئلہ کا حل خود کانگرس نے پاکستان اور ہندوستان کی شکل میں منظور کیا اور بھارت کے سب سے بڑے راہنما مہاتما گاندھی نے صاد کیا تو اس کے بعد پاکستان سے کٹا چھنی کے معنی کیا ہیں؟ ہندوستان نے کشمیر پر جس طرح قبضہ کیا اُس کا عسکری طاقت کے سوا اور کوئی جواز نہیں۔ ہم واقعات کی لمبی چوڑی روداد کو دہرانا نہیں چاہتے۔ کشمیر جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کا جزو ہے۔ جس دو قومی نظریہ کو انڈین نیشنل کانگرس نے تسلیم کیا اُس کے مطابق بھی کشمیر پاکستان ہی کا حصہ ہے۔ لیکن ہندوستان ان دونوں بنیادوں سے منحرف ہو گیا۔ حتیٰ کہ اُس نے یو این او کی قرارداد کا احترام بھی نہ کیا۔ ہندوستان اس مسئلہ میں مخلص ہوتا تو وہ رائے شماری کرا دیتا۔ کشمیری عوام جس کو ووٹ دیتے وہ قطعی فیصلہ ہوتا لیکن ہندوستان کے نگرانوں نے اس سے بھی انحراف کیا۔ ہم ایک پاکستانی کی حیثیت سے محض پاکستان کا نقطۂ نگاہ پیش نہیں کر رہے۔ چونکہ ہم عالمی سیاست کے مضمرات کو محسوس کرتے اور ہندوستان و پاکستان کی دوستی کے متمنی ہیں، اس لیے اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ہندوستان سے [illegible] خوشگوار رہے کہ وہ غلطیوں پہ غلطیاں کر رہا ہے اور اس مسئلہ میں اس کے سیاسی تجربے کتنا پائیدار ہیں۔ کیا معاہدہ شملہ کا تقاضہ یہ ہے کہ

باقی صفحہ [illegible] پر

قادیانی بدزبانی

جب سے نیشنل اسمبلی نے قادیانی اُمت کو مسلمانوں کے متفقہ مطالبہ کی بنا پر اقلیت قرار دیا ہے، ہم نے مرزا غلام احمد، ان کے فرزندانِ ارجمند، ان کی اولاد اور ان کے پیرؤوں سے متعلق اپنے احتساب کا لب و لہجہ بدل دیا ہے۔ قادیانی گواہ ہیں کہ ہم نے اس سے پہلے بھی مرزائی اُمت سے متعلق کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جو گندہ دہنی کا شاہکار ہو یا ان کی پس پردہ آبرو کے متعلق گالی ہو۔ چٹان کے صفحات گواہ ہیں کہ ہم نے آج تک ان کے کسی اخبار کو درخور نہیں لکھا۔ بالخصوص وہ ہفتہ وار یا ماہنامے جو الفضل ربوہ کے [illegible] یا خلیفہ ربوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً لاہور ہی سے ایک قادیانی چیتھڑا نکلتا ہے۔ وہ ستمبر سے پہلے بھی بدزبانی کی انتہا پر تھا اور اس کے بعد بھی اسی طرح تعفن میں بگٹٹ ہے۔ اس کا شعار ہو چکا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ایڈیٹر چٹان کے خلاف سب و شتم اگلتا رہے۔ اس کا یہ حوصلہ اس لیے "قابلِ داد" ہے کہ اقلیتی امت کا فرد ہونے کے باوجود ہذیان بکنے میں بے جھجک ہے۔ ہمارا خیال تھا حکومتِ پنجاب اس کو متنبہ کرے گی کہ اپنی لوچ زبان کے استعمال سے حالات کی خرابی کا باعث نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے شاید کوئی لگام نہیں، ہم اس کا پس منظر جانتے ہیں لیکن فی الحال اس سلسلہ میں چپ ہی بھلی ہے۔ البتہ حکومتِ پنجاب سے یہ ضرور عرض کریں گے کہ وہ کب تک خاموشی سے کام لے گی۔ کیا یہ خاموشی اس لیے ہے کہ اس کے سب و شتم

باقی صفحہ [illegible] پر

طلبا [illegible] حق

بدھ مال روڈ سے

پنجاب یونیورسٹی [illegible] کے صدر مسٹر [illegible] پراچہ جنرل سیکرٹری مسٹر عبد الشکور اور دیگر طلبہ کی گرفتاری خود دیکھی [illegible] ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے کہ پولیس نے [illegible] اور ریسٹوران میں گھس کر انہیں گرفتار کیا ہے۔ اگر ان طلبہ کو گرفتار کرنا تھا تو ان کی قیام گاہ سے بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اگر پولیس کو وہاں نہیں مل رہے تھے تو ان کی نگرانی کر کے انہیں حراست میں لیا جا سکتا تھا۔ ان کے خلاف کوئی ایسا مقدمہ بھی نہیں تھا کہ فی الفور گرفتاری نہ ہونے سے لا اینڈ آرڈر کی رسوائی و پسپائی ہوتی اور نظم و نسق جاں بلب ہو جاتا۔ اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں وائس چانسلر کی رپورٹ پر پکڑا گیا ہے۔ وائس چانسلر کی شکایت پر ہم اسی شمارہ کے ایک دوسرے مضمون میں اظہار خیال کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے اس طرح گرفتار کر کے کسی ہوشمندی یا ذہانت کا ثبوت نہیں دیا بلکہ خود ایک مظاہرہ پیدا کیا۔ پہلے پولیس کے ٹرک لا کر کھڑے کئے گئے پھر افسروں کا لاؤ لشکر جمع ہو گیا اور طلبہ کو گرفتار کر لیا گویا طلبہ کسی بڑے جرم کے مرتکب ہوتے اور ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ پولیس کو اطلاع ملی اور اس نے ریسٹوران کو گھیرے میں لے کر کامیاب چھاپہ "مارا"۔ پولیس کی ان حرکات ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام برانگیختہ ہوتے اور مظاہروں کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ان طلبہ کو گرفتار کیا گیا تو پریس کانفرنس میں موجود طلبہ نے اپنے نوجوان ساتھیوں کی گرفتاری پر احتجاجی نعرے بلند کئے۔ جو ایک فطری ردعمل تھا۔ اس نعرہ زنی یا احتجاج پر پولیس نے آنسو گیس شروع کر دی اور فضا میں ایک منفی تاثر پیدا ہو گیا۔ [illegible] کے نام پر [illegible] کرنے میں حق بجانب نہیں [illegible] حکومت کے خلاف منفی تاثرات پیدا کرنے میں پولیس خود پیش پیش ہے۔ "حکومت کی غلطیوں [illegible]

باقی صفحہ [illegible] پر

پیپلز پارٹی سے استدعا

ملک کے جو حالات ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہم نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ ان کالموں میں ان حالات کا تجزیہ کیا اور اپنی گذارشات پیش کی ہیں۔ چونکہ ہم پیپلز پارٹی پر اجارہ کا حق نہیں رکھتے اس لیے کوئی مشورہ دیتے ہوئے ہمیں بسا اوقات اپنے الفاظ کے ضیاع ہی کا اندیشہ رہتا ہے۔

پنجاب اور سندھ دو صوبے پیپلز پارٹی نے انتخابی معرکہ میں حاصل کئے۔ سرحد اور بلوچستان سیاسی طاقت سے گویا اس وقت چاروں صوبے پیپلز پارٹی کے احاطہ اقتدار میں ہیں۔ اور یہ بھی ایک واشگاف حقیقت ہے کہ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اسی کے اقتدار میں ہیں۔ ملک کے ۹۰ فیصد اخبارات نیشنل پریس ٹرسٹ کے باعث اس کے خانہ زاد ہیں۔ باقی اخبارات بھی اس کے خلاف نہیں۔ بعض غلطیوں یا کوتاہیوں پر ٹوکنا ہر تعمیری ذہن کا خاصہ ہے

شیر پاؤ کا قتل ایک دردناک سانحہ تھا، اس کے بعد ملک بھر میں تعزیری اقدامات کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ادھر نیشنل عوامی پارٹی کالعدم قرار دی گئی ادھر طلبہ سے اسلحہ برآمد کیا جانے لگا۔ اس سے پہلے جلسوں میں دھما چوکڑی ہوتی اور معاملہ کہیں سے کہیں نکل جاتا ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کے ارکان یہ کیوں محسوس

باقی صفحہ ۳۳ پر

بیادِ ابو الکلام

عنوان بالا کے تحت پچھلے شمارہ میں ایڈیٹر چٹان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ اس کے آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع تھا ؎

قلب و نگہ کا سرِّ نہاں تھا ابو الکلام

سہو کتابت سے "نگہ" کی جگہ "نگاہ" چھپ گیا۔ قارئین صحیح فرما لیں۔ ادارہ

صحیح یا غلط؟

الفضل ربوہ نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۵ء میں آخری صفحہ پر خبر دی ہے کہ مرزا ناصر احمد کی تحریک و خواہش پر ربوہ میں مرزا ابو الفضل سپرنٹنڈنٹ پولیس جھنگ نے سہ روزہ گھڑ دوڑ ٹورنامنٹ کا افتتاح کیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے گذشتہ سے پیوستہ سال مرزا ناصر احمد کی اس تحریک کے مضمرات پر تفصیلی اداریہ لکھا اور حکومت کو آگاہ کیا تھا کہ مرزا صاحب اس عنوان سے کس ذہن کے تحت کیا تیاری کر رہے ہیں؟ اب ہم اس چیز کو دہرانا نہیں چاہتے لیکن ہمارے لیے یہ چیز انتہائی حیرت کا باعث ہوئی کہ جھنگ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اس ٹورنامنٹ کا افتتاح کیا؟ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس قادیانی ہیں تو ہمیں اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ انہوں نے اپنے امام و آقا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ مگر ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے وہ اس کے مجاز نہیں تھے اور اگر وہ مسلمان ہیں تو ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ انہیں قادیانی امت سے متعلق مسلمانوں کے جذبات کا علم نہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ اس جماعت کے عقائد باطلہ کیا ہیں؟ اور مرزا ناصر احمد نے گھڑ دوڑ کا ناٹک کس غرض سے رچایا ہے؟ مرزا صاحب عز بار کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انتظامیہ میں انہیں رسوخ حاصل ہے اور مسلمان اب بھی ان کی پذیرائی کرتے ہیں؟ اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے منیر انکوائری رپورٹ پڑھی ہوتی تو وہ لازماً اس کا حوصلہ نہ کرتے؟ انہوں نے قادیانی ٹورنامنٹ کا افتتاح کر کے ذہنی طور پر ایک غلط اقدام کیا ___ پچھلے دنوں مسٹر غالب احمد چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بورڈ نے ربوہ کے قادیانی کالج میں خطبہ اسناد پڑھا تو ہم نے اس کا نوٹس نہ لیا کیونکہ وہ کٹر قادیانی ہیں اور اپنے عقیدے کو چھپاتے نہیں۔ انہیں اپنے آقاؤں کے کالج کو عزت بخشنے کا حق حاصل ہے مگر پولیس کے ایک سپرنٹنڈنٹ سے ہم یہ توقع نہیں کرتے خواہ وہ قادیانی ہی ہوں کیونکہ اس کی ڈیوٹی مختلف ہے اور مسلمان ہوں تو

باقی صفحہ [illegible] پر

کیا باچا خان کا دل کالا ہے؟

خان عبدالقیوم خان کی لن ترانیاں

خان عبدالقیوم خان پچھلے ہفتے دو چار روز لاہور میں مقیم رہے۔ آپ نے مختلف مکانوں میں اپنے نام نہاد کارکنوں کو خطاب کیا۔ اخباروں کا مسئلہ تو بالکل واضح ہے۔ کہ ان کی مسلوب آزادی دورانِ بالتر یری جاگیر ہو چکی ہے۔ جس رنگ میں جس خیال کی ضرورت ہو وہ حسب منشا دلو یا اشاعت سے مزین ہو سکتا ہے۔ خان صاحب کی تقریریں اور تصویریں جس ڈھنگ سے چھپتی رہی ہیں۔ وہ محض صحافت کا شعبدہ تھا ورنہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ ایک "جلسہ" تو ہم نے بھی دیکھا ہے خان صاحب شاہ ابو المعالیؒ کے مزار کی مسجد میں تشریف لائے۔ اور وہاں اپنی خانہ ساز لیگ کے مبینہ کارکنوں کو اپنے خیالات عالیہ سے شاد کام فرمایا۔ شاہ ابو المعالی کے مزار اور مسجد کی تاریخ میں کئی صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ایک سیاسی لیڈر نے اس میں نزول اجلال فرمایا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاہ ابو المعالی کی مسجد نہایت مختصر اور محدود ہے۔ اگر کھینچا تانی کر کے لوگ بیٹھنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک سو آدمی سما سکتے ہیں۔ خان صاحب کی تشریف آوری پر اس مسجد کا نصف خالی تھا اور نصف میں پچاس فیصد سی آئی ڈی کے اہلکار تھے باقی ان کے ٹرک سوار عقیدت مند تھے جو ہر تقریب میں ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

خان صاحب واحد لیڈر ہیں جو اپنے ساتھ سیکورٹی پولیس کے دو ٹرک لے کر چلتے اور جس موٹر میں سوار ہوتے ہیں اس میں ان کے یمین و یسار دو تین مسلح باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ ان دو ٹرکوں کے علاوہ ایک ٹرک خان صاحب کی خانہ ساز لیگ کے ان رضاکاروں کا ہوتا ہے جنہیں خان صاحب کے گرد و پیش رہ کر ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے۔

لاہور کی ایک ایسی ہی تقریب کو خان صاحب نے خطاب کرتے ہوئے پہلی دفعہ بتایا کہ قائد اعظم نے اپنے جس دورۂ پشاور میں خان عبدالغفار خان کے ساتھ ملاقات کی تھی اس کے بعد مجھے کہا تھا کہ خان غفار خان کا دل کالا ہے پھر مجھے مشورہ دیا کہ اول تو میں انہیں اہمیت نہ دوں اور اشتعال دلاؤں اگر وہ پھر بھی سر اٹھائیں تو انہیں کاری ضرب لگائی جائے چنانچہ ہم اسی دن سے قائد اعظم کے اس مشورے پر مکمل طور پر عمل کرتے چلے آئے ہیں۔

خان قیوم نے مزید فرمایا کہ پاکستان بن گیا تو کنگھم پارک میں پاکستان کے قومی پرچم کو سلامی دینے کے لیے سرحد کے ان کانگریسی لیڈروں کو مدعو کیا گیا لیکن انہوں نے سلامی دینے سے انکار کر دیا۔

(روزنامہ صداقت بتاریخ ۱۰ فروری صفحہ اول و آخر)

اس کا ایک جواب تو قرآن پاک میں ہے کہ لعنت اللہ علی الکاذبین اور یہی جواب ایک صادق القول اور صادق العہد مسلمان کو زیب دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس ملک کے راست باز بیگی راہنما اور حق پرست اخبار مردِ آہن کی ان نفز گوئیوں کا نوٹس نہیں لیتے۔ اگر یہ بات درست ہے تو خان صاحب نے اس سے پہلے انکشاف کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں اس سے مختلف بیان کیوں دیا؟ اس وقت کیوں نہ کہا کہ خان عبدالغفار خان اور سرخ پوشوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ قائد اعظم کی ہدایت یا ارشاد کے مطابق تھے۔ خان صاحب کا فرض تھا کہ جب خان عبدالولی خان صدارتی الیکشن میں مادر ملت مس فاطمہ جناح کی مدد کر رہے تھے اور مادر ملت نے خان عبدالولی خان کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ دیا تھا، حتیٰ کہ ان کے ساتھ مل کر بہت سے جلسوں کو خطاب کیا۔ اس وقت اعلان کرتے کہ مادر ملت ان سے پرہیز کریں ان کے عظیم بھائی نے جو بابائے قوم تھے ہمیں فرمایا تھا۔ کہ عبدالغفار کا دل کالا ہے اور اس کے دل کا کھوٹ کاری ضرب لگانے کا مستحق ہے۔ اس وقت تو خان صاحب خفتار زیر پر رہے۔ پھر جب خان محمد ایوب خان کے خلاف تمام ملک میں عوامی تحریک چلی تو ملک کے تمام اخباروں میں ان کی وہ تقریر موجود ہے جس میں انہوں نے خان عبدالولی خان کو اپنا لیڈر کہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان صاحب نے اپنے دل کے بغض کو قائد اعظم سے منسوب کر کے نہ صرف ان کی روح کو صدمہ پہنچایا ہے بلکہ ان کی عظیم جمہوری ذہانت کو بھی داغ دار کیا ہے۔ قائد اعظم منتقم مزاج ہوتے تو مولانا مظہر علی اظہر کو کافر اعظم کہنے پر مزید کاری گھرا تے بلکہ نفرِ حیات تک نہ کو کبھی نہ بخشتے۔ علامہ مشرقی کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرتے کیونکہ انہوں نے خاکساروں کا ایک دستہ کے کر اسلامیہ کالج لاہور کے ایک جلسہ میں اخباری روایت کے مطابق ہلہ بولا تھا۔ اس کے علاوہ علامہ صاحب کے ایک پیروکار محمد صابر نے بمبئی میں قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اگر قائد اعظم غیر جمہوری ہوتے تو مجلس احرار اسلام کو خلاف قانون قرار دیتے۔ مولوی اے کے فضل الحق کی چیتھاڑ کرتے۔ روزنامہ انقلاب لاہور پر چھری پھیر دیتے۔ لیکن قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے ایسا کوئی اقدام نہ کیا۔ ان کی اس عظیم الشان جمہوری شرافت ہی کا نتیجہ تھا کہ ساری قوم نے ماضی کے

اختلافات کو بھول کر انہیں بابائے قوم تسلیم کیا۔ ان کی شخصی عظمت کے گن گائے۔ اختر کو یاد ہے کہ ان کی وفات پر سب سے دردناک اداریہ بعنوان "آہ اتاترک" کے بجائے مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ آزاد نے لکھا تھا
خان عبدالقیوم خان اس قسم کی باتیں صرف اس لیے کرتے ہیں کہ زمانے کی غلط بخشی سے وزیر داخلہ ہیں۔ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں اور اپنی روایت کے مطابق اخبارات ان کے خیالات کو چھاپ دیتے ہیں۔

خان صاحب وزارت داخلہ کی گدی سے اتر کر اس قسم کی باتیں محض ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے کریں تو ہم ان کے حوصلہ و جرأت کے قائل ہو جائیں اور شاید یہ بھی مان لیں کہ وہ کسی قدر سچ بولتے ہیں۔ اگرچہ بعض سیاست دانوں کے اقوال اور ایک طوائف کے اعمال میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ خان صاحب اس قسم کی باتیں پنجاب کے لم چھڑوں میں کرتے ہیں انہیں یہ باتیں سرحد میں کرنی چاہئیں۔ لیکن ہمیں یاد ہے کہ جب سرحد کی وزارت اعلیٰ سے محروم کئے گئے تو بھاگ کر لاہور میں رہنے لگے۔ ہم نے اپنی ان گنہگار آنکھوں سے خان عبدالقیوم خان کو باچا خان کے پاؤں میں بیٹھے دیکھا اور یہ بھی ان کی زبان سے سنا ہے کہ باچا خان آپ پر جو بیتی ہیں اس میں بے قصور ہوں۔

بالآخر ہم ملک کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو سے نہایت ادب کے ساتھ اپنے خدا کو گواہ بنا کر عرض کریں گے کہ وہ (مرد آہن) کو اپنی قدر رس نگاہ سے دیکھیں۔ خان عبدالقیوم خان ان کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ کاش وزیر اعظم بھٹو ہم پر اعتماد کرتے ہم انہیں تاریخی تسلسل کے ساتھ ثابت کر سکتے ہیں کہ خان عبدالقیوم خان ہر لحاظ سے ناقابل اعتماد وجود ہیں۔

آخر اس لگاتار راگنی میں تک کیا ہے کہ ایک شخص کو ستائیس برس سے ملک و قوم کا غدار کہا جاتا ہے لیکن نہ اس کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے نہ کوئی حتمی ثبوت لایا جائے نہ کوئی غداری سامنے آسکے۔ اور جب وہ ہائیکورٹ میں اپنی ایک تقریر کی بنا پر پیش ہو تو خان صاحب اپنے مسلسل الزامات سے اسی طرح مکر جائیں جس طرح فارسی

اور اردو شاعری کے رومانی معشوق کی شب کے وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔

ہمارا ملک اس وقت بعض عالمی طاقتوں کے منفی رجحانات کی آماجگاہ ہے۔ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اب مزید سیاسی تجربے کئے جائیں۔ ہم نہیں جانتے شیرپاؤ کے خون کا ذمہ دار کون ہے لیکن ہم منتظر ہیں کہ جو لوگ اس حادثے کے مرتکب ہوئے ہیں انہیں تختہ دار پر کھینچا جائے۔ وزیر اعظم بھٹو خدارا ہماری اس عاجزانہ التماس پر ایک ثانیہ کے لیے غور کریں کہ خان عبدالقیوم خان وزیر داخلہ نہ ہوتے تو آج سرحد و بلوچستان کے حالات مضطرب نہ ہوتے اور نہ وہ چیزیں پیدا ہوتیں جن کا ظہور ہمارے لئے صدمہ جانکاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قافلہ احرار کی معتبر شخصیت

مولانا عبید اللہ احرار وفات پا گئے

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

قافلۂ احرار رفتہ رفتہ ختم ہوگیا، اپنی طبعی عمر گزار کر اس کی تمام شخصیتیں واصل بحق ہوگئیں۔ وہ لوگ جو فی الواقع احرار راہنما تھے یکے بعد دیگرے ابد کی نیند سو گئے بہ قول شاعر ؎

محشر میں آملیں گے حریفانِ بادہ نوش
نشتر اب ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے

اب احرار کوئی تحریک ہیں، نہ تنظیم، ایک ذہن ہے ایک یادگار ہے۔ ایک گمشدہ جذبہ ہے۔ چند مخلص نوجوان جو اپنے راہنماؤں کا دست و بازو تھے۔ اس یادگار کے وارث ہیں۔ اور اس ذہن کا دلدادہ ہیں یوں کہیئے ؎

سب غنیمت کر جلتے ہیں ابھی چند چراغ
بند ہوتے ہوئے بازار سے کیا چاہتے ہو

مولانا عبید اللہ احرار (فائل پور) ان یادگارِ زمانہ لوگوں میں سے آخری کا رکن راہنما تھے، انہوں نے تمام عمر احرار راہنماؤں کی ہم صحبتی میں بسر کی اور علماء عصر سے ایک گونہ تعلق رکھا۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے مسلک کے شیدائیوں میں سے تھے اور معرکۂ بالاکوٹ کی خصوصیات سے تعلق رکھتے تھے۔ صفِ اول کے احرار رہنماؤں کا دور ختم ہوگیا تو پیچھے جو لوگ ان کے جانشین ہوئے ان میں مولانا عبید اللہ احرار نمایاں و ممتاز تھے۔ اپنی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے جلد ہی مجلس کے صدر ہوگئے۔ آجکل پاکستان مجلس احرار اسلام کے صدر تھے۔ انہیں فراخی و دینی کاموں سے شغف تھا جو کچھ تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں معیشت کی پریشانی سے بے نیاز رکھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے خوشحال فرد تھے ہمیشہ اپنی جیب سے خرچ کرتے اور مخلص کارکنوں کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ سیاست سے غایت درجہ دلچسپی رکھتے، اور مختلف عہد کی قومی تحریکوں سے بخوبی واقف تھے انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ ملک کے جید علماء کی صحبت میں بسر کیا، بعض بڑے سیاسی راہ نماؤں کے ساتھ رہے اور کئی ایک تحریکوں میں حصہ لیا، لیکن ان کا ذہن سیاست سے کہیں زیادہ دین کی طرف تھا اور وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے متعلق ہر تحریک کا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے تھے، ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی انہوں نے حصہ لیا اور ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی پیش پیش رہے، گو ایک عرصہ سے بیمار تھے اور ان کی صحت کا   روز بروز گرتا چلا جا رہا تھا، لیکن علالت کے بستر پر بھی وہ اسلام سے اپنے عشق کی جوت جگاتے اور احرار کے باقیات کی رہنمائی کرتے، ان کے لیے سب سے پریشان کن امر یہ تھا کہ مسلمان اپنے عظیم ماضی سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی نئی نسلیں اس ورثہ سے غافل تھیں جو ان کے نزدیک اسلام کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا، وہ اسلام کے لیے سب سے زیادہ تڑپ رکھتے اور فرماتے کہ ہم کیونکر اپنے عظیم ماضی کی طرف لوٹ سکتے ہیں؟ وہ کسی جمود یا انحطاط کے آدمی نہ تھے وہ تحریک و حرارت کا وجود تھے وہ ہر دور کے علم کی رفعتوں سے فائدہ اٹھانے کے حق میں تھے وہ اس کے خلاف نہ تھے کہ عصر حاضر کے علمی سفر نے جو فتوحات حاصل کی ہیں، انہیں صرف اس لئے مسترد کر دیا جائے کہ مسلمانوں نے ان سے اپنے کو الگ رکھا ہے، وہ حکمت کو حدیث کی رو سے مسلمانوں کی میراثِ گمشدہ سمجھتے اور اس ذہن کے مبلغ تھے کہ   سے علم حاصل کرو۔ ان کے لئے سوال جذبات کا نہیں، سوال حقائق کا تھا، اس صورت حال سے قلبی اذیت محسوس کرتے اور اس کے تاریخی مطالعہ میں صبح و شام مشغول رہتے کہ دنیائے اسلام سیاسی ابتری علمی انحطاط اور سائنسی محرومی کی شکار ہے وہ مسلمان

(باقی ۱۲ پر)

عظیم دوست • عظیم محبِ وطن • عظیم قانون دان

شیخ سعید اختر جواں مرگ ہو گئے

اے میرے رونے والو خدارا جواب دو ٭ وہ بار بار پوچھتے ہیں کون مر گیا

۲۲ فروری اتوار کو اڑھائی بجے سہ پہر شیخ سعید اختر ایڈووکیٹ ۴۶ سال کی عمر میں دل کے ہاتھوں رہگرائے عالم بقا ہو گئے ؎

شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

شیخ صاحب مجموعۂ اوصاف تھے۔ عمر زیادہ نہ تھی ۴۶ سال۔ لیکن اس عمر ہی میں معاصرین سے کہیں آگے نکل گئے تھے انہوں نے پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سردار محمد اقبال کے نائب کی حیثیت سے وکالت کا آغاز کیا اور جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ سردار صاحب ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تو شیخ صاحب کا تجربہ اس کمال کو پہنچ چکا تھا کہ ایک مختصر سی مدت ہی میں وکالت کے افق پر نیرِ تاباں ہو گئے۔ سب سے پہلے رن کچھ کے مقدمہ میں شیخ منظور قادر کے ہمراہ آپ کی دھاک قائم ہوئی اور اس مقدمہ میں کامیاب ہوئے۔ تب آپ کی قابلیت کا اعتراف عالمی عدالت کے ججوں نے بھی کیا۔ اس کے بعد بعض آئینی مقدموں میں آپ کا شہرہ ہو گیا۔ فی الجملہ ہر قسم کے مقدمات میں آپ کی بصیرت مسلّم مستند ہے۔

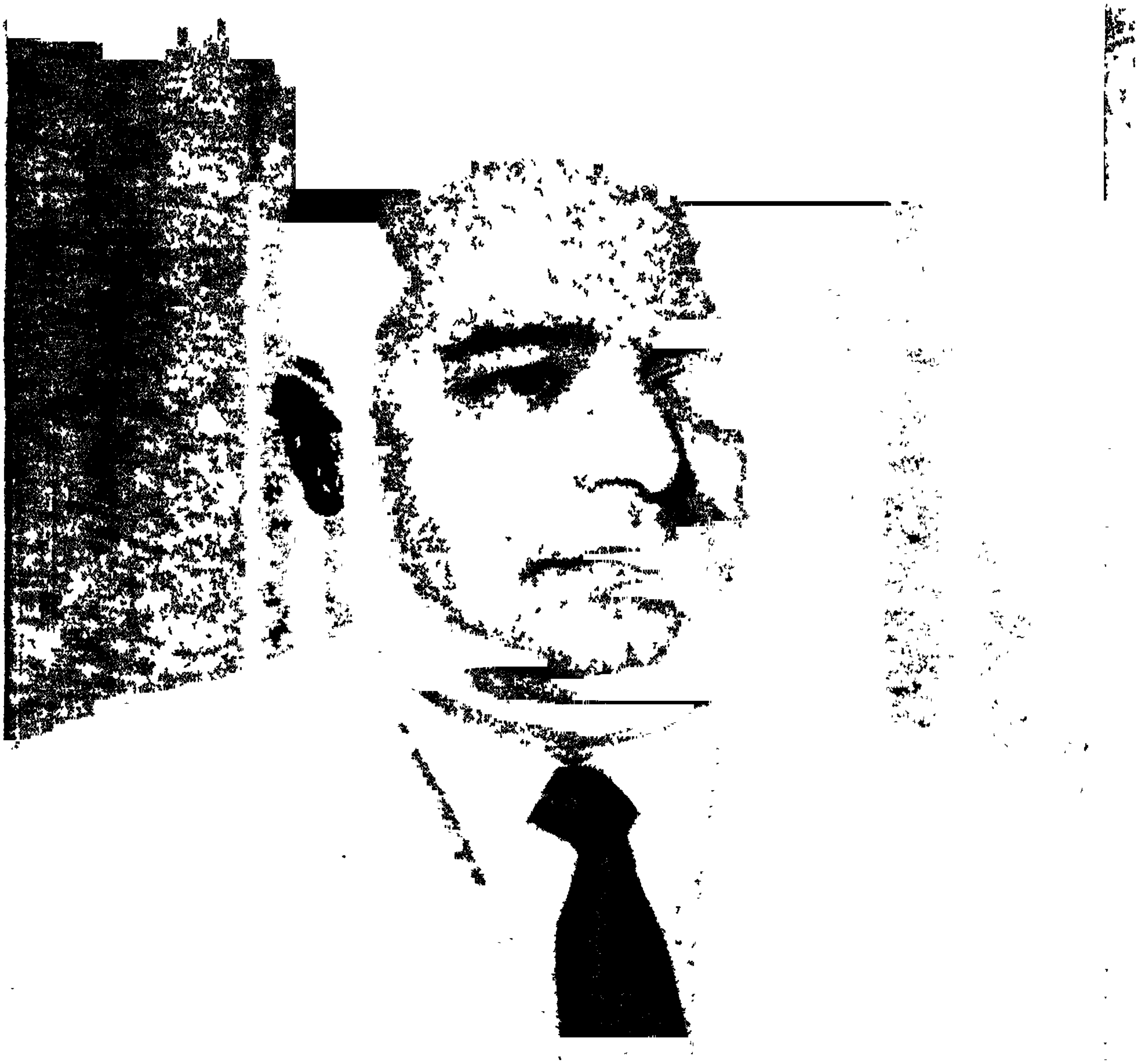
راقم سے آپ کا تعارف اس وقت ہوا جب ایوب خاں کے عہد میں چٹان پریس ضبط ہو گیا۔ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور راقم کو بلا میعاد ڈیرہ اسماعیل خاں میں نظر بند کر دیا گیا۔ شیخ صاحب نے تمام مقدمات ابتداء سے [illegible] آخر تک مفت لڑے تھے۔ کسی مرحلہ اور کسی موڑ پر ایک پیسہ نہ لیا۔ یہ ان کا عظیم ایثار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے تمام دوست وکلا ساتھ چھوڑ گئے۔ اور نامور وکلا تو ہمیشہ دو چار پیشیوں کے بعد اپنے دوسرے مقدمات میں مصروف ہو جاتے یا دو چار نامور چہروں کے مقدمات لے کر اپنی سیاسی شہرت کے بال و پر پیدا کرتے۔ لیکن شیخ صاحب نے اپنی بھرپور پریکٹس پر لات مار کر راقم کے مقدمات کی مہینوں مسلسل پیروی کی۔ بعض چیزوں کا ازخود انکشاف مناسب نہ ہوگا لیکن اس چیز کا انکشاف کرنا غلط نہ ہوگا کہ شیخ صاحب کو حکومت نے بعض گراں قیمت مقدمات دے کر بٹانا چاہا لیکن انہوں نے دو ٹوک انکار کیا اور سرکاری قاصدوں سے کہا کہ وہ اپنے پیشہ سے دغا نہیں کر سکتے۔ جو ڈاکٹر اپنے مریض سے دغا کرتے اور جو وکیل اپنے موکل سے بدعہدی کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی ذہانت سے غداری کے مجرم ہوتے ہیں۔

جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر فضل اکبر نے راقم کی رٹ سے متعلق حکومت کی اڑچنوں کو سہارا دیتے ہوئے ایک قانونی نکتہ پر فیصلہ دینے کے لیے تین ماہ کی تاریخ ڈال دی اور سماعت کے لیے کراچی کے اجلاس کا تعین کیا تو سعید اختر اپنے نائبوں سمیت لاہور سے کراچی گئے۔ وہاں تین دن سماعت ہوئی۔ حکومت نے وکلاء کی ایک ڈار بھیجی۔ اٹارنی جنرل کے علاوہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل بھی بلوائے گئے حتیٰ کہ بہت بڑی رقم دے کر لاہور ہائی کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر اے آر چنگیز نے بھی سرکار کی [illegible] کی ترجمانی کی لیکن سعید اختر نے راقم کا مقدمہ اسی طرح مفت لڑا۔ آپ کا اخلاص اپنے عروج پر تھا۔ سب [illegible] کیا۔ آخر سرکاری ٹیم کے مقابلہ میں قانونی نکتہ جیت گئے جس سے وہ مقدمہ اور اس کا فیصلہ حکومت کے خلاف آئندہ کے سیاسی مقدمات میں ایک نظیر بن گیا کہ حکومت جن لوگوں کو جس طرح بھی نظر بند کرتی ہے۔ ان کے مقدمات کی سماعت کا ہائی کورٹ کو اختیار ہے اور ہائی کورٹ ان کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ دے سکتی ہے۔ چونکہ حکومت راقم کو لاہور میں لانے اور بلوانے کے خلاف تھی۔ اس لیے سپریم کورٹ نے سماعت کے لیے کراچی کا تعین کیا۔ حتیٰ کہ راقم کے ایڈووکیٹ کی فیس تیس تیس ہزار سرکاری خزانہ سے ادا کی گئی۔ اس مرحلے میں شیخ صاحب دستبردار ہو گئے کیونکہ وہ تین ماہ تک مفت مقدمہ لڑتے رہے اور اب اس ایثار کو داغدار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر کیا ہوا۔ اس کی مفصل روداد راقم کی کتاب موت سے واپسی میں موجود ہے اور وہ کتاب شیخ صاحب ہی کے نام معنون ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل نے ہائی کورٹ کی توہین کی۔ ڈویژن بنچ دستبردار ہو گیا۔ راقم نے مقدمہ کا بائیکاٹ کر دیا اور بھوک ہڑتال کے بل پر رہائی حاصل کی۔ ۱۹۶۷ء میں راقم کو ڈیفنس آف پاکستان رولز میں پھر سے گرفتار کیا گیا۔ تو شیخ سعید اختر نے مقدمہ سنبھالا اور جیت گئے۔ راقم رہا ہو گیا۔

اب وہ بے لوث انسان کہاں؟ موت جیسے شتابی کی [illegible] ایک شعلۂ مستعجل ہو گئے۔ ان کی جوان موت پر [illegible] کا چہرہ اشکبار ہو گیا۔ ہائی کورٹ کے ججوں نے [illegible] ان سے خطاب کرتے ہوئے ایک عظیم [illegible]

[illegible]

ہفت روزہ چٹان لاہور



شیخ سعید اختر ایڈووکیٹ

[illegible]

طلبہ ٥ اسلحہ ٥ پولیس

اک معمہ تو نہیں ایک پہیلی تو نہیں

۲۱ فروری کو رات گئے پنجاب، سرحد اور سندھ کی یونیورسٹیوں، کالجوں، ہوسٹلوں اور مختلف تعلیمی اداروں میں پولیس نے چھاپے مار کر ملکی و غیر ملکی ساخت کا جو اسلحہ برآمد کیا وہ ایک ایسی خبر تھی کہ سب چونک گئے۔ آخر یہ کیا ہے۔ طلبہ کے پاس دیگر ایسے طلبہ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے) کتابوں کے بجائے اسلحہ علم کا ارتقا ہے یا سیاسی اخلاق کی تربیت اپ پ ی اور پ پ ای رپورٹ کے مطابق ہوسٹلوں سے برآمد ہونے والے اسلحہ میں مشین گنیں، شاٹ گنیں، رائفلیں، پستول، دستی بم، ریوالور، آتش گیر مادہ اور خنجر شامل تھے۔ تمام اخباروں میں اسلامیہ کالج پشاور کراچی کے بعض کالجوں، پشاور یونیورسٹی کیمپس وغیرہ سے برآمدہ اسلحہ کی تصویریں بھی چھپی ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ سب سے زیادہ ہتھیار سرحد سندھ کے تعلیمی اداروں سے برآمد ہوئے۔ پشاور میں مدفون ہتھیاروں کا ایک ذخیرہ پکڑا گیا۔ تمام چھاپے نصف رات کے بعد مارے گئے۔ ہزاروں ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں کئی طلبہ گرفتار کیے گئے۔ اخباری اطلاع کے مطابق جو اسلحہ برآمد کیا گیا اس کی تمام اقسام پانچ سو سے زائد ہیں اور جو اس سلسلہ میں گرفتار کیے گئے وہ ۳۰۵ افراد ہیں ایک اور تفصیل کے مطابق سندھ میں ۸۰ گرفتاریاں ہوئیں ۱۳۰ ریوالور اور پستول نکلے۔ ۲۶ خنجر برآمد ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹلوں سے ۱۷ پستول اور ریوالور، ۱۷ رائفلیں اور بندوقیں ۹۲ کارتوس اور ۱۹۹ چاقو برآمد ہوئے۔ ۵۰ طلبہ کو گرفتار کیا گیا۔ ملتان ڈویژن سے ۴۵ طلبہ گرفتار کیے گئے جن میں بلا لائسنس اسلحہ رکھنے پر ۲۴ طلبہ صرف ملتان شہر میں پکڑے گئے۔ خبر میں بعض افسوسناک چیزیں بھی ہیں مثلاً ایک طالب علم شیر زمان کو فحش لٹریچر رکھنے پر گرفتار کیا گیا۔ اس کے قبضہ سے بلیو فلم اور دیگر تصاویر برآمد ہوئیں۔ ایک غسل خانہ سے چرس ملی، بعض غسل خانوں کے فحش فقرے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ سکھر گورنمنٹ ڈگری کالج کی خبر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جن طلبہ کو ڈیفنس آف پاکستان رولز اور آرمز ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا ان کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ، تحریک استقلال، جیئے سندھ، نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور آزاد شدہ مارکسٹ سٹوڈنٹس فیڈریشن سے ہے۔ لاہور میں ایم او کالج اور دیال سنگھ کالج کے طلبہ بھی ناجائز اسلحہ کی پاداش میں پکڑے گئے۔ گجرات، ساہیوال، لائل پور، اسلام آباد اور حیدرآباد سندھ میں بھی چھاپے مار کر اسلحہ برآمد کیا گیا۔

پہلا ردِ عمل

اس صورت حال کا لاہور میں طلبہ پر ردِ عمل یہ ہوا کہ بہت سے طلبہ نے احتجاجاً وائس چانسلر شیخ امتیاز علی کے بنگلہ پر حملہ بول دیا اور ان کی کوٹھی کے تمام کمروں پر گملے مار کر اس کے شیشے توڑ دیئے۔ اس کے علاوہ بنگلہ پر موجود ڈاج کار کی اور فرنیچر کو تباہ کر دیا۔ یہ ایک افسوسناک ردِ عمل تھا جس کا اظہار طلبہ نے (اخباری روایت کے مطابق) وفاقی پولیس کے چھاپے مارنے پر وائس چانسلر کے بنگلہ پر کیا اور غیظ و غضب کی حالت پیدا ہو گئی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ وائس چانسلر کا بیڈروم بھی تقدس ظاہرہ ہو گیا۔ نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق وائس چانسلر کی محترمہ بیگم صاحبہ اور ان کے بچوں سے بھی بدتمیزی کی گئی۔ پروفیسر امتیاز علی (وائس چانسلر) نے طلبہ کو واشگاف الفاظ میں بتایا کہ انہیں اس سلسلہ میں کوئی علم نہیں اور نہ ان کی اجازت سے تلاشی ہوئی ہے۔ مگر طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ غلط بیانی کر رہا ہوں تو وہ استعفیٰ دینے کے لیے تیار ہیں۔ بالآخر وائس چانسلر کے سمجھانے پر طلبہ واپس چلے گئے۔ لیکن وائس چانسلر نے اعتراف کیا کہ تلاشی کے دوران نہ تو کسی وارڈن اور نہ کسی سپرنٹنڈنٹ کو بلایا گیا اور نہ انہیں کوئی اطلاع ہی تھی۔ دو طالب علموں طارق جاوید اور محبوب یزدانی نے بیان کیا کہ پولیس نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ پہلے دن خبر میں تھا کہ بعض طلبہ نے کئی ایک پولیس والوں سے رائفلیں چھین لیں اور پولیس نے ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کو گالیاں دیں۔ حکومت پنجاب نے ۲۴ فروری کو ان دونوں خبروں کی تردید کی اور محض دماغی اختراع قرار دیا۔ ایک طالب علم لیڈر غلام عباس نے برآمد شدہ اسلحہ کے متعلق کہا کہ وہ پولیس ساتھ لائی تھی اور طلبہ کے مستقبل کو تاریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے — وائس چانسلر کے چوکیدار نے کہا کہ طلبہ نے اُن سے رائفل چھین لی اور انہیں دھکے دے کر بنگلہ میں گھس آئے۔ اسی دن کی خبروں میں تھا کہ پرو وائس چانسلر ڈاکٹر درشاہی کی رپورٹ پر وحدت کالونی پولیس نے چھ طالب علموں کے خلاف مقدمہ درج کیا ہے۔

معاف کیجئے

یہ واقعہ ہر لحاظ سے ایک سنجیدہ واقعہ ہے۔ جو کچھ پولیس نے کیا ہم اس کے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی روایت کے مطابق ہے۔ اس کو حکم ملا، اس نے حکایت کے مطابق شکایت پیدا کی۔ اس قسم کے چھاپوں میں یہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پولیس اس قسم کی پکڑ دھکڑ کے لیے جاتی ہے تو وہ پولیس ہوتی ہے۔ عوام اور حکومت کے مابین رابطہ افسر نہیں ہوتی۔ لیکن پولیس نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مطایبات

دیدنی ہیں اک غلط اندیشس کی خوش حالیاں — مانگ کر لایا ہے بازارِ سخن سے گالیاں
مَیں شناسا ہوں بہر عنوان خط و خال ہے — مجھ سے مخفی تو نہیں پھوکی بد اعمالیاں
جو مسلمان سطوتِ انگریز سے لڑتے رہے — اُن سے ٹکرانے لگی ہیں کرٹ کھنوں کی پالیاں
ایک مجہول النسب شاعر بطرز ریختی — اپنے رشحاتِ قلم کی بھیجتا ہے ڈالیاں
مسئلہ کوئی نہیں تذکیر کیا تانیث کیا — اِن دنوں اہلِ قلم کہلا رہے ہیں سالیاں
خوش نگارانِ صحافت مہ جبینانِ ادب — کان میں ڈالے ہوئے پھرتے ہیں اپنے بالیاں
سانحہ کوئی تو گذرا ہے پسِ پردہ ضرور — آنکھ کی جھپکی میں عنقا ہو گئی ہیں لالیاں
زاویے بنتی ہیں قرطاس و قلم کی آڑ میں — آنجہانی ظلِ سبحانی کی لٹکن والیاں

لوٹتے ہیں میرے ان اشعار پر اہلِ نظر
پیٹتے ہیں شہسوارانِ صحافت تالیاں

اسرار بصری

جامع مسجد دھلی کی امامت کا مسئلہ

آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

جامع مسجد دہلی کا جھگڑا سابق ہندوستان کی سرزمین میں بھارتی مسلمانوں کے لیے نہ صرف ایک عبرت آموز سبق ہے بلکہ ایک لحاظ سے غور کیا جائے تو اپنے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کوئی معاندت نہیں ہو سکتی۔ ہم تک تمام ہندوستان سے مسلمانوں کے جو صحائف و رسائل پہنچے ہیں ان کے مطالعہ سے ہمیں فی الواقعہ انتہائی قلق ہوا۔ ہم نے اب تک اسی لیے تبصرہ نہیں کیا تھا کہ محض سیاسی مخاصمت کے میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس سے کوئی فائدہ مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ جامع مسجد دہلی کے امام سید حمید بخاری معمر ہو چکے ہیں۔ اور ان کی صحت عمر کی کمزوری، اضمحلال سے متزلزل ہو چکی ہے۔ انہوں نے اپنی جگہ اپنے بیٹے سید عبداللہ بخاری کو امام مقرر کر دیا۔ ان کی دستار بندی کی۔ حالانکہ جامع مسجد آل انڈیا وقف بورڈ کی تحویل میں ہے۔ سید حمید بخاری دراصل امام ابھی بورڈ سے باقاعدہ تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کے فرزند ارجمند سید عبداللہ بخاری کو بھی بورڈ نے نائب امامت کا معاوضہ دینا شروع کیا ہے۔ بالفاظ دیگر سید عبداللہ جامع مسجد کے نائب امام مقرر کئے گئے۔ لیکن نائب امام صاحب نے بورڈ کی منشاء مرضی کے خلاف کچھ اسی طرح سے پاؤں پھیلانا شروع کئے جس سے نہ صرف صورت حال بگڑ کر خون خرابے تک پہنچ گئی بلکہ ایک مدرسے کی طرفداری کے سلسلے میں پٹ کر خوفناک جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

سید عبداللہ بخاری کے خلاف الزامات کا ایک اہم حصہ یہ تھا کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جو دکانیں ہیں سید عبداللہ ان سے کرایہ وصول کرتے اور اسے اپنی آمدنی قرار دیتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جامع مسجد سے ملحق بعض مکانوں سے بھی کرایہ وصول کیا یا کرایہ وصول کرنا چاہا۔ حتیٰ کہ جو لوگ مسجد کی زیارت کے لیے آتے ان سے خاص ٹیکس وصول کیا جاتا۔ اور مسجد کا فوٹو لینے والوں کے علاوہ مینار پر چڑھنے والوں سے بھی باقاعدہ رقم وصول کی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ امام صاحب نے بعض مواقع پر گراں قدر چندے وصول کئے۔ اور ان رقموں کا بورڈ کو کوئی حساب نہ دیا۔ چنانچہ دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین سید مظفر حسین برنی کی روایت کے مطابق یہ رقمیں کئی لاکھ تک پہنچتی ہیں۔ واضح رہے کہ سید عبداللہ بخاری کو بطور نائب امام تین سو اکیس روپے ماہانہ تنخواہ اور بچوں کی تعلیم کے لیے سو روپے ماہانہ الاؤنس دیا جاتا ہے۔ کل چار سو اکیس روپے ماہوار ان کے والد سید حمید بخاری عمر و علیل

(باقی صفحہ پر)

ہفت روزہ چٹان لاہور

بے تاریخ لوگ

نیشنلسٹ مسلمانوں کے نکتہ چیں

یہ چیز انتہائی افسوسناک ہے۔ ہر اعتبار سے، تاریخی اعتبار سے بھی، اخلاقی اعتبار سے بھی اور اسلامی اعتبار سے بھی کہ حضرت قائداعظم کی آڑ لے کر نیشنلسٹ مسلمانوں کو یا سب گالی دی جائے اور انہیں مطعون کیا جائے کہ پاکستان کی بقا و استحکام کے بارے میں اُن کی وفاداری مشکوک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں کھل کے جوابی تنقید نہیں ہو سکتی۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ ابھی ذہنی فضا اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دوسرا اس قسم کے مباحث قومی انتشار کا باعث ہوں تو موجودہ حالات میں ملک کے لیے سازگار نہیں۔ تاہم جو لوگ قائداعظم کی آڑ میں اپنی اصطلاح کے مطابق نیشنلسٹ مسلمانوں کی محبوب شخصیتوں پر کیچڑ اچھالتے رہتے اور ہر چھوٹے بڑے اپنے گرد شہ منہ زور قلم سے بدزبانی اگلتے ہیں وہ یہ کیوں محسوس نہیں کرتے کہ وہ ہوں یا وہ قائداعظم کا حق عقیدت ادا نہیں کر رہے بلکہ قائداعظم سے معاندت کر رہے ہیں۔ بلاشبہ سیاسی اختلافات اور اُن کا اظہار ہر شخص کا حق ہے لیکن کسی کے خلاف گالی بکنا اور بار بار یہ راگ الاپنا کہ نیشنلسٹ مسلمان برعظیم کے مسلمانوں کی حیات ملی سے غداری کے مرتکب ہوتے تھے یا وہ ہندوؤں کی جیب میں تھے تو یہ انداز تنقید نہیں، عاشکافت تبرّا ہے جو پانی گالی ہے، یہ بدنہ سب و شتم ہے اور بد دیانتی کا شاخسانہ ہے۔ اس قسم کے لوگ قائداعظم کی تاریخی عظمت کو [illegible] کی اعتقاد کی کوشش کر رہے ہیں [illegible] نے پاکستان بن جانے کے بعد اپنی تمام [illegible] پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں لگا دی [illegible] قائداعظم علیہ الرحمۃ [illegible] ہو گئے [illegible] انہوں نے [illegible] لوگ [illegible] کے اظہار [illegible]

قربانی و ایثار کی شمعیں روشن کرتے رہے اور قید و بند کے علاوہ دار و رسن کی تماشا گاہ سے گزرتے رہے تھے۔ ان ترازو بردار قلمکاروں یا زبان درازوں کا اپنا وزن کیا ہے؟ یہی کہ عمر بھر انگریزی حکومت کی جوتیاں چاٹتے رہے۔ بعض استعمار دشمن شخصیتوں کے مخبر رہے اور کسی نیک نام کارنامہ [illegible] ڈگری پا کر کی اولاد آن کے ایماء پر برعظیم سے غداری کے علاوہ مسلمانوں سے فریب کرتے رہے تھے۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

اس طائفہ میں وہ لوگ بھی ہیں جو مرزا غلام احمد کی خانہ ساز نبوت کا محاسبہ کرنے پر مسلمانوں کو ٹوکتے تھے کہ اس سے قومی وحدت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختم المرسلین قومی وحدت کے مقابلہ میں کوئی معنی نہیں رکھتی اور قومی وحدت کیا ہے؟ اس کا مجہول تصور ان کے نہاں خانہ دماغ سے کبھی طلوع نہیں ہوا۔ اس تحریک ختم نبوت میں ان خوردہ فروشوں کے پیٹ میں قراقر اٹھا اور وہ کمیونسٹ دوستوں کے پاس دستخط لینے گئے کہ ملک میں ترقی پسندی کو کمیونسٹ خراب کر رہے ہیں لہٰذا اس تحریک کے خلاف بیان دیں۔ یہی لوگ ہیں جو سر ظفر اللہ خان کی آذری مجمری کرتے اور اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں ہمیں ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں لیکن ہم حیران ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں تو انہیں مرزا غلام احمد گوارا ہے کہ اس کی اُمت کے احتساب سے قومی انتشار پیدا ہوتا ہے، لیکن نیشنلسٹ مسلمان کسی حال میں گوارا نہیں۔ اُن پر تبرا ضرور کیا جائے گا کہ اس سے قومی وحدت منتشر ہونے کے بجائے مستحکم ہوتی ہے۔ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے خلاف کسی نیشنلسٹ مسلمان نے کوئی دل آزار بات کی ہے؟ کہ ان حضرات کو سب و شتم یا طعن و تعریض کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیا مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہ نے کبھی یا تقسیم ملک کے بعد قائداعظم سے متعلق کوئی اہانت کی بات کی؟ مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے کوئی استخفافی کلمہ کہا؟ جب ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں نے کوئی تعریضی سخن نہیں کہا بلکہ پاکستان کے حق میں ہمیشہ کلمۂ خیر ہی کہا تو اب کس جرم میں ان کے کفن کو میلا کرتے ہیں۔ رہا یہ کا سوال تو اس طرف کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک فہرست بنا لیجئے اور اس میں چھوٹے بڑے سبھی شامل کیجئے پھر بتائیے کہ انہوں نے قائداعظمؒ یا پاکستان سے متعلق کب اور کہاں تعریضی و تخریبی عمل کیا۔ یا زبان پر کوئی ایسی چیز لائے جس سے قائداعظم کی اہانت مقصود ہو یا پاکستان کی نفی کے لیے کوئی حرکت سرزد ہوئی ہو۔ اگر نیشنلسٹ مسلمانوں کو گالی دینا آپ کی ذہنی غذا ہے تو ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔ اس غذا کو مزید جاری رکھیے کیونکہ آپ کی صحت و تندرستی کا سوال ہے اور شرع نے اجازت دی ہے کہ جان بچانے کے لیے اکل حرام بھی جائز ہے، لیکن یہ نوٹ کر لیجئے کہ آپ فی نفسہٖ کوئی تاریخ نہیں رکھتے۔ آپ کو ضرورت نے قائداعظم کے پاؤں میں ڈال دیا تھا۔ جب دیکھا کہ انگریز جا رہا ہے تو قائداعظم کے ساتھ ہو گئے۔ قائداعظم زندہ باد لگا دینے سے تو آپ ہیرو نہیں ہو گئے یا مجاہد نہیں بن گئے؟

سوال صرف یہ ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان پاکستان کے نظریاتی طور پر مخالف تھے۔ پاکستان بن گیا تو پاکستان کو اس حال تک کس نے پہنچایا؟ نیشنلسٹ مسلمانوں نے؟ یا آپ نے؟ فاطمہ جناح کے مقابلہ میں کون تھا؟ مشرقی پاکستان کس نے علیحدہ کیا؟ پاکستان کیونکر دو لخت ہوا؟ لیاقت علی کو کس نے قتل کیا؟ ناظم الدین کیونکر نکالے گئے؟ سکندر مرزا کس [illegible] کی اولاد تھا؟ کس نے جیت جنگ کی گدی پر

پیدا کر سکے؟ قمر الدین کے خلاف ... کس نے
... لگایا؟
... ایوب خان کے
... کو تختہ دار پر کھینچا؟
... کس نے زنار توڑ کر
... الزام میں پکڑا گیا۔ وہ کوئی نیشنلسٹ
مسلمان تھا یا پنجاب پولیس کا ایک ریٹائر سپرنٹنڈنٹ غلام مصطفیٰ؟
... بخش مری۔
... کانگرس میں رہے۔ کیا وہ
... نیشنلسٹ مسلمان تھے؟ خدا کے لیے کسی
نیشنلسٹ مسلمان کا نام بتایئے جس نے کوئی ایسی حرکت کی
ہو جس سے پاکستان اس حال کو پہنچا ہے؟

غدار نیشنلسٹ مسلمان نہیں، غدار آپ ہیں، جب تک انگریز رہا آپ اس کے ذلہ خوار تھے۔ وہ جانے لگا تو آپ قائد اعظم کے خوشہ چین ہو گئے۔ لیکن پاکستان بن گیا تو پھر اقتدار کی پوجا کی، اور جس نے تخت حکومت پر جلوس کیا اسی کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

قائد اعظم پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کے لیڈر نہیں رہے بلکہ [illegible] کی سیاسی روایت اور لغت کے مطابق FATHER OF THE NATION ہو گئے۔ ان کا احترام ہر پاکستانی کے دل میں بس گیا۔ لیکن آپ ان کی آڑ میں قوم پر [illegible] کر برابر گالی بکے جا رہے ہیں اور آپ کو ذرا برابر حیا نہیں آتی۔ اگر آپ کی پیدائش ہی اس نہج پر ہوئی ہے تو ہم آپ کی پیدائشی غلطی کو درست نہیں کر سکتے۔ لیکن اپنے اس سیاسی عقیدے کا ہم ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ جو پاکستان میں رہ کر پاکستان کا دشمن ہے یا مسلمان کہلا کر پاکستان کی بیخ کنی چاہتا ہے وہ انسان نہیں، جانور ہے۔ قائد اعظم پاکستان کے عظیم سیاسی لیڈر تھے۔ ان کے متعلق دل میں میل رکھنا احمقانہ جہالت اور منافقانہ فعل ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجیے کہ حضرت قائد اعظم بہرحال انسان تھے۔ وہ معصوم عن الخطاء نہ تھے۔ [illegible] پیغمبر یا رسول نہ تھے۔ رسالت و نبوت کے سوا قیادت و سیادت سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے قائد اعظم پر ایمان لانا قرآن و اسلام کی شرط نہیں!
[illegible]

قائد اعظم زندہ باد کا نعرہ لگاتے رہیے ... سے آپ کی
شخصیت عظیم نہیں ہوتی اور نہ آپ ... ہو جاتے ہیں

جتنا آپ کو ... معلوم ہو کہ آپ
... کے نقش پر ...

غزل

لگائے بیٹھا ہوں الفت کو جس کی سینے سے — وہ بات بھی نہیں کرتا ہے اب قرینے سے

شعارِ تیرہ کا وارث نظامِ نو کا نقیب — چراغ لے اُڑا بامِ وفا کے زینے سے

اجالا میرے مقدر کا چھِن نہیں سکتا، — سحر تو پھوٹے گی تاریکیوں کے سینے سے

میں خود فریبی کی جنت میں گُم نہ ہو جاؤں — کہ بوئے خواب کی آئی مرے پسینے سے

یہاں چراغ کسی کا بھی جل نہیں سکتا — یہ روشنی ہے فقط میرے آبگینے سے

یہ تیز و تند ہوائیں یہ موج یہ گرداب — انہیں بھی بیر ہے شاید مرے سفینے سے

نگاہ فرش کروں اور سر کے بل جاؤں — طلب حضور جو فرمائیں پھر مدینے سے

طبق طبق ہوا روشن نظر نظر میں مری — لگا یا دیں تمہاری جو میں نے سینے سے

وہ آدمی ہے کسی کے جو کام آ نہ سکے — میں باز آیا زمانے میں ایسے جینے سے

نظر اٹھے گی اِدھر اور اُدھر میں پی لوں گا — مجھے نہ روک سکیں گے حجاب پینے سے

کشید ہو کے یہ آئے ہیں میرے دل سے شفیق
مری پلک پہ چمکتے ہیں جو نگینے سے

شفیق [illegible]

سولہواں مقالہ

از:- ڈاکٹر سید عبداللہ

ذکر و فکرِ اقبال کو عام کیجئے

یہ ہر طرح ثابت ہو چکا ہے، کہ اس وقت ملت کی شوکتِ گمشدہ کی بازیافت اور اسلام و قرآن کے بھولے ہوئے سبق کی از سرِ نو یادداشت کے لیے، ذکر و فکرِ اقبالؒ کی تحریک ایک مؤثر وسیلہ ہے، اقبالؒ کی ساری تعلیم، قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے اور اسوۂ محمدیہؐ کو شمعِ راہ بنانے کی تلقین کرتی ہے، لہذا کلامِ اقبالؒ کا مطالعہ کیجیے، تاکہ قرآن اور تعلیماتِ محمدیہؐ کی طرف رجوع کا شوق پیدا ہو، پس سالِ اقبالؒ کے موضوعِ خاص کا سلسلہ توڑتے ہوئے اس مرتبہ، قارئین کو حلقۂ ذکر و فکرِ اقبال کے پروگرام کی طرف متوجہ کرتا ہوں، جو ۱۹۷۵ء کے لیے وضع کیا گیا ہے، جیسا کہ پروگرام سے معلوم ہوگا، اس پروگرام کو پبلک جلسوں کی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ سب کی سہولت کے لیے اس کے اجلاسوں کی نوعیت نجی محفلوں کی ہے، جو گھروں میں ترتیب دی جائیں گی اور صاحبِ مکان اپنی مرضی سے اپنے احباب کو بلائے گا۔...... اس پروگرام میں جن صاحبوں کے نام ہیں، ان کے علاوہ بھی جو صاحب چاہیں، اپنے مکان پر محفل ترتیب دے سکتے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

حضرات کے نام ارسال کیا ہے۔

مراسلہ

حلقۂ ذکر و فکرِ اقبالؒ

—— پروگرام ۱۹۷۵ء

جنابِ من! سلام مسنون

حلقۂ ذکر و فکرِ اقبال جس کا پروگرام آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے، کوئی منظم انجمن یا مجلس نہیں اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ حکیم الامت کے افکار اور ان کے حوالے سے اسلامی فکر و حکمت ———— اور ان دونوں کے ضمن میں پاکستان کی سطح پر جائے علم و فکر کی ایک عام تحریک ایسے طریقے سے اُٹھائی جائے، کہ اس میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہو اور وہ باتیں جو کاوش نہ بنیں جو منظم انجمنوں میں اکثر باعثِ اختلاف و اختلاف بن جاتی ہیں۔ اسی کے اجلاس نجی محفلوں کی صورت میں مختلف احباب کے مکانوں پر ہوں گے۔

ملحوظ رہے کہ اس حلقہ کا کوئی دستور اساسی نہیں، نہ اس کے کوئی باضابطہ عہدہ دار ہیں، اس کی حیثیت نجی محفل کی سی ہے جس کے انعقاد اور

جس میں شرکا کی فہرست کے بارے میں ہر وہ صاحب آزاد ہیں، جن کے مکان پر ذکر و فکر کا اہتمام ہوگا۔

البتہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ ریکارڈ رکھا جائے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ہر سال کے آغاز میں، ایک تجریزی سا پروگرام مرتب ہو جایا کرے، چنانچہ ۷۵ء کا پروگرام حاضر ہے———۔

مجلس کا اہتمام جن صاحب کے مکان پر ہو، وہ چاہیں تو اجلاس سے قبل اخبار میں اطلاع شائع کرا دیں۔ تاہم یہ لازمی ہے کہ انعقاد کے بعد مجلس کی مختصر سی روداد بوساطت راقم الحروف یا براہِ راست اخبار کو بھجوا دی جائے جس کی ایک نقل راقم کو بغرضِ ریکارڈ بھجوا دی جائے، تاکہ پبلک آگاہ ہو، اور وہ مقالہ بھی جو اس مجلس میں پڑھا جائے، ریکارڈ میں آجائے تو مناسب ہوگا۔

مقالہ نگار کا انتخاب وہی صاحب کریں گے جن کے مکان پر محفل منعقد ہو یا جس کے اہتمام سے کسی ہوٹل وغیرہ میں اس کا انعقاد ہو، لیکن اگر مقالہ نگار کے لیے راقم سے کہا جائے گا تو راقم بھی انتظام کی کوشش کر سکتا ہے۔

مقالہ چند منٹ سے [illegible] مقالے کے بعد مناسب بحث و گفتگو [illegible] کیونکہ اس مجلس کی [illegible] کی ہے۔

۱۹۷۵ء کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے جس کی ایک نقل ارسالِ ہے:

جن بزرگوں اور دوستوں کے نام اس فہرست میں درج ہیں، ان سے التماس ہے کہ اپنے اپنے اجلاس کی تاریخ انعقاد اپنے پاس درج کر لیں۔

یہ مجلس اتوار کے علاوہ بھی کسی دن ہو سکتی ہے بالفرض ایک تجویز کی فہرست ایسے اصحاب کی ارسال کر دیں گے، جنہیں ہر موقعہ پر بلا لیا جائے تو مضائقہ نہ ہو گا کیونکہ یہ اصحاب، فکر اقبال میں مستقل دلچسپی رکھتے ہیں، آگے یہ ان کی فرصت پر موقوف ہے، کہ وہ کس کس اجلاس کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔

اب آخر میں التماس ہے کہ جن صاحبوں کے نام بطور داعیٔ اجلاس یا بطور مقالہ نگار منسلکہ فہرست میں درج ہیں، وہ جلد بذریعہ پوسٹ کارڈ مجھے اپنی جوابدہی اور رضامندی سے لازمی طور سے آگاہ فرما دیں، تاکہ رد و بدل کی صورت میں متبادل انتظام ہو سکے۔

تاریخ	میزبان
فروری کے اتوار	
۲	ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
۹	پروفیسر عبدالحمید ڈار صاحب
۱۶	ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا صاحب
مارچ کے اتوار	
۲	رانا اکرام علی صاحب
۹	ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب
۱۶	پروفیسر سید امجد الطاف "
۲۳	چوہدری نذیر احمد خان صاحب
۳۰	ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان صاحب

مقالہ نگار

پروفیسر سید کرامت حسین جعفری صاحب
ڈاکٹر سی اے قادر صاحب
سید نذیر نیازی صاحب
ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا صاحب

تاریخ	میزبان
اپریل کے اتوار	
۶	جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس صاحب
۱۳	جسٹس عطاء اللہ سجاد صاحب
۲۰	جسٹس جاوید اقبال صاحب
۲۷	پروفیسر ڈاکٹر سی اے قادر صاحب
مئی کے اتوار	
۴	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب
۱۱	پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب
۱۸	محمد علاء الدین اختر صاحب
۲۵	آغا شورش کاشمیری "

تاریخ	میزبان
جون کے اتوار	
۱	پروفیسر خواجہ غلام صادق صاحب
۸	پروفیسر شیخ محمد سعید صاحب
۱۵	ڈاکٹر محمد جہانگیر خان صاحب
۲۲	پروفیسر سید اکرم شاہ صاحب
جولائی کے اتوار	
۶	پروفیسر سید وقار عظیم صاحب
۱۳	احمد ندیم قاسمی صاحب
۲۰	مولانا حامد علیخان "
۲۷	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب
اگست کے اتوار	
۳	حکیم آفتاب احمد قرشی صاحب
۱۰	پروفیسر وارث میر صاحب
۱۷	مظفر حسین صاحب
۲۴	پروفیسر شیر محمد گریوال صاحب
ستمبر کے اتوار	
۷	حیات احمد خان صاحب
۱۴	بشیر احمد ارشد صاحب
۲۱	ہمایوں ادیب صاحب
۲۸	سید اشرف علی جعفری صاحب
اکتوبر کے اتوار	
۵	پروفیسر سید ابوبکر غزنوی صاحب
۱۲	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب
۱۹	ڈاکٹر انیس احمد ناصر
۲۶	میر نسیم محمود صاحب
نومبر کے اتوار	
۲	ملک احمد حسین صاحب
۹	پروفیسر سردار محمد "
۱۶	امجد اسلام امجد "
۲۳	ڈاکٹر بشیر حسین صاحب
دسمبر کے اتوار	
۷	قاضی جاوید صاحب
۱۴	ڈاکٹر وزیر آغا "
۲۱	پروفیسر فتح محمد ملک صاحب
۲۸	پروفیسر میرزا ریاض صاحب

—— ختم شد ——



تحریر: رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ
سپریم کورٹ آف پاکستان

سوجا! راج دلارے سوجا!

مکرم ایس ایم اختر صاحب

بھائی! "جوان مرگ" ایک ایسا جانکاہ حادثہ ہوتی ہے، کہ اپنے پرائے، واقف و ناواقف، دوست و رقیب سب کا دل پسیجتا ہے، آنکھ چھلکتی ہے جو ایسی موت کا ماتم نہ کرے، وہ سنگ دل کمینہ ہے، پاپی ہے اپنے انجام سے بے خبر ہے، کچھ لوگ خواجہ رفیق، ڈاکٹر نذیر، جاوید نذیر اور افتخار کی بے وقت موت پر پرکھے گئے، اور کچھ شیر پاؤ کے راہیٔ ملک عدم ہوتے ہی پہچانے گئے، ایسی موت پر دل کا بھر آنا، آنسوؤں کا بے اختیار چھلک اٹھنا فطری عمل ہے، مگر فطری نوحہ اور غیر فطری آہ و بکا میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے، جوان مرگ کی ماں کے رونے اور کسی سوتیلی کے نوحہ کناں ہونے میں وہی فرق ہے جو بلبل نالاں کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے خونِ دل اور مگر مچھ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔ باوفا بیوی، بے وفا زوجہ اور ریاکار داشتہ کا رونا ایک سا نہیں ہوتا، یوسفؑ کے لیے یعقوبؑ کا رونا، بنیامین کا غم واندوہ اور سوتیلے بھائیوں کا واویلا اگر ایک ہیں تو کبوتر کا بھولپن اور کوے کی مکاری بھی ایک ہی تصویر کے دو رُخ کہلا سکتے ہیں۔ قتلِ حسین پر زینب و سکینہ بھی روئیں، اور سسکیاں تختِ یزید کی گھٹن اور حرم سرائے یزید کی غلاموں میں بھی اُٹھیں، قاتل کو اگر اس کا احساس نہ ہو، مکرر عہد دے تو اسے مقتول کے اعزا و اقربا کی صفوں میں شریک ماتم ہونے کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔ [illegible]

[illegible]

ہے، قاتل خواجہ رفیق کا ہو یا ڈاکٹر نذیر کا، جاوید نذیر کا ہو یا وحید کا، شیر پاؤ کا ہو یا کسی غیر معروف انسان کا، قابل نفرین ہے، مستحق ملامت ہے، لیکن وہ شخصیت جس نے کسی کی موت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا، راندۂ درگاہ ہے، اس نے اپنا مقدر اپنے ہاتھوں تحریر کیا، جس نے بھائی کی موت پر اس کی جائیداد پر نگاہ حرص ڈالی، اس نے ماں کی کوکھ پر اس زور سے لات ماری کہ اس کے رحم کا خون اس کی چھاتیوں سے ٹپک پڑا۔ جس بیٹے نے باپ کی موت پر بظاہر آنسو ٹپکائے اور دل ہی دل میں وارث جائیداد بن جانے کی فرحت محسوس کی، اس نے گویا باپ کی میت پر تھوک دیا، اور اپنی رگوں میں نطفۂ ہضیم لامبین کو مائلِ رقص ابلیس کر کے اپنی آئندہ نسل کے لیے وہ طرزِ فکر منعقد کر لی جو جوان بیواؤں کو محفل فاتحہ خوانی میں آئندہ محبوب کی تلاش پر آمادہ کر دیتی ہے جس کے زیرِ اثر گنہگاری بیٹیاں ماں کی میت کو چھوڑ کر تجوری کی چابیوں کی تلاش میں مصروف ہو جاتی ہیں اور بظاہر چلاتی ہیں، ہائے اب یہ گھر کون چلائے گا، ماں! تیرے بعد اس گھر کی سالمیت کا کیا ہوگا، اب یہ گھر بٹ جائے گا، تقسیم ہو جائے گا، بھابھیاں قبضہ کر جائیں گی، اس پر تو بھائی تالے ڈال دیں گے ہم کس گھر کو اپنا گھر کہیں گی ہائے ماں ہم کہاں جائیں گی۔ ماں! تو کیوں مر گئی، اس انداز سے بین کرتی ہیں کہ لوگ بے ساختہ رو دیتے ہیں [illegible]

[illegible]

ملکیت تصور ہو گا۔ فرطِ جذبات سے سر پہ پیار دینے لگیں، گلے لگالیں، اور ان میں سے کوئی عضو سسکیوں کو روک کر کہے۔

میرے بزرگو، بھائیو، میرے ہم دردو، میرے جان سے پیارے عزیزو، اپنی بات پر قائم رہنا، یہ تمہارے سامنے، تمہاری اجازت سے میں نے ماں کی تجوری کی چابیاں سنبھالی ہیں، جو کوئی طلب کرے گا، تمہارا اور میرا دشمن ہوگا، اس گھر کا دشمن ہوگا، پنچایت کے فیصلے کا منکر ہوگا، گردن زدنی ہوگا، راندۂ درگاہ ہوگا، لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں، لوگ دھوکا کھانے کے عادی ہیں، مگر فطرت کہاں معاف کرتی ہے ایسی چھلوں کا انجام دنیا دیکھتی آئی ہے، دنیا دیکھتی رہے گی۔ اور مان و الحفیظ اور پھر وہ قتل کہ جن کے سرزد ہوتے ہی سرکاری جھنڈے سرنگوں ہو جائیں۔ ماتمی اعلانیے جاری ہونے لگیں، تعزیتی جلوس برآمد ہوں، جلسے منعقد ہوں، قتل جو مشرکین کی تختیوں پر تحریر ہو جائیں، عمارتوں کی پیشانیوں پر منقش ہو چکیں، ان کے انتقام کے لیے فطرت ازل سے ہی اپنے سپاہی تیار کر [illegible]



...نہ جیو، دل کو اپنے [illegible] بنائے، بہاء اشہار کئے اسی [illegible] اور خودکشی مقصد پر شاعر جیت حاصل کر دیتا ہے، وہ اثر کہیے ریخ نکل جاتی ہے، بہنتا ہے تو سسکیاں منکے اٹھتی ہیں، اسے رعایا جلد گذر جیسی زیر مذار قتل گاہ لوٹ آنے لگی ہے۔

انسان! سیاست [illegible] اسلوب ہے دستا نہ کی مسند پر آگرہ کی مقبرہ تعمیر کرواتے تھے اپنی شہنشاہی کا سکہ جمانے کی بھی سوچے تو اپنی ہی اولاد سے اپنی آنکھیں بھی نکلوا بیٹھے۔ مسجد نبوی اور اہرام مصر کا مقدر یونہی جدا جدا نہیں، بیت المقدس اور سومنات کی تقدیر کبھی ایک سی نہیں ہو سکتی، انار کلی کا حسن مٹانے کے لیے تاریخ کے پاس کوئی گنجائش موجود نہیں، دولت عوام الناس، مقبرہ جہانگیر پہ مرادیں مانگنے کبھی نہیں جائے گی، سیوا جی کو اورنگ زیب کے پہلو میں دفن کر دینے سے تاریخ کے دھارے اپنا رخ نہیں بدل لیا کرتے۔ اکبر اعظم بیرم خاں کو قتل بھی کروا دے تو بھی زمانہ اس کی شان وفا پر کوئی دھبہ قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوگا، نور جہاں کے ساتھ نکاح پڑھوا لینے سے نور الدین جہانگیر اور شیر افگن کے درمیان دودھ کے رشتے قائم نہیں ہو جایا کرتے، ابو الفضل دم آخر آل جلال الدین کے لیے جو گالی تجویز کریگا زمانہ اسے بیکے از تخلیقات آئین ادب تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا۔

لوگو! قتل شیر پاؤ، صوبائی وزیر داخلہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہ پیمانہ اندازہ ضمیر سیاست کہاں مر گئی کہ کوئی وزارت داخلہ سے مستعفی نہیں ہوا، کسی نے اپنی نااہلی کو تسلیم نہیں کیا، کسی کے حسن انتظام پر حرف نہیں آیا، کسی کی سیاہ کاری نے گریبان میں نہیں جھانکا، نہ راہ نمائش خدا سا گریبان چاک کر لیا اور بس، فقط کابل ریڈیو نے کسی بیان کو دہرا دیا اور بری الذمہ ہو۔

جیسے وقت اس کا اختیار ہو جو اس [illegible] سے عاری ہو، اور جیف اُس دسترس پہ جو اپنے اندیشہ مارے ہوئے چور کی گردن دبوچ سکے۔ لوگو! ماتم ماتم، مرگ شیر پاؤ جیسوں سال کا کہ پہرہ دار اندھے ہو گئے، سراغ رساں فہم و دانش سے عاری پائے گئے۔ ماتم، ان کا، پردہ داران چمن کا کہ نیت صیاد ان پر واضح تھی۔ جانتا تھا، خلال غافل ہیں اور گرگوں نے آستیں میں بجلیاں چھپا رکھی ہیں، واقف تھے کہ سانپ آستینوں میں سر چھپانے کے عادی ہیں، جس کی چھتری کے دودھ پر پلتے ہیں، اسی کی پیشانی پر ڈنک بھی مارتے ہیں۔ لوگو! ماتم کہ آج تک کسی نگہبان کی، کسی منتظم کی، کسی پہرہ دار کی بہ الزام غفلت معطلی تک کی خبر نہ ملی۔ ہائے یہ سارے چوکس تھے اور شیر پاؤ یوں مارا گیا۔ لوگو! پوری قوت تحفظ عامہ کو، پورے محکمہ فہم و فراست کو، پوری انتظامیہ کو، پوری انصرامیہ کو اپنی دور رسی کے سر پردے مار کر ان سے کوئی غفلت سرزد نہ ہوئی اور شیر پاؤ مارا گیا، کیا کہتے ہو، یہ سیاسی قتل ہے، کتنے دور کے بہکاتے ہو، تاریخ جانتی ہے، تاریخ فیصلہ دے گی، تاریخ تحریر کرے گی، کہ یہ قتل سیاست ہے بالعمد، بالانتظام، بالانصرام، مجرم کون ہے، ہندوستان و افغانستان و روس کے دور رس اذہان کا تخلیق دیا ہوا کوئی ڈرامائی کردار، جو پورے تنزل اندیشہ تمام کنندہ کار سیاست ہے۔

اے عوام اب تم کسی ٹریبونل کا اعلان کر دو۔



قتل شیر پاؤ کے مجرمین [illegible] جاسکے کہ شیر پاؤ کون تھا [illegible] ہے، حنیف وطن کا دم ٹوٹ گیا ہے۔

دانشورو! قتل شیر پاؤ اور ساتھ ہی ساتھ [illegible] سیاست میں یہ نام و ناموس مایہ وطن نیشنل عوامی پارٹی کا مقدر۔ بتاؤ ماتم برپا کرو اور بتاؤ کہ اینٹی نیشنل ثابت کرنے کے لیے ہے یا اینٹی نیشنل ثابت کرنے کے لیے، اگر کھل کر نہیں بتا سکتے تو ہاتھ کھڑے کرو کہ عوامی فاصلے قائم کرنے کے لیے عوامی فیصلے حاصل کرنے کا یہ انداز تم اپنا کر بھی اور آزما کر بھی دیکھ چکے ہو، خدا لگتی کہو، قتل شیر پاؤ کے ساتھ ساتھ قیادت ذرہ طالب علموں کا یوں مسلح پایا جانا، فروری کی "بائی" کا آنا مگر گھر کا نہ آنا، سیاست مسکہ کی آئندہ ماہ قیادت متبادل کو زیر عمل لانے کی کشت گوئی، سانپ نکل جانے کے بعد سانپ کو نگل جانے والوں کی پکڑ پیٹنے کے لیے ہڑتال ہو جائی اور سب سے بڑھ کر ہمیں امور سمجھنے کے لیے ہمارے اصلاً پر مزید پابندی کے بعد کچھ دیگر پابندیوں کا اٹھا لیا جانا، کیا زبر و بالا کا عوامی فہم و فراست سے بالاتر کوئی مسحور کن گیت نہیں کہ خامہ سر بگریباں ہے، کہ کیا لکھیے، اور لکھیے تو کفن زیر بغل کیونکر رکھتے جان ہتھیلی پر کس انداز سے سنبھالیے، ہم کہ کوئے قاتل کا سفر بھی مقصود ہو تو ہمیشہ بفضل اللہ الحمدللہ مسکراتے، گنگناتے، رقص کرتے "عزیز کہ کامزن پا گئے ہیں، یہ نہیں کہ مائل گریز ہیں" گو کہ ہم مشکل دگر دگر کہ ہم مشکل بھی نہیں۔ ہم تو صرف کاوش بے حصل و بے سود سے خائف ہیں، کہ فن ڈرامہ نویسی کی عدم ترقی بلکہ مسلسل تنزل کی وجہ سے لوگ اچھے ڈرامے کو سمجھ بھی نہیں سکتے، ڈرامہ نویس سے مافی الضمیر کا کھوج نکالنا تو بہت دور کی بات ہے، کون جانے، قتل شیر پاؤ، تاریخ کے کس کردار کے کس خوش اقبال رخ زیبا کی نشاندہی

باقی صفحہ پر

سفیرِ ختم نبوت مولانا منظور احمد چنیوٹی

سرزمینِ رسالت میں

ایک قادیانی جوڑا آغوشِ اسلام میں

قاطع مرزائیت مجاہد ختم نبوت برادر مکرم آغا شورش کاشمیری! ادام اللہ بالعزّ والعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج شریف

امسال حجازِ مقدس کے سفر کی بظاہر کوئی توقع نہ تھی، کیونکہ سات ماہ کا طویل عرصہ حجازِ مقدس اور عرب ریاستوں میں گزارنے کے بعد ۷ ستمبر ۷۴ء کے تاریخی دن ہی پاکستان واپس پہنچا تھا لیکن الخبر کے احباب نے واپسی ٹکٹ بھیج دیا، تاکہ حج کے بین الاقوامی اجتماع سے فائدہ اٹھایا جائے اور فراغت کے بعد پھر عرب ریاستوں کا دورہ کر لیا جائے۔ N.O.C. وغیرہ کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد راقم ۱۹ دسمبر کو بذریعہ پی آئی اے الحمدللہ مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔ ایک دو دن میں ہی تیاری کی، اس لیے بوقت روانگی ملاقات نہ کر سکا۔ آپ کی صحت، درازی عمر اور فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے خاص طور پر دعائیں کر رہا ہوں، آج آپ کے لئے ایک مستقل طواف بھی کیا ہے اور طواف میں تمام دعائیں آپ ہی کے لئے مختص تھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ نصیب فرما دیں۔ آمین۔

سعودی عرب روانگی سے قبل مجھے اطلاع ملی تھی کہ ہمارے علاقہ [illegible] ضلع جھنگ کا ایک بہت بڑا زمیندار [illegible] کی وجہ سے علاقہ کے کئی خاندان مرزائی ہو چکے تھے [illegible] سعودی عرب پہنچ گیا ہے۔ حج سے پہلے [illegible] فرصت ہی نہ تھی، حج سے فارغ ہو کر اس کا تعاقب شروع کیا [illegible] ہفت روزہ چٹان لاہور [illegible] کے فیصلے کے بعد انہیں جیل بھیج دیا گیا ہے۔ راقم نے اپنے طور پر ایک توبہ کی تحریر حاصل کر لی تھی، جس کی فوٹو کاپی اور دیگر تفصیل ارسال خدمت ہے اسے اپنے مؤقر جریدہ "چٹان" میں شائع فرما دیں۔

دوسرا ایک ضروری اعلان اپنی طرف سے یا میری طرف سے کر دیں کہ جن لوگوں کے علم میں ہو کہ کوئی قادیانی سعودی عرب یا مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں مقیم ہے وہ ہمارے ساتھ رابطہ قائم کرے اور پاکستان اور جس ملک میں مقیم ہو دونوں کے مکمل ایڈریس ہمیں مہیا کرے تاکہ ان کے متعلق ہم ضروری کارروائی کر سکیں۔

گھر میں تسلیمات اور بچوں کو پیار، کارکنوں سے مطلع فرمائیں۔ راقم آج مدینہ منورہ روانہ ہو رہا ہے، ہفتہ عشرہ کے بعد پھر مکہ مکرمہ واپسی ہو گی اور وہاں سے دیگر ریاستوں کے دورہ کا پروگرام شروع ہو گا، برادرم فضل حق صاحب ہدیہ سلام پیش کرتے ہیں۔ فقط والسلام

دعاگو، منظور احمد عفی اللہ عنہ

المحکمۃ الکبریٰ الشرعیہ بمکۃ المکرمہ (ہائی کورٹ مکۃ المکرمہ) نے ایک قادیانی العقیدہ جوڑے محمد خان ولد قادر بخش جسٹی اور اس کی زوجہ سرداراں بی بی کی تجدید توبہ قبول کر کے پاکستان واپس جانے تک انہیں جیل میں بھیج دیا ہے۔ تفصیلات یہ ہیں:۔

مولانا منظور احمد چنیوٹی آجکل تبلیغی دورہ پر عرب ممالک کے سفر پر ہیں، انہیں [illegible] ذرائع سے اطلاع ملی کہ [illegible] تحصیل جھنگ کے ایک بہت بڑے زمیندار [illegible] محمد خان ولد قادر بخش جسٹی اور اس کی بیوی جو قادیانی العقیدہ ہیں اور سفر حج تک قادیانی مذہب پر قائم تھے، حج پر روانہ ہوئے تھے واضح رہے کہ حدود حرمین شریفین میں شرعاً ہر غیر مسلم کا داخلہ ممنوع ہے لیکن حکومت سعودی العربیہ نے قادیانیوں کی اسلام دشمنی اور ان کے گھناؤنے عزائم کے پیش نظر پوری مملکت میں ان کے داخلے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ مولانا منظور احمد نے حکومت سعودی العربیہ کو اطلاع بہم پہنچائی، کہ یہ جوڑا قادیانی ہے۔ اور حج کی غرض سے سعودی العربیہ میں داخل ہوا ہے لہذا ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ چنانچہ پولیس نے قادیانی جوڑے کو فوراً گرفتار کر لیا اور تفتیش شروع کر دی۔ تفتیش مکمل کر کے مقدمہ مکۃ المکرمہ کی ہائی کورٹ میں پیش کر دیا گیا۔ ملزم قادیانی جوڑے نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ پہلے مسلمان تھے، پھر مرتد ہو کر قادیانی ہو گئے، مگر حکومت پاکستان کے ۷ ستمبر کے فیصلے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ قادیانی واقعی کافر ہیں، لہذا ہم تائب ہو کر پھر مسلمان ہو گئے ہیں، لیکن ہم نے روانگی سے قبل ماسوائے چند عزیز و اقارب کے، رسمی طور پر کسی عالم دین یا کسی اجتماع کے سامنے اپنے تائب ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ مگر مسلمان ہو کر حج پر چلے تھے، مولانا منظور احمد کو جو شہادتیں موصول ہوئی تھیں، وہ یہی تھیں، کہ یہ سفر کرنے تک قادیانی ہی تھے۔ قادیانی جوڑے نے بیت اللہ شریف کے سامنے مولانا منظور احمد چنیوٹی صاحب کے ہاتھ پر تائب ہونے کا اعلان کیا اور اپنا توبہ نامہ لکھ دیا

کورٹ کے جج قاضی عبدالملک بن دہیش نے
یانی مذہب کو ترک کرنے اور اسلام کو قبول کرنے
یے محمد خان اور اس کی بیوی کا توبہ نامہ قبول
لیا۔ تجدید توبہ کے بعد عدالت کی اس رائے
پیش نظر کہ اس بات کا بہت شک ہے کہ
اوں نے ڈر کر توبہ کی ہے لہذا مشکوک توبہ کی
سے عدالت نے ملزموں کو واپس تک جیل
سکنے پر اکتفا کیا ہے۔ عدالت نے حکم دیا ہے
محمد خان اور اس کی بیوی کو جیل سے ہی سعو
دیا جائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معلم عبدالصمد ساعاتی
محلہ شامیہ۔ مکہ مکرمہ
سعودیہ عربیہ

توبہ نامہ

من مسمیان محمد خان ولد قادر بخش قوم بھٹی و
مسماۃ ... بی بی زوجہ محمد خان بھٹی ساکن موضع گھوڑیالہ
تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ بقائمی ہوش و حواس
بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر
جان کر مکہ مکرمہ حرم شریف میں درج ذیل حلفیہ بیان
دیتے ہیں۔ اگر ہم جھوٹی قسم کھا کر یہ بیان منافقت
سے محض اپنی جان بچانے کی نیت سے دے رہے
ہوں یا پاکستان جا کر اس بیان سے منحرف ہو جائیں
تو خدا تعالیٰ کا ہم پر قہر و غضب اور سخت قسم کا
عذاب نازل ہو، جس کے گھر بیٹھ کر ہم اس کے نام
کی جھوٹی قسم کھا رہے ہیں۔

ہم ایک عرصے سے مرزائی جماعت سے تعلق
رکھتے تھے، آج سے ہم سچے دل سے اس مذہب
اور عقیدہ سے توبہ کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں،
کہ آج کے بعد ہمارا اس جماعت سے مذہبی، سیاسی
سماجی کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، آج سے ہم
مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے قادیانی
اور لاہوری دونوں پارٹیوں کو علماء امت مسلمہ کے
اجماعی فتوے اور حکومت پاکستان کے حالیہ فیصلے
کے مطابق کافر اور دائرہ اسلام سے خارج یقین کرتے
ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ
وسلم کے بعد قیامت تک تشریعی، غیر تشریعی، ظلی
بروزی کسی قسم کا کوئی نبی نہیں ہوگا، حضرت سیدنا
عیسیٰ علیہ السلام جو کہ بغیر باپ کے مریم علیہا الصلوٰۃ
والسلام کے پیٹ سے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس
کی قدرتِ کاملہ سے پیدا ہوئے تھے آسمانوں پر
زندہ موجود ہیں اور وہی احادیث نبویہ کے مطابق
قیامت سے قبل آسمانوں سے نازل ہوں گے، جو
امام مہدی علیہ السلام (جو کہ سیدہ خاتون جنت مائی
فاطمۃ الزہرا کی اولاد سے پیدا ہوں گے) کے ساتھ
مل کر یہودیوں اور ان کے سربراہ دجال سے جنگ
کریں گے اور دجال ان کے ہاتھوں مارا جائے گا،
پھر ایک عرصے کے بعد وہ فوت ہوں گے اور حضور
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک میں دفن ہوں
گے۔

ہم اس عقیدہ کی دوسروں میں اشاعت و تبلیغ
بھی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں
اس عقیدہ پر قائم رکھے اور ہماری توبہ کو قبول فرما
لے۔ آمین

ٹنڈر نوٹس

۱۔ مندرجہ ذیل کاموں کے لیے ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جنہوں نے سال رواں کی فیس جمع کرا کے اپنے
ناموں کی تجدید کرالی ہو مہر بند ٹنڈر مطلوب ہیں۔ ٹنڈر نیچے درج شدہ تاریخ کو دن کے ایک بجے وصول کیے جائیں گے۔ اور
اسی دن اسی وقت ٹھیکیداروں یا اُن کے نمائندوں کی موجودگی میں جو بھی حاضر ہوں کھولے جائیں گے۔
۲۔ ڈاک اور تار کے ذریعہ موصول شدہ ٹنڈروں پر غور نہیں ہوگا۔
۳۔ زرِ ضمانت صرف چالان خزانہ یا منظور شدہ بنک کے ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں قابل قبول ہوگا۔ کوئی مشروط ٹنڈر
قابل غور نہ ہوگا۔
۴۔ کام کی تفصیلات زیر دستخطی کے دفتر میں اوقات کار میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔
۵۔ زیر دستخطی کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی ٹنڈر یا تمام ٹنڈروں کو بغیر وجہ بتائے مسترد کر دے۔
۶۔ ٹنڈر فارم سرکاری مقررہ فیس ادا کر کے جو قابل واپسی نہیں، ٹنڈر وصول ہونے کی تاریخ کے علاوہ کسی روز بھی زیر دستخطی
کے دفتر سے اوقات کار میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
۷۔ کسی فرم یا کمپنی کی طرف سے دیئے گئے ٹنڈروں کے ساتھ جوڈیشل کاغذ پر مختار نامہ لگانا ضروری ہے۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ	زرِ ضمانت	میعاد	تاریخ
	مکی ڈی روڈ کے ساتھ ٹولیوں پشتے کی تعمیر				
۱	میل ۲۳ تا ۳۰ میں پشتہ بندی گروپ ۱۷	۱۵۰۰۰ لاکھ	۳۰۰۰۰/-	۶ ماہ	۱۳ ۳/۷۵
۲	میل ۳۰ تا ۳۶ میں پشتہ بندی گروپ ۷	۱۵۰۰۰ لاکھ	۳۰۰۰۰/-	۶ ماہ	۱۳ ۳/۷۵

ایگزیکٹو انجینئر
ہائی وے ڈویژن گوجرانوالہ

مالک رام

غالب کے اثرات

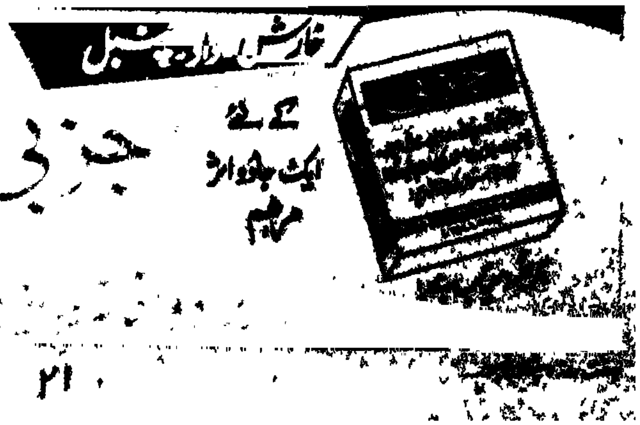
یہ عام خیال صحیح نہیں ہے، کہ غالبؔ کی اس کے اپنے زمانے میں کافی قدر نہیں ہوئی، جہاں تک فن کا تعلق ہے اس کی قدر ہوئی، اور خوب قدر ہوئی۔ اس کا بیّن ثبوت اس کتابوں کا بار بار اشاعت پذیر ہونا ہے، اس کی تمام اہم کتابیں اس کی زندگی میں ایک سے زیادہ مرتبہ شائع ہوئیں، اس کا اُردو دیوان تو پانچ مرتبہ چھپا اور ایک مرتبہ تقریباً مکمل دیوان ایک انتخاب میں شامل کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا، جبکہ اس کے ہمعصروں کا کلام ایک مرتبہ بھی نہ چھپ سکا، اور ان میں سے بیشتر کا آج تک بھی شائع نہیں ہوا،

قدردانی اور ہردلعزیزی کا ایک پہلو شاگردوں کی تعداد بھی ہے، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک لوگ کسی کو صاحب فن استاد زبان تسلیم نہ کرتے ہوں۔ میں نے اس وقت تک غالبؔ کے کوئی (۱۴۱) شاگردوں کے حالات جمع کیے ہیں؟ یہ ملک کے دوسرے دراز خطوں مثلاً حیدرآباد سورت اور ڈھاکے کلکتے تک میں ملتے ہیں۔

کسی صاحبِ علم شخص کی مثال روشن چراغ کی ہوتی ہے کہ اس کی روشنی اور نور سے اس کے قریب لوگ تو مستفید و مستنیر ہوتے ہی ہیں، دور کے لوگ بھی حسب توفیق و صلاحیت اور باندازہ جرأت اس سے کسب فیض کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ قلت مسافت کے لحاظ سے قریب کے لوگوں کو استفادے کے مواقع آسانی سے مہیا ہوتے ہیں اور پھر اس سے باہر کے علاقے کے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے شاگردوں میں (۱۴) حضرات دلّی کے رہنے والے ہیں۔ اس کے بعد سب سے زیادہ تعداد اُتر پردیش کے شاگردوں کی ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھی اس زمانے میں آمد و رفت اتنی آسان نہیں تھی، نہ ابھی رسل و رسائل کی سہولتیں ہی مہیا ہوئی تھیں ــــ یوپی کے لوگوں کے لیے دلّی پہنچنا نسبتاً آسان تھا اس کے علاوہ خود غالبؔ دو مرتبہ رامپور گئے۔ ان دونوں سفروں میں آتے جاتے میرٹھ میں ضرور ٹھہرے ہوں گے ؟ اس کے علاوہ بھی کم از کم ایک سفر میرٹھ کا پتا چلتا ہے، جب وہ اوائل میں اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے گئے ہیں تو وہ یو۔ پی کے مختلف شہروں مثلاً کانپور، لکھنو، باندہ بنارس، الٰہ آباد وغیرہ بڑے شہروں میں ٹھہرے ہوں گے، جہاں بھی ان کا قیام رہا، لازماً وہاں کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے ہوں گے جو بعد کے زمانے میں اور استوار ہو گئے، لیکن وہ یہ زمانہ ہے جب ان کی شہرت عام نہیں ہوئی تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، لوگ ان کے کمال فن کے معترف اور ملکہ شعری کے مرتبہ شناس ہوتے گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ابتدائی عمر کے تعلقات اس پہلو سے مفید اور معاون ثابت ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ اسی سے کم و بیش (۶۰) شاگرد یو۔ پی کے ہیں۔ سب سے زیادہ یعنی (۱۲) آگرے میں۔ اس کے بعد (۹) رامپور میں اور پھر میرٹھ میں اور مارہرہ میں چار چار مرادآباد سکندرآباد، سہارنپور، سہسوان میں تین تین، بلگرام، بدایوں، لکھنؤ، بریلی، مرزاپور میں دو دو اور پھلی شہر بنارس، جہانگیرآباد، غازی پور، اصفی پور، قنوج وغیرہ میں ایک ایک۔ اس سے معلوم ہوگا، کہ یوپی کے تقریباً تمام مشہور علمی مرکزوں میں مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔

ان کے شاگردوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں نواب ناظم والیٔ رامپور، صاحبزادہ بیتاب رامپوری سید محمد جمشید علی خان جم مرادآبادی، شیفتہ اور ان

۳ مارچ ۸۵ء



کے فرزند رشید نواب محمد علی خاں [illegible] اسرار اور روساء بیدل بیہار شریفی، قاضی عبدالرحمٰن تحسین صفیر بلگرامی، جوشش تنولی کے سے علماء و فضلاء اور غلام محمد خاں تپش کے سے صحافی، نفتہ کے سے فارسی داں اور شاعر، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کی اس صوبے کے مختلف حصوں میں موجودگی سے یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں کتنا اضافہ ہوا ہوگا اور یہاں جتنی تہذیبی اور ثقافتی ترقی آج ملتی ہے، اس کی نشوونما اور ارتقا میں ان کا کتنا ہاتھ ہوگا۔ مولتن کی طرح شاعر اور ادیب بھی زیادہ عرصہ تک اکیلا نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ علم و فضل خواہ کتنا ہی منکسر مزاج اور متواضع طبع کیوں نہ ہو ضرور ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی شعاعیں اپنے اردگرد کے دھندلکے کو چیر کر تمام فضا کو منور کردیں۔ علم طبعاً عزلت گزیں اور گوشہ نشیں ہوتا ہے، وہ جلوت پر خلوت کو ترجیح دیتا ہے اسے نمائش سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کا ماحول صالح ہے تو ناممکن ہے کہ اس کی خوشبو سے تشنہ کامان علم و ادب کے دماغ معطر نہ ہوجائیں۔ لوگ خود ان کے پاس آتے اور مستفید ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ اصحاب بے ریا اپنی ذات سے اک انجمن بن جاتے ہیں۔ غالب کے یہ شاگرد بھی اس پوری ریاست میں پھیلے ہوئے تھے، تو ہم آسانی سے تصور کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے ذریعے شعر و ادب کا چرچا یو۔پی میں پیدا ہوا ہوگا اور وہ شمع جو غالب نے روشن کی تھی، اس نے پورے صوبے کے دور دراز کے علاقوں کو بھی منور کیا۔

غالب کی ترقی پسندی، جدت نوازی اور اپنے زمانے سے آگے ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسے اخباروں اور رسالوں سے بہت دلچسپی تھی، اس کے خطوط میں دلی اور آگرے، لکھنؤ اور کلکتے کے بلا مبالغہ بیسیوں رسائل و جرائد کے نام ملتے ہیں خود انہوں نے بعض رسائل میں مضمون شائع کیے، اور لسان القات اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ہدایت ملتی رہتی تھی [illegible] کی، کہ فلاں چیز اخبار میں چھپا دی جائے جو اخبار اور رسالے انہیں پسند تھے وہ انہیں قیمتاً خرید لیتے تھے اور ملک کی علمی و ادبی، سرکاری اور سیاسی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لیے ان کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں اور دوستوں میں بھی ہمیں بعض صحافی اور اخبار نویس حضرات کے نام ملتے ہیں مثلاً غلام محمد خاں تپش ہیں، یہ پہلے منشی نول کشور کے اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے، پھر یہاں سے الگ ہو کر اپنا ہفتہ وار جریدہ "مشیر قیصر ہند" جاری کیا یہ بہت دن تک چھپتا رہا اور اس کا اپنے زمانہ کے اچھے اور مؤقر پرچوں میں شمار تھا، سید جمشید علی خاں جم مرادآبادی، غالب کے ایک اور شاگرد ہیں، بڑے صاحب علم بزرگوں میں سے تھے، اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے انہیں تاریخ اور صحافت سے خاص دلچسپی تھی، اس کی ذوق کی تسکین کے سبب انہوں نے "جام جمشید" اور "روہیل کھنڈ پنچ" دو رسالے جاری کیے، ایک اخبار بلند اختر بھی ان کی سرپرستی میں نکلتا تھا، ان تینوں کا حلقۂ اشاعت خاصا وسیع تھا اور یہ اپنے زمانے کے مقبول پرچوں میں شمار ہوتے تھے، غالب کے ایک اور شاگرد منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی کا آگرے سے [illegible] وہ مطبع سے شائع کرتے رہے، پندرہ روزہ مجلہ "معیار الشعراء" اور ماہانہ رسالہ "مفید خلائق"، بعد کو انہوں نے اس ماہانہ رسالے کے ساتھ ایک ہندی ضمیمہ "سروپ کارک" بھی شامل کردیا تھا، اسی طرح حکیم اظہر حسن خاں احسن رامپوری نے ہفتہ وار "خورشید آفاق" پیلی بھیت سے جاری کیا، پھر ان شاگردوں میں سے بہت سے دوسرے صوبوں میں گئے، جو آبر اور شبیر بھوپال گئے، صفیر بلگرامی بہاولپور میں بس گئے، بعض حضرات حیدرآباد دکن کی علم پروری اور قدردانی فن و ہنر کا شہرہ سن کر وہاں پہنچے اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے، لیکن جو شخص جہاں بھی گیا وہ اپنے استاد کا والہ و شیدا رہا اور اس کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔

غالب کا اثر ملک میں بالعموم اور یوپی میں بالخصوص ایک اور ذریعے سے بھی پھیلا، اس کے مکتوب الیہم میں متعدد حضرات یو۔پی کے رہنے والے تھے خاندانِ اجتہاد میں مولوی سید محمد مجتہد العصر، مفتی محمد عباس عزیز لکھنوی، خواجہ مرزا حاتم علی مہر، خواجہ غلام غوث بے خبر، منشی نولکشور لکھنوی سے ان کے تعلقات

باقی صفحہ ۲۲ پر

خطوط

مولانا سید محمد داؤد غزنوی

مکرمی! السلام مسنون۔ گزشتہ دنوں مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کی شخصیت پر ابوسلمان صاحب کا مضمون دیکھنے میں آیا۔ اس مضمون سے مولانا مرحوم کی شخصیت کے متعدد گوشے سامنے آ گئے۔ بلاشبہ مولانا غزنوی مرحوم ایک بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے اور اپنی شخصی وجاہت، دینی فقاہت اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے۔ مجھے مولانا مرحوم کو دو بار دیکھنے کا موقع ملا ہے بلکہ ان کی تقریر سننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں ان سطور میں اپنی سعید یادوں کی جوت جگانے کی سعی کر رہا ہوں۔

۱۹۶۱ء کے وسط میں ہری پور شہر میں مقامی جمعیت اہلِ حدیث کے رفقاء نے ایک دینی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا غزنوی مرحوم تشریف لائے۔ انہوں نے سوز و گداز میں کچھ ڈوبے [illegible] انداز میں تزکیہ نفس پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ [illegible] میں انہوں نے کہا کہ تعلق باللہ میں استواری پیدا [illegible] کے لیے اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کے خلاف [illegible] ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر دین کے [illegible] [illegible] سے احتراز برتا [illegible] چھوٹی چھوٹی خامیوں سے صرفِ نظر کیا جانے [illegible] کا نتیجہ [illegible] [illegible]

فقہائے کرام اور ائمہ دین کے گستاخ نہیں بلکہ انہیں ائمہ ہدیٰ سمجھتے ہیں اور ان کے حق میں ذرہ بھر سوئے ظن کو بھی سراسر معصیت تصور کرتے ہیں۔ مولانا مرحوم کی نکتہ آفرینی ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر دوسرے مذاہب کے لوگ تین کی تقلید نہ کرنے کے باعث گستاخ نہیں کہلا سکتے تو ہم چاروں کی تقلید نہ کرکے گردن زدنی کیوں ہیں اور کیونکر طعن و تشنیع کا مورد ٹھہرائے جاتے ہیں۔

دوسری دفعہ مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم کو نتھیا گلی سے متصل کالا باغ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا مرحوم ایک دینی کانفرنس میں شمولیت کی غرض سے یہاں تشریف لائے تھے چنانچہ مولانا مرحوم کی تقریر بھی سنی اور کچھ دیر ان کی معیت میں بیٹھنے کا موقع بھی ملا۔ ہوا یوں کہ مولانا کالا باغ کے قریب [illegible] میں دھوپ سینک رہے تھے کہ میں نے موقع کو غنیمت گردانتے ہوئے مولانا کو جا لیا۔ جونہی بات چیت کا آغاز ہوا تو میں نے سید مرحوم سے محمود احمد عباسی مرحوم کی کتاب خلافت معاویہ و یزید کے سلسلہ میں استفسار کیا۔ اس پر مولانا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے عباسی صاحب کی تحقیق کے منفی اسلوب پر کڑی تنقید کی اور ان کی کاوش کو ایک گستاخانہ جسارت سے تعبیر کیا جس میں کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر اپنے مخصوص مقصد کی آبیاری کی گئی ہے۔ اس موقع پر مولانا مرحوم حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ کی مظلومیت کا تذکرہ کرتے ہوئے [illegible]

[illegible]

انہیں رب کریم نے ایک وجیہہ و شکیل اور متین شخصیت کا مالک بنایا تھا۔ ان میں توازن بھی تھا اور اعتدال بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اختلافی مسائل میں انتہا پسندانہ نقطہ نظر کے حامل نہ تھے۔ وہ خوفِ خدا سے سرشار تھے اس لیے قرآن حکیم کی تلاوت کرتے وقت اور اسلاف کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑتے۔ کاش ہمارا مقدر ہوتا اور ہم ان گنج ہائے گراں مایہ کی خبر اس خاک سے لے سکتے۔

عتیق الرحمٰن صدیقی

ہری پور ہزارہ

میں حنفی العقیدہ مسلمان ہوں

جناب احسان الحق طور کا بیان

السلام علیکم۔ ہفت روزہ چٹان کے ۲۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں محکمہ تعلیم پنجاب کے کچھ افسران کی فہرست شائع ہوئی تھی جنہیں قادیانی بتایا گیا ہے۔

اس فہرست میں میرا نام بھی شامل ہے۔ میں آپ کی اور آپ کے قارئین کی اطلاع کے لیے تحریر کر رہا ہوں کہ میں سنی العقیدہ مسلمان ہوں اور میرا یا میرے اہل خاندان کا قادیانی مذہب سے نہ کبھی تعلق رہا ہے اور نہ ہے۔

براہ کرم یہ تردید اپنے موقر جریدہ میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں تاکہ اس سلسلہ میں کسی قسم کا ابہام دور ہو۔

آپ کا مخلص

احسان الحق طور

[illegible] لاہور

آزادی کا تذکرہ

ہندوستان کی جنگ آزادی میں [illegible]

[illegible] ۱۸۵۷ء

[illegible] شاعروں اور صحافیوں [illegible] ہے وہ تمام یا بیشتر لیکن ایسے بہت سے [illegible] صحافیوں کا کوئی مبسوط تذکرہ اب تک مرتب نہیں کیا جا سکا۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات افسوسناک حد تک محدود ہیں۔

خوش قسمتی سے ابھی ایسے افراد موجود ہیں جنہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لینے والے قلم کاروں کو قریب سے دیکھا ہے۔ ایسے اخبارات و رسائل جا بجا ابھی موجود ہیں جن سے ضروری معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ اس نوع کے مواد کو محفوظ کرنے کے لیے ایک ایسا تذکرہ زیر ترتیب ہے جو تحریک آزادی میں عملی حصہ لینے والے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے مستند حالات اور ان کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل ہوگا۔ ایسے شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کے حالات بھی اس تذکرہ میں درج کئے جائیں گے جنہوں نے تحریک آزادی سے متعلق کوئی ایسا مضمون لکھا ہو، یا نظم کہی ہو جو ضبط کر لی گئی ہو۔

ناظرین سے استدعا ہے کہ اس موضوع سے متعلق ضروری مواد مندرجہ ذیل پتے پر بھیجنے کی زحمت فرمائیں یا اس موضوع سے متعلق کوئی مواد ان کے علم میں کسی ادارے یا فرد کے پاس ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ تذکرے میں اس گرانقدر علمی تعاون کا مناسب طور پر بصد شکریہ ذکر کیا جائے گا۔

علی جواد زیدی

۱/۹۳۔۵ ستیہ مارگ، نئی دہلی ۱۰۰۱

خلیفہ ربوہ کے نام

محترمی!

ہدیۂ اسلام مسنون۔ میں ذیل کی چند سطور آپ کے موقر جریدہ کی وساطت سے خلیفہ ربوہ مرزا ناصر احمد تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں گے۔

جناب مرزا صاحب

میں نے گزشتہ چار سالوں میں سینکڑوں درخواستیں دستی و بذریعہ ڈاک آپ تک پہنچائیں تا کہ جو ظلم و ستم آپ کے ایما پر ہم لوگوں پر ہو رہا ہے وہ بند کیا جائے لیکن آپ کی طرف سے نہ تو کوئی جواب ہی موصول ہوا اور [illegible]

نہ ہی وہ سلسلہ ظلم و ستم بند ہوا۔ [illegible] کے ذریعہ آپ سے چند سوالات [illegible] ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی ان کا جواب اخبار ہی میں دیں گے۔

۱۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں آپ نے مجھے ملازمت سے کیوں نکلوا دیا۔

۲۔ ۱۹۵۸ء میں نصرت گرلز ہائی سکول کی ہیڈمسٹریس امۃ العزیز عائشہ (حال مقیم کوئٹہ) نے آپ کے ایما پر میرے والد سے دو سفید کاغذات پر دستخط کروا لئے۔ اور انہیں بتایا یہ گیا کہ ان کی ترقی کے کاغذات ہیں۔ بعد ازاں ان کے حاصل کردہ دستخطوں کی آڑ لے کر انہیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔ اور ایک ماہ کی تنخواہ معہ پراویڈنٹ فنڈ ضبط کر لی۔

۳۔ ۱۹۶۰ء میں ہمیں ڈرانے دھمکانے کے لیے آپ نے ڈاکو بھیجے۔ کیا یہ بھی خانہ زاد نبوت [illegible]

[illegible] کے ذریعہ میری [illegible] کروا دیا۔

۵۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے [illegible] کے باوجود اپنی اسی عقیدت کے باعث اپنے بیوی بچوں کو ربوہ میں [illegible] ہوئی تھی۔ آپ نے اور آپ کی [illegible] سازش کے تحت میرے بیوی بچوں کو [illegible] پاس [illegible] اور میرا تمام سامان [illegible] تقسیم کر دیا [illegible] کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ مذہب کے لبادے میں [illegible] ہمیشہ کے لیے [illegible] توبہ کرتا ہوں لیکن [illegible] کرتا ہوں کہ [illegible] خلیفہ ہونے کی حیثیت [illegible] اتنی اخلاقی جرأت [illegible]

عبد الحمید [illegible] لاہور۔

تحریر: [illegible]
سیکرٹری ادارہ ادب و ثقافت پاکستان

مرزا غالب کے لطائف اور اُن کی اَدبی اہمیت

مرزا اسد اللہ خاں غالب بیک وقت بحیثیت آپ ایک بہت بڑے محقق، مفکر، عظیم شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ آپ کی زندگی میں جو دو پہلو [illegible] [illegible] تھا۔ انہوں نے تفریح کے لیے بھی جس ادب کو تخلیق کیا وہ بھی اپنے اندر ادب کا ایک لازوال خزانہ لیے ہوئے ہے۔ یہ خصوصیت ہر انسان میں موجود نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ملکہ ہے جو قدرت عطا کرتی ہے۔ غالب چونکہ ایک معزز خاندان سے تھے اس لیے آپ کے بچپن کا زمانہ انتہائی امارت اور لاڈ پیار کے سائے میں گزرا۔ یہی وہ وجہ تھی جس نے آپ کی طبیعت میں بلا کی شوخی اور شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ وہ ظرافت اور شوخی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

غالب کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ اکثر بات سے بات پیدا کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ آتا تھا۔ جس طرح آپ کے مکاتیب کو اردو ادب میں ایک منفرد اور اعلیٰ حیثیت حاصل ہے بالکل اسی طرح آپ کے لطائف بھی اپنے اندر ادب کے بیش قیمت [illegible] ہوئے ہیں۔ آپ کے لطائف پڑھ کر جہاں انسان [illegible] مرزا کی ذہانت سے [illegible] ہوتا ہے وہاں ادب کی [illegible] غالب کے لطائف کی سب سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] لطائف پڑھ کر ہم غالب کے قریب [illegible] [illegible] [illegible] کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔ آئیے مرزا غالب کے چند انتہائی خوبصورت لطائف سے ہم بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۱۸۴۷ء میں مرزا غالب کو ایک انتہائی بدنام اور رسوا کن واقعے سے دوچار ہونا پڑا یعنی آپ کو قمار بازی جیسی بڑی لعنت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ۶ ماہ سخت قید کا حکم ہوا مگر ڈاکٹر راس کی سفارش سے تین ماہ بعد رہائی مل گئی۔ جب قید سے رہا ہو کر گھر آئے تو کالے میاں (آپ کے مکان کا مالک) کے مکان میں آکر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے کسی نے آکر قید سے چھٹنے کی مبارکباد دی تو اس وقت مرزا غالب نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔"

کیا خوبصورت پیرایہ میں اپنی شخصیت کو بیان کیا ہے۔ اس لطیفہ میں زندگی کی مسلسل مصیبت اور شکوہ کا رونا ہے مگر دیکھئے انداز کیا ہے!

جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لیے رام پور گئے چند روز پہلے جب نواب کلب علی خاں مرحوم کو نواب لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی جانا ہوا۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے مرزا صاحب سے رسماً کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے جواب دیا

"حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھے خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"

مرزا کی حسن ذہانت دیکھئے طبیعت میں کتنا [illegible] ہے [illegible]

ایک اور خوبصورت لطیفہ [illegible] مرزا کی [illegible] کا جواب مرزا کے [illegible] میں اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے مرزا سے کہا۔

"حضرت آپ نے اس کتاب کا جواب نہیں لکھا۔" مرزا نے فوراً جواب دیا "اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"

دیکھئے ایک اشارے اور کنائے سے تمام مخالف کو کیسی پتہ کی بات کہہ دی ہے۔ لطیفہ کی حیثیت اپنی جگہ برقرار ہے مگر اس میں وسعت خیال کی بھی بلندی ہے۔ اس لطیفہ سے ایک بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مرزا فحش اور اخلاق سے گرا ہوا ادب بالکل پسند نہ کرتے تھے اور ایسے ادب کے تخلیق کرنے والوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو گدھا ہی کہہ دیا ہے۔ یعنی انسان نما گدھا۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو!

کالے میاں کے جس مکان میں وہ رہتے تھے اس میں ایک کمرہ غالب کے لیے وقف تھا جو مکان کے بالکل دروازے کے اوپر تھا، اس کمرہ میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمیوں کے موسم میں دس بجے سے تین بجے تک وہاں بیٹھا کرتے تھے رمضان کا مہینہ تھا اور گرمی بھی جوبن پر تھی۔ اس وقت آپ کسی دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کو مرزا سے ملنے اسی جگہ پہ آئے جہاں مرزا چوسر کھیل رہے تھے۔ مولانا نے "حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان میں شیطان قید ہوتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا ہے۔" مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید ہے، وہ یہی کوٹھری ہے۔"

داد دو کہ اعتراف بھی کیا تو گنہگاروں کے
ساتھ کس ظرافت سے اپنے گناہ کا اعتراف
کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ دیکھیے کتنی بڑی بات ہے
لطیفہ کی صحت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لطیفہ
جگہ مزاح اور ہنسی کے خزانے لٹا رہا ہے۔

ایک دفعہ باغ حیات بخش میں بادشاہ بہادر شاہ
کے ساتھ آپ بھی ٹہل رہے تھے۔ آموں کا
موسم تھا، مرزا بار بار آموں کی طرف دیکھتے کیونکہ
وہ آموں کے انتہائی شوقین تھے۔ آپ کے اس
طرح آموں کی طرف بار بار دیکھنے پر بادشاہ نے
کہا۔

"مرزا آموں کی طرف اتنے غور سے کیوں
دیکھتے ہو؟"

مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کی:

"پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے:"

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں
کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

"یہ یہی دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور
میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے کہ نہیں؟"

اسی روز بادشاہ نے ایک بہنگی عمدہ عمدہ
آموں کی مرزا کے گھر بھجوائی۔

دیکھیے اس میں کس قدر شوخی اور ظرافت
ہے مگر اس شوخی کے پردے میں انہوں نے اپنی
طلب پالی ہے، لطیفہ اپنے تمام تقاضے پورے
کر رہا ہے۔

یہ لطیفہ انتہائی خوبصورت ہے، ملاحظہ ہو!
حکیم رضی الدین جو مرزا کے نہایت قریبی دوست
تھے آم نہیں کھاتے تھے، ایک دن مرزا کے ساتھ
بیٹھے ہوئے تھے کہ پاس سے دو گدھے گزرے
راستے میں آموں کے چھلکے پڑے تھے ایک گدھے
نے چھلکوں کو سونگھا، پھر چھوڑ دیا۔ اس پر حکیم
رضی الدین بولے:

"دیکھیے آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں
کھاتا۔"

مرزا نے جواب دیا:

"بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

اس حاضر جوابی کی خوبصورتی کی جتنی بھی
داد دی جائے کم ہے۔ لطیفہ ہے کہ ادب کی چاشنی
سے بھرا ہوا ہے، انتہائی مہذب ہونے کے ساتھ
مزاح سے بھرپور ہے۔ انسان لطیفے کا لطف لے
کر خود بخود قہقہہ لگاتا ہے۔ غالب کی نثر نگاری کی
یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

ایک دفعہ آپ اپنے ایک شاگرد کے گھر میں
گئے، طبیعت خراب تھی، پلنگ پر لیٹ گئے
میر مہدی مجروح بھی اس وقت وہاں تشریف
رکھتے تھے، غالب کی بہت عزت کرتے تھے۔
جب انہوں نے دیکھا کہ مرزا طبیعت کی خرابی
کی وجہ سے کراہ رہے ہیں تو مرزا سے کہنے لگے،
کہ "میں آپ کے پیر داب دیتا ہوں۔"

مرزا نے جواب دیا:

"بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار
کرتا ہے۔"

مہدی نے کہا اگر

"ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت
دے دیجیے گا۔"

مرزا نے کہا،

"اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

جب انہوں نے پیر داب دیئے تو مرزا سے
اجرت طلب کی، مرزا نے جواب دیا:

"کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے
میں نے تمہارے پیسے دابے، برابر ہوا۔"

سبحان اللہ کس بلا کی ظرافت اور شوخی
ہے، ادب کی چاشنی ملاحظہ ہو کہ لفظ دابنا کس پہلو
سے استعمال کیا ہے، باتیں عموماً شاعر اور ادیب
محنت کے بعد کیا کرتے ہیں، مگر غالب کا کمال
یہ ہے کہ باتوں باتوں میں انتہائی بلند باتیں کہہ
جاتے ہیں، لطیفہ ظرافت اور شگفتگی کا حسین پیکر
ہے اور نقل مناسبت اتنی ہے کہ جتنی بھی داد دی
جائے کم ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ ایک دفعہ
مرزا بیٹھے ہوئے تھے، غروب آفتاب کا وقت تھا
اور شام کا کھانا مرزا تناول فرما رہے تھے اس
وقت کھانے میں صرف شامی کباب ہی تھے
مولانا حالی رومال سے بار بار کبابوں پر سے مکھیاں
جھل رہے تھے ان کو دیکھ کر مرزا نے کہا:

"آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں
میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔"

مولانا حالی کے ساتھ مرزا کی شوخی اور بے
تکلفی دیکھیے، لطیفہ کیا ہے، ایک بے ریا اور بے
تکلف دوستی کی نشانی ہے۔ ایک دفعہ سید سردار
مرزا مرحوم شام کے وقت مرزا سے ملنے آئے
تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس جانے لگے تو مرزا
خود شمع دان لے کر لب فرش تک ان کے ساتھ
آئے تاکہ وہ روشنی میں جوتا پہن سکیں۔ سید سردار
نے کہا:

"قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی،
میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا ہوں۔"

مرزا نے جواب دیا:

"میں آپ کا جوتا دکھانے کے لیے شمع دان
نہیں لایا، اس لیے لایا ہوں، کہ کہیں آپ میرا جوتا
نہ پہن جائیں۔"

قاری یہ لطائف پڑھ کر ظرافت اور مزاح
سے بے شمار حظ اٹھا چکا ہے مگر یہ لطائف
صرف ظرافت اور شوخی و شگفتگی ہی کی حد تک
محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بھی ہیں
ان میں ایک طرح کی شائستگی ہے جس میں غالب
کی پہلو دار شخصیت کا ایک انتہائی بہتر پہلو
اور وہ ہے ان کی ظرافت، شوخی، شگفتگی اور
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بقیہ: جامع مسجد دہلی ۸

ہیں لیکن انہیں ۵۰۲ روپے ماہوار تنخواہ باقاعدہ دی جاتی ہے۔ چار سال قبل نومبر میں مسجد کی آمدنی کا حساب پیش نہ کرنے کی بنا پر سید عبد اللہ بخاری کی تنخواہ روک لی گئی۔ انہوں نے اس غصے میں جامع مسجد کے دوسرے ملازمین کو تنخواہ نہ لینے پر آمادہ کیا اور مسجد کے منبر و محراب کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ بنا لیا۔ جس سے مسلمانوں کے باہمی خلفشار کی فضا پیدا ہو کر تیز ہو گئی۔ جب وقف بورڈ نے سید عبد اللہ بخاری سے مسجد کی محولہ بالا آمدنی پر اعتراض کیا تو انہوں نے تجویز پیش کی کہ بورڈ اور ان کے درمیان یہ آمدنی آدھی آدھی تقسیم ہو جایا کرے۔ بورڈ نے اس تجویز کو رد کر دیا اور تمام آمدنی کا حساب پیش کرنے پر زور دیا۔ لیکن سید عبد اللہ بخاری آپے سے باہر ہو گئے اور بورڈ کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ہندوستان میں خود مسلمانوں کی تحریک پر ۱۹۵۴ء میں وقف ایکٹ بنا تھا۔ اور کسی گوشے سے اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی تھی کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی مسجدوں، خانقاہوں اور مدرسوں کو ایک مرکزی نظام کے باعث ان تخریبی عناصر سے تحفظ مل گیا تھا جو ان کی تاراجی کا باعث ہو کر قابض ہو جاتے تھے۔ اس ایکٹ کی رو سے وقف بورڈ کو جامع مسجد کے امام مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ آجکل ہندوستان میں اوقاف اور زراعت کے وزیر آزاد ہند فوج کی شہرت کے مالک جنرل شاہنواز ہیں۔ ان کی اُجلی سیرت پر کوئی داغ نہیں۔ اس قدر معلومات ہمیں خود حاصل ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے نہ صرف مہاتما گاندھی کو دہلی کے مسلمانوں کی شبانہ روز بربادی سے آگاہ کیا بلکہ بعض تاریخی مسجدوں اور خانقاہوں سے بول و براز کے اُس ڈھیر کو خاکروبوں کی طرح اپنے سر پر اٹھا کر صاف کیا جس ڈھیر نے ان عبادت گاہوں کو منتقمانہ غضب کے تحت بیت الخلاء بنا رکھا تھا۔

ہم یہاں سے اپنے ذہنی مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جنرل شاہنواز کے پہلو میں ایک عظیم انسان اور ایک سچے مسلمان کا دل ہے۔ سوال اصل یہ ہے کہ امامت موروثی عہدہ ہو سکتا ہے؟ اور مسجد کی آمدنی اماموں کی موروثی آمدنی ہو سکتی ہے؟ ہمیں یاد ہے کہ دہلی کی دوسری بڑی مسجد ــــ مسجد فتح پوری جہاں شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ درس دیا کرتے تھے ــــ کی امامت کا سوال پیدا ہوا کہ یہ موروثی ہے یا نہیں تو یہ مسئلہ عدالت کے سامنے گیا اور ہندوستان بھر کے تمام علماء سے فتوے حاصل کئے گئے کہ امامت کے حدود و شرائط کیا ہیں۔ ان فتووں کی بنا پر ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا کہ امامت شرع کے اصولوں سے طے کی جاتی ہے اور موروثی نہیں ہوتی۔ لیکن سید عبد اللہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور کسی صفائی یا سمجھوتے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے چھ سات سو افراد کی بھیڑ لے کر وقف بورڈ کے اجلاس پر حملہ کر دیا۔ جو جامع مسجد سے کہیں پرے ایک دوسری عمارت "بچوں کے گھر" میں ہو رہا تھا۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں یتیم خانوں کے لیے "بچوں کا گھر" استعمال کیا جاتا ہے اور اردو میں یتیم خانہ کہنا اور لکھنا ممنوع ہے۔ سید عبد اللہ بخاری کی اس جوشیلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دس مسلمانوں کی جانیں قربان ہو گئیں۔ سینکڑوں مسلمان گرفتار ہوئے۔ ڈیڑھ کروڑ کا نقصان ہوا۔ دو تین درجن دکانیں جلا دیئے گئے اور کئی دن کرفیو نافذ رہا۔ جس سے لاکھوں افراد کو پریشانی ہوئی۔

نوبت یہ آپہنچی کہ مسلمانوں کی اس باہمی چپقلش نے تخریبی عناصر کو غلط کاریوں کا حوصلہ دلایا۔ یوپی میں مسلمانوں کے معاملہ میں پہلے ہی سرد مہر ہے۔ اُس نے خوب کھل کھیلے۔ اور شرمناک پہلو یہ ہے کہ جن سنگھ، آر۔ ایس۔ ایس اور بھارتیہ لوک دل ایسی جماعتیں جنہیں مسلمانوں کے خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے سید عبد اللہ صاحب کی طرفدار ہو گئیں۔ ان کی دلچسپی صرف یہ تھی کہ خون بہے اور نقصان ہو۔ ظاہر ہے کہ طرفین مسلمان تھے۔ نقصان انہی کا ہوتا تھا۔ اب یہ تکرار اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ سید عبد اللہ (نائب امام) جامع مسجد کے خلاف خود مسلمانوں میں ایک جوش و خروش پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ "نوائے وطن" انبالہ و سہارنپور کے ایڈیٹر قاری محمد اسحاق نے بعنوان "دہلی کے امام بے ضمیر کے نام" تحت الذکر نوٹ کے ساتھ مندرجہ ذیل نظم لکھی ہے۔

"دہلی کی مسجد کا نائب امام جو مسلمانوں کے غم میں سوکھ کر "دنبہ" بن گیا ہے، کچھ دنوں سے انسانیت، اخلاق شرافت اور تہذیب کا جنازہ اپنے کاندھے پر رکھ کر مسجد کے منبر اور حوض پر "شیطانی رقص" میں مصروف ہے۔ یہ نظم اسی ضمیر فروش نائب امام کی سوقیانہ حرکتوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔"

مجھ کو کہنا ہے یہ تجھ سے اے امام بے ضمیر
کیوں سمجھتا ہے غداروں کو تو اتنا حقیر
کیوں اُلجھتا ہے تو ان سے اے سگِ دنیا بتا
تجھ سے کیا چھینا انہوں نے کیا بگاڑا ہے تیرا
نفرت و بغض و حسد کا بن گیا ہے کیوں نقیب
زہر ان کا گھولتا ہے کیوں فضا میں بدنصیب
حال تیرا ہو گیا کیا، الحفیظ و الاماں!
بر سرِ منبر نہیں اچھی تری یہ گالیاں
چھوڑ کر طوفاں اُٹھانے سے تجھے کیا فائدہ
آگ نفرت کی لگانے سے تجھے کیا فائدہ

ملقد ہے آج تیری گرمیِ گفتار کا
حال روشن ہے مگر سب پہ ترے کردار کا
دوسروں پر طعنہ زن ہونے سے پہلے غور کا
کس قدر ہیں مائلِ پستی ترے فکر و نظر
کس طرح ملت پہ گذرے پچھلے ستائیس سال
کیوں نہ پہنچی تیری پیشانی پہ یہ گردِ ملال
آدمیت کا چمن افسوس جلتا ہی رہا
تیرا حلوہ مانڈہ لیکن روز چلتا ہی رہا
دامِ تزویر و ریا میں دم بدم پھنستا رہا
قوم پہ ٹوٹی قیامت تو مگر ہنستا رہا
یک بیک یہ آگیا کیوں تجھ کو ملت کا خیال
کیا حقارت سے کہیں جھٹکا گیا دستِ سوال
چاہتا تھا تو جسے وہ چیز ہاتھ آئی نہیں
جو مرادِ خاص تھی تیری وہ بر آئی نہیں
سچ بتا کیا واقعی تجھ پر ستم ڈھایا گیا
کیا کسی در سے سوالی بن کے ٹھکرایا گیا
اپنی ذاتی منفعت کے واسطے اے ابن شر
اہلِ ایماں کو نہ اپنے ملک میں بدنام کر
لا رہا ہے بہرِ ملت جو تباہی دیکھ لے
دیکھ لے ہاں اپنے ماضی کی سیاہی دیکھ لے
کھیل بچوں کا نہیں سمجھے یہ امامت کا مقام
تجھ کو کیا معلوم یہ ہے منصبِ خیر الانام
آج اس منصب کو لے بدبختیوں سے وا نہ کر
بلکہ دشمنِ ملت بیضا میں تو پیدا نہ کر

ان حالات کو پڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ ہمارا سر ندامت سے جھک گیا ہے کیا ہندوستان کے مسلمان بلا تفریق عقیدہ ومسلک اپنے اعمال و اشغال پر نظرِ ثانی کریں گے۔

ہم حتی الامکان ہم جیسے کسی کے طرفدار نہیں ہمارے دل میں دونوں گروہوں کا احترام ہے۔ اسی بنا پر ہم گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے عوام کو سیاسی عزائم کے چہرے کا غازہ نہ بنائیں بعض لوگ اِس قسم کی روایتوں اور حکایتوں سے اپنی سیاسی حکایتیں سجاتے رہیں لیکن مدد کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ کیا ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کرو کا اصول فراموش کر دیا ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

بقیہ: طلباء اور پولیس

وہ حکم کے تحت کیا۔ اب کھوج اس امر کا لگانا چاہیئے کہ طلبہ اور اسلحہ کیونکر اکٹھا ہو گئے۔ حکومت نے مخبروں کی اطلاع پر اعتماد کیا اور جب تلاشی لی گئی تو اس کا جواز قائم ہو گیا۔ اپنی جگہ یہ درست ہے کہ تمام تر طلبہ کے جذبات مجروح ہوئے۔ جن طلبہ سے اسلحہ نکلا وہ عشاریہ ایک فی صد بھی نہ تھے۔

حقیقۃً اسلحہ رکھنے والے طالب علم اس صورت حال

اشتہار زیر آرڈر ۵ رول ۲۰، ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب زبدۃ الحسین سول جج / وجج فیملی کورٹ سمندری۔

مقدمہ نمبر ۲۱۷ آف ۱۹۷۴ء

اعادہ حقوق زن شوئی

اکبر علی ولد علم الدین قوم آرائیں۔ ساکن چک نمبر ۳۷۲ دیہہ محمد پور تحصیل سمندری ضلع لائلپور (مدعی)

بنام بشیراں بی بی دختر لال دین قوم آرائیں۔ ساکن واں آدھن ڈاک خانہ خاص تحصیل چونیاں ضلع لاہور

اشتہار بنام، مسماۃ بشیراں بی بی دختر لال دین قوم آرائیں ساکن واں آدھن ڈاک خاص تحصیل چونیاں ضلع لاہور

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسماۃ بشیراں بی بی دختر لال دین مذکورہ دیدہ دانستہ تعمیل سمن سے گریز کرتی ہے اور روپوش ہے، اس لیے بذریعہ اشتہار اخبار بنام مسماۃ بشیراں بی بی مذکورہ جاری کیا جاتا ہے کہ اگر وہ مقررہ تاریخ ۹ مارچ ۱۹۷۵ء بوقت ۹ بجے حاضر عدالت اصالتاً یا وکالتاً حاضر نہ آئی تو اس کے خلاف کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۷ فروری ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط، سول جج وجج فیملی کورٹ

(مہر عدالت)

کو ہی تشویش کا باعث ہوتے ہیں۔ ہم سب طالب علموں کو اپنا جگر پارہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے ملک کا مستقبل اور ہماری قوم کی امید ہیں۔ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں چاہتے کہ ان کی توہین ہو یا وہ اپنی عزتِ نفس پر کوئی سا زخم محسوس کریں۔ ایک زمانہ میں پیپلز پارٹی کی ساری طاقت ہی طالب علم تھے ان کی دلجوئی پیپلز پارٹی کا فرض ہے ــــ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ طلبہ کو سیاست کی خود سرانہ چاٹ اس عہد ہی میں لگی ہے۔ اگر ہم طلبہ کو طلبہ ہی رہنے دیتے اور ان کے مسائل میں سیاسی مداخلت نہ کرتے تو لازم تھا کہ طلبہ اس طرح بے راہ رو نہ ہوتے اور نہ آپس میں متحارب ہو کر اسلحہ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ ہم نے طلبہ کو استعمال کیا۔ اب طلبہ سیاست کو استعمال کر رہے ہیں اور اس ذوق کے طالب علم زیادہ نہیں، ایک مختصر و محدود تعداد میں ہیں۔

دردمندانہ التماس

ہم عزیز طلبہ کو مشورہ نہیں دے سکتے۔ ہم ان کے لیے نہیں وہ ہمارے لیے ہیں۔ لیکن اُن سے یہ عرض کرنا ہمارا فرض ہے کہ وہ اپنے مستقبل اور اپنی تعلیم پر نگاہ رکھیں۔ اگر وہ سیاسی حوادث کا شکار ہوتے رہے تو نقصان صرف اُن کا نہیں پوری قوم اور پورے ملک کا ہے۔ اگر استادوں کی عزت طلبہ کے دل میں نہ رہے اور غصہ و اشتعال کے شعلے لپک کر وائس چانسلر تک پہنچ جائیں تو یہ کوئی خوبی نہیں۔ آخر طلبہ یہ محسوس کیوں نہیں کرتے کہ اب وائس چانسلر وہ نہیں جو کبھی تھے اور اُن کا وقار و اقتدار تھا۔ اب وائس چانسلر محض ایک عہدہ ہے اور یہ قول یا فعل سے ان کو [illegible] [illegible] پچھلے عہد سے طلبہ کے لیے [illegible] شکم کے لیے ہیں۔ جس دن طلبہ نے یہ محسوس کر لیا اُس دن شاید انہیں بہت سے عہدیداروں کے خلاف کوئی شکایت نہ رہے گی۔

ہم اگر وائس چانسلر ہوں، آزاد سمجھے تو اُن سے یہی عرض کرتے کہ اُن کی عزت طلبہ سے ہے وہ ان کے کسٹوڈین ہیں اور، طلبہ کو صرف محبت سے جیت سکتے ہیں۔

تیل کے بحران کا اقتصادی اور سیاسی پہلو

عرب ممالک اسرائیلی مقبوضہ علاقوں کا مکمل انخلا چاہتے ہیں

سعودی عرب کے وزیر برائے پٹرولیم شیخ ذکی یمنی نے دھمکی دی ہے کہ تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک مجبوراً اپنے تیل کی پیداوار میں کمی کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے تیل کی آمدنی کا مناسب استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ مناسب استعمال کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہی خواہش نہیں ہے کہ مغربی ممالک میں ان کے لگے ہوئے سرمائے پر مناسب شرح سے سود ملتا رہے بلکہ ان کا مقصد عرب ممالک کی جلد از جلد صنعت بندی ہے، جس میں ترقی یافتہ ملکوں کی تکنیکی مہارت کا تعاون ہو۔

گزشتہ سال اکتوبر میں عرب ممالک نے اس سمت پہلا قدم اُٹھایا تھا کہ ترقی یافتہ ملکوں کو یہ سبق دیا جائے کہ جو ترقی انہوں نے اپنی صنعت میں تیل کے سہارے کی ہے۔ اس میں تیل پیدا کرنے والوں کا بھی حصہ ہے اور کتنا حصہ ہے یہ طے کرنے کا حق ان کو بھی ہے اور اس بات کا بھی حق ہے کہ اپنی تیل کی دولت اپنی معاشی ضرورتوں کے اعتبار سے استعمال کریں نہ کہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے ہی مفاد میں اس کا استعمال ہو، اور اس سبق دینے کی ہمت ان میں اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی، کہ مغربی ایشیا کے بحران نے عربوں میں اتنی یک جہتی پیدا کر دی تھی کہ مشترکہ اقدام کرنے کا تصور ہو سکا۔

سب سے پہلا قدم انتہا پسند کرنل قذافی نے اُٹھایا اور لیبیا کے تیل کے چشموں سے تیل نکالنے والی کمپنیوں کے ۵۱ فیصد حصے قومیا لیے، اور معاوضہ کھاتوں میں درج قیمتوں پر دیا نہ کہ موجودہ بڑھتی ہوئی قیمتوں پر، اور پھر رفتہ رفتہ انہوں نے سب ہی بیرونی کمپنیوں کو بے دخل کر دیا اور اپنے سب ہی تیل کے چشمے قومیا لیے۔ ان کمپنیوں میں متعدد اقوامی دیو قامت اجارہ دار کمپنیاں تھیں، جو سارے عالم کے تیل کے کاروبار پر چھائی ہوئی ہیں، ساتھ ہی ساتھ کرنل قذافی نے اپنے تیل کے دام بھی بڑھا دیئے۔

شاہ ایران اور خلیج فارس کی دوسری تیل پیدا کرنے والی ریاستیں جن میں سعودی عربیہ سب سے زیادہ تیل پیدا کرتی ہے، تیل کے دام بڑھا رہی تھیں اور ایک طرح سے اقتصادی نو تنظیم کی مانگ کر رہی تھیں۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ صنعتی ترقی کی جان تیل ہے۔ پٹرول صنعت میں دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو توانائی کے وسیلے کی طرح، ساری مشینیں تیل سے چلتی ہیں، وہ بھی اب تیل سے چلتی ہیں کیونکہ تیل کا نکالنا کوئلے کی نسبت بہت زیادہ آسان ہے، ایک پائپ ڈال دیا گیا اور تیل نکلنے لگا، جب کہ کوئلے کے لیے مستقل کھدائی کی ضرورت ہے، جس میں مشینوں کے ساتھ ساتھ محنت کشوں کو لگانا پڑتا ہے، جن کی مزدوری اور آسائشوں کا انتظام روز بروز قیمتی ہوتا جا رہا ہے، اس طرح تیل کوئلے سے بہت سستا پڑتا ہے اور تیل کی بار برداری اور استعمال بھی بہت آسان ہے اور اس کی ذخیرہ اندوزی بھی اتنی ہی آسان ہے، اس لیے رفتہ رفتہ بہت سی کوئلے سے چلنے والی مشینیں بھی تیل سے چلنے لگیں ریلیں بھی اب تیل یا بجلی سے چلتی ہیں، چھوٹے پیمانے پر بجلی بھی تیل سے ہی بنائی جاتی ہے۔

دوسرا استعمال تیل کا کچے مال کی طرح ہے۔ پلاسٹک کا سب ہی سامان اور لباس کے لیے مختلف قسم کے مصنوعی دھاگے اور ریشے۔ اس طرح ۳ ہزار سے زیادہ اقسام کا سامان ایسا بنتا ہے، جس میں تیل کچے مال کی طرح استعمال ہوتا ہے اور اگر تیل نہ ملے تو لاکھوں کارخانے بند ہو جائیں اور تیل کی قیمت بڑھتی ہے تو یا تو مصنوعات کی قیمت اسی تناسب سے بڑھے یا مزدوری اور مزدوروں کے فلاحی کاموں میں کٹوتی کی جائے یا کمپنیوں کے منافع میں کٹوتی ہو، صنعتی ترقی یافتہ ممالک، جن میں سب سے پیش پیش امریکہ اور اس کے حلیف مغربی ممالک ہیں اور جاپان ہے۔

عربوں کے سستے تیل کے سہارے اپنی معیشت آسمان پر پہنچا چکے ہیں اور ان میں سالانہ رفتار ترقی میں آپس میں مسابقت ہے، اس طرح تیل کے بحران سے پہلے جاپان کی رفتار ترقی ۱۰ فیصد سالانہ تھی، اس کے معنی یہ تھے کہ اس کی مصنوعات کی پیداوار اور اس سے آمدنی ۱۰ فیصد بڑھ رہی تھی اور تجارت میں ادائیگی اسی نسبت سے اس کے حق میں فاضل تھی اس مسابقت کی مار گھوم گھام کر ترقی پذیر ملکوں پر پڑتی ہے اور یہ فاضل آمدنی انہیں کے حلق سے نکالی جاتی ہے، تیل پیدا کرنے والے ممالک، جن میں عرب ممالک بھی شامل ہیں، زیادہ ترقی پذیر ہیں اور استحصال کا شکار ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں جو معیار زندگی ہے جو آسائشیں وہاں کے عوام کو حاصل

ہیں وہ سب ان کے تیل کے سہارے ہیں اور معیار زندگی کا یہ فرق معمولی نہیں ہے، صرف توانائی کے وسائل کے استعمال ہی کی نسبت ایک اور چالیس کی ہے۔ اس لیے جب تیل پیدا کرنے والے ممالک تیل کے دام بڑھا دیتے ہیں اور اپنے تیل پر اپنا اختیار بڑھانا چاہتے ہیں تو وہ اقتصادی نو تنظیم کی مانگ کرتے ہیں اور اسے سیاسی جنگ کہنا دھاندلی ہے اور اصل مسئلے کو چھپانے کی کوشش ہے۔

مگر اس مسئلے کا حل بغیر اقتصادی اور سماجی انقلاب کے ناممکن ہے، مغربی ممالک میں اور امریکہ میں سرمایہ داری نظام کمپنیوں کے نفع میں کمی نہیں کر پاتا، محنت کشوں کا معیار زندگی جس سطح تک پہنچ چکا ہے، اس سے گرایا نہیں جا سکتا، اگر اس کی کوشش کی گئی تو ان ملکوں میں انقلاب آ جائے گا ——— نتیجتاً تیل کے دام بڑھنے سے مصنوعات کی قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہے جس کا بار قوتِ خرید پر پڑتا ہے اور مصنوعات کی مانگ کم ہوتی ہے۔

اس لیے عالمی معیشت میں اس وقت بحران ہے اور کساد بازاری کا بھوت ہر ترقی یافتہ ملک کے سامنے ہے۔ امریکہ میں بیروزگاری بڑھ رہی ہے، جاپان کی رفتار ترقی صفر ہو گئی ہے اور اس بحران میں لوگوں کی نگاہیں اپنے رہبروں کے عمل اور کردار کی جانچ کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وزیر اعظم تناکا کو استعفا دینا پڑا، اس سے پہلے برطانیہ کے ہیتھ اور جرمنی کے ولی برانٹ کو مستعفی ہونا پڑا تھا، یہ سب بالواسطہ نتیجے ہیں، اس معاشی بحران کے جو تیل کے دام بڑھنے سے وجود میں آیا ہے۔

مگر عرب ممالک کا ایک مسئلہ اور ہے جس رفتار سے ان کا تیل اکتوبر ۱۹۷۳ء سے پہلے نکل رہا تھا اگر ویسے ہی نکلتا رہے تو ۱۹۸۵ء تک ان کا تیل کا خزانہ خالی ہو جائے گا اور تیل سے کمائی ہوئی دولت عالمی بینکوں کے رحم و کرم پر ہو گی، جو سکوں کی قیمت کی کتر بیونت کا شکار رہتی ہے، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس بدون کے آنے سے پہلے ہی وہ بھی ایسے ہی ترقی یافتہ ہو جائیں، جیسے دوسرے ترقی یافتہ ممالک ہیں، یعنی ان کی صنعت بندی اسی معیار کی ہو جائے۔

یہ تو تیل کے بحران کا اقتصادی پہلو ہے مگر اسرائیل عرب تنازعے نے اس میں بہت گہرا سیاسی مسئلہ بھی پیدا کر دیا ہے، جس کے واضح نقوش شاہ فیصل نے اکتوبر ۱۹۷۳ء میں امریکی سفیر کو روشناس کرایا تھا انہوں نے کہا تھا کہ تیل کی آمدنی کی کھپت ہماری معیشت میں نہیں ہے، اس لیے تیل زمین سے نکالنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے ہم اسی قدر تیل زمین سے نکالیں گے، جس کی آمدنی ہماری معیشت میں کھپ سکے، اب اگر امریکہ اور اس کے حلیف چاہتے ہیں کہ ہم ان کے مفاد کے لیے تیل زمین سے نکالیں، تو آپ کو چاہیئے کہ ہمارے موافق حالات پیدا کریں، اسرائیل سے عرب علاقہ واپس کرائیں، اور یروشلم کو عربوں کے انتظام میں دیں۔

شاہ فیصل نے کہا تھا کہ ان کی تمنا ہے کہ اس دنیا کو چھوڑنے سے پہلے یروشلم کی مسجد میں نماز پڑھیں اور وہاں وہ نماز اسی وقت پڑھیں گے جب وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہو گی، اور اس اعلان کے بعد انہوں نے تیل کی نکاسی میں تخفیف کا بھی اعلان کر دیا تھا، جس سے توانائی کا عالمی بحران پیدا ہو گیا اور یورپی ممالک اور جاپان اس سے بدحال ہو گئے تھے، اس کے بعد کسنجر کے دورے ہوئے جن میں مذاکرات ہوئے اور امیدیں پیدا ہوئیں، کہ امریکہ اسرائیل کو اس کی حدوں میں پابند کرنے میں کامیاب ہو گا، مگر حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے گئے اور اب مغربی ایشیا پھر ایک اور جنگ کے دہانے پر کھڑا ہے، امریکہ نے اقتصادی خوشحالی کے جو سبز باغ عرب ملکوں کو دکھائے تھے، ان کا پورا ہونا کیا، ان کی ابھی بنیاد ہی نہیں پڑی، نہر سوئز تو صاف ہو گئی، مگر سادات اعلان کر چکے ہیں کہ وہ چالو اس وقت تک نہیں ہو گی، جب تک اسرائیل تخلیہ کا دوسرا قدم نہیں اٹھائے گا۔

اور ادھر عرب ممالک نے فلسطینی آزادی تنظیم کو فلسطین کی جلا وطن حکومت کا درجہ دے کر امریکہ اور اسرائیل کی دھوکے کی ٹٹیوں کو مسمار کر دیا اور مغربی ایشیا کا جو اصل مسئلہ تھا، اسے واضح طور سے سامنے لا کھڑا کر دیا۔

اس پس منظر میں یمنی کا یہ اعلان کہ وہ پھر تیل کی نکاسی میں تخفیف کرتے جا رہے ہیں پوری طرح تیل کی جنگ چھیڑنے کا اعلان ہے

آخر ستمبر میں شاہ فیصل سے نیوز ویک کے ایڈیٹر ارنوڈ ڈی بورش گریو نے ایک انٹرویو لیا تھا، جس میں انہوں نے مغربی ایشیا کے حالات سے متعلق اپنی

اشتہار زیر دفعہ ۵، رول ۲۰، مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب آفتاب سرور کاشمیری صاحب سول جج درجہ اول، جج فیملی کورٹ و رینٹ کنٹرولر سرگودھا

مقدمہ نمبر ۲۳۹ سال ۱۹۷۴ء

عبدالرحمٰن ولد کاکا قوم آرائیں ساکن ۵۸ جنوبی، تحصیل و ضلع سرگودھا

بنام کلثوم (مدعا علیہ)

دعویٰ زنا شوئی

بنام: کلثوم اختر دختر محمد شفیع زوجہ عبدالرحمٰن قوم ارائیں ساکن موضع محمد یعقوب نمبر ۲۲۵ تلکہ میر پور خاص

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں سماۃ مدعا علیہا مذکورہ تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتی ہے، اور روپوش ہے، اس لیے اشتہار ہذا بنام مدعا علیہا مذکورہ جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہا مذکورہ تاریخ ۶ مارچ ۱۹۷۵ء کو مقام سرگودھا حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہو گا تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۱۰ ماہ فروری ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج درجہ اول

(مہر عدالت)

سے بیشی کا اظہار کیا تھا، انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کے پس منظر میں ہمیں شیخ یمنی کے موجودہ اعلان کو سمجھنا ہے، اس انٹرویو کا کچھ اقتباس دیا جاتا ہے۔

س: سعودی عربیہ اور امریکہ کے درمیان خصوصی رشتہ ہے، اور اس رشتہ کو تمام میدانوں میں دفاع عمل، ٹکنالوجی میں وسعت دی جا رہی ہے اور اس رشتہ کو اس خاص رشتہ کے برابر بتایا جا رہا ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد برطانیہ اور امریکہ کے درمیان تھا یہ رشتہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا، یا اس کے قیام کا دارومدار مشرق وسطیٰ میں خاطر خواہ سمجھوتا کرانے کی امریکی صلاحیت پر ہوگا؟

ج: ظاہر ہے کہ اس کا دارومدار تصفیہ پر ہے اور یہ تصفیہ مقبوضہ علاقے کا مکمل انخلاء، عربی یروشلم پر عربوں کا اقتدار اعلا اور فلسطینیوں کے حق خود اختیاری اور اپنے وطن میں واپس آنے کے حق سے ایک شتہ کم نہ ہوگا ہم دھمکی نہیں دے رہے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ مخصوص رشتہ دونوں ملکوں اور ساری عرب دنیا کے حق میں مفید ہے اور ہم اس رشتہ کو کامیاب بنانے کے لئے حتی الوسع سب کچھ کریں گے لیکن امریکیوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اسرائیلی ضد کریں گے اور غصب کیے ہوئے علاقے سے چپکے رہیں گے تو کوئی رشتہ ٹھیک نہیں رہ سکتا۔

س: یہ قیاس کیا جا رہا ہے کہ موسم بہار سے پہلے مغربی ایشیا میں کوئی بحران نہ پیدا ہوگا کیا آپ کے خیال میں یہ قیاس صحیح ہے؟

ج: گزشتہ مہینوں میں کافی قیمتی وقت ضائع ہو چکا ہے اگر اس زمانے میں دباؤ میں کچھ کمی آگئی ہے اور اہمیت اور ضرورت کا احساس کچھ کم ہوگیا ہے تو مجھے اس بات کا افسوس ہے، اور میں اسے خطرناک سمجھتا ہوں، میں امید کرتا ہوں اور اس بات کے لیے دعا کرتا ہوں کہ امریکہ اسرائیل کو ہوش میں لانے اور تخلیہ کرانے میں کامیاب ہوگا۔

س: کچھ عرب رہبروں سے بس نے بات کی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ صرف اسی وقت عمل پیرا ہوتا ہے جب بحران کا سامنا ہوتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک امریکی دباؤ اسرائیل پر اس وقت پڑے گا، جب پھر امریکہ کا سابقہ دوسرے بحران سے ہوگا۔

ج: میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کو اس بات کا شعور پیدا ہوگا کہ وہ بغیر بحران کے ہی اسرائیل سے جلد مکمل تخلیہ کرا دیگا کیونکہ یہ کام اگر بغیر بحران کے نہیں کرایا جاسکتا تو دوسرا بحران پہلے سے کہیں زیادہ سخت ہوگا

س: کیا آپ اسرائیل سے تخلیہ کرانے کے لیے تیل کا حربہ پھر استعمال کرنے کے لیے تیار ہیں؟

ج: ہم اپنے دوستوں کے خلاف تیل کی بندش لگانا نہیں چاہتے لیکن ہمارے دوستوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی حکمت عملی کا مفاد کس طرف ہے، یہ فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔

س: میں نے سُنا ہے کہ آپ اپنے فاضل پٹرو ڈالر امریکہ میں طویل المیعاد معاملوں میں اس وقت تک نہ لگائیں، جب تک اسرائیل مقبوضہ علاقوں کا مکمل تخلیہ نہ کر دے گا۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج: میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا، جس سے امریکہ کو گزند پہنچے، لیکن اگر ہمارا مخصوص رشتہ برقرار رہے تو امریکہ کو بھی کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہیئے اور عرب علاقہ پر اور عربی یروشلم پر غاصبانہ قبضے کا دستور جاری رہتا، صرف ہم کو تکلیف نہیں پہنچا رہا ہے بلکہ بین الاقوامی فضا کو زہر آلود کر رہا ہے۔

س: آپ کے خیال میں دوسرا قدم کیا ہونا چاہیئے

ہفت روزہ چٹان لاہور

اُردن کے مغربی ساحل سے تخلیہ یا سینائی کے علاقے میں مزید تخلیہ ؟

ج : دوسرا قدم مقبوضہ علاقوں کا مکمل تخلیہ ہونا چاہیے جزوی حل نا مناسب ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ مسئلے کے حل کی طرف انتہائی قدم اُٹھایا جائے۔

س : آپ کے خیال میں اس پر کتنا وقت لگے گا ؟

ج : ہم تو یہ چاہیں گے کہ اسرائیل عرب علاقہ کو چھوڑ دے، جہاں تخلیہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ (اس) امریکہ چاہے تو اسرائیل میں اس بات کا شعور پیدا کر سکتا ہے اور اہمیت کا احساس دلا سکتا ہے اگر چند ہفتوں میں اس پر عملدرآمد ہو سکتا ہے ہم اس کے لئے تاریخوں کا تعین نہیں کرنا چاہتے۔ مگر اکتوبر کی جنگ کو ایک سال ہو گیا اور یہ اُمید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ غازہ تخلیہ اس سال کے اختتام سے پہلے ہی شروع ہو جائے گا۔

س : جنگ ہوگی ؟ یا آپ کے خیال میں بات چیت کے ذریعہ کسی حل پر پہنچا جا سکے گا ؟

ج : میرا اندازہ یہ ہے کہ اسرائیلی فوجی ٹولہ پانچویں جنگ کے لئے تیاری کر رہا ہے۔ عرب فوجوں پر ناگہانی حملے کا، جسے وہ اپنی فوجی حکمت عملی کی بہت پسندیدہ منزل کہتے ہیں، امریکی فوجی امداد جو برابر جاری ہے ان کے حوصلوں کو بڑھاتی رہتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ نے اس علاقہ میں اور تمام عالم میں کچھ سیاسی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، اسرائیلی فوجی رہبر پھر جنگ کے ذریعے ان تبدیلیوں کو اپنے موافق بدلنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے میں ابھی اس بات کو ممکن نہیں سمجھتا کہ کوئی پُرامن حل جو منصفانہ بھی ہو، نکل آئے گا، کیونکہ اسرائیل اور امریکا اور سب ہی مغربی ممالک ابھی فلسطینی عوام کو نظر انداز کرتے ہیں، فلسطینی عوام کے حقوق ہی اصل مسئلہ ہیں اور بغیر فلسطینی عوام کے اس کا قیام ممکن نہیں ہے، ممکن ہے ایک سمجھوتہ ہو جائے جو مسئلہ کا جزوی حل ہو، مگر اس سے امن نہیں قائم ہو سکتا کیونکہ پوری صلح اور امن تو فلسطینی عوام کے قومی حقوق کی پوری حفاظت کر کے ہی ممکن ہے — بغیر اس کے امن ناممکن ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے مگر حقیقت ہے جو سارے عالم کو سمجھنا ہے اور خاص طور پر فرانسیسی عوام کو سمجھانا ہے، وہ فرانسیسی عوام جن کا تمدن سارے عالم میں پھیلا ہوا ہے۔

بقیہ : شیخ سعید اختر

کے انفاظلکم اور مطالب وسیع ہوتے وہ زبان و بیان کے دھنی تھے۔ ان کا دل ایک مسلمان کا دل تھا۔ وہ ایک سچے پاکیزہ اور مثالی مسلمان تھے۔ وہ ایک عظیم دوست تھے۔ ان کی دوستی پر اعتماد اور ان کے اخلاص پر ناز کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک جید قانون دان تھے۔ وہ زمانہ قریب تھا جب وہ ملک کے چار دس چوٹی کے وکلاء میں سرفہرست ہوتے۔ وہ ایک فقید المثال محب وطن تھے۔ انہیں پاکستان سے اتنی محبت تھی جتنی ایک ماں کو اکلوتے بچے سے ہوتی ہے۔ ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ سیاست کا اتار چڑھاؤ کما حقہ سمجھتے تھے اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ ہر گوشے سے آگاہ

ہو گئے۔ اس دنیا میں قدم رکھتے ہی بیاد عصر یاستدان ہو گئے۔ یہ دن ان کی محنت کے دن تھے۔ ابھی تو انہوں نے سفر حیات شروع کیا تھا، وہ بعجلت اپنے اللہ کے ہاں چلے گئے۔ اُن کا مقام اعلیٰ علیین میں ہے اللہ کی رحمتوں نے انہیں اپنے آغوش میں لے لیا ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ان کے شریک حال ہے۔ اصل غم اُن اقرباء اعزہ اور احباب کا ہے جو ان کی یاد میں رونے کے لیے رہ گئے ہیں ؎

رات دن رویا کئے شام و سحر رویا کئے
رونے والے تیرے تجھ کو عمر بھر رویا کئے

بقیہ : مولانا عبیداللہ احرار

ریاستوں کی جغرافیائی پیوستگی کو دیکھتے اور اس پر تاسف کا اظہار کرتے کہ مسلمانوں کا مشترکہ وفاق، جن میں کوئی سا فاصلہ نہیں اور ہم آہنگی کے بے شمار ذہنی رشتے ہیں، اس طرح منتشر ہے ——— وہ مسلمانوں کی دولت مشترکہ کا تصور لیکر اللہ کو پیارے ہو گئے، اس باب میں ایک حساس مسلمان کا اضطراب رکھتے اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا رہتے، کہ دنیا کا آئندہ انقلاب اسلام کے خطوط پر ہو ———

ان کی رحلت کے بعد وابستگان احرار کا مختصر قافلہ ایک اندوہ کا شکار ہو گیا، ان سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ ذہن سچا ہو تو کیونکر جیتا ہے اور دل مخلص ہو تو اس کی آرزوئیں کسقدر ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہر شخص کو مرنا ہے، وہ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے اور اپنی طبعی عمر کر اپنے رب سے جا ملے، صدمہ صرف بچھڑ جانے کا ہوتا ہے کہ ہم ایک مخلص دوست اور بے غرض رفیق سے محروم ہو گئے۔ کائنات اسی طرح چلتی رہی ہے اور چلتی رہے گی صدمہ اس کا ہوتا ہے کہ ہم لوگ دوستوں کی جس انجمن کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں وہ اُٹھ جاتے ہیں تو خلا کا شدید احساس ہوتا ہے

بقیہ: [illegible]

ہونگی ہم ایران کے ممنون ہوں گے کہ اس نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور اسے اس کو بھی مسرت ہوگی کہ پاکستان سرمایہ کا صحیح استعمال کر رہا ہے۔

دوسری پیرالائن کے مطابق پاکستان کے افغانستان سے تعلقات کے متعلق ہے کہ شہنشاہ افغانستان اور پاکستان کے مابین خوشگوار تعلقات چاہتے ہیں۔ اس نشریہ کے مطابق مسٹر ذوالفقار علی بھٹو خود بھی اس کے خواہاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان سے متعلق پاکستان نے کبھی منفی رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ اپنی طرف سے کوئی شکایت پیدا ہونے دی۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ افغانستان کی داخلی یا عالمی سیاست کی ترنگ ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ افغانستان پاکستان سے متعلق اپنی منفی سیاست پر نظرثانی کرے۔ ایک دوستانہ فضا ہی عمدہ نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ہم دونوں راہنماؤں کی ملاقات کے اثرات و نتائج کی کامیابی کے لیے پُر امید ہیں۔

بقیہ: ہندوستان کے سیاسی دماغ

بھائیوں سے دستبردار ہو جائیں، اپنے حق کا مطالبہ نہ کریں، اپنے استحکام پر نہ سوچیں اور ہندوستان کی مرضی پر چلیں۔ ہندوستان ایٹمی تجربے کرے تو حق بجانب ہے ہم اپنے لیے اسلحہ حاصل کریں تو بھارتی وزیر خارجہ فرماتے ہیں کہ سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا پاکستان کو کمزور رکھنا عالمی اخلاق ہے اور پاکستان کو کمزور دیکھنا بھارتی موقف ہے؟ اگر دوستی کے معنی یہ ہیں تو اس کا نام دوستی نہیں بلکہ دشمنی ہے ... ۱۹۷۱ء کا برطانیہ عظمیٰ نہیں اور پاکستان ریاست ... نہیں کہ ہندوستان کے سیاسی دماغ پاکستان ... کرتے رہیں اور اس کے اعمال و افکار کی نگرانی کریں ... ستان کی مضبوط بنیادوں پر مضبوط ہندوستان سے ... چاہتے ہیں لیکن اپنی خودمختاری کے خلاف اس کی ... ہمارے لیے پہلی بوجھ پہلی کے مصداق ہے۔

بقیہ: قادیانی ہذیانی

... ابوالاعلیٰ مودودی اور ایڈیٹر چٹان وغیرہ ... ہم نے قلم اٹھایا تو میرزا غلام احمد کی قبر سے ... مرزا بشیر الدین تک کی قبر پیٹ جائے گی۔

... چٹان ... بعد

آج پتے چھاؤ تو کر لیا۔ اب ہم سوادِ اعظم کے منتظر ہیں کہ وہ اس کو شرافت کا سبق دیتی ہے یا ہم اس کو عبرت کا سبق پڑھائیں۔

بقیہ: طلبہ کی گرفتاری

کی سزا جانشین کے سیاسی مزاج کو بھگتنی پڑتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ پولیس کی اس بے تدبیری کے باوجود طلبہ نے ایسا کوئی نعرہ بلند نہیں کیا جو سب و شتم سے ملوث ہو۔ ان کی زبان پر صرف ایک ہی نعرہ تھا لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی اور یہ نعرہ پنجاب کی جدوجہد کے زمانہ میں پیپلز پارٹی ہی نے ایجاد کیا تھا۔ وائس چانسلر سے تو ہم کہنا نہیں چاہتے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے اس سلوک کی ضرورت کیوں محسوس کی لیکن وزیر اعلیٰ پنجاب سے ضرور عرض کریں گے کہ وہ ان طلبہ کی گرفتاری پر غور کریں۔

بقیہ: پیپلز پارٹی سے استدعا

نہیں کرتے کہ ان کا بھی کچھ فرض ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ تمام بڑے بڑے جلسوں سے وزیر اعظم بھٹو خطاب کرتے اور وہ صبح و شام سفر کرتے ہیں۔ ان سے کتنی لیڈرشپ کے امکان کہاں ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان کی تصویروں کے خطوط مسٹر بھٹو نے کھینچے ہیں۔ ان میں رنگ و روغن مسٹر بھٹو نے بھرا ہے اور انہیں سیاسی شکل مسٹر بھٹو نے دی ہے۔ اس رعایت سے کیا ان کا فرض نہیں کہ محض حکومت کا سہارا نہ لیں بلکہ پولیس کے ڈنڈے اور پولیس کی آنسوگیس کو روک کر اپنے اسٹیج سے سیاسی مقابلہ کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ ان کے خلاف جو نکتہ چینی کی جاتی ہے اس کا جواب کیا ہے؟ آخر پارٹی اپنے قائد کی سیاسی نیابت کا حق کیوں ادا نہیں کرتی۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جمہوریت کی فصل کبھی تشدد سے بارآور نہیں ہوتی۔ وہ سیاسی آب و ہوا ہی سے پنپتی ہے۔

بقیہ: صحیح یا غلط؟

اپنے ایک بھائی کی اس بھول پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک خارج از اسلام فرقے کے اندرونی ضمیر سے بے خبر ہے۔ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ مرزائی اُمت مہرے ہلانے اور اپنا کھیل کھیلنے سے باز نہیں آتی۔

بقیہ: منظور احمد چنیوٹی

(نوٹ: بقول محمد خان، ۷ ستمبر کے حکومت پاکستان کے فیصلہ کے بعد میں نے میرزائی مذہب کو ترک کر دیا تھا لیکن میرے پاس اس کے خلاف ثبوت اور شہادتیں موجود ہیں۔

راقم منظور احمد چنیوٹی)

نشان انگوٹھا سرداراں بی بی زوجہ محمد خان

محمد خان بقلم خود

دستخط گواہان: خادم ختم نبوت منظور احمد عفا اللہ عنہ چنیوٹی۔ عبدالمجید بقلم خود ضلع سرگودھا

الحاج محمد — این ۳۱۲ کورنگی کالونی

کراچی نمبر ۳۱ — احمد شیر پنجابی

بعدالت جناب زبدۃ الحسین سول جج / جج فیملی کورٹ سمندری

مقدمہ نمبر ۹، ۱۹۷۵ء

تنسیخ نکاح

کنیز اختر زوجہ گلزار حسین (دختر خادم حسین) قوم کھوکھر ساکن سمندری شہر تحصیل سمندری ضلع لائلپور

(مدعیہ)

بنام: گلزار حسین ولد جلال الدین قوم کھوکھر ساکن موضع جسڑ تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ (مدعا علیہ)

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں تاریخ پیشی ۸ مارچ ۱۹۷۵ء مقرر ہے اور گلزار حسین مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے اس لیے اشتہار اخبار بنام گلزار حسین مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مسمی گلزار حسین بتاریخ ۸ مارچ ۷۵ء بوقت ۹ بجے بمقام سمندری حاضر عدالت اصالتاً یا وکالتاً نہ ہوگا تو اس کے خلاف کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۷ فروری ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط سول جج / جج فیملی کورٹ

مہر عدالت

۳ مارچ ۷۵ء

بقیہ: سیاسی ڈائری

کرے گا۔ مگر یہ جان لینے کے لیے کسی عمیق فکر کی ضرورت نہیں کہ یہ عمل واردات سیاست کا نہیں، امر غیر واقعہ کو ڈرامائی رنگ میں پیش کرنے کا ایک اچھوتا انداز ہے، جیسے کوئی بوڑھی دادی اماں پوتے کو سلانے کے لیے کہانی سنا رہی ہو کہ بیٹے ایک بادشاہ تھا، اُس نے ایک جن پال رکھا تھا جو وزیر کھاتا تھا اور وزیر بیٹے تو سوجا سوجا راج دلارے سوجا! میرے لال۔ اللہ تجھے بادشاہ بنائے، مگر اب نہ سوچ، اب سوجا، ورنہ وزیر پھر آئے گا اور تجھے کھا جائے گا میرے لال، سوجا نہ ڈر، ابھی وہ ایک مہینہ تک نہیں آئے گا، بادشاہ نے اعلان کیا ہے اور بیٹے جب وزیر آئے گا نا! تو جن اسے کھا جائے گا تو سوجا! تو نہ ڈر اور بیٹا خواب میں بڑبڑائے جن وزیر کو کھا جائے گا تو ہم اس کی قبر پر مقبرہ بنوائیں گے۔ مگر اس سے پیشتر اپنے اقتدار کا محل تعمیر کریں گے، ہم وزیر کے قاتل کو پکڑنے سے پہلے اپنے رقیبانِ اقتدار کو پکڑیں گے، ان کی خبر لیں گے جو کہتے ہیں ہم کتاب در بغل ہیں اور ہم کہتے ہیں، نہیں تم پستول در نیفہ ہو، تم پستول در نیفہ رہے تو ہم گھر والوں سے نیفہ کی جنگ کیونکر لڑیں گے، اس لیے اے دوران صبح کاذب جاگ جانے والے، سو جاؤ، سو جاؤ، کہ میٹھے سپنے آسکیں۔

آپ کا رفیق

بقیہ: غالب

جز رندانہ، خود انہ یا دوستانہ تھے، ان اصحاب کا اس صوبے کی ثقافتی زندگی میں جو اہم حصہ رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

یو۔پی کو ایک اور فخر بھی حاصل ہے، غالب کے اُردو خطوط کا ہماری ادبی تاریخ میں جو مقام ہے اسی پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل سے کم نہیں ہے، مختصراً یہ کہ ان سے ہماری نثر کو نئی زندگی اور توانائی ملی، اگر غالب کے یہ خطوط نہیں چھپتے، اور جاری نثر اسی فارسی اور عربی الفاظ سے بوجھل [illegible] آپ اندازہ لگا سکتے ہیں [illegible]

کرنے کا [illegible] کے حوالے کر دیا۔ منشی ممتاز علی میرٹھی جو اپنے زمانے کے مشہور خطاط اور نزہت رقم کے لقب سے مشہور اور غالباً اسی فن میں خود بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے، ایک مطبع مجتبائی کے نام سے چلاتے تھے، انہوں نے اپنے مطبع کی شہرت میں اضافہ کرنے کو غالب کے اُردو خطوط شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، چنانچہ یہ کام انہوں نے اپنے دوست اور غالب کے شاگرد چودھری عبدالغفور سرور کے سپرد کیا، غالب شروع میں خطوط جمع کرنے اور ان کے شائع کرنے کے خلاف تھے۔ بہرحال ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی پرواہ نہ کی، اور بالآخر طوعاً و کرہاً رضامند ہو گئے، یہی مجموعہ غالب کی وفات سے تقریباً چار مہینے قبل اکتوبر ۱۸۶۸ء میں "عود ہندی" کے عنوان سے شائع ہوا۔

غالب کی کتاب دستنبو، دو مرتبہ اس کی زندگی

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب سید شفقات احمد ساجد نقوی سول جج رینٹ کنٹرولر اور جج فیملی کورٹ بھلوال۔

دعویٰ تنسیخ نکاح

مسماۃ کنیز دختر نور محمد بنام مرجا

مرجا ولد نادر قوم موچی ساکن لقمان تحصیل و ضلع سرگودھا۔

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی مرجا ولد نادر مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے، اس لیے اشتہار ہذا بنام مرجا ولد نادر مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مذکور تاریخ ۷ ماہ مارچ ۱۹۷۵ء کو بمقام بھلوال حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۸ ماہ فروری ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط سول جج

مہر عدالت

میں چھپی، یہ فارسی میں ہے اور اس میں اس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے حالات مختصراً اور آپ بیتی کے کچھ حالات لکھے ہیں، یہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۸ء میں منشی شیو نرائن کے مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپی، اور دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء میں بریلی۔

غالب کا فارسی دیوان (میخانہ سر انجام) پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں دلی میں چھپا تھا، ظاہر ہے کہ یہ مکمل کلیات نہیں کہا جا سکتا، اس کا دوسرا ایڈیشن منشی نول کشور نے اپنے شہرہ آفاق مطبع سے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا، یہی آجکل مروج ہے۔

غالب کی کلیات نثر فارسی مجموعی شکل میں بھی پہلی مرتبہ لکھنؤ ہی سے شائع ہوئی، ہوا یہ کہ ۱۸۶۵ء میں منشی نول کشور دلی گئے، وہاں غالب کی خدمت میں بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے، تعلقات پہلے سے تھے ہی، انہوں نے کلیات نظم فارسی ۱۸۶۳ء میں چھاپا ہوا تھا، اسی سے انہیں جرأت ہوئی اور انہوں نے دوران گفتگو میں درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو کلیات نثر فارسی، میں بھی اپنے مطبع سے شائع کروں۔ غالب نے بہ طیب خاطر یہ درخواست منظور کی اور نواب ضیاء الدین احمد خان نیر درخشاں سے ان کا قلمی نسخہ لے کر منشی صاحب موصوف کے حوالے کیا، یہ کتاب بڑے سائز کے ۲۱۲ صفحات کو محیط ہے اور جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی، نول کشور نے ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۴ء میں اسے دو مرتبہ اور شائع کیا ایک مرتبہ اور یہ مطبع نول کشور کانپور کی شاخ سے ۱۸۷۵ء میں چھپی تھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا، کہ یو۔پی اور غالب کے تعلقات بہت گہرے اور وسیع ہیں، دونوں نے ایک دوسرے کی خدمت کی۔ غالب نے براہِ راست اور [illegible] سے یہاں کی علمی اور ادبی اور ثقافتی زندگی کی [illegible] میں نمایاں حصہ لیا اور یو۔پی [illegible] کی اشاعت میں [illegible]

چٹان
لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲ ــــ شمارہ ۱۰
۱۰ مارچ ۱۹۷۵ء
قیمت ــــ ایک روپیہ

سیاست میں تشدد اور گالی

جس ملت کے پاس اللہ اکبر کا نعرہ ہو جس کے عشق نے نعرۂ رسالت ایجاد کیا ہو جو ترنگ میں آکر یا علی کی صدا بلند کرتی ہو جس کے جیب و داماں کی پونجی اسلام ہو اور جس کا لغت بے شمار زندہ باد و پائندہ باد کے دل کشا الفاظ رکھتا ہو وہ قوم اگر سیاست کے روزمرہ بازار میں گالی بکنے پر اتر آتے، اس کے نوجوان لڑکے اور بچے سب و شتم کو شعار بنا لیں اور اس پر فخر کریں تو یہ اس قوم کے اخلاق ہی کا زوال نہیں بلکہ مستقبل کا ارتحال بھی ہے۔ ہم یہ بحث چھیڑ کر کہ اس کا آغاز کب ہوا ہم کسی جماعت کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے اور نہ کسی لیڈرشپ کو آزردہ کرنا ہمارا مقصود ہے لیکن جب [illegible] ہماری سیاست میں گالی گفتار کا عمل دخل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری نئی پود [illegible] طور پر اپاہج ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ملک خضر حیات مرحوم کی وزارت [illegible] مسلمانوں نے احتجاجی تحریک شروع کی تو گالی گلوچ کا بازار اس حد تک گرم [illegible] اخلاق کو کھلم کھلا آگ لگا دی گئی۔ اب نہ ملک خضر حیات رہے نہ وہ زمانہ [illegible] اس دور میں اشتعال کی کمی وہ نہ سیاسی تھی نہ اسلامی نہ اخلاقی اور نہ کسی [illegible] ہے کہ پنجاب کا مسلمان ملک خضر حیات کی وزارت سے [illegible] تھا اور اس کا غصہ تمام تر سیاسی تھا۔ لیکن وزارت کو شکست [illegible] ب و شتم کا الاؤ روشن کیا جاتا۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت وزارت [illegible] نے کے لیے کافی تھی لیکن قصور عوام کا نہیں تھا بلکہ ان صوبائی [illegible] گفتار کو سیاسی اسلحہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے لیکن اس سے [illegible] یہ کہ خود ان کے خلاف بھی دہرایا جا سکتا ہے اور اس اسلحے [illegible] سیادت پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان بن جانے [illegible] عرصہ بعد جب ملکی سیاست میں مختلف لہریں ابھریں تو جو لیڈر اس اسلحہ پر [illegible] تے تھے انہیں خود مختلف مرحلوں میں گالی گفتار کے زخم سہنا پڑے اور کسی دور [illegible] لیڈر ایسا نہ رہا جس نے گالیوں کا مزہ نہ چکھا ہو۔ جب ایوب خان کی آمریت [illegible] ہوا تو بعض شعلہ نوا و غلط اندیش افراد نے سیاست دانوں کو گالی دینا شروع کی لیکن بدزبانی ایک خاص طائفہ ہی میں محدود رہی۔ ایوب خان نے ڈنڈے سے حکومت کی لیکن وہ دور بھی کچھ سال بعد سامنے آ گیا جب ایوب خان کا عسکری دبدبہ خاک میں مل گیا اور گالی گلوچ کا سیلاب بہہ نکلا۔ کوئی گوشۂ ملک ایسا نہ تھا جہاں ایوب خان کو گالی نہ دی گئی ہو۔ ایک شرمناک چیز جو اس دور میں پیدا ہوئی وہ نام کے ساتھ لفظ "کتا" لگا کر ہائے ہائے کا شور و غل تھا۔ ممکن ہے اس گندہ دہنی کا مظاہرہ نہ ہوتا لیکن جب اپوزیشن کے جلسوں کو خراب کیا گیا اور پولیس نے ڈنڈا بازی کی تو لوگوں کا غصہ شعلۂ جوالہ ہو گیا اور وہ گالی گفتار میں رواں ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام میں گالی گلوچ جبر و تشدد ہی کے مظاہر پیدا کرتے ہیں۔ ایوب خان اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہو گیا کہ عوام ان کے خلاف جاگ اٹھے ہیں اور ان کا نام مبتذل سے مبتذل گالی کے ساتھ لیا جاتا ہے تو وہ اس صدمے کے ساتھ صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔

یحییٰ خان نے اپنی عسکری دھونس کے ساتھ کچھ عرصہ حکومت کی لیکن الیکشن کے زمانے میں انہوں نے سیاست دانوں کا تماشا دیکھا۔ عوام مدت مدید کے بعد اپنے ووٹ کی طاقت استعمال کر رہے تھے۔ یحییٰ خان نے اپنے گماشتوں کی معرفت اس قسم کی فضا پیدا کی جس سے ہر سیاست دان کو گالی دینا عوامی عبادت کا حصہ ہو گیا۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ خدا کے دشمن اشتراکیوں نے اپنے حریفوں کو مارنے کے لیے زبان درازوں کی پشت پناہی کی اور رسولؐ کے دشمن مرزائیوں نے اسلامی نظام کے داعیوں کی آبرو پر حملے کرائے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ بعض اخبارات نے اپنے سیاسی حریفوں کی ماں بہن تک نہ چھوڑی۔ مستقبل کا مورخ جب اس دور کے انتخابی حالات کی تاریخ لکھے گا تو وہ کانپ جائے گا کہ ماضی میں ایک ایسا دور بھی ہم پر گزرا ہے اور کوئی پڑھا لکھا شخص اس پہ فخر نہیں کر سکتا۔ گندی چیز بہرحال گندی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے حواس خمسہ درست ہوں وہ [illegible] کسی حالت میں گوارا نہیں کر سکتے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ سیاسی فضا

کی [illegible] ہو کر اب ظاہر ہو چکی ہے۔ ایک قوم کا مستقبل اس کے لیے ہوتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ وہ برہم ہوں تو ان کی زبان بھی سب و شتم میں ڈوب جاتی ہے۔ مزدور مالکوں سے بگڑ جائیں تو وہ بھی سب و شتم کا سیلاب بہا دیتے ہیں۔ غرض کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں رہا۔ جو لوگ اس سے دامن کشاں ہیں اور کسی حال میں گالی گفتار گوارا نہیں کرسکتے۔ ان کی تعداد گالی دینے والوں کے مقابلے میں کم ہے۔ اگر گالی دینے سے کوئی مثبت چیز حاصل ہوتی ہم کوئی معرکہ سر کرسکتے اور اس طرح کوئی محاذ فتح ہوتا تو ہم اس پر صاد کرتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح قوم ایک ہولناک ذہنی دیرانے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہم پہلے ہی سیاسی طور پر کچھ زیادہ تربیت یافتہ نہ تھے کہ اس عادت و غلاظت نے ہمیں قعرِ ذلت میں گرا دیا۔ قارئین چٹان آگاہ ہیں کہ ہم نے ختم نبوت کی تحریک میں مسلمانوں کو اس رخ پر نہیں آنے دیا اور اگر کسی جلسے میں ایسا کوئی نعرہ بلند ہوا تو اس پر حاضرین کو سختی سے ٹوکا کیونکہ اسلامی اخلاق سے دستبردار ہونا ایمان کی جانکنی ہے جب ہم بازو کی قوت، دل کے عرفان اور دماغ کی صلابت سے ارتداد کا مقابلہ کرسکتے ہیں تو گالی دشنام بازی کی خوبی نہیں۔ لہجہ کی خرابی ہے۔ غالباً ہمارے اس اخلاق و عمل ہی سے ایک مرزائی ہفتہ وار کو حوصلہ ہوا اور اس نے اپنے اس حوصلہ کو لگاتار قائم رکھ کر فحش سے فحش گالیاں بکتا رہتا ہے۔ جب گالی بکنے والے کو جواب نہ دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ جیت رہا ہے یا اس کی طاقت نے مرعوب کر لیا ہے۔ قادیانی تو کوئی طاقت ہی نہیں انہیں قلم ہی سے نہیں ہاتھ سے بھی جواب دیا جاسکتا ہے۔ اور ایسا جواب دیا جاسکتا ہے کہ عمر بھر یاد رکھیں لیکن سیاست میں تشدد اور گالی کبھی بار آور نہیں ہوتے۔ ہمیشہ وہی انسان جیتتے ہیں جو اخلاق کا دامن تھام کر اپنی جدوجہد کا سفر اور منزلِ مقصود کی طرف قدم اٹھاتے [illegible] ہم [illegible] پسند نہیں کرتے کہ جس ملک [illegible] کے ساتھ ہمارا سیاسی [illegible]

کے خلاف گالی گفتار [illegible] کریں۔ آخر [illegible] گیا ہے۔ بنگالی علاقے کٹ گئے اور وہاں [illegible] ہے۔ ایک سیاسی چیز کو سیاسی ہی رہنا چاہیے۔ جن لوگوں نے سیاست میں سب و شتم کی بنا رکھی انہوں نے قوم پر انتہائی ظلم کیا۔ ہم ایک شریف قوم ہیں۔ ایک اللہ کے ماننے والے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ جب ہم اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ ہم اپنی قوم کے تمام راہنماؤں، خطیبوں، ایڈیٹروں، دانشوروں عالموں اور واعظوں سے گزارش کریں گے کہ وہ قومی اخلاق کی حفاظت کریں۔ جب بچے بازار میں سیاسی مظاہروں کا آغاز گالیوں سے کرتے ہیں تو اس سے خوشی نہیں ہوتی، رنج ہوتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے کہ دوسروں کے بتوں کو برا نہ کہو تاکہ وہ تمہارے سچے خدا کو برا نہ کہیں۔ رہا تشدد کا سوال تو حیات محمد خان شیرپاؤ کا خون اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اگر ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ محمد رفیق، جاوید نذیر قیصر مولوی شمس الدین اور سردار عبدالصمد اچکزئی کے قاتل تختۂ دار پر لٹک چکے ہوتے تو آج یہ سلسلہ اس قدر طول نہ کھینچتا۔ آخر آتش گیر مادے کی مشقیں کس لیے کی جارہی ہیں؟ کیا ہمارے بھائیوں کو ذرا برابر احساس نہیں کہ پاکستان کن مرحلوں سے گزر رہا ہے؟ اور اس کے بدبخت دشمن اسے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ آج ہر پاکستانی کو اپنے دل کی تختی پر یہ نقش کرلینا چاہیے کہ ہم نہ سندھی ہیں، نہ پنجابی، نہ بلوچی نہ پٹھان، ہم مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں۔ ہم اسلام کے وفادار رہے تو پاکستان رہے گا اور پاکستان رہا تو مسلمان رہیں گے ورنہ ہم تاریخ کے صفحات سے اسی طرح محو ہوجائیں گے جس طرح ہسپانیہ کی سرزمین مسلمانوں سے محروم ہوچکی ہے

بھارتی پتنگ بازی

[illegible]

بنا دیا اور اس جماعت کے [illegible] افراد گرفتار کئے جاچکے علاوہ ۲۲ تخریب کاروں کے ایک مفرور گروہ کی تلاش جاری ہے۔ کئی ایک پمفلٹ بھی پکڑے گئے ہیں جو افغانستان میں چھپے اور چھپوائے گئے اور پاکستان کے خلاف ہیں۔ جو اسلحہ پکڑا گیا ان میں ایک مشین گن، اس کی ۸ گولیاں، دو [illegible] ۳۰۳ کی رائفلیں، ۹۰ [illegible] کارتوس ۳ میگزین، ۱۳۱ دستی بم، ۲۰۰ ٹائم بم، ۱۴۹ زہریلی سوئیاں بموں کے فیوز کچھ زہریلے کیپسول اور ۲ پونڈ دھماکہ کرنے والا مادہ ہے۔

ایک دوسری خبر کے مطابق پشاور میں گزشتہ رات بموں کے چار دھماکے ہوئے۔ بحمد اللہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ شہر کے محلہ گلاب خان میں ساڑھے تین بجے شب دو دھماکے ہوئے جن سے ایک شخص کا دروازہ اور کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ لیکن موم بتی بنانے والی ایک فیکٹری تباہ ہوگئی۔ اس کے علاوہ پشاور کے ایک نواحی علاقے میں بموں کے دو دھماکے ہوئے۔ ایک دوسری اطلاع کے مطابق خان عبدالقیوم خان کے آبائی مکان کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے دو دستی بم پکڑے گئے۔ آجکل اس مکان میں خان صاحب کے بھائی خان عبدالرؤف خان رہتے ہیں۔

تیسری اطلاع یہ ہے کہ امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد ڈیرہ غازیخان کی ایک مسجد میں خطاب کر رہے تھے کہ مسجد کی دیوار سے ملحقہ مکان میں دو بم گرے جن سے آگ لگ گئی۔ ایک آدمی زخمی ہوگیا۔ جماعت اسلامی کی روایت کے مطابق دو آدمی ایک جیپ میں سوار ہوکر آئے بم پھینکے اور جیپ بھگا کر لے گئے۔ جیپ پر کوئی نمبر پلیٹ نہ تھی۔ جماعت اسلامی کی پریس ریلیز کے مطابق پوری پولیس اور پولیس کی مسلح جمعیت موجود تھی لیکن اس نے کوئی بھی مداخلت نہ کی۔ البتہ واقعہ کے بعد ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور بموں کے خول قبضہ میں کر لیے۔ ڈیرہ غازی خان کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا عبداللہ حنیف نے ڈپٹی کمشنر [illegible] ایک تحریری درخواست میں کہا ہے کہ ۲۸ فر[illegible]

باقی ص ۴۳ پر

یوم حمید نظامی

• نظامی کے ہمعصر بہت تھے لیکن ہمسر کوئی نہ تھا۔ جسٹس عطاء اللہ سجاد

• جو لوگ اسلام سے بدکتے ہیں وہ بتائیں کہ اسلام کی نفی کے بعد انکے پاس کیا ہے۔ بروہی

• نظامی کے اداریے لذتِ وصل کی طرح مختصر ہوتے تھے،

لاہور میں دو مارچ کو شاد مان ہال میں فاضل قانون دان مسٹر اے کے بروہی کی زیرِ صدارت یوم حمید نظامی منایا گیا تمام ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ہال سے باہر ہر طرف برآمدے میں بے شمار لوگ کھڑے تھے۔ جلسہ ساڑھے دس بجے شروع ہو کر پورے دو بجے ختم ہوا۔ مختلف مکاتیبِ فکر کے چودہ دانشوروں نے جن میں اخبار فروش یونین کے صدر اور بانی بھی تھے اور ان کے علاوہ لاہور ہائی کورٹ کے ایک فاضل جج چار پروفیسر دو معروف شاعر اور تین صحافی بھی شامل تھے۔ حمید نظامی مرحوم کو اپنی تابدار تقریروں میں خراجِ عقیدت و اخلاص پیش کیا۔ تمام مقررین نے حمید نظامی مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے اسلوبِ بیان کی بوقلمونی کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا کہ:

۱۔ حمید نظامی اپنے دور کے سب سے کم عمر لیکن سب سے بڑے صحافی تھے۔

۲۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سیاست پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور ان معاملے میں سب سے آگے تھے۔

۳۔ اُن کے ہم عصر تو بہت سے تھے لیکن ہمسر کوئی نہ تھا وہ ایک مثالی کردار کے بے مثال صحافی تھے۔

...انہیں کوئی خرید نہ سکتا تھا۔

...انہوں نے صحافت کو انتہائی عروج بخشا۔

...صحافت گمنامی سے قصرِ اقتدار تک ...

...کی حوصلہ مندی کی حرمت کرتا تھا۔

...ایک موہکی سے ذرتے تھے۔

۸۔ اُن کے دل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بے پناہ عشق تھا۔

۹۔ وہ صرف اور صرف اسلام کے وفادار رہے۔

اس یادگار تقریب میں شروع سے آخر تک پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد اور حمید نظامی زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ زندہ دلانِ لاہور ایک عرصے کی خطیبانہ تشنگی کو مٹانے اور مختلف جرعوں کا لطف لینے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔ سب سے پہلے قاری غلام رسول نے تلاوتِ کلامِ پاک کی اور اُن کی قرأت سامعین کے دلوں پر نقش ہو گئی۔

پروفیسر اسحاق قریشی نے حمید نظامی کے دوستانہ عہد کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے قلم کی خوبیوں کو اپنے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

خواجہ افتخار احمد نے حمید نظامی مرحوم کے محاسنِ قلم بیان کرتے ہوئے اُس عہد کے بعض دلچسپ واقعات بیان کئے کہ ایک اندھیری رات میں اُن کا وجود روشنی کا مینار تھا۔ آپ نے بعض ایسے ایڈیٹروں کا ذکر کیا جو کراچی سے وزیرِ اعظم کا ٹیلی فون سننے پر آداب بجا لاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد باقر نے اپنے پُر شکوہ لہجے میں قلندر کی سیاست کو حکومت کے لیے خطرناک قرار دیتے ہوئے حمید نظامی کی صحافت کو جدید نسلوں کے لیے مشعلِ راہ قرار دیا۔ چوہدری رشید احمد صدر اخبار فروش یونین نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حمید نظامی قلم کی آبرو تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی مجید نظامی نے اس آبرو کو قائم رکھا اور نوائے وقت ہی ایک ایسا اخبار ہے جس پر روزانہ صحافت ناز کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے اپنے فاضلانہ مقالے میں حمید نظامی مرحوم کو جمہوریت کا علمبردار قرار دیا اور اس امر پر روشنی ڈالی کہ وہ آزادیٔ صحافت کے داعی اور آمریت کے دشمن تھے۔ آپ نے کہا اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حکومت کے مرئی و غیر مرئی دباؤ کے خلاف تھے وہ اپنے خدا اور اپنے دل کے انسان تھے۔ آپ نے پاکستانی معاشرے میں منصفانہ معاشی نظام پر اُن کے خیالات کا تاریخی پس منظر پیش کرتے ہوئے اس سلسلے میں اُن کے صادقانہ جذبے پر روشنی ڈالی۔

مسٹر زیڈ اے سلہری نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں حمید نظامی مرحوم کو زبردست خراج پیش کیا اور اس امر پر روشنی ڈالی کہ پاکستان جس بے پناہ عشق کی بدولت معرضِ وجود میں آیا تھا اُسی اساس و نظریے پر قائم رہ سکتا ہے۔ آپ نے کہا حمید نظامی پاکستان بننے کے بعد پہلے ایڈیٹر تھے جنہوں نے اُن حاکموں کی تادیب کی جو خود کو انگریزوں کا جانشین سمجھتے تھے اور جنہیں یہ زعم تھا کہ وہ عوام سے مختلف مخلوق ہیں۔ آپ نے مشرقی پاکستان کو بطور بنگلہ دیش تسلیم کئے جانے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم نے اپنی بہت سی قدریں خود غارت کی ہیں۔ آپ نے فرمایا برِ عظیم کے کروڑوں مسلمانوں

نے صرف وحدت ایک پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی لیکن بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جس بنا پر ہی ایک کاسدن سنے قرار دیا تھا وہ کو غلط ثابت بنا گئے اور کہا کہ تحریک پاکستان میں وہ الگ الگ ہو گئے تھے۔ آپ نے سوشلزم اور سیکولرازم پر بھرپور نکتہ چینی کی۔ نیز سندھو دیش کی تحریک پر اشاراتی نکتہ چینی کرتے ہوئے سندھ کے تہذیبی سیمینار پر اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس سے ملتِ اسلامیہ کی وحدت الگ الگ قومیتوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پروفیسر مرزا منور نے اپنی فکری تقریر میں حمید نظامی کے محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہ مستقبل اندیش صحافی تھے اور انہیں مختلف افکار و نظریات کا بخوبی اندازہ تھا۔ آپ نے کہا جس قسم کے حالات پاکستان کو درپیش ہیں وہ ہمیں حمید نظامی کی یاد دلاتے ہیں کیونکہ ایسے ہی حالات ہی میں وہ ہمارے لیے نوائے وقت کے صفحات میں راہنمائی کا چراغ روشن کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی تقریر میں ادبی استعاروں اور شعری تشبیہوں کی معرفت حقائق کی چہرہ کشائی کی اور سامعین کو اس امر سے روشناس کرایا کہ ہماری چھوٹی سی غلطی یا حقائق سے روگردانی ملک و قوم کے لیے کس آفت کا باعث ہو سکتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری نے اپنی طویل بیماری کی پیدا کردہ ناتوانی کے باوجود اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں حمید نظامی مرحوم کو زبردست خراج پیش کیا اور اُن کے قلم کی دل آویزیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اس فقرے سے پوری محفل کو لوٹ پوٹ کر دیا کہ حمید نظامی مرحوم کے ادارئیے لذتِ وصل کی طرح مختصر ہوتے تھے۔ آغا صاحب نے مرحوم کے بیسیوں کمالات بیان کیے اور صحافت میں اُن کی عظیم الشان روایات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے ذہنی رہنمائی کے خط و خال دو شخصیتوں سے حاصل کیے ہیں۔ میرے قلم اور میری زبان کا بانکپن انہی دو شخصیتوں کی وجہ سے ہے۔ ایک علامہ اقبال دوسرے مولانا ابو الکلام آزاد۔ لیکن صحافت کی وادی میں غیرت و حمیت کا سبق حمید نظامی سے سیکھا ہے کہ وہ اُس

ہفت روزہ چٹان لاہور

وہ پچھ عرصہ میں ہمارے لیے ایک نشان تھے۔ آغا صاحب نے کہا کہ آج بھی اُسی عزم و ہمت کا مظاہرہ ہوتا ہے اور آج حمید نظامی کی روایات کے وارث اُن کے بھائی مجید نظامی ہیں۔ آغا صاحب نے خواجہ افتخار احمد کے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اپنے مشاہدے کی بنا پر بعض خود فروش ایڈیٹروں کا ذکر کیا ہے کہ وہ وزیراعظم کے ٹیلی فون پر مرعوب ہو جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کے علاوہ بعض دوسرے دوستوں نے بھی آج کے ایڈیٹروں کی خود سپردگی کا ذکر کیا اور اس امر کا شکوہ کیا ہے کہ ایوانِ حکومت میں وہ پیش کار کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس میں اقتدار قصور وار نہیں۔ جو لوگ سیرت سے محروم ہوتے ہیں اُن سے ہر کوئی منفی سلوک کرتا ہے۔ اور جو روشن سیرت رکھتے ہیں اُن کا احترام اقتدار کے دل میں ہوتا ہے۔ اقتدار کسی کی جاگیر نہیں خدا انہی لوگوں کو دیتا ہے جو کسی خوبی کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ جدوجہد نہ بھی کریں تو اقتدار اُن کے پاس آ جاتا ہے۔ آپ نے نظامی صاحب کی موت کا سبب ملک کے ابتر حالات کو قرار دیا اور کہا کہ اُن کی وفات اگر اُس وقت نہ ہوتی تو مشرقی پاکستان کا صدمہ اُن کے لیے عزرائیل ثابت ہوتا۔ آپ نے نہایت زوردار الفاظ میں بیان کیا کہ نظامی عظمتِ کردار اور غیرتِ قلم کے حامل تھے۔ اگر وہ بکنے والے ہوتے تو اُن کے خریدنے والے خود بک کر انہیں خریدتے۔ آغا صاحب نے اپنی تقریر میں بذلہ سنجی کا بھی بازار لگائے رکھا جس وقت آپ نے یہ بیان کیا کہ حمید نظامی کے قاتلوں کو اُن کے بھائی مجید نظامی نے معاف کر دیا تو سارا ہال کھل کھلا کر مسکرا یا کسی نے مجمع میں سے آغا صاحب کے ایک فقرے میں پیوند لگانا چاہا تو آغا صاحب نے کہا کہ جان برادر تقریر سننے کی کوشش نہ کیجئے میرے لیے تقریر کرنا اور سانس لینا یکساں ہیں۔ انقلاب طالب میرے لیے بار بار اس طرح رہتے تھے جس طرح عباسی عہد میں اقتدار کی حرم سرا میں لونڈیوں کا ہجوم ہوتا تھا اس پر مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ آپ نے صرف

ایک سیاہی بات کہ ان کا شکار ہوئے ہیں عمل کی طاقت نہیں ہے۔ سامعین نے بیانی تقریر کا مطالبہ کیا تو آغا صاحب مذاق کا شکار کر کے نکل گئے۔

جسٹس عطاء اللہ سجاد نے اپنی خوبصورت تقریر میں حمید نظامی مرحوم کے اوصاف کو اجاگر کیا اور بتایا کہ بہت تھوڑے الفاظ میں اُن کی حق گوئی، پامردی، اسلام سے شیفتگی، پاکستان سے وابستگی اور خیالات کی جرات مندی پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا کہ حمید نظامی نے ہمیشہ سادہ، سلیس اور شستہ زبان استعمال کی۔ صحافت کو ایک نیا اسلوب دیا اور بے باکی کا جو چراغ مولانا ظفر علی خان نے روشن کیا تھا اُس کو بجھنے نہ دیا بلکہ اُس کی لو کو مزید تیز کیا۔

مسٹر اے کے بروہی نے نہایت شگفتہ اردو میں اپنے عالمانہ طرزِ بیان سے حمید نظامی کا ذکر کیا اور کہا کہ میں اپنے تئیں بین الاقوامی سیاسیات کا نبض شناس سمجھتا ہوں لیکن نظامی صاحب سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ وہ انتہائی فہیم و زیرک نگاہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اسلام کی حقانیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کرۂ ارض کے مسلمانوں کو ایک جسم کے مختلف اعضاء قرار دیا اور کہا کہ ہم آج کی سیاسی روایت کے مطابق قوم نہیں ہیں بلکہ امتِ محمدی ہیں۔ ایک ملت۔ جیسے جو لوگ اسلام سے بیزاری و لاتعلقی کو اپنے انفرادی تراز میں تولتے ہیں وہ بتائیں کہ اسلام کی نفی کے بعد اُن کے پاس کیا ہے۔ بروہی صاحب نے قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے اس حقیقت کبریٰ پر روشنی ڈالی کہ قرآن مجید معاشرہ انسانی کا غیر فانی منشور ہے۔ اور اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جو انسان کو ابدی راحت مہیا کر سکتا ہے۔

مولوی حبیب اللہ باقی اخبار فروش یونین نے حمید نظامی کو اپنے رواں دواں اور شستہ و رفتہ الفاظ میں خراج ادا کرتے ہوئے اُن کے قابلِ فخر کردار کے بعض واقعات بیان کیے اور بتایا کہ وہ سچائی کے مسئلہ میں کتنے ضدی و جسور تھے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

از :- ڈاکٹر سید عبداللہ

★

حکمت فرنگ کی ایک اور محرومی

غلط سیاسی فلسفہ

اقبالؒ نے حکمت فرنگ پر جو شدید تنقید کی ہے، اس کے بعض اجزاء پہلے آ چکے ہیں، یہ کہا جا چکا ہے کہ اقبالؒ حکمت فرنگ کے یک رخاپن اور اجزاء پرستی کے مخالف تھے، یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی بھی اقبال کو کھٹکتی رہی۔ آج یہ بتانا ہے کہ حکمت فرنگ کے سیاسی تصورات بھی اقبالؒ کی نظر میں انسانیت کے لیے مہلک ثابت ہو سکے۔ تفصیل اس کی آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

اقبالؒ اگرچہ خود بھی اساتذانِ فرنگ سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ اور ان کے خمستانِ فکر سے وہ سیراب ہوتے رہے۔ مگر ایسے اتفاق یا سعادتِ ازلی کی یاوری و مساعدت کہ انہیں جتنا مغربی افکار و خیالات کے مطالعہ کا موقع ملتا گیا۔ اتنا ہی ان کے ذہن میں مغربی تہذیب کے خلاف ناقدانہ ردعمل ترقی پذیر ہوتا گیا۔ اسی طرح کی صورت برگساں کو بھی پیش آئی جس قدر وہ ہربرٹ سپنسر کے مادہ پرستانہ [illegible] کا گہرا مطالعہ کرتا جاتا تھا، اسی قدر اس کے ذہن میں مادیت کے خلاف نفرت کا جذبہ بڑھتا تھا۔ اقبال جس قدر مغربی افکار کے قریب ہوتے گئے اسی قدر مغربی نظریات سے منحرف ہوتے گئے۔ [illegible] اقبال کے پختہ افکار کی [illegible] کتاب ہے۔ اس میں حکمت مغرب کے خلاف ان کی نفرت انتہا کو پہنچ چکی ہے ؎

من از میخانہ مغرب چشیدم
بجان من کہ درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی
از آن بے سوز تر روزے ندیدم

مشرق کی بے چارگی و درماندگی کے احساس نے رفتہ رفتہ اقبال کو نئے سیاسی عقائد کی تشکیل پر آمادہ کیا اور یہ نتیجہ تھا، درحقیقت مشرق و مغرب کے افکار کے آزادانہ مقابلہ و موازنہ اور امتزاج و اختلاط کا یہ ایک نیا فلسفہ سیاست تھا جو اقبالؒ سے مخصوص تھا، یہ افلاطون، ارسطو، میکیاولی، ہابز، کانٹ اور روسو وغیرہ کے تصورات پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کی تعمیر و ترتیب میں قرآن و حدیث، غزالیؒ، رازیؒ، ماوردیؒ، نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدونؒ وغیرہ کے خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کی تشکیل و ترکیب میں ان سب باتوں نے مل کر حصہ لیا ہے۔

اقبالؒ کے سیاسی فکر کا ان کی زندگی میں کچھ زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا، ملک کی فضا ان خیالات کے لیے آہستہ آہستہ سازگار ہوئی، وہ گویا حکیم فردا تھے، اگرچہ شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام تسلیم کیا جا چکا تھا، یہ صحیح ہے کہ ان کی تعلیمات کی صداقت کی کچھ علامتیں خود ان کی زندگی ہی میں نمودار ہو گئی تھیں۔ اور کچھ آہستہ آہستہ اب منظر عام پر آ رہی ہیں۔ خصوصاً قیام پاکستان انہیں کے فکر کی عملی صورت ہے لیکن یہ بات کسی حد تک افسوسناک ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک جماعت میں ان کی تعلیمات کے بارے میں اب بھی تشکیک پائی جاتی ہے اور یہ وہ رجحان ہے، جس کو اقبالؒ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بہت محسوس کیا۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ گروہ جسے وہ ایک عرصے سے مخاطب کر رہے ہیں سوز و یقین سے خالی ہے، ارمغان، ضرب کلیم اور بال جبریل میں مسلمانوں کے سب طبقوں اعلیٰ مخصوص تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے انہوں نے مایوسی اور بے دلی کا اظہار کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے رہے۔ سو اس سے تنہائیت کا احساس ان پر غالب رہا۔ چنانچہ ارمغان میں لکھا ہے ؎

شریک درد و سوز لالہ بودم
ضمیر زندگی را وا نمودم
ندانم کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

غریبم در میان محفل خویش
تو خود گو با کہ گویم مشکل خویش
از آن ترسم کہ پنہانم شود فاش
غم خود را نگویم با دل خویش

چہ لذت خویش بجستم از ین جنگ
ہر گفتند با من آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

اور نہیں کہا جا سکتا، کہ اقبال کی غایتوں سے اس کی قوم کے دانشور اب بھی آگاہ ہو گئے ہیں یا نہیں، اقبال کی غایتیں اسلامی ہیں، مگر قوم کے اہل فکر اقبال کو مغربی غایتوں کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جن کی اقبالؒ نے سخت مخالفت کی ہے

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہا، اور ان کے افکار میں مختلف حالات کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ چنانچہ "اسرار خودی" پر تبصرہ کرتے ہوئے انگریزی رسالہ "اقسیم" کے ایک مضمون نگار مسٹر فارسٹر نے بھی کہا تھا، کہ اقبال کا قدم کسی ایک راستے پر نہ رہے گا، اس اعتراض کی تائید میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال ایک زمانے میں "ہندوستانیت" کے جذبات سے سرشار تھے، جس سے متاثر ہو کر انہوں نے "تصویر درد"، "ترانۂ ہندی"، "نیا شوالہ"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" جیسی قومیت اور وطنیت سے لبریز نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی، اور انہوں نے وطنی عقیدت سے بیزار ہو کر "بلاد اسلامیہ" "ترانۂ ملی" "خطاب بہ جوانان اسلام" "شکوہ" اور "جواب شکوہ" وغیرہ ملی اور خالص اسلامی نظمیں لکھیں، اس کے بعد سرمایہ و محنت کی کشمکش میں اشتراکی خیالات کا اظہار کیا۔ پھر جب اٹلی میں فاشزم سے متاثر ہوئے تو اس کی بھی تعریف کی۔ معترضوں کے خیال میں اقبالؒ کنظر بدلتے اور نئے نئے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ [illegible]

[illegible]

جاتا ہے کہ اقبال کے سیاسی فکر کی تشکیل میں ان تجربات کا حصہ کثیر بھی شامل ہے جو انہیں اطوار سیاست عالم کے عمیق مطالعے سے حاصل ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں، کہ اقبال ایک زمانے میں بعض وطنی تحریکات کے مؤید اور حامی تھے، لیکن ان کے یہ خیالات زیادہ تر ملکی فضا اور اہل مغرب کی کتابوں کے مطالعہ پر موقوف تھے، جو انہیں ایسے مصنفین سے حاصل ہوئے جو عموماً قومیت، جمہوریت اور وطنی عصبیت کے معتقد تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ تہذیب فرنگ کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خود آشنا اور طور آشنا بھی آنکھیں کر لیتے ہیں، اقبال بھی قدرے اس سے متاثر ہوتے ہوں گے، مگر علوم مشرق کے گہرے مطالعہ اسلام اور مشرقی تمدن کی روح کے صحیح ادراک، یورپ کے رد عمل اور تمدن مغربی کے قریبی تجربے نے اس سے جلد بدظن کر دیا ؎

وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم
رہزنے بود کمین کردہ رہ آدم زد

اس نکتے کی وضاحت کے سلسلے میں یہ عرض کروں گا، کہ اقبال نے مغرب کے کلچر اور تمدن کی اس بنا پر پیہم مخالفت کی ہے، اس میں عقلیت RATIONALISM اور مادیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں بخلاف اس کے فقر و عشق کو زندگی کی اساس سمجھتے ہیں۔ اور اسی ایک چیز کو کائنات کی ترقی و وسعت کا باعث خیال کرتے ہیں۔ مغربی کلچر کے خلاف اقبال کو یہی شکایت ہے کہ اس کے تمام شعبے اسی مرض مادیت و عقلیت سے متاثر ہیں، جس کی [illegible]

[illegible]

بانگ درا، پیام مشرق، زبور عجم، اور ارمغان حجاز کا محسوس جامہ پہن کر باہر آتے ہیں اور دنیا کو متاثر کرتے ہیں، ان سب تصانیف میں ہم اقبال کو مغرب کی مادہ پرستی اور روحانیت سے بیگانگی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اقبالؒ کی نظر مغرب کے سیاسی استیلاء اور ملک گیری پر بھی رہتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ رنج انہیں مغرب کی روحانی علالتوں اور اس کی تہذیب میں عنصر کی کمی دیکھ کر ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ سادہ لوح مشرق بھی مغرب کے انہیں روحانی امراض سے متاثر ہو رہا ہے۔ اقبال اور بھی غم میں ڈوب جاتے ہیں۔

غرض اقبال کے پیغام کے مقاصد دو گانہ ہیں اولاً یہ کہ وہ مشرق کو مغرب کی روحانی بیماریوں سے بچائے۔

دوم یہ کہ یورپ کو بھی اس مرض مہلک سے آگاہ اور خبردار کر دے۔

یہاں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ "پیام مشرق" کے باب "نقش فرنگ" سے اچھی طرح واضح ہو سکے گا، جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں ؎

از من اے باد صبا گوئی بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زند آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است
عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ
آہ زان نقد گران مایہ کہ در باختہ

زبور عجم میں فرماتے ہیں ؎
[illegible]
[illegible]

مسز صوفیہ شورش
متعلمہ ایم اے (فائنل ایئر)
شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی

حمید نظامی نے نوائے وقت کو
ایک ذہن، ایک تحریک، ایک جہد اور ایک دعوت بنا دیا

برصغیر میں اُردو صحافت کے ارتقاء کی تاریخ بڑی خصوصیت کی حامل ہے۔ اس میں یک رنگی بھی ہے تضاد بھی ہے اور تنوع بھی۔ اس مختصر مضمون میں یہ بحث تو نہیں آسکتی کہ اُردو اخبار نویسی کب شروع ہوئی؟ اس نے کونسی منزلیں طے کیں اور کس مرحلے میں مختلف وادیاں قطع کرتے ہوئے موجودہ مقام تک پہنچی۔ لیکن صحافت کے بعض چہرے اتنے روشن ہیں کہ نہ تو ہم انہیں سیاسی اختلافات کے روزبازار سے گزرتے ہوئے نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ اُن کے بغیر صحافت کی تاریخ مکمل ہوتی ہے۔ ایک چیز ہے سیاست ایک چیز ہے صحافت۔ بے شک سیاست صحافت کا آئینہ ہے لیکن مقصد اور وسیلہ بہر حال دو مختلف چیزیں ہیں جب تک کوئی وسیلہ نہ ہو مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انسانی جدوجہد وسیلے کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی آزادی کے حصول کا احساس کیا تو وسیلے کی دنیا مختلف ہو چکی تھی سب سے پہلے جس چیز نے ذہنی فضا میں انقلابی برگ و بار پیدا کئے وہ صحافت تھی۔ اسی کی صلاحیت کا یا پلٹ گئی اور مسلمان اس نہج کی طرف قدم زن ہوئے کہ اپنی گمشدہ متاع کیونکر حاصل کر سکتے ہیں؟ اور اُن کی نشاۃ ثانیہ کا سرآغاز کہاں سے ہوتا ہے؟ شاید یہی دور تھا جب برصغیر کے مسلمانوں نے [illegible] ہونے کا احساس کیا اور جدید قومی آزادی کی [illegible] ساتھ اسلام کے سرگرم مبلغ، جن اخبارات یا [illegible] دور نے میں مسلمانوں کی ملی حیات میں [illegible] انہیں تھا اور استبداد کے خلاف سر [illegible] اسلام کا [illegible]

"البلاغ"، مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد" و "کامریڈ"، مولانا ظفر علی خان کا "ستارۂ صبح" و "زمیندار" اور مولانا حسرت موہانی کا "اُردوئے معلیٰ" سرفہرست تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے اخبار اور کئی ایک نامور ایڈیٹر بھی تھے۔ لیکن جس بانکپن کے ساتھ ان ایڈیٹروں اور اخباروں نے ملی حریت کی بنیاد اُٹھائی اور قدرت نے جو قلم انہیں عطا کیا وہ شمشیرِ خاراشگاف تھا۔ ان کے قلم نے ایک نیا اسلامی ہند پیدا کیا اور ایک محدود و مختصر گروہ کی سرکار پرستی کے باوجود برصغیر کا مسلمان برطانوی استعمار کے خلاف ذہنی طور پر مستعد ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کی زبان میں صورِ اسرافیل پھونکا اور دنیائے اسلام کی ویرانیوں کا ماتم کیا، مولانا کے طرزِ نگارش میں خطابت کا جلال تھا۔ وہ عربی و فارسی کے لہجے میں ہم کلام ہوتے اور مسلمانوں کے ماضی کو جھنجھوڑتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ابتداً انگریزی زبان میں "کامریڈ" کا سر پھونکا۔ وہ کس پایہ کے انسان تھے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اُن کی موت پر کہا تھا۔ "محمد علی کا قلم میکالے کا، زبان برک کی اور دل نپولین کا تھا"۔ "ہمدرد" محمد علی کا اردو روزنامہ تھا۔ زیادہ عرصہ نہ چل پایا آخر مسلمانوں کی بدقسمتی کا نذرانہ ہو گیا لیکن محمد علی کے قلم سے جو نکلا وہ گریۂ نیم بہار اور نغمۂ تیغ اصیل کا آمیزہ تھا۔ مولانا حسرت موہانی کا "اردوئے معلیٰ" ادب میں بزم اور سیاست میں رزم کا شہ پارہ تھا۔ وہ رئیس الاحرار بھی تھے اور رئیس المتغزلین بھی۔ مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" میں شعر و انشاء کی جوت جگا کر پنجاب، سرحد اور سندھ کے میدانوں کو سیراب کیا۔ اس سیرابی کا نتیجہ تھا کہ لالہ و گل اُگے اور [illegible] سرزمین استعمار کے خلاف جاگ اٹھی جس کو برطانوی جلادوں کی متابعت پر فخر و ناز تھا۔

ان چاروں ایڈیٹروں اور اخباروں کی بدولت صحافت کا دبستان پیدا ہو گیا اور صحافت کی مختلف تحریکوں کے ساتھ اس مقام و خصوصیت کے صحافی سامنے آئے کہ اُن کا تذکرہ کئے بغیر تاریخ صحافت تشنہ رہتی ہے۔ ان سب کے نام گنانا تو مشکل ہے لیکن اس صف میں بہت سے بزرگوار شامل ہیں ہم اُن کے قلم سے اختلاف کر سکتے ہیں اُن کے علم سے نہیں۔ فی الجملہ وہ اپنے زمانے کے جید صحافی تھے انہوں نے صحافت کو بعض نئی چیزیں دیں۔ ایک خاص طرزِ نگارش پیدا کیا۔ مطالبات کا مزاج بدل ڈالا، استدلال کی بنیاد اٹھائی اور صحافت کے بعض حدود متعین کئے۔ پھر جب مسلمانوں کا ملی شعور واضح و آشکار ہو کر پاکستان کے نصب العین کی شکل میں ڈھلا اور اُن کی ذہنی سرگزشت مدون و منظم ہوئی تو صحافت کی ڈگر بدل گئی۔ اس دور کی نمائندہ شخصیت حمید نظامی تھے جن کے قلم نے تصورِ پاکستان کی آبیاری کی جو اپنے دور کے سب سے کم عمر لیکن فہم و فراست کے اعتبار سے یگانۂ عصر صحافی تھے۔ انہیں قدرت نے ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ جب وہ ڈھل گئے تو وہ سانچہ ہی توڑ دیا۔

حمید نظامی کے سوانح و افکار سے متعلق میری معلومات کے ماخذ تین ہیں۔

میرے والد آغا شورش کاشمیری جو اُن کی بلند سیرت سے متعلق اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں کہ دماغ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۱)

سید محمد انظر شاہ قیصر

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اور شاہ جی نے غزل سنائی

۱۹۴۶ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری دیوبند آئے ہمارے یہاں یا بر مردانہ میں تشریف فرما تھے، اچھا خاصا مجمع تھا۔ اُن دنوں انظر بیچارہ، مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ تفسیر دار العلوم نہیں تھے بس صرف انظر، چھوٹی عمر تھی، انہوں نے سُن رکھا تھا کہ شاہ جی کی آواز میں جادو ہے، شاہ جی سے فرمائش کی کہ شاہ جی کچھ گا کر سنائیے۔ شاہ جی انکار کیسے کرتے، استاذ زادہ کی فرمائش تھی۔ انظر کو سامنے بٹھا لیا۔ فرمایا کہ گوجرانوالہ میں ایک سرحدی طالب علم نے مسجد کے حجرہ میں میری دعوت کی۔ الٹی سیدھی چائے، گڑ اور آٹے کا حلوہ۔ یہ کھلا پلا کر وہ طالب علم کہنے لگا کہ حضرت میں آپ کی اور بھی ضیافت کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا کہ مردہ بدست زندہ، اور جو کچھ بھی تمہاری تمنائیں ہیں وہ پوری کر لو، اس نے کہا کہ میں غالب کی غزل سناتا ہوں اور ایک لہک کر غالب کی یہ غزل اس طرح سنائی۔

کوئی امید بر نہیں آتے — کوئی صورت نظر نہیں آتے
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتے
آگے آتے تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتے
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتے

غالب کے یہ دو چار شعر شاہ جی نے ان ہی الفاظ میں اس سرحدی طالب علم کے ترنم کے ساتھ سنائے، پھر فرمایا کہ قریب قریب ایسے ہی الفاظ کی ایک غزل قطب شاہ دکنی کی مجھے یاد ہے۔

غم دل کسی سے کہا جائے نا — کہا جائے بھی تو سنا جائے نا
پیسے کی لطافت یہ نازک بدن — پیالہ بھی ان سے دیا جائے نا
قطب شہ زلف اب ہوا کے پند — دیوانہ کو کچھ پند دیا جائے نا

ہفت روزہ چٹان لاہور

چند شعرا کا نذرانۂ عقیدت

۱۔ مشہور استاد سخن سیماب اکبر آبادی ایک دفعہ دیوبند آئے اور مولانا عثمانی کے یہاں ٹھہرے۔ دار العلوم میں اس وقت عید الاضحیٰ کی تعطیل تھی، حفاظ اور درس کا سلسلہ بند تھا، سیماب صاحب نے مدرسہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہیں بتایا گیا کہ مدرسہ بند ہے اب وہاں جانا بیکار ہوگا۔ مگر سیماب صاحب اصرار کر کے مدرسہ میں آئے۔ اور ایک دو گھنٹے مدرسہ کی عمارتوں، مسجد، دار الحدیث، دار التفسیر کا چکر لگاتے رہے واپسی پر دار العلوم کے صدر دروازہ پر ایک شناسا سے ملاقات ہوئی۔ اس شخص نے کہا مولانا چھٹی کے شعرا میں سیماب صاحب مولانا ہی کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے، دار العلوم میں اس وقت تعطیل ہے [illegible] کرا کے، سیماب صاحب نے کہا کہ بھائی میں [illegible] کو دیکھ کر آیا جن میں [illegible] برس سے [illegible] کی روحانی گونج رہی ہیں اور جہاں سے ایسے [illegible] مجاہد پیدا ہوئے کہ آج وہ انگریز [illegible]

بن کر بکھر رہے ہیں۔

۲۔ جگر مراد آبادی بڑے مست مولا آدمی تھے کبھی موڈ ہوتا تو آدم بیزار بن گئے اسیر کہو مہ سے حشت لیتے وہ دار العلوم میں آئے حضرت اہتمام میں ایک مجلس میں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے ایک ساتھی نے کہا جگر صاحب چلئے ذرا دار العلوم کا کتب خانہ دیکھ لیں، نوادرات اور مخطوطات کا بڑا ذخیرہ دار العلوم میں ہے جگر صاحب سن کر چپ رہے ساتھی نے دوبارہ کہا۔ سہارا کیا جگر بولے کہ تم کتابیں دیکھنے کی فکر میں ہو میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو ان کتابوں سے بنے ہیں اور جیسے کتابیں بنتی ہیں تو ان کتابوں [illegible] تو چلو دیکھ آؤ۔

۳۔ [illegible] مولانا ظفر علی خاں [illegible] [illegible] دار العلوم کے [illegible] دار التفسیر [illegible] بھائی یہ دیوبند کے [illegible] یہاں کچھ تو [illegible] دار التفسیر اور دار الحدیث [illegible] (تحریک دیوبند)

۱۰ مارچ

مسلمانوں کی کثیر تعداد محض موروثی مسلمانوں پر مشتمل ہے

ہماری اصل بیماری دینِ حق پر ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے حقیقی اور زندہ ایمان کا فقدان ہے

● عراق کی اسلامی کانفرنس منعقدہ ۱۳ تا ۱۸ فروری ۷۵ء میں میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان کے ایمان افروز خطبہ کا مکمل متن قارئین چٹان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

محترم صدر موتمر علماء المسلمین، قابل صد احترام شرکائے کانفرنس، محترم ارباب دیوان الاوقاف اور معزز سامعین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں پاکستانی وفد اور پاکستان کے عوام کی طرف سے وزارت اوقاف کے زیر اہتمام اور صدر جمہوریہ عراق کی زیر سرپرستی منعقد ہونے والی اس عظیم بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا خیر مقدم کرتا ہوں بغداد جہاں یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے نہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن کا مخزن ہے بلکہ وہ شہر بھی ہے جو ایک طویل مدت اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کا گہوارہ رہا ہے، یہاں تک کہ ایک وہ وقت بھی تھا، جب خلیفہ ہارون الرشید نے بادلوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"جاؤ اور جہاں تمہارا جی چاہے برسو
مگر یاد رکھو کہ جن زمینوں کو بھی تم سیراب
کرو گے۔ ان کا خراج بغداد ہی میں
آئے گا۔"

یہ وہ مقام ہے، جہاں امام ابو حنیفہؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام ابو یوسفؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ جیسے اصحاب علم و [illegible] ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میری دلی خواہش [illegible] اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہوں [illegible] اس کانفرنس کو حقیقی اور مکمل کامیابی عطا [illegible] اور اسے [illegible] [illegible] عظمت [illegible] نقطۂ آغاز بنا دے۔

برادران اسلام! اس کانفرنس میں تبادلۂ افکار کا اصل موضوع اور اظہار خیال کا مرکزی مضمون مسجد اقصیٰ کی آزادی کا مسئلہ ہے، اس بارے میں عراق کی حکومت اور اس کے عوام کا کردار بالخصوص ۱۹۷۳ء کی جنگ رمضان کے دوران اور اس کے بعد بھی ان کے کارہائے نمایاں فی الواقع قابل ستائش ہیں، جن کے لیے میں ان کو دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، جہاں تک مسلمانوں کے لیے مسجد اقصیٰ کی اہمیت کا تعلق ہے یہ متعدد پہلوؤں سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے، یہ ہمارا قبلہ اول (اولی القبلتین) ہے اور چودہ سال سے زائد عرصے تک ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسی مسجد کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے ہیں، پھر اس کرۂ ارض پر یہی وہ مقام ہے، جہاں سے معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کی نماز میں امامت فرمائی تھی، مزید برآں یہ اس روئے زمین پر ان تین مساجد میں سے ایک ہے جن کی زیارت کے لیے ایک مسلمان کا قصد کرنا شریعت کی رو سے دینی فعل اور موجب اجر و ثواب ہے، خود ارض فلسطین جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے، قرآن میں اسے ارض مبارک [illegible] ہے اور فرمایا گیا ہے کہ:

"پاک ہے وہ ذات [illegible] اپنے بندے کو مسجد حرام [illegible] اقصیٰ تک سیر کرائی، جس کے اردگرد علاقے کو ہم نے بڑی برکت دی ہے"
(سورہ بنی اسرائیل آیت ۱)

ان وجوہ سے مسجد اقصیٰ کی آزادی صرف فلسطین اور اس کے گرد و نواح کے عرب ممالک کے مسلمانوں کا ہی نہیں، تمام دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے بلکہ اسے آزاد کرانا ان سب کا دینی فریضہ ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک طویل عرصے تک بہت سے لوگ فلسطین اور بیت المقدس کی آزادی کے معاملے کو کلیۃً ایک عرب مسئلے کے طور پر لیتے رہے ہیں۔ تاہم میں اس بات کے اعادے میں فخر و انبساط محسوس کرتا ہوں کہ اپنی تمام تر مشکلات اور دوسروں کے رویّہ کی پرواہ کیے بغیر پاکستان بیت المقدس کے مسئلے میں گہری دلچسپی لیتا رہا ہے، گویا کہ یہ اُس کا اپنا مسئلہ ہے اور اس کے لیے پاکستان کو بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے، پہلے جوناگڑھ، مناوادر، منگرول اور ریاست جموں و کشمیر کھو دینے کی صورت میں اور اب المیہ مشرقی پاکستان کے رونما ہونے کی شکل میں ـــــ،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جسے گزشتہ ۲۷ برس کے واقعات کی روشنی میں کوئی شخص جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا، کہ فلسطین کے گرد و نواح کی مسلمان ریاستیں بیت المقدس کو بھی آزاد کرانے کی طاقت بھی نہیں رکھتیں، ہم جانتے

تمام فلسطین کو آزاد کرانے کی ان سے توقع کی جائے۔ یہ کتنی افسوسناک صورت حال ہے کہ مسلمانانِ عالم جن کی تعداد ۹۰ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور جو دو تین درجن سے زیادہ آزاد ریاستوں کے مالک ہیں (صرف عرب ریاستوں کی تعداد جو خلیج سے لے کر بحر اوقیانوس تک پھیلی ہوئی ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ درجن ہے) اور اللہ رب العزت کے فضل و احسان سے اتنے وسیع مالی وسائل ان کے پاس ہیں، کہ چاہیں تو نام نہاد بڑی طاقتوں کے ہوش ٹھکانے کر سکتی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود وہ ۳۰ لاکھ یہودیوں پر ایک چھوٹی سی ریاست کے مقابلے میں عاجز ہو رہے ہیں۔

ہم پستی کی کس حد تک کو پہنچ گئے ہیں، اس کا اندازہ درج ذیل چند واقعات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

(الف) چند ہزار یہودی مہاجروں کے بھیس میں داخل ہوئے اور چند سال کے قلیل عرصے میں فلسطین اور سینا پر قابض ہو کر اب تمام عالم اسلام کو للکار رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ بار بار انہدام اور آتش زدگی کے خطرے سے دوچار ہو رہی ہے۔

(ب) مسئلہ کشمیر، جس کے متعلق ۱۹۴۸ء سے تمام اقوام عالم بالاتفاق یہ طے کیے ہوئے ہیں کہ اس کے پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کا مسئلہ حق خود ارادیت کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق اہل کشمیر کے استصواب عام کے ذریعے سے طے ہونا چاہیئے، اپنے تمام تر وسائل اور قوت و شوکت کے باوجود مسلمان ریاستوں کی غفلت کی وجہ سے لاینحل پڑا ہے اور مسلمان ممالک ہندوستان سے اپنے بین الاقوامی وعدے کو پورا نہیں کرا سکے جو اس نے اہل کشمیر اور تمام عالم اسلام سے کر رکھا ہے، حالانکہ وہ اگر زور ڈالیں تو وہ بآسانی ایسا کر سکتے ہیں۔

(ج) فروری ۱۹۷۴ء میں تقریباً بیس مسلمان ممالک کے سربراہ لاہور میں جمع ہوئے، تاکہ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی آزادی کے لیے مطلوبہ اقدامات اور طریقہ پر غور و فیصلہ کریں۔ مگر اس کا نتیجہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کو دولخت کر کے اس کے مشرقی بازو کے اسلامی جمہوریہ سے ایک لادین سوشلسٹ قوم پرست ریاست میں تبدیل کر دینے کی صورت میں برآمد ہوا، جگہ جگہ غیر مسلم حکومتوں اور اقوام کے ہاتھوں مسلمان اقلیتوں سے جو سلوک ہو رہا ہے، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔

برادران عزیز! کیا یہ صورت حال اس بات کی متقاضی نہیں کہ ہم اس مذلت کے اسباب پر غور کریں اور اپنے موجودہ انحطاط و تنزل اور رسوائی کا اس عظمت رفتہ سے تقابل کریں، جب چند ہزار صحرانشین عرب کے ریگزاروں سے اس حال میں اٹھے، کہ نہ ان کے پاس کوئی مادی وسائل تھے، نہ قابل ذکر آلات حرب، لیکن انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے وقت کی دو سپر پاورز، یعنی قیصر و کسریٰ کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ ہمیں چاہیئے، کہ ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے مرض کی تشخیص اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ کہ جس امت کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ساری دنیا اور تمام نوع انسانی کی راہ نمائی و پیشوائی کے لیے مبعوث کیا تھا، وہ اس خوفناک زوال و ادبار سے کیوں دوچار ہو گئی ہے، اس امت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

"اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔" (سورۂ حج۔ آیت ۷۸)

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آل عمران آیت ۱۱۰)

میرے پیارے بھائیو! ہماری اصل کمزوری اور بیماری جسے دور کرنے کی ضرورت ہے، وہ دین حق پر ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے حقیقی اور زندہ ایمان کا فقدان ہے۔ ہم نے اس کو ایک نظام زندگی کے بجائے محض مذہبی رسوم کا مجموعہ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں اسی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدائے علیم و خبیر نے فرمایا :۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔" (النساء آیت ۱۳۶)

"اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ، اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔" (البقرہ آیت ۲۰۸)

"نہیں، اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کریں۔" (سورہ النساء آیت ۶۵)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی فاسق ہیں" (سورۃ المائدہ آیت ۴۴، ۴۵، ۴۷)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت

باقی ص۲۶ پر

ہفت روزہ [illegible] لاہور

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیار جاسوس

گیانی کی اس بات سے مجھے خلش ضرور ہوئی تاہم مَیں نے اپنے دماغ کو ٹھکانے رکھا اور اس مذاق پر ٹھنڈے دل سے ہنس دیا۔ ڈر صرف یہ تھا کہ میری طرف سے کوئی برجستگی کہیں خطرناک ثابت نہ ہو، اور معاملہ نیم پختہ شوربے میں اپنی انگلیاں جلا لینے کی صورت اختیار نہ کر جائے۔ دراصل یہ وقت اُس کے ساتھ معقول لطیفے یا رو بہ رو جواب دینے کا نہیں تھا۔ کیونکہ بعض اوقات مذاق ناکامی کا باعث بن جاتا ہے۔ میں خاص طور پر محتاط تھا کہ گفتگو نامعقولیت کا رنگ نہ پکڑے۔ یہ عین ممکن تھا کہ گیانی اپنے مذاق کا جواب سن کر کبیدہ خاطر ہو جائے، لہٰذا مَیں نے متشکرانہ ہنسی کے ساتھ کہا:

"گیانی صاحب۔ آپ بجا فرماتے ہیں اور مجھے آپ کی مشکلات کا بخوبی اندازہ ہے لیکن میرا مطلب اُس عجائب سنگھ سے ہے جو بارہ سے تک واپسی پر آپ کے پاس روزگار کی تلاش میں آیا اور یہ کہہ کر آپ سے مدد چاہی، کہ چونکہ گھر والوں کے ساتھ اس کی کشمکش ہے، لہٰذا وہ واپس اُن کے پاس نہیں جائے گا۔"

یہ کہتا ہے قبول اسماعیل کے، عجائب سنگھ ... کے سپرد کر دو بارہ میں آخری ملاقات ... اسے بتایا تھا اور یہ وہ بات تھی جو ... پہلے تحقیقات کرنے والوں کو نہ بتا سکا تھا، مَیں نے دیکھا کہ ان الفاظ نے گیانی کو محویت کے عالم میں ڈال دیا اور اس کی بھنویں اوپر اُٹھ گئیں، ایسا لگتا جیسے ان الفاظ سے وہ یہ جان گیا کہ مَیں کوئی عام قسم کا ملاقاتی نہ تھا۔

یہ گیانی رسالا سنگھ گیانی سے بالکل مختلف تھا، یہ ایک دانشورانہ چہرے، مستعد ذہن، سراغرسانی اور صحیح قیاس آرائی کے خصائص سے متصف نظروں اور شکاری کی مانند تیز اور متجسس دماغ کا آدمی تھا ایک بے پناہ ذہانت اور دلآویز چمک اس کی آنکھوں میں موجود تھی جب کہ اس کے جسمانی خط و خال ایک اکل کھرے کریکٹر کی نشاندہی کرتے تھے وہ انتہائی ہوشیار، راز جو اور سچ کس قسم کا انسان تھا جو مجھے معنی خیز انداز سے تاڑ رہا تھا، وہ تمسخر آمیز نگاہوں سے میرے چہرے کا بھرپور جائزہ لے رہا تھا اور اس کی نگاہیں مجھ پر ایک طرح کے تازیانے برسا رہی تھیں، اپنے پیشے کے اعتبار سے جہاں وہ ایک استاد تھا، اپنی ظاہری شکل و صورت میں وہ ایک مکمل انسان تھا اس کی ان خوبیوں کے پیشِ نظر مجھ میں بے حوصلگی پیدا ہونے لگی، لہٰذا میں نے اپنی آنکھوں اور کانوں کو پوری طرح تان رکھا تھا۔

اس مسابقہ میں میرے لیے دشواری اسی وقت پیدا ہو گئی، جب اُس نے اپنی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں سے میرے چہرے پر جلدی جلدی نظر ڈالنا شروع کیا۔ ابتداً وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتا، لیکن میں اُس کی طرف نہ دیکھتا، میں اُس کی نظروں سے بہت کم نظریں ملاتا۔ بعض اوقات میں نیم دلانہ طور پر اُس کی طرف دیکھنے کی جرأت کرتا، لیکن پھر تیزی سے اپنی نظریں جھکا لیتا، لیکن میں نے جلد ہی اُس کی آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ ایک دلآزار تمسخر اور طنز کو بھانپ لیا اور خود کو اس کے برابر لے آیا، اب ہماری تمام گفتگو آنکھوں آنکھوں میں ہو رہی تھی، آنکھیں کوئی انتہا نہیں رکھتیں وہ ہمیں ایک دوسرے کی حکایت سے باخبر رکھتی ہیں اس وقت آنکھیں ہی سب کچھ تھیں، خاموش لمحوں میں ہم متواتر اور مسلسل ایک دوسرے پر تاڑ لگائے رہتے، ہم نے ایک دوسرے کے چہروں کی نظروں ہی سے یوں چھان پھٹک کی کہ جنگ اب نگاہوں، ذہانت اور ظرافت و مستعدی کی جنگ معلوم ہونے لگی، کئی بار ہم ایک دوسرے کو کئی کئی منٹ چہرے پر نظریں گاڑ کر دیکھتے رہے اکثر اوقات مَیں نے خاموشی سے اس کی نظروں کا نظروں ہی سے جواب دینے پر اکتفا کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ میں اُس کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھوں، اور وہ مکمل جائزہ لے سکے۔ میں نے جب کبھی ادھر اُدھر دیکھنے کی سعی کی، تو اس نے اپنی بیل جیسی موٹی آنکھوں سے گھنی ابھرواں کے تلے مجھ پر اپنی نظریں گاڑ دیں، اس کی ایک ایک نگاہ اس بات کی غماز تھی، کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے

ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ سوال و

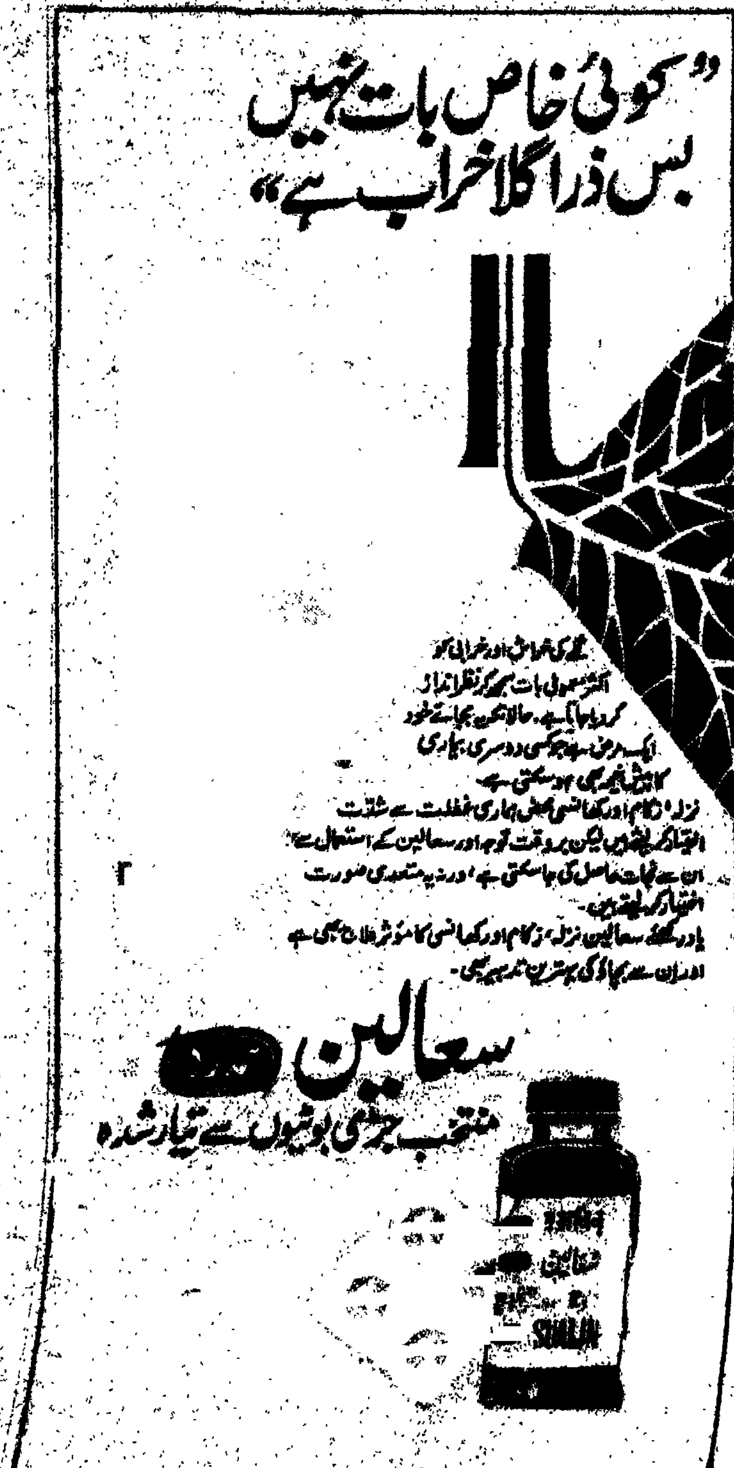
جواب میں اتفاق ... اختیار
کئے ، کبھی موضوع تبدیل ہوتے رہے ، لیکن کل
کر کسی بھی بات پر ... اس نے اعتماد کا
دامن دونوں سے ... کام لے کر ... کرنے
کے لیے ایک دوسرے پر ... کی کوشش

کی ... حقیقت کے ساتھ ایک دوسرے
کو دیکھا اور ہر موضوع کے ہر پہلو پر ... کا مطلب
کا اظہار کیا ، بلاشبہ ہم نے اکثر و بیشتر گفتگو کو
اشاروں اور تشبیہات ... اس قسم
کی ... کے دوران ... گمراہ کیا

... حالات
کا بہت حد تک ... دینی سے
سوال کرنے کا شخص تھا اُس نے میری شخصیت
کا جائزہ لینے کے لیے مجھ سے خاصے پیچیدہ
سوالات کئے اور میرے ماضی و حال کے علاوہ
ماحول اور جناب سنگھ سے میرے تعلقات

جاننے کے لیے پوری طرح سے کھنگالا جیسا
کر آپ ... میں دیکھیں گے اُس نے مجھے
... معلومات کی مدد سے اُلجھا
دینے کی بھی پوری کوشش کی ، اس نے اپنی
ذہانت کے ... کرنے کے لیے کوئی ایک موقع
خود پیدا کئے اور ایک شائستہ سکول ماسٹر کی فطرت
ثانیہ کے طور پر اصل موضوع سے بھی برابر چمٹا
رہا ۔
گیانی : جناب سنگھ کا گھر کہاں ہے ؟
بن : جناب سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا گاؤں
ترن تارن کے نزدیک واقع ہے ، لیکن میں
اس کا نام بھول چکا ہوں ۔
گیانی : میں موضع ... کے رہنے والے ایک
جناب سنگھ کو ضرور جانتا ہوں ، لیکن وہ
تو سکول میں ایک ... کی حیثیت
رکھتا تھا ۔
بن : اگر میری یادداشت غلط نہیں ، تو یہ نام اس
گاؤں کا نہیں ، یہ اس سے بہت حد تک
مختلف ہے ۔
(نوٹ : مجھے اپنی ابتدائی تحقیقات میں علم
ہو چکا تھا کہ جناب سنگھ کے گاؤں کا نام
موضع ... ہے ، لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ... نے
نے اپنے کسی بیان میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا
اس لیے میں نے گیانی سے اپنے انٹرویو کے
دوران اس گاؤں کا نام بتانے سے معذوری
کا اظہار کر دیا ۔)

* * *



مولانا سید ابوالحسن ندوی

ہمارے اندر بھیڑیئے، سانپ اور بچھو پیدا ہو گئے ہیں

باہر کی غلامی سے، یہ ضمیر کی غلامی کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے

جنابِ صدر اور معزز حاضرین! میرے لیے بڑی [illegible] اور سعادت کا موقع ہے کہ میں ایک ایسے تاریخی شہر میں آپ [illegible] مخاطب ہوں جو صرف دریاؤں کا نہیں بلکہ کئی تحریکوں کا [illegible] اور منبع ہے جہاں سے کئی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اور انہوں [illegible] پورے ملک کو متاثر کیا اور ہمارے صوبے ہی کو نہیں بلکہ [illegible] ملک کو عالمی شہرت رکھنے والے رہنما اور لیڈر اور [illegible] مہیا کیے۔

حضرات! انسان کے لیے انسان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس پر اعتماد [illegible] جائے۔ اس کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس [illegible] اچھی امید قائم کی جائے اس کی بات کو کان لگا کر سنا جائے۔ اور اگر اس کو کسی چیز کی فکر ہے یا اس کے دل میں درد ہے تو اس درد کی قدر کی جائے۔ اس درد میں [illegible] ہونے کی کوشش کی جائے۔ اگر دنیا میں یہ نہ ہو تو یہ دنیا احساس، ضمیر اور دل رکھنے والوں کی جگہ نہیں ایک مکان ہے جس میں [illegible] ہیں، ایک [illegible] [illegible] اگر دنیا ایسی ہی ہو جائے [illegible] اس دنیا میں [illegible] اور اگر دنیا ایسی [illegible] کی بالکل ضرورت [illegible]

اور پتھر میں کیا فرق؟ پتھر کوئی غلطی نہیں کر سکتا، پتھر نہ غلطی کرتا ہے اور نہ اپنے کو بہتر بھی نہیں بنا سکتا۔

انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ غلطی کرتا ہے، دس بار کرتا ہے، پچاس بار کرتا ہے، لیکن غلطی کو مانتا بھی ہے غلطی کا اقرار بھی کرتا ہے، اس کے اندر جذبہ بھی ہوتا ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کروں۔ وہ ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتا ہے ٹھوکر کھانا اتنا برا نہیں لیکن ٹھوکر کھا کر نہ سنبھلنا یہ ہے انسان اور انسانیت کا سب سے بڑا المیہ۔ خطرہ کی یہ بات نہیں کہ انسان غلطی کرتا، پاپ کرتا ہے۔ اگر پاپ نہ کرتا ہوتا تو پھر مصلحینِ اخلاق کو خدا کے پیغمبروں کو دنیا میں ظہور فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر جدوجہد میں کیا رکھا تھا، جدوجہد کا کوئی میدان ہی نہ ہوتا، زندگی کی ساری لذت تو جدوجہد سے ہے ایک چیز پیدا ہو اس کے برے اثرات کو دور کرنے کی کوشش، اس کو بہتر بنانے کی کوشش، زندگی میں جو کچھ آپ رنگ دیکھتے ہیں، زندگی میں جو آپ کشش پاتے ہیں اس میں جو توانائی، تر و تازگی ہے وہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ متقابل خیالات پیدا ہوتے ہیں، متقابل جذبات پیدا ہوتے ہیں، انسان غلطی کرتا ہے پھر وہ اس غلطی کو تسلیم کرتا ہے، وہ کچھ کھوتا ہے، پھر پانے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں کھوتا نہیں وہاں پا لینے، پانے کی لذت بھی نہیں بغیر کچھ کھوئے پانے کی لذت بھی نہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بن جائے [illegible]

———— یا پتھر بن جائے۔ فرشتے اور پتھر میں بہت بڑا فرق ہے۔ میں اس فرق سے اچھی طرح واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، غلطی نہ فرشتے سے ہوتی ہے اور نہ پتھر سے ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی، انسان کی طاقت اور اصل یہ ہے کہ وہ غلطی کر سکتا ہے، کرتا ہے، ہزار بار کرتا ہے مگر غلطی کو محسوس کرتا ہے، اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ کبھی کبھی اپنے قصور کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس سے اس کی عزت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں ہے۔ کوئی بٹہ نہیں لگتا، اس کی عزت پر۔ اس کی زندگی کا جو لطف ہے وہ یہ ہے کہ چار آدمی ایک دوسرے پر بھروسہ کریں اور ٹھنڈے دل سے بات سنیں، زندگی کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے، ابھی بات سنی نہیں اور پہلے سے ایک خیال دل میں قائم کر لیا کہ یہ اپنے فلاں غرض کے لیے کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس وقت آپ حضرات کے ایک منتخب مجمع اور پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دیکھ کر میرے دل میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور خود مجھے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بھائی اچھی امید لے کر یہاں آئے، ان کا خیال ہے کہ کوئی کام کی بات کہی جائے گی۔

میرے بھائیو! کہانی لمبی بھی ہے اور مختصر بھی، اور کہانی کی طرح اسے پھیلایا بھی جا سکتا ہے اور اس کو سمیٹا بھی جا سکتا ہے، کہانی کوئی پرانی کہانی نہیں ہے، کسی قوم کی کسی ملک کی نہیں بلکہ ہماری اور آپ کی کہانی ہے ہم کو اور آپ کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے اپنی رحمت سے مالا مال کر رکھا ہے اور ہماری قسمت [illegible]

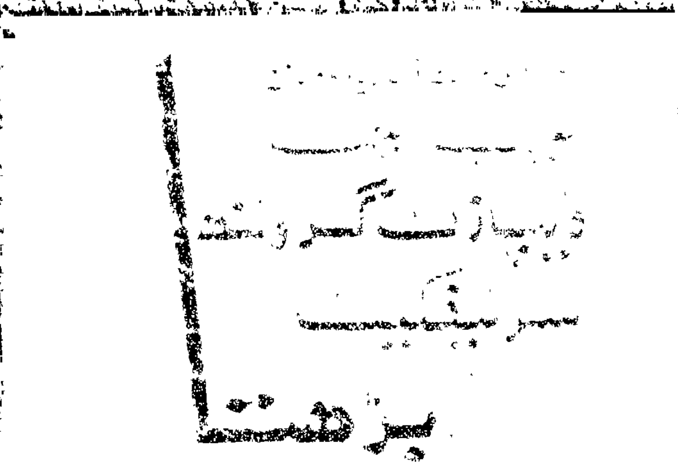
[illegible] اور ہمارے بھائی بھی ہیں [illegible] کی [illegible] جنگ عظیم [illegible]

جو بہتر سے بہتر مواقع ہو سکتے تھے بہتر سے بہتر دماغ ہو سکتے تھے، بہتر سے بہتر خزانے ہو سکتے تھے وہ سب اس نے ہمارے قدموں میں ڈال دیئے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو اتنا بڑا ملک دیا، ایسا ملک جو [illegible] سے مالا مال ہے جس کی بڑی شان [illegible] اپنی جگہ پر ایک دنیا ہے جو [illegible] کے مطابق ہم اس کو ملک کہتے ہیں لیکن یہ اچھا خاصا ایک بر اعظم ہے۔ اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی کو یہاں سے مثلاً [illegible] تک بھی سفر کرنے کا موقع ملا ہو تو اس پر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، یہاں [illegible] ہوں گے جن کو یورپ کے [illegible] مجھے بھی بعض علمی تعلیمی مقاصد [illegible] ... پہلی بار سفر کرنے کا اتفاق ہوا، ان کے ملکوں کا تو حال یہ ہے کہ آدمی ذرا سا [illegible] اچانک وہ اپنے ملک کی سرحد پار کر جاتا ہے۔ اور دوسرے ملک کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔ اور یہاں ملک تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دنیا ہے آدمی تیز سے تیز گاڑی پر بھی بیٹھے اکتا جاتا ہے کئی کئی راتیں نکل جاتی ہیں کئی کئی دن نکل جاتے ہیں لیکن آدمی منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو اتنا بڑا ملک دیا اور بڑی تعداد میں ایک قوم بسا دی ہے۔ اس قوم کی بہت سی بلند ترین شخصیات ہیں۔ اس کا وسیع ادب ہے، شاعری ہے اور یہ ملک قیمتی خزانوں سے مالا مال ہے، اس کے علاوہ [illegible] میں ایک زرعی ملک ہے۔ [illegible] نے اپنی [illegible] نہیں بہائی ہے۔ [illegible] پانی بہایا ہے۔ بہت سے ملک [illegible] خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ ملک دیا ہے [illegible]

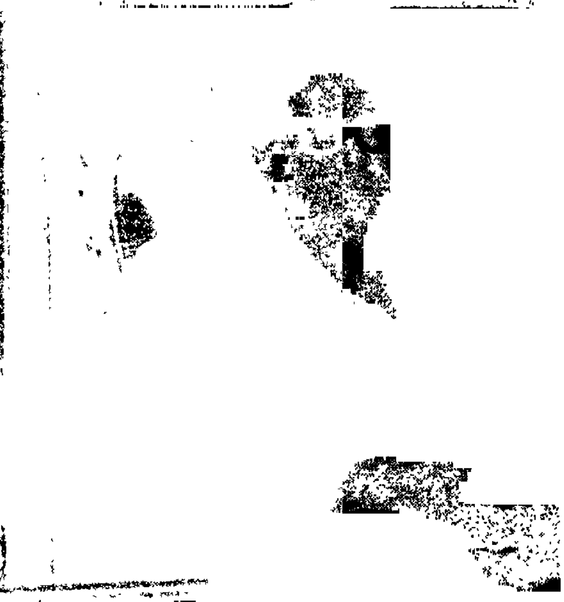
کامیاب نہیں ہوئے، جو منصوبے بنائے گئے [illegible] منصوبے پورے نہیں ہوئے اور دنیا بڑی مشکلات میں مبتلا ہو گئی جو حضرات پڑھے لکھے ہیں جانتے ہیں کہ ساری دنیا کی قیادت حاصل کرنا، رہنمائی حاصل کرنا کھیل نہیں ہے اس کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے [illegible] کے احکام سے واقف تھے، ان کے نزدیک تو سیاسی برتری قوموں کو غلام بنانا زیادہ سے زیادہ ملکوں پر اور وسیع سے وسیع رقبے میں اپنی حکومت قائم کرنا اور ان کا استحصال کرنا، ان کے ذرائع پر قبضہ کرنا اور ان ذرائع سے کام لے کر اپنی پڑوسی قوموں پر اپنی برتری کا نقش قائم کرنا اور ان سے بازی لے جانا اصل مقصد تھا۔ یورپ کی حیثیت تو یہ ہے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے ملک ہیں۔ ان کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ جرمن قوم فرانسیسی قوم، انگریز قوم میں مسابقت رہی تو ان کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ اپنی حکومت کے رقبے کو وسیع کریں اور دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کریں اور وسائل و ذرائع پر قبضہ کریں [illegible] بھی ہمارا مشاہدہ [illegible] چنانچہ اب بھی ان قوموں میں یہ کام جاری ہے۔ فرانسیسی جرمن قوم کو زک دینا چاہتے تھے اور ان پر سبقت لے جانا چاہتے تھے پھر اس کی صورت یہ تھی کہ ان کی کالونیاں ہوں [illegible] کا شکار بنتے وہ ان کی غلامی [illegible] نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اپنی خدمت کرانا چاہتے تھے۔ اپنی حریف جرمن قوم کو زک دکھانا چاہتے تھے کہ ہم اتنی بڑی طاقت ہیں اور یہی انگریزوں کا مقصد ہے۔

یہ دنیا کی بڑی بدقسمتی تھی کہ جو قیادت یورپ میں چلی گئی اور اس قیادت اس لیڈر شپ نے انسانیت کا سبق ہی نہیں پڑھا۔ یہ نہیں جانا کہ انسان کس عزت کا مستحق ہے۔ انہوں نے یہ سبق ہی نہیں پڑھا کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

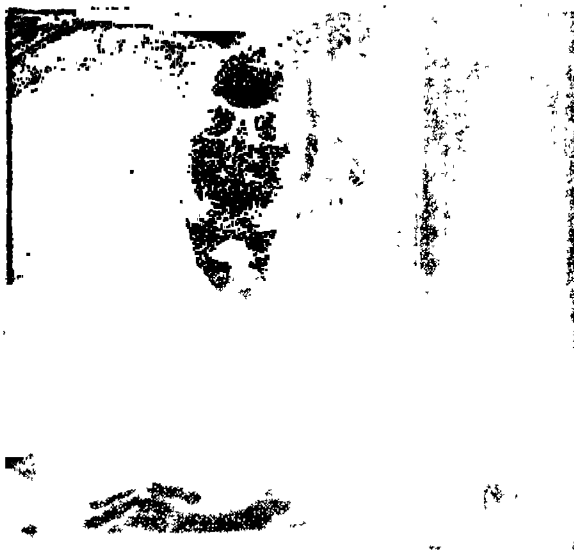
حضرت مسیح علیہ السلام جن کو ہم سب خدا تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں انہوں نے انسانی ہمدردی، اخلاق [illegible]



لاہور میں یومِ حمید نظامی



جناب جسٹس عطاء اللہ سجاد
(مہمانِ خصوصی)

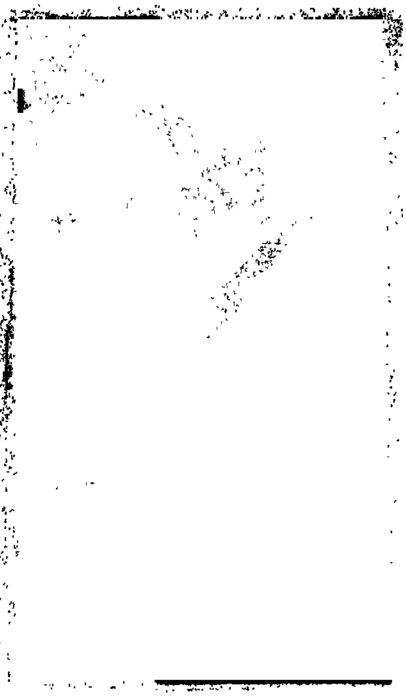


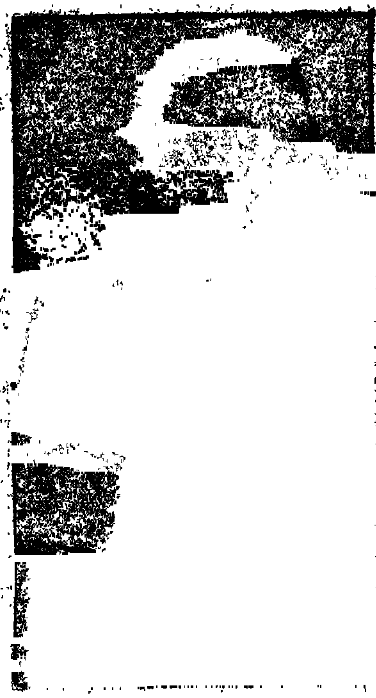
جناب اے کے بروہی
(صدر)



یومِ حمید نظامی کے موقع پر اجتماع کا ایک منظر

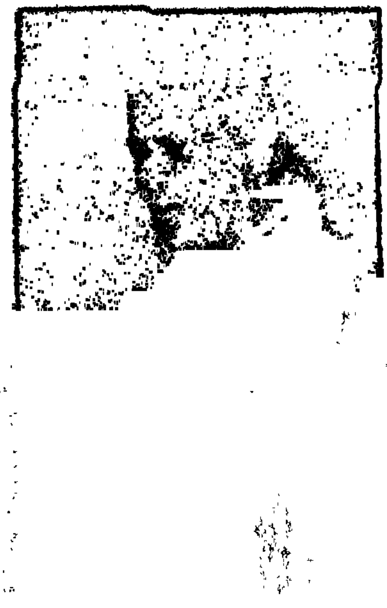
صفِ اوّل (دائیں سے بائیں) میاں امیر الدین، پروفیسر محمد منور، آغا شورش کاشمیری، علامہ عزیز انصاری، جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ،
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، جناب مجید نظامی، جناب معراج الدین

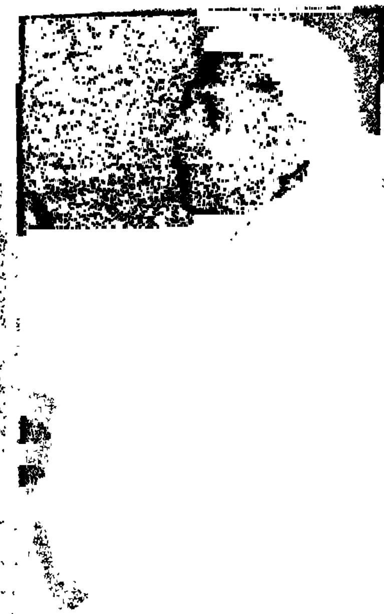






جناب جسٹس عطاء اللہ سجاد —— جناب اے۔کے۔ بروہی —— جناب زیڈ اے سلہری







آغا شورش کاشمیری —— پروفیسر محمد منور —— الحاج چوہدری عبدالرشید صدر اخبار فروش یونین



پروفیسر اسحاق قریشی



ڈاکٹر عبدالسلام خورشید



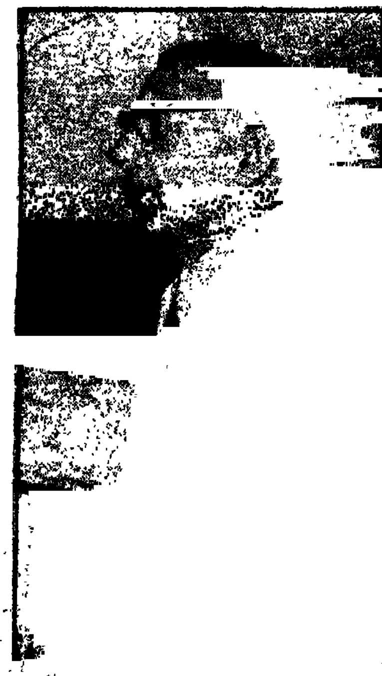
مولوی حبیب احمد
بانی اخبار فروش یونین



جناب مشیر کاظمی



خواجہ افتخار احمد



ڈاکٹر مہر باقر

صہیونی تحریک

ہزاروں روپ رکھنے والی تحریک

۱۹۶۹ء، ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۷ء میں چیکوسلواکیہ کے نشریاتی ذرائع اس نظریے کی پُرزور حمایت کر رہے تھے کہ صہیونیت کے دو رُخ ہیں مثبت اور منفی۔ اس کا ایک رجحان ترقی پسندی کی جانب ہے اور دوسرا رجعت پرستی کی طرف اور یہ کہ صہیونیت کو جزوی طور پر قبول کیا جا سکتا ہے، اس کے ترقی پسند رُخ کی حمایت اور ہمت افزائی کی جا سکتی ہے تاکہ یہ اپنی جارحیت پسندانہ قوم پرستی، شہنشاہیت پرستی، نوآبادیاتی اور غیر ہوشمندانہ رجحان کو ختم کر دے۔ ان ذرائع کا کہنا تھا کہ ایک ایسی جنگ لڑی جانی چاہیئے جس میں صہیونیت کے اندر جو ترقی پسند یا بائیں بازو کی ذہنیت جینیئنہ طور پر موجود ہے اسے فتح حاصل ہو۔ بلاشبہ یہ نظریات آج تک اپنی غیر واضح اور پوشیدہ شکل میں کہیں نہ کہیں موجود رہے ہیں۔

بائس اسٹینر نے ۱۹۶۹ء میں اپنے مضمون بعنوان "سامیت دشمنی اور مارکسزم کو مسخ کرنے کی نفسیات" میں لکھا تھا:

"صہیونی کردار کی کمزور خصوصیات اس وقت واضح ہو جاتی ہیں جب اس کا تصادم شہنشاہیت دشمن اور قوم پرست عرب تحریک سے ہوتا ہے، ان مواقعات پر صہیونیت ایک ایسی تحریک کی صورت میں سامنے آتی ہے جو ایک طرف تو قوم اور "ریاست" کے مادی وجود کا دفاع کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف عرب دشمن جارحیت اور توسیع پسندی کے رجحانات کا اظہار بھی کرتی ہے، ایک ایسی تحریک جو مغربی ممالک کی رجعت پرست قوتوں کی پالیسی کا خوشامدانہ آلۂ کار رہتی ہے لیکن ایسی صورت میں بھی ہمیں صہیونیت کے اندر موجود مختلف رجحانات کو لازمی طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔"

کیا ایسی تحریک کے لیے جو مغربی ممالک کی پالیسی کا خوشامدانہ آلۂ کار ہو "ریاست اور قوم کے مادی وجود" کا دفاع ممکن ہے؟ کیا واقعتاً صہیونیت بہ دفاع ہمسایہ ممالک کے علاقوں تک اسرائیل کو وسیع کر کے اس کے مقتدر رہنماؤں کے بقول ایک "عظیم تر اسرائیل" قائم کر رہی ہے جس میں ہمسایہ عرب ممالک کا بہت بڑا علاقہ شامل ہوگا؟

۶۷-۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ کے نشری ذرائع ان دلائل کو نشر کر رہے تھے جو اسرائیل کے پروپیگنڈا کرنے والے اداروں نے پیش کئے تھے یعنی یہ کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مختصر اسرائیلی داؤد پر عرب جولیات نے حملہ کیا تھا اور عرب ممالک اسرائیل کی ریاست کو ختم کرنے اور اسرائیلی قوم کا صفایا کرنے کی کوششوں میں مشغول تھے۔ صہیونی مذہبی تنظیم کے صدر فرینک فرش اپنی تنظیم کی میٹنگ منعقدہ پراگ میں ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو کہا تھا کوئی بھی یہودی اسرائیلی حکومت کے عوام کے خاتمے پر رضامند نہیں ہو سکتا جس کا اظہار اتنی زیادہ مرتبہ کیا جا چکا ہے!"

صہیونی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس وقت خود چیکوسلواکیہ کے مذہبی یہودیوں کے کچھ عناصر نے بھی اسرائیل



نواز اور صہیونیت نواز جانبدارانہ موقف اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر اس اعلان کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بوہیمیا اور موراویہ کے یہودیوں کی مذہبی تنظیموں نے ۷ اپریل ۱۹۶۸ء کو جاری کیا تھا اور جو کونسل ہذا کے گزٹ کی اپریل ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان میں تمام ہی تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہوئے کہا گیا ہے "گزشتہ صدی میں صہیونیت کا قیام سامیت مخالف فوجی تحریکوں اور بھیانک قتل عام کا رد عمل تھا" چیکوسلواکیہ کے عوامی نشری اداروں نے اسرائیل کے خلاف جو تنقید کی تھی اور اسے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عرب ممالک کے خلاف حملہ آور قرار دیا تھا اسے ایسی زبردست اسرائیل مخالف مہم قرار دیا گیا جس کی بنیاد کسی مقصد پر نہیں بلکہ متعصبانہ پردہ پوشی پر ہو۔ مذکورہ بالا بیان میں کہا گیا ہے کہ متعدد شواہد کی موجودگی میں اسے یہود دشمن مہم کے علاوہ کچھ اور کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

۱۹۶۷ء کے اسرائیل کے اس شرارت آمیز اور حالات کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کے پروپیگنڈا کا کہ ہوا میں اسرائیل کو اپنے وجود کے خلاف کا خطرہ تھا اس نے تو جواب دہ انتہائی ذمہ دارانہ اقدام کیا۔ ان میں سے ایک اس وقت اسرائیلی افواج کے چیف آف سٹاف تھے اور دوسرے کرنل عیزرا ای وینٹین ہیں جو معتبر ہیں۔ اسرائیل کے انتہائی رجعت پسند طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کا یہی موقف انتہائی امریکی نواز اور سامی دشمن ہے ان کے اقوال پر کسی بھی طرح بائیں بازو یا اشتراکیت پروپیگنڈہ کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی ان کو صہیونیت کے خلاف متعصب کہا جا سکتا ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

[illegible]

بقیہ ۔ مولانا ابوالحسن ندوی کا [illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible] ہے کہ [illegible]

[illegible]

[illegible] کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] ایشیائی قومیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی مذہب کی [illegible] سے سرفراز کیا ہے یہ ان کا موقع تھا کہ دنیا کو [illegible] سبق دیتے، دنیا کے سامنے خلوص کا ایک نمونہ پیش کرتے [illegible] جو انسانی مسائل صرف قابلیت، ذہانت، سائنس اور [illegible] سے حل نہیں ہو سکتے وہ خلوص سے حل ہو سکتے [illegible] خدا کے پیغمبروں کو دیکھئے کئی صدیاں گذر گئیں لیکن آج [illegible] دنیا ان کا کلمہ پڑھتی ہے۔ ان سے محبت رکھتی ہے [illegible] ادب و احترام کے ساتھ ان کا نام لیتی ہے اور دنیا [illegible] دو بڑی جنتریاں ایک عیسائی جنتری شمسی اس کا حساب [illegible] آفتاب سے چلتا ہے اور ایک اسلامی جنتری قمری اس کا حساب [illegible] سے چلتا ہے۔ یہ دو پیغمبروں کی یادگاریں ہیں، دنیا اپنے تمام کاموں میں ان کی پابند ہے، کتنا گہرا نقش [illegible] ان کا انسانی تہذیب پر، انسانی زندگی پر۔

یہ نتیجہ خلوص کا ہے، ہم ہندوستان میں [illegible] کا ایک نمونہ پیش کرتے، پہلے تو ہم اپنے ملک [illegible] زندگی کا تجربہ کرتے، ہم دکھاتے کہ ہم [illegible] سے کتنا بڑا کام لے سکتے ہیں، ہم دکھاتے [illegible] محبت میں کیا طاقت ہے۔ کیا جادو ہے [illegible] دنیا [illegible] جو نایاب ہو چکی ہے جس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا [illegible] سکتا ہے۔ [illegible] اور [illegible] اٹھے [illegible] سے تعلق نہیں ہوتا۔ ہر شخص یہ انتظار کرتا ہے کہ اب اس کی غرض سامنے آئے گی [illegible] کہ اب بعض بعض ملک ایسے ہیں جن کی حکومت کی فضا شک و شبہ پر [illegible] ہے۔ انہوں نے انسان پر اعتماد کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے، ان کی ساری فلاسفی یہ ہے کہ انسان اعتماد کے قابل نہیں ہے اور ہر انسان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں [illegible] پر بھروسہ نہیں رہا، پورے پورے ملک میں شک و شبہ کی فضا [illegible] ہے۔ ہر شخص دوسرے کے متعلق غیر مطمئن رہتا ہے [illegible] ہو سکتا [illegible] نہیں [illegible] کھل کر بات نہ کر سکے۔

[illegible] وقت ہم [illegible] زندگی کے [illegible] مسائل [illegible] وقت [illegible] ایشیائی ممالک [illegible] کرتے ہیں، [illegible] بالکل [illegible] زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ایک حقیقت ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] انسانی [illegible] جاتا تھا، ہر بات

[illegible] سے [illegible] اور ملک کے [illegible] ہے، ہم [illegible] ہم [illegible] مریض ہو [illegible] لیکن وہ مریض ہو جاتے [illegible] انسان شک و شبہ کا بیمار ہو جاتا ہے۔ انسان کو بہت [illegible] مایوسی پھیل جاتی ہے اور اس کی [illegible] ہو جاتی ہے کہ وہ سب سے مایوس ہو کر ملک کی حالت سے [illegible] مایوس ہو کر وہ اپنے فائدے کو سوچنے لگے۔ یہ [illegible] بن گئی ہے، یہ بالکل سکرات کی کیفیت ہے۔ جب انسان انسانیت سے مایوس ہو کر اپنی قوم سے مایوس ہو کر [illegible] سے مایوس ہو کر، ملک کی اصلاح سے مایوس ہو کر یہ کہے کہ اب تو جو کچھ ہو سکے [illegible] چاہیئے۔ ہمیں اپنا فائدہ دیکھنا چاہیئے اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیئے کہ ہم اس ملک کو درست کریں گے۔ اس ملک کو کوئی درست نہیں کر سکتا، یہ ملک اگر نہیں ڈوبا تو اب ڈوب جائے گا، اگر یہ مریض ذہنیت پیدا ہو جائے تو ملک کبھی سنور نہیں سکتا۔ یہ وہ کیفیت ہے جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس قوم کو بچانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت [illegible] یہ [illegible] سب کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ملک کا [illegible] ہے، اس کا [illegible] سے ہے، اس میں [illegible] نہیں سکتا [illegible] کرتا ہے [illegible] اس [illegible] ذہنیت ہے۔

اس وقت ملک کی جو کیفیت ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ اپنی زبان سے [illegible] اپنے [illegible] اس [illegible]

[illegible]

کسی وقت بھی تھے ... ... یہ تو ہم ...
دوسروں سے بھی بہت تنگ ہیں کہ ایسی حالت میں ان کی یہ
بات سوچی اس وقت تو دیکھنا چاہیے تھا کہ کونسی چیز
کا صرف ہے جس کی جان بچائی جا سکے کہ کشتی یا سامان تو
اس کے جو نشان پر پانی تک لانا چاہیے تھا اور جو کچھ بھی
ہمدردی ان کے ساتھ کی جا سکتی تھی کرنی چاہیے تھی۔
بجائے اس کے کہ ان ... جان بلب ہو کر رہیں۔
اس واقعہ کو تو آپ اتنی نفرت کی نگاہ سے دیکھیں
گے اور لعنت بھی بھیجیں گے اور کہیں گے لعنت ہے اس
بے حسی پر اور خدا کا غضب ان پر نازل ہو۔

حضرات! اس صورت حال سے آپ اپنے دل
میں نفرت کا کوئی جذبہ کیوں نہیں پاتے؟ ہماری قسمت
اس ملک سے وابستہ ہے اگر خدانخواستہ یہ کشتی ڈوبی تو
ہم ڈوبیں گے، نہ حاجب اور نہ ڈاچ لوگ بچیں گے اور نہ پڑھے
عالم اور فاضل لوگ بچیں گے۔ کشتی پر بیٹھنے کا ٹکٹ سب
کو دینا پڑے گا، کشتی ڈوب گئی تو اس کی فکر نہ کریں گے کہ
اس میں نیک اور پارسا لوگ ساحل پر اتر جائیں یا آسمان
سے کوئی ایسی چیز اترے جو نیک لوگوں کو اچک لے جائے۔ یہ
انہونی باتیں ہیں، عقل تجربے اور تاریخ کے خلاف ہیں
جب کشتی ڈوبے گی تو سب کو لے کر ڈوبے گی۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ ملک کو وہ پرانا
ہوائی جہاز ... سمجھ رہے ہیں کیا کوئی اور کسر باقی ہے
کیا ہم اور آپ کسی اور ایکشن کے انتظار میں ہیں ہم آج
ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمارے ملک میں سب
کی نظر اس پر ہے کہ جو فائدہ مذاق طور پر ہم کو پہنچ سکے اس
میں ہم کمی واقع نہ ہو۔ کرپشن کا بازار گرم ہے کام میں کامیابی
عام ہے۔ اپنا فائدہ اٹھا لینا، اپنا حق حاصل کر لینا اور
دوسرے کا حق دبانے کا کوئی ... کی کوشش ... کی
خواہش نہیں آج حالت یہ ہے کہ ایک سرے سے
لے کر دوسرے سرے تک کسی کو یہ فکر نہیں کہ اس سے
دوسرا بھی شہری ہے دوسرے سے ... کا ...
نہیں کہ اس سے انسانیت کا ... ...
کا ... ...

شائع شدہ ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈر برائے ٹینڈر اس محکمے کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے مطلوب ہیں جنہوں نے سالِ رواں کی تجدید فیس جمع کرا دی ہے۔ مطلوبہ ٹینڈر مندرجہ ذیل تاریخ اور وقت پر ٹھیکیداروں کے نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ (۱) مشروط اور بذریعہ تار کام بھیجے ہوئے ٹینڈر قبول نہ ہوں گے۔ (۲) ٹینڈر بغیر وجہ بتائے خداوند کریم پارٹی کو کال قبول نہ ہوں گے۔ (۳) ٹینڈر کا اعلانات یعنی تفصیل وغیرہ دفتری اوقات میں دفتر ہذا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ (۴) فرم کی صورت میں پارٹنر آف اٹارنی یا قاعدہ متعلقہ کاغذات پر مجسٹریٹ درجہ اول سے تصدیق شدہ ٹینڈر کے ہمراہ لگانا ہوگی۔ ... کو زیر دستخطی کو تمام یا کوئی ٹینڈر مسترد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ (۶) ٹینڈر فارم متعلقہ ہیڈ کلرک سے ٹینڈر وصول کرنے سے ایک دن پہلے قیمتاً لیے جا سکتے ہیں۔

نمبر شمار	کام کی تفصیل	ٹینڈر وصول اور کھولنے کی تاریخ اور اوقات	تخمینہ	زر ضمانت	مدت
(۱)	گوجرانوالہ ڈسٹری بیوٹری کے ساتھ سیوریج مہیا کرنا اے ایس ٹی ایم سپیسیفیکیشن کے آر سی سی پائپ سیور کا مہیا کرنا، بچھانا، کاٹنا، لگانا اور ٹیسٹ کرنا	۱۳-۳-۱۹۷۵			
	گروپ اے ۳۳ انچ اور ۳۶ انچ قطر	۱۱ بجے صبح	۱۱ لاکھ	۲۲ ہزار	۶ ماہ
	گروپ بی ۴۲ انچ قطر	ایضاً	۹ لاکھ	۱۸ ہزار	۶ ماہ
	گروپ سی ۱۵ اور ۱۸ انچ قطر	ایضاً	۵ لاکھ ۵ ہزار	۱۰,۳۰۰/-	۶ ماہ
(۲)	اربن سیوریج سکیم سیالکوٹ اے ایس ٹی ایم سپیسیفیکیشن کے آر سی سی پائپ سیور کا مہیا کرنا، بچھانا، کاٹنا، لگانا اور ٹیسٹ کرنا ۱۸ انچ قطر	ایضاً	۲۰,۰۰۰/-	۴۰۰	۲ ماہ
(۳)	شیخوپورہ سیوریج اینڈ ڈرینج سکیم فیس I پارٹ I اندرون پالا اے ایس ٹی ایم سپیسیفیکیشن کے آر سی سی پائپ سیور کا مہیا کرنا، بچھانا، کاٹنا، لگانا اور ٹیسٹ کرنا				
	گروپ اے ۲۴ اور ۲۷ انچ قطر	[illegible] گیارہ بجے صبح	۸ لاکھ	۱۶ ہزار	[illegible] ماہ
	گروپ بی [illegible] انچ قطر	ایضاً	۳,۲۰,۰۰۰/-	۶,۴۰۰/-	۳ ماہ
(۴)	[illegible]	[illegible]	۱۲ ہزار	۲۴۰	۱۵ یوم

[illegible] ... ڈپٹی ... ایکسین ... گوجرانوالہ

IPL-604

۱۰ مارچ ۱۹۷۵ء

[illegible]

[illegible] اور عزت

اور ایسی صورت میں کوئی چیز بچائی نہیں جا سکتی۔ اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جو کوشش کی گئی کرنی چاہیے تھی وہ اس سے دس گنا زیادہ کرنی چاہیے تھی اور وہ سب لوگ قابل مبارک باد ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں نہیں انسانیت کی تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا جنہوں نے یہ مقدس فریضہ انجام دیا، لیکن مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ملک کو آزاد کرانا تو بہت ضروری کام تھا، لیکن قوم کو آزاد کرانے کی بھی ضرورت تھی

قوم کو آزاد کرنے کے معنی کیا ہیں؟ قوم کی ایک ہی غلامی نہیں غیر ملکی ملک کی ایک ہی غلامی ہے۔ ملک کی غلامی تو یہ ہے کہ باہر سے جو طاقت آئے اس پر حکومت کرے، اپنی حکومت کی ایجنسی قائم کرے، اپنا ایڈمنسٹریشن قائم کرے، وہاں ایک نظام لائیں، وہاں سے وہ فائدے حاصل کریں۔

لیکن انسان کو غلام بنانے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں، انسان کو غلام بنانے کے لیے اس کی نفس کی خواہشات ہیں، ظلم کی محبت ہے، ظلم سے نفرت کا نہ ہونا ہے، بے انصافی کا جذبہ ہے، دولت کی حرص ہے، انسانیت کا احترام دور کرتا ہے۔ روپے کی دوڑ بڑھتی ہوئی محبت ہے۔ یہ پانچ باتیں انسان کو غلام بناتی ہیں۔

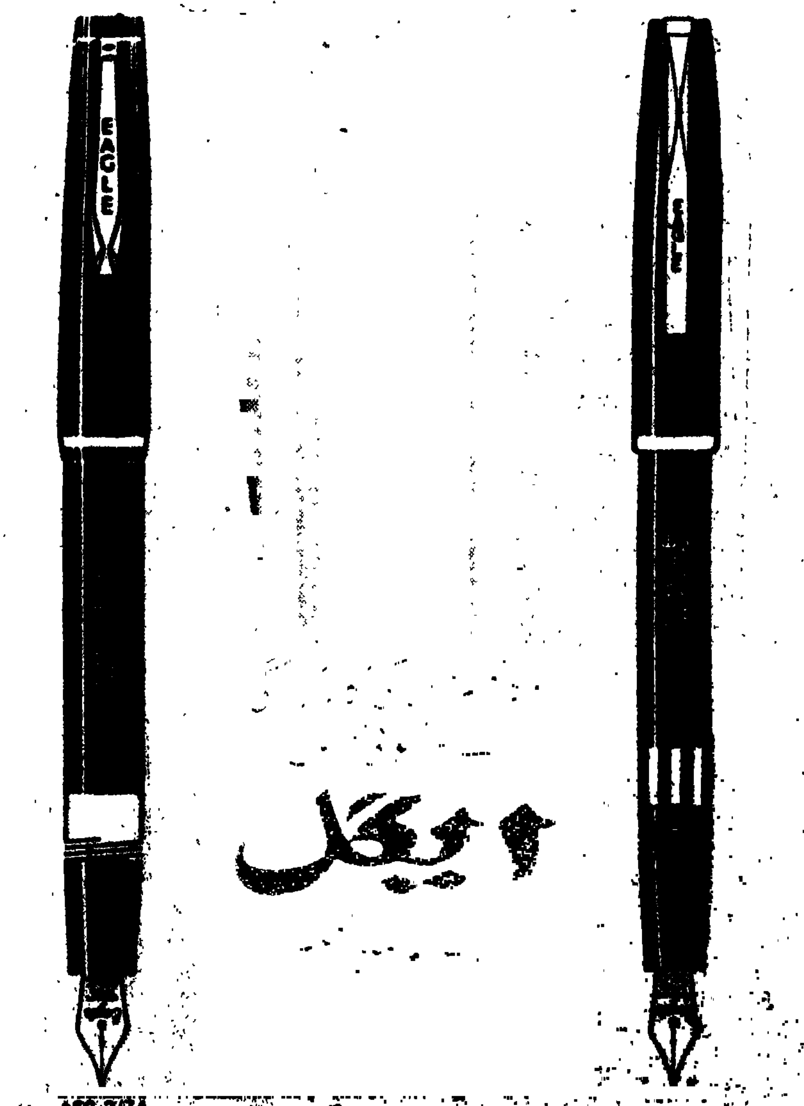
ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کی گئی بہت بڑی کوشش تھی اور ایک منٹ کا غور کر کے کرنی چاہیے تھی قوم کو آزاد کرانا، قوم کے ضمیر کو آزاد کرانا بھی ضروری [illegible] کے آزاد ہونے سے کام نہیں چلتا۔ اب تو یہ [illegible] ہو گیا ہے کہ [illegible] کام نہیں چلا ہم [illegible] قوم کے ضمیر آزاد ہوئے [illegible] آپ کا صحیح علم ہے۔ [illegible]

نہیں کرتا اندر کا بھی کرتا ہے۔

ہم ظلم کے عادی ہو گئے ہیں، ہم کو ظلم کا شوق ہو گیا ہے، ظلم ہمارے اندر سرایت کر گیا ہے، ظلم ہمارا مزاج بن گیا ہے، نا انصافی ہمارا شعار بن گیا ہے پیسے کی قیمت ہم پر اتنی سوار ہو گئی ہے کہ نہ ہم بھائی کو دیکھتے، نہ ہم ماں کو دیکھتے، نہ ہم باپ کو دیکھتے، نہ بیٹے کو دیکھتے ہیں۔ ہم پیسے کو دیکھتے ہیں۔ ہم اپنے لیے مصیبت ہیں، اپنے بھائیوں کے لیے مصیبت ہیں۔ اپنے ملک کے لیے مصیبت ہیں، اور اگر آپ مجھے معاف کریں اور بدگمانی نہ کریں تو میں کہوں کہ باہر کی غلامی سے یہ ضمیر کی غلامی کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ہم نے ملک کو تو آزاد کرایا اور آزاد کرانا چاہیے تھا، لیکن قوم کو آزاد کرانا، اس کے ضمیر کو آزاد کرانا، اس کی بیڑیاں و ہتھکڑیاں اس کے ضمیر کو دھونا، پاک کرنا، اس کے اندر سے پاپ کی خواہش اور مال کی محبت نکالنا اس کی ہم نے فکر نہیں کی۔

ظلم کی عادت بڑھنے والا ایک ہندوستانی کا ہاتھ باہر کے ایک جرمن، ایک فرنچ، ایک انگریز سے کچھ کم پاپی نہیں، اگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں تو میں آپ کا ہرگز ساتھ نہ دوں گا۔ میں کہوں گا کہ یہ کھلی ہوئی نا انصافی ہے، انگریز کیا کرتا تھا؟ آپ سے لے کر آپ کے ملک کا انتظام کرتا تھا۔ میں اس کو کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ وہ آپ سے اچھا انتظام کرتا تھا، بہت سخت لفظ ہے، میرا ضمیر احتجاج کرتا ہے مجھے تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن میں



پچھلوں کا اس سے زیادہ آپکو یہاں اطمینان حاصل تھا، کہ آپ ریل پر آنکھ بند کرکے سفر کرتے تھے اور کوئی خیال تک نہیں کرتا تھا کہ ریل پر کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے۔ آج ملک کے پچیس برس ہو گئے۔ ہمارے اندر بچھو جیسے سانپ اور بچھو پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ انگریزوں کو سانپ کہیے یا بچھو کہیے مگر یہ سانپ اور بچھو آپ سے ہمیشہ چپٹے نہیں رہتے تھے۔ یہ تو سول لائن میں رہتے تھے، یہ تو بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے تھے، جب تک یہاں رہتے تھے اپنے ملک کو یاد کرتے رہتے تھے اور جس طریقے سے ہر شام چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف جاتی ہیں اس طریقہ سے جب چھٹی ہوتی تھی، جب گرمی ہوتی تھی تو یہ انگلستان پہنچ جاتے تھے، مگر یہ سانپ اور بچھو تو آپ سے چپٹے ہوئے، چھٹے ہوئے ہیں۔ مال کی محبت، پاپ کا اندر بسیرا کر لینا ہمارے دماغوں، ہمارے دلوں میں پاپ نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ انسانیت کی عزت کا جذبہ ہمارے اندر دلوں سے نکل گیا ہے۔ ہمارا فائدہ ہو، ہمارا کام نکل جائے، ہمارا الو سیدھا ہو جائے باقی ہمیں مطلب نہیں۔

دفتروں، کچہریوں، اسٹیشنوں اور ڈاک خانوں غرض ہر جگہ ابتر حالت ہے، یہ محکمے انگریزوں کے زمانہ میں خوش انتظامی اور باقاعدگی میں ضرب المثل تھے، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے خط بھی میرے پاس بہت آتے ہیں اور میں بھی بہت خطوط لکھتا ہوں، مجھے ڈاک خانہ کا تجربہ ہے، ریل کا سفر بھی بہت کرتا ہوں بہت سے سفر اپنی قسمت میں لکھوا کر لایا ہوں خدا جانے کب ان کی فہرست پوری ہوگی۔ ہندوستان کے اندر اور باہر بھی سفر کرتا ہوں۔ مجھے ریل کا خوب تجربہ ہے کوئی کام بغیر پیسہ دیئے ہوئے ہوتا ہی نہیں۔

سیٹ بک کرانے جائیے تو جواب ملتا ہے نہیں ملتا ہے سیٹ نہیں، سب سیٹیں الاٹ ہو گئی ہیں۔ اور جب وہاں پہنچے کمپارٹمنٹ میں تھرڈ کلاس ہو یا فرسٹ کلاس میں تو معلوم ہوتا ہے کہ چار چار سیٹیں خالی جا رہی ہیں اب وہاں کاروبار ہو رہا ہے، بات بہت کڑوی ہے اور میں بھی ذائقہ رکھتا ہوں، کڑوے اور میٹھے کا فرق سمجھتا ہوں، میں اس وقت جو الفاظ کہہ رہا ہوں اپنے منہ میں کڑواہٹ محسوس کر رہا ہوں اور مجھے تکلیف ہوتی ہے

ہفت روزہ چٹان لاہور

آج ہمارے ملک کا حال کیا ہے یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کس نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں یہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے؟ میں تو اتنا سادہ لوح نہیں ہوں کہ یہ مان لوں۔ میں تو اپنے عزیز دوستوں سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کیا دو یونیورسٹیوں پر بڑا ناز کر رہے ہیں ہمارے یہاں آیئے ہندوستان میں آپ تو فہرست پڑھتے پڑھتے اکتا جائیے گا اتنی یونیورسٹیاں ہیں۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پیسے کی کمی اس کا سبب ہے؟ سبب یہ ہے کہ ہمیں بنانے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ ملک کے آزاد کرانے کی کوشش جس طرح کی گئی اس کے چوتھائی حصہ بلکہ پانچواں حصہ اس قوم کو بنانے کی کوشش کی گئی ہوتی۔ ان کو درست کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی اور اس کے اندر اخلاقی بنیادیں قائم کی جاتیں جس سے آدمی آدمی بنتا ہے جس سے آدمی اپنے مرتبہ کو پہچانتا ہے۔ جس سے وہ سمجھتا ہے کہ پاپ، ظلم، ناانصافی، خیانت بری چیز ہے۔ دوسرے کا پیسہ میری جیب میں آئے گا وہ پیسہ نہیں، یہ زہر ہے، یہ پھندا ہے، یہ سانپ ہے، یہ احساس ہی نہیں ہوگا اس کے نزدیک پیسہ ہونا چاہیئے اس سے مطلب نہیں جس راستے سے آئے چاہے۔

بھائی آپ درخت لگاتے ہیں اور درخت ہے نیم کا۔ آپ اس کی سینچائی کیجئے، پانی دیجئے اس کے بعد نبولی اس سے پیدا ہو۔ آپ چکھیں اور اس سے آپ کے منہ کا مزہ بدل لے تو آپ کہیں لعنت ہو اس درخت پر، ہم نے اس کی اتنی خدمت کی، اس کو پانی دیا، مگر ہم یہ امید کرتے ہیں کہ پھل میٹھا ہے کوئی سمجھدار آدمی آپ کی بات نہیں مانے گا۔ ارے بھائی! تم نے نیم کا درخت کیوں لگایا تھا؟ تم نے نیم کے درخت سے توقع کیوں کی کہ تمہیں الہ آباد کا امرود کھلائے۔

ہم نے جو درخت اس ملک میں لگایا اور ساری مغربی تہذیب لے آئے ہیں سب کو کہتا ہوں اور میں سب کے خلاف احتجاج کرتا ہوں، بلکہ آپ کی عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کرتا ہوں۔ ایک منصف جج سے آج فیصلہ کرانا چاہتا ہوں۔ میں اس معزز عدالت میں، اس الہ آباد میں کھڑے ہو کر یہاں کے اس نامی ہائی کورٹ جس نے ہزاروں آدمیوں کو، ہزاروں مظلوموں کو ان کا حق دے دیا ہے اور ہزاروں یتیموں اور بیواؤں کو ان کی جائداد دلائی ہے۔ میں آج اس میں ایک اخلاقی مقدمہ دائر کرتا ہوں، میں عدالت کو محدود نہیں سمجھتا ہوں کہ اس کو اخلاقی مقدمہ کا بھی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اگر میری پہنچ وہاں تک نہیں ہے تو آپ کی ضمیر کی عدالت میں آپ کے دلوں کی عدالت میں جس نے یہ عدالت پیدا کی ہے، آپ کے دل نہ ہوتے، آپ کے روشن دماغ نہ ہوتے، آپ کا علم نہ ہوتا، آپ کی کوشش نہ ہوتی تو یہ عدالتیں کہاں ہوتیں، یہ عدالتیں آپ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آپ ان عدالتوں کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں۔ آج میں آج کے پورے فلسفۂ زندگی کے خلاف اس پوری مادہ پرست تہذیب کے خلاف، موجودہ سیاست کے خلاف ایک نالش کرتا ہوں، میں آپ سے پوچھتا ہوں، مجھے آپ جواب دیجئے، آپ نے جو درخت لگایا تھا آپ کو اس درخت سے کیوں شکایت ہے کیا آپ

اس درخت کی فطرت، اس درخت کی تیر کے خلاف اس کو بغاوت کرنے کی خواہش رکھتے تھے؟ آپ کی خواہش جائز نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو عاقل بالغ انسان بنایا ہے۔ آپ سے کہا ہے کہ یہ آم کا درخت ہے یہ نیم کا درخت ہے، یہ امرود کا درخت ہے یہ سیب کا درخت ہے، زمین بنا کے اس نے یہ اعلان کیا کہ میں نے زمین کو حکم دیا ہے کہ جیسا بیج ڈالا جائے وہ اسی طرح کا درخت پیدا کرے، میں نے بارش کو حکم دیا کہ اس درخت میں اس کے قطرے جائیں اور اس درخت کی فطرت کے مطابق اس کی صلاحیت کو ابھاریں۔ نہ بارش میرے حکم سے سرتابی کر سکتی ہے نہ زمین میرے حکم سے سرتابی کر سکتی ہے لیکن میں تمہیں اے انسانو! اے پڑھے لکھے انسانو! اور عاقل بالغ انسانو! میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم نیم کا درخت لگاؤ۔ چاہے سیب کا درخت لگاؤ، آپ نے نیم کا درخت لگایا، آپ کا انتخاب یہی تھا، اور اب آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں آپ کا انصاف یہ کیسا؟

ہم نے نیم کا درخت لگایا، ہم نے کسی بچے کو نہیں بتایا کہ خدا ہے۔ ہم نے کسی بچے کو سبق نہیں پڑھایا کہ مرنا ہے، ہم نے کسی بچے کو سبق نہیں پڑھایا کہ اوپر خدا اور نیچے انسان ہے ہم نے کسی بچے کو یہ سبق نہیں دیا کہ پرائمری اسٹیج سے لے کر مجھے معاف کیا جائے، الٰہ آباد یونیورسٹی کے آخری اسٹیج تک پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ ریسرچ وغیرہ کے آخری اسٹیج تک ہم نے ایک دن اس کو نہیں بتایا۔ ہم نے کیا کیا چیزیں بتائیں؟ وہ چیزیں بتائیں جس کے بتانے سے انسان کی قسمت نہیں بدلتی جس کے نہ جاننے سے انسان کی قسمت نہیں پھوٹتی، وہ اگر جانے اچھا، وہ اگر نہ جانے تو کوئی نقصان نہیں، ہم نے وہ چیز اس کو تو کوئی نقصان نہیں، ہم نے وہ چیز اس کو نہیں بتائی جس کے جاننے سے انسان کی قسمت بدل جاتی ہے، یہ دنیا جنت بن جاتی ہے، جس کے نہ جاننے سے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ دنیا جہنم ہے کسی اسٹیج پر ہم نے اپنے بچے کو یہ بتایا کہ مسلمان [illegible]

اور نہ بچے کو یہ بتایا کہ میاں، سمجھا، انسان سب سے بڑی چیز ہے، یہ خدا کا پیدا کیا ہوا خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ ہے، یہی تمہاری سب سے بڑی خدمت ہے کہ اس کی سیوا کرو۔ اس کے دل کو خوش کرو جیسے تمہارے ماں باپ انسان ہیں یہ بھی انسان ہیں، یہ بھی کسی کا باپ ہے، یہ بھی کسی کا بیٹا ہے۔ ہم نے کبھی یہ بتایا کہ یہ پیسہ جو ہم ناجائز طریقہ پر لیتے ہیں یہ پیسہ نہیں ہے یہ آگ کا انگارہ ہے۔ یہ خدا تعالیٰ

اشتہار زیر دفعہ ۵۔ رول ۲۰، مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب محمود خالد سول جج گجرات

درخواست سرٹیفکیٹ جانشینی نمبر ۵

مورخہ ۲/۷۵-۲۱

مسماۃ سکینہ بی بی بیوہ میاں خاں قوم گوجر سکنہ دریاکسانہ تحصیل گجرات (مدعیہ)

بنام: طارق محمود پسر (۲) منور بی بی (۳) فرخ تسلیم دختران نابالغان بذریعہ رحمت خان ولد فضل داد قوم گوجر سکنہ مذکور (مدعا علیہم)

بذریعہ عوام الناس

مسماۃ سکینہ بی بی مذکور (مدعیہ)

بنام طارق محمود وغیرہ بذریعہ عوام الناس (مدعا علیہم)

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی عوام الناس مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے، اس لیے اشتہار ہذا بنام طارق محمود عوام الناس، مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر طارق محمود عوام الناس مذکور تاریخ ۲۷ ماہ مارچ ۷۵ء کو بمقام گجرات حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا، تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آئیگی آج بتاریخ ۲۶ ماہ فروری ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

کے پیغمبروں نے بتایا اور آپ نے ایسی سوسائٹی پیدا کی کہ واقعی انسانوں نے اس کو انگارہ سمجھا انگارہ سے بڑھ کر سمجھا، جہاں ایسے واقعات پیش آتے کہ دنیا کے بادشاہوں کے تاج ان کے قدموں کے نیچے تھے، اور ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ میاں پیٹ پر پتھر بندھے ہوتے تھے اور اگر وہ چاہتے تو اچھے اچھے پکوان پکا سکتے تھے اور بڑے جشن منا سکتے تھے، لیکن نظر اٹھا کر بھی انہوں نے نہ دیکھا۔

ہمارے ملک میں انسان اور انسانیت کی پامالی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند کسی دفتر جاتا ہے تو اسے غرض مند دیکھ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شکار پھنس گیا، موٹا شکار ہاتھ آگیا، گویا انسان نہ ہوا کوئی چوپایا موذی جانور ہوا کہ جو پنجرے میں پھنس گیا ہو۔

بھائی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارا ایک بھائی آیا ہے، اس کا کام ہمارے ذریعہ سے ہو جاتے اور ہم اس کا دل خوش کر دیں یہ ہماری سعادت ہے کہ ہمیں اپنے ہی بھائی اور اپنے جیسے ایک انسان کی خدمت کا موقع اللہ تعالیٰ نے نصیب کیا۔

یہ کیا ذہنیت ہے، یہ کیسی شقاوت ہے کہ بیچارہ ایک غرض مند ہمارے پاس آئے اور ہم یہ کہیں کہ ایک شکار پھنس گیا۔ اب اس سے خوب وصول کریں گے، اپنے خاندان کی کئی فرمائشوں کو پورا کرنا تھا خوب موٹا شکار ہاتھ آیا ہم نے اس کو یہ کیوں نہیں سمجھا کہ یہ اپنی ماں کا لاڈلا اور باپ کی آنکھ کا تارا ہے۔ یہ بیمار پڑتا تھا تو اس کی ماں آنکھوں میں رات کاٹ دیتی تھی کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر اس کو پالا گیا کیا اس دن کے لیے اس کو پالا تھا کہ آپ اس کا خون چوسیں اور کیا اس کی یہی قیمت تھی کہ آپ اس سے چند پیسے وصول کریں؟

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

بقیہ: میاں فضل محمد

کرو، رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔"

(النساء آیت۔ ٥٩)

"اے نبی تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔" (سورہ النساء آیت ٦٠)

فی زمانہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد محض مورو ثی مسلمانوں پر مشتمل ہے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق اور رازق ماننے کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اسے ایسا نا و بینا نہیں سمجھتے کہ وہ انہیں اپنے معاملات زندگی کو صحیح طریق پر چلانے اور زمین پر بھلے آدمیوں کی طرح رہنے سہنے کے لیے ضابطہ حیات بنا سکے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین (یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں قیامت تک کے لیے خدا کی طرف سے مقرر رہنما) بھی قرار دیتے ہیں، مگر مسجد کی چار دیواری سے باہر یا سوائے چند ذاتی معاملات کے کسی معاملے میں راہ نمائی دینے کے قابل نہیں مانتے، وہ قرآن حکیم کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانیت کی راہ نمائی کے لیے نازل کی گئی ہے لیکن

بقیہ صفحات طرتہ

خود اسے اپنی زندگی کا قانون و ضابطہ بنانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اب فرمائیے، صورت احوال یہ ہو تو کیا یہ حیران کن اور اصول فطرت کے منافی ہوگا کہ اپنی بوجھ سوجھ کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کے لیے کوشاں قوم اس قوم پر مسلط ہو جائے، جو خدا کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ کھیلتی اور اسے پس پشت ڈالے ہوئے ہو، حالانکہ اسے قرآن پاک اور سنت محمدؐ کے مطابق دنیا کی اصلاح و راہ نمائی کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔

محترم احباب و اخوان! اگر ہم چاہتے ہیں، کہ قبلہ اول اور سرزمین بیت المقدس واپس مل جائے، فلسطین، قبرص، اری ٹیریا، بھارت، برما تھائی لینڈ اور فلپائن میں مسلمانوں کا خون خرابہ بند ہو جائے، تمام دنیا میں مسلمان قوم کے درمیان حقیقی اور فعالی اتحاد پیدا ہو، اگر ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ عراق کی سرزمین سے ایک اور صلاح الدین ایوبیؒ جنم لے تو ہمیں اسلام کی خالص اور بے آمیز تعلیمات اور ضوابط حیات کی بنیاد پر مسلمان افراد اقوام اور ممالک کی تعمیر نو کا سنجیدگی سے فکر کرنا ہوگی، کیونکہ اسی صورت میں اور اسلام ہی کی بنیاد پر ہم عالمگیر مسلم اتحاد کو متشکل کر سکتے ہیں، اور اس طرح کے اتحاد کے بغیر ہم اسلامی دنیا کو درپیش اہم مسائل میں سے کسی ایک کو بھی حل نہیں کر سکتے چاہے وہ صیہونیت کے استعماری عزائم کا مسئلہ ہو، مسجد اقصیٰ اور فلسطین کا مسئلہ ہو، اری ٹیریا قبرص اور کشمیر کا مسئلہ ہو یا دنیا میں مختلف خطوں میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنے رہنے والے مسلمانوں کے گوناگوں مسائل ہوں۔

جہاں تک اس کانفرنس کے مقاصد کے حصول کے طریقوں کا تعلق ہے، مختلف حضرات کی طرف سے بہت سی مفید تجاویز پیش کی گئی ہیں، اور بہت سی اور پیش کی جائیں گی، لیکن میں سمجھتا ہوں، کہ اس بارے میں ٹھوس اور قابل عمل نتائج تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تجاویز کو زیر بحث لانے سے پہلے ان پر موتمر کی ذیلی مجالس میں غور کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ میں پرزور سفارش کرتا ہوں، کہ موتمر کو اس کانفرنس کے ساتھ ہی ختم نہ ہو جانا چاہیے، بلکہ ایک مستقل سیکرٹریٹ کے ساتھ اسے ایک باقاعدہ و باضابطہ تنظیم بنا دینا چاہیے، جو اس موتمر کے فیصلوں پر عملدرآمد اور خصوصاً امت مسلمہ کے احیاء اور تعمیر نو کے انتظامات کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ:-

(١) "اگر تم اہل ایمان کی روش پر قائم رہو، تو تم ہی غالب رہو گے۔"

(آل عمران- ١٣٩)

(٢) "تم اللہ کی مدد کرو، تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

ان ارشادات الٰہی سے صاف واضح ہو جاتا ہے، کہ اہل ایمان و اسلام کا غلبہ مشروط ہے ان کے ایمان کی روش پر قائم اور خدا کے مددگار ہونے پر۔

اپنی ان گزارشات کے آخر میں ایک مرتبہ پھر میں کانفرنس کی مکمل کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں اور عراقی حکومت اور اس کے صدر محترم کا شکر گزار ہوں، کہ انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمان علماء کو مجتمع کر کے انہیں اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ دنیا کی مسلم آبادی کو پیش آمدہ اہم مسائل پر غور و فکر کریں، ان کے حل کے بارے میں انہیں ضروری مشورے دیں، میں موتمر، حکومت عراق اور تمام دوسرے متعلقین کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان اور اس کے عوام ہمیشہ فلسطین اور مسجد اقصیٰ کی آزادی کی جدوجہد میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

★ ★ ★

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ

ایک خطہ کے بسنے والوں کی خوشحالیوں سے
دوسروں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی

زندگی ہے سو بہر حال گزر جائے گی !

طفل تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے ؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسل کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین سے سلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کرہ پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے وہی پائیں گے۔ ایسے میکانکی آلات، نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا مگر اس امکان کے تصور کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں ہاں وہ انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا معاملہ ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں طمانیت و عافیت کی میٹھی چھاؤں بن جاتی ہیں۔ انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم کر کے پیدا کی گئی ہے اور معاشی سرمایہ محدود پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آ سکے، لیکن قدرت کا یہ الٰہی فیصلہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کی کیفیت اس میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہوئی ... معلوم ہوتا ہے کہ

زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورتِ حال سے ہے، جسے دیکھئے، جس طرف دیکھئے، یہی آرزو آرہی ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اسی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان کہ ہر جینے والا بھی یہی کہتے ہوئے مر رہا ہے ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے، حیات کی یہ قید ان کو کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے، اسی لیے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

کا فیصلہ کیا جاتا ہے، کبھی یہی غالب 'زندگی' کو 'سوز' اور 'سوز' کو 'زندگی' بناتے ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ زندگی کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو، غالب کی نگاہوں میں وہ جلتی ہوئی ایک شمع ہے۔ کسی رنگ کی چمنی اس پر چڑھائی جائے، سبز ہو یا سرخ، لیکن جب تک روشن ہے جلے گی اور جب تک جلتی رہے گی اسی وقت وہ روشن ہے، شیراز کے عارف کو تو کہنا پڑا کہ ؎

زگل از داغ غمت رست نہ بلبل در باغ
ہمہ را نعرہ زناں جامہ دراں می داری
(حافظ شیرازی)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب و تکلیف کی اسی کیفیت کا احساس موجودہ زندگی میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثنا بھی ہو، جیسے ہر کلیہ میں استثنا بھی ایک کلیہ ہے۔ لیکن اضطراب و بے چینی، کرب و تکلیف کے عام ہنگاموں میں ٹٹولنے والوں کو عموماً یہی چھپا یا چھپا ہوا نظر آیا ہے کہ سب کچھ چاہتے ہیں لیکن چاہنے والوں کی چاہ کو پورا کرنے کے لئے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے وہ ایک ایسے محدود پیمانے پر پیدا ہو رہا ہے۔ جس سے یہ سب کی چاہ پوری نہیں ہو سکتی۔ اکبر مرحوم نے فرمایا تھا ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے کتاب اسکو کیا پڑھیگا
حدود فطرت کے ہیں مقرر جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

لامحدود خواہشوں والی فطرت کا رُخ ایسے محدود سرمائے کی طرف پھیر دیا گیا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت لامحدود نہیں بنا سکتی، محدود پر لامحدود کا انطباق چونکہ نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خواہشوں کے جس محدود حصہ کو تکمیل کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اس وقت آدمی مسرور ہوتا ہے لیکن نہ پورے ہونے والے ارمانوں کا بھرتا قافلہ عدم کی راہ سے رہا ہے اسی

کا ماتم ہے جس کے غم میں اولادِ آدم سوگوار ہے مسکین شاعر نے کتنے دردناک پیرایہ میں کہا تھا۔

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سینکڑوں ارماں
عدم کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

پھر کیا کیا جائے ؟ کیا چھوڑ دیا جائے اسی حال میں آدمی کو تڑپتا پھڑکتا چھوڑ دیا جائے کہ وہ جنت بنا سکے گا ہرگز نہ کرو اس کو

اکبر یونہی چلی ہے دنیا یونہی چلے گی

کہتے ہیں کہ "الیاس احدی الراحتین" قنوطاور مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے اسی قسم کی راحت جو امیدوں اور ارمانوں کے پورے ہونے سے ہوتی ہے۔ شعر کی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ سُن بھی لیا جائے۔ لیکن کامیابی کی مسرت اور ناکامی کی خاموش کھسیاہٹ حقیقت بینوں کی نگاہ میں ایک نہیں ہو سکتی، اگر راحت کی یہ دونو شکلیں ایک ہی ہیں تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے ایک کو دوسرے سے بدلنے کے لیے کیا کوئی تیار ہو سکتا ہے ؟

یہ نہیں تو طفل تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے ؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسل کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سُلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کرہ پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسّر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے وہی پائیں گے، ایسے میکانکی آلات نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا۔

ایسا ہوگا بھی یا نہیں اسے تو جانے دیجئے کم از کم قرآن کو جو خدا کا کلام مان چکے ہیں، ان کے لیے تو اس امکان کے تصور کی جیسا کہ گزر چکا ہے قطعاً گنجائش نہیں یا السرتق کی جن سے اطلاع سے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام نسبا کی حالت میں جس سے پیدا ہو، اس کا پیاسے پن کی پیدائش یہاں نہ ہو گی، پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنہوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ آج نہیں تو کل ایسا ہو کر رہیگا تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یا فتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جا سکتا ہے۔ دریہ کے تندرست ہو جانے سے غریب عمر کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی۔ مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتایئے کہ حال والوں یا ان کے لیے جو کڑھتے اور جھینکتے، چلاتے اور کراہتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے، مر رہے ہیں، مرتے چلے جائیں گے۔ ان مسکینوں کی تسکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے۔ ؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے رہنے والوں کی مشکلات کا صحیح حل اگر یہ واقعہ نہیں ہو سکتا، کہ امریکہ یا ارجنٹائن، برازیل یا ٹمبکٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں ہیں، پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوشحالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی تو ایک عہد کی نسلوں کی شیریں کامیوں کے وعدے صرف وعدوں سے کیسے کر سکتے ہیں ؟ آپ جنت میں رہنے والوں کو یہ سنا سنا کر کیا خوش کرتے ہیں کہ ان کے پوتے جنت میں پیدا ہوں گے، اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو مستقبل کے مشکوک بے بنیاد الٰہی وعدوں کی کیا ضرورت ہے ؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے۔ بتا چکا ہوں کہ انسان سکینت و طمانیت کی جس کیفیت کے لیے تڑپ رہا ہے، یہ مرہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت بغیر کسی کد و کاوش، دردسری اور محنت کے حاصل ہے جو انسان بن کر دنیا میں نہیں پیدا ہوتے ہیں دوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کر سکتا ہے تو شاخساروں پر چہچہانے والی چڑیوں ہوا میں تیرنے والی مچھلیوں اور مرغابیوں، مرغزاروں میں کلیلیں بھرنے والی ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے ادھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے مستقبل کے شنیدہ مواعید سے آپ کی فطرت اگر تسکین حاصل کر لیتی تو انسان کے سوا ہر دوسری زندہ ہستی دیدہ کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت اسی کیفیت کو تقسیم کر رہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے تو پھر دوسروں میں خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنیٰ ؟

خیر کہاں تک چلا گیا ہوں اور جنہوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد نہیں کیا ہے، ان سے کیا بات تو یہ ہے کہ میرا ان سے خطاب بھی نہیں ہے، فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں، کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لیے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سیدھے سادے مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ الرزق یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رُو سے اس دنیا میں غیر مبسوط یا غیر مبسوط یا غیر محدود شکل اختیار نہیں کر سکتا، اس کی عدم مبسوطیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے وہی کل بھی رہے گا اور جب تک یہ حال ہے الخیر کے حُبّ شدید کے روگی اور ہلوعیت اور عدم سیری و بے صبری کے [illegible] میں [illegible] مبتلا انسان کی بے چین فطرت اپنی لامحدود [illegible] کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پا کر ہمیشہ بے کلی و بے چینی کی اس حالت میں تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانون ازالہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے آپ دیکھ چکے کہ معاشی زندگی کی اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے، زور آزمائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے اور جو باقی ہیں انہیں بھی ختم کر رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے بجائے ازالہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے وہ کتنی سادہ کتنی آسان کتنی سہل الوصول ہے، ایسی راہ سننے کے سننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کہہ اٹھیں کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے ایسی بات جس سے کون ناواقف ہے اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں، کہ آسانیوں کو غلط کار [illegible] نے کیوں دشوار بنا لیا۔ قدرت ظالم نہیں [illegible] اپنے بندوں کے لیے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے، تمام تقویموں میں سب سے احسن سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا، امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا۔ ایک لمحہ کے لیے کوئی باور کر سکتا ہے کہ قصداً "وارادۃً" ایک ایسی زندگی اس اسی کے گلے میں لٹکا دی گئی جو جہنم بن کر اسے لپٹ گئی، ایسی جہنم جس میں وہ جھلس رہا ہے تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھُن رہا ہے اور اس طور پر جل بھن رہا ہے کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکالنے میں بیکار ثابت ہو رہی ہیں، ذہنی ارتقار اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لیے ٹھہرایا جا رہا ہے، اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی وعدوں کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی اُمید ہے، بہرحال بجائے ازالہ کے امالہ کی جس عجیب و غریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف سے جو منسوب کر رہا ہوں، آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہتا ہوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں الدین یا مذہب کے نام ہی کو اسی امالہ کی واحد بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں، خود ہی سوچ لیجیے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی نا کہ زندگی کے موجودہ دَور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں الحیوۃ الدنیا ہے ــــــ اسی الحیوۃ الدنیا کو لامحدود قدرت و قوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اس لیے گزارنا تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں یعنی وہی:

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے۔

جس کا قرآنی خلاصہ ہے، جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا، یعنی حضرات رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے پیش ہوتی رہی ہے کون نہیں جانتا، کہ اس کا اصل یہی ہے۔ مذہب جس چیز کا نام ہے، یہ تو اس کا حاصل ہوا لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لبریز فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جو انگارے دہک رہے تھے مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا۔ انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی شکل اختیار کر کے آدمی کو جو تڑپا رہے تھے، شاداب بڑھتی ہوئی امیدوں اور ارمانوں کے پھول بن بن کر وہاں جہاں آگ صرف آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تروتازہ نعمتوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں اپنے کانوں پر بھی نہیں ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسول اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا مادہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں چین کی، اور ساری پریشانیاں سکون و عافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں، فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کے لیے بجز اس کے چارہ نہ تھا پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا، اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے، اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے والوں پر ہے نہ کہ اس پر کہ جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے، اسی امداد کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے، لیکن بدیہات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے، قرآن پڑھیے ان تنبیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے۔

بقیہ: حمید نظامی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

ہمارے اساتذہ جو حمید نظامی کے ساتھ قلم کے سفر میں شریک رہے ان سے مستفید ہوئے اور ان کا براہ راست مطالعہ کیا اور نوائے وقت کا صحافت کے سلسلے میں تحقیقاتی مطالعہ۔

ظاہر ہے کہ حمید نظامی نے نوائے وقت کو محض اخبار نہیں رہنے دیا بلکہ ایک ذہن، ایک تحریک، ایک جہد اور ایک دعوت بنا دیا اسے شہرت اردو اخبارات میں پہلی دفعہ صرف نوائے وقت کو حاصل ہوا اگر جو فوقیت کبھی انگریزی اخبارات کو حاصل تھی وہ اردو کے ایک اخبار کو عوام و خواص میں حاصل ہو گئی۔ نوائے وقت کا مطالعہ حاکمیت نے اپنے اوپر فرض کر لیا حتیٰ کہ نوائے وقت کی تنقید و تجویز مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کی ہر بڑی شخصیت کا لازمہ ہو گیا۔ نوائے وقت نے

۱۔ اخبار کی زبان پیدا کی۔

۲۔ خبروں کو تبصروں سے ملوث نہ کیا۔

۳۔ اداریہ کو سلیس و مستدل کیا۔

۴۔ یگانوں اور بیگانوں کے خوف سے بے نیاز رہا۔

۵۔ عوام کے مذاق سے پرہیز کیا۔

۶۔ قارئین کے ذہن پر فالتو الفاظ اور فالتو جذبات کا بوجھ نہ ڈالا۔

۷۔ اپنے صفحات کو میناباز ار بنانے کی بجائے سنجیدہ افکار کا گہوارہ بنایا۔

اداریات آج بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ نوائے وقت پاکستان کی ۳۰ سالہ تاریخ کی سب سے بڑی دستاویز ہے اس دور کے سب سے بڑے ایڈیٹر کا نام حمید نظامی تھا۔ ان کا دامن جلب زر، زرخرید اقتدار کے بوجھ سے پاک رہا۔ (بشکریہ نوائے وقت)

بقیہ: سترھواں مقالہ

ضرب کلیم کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں؎

صیاد معانی کو یورپ سے ہے نومیدی
دلکش ہے فضا لیکن بے نافہ تمام آہو

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

یہ اور اس قسم کے بہت سے اشعار اسی ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اقبالؒ کو یورپین کلچر کی روح سے سخت نفرت تھی یہ نفرت لینن، ایچ۔ جی۔ ویلز، برنارڈ شا، اور سپنگلر کی نفرت سے جداگانہ ہے کیونکہ یہ لوگ اس نسخہ شفا کو حاصل نہیں کر سکے جو صرف اسلام کے پاس ہے اقبال کے پاس ایک ایسا نظام فکر موجود ہے جو ہر لحاظ سے مغرب کے امراض کا علاج ثابت ہو سکتا ہے۔ کاش مغرب اقبال کی آواز کو سن سکے، لیکن اگر مزعومہ بلندی و تفاخر کا خیال باطل اہل مغرب کو ایک مشرقی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے مانع آئے تو پھر اپنے ہی ایک ہم وطن برگساں سے ان امراض اور پریشانیوں کا علاج دریافت کر لیں جو اقبال کی زبان میں یہ کہتا ہے سنائی دیگا؎

نقشے کہ بیستائی جز اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

اقبالؒ کے فرسودہ روایت اور مستقبل کے جن درجہ سے مخالفت کی بات کا ذکر اگلے مقالہ میں آئے گا۔ انشاء اللہ

از عبدالحکیم عامر
شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ

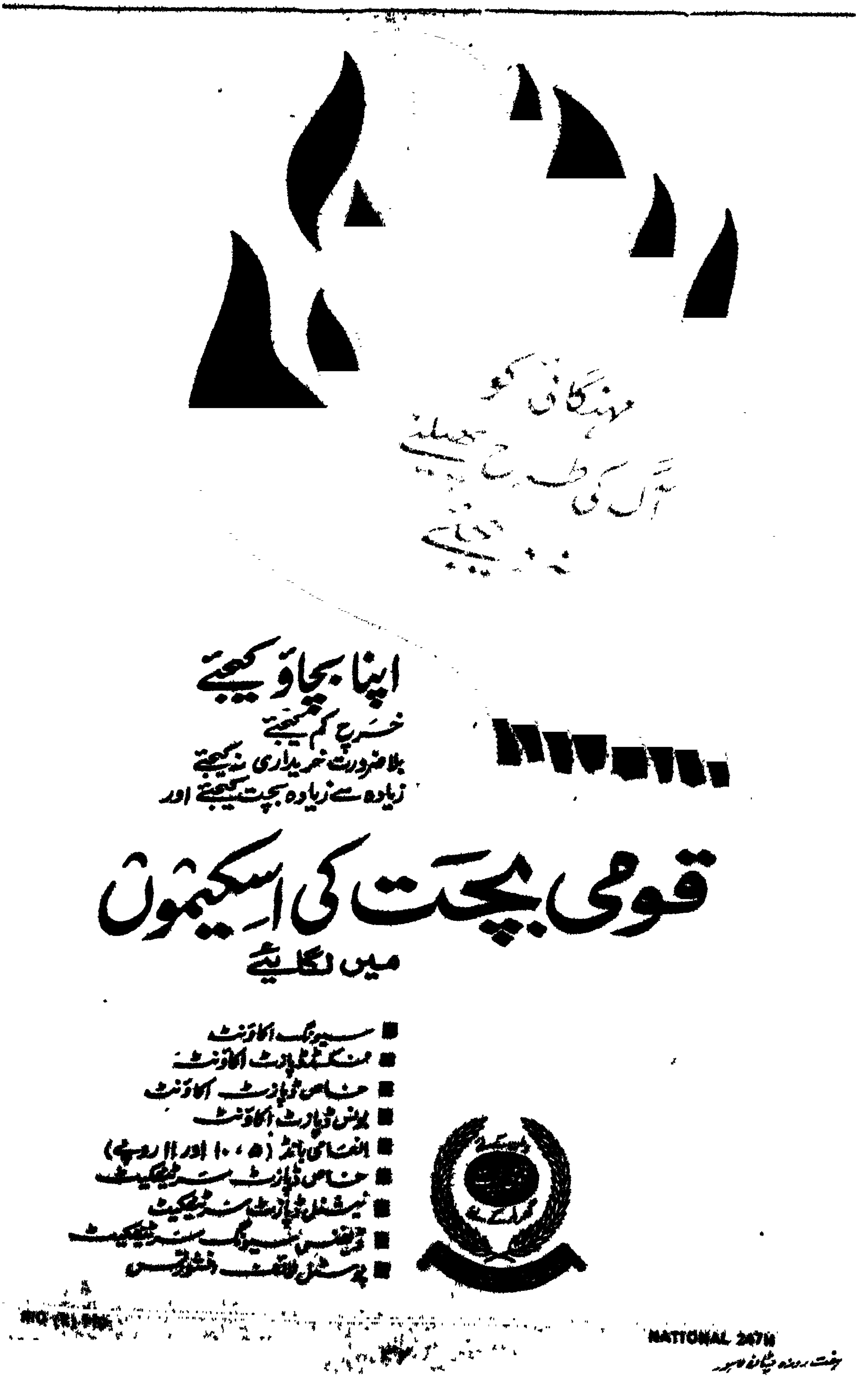
وقت کروٹیں بدلتا رہیگا، اور انسان پردۂ عدم سے بساط ہستی پر جلوہ گر ہوتے رہیں گے، مگر ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اپنی تمام زندگی رضائے الہٰی اور تقوٰی میں گزار دیتے ہیں اور انسانوں کو خاص ارفع واعلیٰ مقصد سے آگاہ کر دیتے ہیں، انسان اگر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سبق حاصل کریں تو وہ اپنی دنیا وعاقبت سنوار سکتے ہیں۔ داتا علی ہجویریؒ بھی انہی انسانوں میں سے تھے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی جتنی خدمت کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ داتا علی ہجویریؒ مسلمانوں کی تاریخ میں کسی ڈھکی چھپی شخصیت کے انسان نہیں ہیں آپ نے حیات میں تو اسلام کی خدمت کی، مگر دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی فیض عام کا سلسلہ جاری و ساری ہے، آپ کے فیض عام کی مثالیں یوں تو بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن بہت ہی اہم اور خاص مثال حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ہے، جنہوں نے آپ کی درگاہ سے فیض حاصل کیا، پھر فیض یاب ہونے کے بعد بے ساختہ آپ کے لب پر یہ اشعار آ گئے ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہ نما

آپ نے اپنی زندگی اور تقویٰ کا اظہار حیات میں تو کیا دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی فرمایا۔ عام لوگ تو رہے درکنار بڑے بڑے بادشاہوں نے منوایا، جب آپ کے مزار اقدس پر آج بھی کوئی شخص حاضر ہوتا ہے تو وہاں کا نظارہ اور ماحول دیکھ کر آپ کی بزرگی اور رتبے کا قائل ہو جاتا ہے، وہ یوں کہ وہاں پر امیر و غریب دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق دیکھنے میں نہیں آتا، وہاں ہر وقت ہی نور الہٰی کی بارش ہوتی رہتی ہے اور وہاں پر موجود ہر شخص کا چہرہ نور سے منور نظر آتا ہے، کوئی گناہ گار جب اپنے چہرے کی روسیاہی لے کر وہاں حاضر ہوتا ہے، پھر جب وہاں سے فیضیاب ہو کر واپس لوٹتا ہے تو اس کا چہرہ نور علیؒ سے منور ہوتا ہے۔

آپ کا اصلی نام علی لقب گنج بخش جس سے معین الدین چشتی اجمیریؒ نے آپ کو نوازا تھا، آپ ۴۰۰ھ میں شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ کے گھر پیدا ہوئے آپ کے نام کے ساتھ ہجویری کا لفظ اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ آپ نے اپنی زندگی کے کچھ ایام غزنی کے ایک شہر ہجویر میں گزارے تھے یوں تو آپ کے والد صاحب بھی بہت اللہ والے انسان تھے لیکن پھر بھی آپ روحانی طور پر سلسلۂ جنیدیہ کے شیخ ابوالفضل بن محمد بن حسن سے فیض یاب ہوئے، بچپن میں ابتدائی تعلیم کئی ایک مشائخ سے حاصل کی، جب آپ نے مختلف علوم دین سے آشنا ہو گئے تو آپ نے اسلامی ممالک کا سفر شروع کیا، اپنے اس دورے کے بعد سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اپنے دو ساتھیوں کی معیت میں لاہور پہنچے۔ لاہور پہنچنے کے بعد یہاں پر آپ نے اسلام کی خدمت جاری رکھی اور فروغ اسلام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا، اس کے بعد درس و تدریس میں لگ گئے۔ آپ نے مختلف کتابیں لکھیں جو آپ کے ادبی ذوق کا ثبوت ہیں، ان تصانیف میں کشف الاسرار، کشف المحجوب، البیان اور منہاج الدین شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ آپ کی بزرگی کے چرچے دور دور تک پھیل گئے، اور کتنے ہی غیر مسلموں نے آپ کے

(باقی صفحہ ۳۳ پر)



مہنگائی کو
آگ کی طرح پھیلنے
نہ دیجئے
اپنا بچاؤ کیجئے
خرچ کم کیجئے
بلا ضرورت خریداری نہ کیجئے
زیادہ سے زیادہ بچت کیجئے اور
قومی بچت کی اسکیموں
میں لگائیے
سیونگ اکاؤنٹ
خاص ڈپازٹ اکاؤنٹ
بونس ڈپازٹ اکاؤنٹ
انعامی بانڈ (۵، ۱۰ اور ۱۱ روپے)
خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ
پوسٹل لائف انشورنس
NATIONAL 247 H

بقیہ: داتا گنج بخش

ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس عہد میں مختلف صوفیاء فرقے تھے، آپ نے جب ان سے آشنائی کی تو آپ کو ان کی تعلیمات اور کردار پسند نہ آئے، چنانچہ آپ نے طعن کرتے ہوئے فرمایا،

"میں نہیں جانتا، فارس کون ہے، اور ابو سلمان کون، انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا، لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے۔ اس کا دین جو اصل ہے، مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس کی شاخ ہے، کس طرح مفید ہو سکتا ہے"؟

آپ کی تصانیف میں سے کشف المحجوب ممتاز حیثیت کی حامل ہے، کیونکہ یہ مکمل اور جامع ہے، اس کتاب میں بڑے بڑے مشائخ کے اقوال تصوف کے طریقے تحریر کئے گئے ہیں، کشف المحجوب کے بعد قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے، کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس زمانے میں اس دور کے صوفیاء کرام کے درمیان سماع کا رواج تھا۔ داتا علی ہجویریؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"کرمان میں ایک دفعہ میں شیخ ابو مظفر کی خدمت میں حاضر ہوا، سفر کے کپڑوں میں تھا اور تھکان کی وجہ سے پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔"

فرمایا: "کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے"

میں نے فوراً کہا:

"مجھے اس وقت سماع کی خواہش ہے"

انہوں نے فوراً ایک قوال کو بلا لیا اور اس کے ساتھ سماع پسند حضرات بھی سماع کے دوران میں اتنا [illegible] گیا کہ مجھے کوئی ہوش [illegible] اور جب قوالی ختم ہوئی تو آپ نے مجھ سے پوچھا:

"کیوں قوالی پسند آئی"؟

میں نے جواب دیا:

"بہت"

انہوں نے مجھ سے کہا:

"یہ بات میری نوٹ کر لو، کہ ایک وقت وہ آئے گا، کہ تمہیں قوالی (سماع) میں اور کتے کی آواز میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا کیونکہ جب تک مشاہدہ حاصل نہ ہو، قوت سماع حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب مشاہدہ حاصل ہوتا ہے تو قوالی کی طلب ہٹ جاتی ہے"

آپ بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ زاہد بھی تھے اور متقی بھی، آپ کے متعلق شاعر مشرق اقبال علیہ الرحمۃ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے، جو آپ کی بزرگی سے متاثر ہو کر کہے ؎

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم
بندھائے کوہسار آساں گسیخت
در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروقؓ از جمالش تازہ شد
حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

بقیہ: شذرات

کے ایک جلسہ میں جہاں میاں صاحب تقریر کر رہے تھے ایک دھماکہ ہوا۔ دوسرا دھماکہ اب ڈیرہ غازی خان میں ہوا ہے۔ اس کے خلاف فوری کارروائی کی جائے۔

ہمارا پہلا ذہنی ردِ عمل یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ کیا ہمیں اپنے ملک سے محبت نہیں۔ جو لوگ اسلحہ کے تجربے کر رہے ہیں وہ ایک لحظ کے لیے سوچیں کہ ان کے دھماکوں سے کس کا نقصان ہے۔ اور کس کا فائدہ؟ اس سلسلہ میں حکومت کی بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ان دھماکوں کا ہر قیمت پر خاتمہ کرے اور ان عناصر کی سختی سے باز پرس کرے جو اس کے محرک و مسئول ہیں۔ بلوچستان اور سرحد میں تو گرفتاریاں ہو رہی ہیں لیکن میاں صاحب کے جلسہ میں جس پر اسرار جیب نے دھماکہ کرنے کا حوصلہ کیا وہ کہاں گئی اس کا پولیس کی پکڑ سے بچ جانا ہمارے لیے لطیفہ غیبی ہے۔ ملک کی ہر سیاسی جماعت کو سوچنا چاہیئے کہ اس قسم کے دھماکے ملک میں

بعدالت جناب خان محمد ارشد خان۔ سول جج درجہ اول / رینٹ کنٹرولر / باختیارات جج فیملی کورٹ سرگودھا۔

(۱) گل محمد ولد محمد بخش قوم رانجھا (۲) اللہ بخش ولد مولا بخش قوم رانجھا (۳) اللہ بخش ولد علی محمد قوم رانجھا (۴) خضر حیات ولد شیر قوم بجرا (۵) سکندر ولد گل محمد قوم بجرا (۶) نبی بخش ولد فضلاں قوم راں (۷) احمد یار ولد محمد یار قوم رانجھا سکنہ موضع مرولیانوالہ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا (مدعی)

بنام (۱) محمد اسلم (۲) سکندر حیات پسران غلام علی (۳) الطاف حسین ولد محمد علی (۴) محمد حیات ولد شیر علی (۵) سکینہ بی بی زوجہ شیر علی (۶) محمد بخش (۷) محمد افضل (۸) محمد اسلم (۹) محمد افضل پسران مانک اقوام شیخ اعوان (۱۰) مسماۃ نسیم اختر زوجہ عبدالقیوم قوم رتہ (۱۱) محمد نواز ولد محمد شیر (۱۲) محمد یوسف ولد محمد شیر (۱۳) اطہر ایوب ولد محمد یعقوب (۱۴) محمد صادق (۱۵) محمد یار پسران قادر بخش (۱۶) غلام رسول (۱۷) محمد حسین (۱۸) محمد انور پسران صدر دین (۱۹) محمد نذیر ولد رحمت خان قوم بھٹی (۲۰) دوست محمد ولد تاجہ (۲۱) منظور احمد ولد دوست محمد اقوام پنجوتھہ (۲۲) محمد علی (۲۳) غلام علی پسران شیر محمد قوم پنجوتھہ (۲۴) خدا بخش ولد نیادہ (۲۵) غلام مصطفیٰ ولد خدا بخش (۲۶) مختار احمد (۲۷) اللہ یار پسران محمد عبداللہ (۲۸) محمد دین (۲۹) محمد عظیم پسران یاسین قوم ملک موضع للیانی تحصیل بھلوال (۳۰) دوست محمد (۳۱) خدا بخش (۳۲) محمد بشیر (۳۳) محمد نذیر پسران نبی بخش اقوام راں (۳۴) فضل خان (۳۵) عتیق خان پسران حکیم قوم راجپوت (۳۶) فتح محمد ولد نیادہ (۳۷) شان محمد (۳۸) امان اللہ پسران حیات، غلام ولد لوا قوم جوہ سکنائے موضع مرولیانوالہ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا

(مدعا علیہم)

دعویٰ دخلیابی بذریعہ حق شفع

مقدمہ عنوان بالا میں گل محمد وغیرہ نے مقدمہ دائر کیا ہوا ہے اور مدعا علیہم دانستہ طور پر حاضر ہونے سے گریز کر رہے ہیں اور روپوش ہیں۔ اس لیے اشتہار ہذا بنام مدعا علیہم جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم مذکور تاریخ ۱۳ مارچ ۷۵ء کو مقام سرگودھا عدالت ہذا میں حاضر نہیں ہوں گے تو ان کے خلاف قانونی کارروائی یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

دستخط: سول جج درجہ اول

مہر عدالت

ایک ایسے ذہن کی آبیاری کر رہے ہیں جو کسی کے لیے سود مند نہیں ہے۔

گمنام اور بے پتہ خطوط

اخبارات کے دفتر میں خطوط کا انبار لگا رہتا ہے۔ بعض اصحاب اپنا پتہ دیئے بغیر خطوط لکھتے اور جواب کے لیے اخبار میں طالب ہوتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اخبار اجتماعی مسائل کے لیے ہوتے ہیں، انفرادی مسائل کے لیے نہیں۔ ان کا جواب خط ہی کے ذریعہ دیا جاسکتا ہے۔ کئی صاحب بعض افراد کے متعلق شدنی و ناشدنی باتیں لکھ کر ڈنڈ پیلنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس طرز کے مضامین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین و خطوط کے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں۔

پریس برانچ سے

ہم نے گزشتہ شمارے میں ایک قادیانی جریدے کی بدزبانی کا ذکر کیا اور اس امر پر افسوس کیا تھا کہ حکومت کا متعلقہ محکمہ اس سے فیاضانہ سلوک کر رہا ہے۔ سوال اس کے خلاف کسی اقدام کا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اس ہفتہ وار کے لیے کوئی وار تنگ نہیں اس کو گالی بکنے کی علانیہ چھٹی ہے؟ اگر حکومت نے اس کو اسی طرح چھٹی دیئے رکھی تو پھر ہم اس سے تو کبھی مخاطب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں اور نہ اس کا وجود لائق اعتنا ہے۔ لیکن ہم اس شکل طرح مرزا غلام احمد کی قبر کھود دیں گے۔ مرزا بشیر الدین کا

پوسٹ مارٹم کریں گے اور ناصر احمد کو ادھڑے پر لا کر پہنچا دیں گے کہ اس کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ اس وقت شاید صوبائی حکومت کو لا اینڈ آرڈر کا احساس ہوگا کیونکہ قادیانی امت لا اینڈ آرڈر کی چہیتی اولاد ہے۔

بقیہ: یوم حمید نظامی

بشیر ناظم نے اپنے خوشگوار لحن میں حمید نظامی مرحوم پر ایک نظم سنائی اور بشیر کاظمی نے قرطاس وقلم کے زیر عنوان اپنی پُرسوز لے میں ایک دلگداز نظم سے سامعین کو تڑپا دیا۔

آخر یہ تقریب ٹھیک دو بجے اختتام پذیر ہوا۔

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب سینئر سول جج گجرات

دعویٰ یا اپیل دیوانی نمبر ۱۷۳ ۔ آف ۱۹۷۴ء

(۱) غلام حسین ولد غلام قادر قوم قریشی (۲) اعجاز حسین ولد شیخ عبدالعزیز قوم بابا سکنہ جلالپور جٹاں۔

بنام عبدالحمید ولد غلام مرتضیٰ قوم بھٹی سکنہ کالا چودھری تحصیل وضلع گجرات۔

غلام حسین وغیرہ

بنام عبدالحمید ولد غلام مرتضیٰ

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی عبدالحمید مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے اس لیے اشتہار ہذا بنام عبدالحمید مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر عبدالحمید مذکور تاریخ ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء کو مقام سینئر سول جج صاحب گجرات حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۲۲/۲/۷۵ کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سینئر سول جج

مہر عدالت

ہفت روزہ چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ـــــ شمارہ ۱۱
۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء
قیمت ـــــ ایک روپیہ

اسلامیات سے گریز و فرار

بے دین دانشوروں کی چہلیں

یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مرکزی اور صوبائی محکمہ ہائے تعلیم میں کس قسم کے لادین دانشوروں کی ایک بڑی اکثریت موجود ہے جو اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ شاید ماہر تعلیم ہے اور علم اُن کا ہم زلف آدھ مختصر دور کے بعد پاکستان ہمیشہ اس خسران میں مبتلا رہا کہ مرکزی وزارت بھر سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں رہی جنہیں علم سے شاید اتنا تعلق بھی نہ تھا کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔ صوبائی وزارتوں کا مسئلہ اس سے بھی افسوسناک بیشتر وہ لوگ تعلیمی وزارت کی مسند پر فروکش ہوتے رہے جنہیں علم اور تعلیم سے نہ تھا۔ اگر ان وزرا کے لطائف جمع کئے جائیں تو ایک نئی داستانِ لطائف ی ہے۔ ان لوگوں کے سیکرٹریٹ میں بعض ذہین لوگ بھی رہے اور اُن سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی فضا بھی خوشگوار رہی لیکن تعلیم کا محکمہ سے ان دھبوں کو دُور نہیں کر سکتا کہ اُس نے نئی نسلوں کو تیار کرنے کی نسلوں کے برباد کرنے میں زیادہ حصہ لیا۔ علامہ اقبال نے غلط نہیں کہا تھا کہ نے میں علم گھٹ گیا اور تعلیم بڑھ گئی ہے۔ پہلے علم زیادہ تھا اور تعلیم کم زیادہ ہے اور علم کم تر۔ لیکن دس بارہ برس سے تعلیم کا نقشہ بھی مسخ ہو گیا نسلوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق وسعت پذیر ہے۔ لیکن سیاسی آلودگیوں ذہن کو غارت کر دیا ہے اور سو میں سے بمشکل تمام دس نوجوان علمی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس قدر اساتذہ آج گذرے ہیں اس سے پہلے سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ سیاسی مداخلت نے درسگاہوں یا ہے۔ جب صورت حال کی خرابی کا یہ حال ہو کہ فلاں کالج کا پرنسپل اور ی پارٹی کا ذہن نہیں رکھتا لہٰذا اُس کو کسی پسماندہ ضلع کے پسماندہ کیا جا سکے اور اس قسم کی تبدیلیاں روزمرہ ہوتی رہیں تو درسگاہوں کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو گی۔ ہم تعلیمی اداروں اور اُن سے منسلک بعض استادوں کی سوانح عمری بیان کرنے کے عادی نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بیشتر اساتذہ نے طالب علموں کو اپنے لہو و لعب میں شریک کیا اور انھیں جام و سبو کے علاوہ کئی اندوہناک علتوں کا چسکہ ڈالا۔ حتیٰ کہ طالبات کی درسگاہیں بھی سیاسی ذوق کا شکار ہو چکی ہیں۔ جب درسگاہوں کی براہِ راست حالت یہ ہو تو محکمہ ہائے تعلیم سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ہم انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں کہ جو لوگ آجکل تعلیم کے محکموں میں دانشور ہونے کی کلغی لگا کر بیٹھے ہیں اُن میں چند ایک خوشگوار دماغوں کو چھوڑ کر اکثریت شکستہ ذہن لوگوں کی ہے۔ اب معیارِ علم نہیں رہا شکم ہو گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر دردناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ وائس چانسلر اپنے طلبا۔ کی نگہداشت نہیں کرتے بلکہ اُن کے خلاف سرکاری گواہ بننا اپنے فرائض کا جزو لاینفک گردانتے ہیں۔ مثلاً پچھلے ہی دنوں پولیس نے یونیورسٹیوں کی مختلف اقامت گاہوں میں چھاپے مار کر اسلحہ برآمد کیا تو وائس چانسلروں کا کردار تعلیمی نہیں تھا بلکہ واضح طور پر سیاسی تھا لیکن یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس کے لیے موضوع بھی دوسرا ہے فی الحال ہمارے سامنے وزارتِ تعلیم کے ماہرین کا تعلیمی کردار ہے۔ اس خبر نے سارے ملک کو چونکا دیا ہے کہ انٹرمیڈیٹ میں سے اسلامیات کو جو پہلے ہی اختیاری مضمون ہے بعض دانشوروں کی تجویز پر خارج کیا جا رہا ہے اور اُس کی جگہ موسیقی کو شامل کیا جا رہا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے اس کی اصل شکل کیا ہے لیکن جن دانشوروں نے نصاب کا یہ نقشہ تیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے وہ نہ تو اس ملک کی بنیادوں سے واقف ہیں نہ اس قوم کے مزاج سے آشنا ہیں اور نہ انہیں مسلمانوں کی نفسیات سے آگاہی ہے، اگر فی الواقع ایسی کوئی تجویز پروان چڑھانے کا منصوبہ زیر نگاہ ہے تو ہم کسی

رقص و غنا سے نہیں بچ سکتے بندروں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جن لوگوں نے یہ خاکہ تیار کیا ہے وہ نہ تو اس ملک کے خیر خواہ ہیں، نہ اس قوم کے مزاج داں ہیں اور نہ انھیں ملتِ اسلامیہ کی تعلیمی ضرورتوں سے آگاہی ہے۔ اسلامیات کو خارج کر دینا اور موسیقی کے مضمون کو شامل کرنا احمقانہ جسارت ہے۔ اس قسم کی تجاویز ماہرینِ تعلیم کے ذہنوں میں نہیں آتیں وہ لوگ ہی اس کی جسارت کر سکتے ہیں جن کا رشتہ طاؤس و رباب سے ہو۔ ہم "نوائے وقت" کی اس تجویز سے کاملاً متفق ہیں کہ جن نام نہاد ماہرینِ تعلیم نے یہ خاکہ مرتب کیا ہے انھیں تعلیمی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی شخص کو قومی تقاضوں کے بے دریغ پامال کرنے کی ہمت نہ ہو۔ ہم اس سلسلے میں ملک کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو سے اپنے محسوسات و تجربات کی بنا پر عرض کریں گے کہ وہ ان لادین دانشوروں سے قوم کو نجات دلائیں جن کی دانشِ مستعار اسلام سے مذاق کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی اور جنہیں اس امر کا مطلقاً احساس نہیں کہ پاکستان مسلمانوں کی آرزوؤں کا گہوارہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان دانشوروں کو خود مسٹر بھٹو کی سیادت اور حکومت کا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہن میں اس کے سوا کوئی خاکہ نہیں کہ مسلمانوں کو ان کی تعلیمات سے محروم کیا جائے پھر ان کے اذہان میں افراتفری پیدا ہو اور وہ ان منتشر خیالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کا انقلاب اور اپنی مرضی کا اقتدار لا سکیں۔ ان لوگوں کی واحد طاقت حکومت ہے خود مٹھی بھر بھی نہیں۔ اگر ان میں حوصلہ اور قابلیت ہے تو مسلمانوں کے سامنے آئیں اور کسی بھی اجتماع سے اس امر کا فیصلہ حاصل کریں کہ ان کی تعلیمی تجاویز مسلمان رد کرتے یا قبول کرتے ہیں۔ اس غرض سے وہ کوئی سا منتخب اجتماع کر لیں مسلمان انھیں چھٹی کا دودھ یاد نہ کرا دیں تو ہم اپنے لیے ہر سزا تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر اس ملک میں ہمیں اسلام کے تابع ہو کر نہیں رہنا تو پھر کس کی متابعت ہم پر فرض ہے؟ کیا ہم نے یہ ملک لادین دانشوروں کے لیے بنایا تھا؟ ہم ان کی جاگیر ہیں یا ان کی غذا؟

ہفت روزہ چٹان لاہور

انھیں محسوس کرنا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان زیادہ دیر تک ان کی شرارتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ انھیں کسی مرحلے میں سبق سکھانے کی ضرورت محسوس ہو۔ کبھی ان لوگوں نے سوچا ہے کہ ان کے نقشہ ہائے تعلیم نے کوئی قابلِ فخر وجود پیدا کیا ہے یا قوم ان کی بدولت کسی معراج کو پہنچی ہے؟ علامہ اقبالؒ نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ایک بیان میں کہا تھا کہ ہر ملک کی تعلیمی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کا تعلق ہے ان کے لیے خالص دنیاوی تعلیم نے اچھے نتائج پیدا نہیں کیے۔ یہ اس وقت کا بیان ہے جب ہم انگریزی حکومت کے غلام تھے لیکن مسلمانوں کے لیے ان کے مدرسوں اور کالجوں میں اسلامیات کا اہتمام تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد اسلامیات کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے تھا نہ کہ اس کے متعلق اس قسم کی تجاویز سامنے لائی جائیں کہ اسلامیات کا وجود ہی نہ رہے اور مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ان زاغ ہائے وغیرہ کے ہاتھ میں آ جائے جن کا اپنا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس ۱۹۳۱ء میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے بتایا تھا: "وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلامِ مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے" اسی طرح آپ نے انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی عزائم پر ایک مقالے میں لکھا تھا کہ:

"مسلمان نوجوان کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو اس میں وہ سیر چشمی بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصافِ حسنہ نہیں پیدا ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے لیے مابہ الامتیاز ہیں"

اور یہ الفاظ بھی حضرت علامہ ہی کے خطبہ صدارت سے ماخوذ ہیں کہ:

"مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نا بلد ہیں روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہیں"

(آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۱ء)

بالآخر ہم اس طرز کے تعلیمی خاکے تیار کرنے والے کرگسوں کی خدمت میں علامہ اقبال کا قطعۂ ذیل پیش کرتے ہیں۔

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے
ز بینائے غلط بینے نکوتر!
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمندِ بے دینے نکوتر

وما علینا البلاغ

عوامی میلہ یا بے معنی میلہ

جو چیز آج تک سمجھ میں نہیں آئی وہ عوامی میلہ ہے۔ بالفرض یہ میلہ عوامی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ اول تو یہ میلہ عوام سے کہیں دور فورٹرس سٹیڈیم لاہور چھاؤنی میں ہوتا ہے۔ پھر یہ میلہ نہیں ہوتا پہلے فوجی دور میں میلہ اسپاں تھا اب عوامی میلہ ہے۔ گویا گھوڑوں کا میلہ، انسانوں کا میلہ ہو گیا ہے۔ چونکہ اس عہد میں ہر چیز عوامی ہو گئی ہے اس لیے اس کا نام بھی عوامی پڑ گیا ہے۔ اس میلہ میں عوام تو بہت کم ہوتے ہیں یہی پانچ فی صد البتہ خواص زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر یہ واحد میلہ ہے جس میں روزانہ ایک روپے کے ٹکٹ سے لے کر ۲، ۳، ۴، ۵ اور ۱۵ روپے کا ٹکٹ لگتا ہے اور سیزن ٹکٹ ۳۰ روپے اور ۱۰۰ روپے کا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ذرہ برابر میلہ کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ حکومت اشتہاروں کے بل پر سرکاری اہتمام سے میلہ کرتی اور یہ سب وقت اور پیسہ کا ضیاع ہے۔ آخر اس میں ہے کیا۔ اس میلہ میں کونسی چیز ہے جو ہماری قومی روایتوں اور تہذیبی خصوصیتوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ کیا کتوں کی دوڑ، گھوڑوں کی دوڑ، اونٹوں کا ناچ اور ہیجڑوں کا مجرا۔ حقیقت یہ ہے کہ ا

باقی صفحہ ۳۴ پر

اٹھارھواں مقالہ

از ڈاکٹر سید عبداللہ

مغرب کے سیاسی فکر پر اقبال کی تنقید

اقبال نے مغرب کے سیاسی فکر کے جن چند مباحث پر خصوصی طور سے تنقید کی ہے، وہ چار ہیں
(۱) دین اور سیاست (۲) جمہوریت (۳) نیشنلزم اور (۴) سوشلزم

ان میں سے ہر ایک پر مختصر بحث کی جائیگی

دین اور سیاست

دین اور سیاست کی پرانی بحث میں اقبال لادین سیاست کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مارٹن لوتھر مسیحیت کا سب سے بڑا دشمن تھا جس نے مذہب اور حکومت کو دو مختلف اور مستقل وجود قرار دیا۔ اس کے خیال میں مذہب اور حکومت کی مثال جسم اور روح کی ہے جس کا ربط باہمی زندگی کے لیے ضروری ہے اور جن کا ایک دوسرے سے قطع تعلق موت ہے۔ اقبال کی نظر میں دین اور سیاست ایک ہی وحدت کے اجزا اور لاینفک ہیں۔ چنانچہ گلشن راز جدید میں ہے ؎

تن و جان را دو تا گفتن کلام است
تن و جان را دو تا دیدن حرام است
بدن را تا فرنگ از جان جدا دید
نگاہش ملک و دین را هم دو تا دید
کلیسا سبحۂ پطرس شمارد
کہ او با حاکمی کارے ندارد
[illegible] ما با دل خود

یکی بر ملّت ترکان نظر کن
بہ تقلید فرنگ از خود رمیدند
میان ملک و دین ربطے ندیدند

رموز میں ہے ؎

تا حکومت مسند مذہب گرفت
این شجر در گلشن مغرب شگفت
قصہ دین مسیحائی فسرد
شعلہ شمع کلیسائی بمرد!

'بال جبریل' میں دین و سیاست کے عنوان سے جو قطعہ لکھا ہے، اس میں دین و حکومت کے اس نازک اور ضروری تعلق کے متعلق نہایت ضروری اشارے ہیں ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

اسی کتاب کا ایک شعر ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

'ضرب کلیم' کے ایک قطعہ میں 'لادین سیاست' کو 'کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر' کہا ہے، اور مغربی سیاست کے علمبرداروں کو ابلیسی نظام کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ دورِ جدید کے ترکوں نے یورپ کی دیکھا دیکھی دین اور حکومت کو الگ کر دیا۔ اقبال نے اسے غلط کہا اور کہا کہ یہ تدبیر صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ اس نظریہ حکومت کے خلاف ہے جس کی بنیاد عشق مصطفیٰ پر ہے۔ مصطفیٰ کمال نے یورپ کی اس چیز کو جسے خود اہل یورپ اب پرانا سمجھتے ہیں نیا سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔ حالانکہ مرد مومن کو اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہیئے۔ مگر یہ قوت عمل صرف عشق ہی کی کارفرمائیوں سے ممکن ہو سکتی ہے۔ 'جاوید نامہ' میں لکھتے ہیں ؎

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست
تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' میں علامہ مشرق کی اسلامی اقوام سے اسی لیے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے راہ نما مشرق روح کا سراغ نہیں لگا سکے، چنانچہ ضرب کلیم میں فرماتے ہیں ؎

مری نوا سے گریباں لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

اس سلسلے میں یاد رہے کہ اقبال نے اپنے خطبات میں مسئلہ خلافت کے متعلق ترکوں کے اجتہاد کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس بیان سے یہ واضح نہیں ہو سکا، ترکوں کے اس اجتہاد کی محرک روح اسلامی ہے یا قبائلی یا نسلی حِس جو اسلام کی کمزوری کی وجہ سے ترکی میں بہت ترقی کر چکی ہے۔ 'ارمغان حجاز' میں ترکوں کے متعلق لکھتے ہیں ؎

بملک خویش عثمانی امیر است
دلش آگاہ و چشم او بصیر است
پھر بھی عمومی خیال یہ ہے کہ ترکوں کا تجدد بھی تقلید غیر سے کسی طرح کم نہیں، کیونکہ وہ دین و سیاست کی تفریق کا قائل ہے۔

جمہوریت

اقبالؔ یورپ کے جمہوری نظام کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتے، ان کا خیال ہے کہ یہ جمہوریت بھی استبداد، تسلط اور غلبہ بے جا کی ایک نئی شکل ہے اصولی طور پر اقبال حکومت میں عوام کی مداخلت کے قائل معلوم نہیں ہوتے، اس لیے کہ عوام میں سے ہر فرد کو قدرت نے مصالح حکومت کے سمجھنے کی توفیق نہیں دی۔ آپ نے خلافت اسلامیہ کے موضوع پر جو رسالہ لکھا ہے، اس میں کسی حد تک انتخاب کے طریقے کی تعریف کی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں آہستہ آہستہ اس مسئلے کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی، وہ کسی عالمی نظام کی کامیابی کے لیے ایک کامل طور پر حساس اور خودی سے سرشار فرد کے قائل ہیں، اور نیٹشے کی طرح باشعور اور طاقت ور شخص یا فرد کی حکومت کو جمہوریت سے زیادہ کامیاب اور مناسب خیال کرتے ہیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیٹشے کا راہ نما مادی طاقت کا مجسمہ ہے اور اقبالؔ کا امام مادی قوتوں کے ساتھ ساتھ روحانی قوتوں کا بھی مجموعہ بھی ہے ؎

متاع معنی بیگانہ از دون فطرتان جوئی
ز موراں شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

روسو ایسی جمہوریت کا قائل ہے، جس میں حریت، اخوت اور مساوات بطور اصل الاصول ہوں لیکن جمہوریت کے اصل نقائص کا اسے بھی پورا پورا احساس تھا، چنانچہ اس کا قول ہے کہ ،،

"ایسی طرز حکومت تو فرشتوں کی دنیا کے لیے مناسب معلوم ہوتی ہے ہم انسان تو اس کے قابل نظر نہیں آتے۔ اب یورپ میں بھی جمہوریت کے خلاف زبردست رائے پیدا ہو گئی ہے اور بیسیوں کتابیں اس کی خرابیوں کو ظاہر کرنے کے لیے لکھی جا رہی ہیں اور اس وقت دنیا میں کسی نہ کسی طور پر شخصی آمریت اور پارٹی کی آمریت کی طرف جا رہی ہے۔

اقبالؔ کو سب سے بڑی شکایت جمہوری طرز حکومت سے یہ ہے کہ اس میں قابلیت نہیں عددیت معیار ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے، کہ ایک شخص مقبول ہو تو مگر قابل نہ ہو، اس پر اقبال کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جمہوریت گروہ بندی اور پارٹیوں اور سیاسی فرقوں کو ترقی دیتی ہے۔

ہیرلڈ لاسکی اگرچہ جمہوریت کی خوبیوں کا بے حد معترف ہے، لیکن اسے بھی جمہوریت میں سب سے زیادہ اسی بات کا خطرہ نظر آتا ہے کہ حکومت میں عوام کی مداخلت اور حق رائے دہی کی وسعت پارٹیوں کی بے انتہا کثرت کا باعث ہو رہی ہے جمہور کی آزادی میں لاکھ برکتیں سہی، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ جمہور کا یہ غلبہ عام اور عوام کی مطلق العنانی کسی نظام کو بھی پائدار اور مستحکم نہ ہونے دے گی، اور آئے دن کے انقلابات اور سریع الوقوع تغیرات قومی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ پیدا کریں گے۔ "گلشن راز جدید" میں اقبالؔ نے انہیں نکات کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

فرنگ آئین جمہوری نہاد است
رسن از گردن دیوے گشاد است
چہ بی زن کار روانے در تگ و تاز
شکمہا بہر نانے در تگ و تاز
گروہے را گروہے در کمین است
خدا آن یار اگر کارش چنین است
ز من دہ اہل مغرب را پیامے

کہ جمہور است تیغ بے نیامے
نہ ماند در خلافت عقود زمانی
برد جان عقود و جان جہانی

ان اشعار کے ساتھ ضرب کلیم کے یہ اشعار بھی زیر نظر ہیں ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ، اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

"ارمغان حجاز" میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ اس میں مغرب کے جمہوری نظام کو ملوکیت اور استحصال کا ایک بہانہ قرار دیا ہے، یہ وہ طرز حکومت ہے، جس کا چہرہ روشن اور باطن چنگیز سے تاریک تر ہے۔ اقبالؔ اپنی آخری کتابوں میں جمہوریت کی خرابیوں کے پہلے سے بھی زیادہ قائل نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس میں وہی پرانی ملوکیت، سوداگری اور استبداد موجود ہے۔ قیصر ولیم اور لینن کے مکالمے میں یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ انسانی طبیعت صرف قاہر اور جابر شخصیتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہے۔ مطلق العنان حکومتوں میں جو خرابیاں ہیں، وہی جمہوری اداروں میں بھی موجود ہیں ؎

گناہ عشوہ و ناز بتاں چیست
طواف اندر سرشت برہمن است
اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

ہفت روزہ چٹان لاہور

۱۷ مارچ ۱۹۶۵ء

سماع کی ایک محفل میں

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا

مشہور سوبجرز فیاکٹری کے پروپرائٹر مسٹر رحیم الدین بھٹی کے ہاں ۸ مارچ کی شب کو مجلس سماع منعقد ہوئی۔ احباب منتظر تھے، اخوان، زمان، اور مکان کے حدود کا پورا پورا نقشہ تھا۔ قوال تھے آستانہ گولڑہ شریف کے حلقہ بگوش محمد علی فریدی اور ان کے بھنوا تقریباً دس سال بعد راقم نے مجلس سماع میں شرکت کی اور خط اٹھایا کہ سماع کیا ہے اور اس سے دماغ و دل کن واردات و کیفیات سے محظوظ و مسرور ہوتے ہیں۔

راقم کو اس بحث سے تعلق نہیں کہ دین میں سماع کا درجہ کیا ہے؟ اکابر چشت نے اس کا جواز پیدا کیا اور عجم کی دنیا میں اس کو دلوں تک رسائی کا ذریعہ بنایا، ہندوستان کی فضا میں اس سے تبلیغ بھی ہوئی کیونکہ ہندوستان صدیوں سے نغمہ و آواز کا خطہ تھا اور موسیقی اس کے مذہب کا جزو ہو کر عوام کے خون میں شامل ہو گئی تھی مشائخ کا وہ قافلہ جو برصغیر میں وارد ہوا اس نے انسانی فطرت کا مطالعہ کیا، اُس کی عمیق نگاہ بھانپ گئی کہ ہندوستان کے عوام کس انداز میں سچائی قبول کر سکتے ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی دوسرے ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ جب زبان کا اختلاف ہو تو موسیقی کا آہنگ اور رنگ ہی دوسرا ہوتا ہے۔

مسلمان ہندوستان میں اسلام کی زبان سے کر نہ آئے تھے، وہ عربی کے بجائے فارسی کی معرفت آئے اسلام کا مطالعہ بالواسطہ تھا، لیکن ہندوستان کے ... زبانیں اجنبی تھیں عربی تو علما کے مختصر گروہ ... اس سے مشائخ بہرہ مند تھے فارسی تھا۔ ... ملک کی زبان تھی اور ... سب ... تھے جو آتھیں کے ساتھ اسلامی ... ریاستوں سے لشکروں میں شامل ہو کے آئے تھے لیکن جو ہندوستان پر حکمرانی کرنے کے لیے آئے تھے اُس میں حمایت کے لیے یا اسلام کی دعوت کے لیے زبان کے معاملہ میں بے بس تھے۔ اگر عربی و فارسی میں دعوت دیں تو وہ عوام کے حدود فہم سے ماوریٰ تھیں اور جو ہندوستانی عوام کی زبانیں تھیں وہ اُن کے لیے یا اسلام کی تبلیغ کے لیے اجنبی تھیں۔ مشائخ نے جابر حکمرانوں کے استبداد و استیلا سے تنگ آکر دعوت اسلام کی خانقاہی راہ پیدا کی۔ اور ہندوستان کے مزاج پر قابو پانے کے لیے سنگیت کو سماع کی شکل دی۔ امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے موسیقی میں ہندوستانی مزاج کے مطابق اجتہاد و اختراع کے قلم لگائے اور قوالی کی بنا ڈالی۔ نتیجۃً موسیقی ایک اسلامی سانچہ میں ڈھل کر ہندوستانی عوام کے لیے تبلیغ کا ذریعہ بن گئی اور اس نے ہندوستان میں قبول اسلام کے لیے نہایت کشادہ راہیں پیدا کیں۔ اس سلسلہ میں کسی نے تاریخی و تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا۔ اگر کوئی محقق نگاہ غائر نظر سے مطالعہ کرتا یا تجزیہ کی طرف آتا تو اس پر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی کہ ہندوستان میں جن آبادیوں نے قبول اسلام کیا وہ تلوار کے مفتوح نہیں تھے جیسا کہ عیسائی پادریوں نے اسلام کے خلاف الزام عائد کیا۔ ہندوستان میں قبول اسلام کرنے والے اکثر و بیشتر وہ لوگ تھے جو علما کی صحبتوں، مشائخ کی نگاہوں اور سماع کی محفلوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس طرح حلقہ بگوشان اسلام کا ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ اس کی تفصیلات نہایت اہم اور مبسوط ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ کا جائزہ لیں۔ پھر اس کے بعد اور اس دوران کے مشائخ کے احوال و وقائع کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ سکتے ہیں کہ سماع کی محفلوں نے ہندوستان کی سرزمین میں قبول اسلام کی تحریک کو کس بانکپن سے پروان چڑھایا اور جو لوگ بسرعت تمام اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر تیار ہو گئے، وہ ستر فیصد بلاشبہ اہل اللہ کی صحبتوں سے فیض یافتہ تھے اور اُن کے دلوں کو سماع کی محفلوں نے پلٹ دیا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سماع کیا ہے؟ دل میں گداز پیدا کرنے کی تحریک اور جس عظیم الشان انسان کی حلقہ بگوشی پر ہمیں فخر و ناز ہے۔ اُس کے عشق سے دلوں کو منور کرنے کی لَو ــــ آخر وہ کیا چیز ہے جو ماحول کو جلا بخشتی، دلوں کو موم کی طرح پگھلاتی، طبیعت کو وجد میں لاتی اور خون کی گردش کو تیز کرتی ہے۔ وہ عشق رسالت ہے، محمد عربیؐ کی غلامی ہے اور اُس ذات اقدس کا فیضان ہے کہ انسان سماع کے لمحوں میں اُنہی کا ہو جاتا ہے۔

مسٹر رحیم الدین بھٹی کی اس محفل میں حضرت قبلہ مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ کی مشہور پنجابی نعت جو

آج سک متراں دی ودھیری اے

پڑھی گئی۔ اور سوا گھنٹہ تک پڑھی گئی، صرف بیالیس[۴۵] منٹ مقطع پر صرف ہوئے کہ ــ

سبحان اللہ، ما اجملک ما احسنک ما اکملک
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

عالم یہ تھا کہ سب لوگ اس شعر کے عمق میں مستغرق ہو گئے۔ ایک وجد، ایک سرور، ایک کیفیت، ایک نشہ، ایک جوش، ایک جھمہ، ایک عشق پیدا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کیفیتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ لوگوں نے جیبیں خالی کر دیں۔ ہر شخص اشکبار تھا، ایک عجیب سماں تھا کہ الفاظ اس کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ راقم کا یہ حال تھا کہ حضرت مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ پر قربان ہونے کو جی چاہ رہا تھا کہ شعر نہیں کہنہ حقائق کی کیسی نیا سرمدی ہے۔ سچائی کو ایک

باقی ص۲۳ پر

موت سے کس کو رستگاری ہے

حافظ عزیز الرحمٰن کی رحلت

گزشتہ ہفتہ سے ایک دو روز پہلے کراچی میں حافظ عزیز الرحمٰن خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ دل کے ہاتھوں یک اجل کا شکار ہو گئے۔ چار پانچ سال پہلے ان کا دل صحت کی توانائی کے باوجود دغا دینے لگا، علاج کراتے رہے اور تندرست ہوتے رہے، لیکن دل ہی منافقی سے کر گیا اور وہ احباب و اقربا کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ حافظ جی ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ انہیں توحید و رسالت سے انتہائی عشق تھا۔ اُن کا تعلق اعوان خاندان سے تھا، اصل وطن کیمبل پور تھا، اکثر اعزہ فوج سے منسلک تھے، اور بعض مختلف بڑے شہروں میں کاروبار کرتے تھے۔ حافظ جی شروع ہی سے اکابر احرار کے مخلصین میں سے تھے۔ انہیں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چودھری افضل حقؒ کے ساتھ عقیدت مندانہ تعلق تھا۔ پنجاب سے اٹھ کر سندھ میں چلے گئے اور وہاں سکھر میں قیام کیا۔ آپ کے مذہبی شغف کا یہ حال تھا کہ منزل گاہ کی مسجد کے سلسلہ میں ایک تحریک پیدا کی اور بفضل تعالیٰ کامیاب رہے۔ آپ کے جذبہ، شوق، دیانت، اخلاص اور قابلیت نے اکابر سندھ کو بے حد متاثر کیا۔ تقریباً سبھی سندھی راہنماؤں سے تعلقات قائم ہو گئے۔ تحریک پاکستان چلی تو آپ نے اس کے لیے بھرپور کام کیا۔ پھر جب پاکستان بن گیا تو سکھر سے کراچی چلے گئے اور وہاں اقامت اختیار کی۔ کچھ دنوں بعد وہاں خوراک کے محکمہ سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۷۶ء تک ملازمت کی، ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر رہے۔ پھر اپنی علالت کے باعث مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گئے لیکن دینی سرگرمیوں سے بھرپور رابطہ رکھا۔ مرزائیت کے تعاقب میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اس سلسلہ میں کبھی سروس کی پروا نہ کی۔ کئی دفعہ حکومتوں نے ٹوکا، لیکن ایک تو پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں آپ کی خدمات اتنی جلیل تھیں کہ سندھ کے راہنما آپ کا احترام کرتے، دوسرے اس قسم کی باز پرس کے موقع پر ہمیشہ استعفیٰ داغ دیتے اور کہتے رازق سرکار نہیں پروردگار ہے۔ میں اپنے شکم کے لیے اپنا علم قربان نہیں کر سکتا جہاں دین و ملازمت میں ٹکراؤ ہو گا میں دین کا ساتھ دوں گا۔ مرزا غلام احمد اور اُن کا فرقہ منافق کسی دین کا جزو یا حصہ نہیں کہ مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ نہ کیا جائے۔ ایک باطل ہے اور اس سے پاکستان کو محفوظ رکھنا ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ اس تحریک میں جو پار سال ربوہ کے سانحہ سے پیدا ہوئی اور تمام ملک میں پھیل گئی حتیٰ کہ مرزائیت، خارج از اسلام ہو کر اقلیت قرار پا گئی۔ حافظ جی نے اپنی صحت کی پروا نہ کر کے حصہ لیا اور صبح و شام اسی میں صرف کئے۔ آپ نے سندھ کے اندرونی اضلاع اور کراچی شہر میں مسلسل جدوجہد کی اور ایک ایسی فضا پیدا کی کہ مرزائیت کا شعلہ بجھ گیا۔ آپ نے سندھ میں مرزائیت کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کیں اور ان کی خلافِ قانون چیرہ دستیوں پر

باقی صفحہ ۳۳ پر

جسٹس محمد منیر کی پھلجھڑیاں

قولاً اسلام، عملاً سیکولرازم

ہمارے دور میں اسلام کا اولین حریف سیکولرازم کا نظریہ اور مسلک ہے۔ سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کوئی ابدی اور غیر متبدل اقدار و قوانین نہیں۔ اقدار و قوانین سوسائٹی متعین کرتی ہے جو وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی، ثبات و تغیر کے اصول کے تابع قائم رہتی، اور آگے بڑھتی ہے۔ وحی خداوندی وہ حدود و اصول متعین کرتی ہے جو غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے قوانین وضوابط وضع کیے جا سکتے ہیں، جو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، یہ غیر متبدل ابدی اصول و اقدار، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ مملکت پاکستان اسلام ہونے کی مدعی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہاں ثبات و تغیر کا اصول کارفرما ہوگا، اس کے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت اپنا تمام کاروبار خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ اس کے باوجود یہاں اُٹھتے بیٹھتے، سیکولرازم کا پرچار ہوتا رہتا ہے مثلاً ابھی حال ہی میں 'پاکستان ٹائمز' میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے :-

"قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے
جو تمام کائنات کو محیط ہے ایک ذرہ ناچیز
سے لے کر، بڑے سے بڑے کرۂ فلکی تک
حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں، ہم بھی، جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرا سے گوشے کے مکین ہیں، اسی قانون تغیر کے زیر اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں، (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گزشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالیئے

شیکسپیئر نے کہا تھا "خیر اور شر فی ذاتہ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے، کسی کو شر (جیسا ہم خیال کریں، وہ شے ویسی ہی ہو جاتی ہے۔) حق اور باطل، غلط اور صحیح ــ قانونی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ــ اضافی ہیں ــ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصور حق و باطل اور خیر و شر، سوسائٹی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے سوسائٹی کے معیار کی رُو سے ہوتا ہے، انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ــ بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روکے رکھے ــ اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کو نگاہ میں رکھے ــ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

اس مقالہ کے نگارندہ ہیں، پاکستان کے سابق چیف جسٹس، محمد منیر صاحب، اور یہ شائع ہوا ہے اور پاکستان ٹائمز کی ۱۸ جنوری ۷۵ء کی اشاعت میں۔ جو پریس ٹرسٹ کے زیر تحویل ہے، یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ تصورحیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام تو ایک طرف، نظام فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بڑی سطحی اور ناقص ہیں، وہ اگر کسی عام سائنسدان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے اور تغیرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں، سرما میں وہ بالکل ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں ابھرتی ہیں، غنچے چٹکتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، پھل آتے ہیں، یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانون نشوونما کے مطابق ہوتا ہے، اگر ان قوانین فطرت میں جس کی بنیادوں پر اس محیر العقول کارگہ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیر بھی آ جائے، تو سارا سلسلہ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبعی زندگی پر غور فرمائیں، زندگی کا مدار تنفس (سانس لینے) کے

قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس قانونِ جہات تغیر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے تغیر سمجھتے ہیں کہ عام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے۔ سمندر کی تہ میں یا چاند کی سطح پر اسے آکسیجن کا بیگ اپنی کمر پر لادنا پڑتا ہے اور مریض کو آکسیجن ٹینٹ میں رکھتے ہیں لیکن یہ قانونِ زندگی کے تغیرات نہیں، یہ اس قانون پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع واسباب ہیں، ذرائع و اسباب حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے قانون ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ یہ ہے نظامِ فطرت۔

انسان کی تمدنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے اس کے لیے بھی قوانین کی ضرورت ہے یہ قوانین (جو وحی کے ذریعے عطا ہوتے ہیں) غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان پر عمل پیرا ہونے کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں، یہ غیر متبدل قوانین، خیر و شر اور حق و باطل کا معیار ہیں۔ منیر صاحب اپنے دعوے کی تائید میں شیکسپیئر کا قول پیش کرتے ہیں اور اس کے برعکس اللہ تعالٰی کا ارشاد یہ ہے کہ لاتبدیل لکلمات اللہ ——— قوانین خداوندی غیر متبدل ہیں۔ مذہب پرستوں کا خدا کے اس ارشاد پر ایمان ہے جس کی تائید کائنات کا سارا نظامِ فطرت کر رہا ہے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منیر صاحب اپنے دعوے کی تائید میں علامہ اقبالؒ کو بھی پیش فرما رہے ہیں۔ لیکن اسی طرح جس طرح انہوں نے نظامِ فطرت کو اپنی تائید میں پیش کر دیا تھا، چنانچہ وہ اپنے مندرجہ بالا دعوے کے بعد خطباتِ اقبال سے، حسب ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں:-

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے، کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر جیسے متضاد عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لیے مستقل اور ابدی اصول ہوں، اس لیے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں، جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے، کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ——— وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و منصلب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ (انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصور نہیں) علامہ اقبال کا مندرجہ صدر بیان پیش فرمایا ہے، اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نہ، دلبرا! خطا اینجاست

جس طرح وہ نظامِ فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے، کہ اس میں کس طرح غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے، کہ اقبالؒ کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے علامہ اقبالؒ، ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصولِ حیات قرار دے رہے ہیں، وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں، جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے چنانچہ وہ (جو اقتباس منیر صاحب نے درج کیا ہے، اس کے بعد کہتے ہیں کہ:-

یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے، اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو برس میں اسلام جو حقیقتہً جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

اب منیر صاحب ہمیں سبق دے رہے ہیں کہ تم بھی، غیر متبدل کے چکر سے نکل کر یورپ کی تقلید کرو، تاکہ جس طرح وہ ناکام رہا ہے تم بھی ناکام ہو جاؤ، بیچارہ مظلوم پاکستان بھی کس عذاب میں مبتلا ہے۔ ایک طرف ملّا ہے، جو مُصر ہے کہ تم آسمان کو شیشے کا دبیز ٹکڑا مانو، جس میں ہیرے اور جواہرات ٹکے ہوئے ہیں اور وہ رات کے وقت چمکتے ہیں، سند اس کی یہ کہ ہمارے اسلاف اسی طرح کہہ گئے ہیں ——— دوسری طرف ہمارے یہ قانون دان اور دانشور ہیں جو یہ تلقین فرماتے ہیں کہ تم وحی کے عطا کردہ ابدی اور غیر متبدل اصولوں کی توہم پرستی کو چھوڑو، اور یورپ کی تقلید کرو ——— سند اس کی یہ کہ شیکسپیئر ایسا کہہ گیا ہے ——— چکی کے ان دو پاٹوں میں یہ مملکت پس رہی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ کہ خود اربابِ اقتدار اسے رکھنا چاہتے ہیں، وہ ملّا کو بھی دانہ ڈالتے رہتے ہیں اور مغرب زدہ دانشوروں کو بھی تھپکی دیتے رہتے۔ انہوں نے آئین میں شق رکھ چھوڑی ہے کہ مملکت اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ لیکن اس نے نہ آج تک یہ متعین کیا ہے کہ یہ حدود اللہ کیا ہیں، نہ یہ دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کہ مملکت کا کاروبار ان حدود کے اندر سرانجام پا رہا ہے یا ان سے تجاوز کر کے۔ یہاں قولاً اسلام کی حکومت ہے، اور عملاً سیکولرازم کی۔ پھر اگر جناب منیر یہ کچھ فرمائیں اور ان کی نگارشات پاکستان ٹائمز میں ہوں تو اس میں کون سی تعجب انگیز بات ہے!

(بشکریہ طلوع اسلام لاہور)

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیار جاسوس

تحریر: چوہدری عصمت حسین ریٹائرڈ [illegible]

گیانی کی شخصیت کے متعلق میرا عمومی تاثر یہ
اکہ وہ ... تہ درتہ گفتگو کرنے کے فن میں بڑا ماہر
، اور اس نے عجائب سنگھ کے گاؤں کا غلط پتہ
ے کر مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کی ہے
نہایت عیاری سے اپنی آنکھیں جھپکتا اور خطرناک
، کی کی حد تک میرا شخصی مطالعہ کرتا رہا، اُس
، انداز گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اُسے
ئب سنگھ کے صحیح گاؤں کا نام معلوم ہے اور
، وہ جان بوجھ کر مجھے اِدھر اُدھر کر رہا تھا، شاید
، لیے کہ وہ عجائب سنگھ کے ساتھ میرے تعلقات
ستی کا صحیح اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سلسلہ
اس کی تصحیح تو کر دیتا۔ بشرطیکہ اسماعیل کو عجائب
ھ کے گاؤں کا پتہ ہوتا۔

نی: اُس کی عمر کیا تھی؟

ں: یہی کوئی تیس سال!

نی: کیا تمہارا مطلب اس آوارہ نوجوان سے
ہے، جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہے؟

: نہیں وہ نہیں۔

: اس کی شباہت سے متعلق کوئی اور عجیب
تفصیلات تمہیں معلوم ہوں؟

: یہی کہ وہ کھلتے ہوئے رنگ، گٹھے ہوئے
جسم، درمیانے قد، بھرے ہوئے چہرے
اور نیلی آنکھوں والا ایک گٹھیلا نوجوان ہے

: تمہارا مخبر کون ہے؟

: اگر میں اُسے ذاتی طور پر نہ جانتا تو کہہ سکتا
تھا کہ کسی پرندے نے مجھے بتایا ہے۔

گیانی: خوب! لیکن میں حیران ہوں کہ تم میرے
پاس کیونکر پہنچے؟ تمہیں میرا پتہ کس نے دیا؟

میں: مجھے یہ خود میرے گھوڑے (مطلوب) نے
بتایا ہے؟

گیانی: تمہارا گھوڑا (مطلوب) کون ہے؟

میں: عجائب سنگھ!

گیانی: بعض اوقات گھوڑے بھاگ جانے میں زیادہ
تیز ہوتے ہیں۔

میں: بجا! بعض اوقات گھوڑے دوڑ ضرور جاتے
ہیں، لیکن سوار کے بغیر بہت کم!
اور آپ اس معاملہ میں میرے گھوڑے کے
سوار ہیں (قہقہہ) عجائب سنگھ نے مجھے بتایا تھا،
کہ اُس کی تلاش کے سلسلہ میں گوردوارہ مہانہ صاحب
کے علاوہ مجھے آپ سے رجوع کرنا چاہیئے، میں
آپ کے پاس ہرگز نہ آتا، اگر مجھے یہ یقین نہ ہو جاتا
کہ وہ گوردوارہ میں موجود نہیں ہے۔

گیانی: گوردوارہ مہانہ صاحب، ترنتارن سے کتنی
دُور ہے؟

میں: نہایت محتاط اندازے کے مطابق وہ یہاں
سے ۱۲ میل پر واقع ہے۔

گیانی: (جھک کر مسکراتے ہوئے) اس نام کا کوئی
گوردوارہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

میں: (گیانی نے اس مرتبہ پھر مجھے باتوں باتوں
میں ہی اڑا دینے کی کوشش کی، یہ سمجھتے ہوئے

اُس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ
میری بتائی ہوئی بات کا مذاق اُڑایا، لہذا
میں نے فوراً جواب دیا۔)

گیانی صاحب، آپ جغرافیے میں کمزور ہی
معلوم ہوتے ہیں، آپ کو اپنے علاقے کے
ایک اہم گوردوارہ کا بھی علم نہیں، آپ بڑے
محدود ذہنی اُفق کے آدمی ہیں، میں پہلے اسی
گوردوارے گیا ہوں، لیکن عجائب سنگھ کو
وہاں نہ پا کر آپ کے پاس آیا ہوں۔
(حقیقت یہ ہے کہ میں گوردوارہ مہانہ صاحب
کبھی نہیں گیا، لیکن دوسرے پولیس افسروں کی
تحقیقاتی رپورٹوں سے میں یقینی طور پر اس کی جائے
وقوع سے واقف تھا)

گیانی: (ایک خفیف ہنسی کے ساتھ) تم نے ٹھیک
کہا ہے، میں واقعی جغرافیے میں کمزور ہوں!
لیکن عجائب سنگھ نے میرا نام تمہیں غلط طور
پر دیا ہے

ں: نہیں! مجھے یقین ... ہے کہ میں نے آپ کو صحیح
پہچانا ہے!

گیانی: تمہارا نام کیا ہے؟

(اس سوال نے میری شخصیت کو ایک نہایت
تیز، سرچ لائٹ Searchlight کے
سامنے لا کھڑا کیا ... گیانی کے ساتھ مسابقے کی
نوعیت کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے
اب اپنے آپ کو اسمٰعیل ظاہر کرنا چاہیئے اور عجائب

سنگھ کے ایک ساتھی کا رول بحیثیت دیش بھگت
ادا کرنا چاہتے۔ دیش بھگت کا لفظ اُدو لوں ایسے غرض
محب وطن کے سیاسی مصنف کے طور پر استعمال ہوتا
تھا، مذکورہ رول کا اختیار کرنا میرے لیے انتہائی
ناگزیر تھا، کیونکہ میں اسی طرح گیانی کے دل میں گھر
کرکے اُس کا اعتماد حاصل کر سکتا تھا لیکن یہ صورت
حال محض اتفاقاً ہی پیش آ گئی، حالانکہ میرے اصل
منصوبے میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا، اپنے سوا
کسی دوسرے شخص کا رُوپ اختیار کرکے، اس
کی شکل و صورت اور بول چال کو بجنسہٖ قائم رکھنا
کوئی آسان کام نہیں، تاہم یہ ایک ایسی ناگہانی افتاد
تھی، جس کا سامنا کرنے کے لیے ہر اُس پولیس
افسر کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ جو اپنے کسی
شکار کے تعاقب میں ہو کیونکہ ایک پولیس مین
سے تمام قسم کے معاملات میں مہارت متوقع ہوتی
ہے۔ اگر کوئی انتظامی فورس سب چیزوں کے متعلق
تھوڑا بہت علم ضرور رکھتی ہے تو وہ پولیس ہی ہے
پولیس والوں کو اکثر اوقات بالکل انوکھے کردار
ادا کرنے پڑتے ہیں، اور مختلف الاصل ناساعد
حالات میں سے بغیر کسی سابقہ تیاری کے عہدہ برآ
ہونا پڑتا ہے۔ فی البدیہہ فیصلہ کرنا اور خطرات کو ٹال
دینا ایک پولیس افسر کے روزمرہ فرائض میں سے
ہے۔ اُسے اس درجہ وسعتِ نظر کا مالک ضرور ہونا
چاہیے جو آئندہ پیش آنے والی ضروریات کا اندازہ
کر سکے، اُسے اپنے چہرے شکل و شباہت اور
آواز کو کسی بھی ناگہانی صورت حال کے مطابق
ڈھال لینے کا ملکہ ہونا چاہیئے۔ اور ناقابل تشخیص
رُوپ بھرنے کا ماہر ہونا چاہیے۔ یہ بہت کم ہوا ہے
کہ اُسے جعلی بالوں یا مصنوعی مونچھوں کی مدد سے
اپنی اصل شکل و صورت کو چھپانا پڑے۔
بہرحال اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ شکل
و شباہت کے قدرتی پن میں فرق نہ آئے۔ جہاں یہ
میری خوش قسمتی تھی، کہ میں قد و قامت کے
اعتبار سے بالکل اسماعیل سے مطابقت رکھتا
تھا، ماسوا اس کے کہ میرے بالوں میں معمولی سفیدی
آ چکی تھی، وہاں بد قسمتی یہ تھی، کہ میری اور اسماعیل
کی عمر کا فرق خاصا زیادہ تھا، وہ بمشکل ۱۹ برس کا تھا
جبکہ میں ۲۵ سال کے پیٹے میں تھا اور میرے
سفید بال، اس تفاوت کی یقینی نشاندہی کرتے
تھے، عمر کے اس واضح فرق کو چھپا کر، اسماعیل بننا
ایک معمّہ سے کم نہ تھا۔ تاہم میں نے اس پیش آمدہ
مشکل کا فوری طور پر یوں سامنا کیا۔
میں: (گھبرائے ہوئے ہوئے میں نے کہا)
نام میں کیا رکھا ہے؟ اس ضمن میں کچھ نہ
کہنا ہی بہتر ہے! ازراہ کرم مجھے جانے دیجئے
دراصل آپ میرے دوست کے متعلق کچھ
بھی نہیں جانتے۔
(نوٹ، قدرتی طور پر میں نے اپنے آپ کو عجائب سنگھ
کا دوست ظاہر کرنے میں توقف سے کام لیا۔
درحقیقت ایک جاسوس اور اجنبی کے درمیان
گفتگو کے دوران اس قسم کا پیدا کردہ توقف اور
زیر و بم، غایت درجہ تجسس پیدا کرنے کا باعث
ہوا کرتا ہے، اسی لیے میں نے جان بوجھ کر اصل
سوال سے انحراف کرکے گیانی کو یہ تأثر دینا چاہا
کہ میں عجائب سنگھ کا ساتھی ہوتے ہوئے اتنی
جلدی ایک اجنبی کو اپنی شخصیت سے کیسے متعارف
کرا سکتا ہوں، حقیقی اسماعیل اتنا احمق نہیں ہو سکتا
کہ وہ جاوبے جا اپنی اصلیت کا ڈھول پیٹتا پھرے
اس تمام لیت و لعل کا مقصد یہ تھا کہ گیانی کو یقین
ہو جائے، کہ میں درحقیقت ایک پُراسرار شخصیت
ہوں، اور کسی خفیہ مشن پر یہاں آیا ہوں، اُس
نے میری قمیص کو پکڑتے ہوئے زوردار آواز میں کہا)
گیانی، تشریف رکھیئے! ابھی تو گرمی بہت زیادہ ہے
مجھے حیرت ہے کہ آپ عجائب سنگھ کو کیسے
جانتے ہیں۔
میں: ہم ایک ساتھ آئے تھے!
گیانی: 'کہاں سے'
میں: 'باہر سے'
گیانی: 'کیسے؟'
میں: 'اُوپر سے!'
گیانی: کب؟
میں: یہی کوئی چھ ماہ پہلے!
(نوٹ، نہ تو میں نے ان اصطلاحات یعنی
'اُوپر سے' اور 'باہر سے' کی وضاحت کی، اور نہ ہی
گیانی نے چاہی، اُس نے تو اس تمام معاملے
متعلق کیوں، کب اور کیسے بھی نہ پُوچھا، اس
اس طرز عمل سے میری قوت متخیلہ اس درجہ بی
ہوئی، کہ میں نے اس میں کئی ایک زبردست
شبہت اشارے محسوس کئے، جن کی بنا پر مج
یقین ہونے لگا، کہ گیانی ہی عجائب سنگھ کا ہمراز
اور معتمد علیہ ہے، اگر فی الواقعہ اُسے عجائب سنگ
یا اُس کے مشن کے متعلق علم نہ ہوتا (اور یہی تأثر
وہ تمام عرصہ دینے کی کوشش کرتا رہا) تو اسے
بالراست مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا، کہ ان پُراسرا
اصطلاحات سے میرا کیا مطلب ہے، اس ضم
میں مجھ سے مزید تشریح طلب نہ کرنے میں اس
سے جو فرو گذاشت ہوئی، اُس سے صاف ظاہ
ہوتا تھا، کہ اُسے راز درونِ پردہ کا کماحقہٗ علم ہے
اور وہ اقتضائے وقت کے مطابق خاموشی اختیا
کئے ہوئے ہے، اُس کی تمام تر گفت گو اصل موضو
سے متعلق ترچھے سوالوں سے مُرصع تھی، مجھے یقی
ہو گیا کہ وہ کسی کی خاطر مجھے ٹٹولنے کی کوشش
کر رہا ہے، ظاہر ہے وہ میرے اور عجائب سنگھ
کے تعلقات کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔
گیانی: آپ نے بُرا تو نہیں منایا؟
میں: ہرگز نہیں! آپ کے سوالوں سے مجھے حقیقی
مُسرت ہوئی ہے۔
گیانی: آپ کی اور عجائب سنگھ کی آخری ملاقات
کب اور کہاں ہوئی؟
میں: پانچ مہینے بھی نہیں ہوئے، سنہری گوردوارہ
امرتسر میں!

باقی صفحہ ۲۶ پر

مولانا محمد یوسف
امیر جماعت اسلامی ہند

ملتوں کی زندگیاں کبھی دوسروں کی مرہونِ منت نہیں ہوا کرتیں

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف کا عالمانہ خطاب قارئین چٹان کے مطالعہ کیلئے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ——— (ادارہ)

خطبہ مسنونہ کے بعد

برادرانِ ملت

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا شکر ہے کہ اس نے اپنے ملک یں ہمیں بار بار سر جوڑ کر بیٹھنے اور اپنی مشکلات پر غور کرنے ر پیش آمدہ حالات میں اپنے لیے راستے نکالنے کے اقع فراہم کیے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے یں بہت سے وسائل و ذرائع فراہم کر رکھے ہیں اور ہم و یہ حوصلہ اور امنگ بھی عطا کی ہے کہ ہم ان وسائل کو م میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ملتوں کی زندگیاں کبھی دوسروں کی مرہونِ منت نہیں ا کرتیں۔ وہ اپنے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں اور پنے وسائل و ذرائع اور لگن سے کام لے کر آگے بڑھتی یں۔ یہی ان کی زندگی کا حقیقی راز ہے۔

دنیا میں جہاں جہاں اقلیتیں مختلف میدانوں میں گے بڑھی ہیں۔ اس کا بھی یہی راز ہے کہ وہ مسائل کا سروں کے مقابلہ میں زیادہ ادراک رکھتی ہیں۔ اور ہیں حل کرنے کے لیے دوسروں کے مقابلہ زیادہ لگن ر تندہی سے کام کرتی ہیں۔ اس طرح فی الاصل کسی گروہ اقلیت میں ہونا کوئی زحمت نہیں بلکہ بسا اوقات ہ رحمت ہی ثابت ہوا ہے۔ ہم مسلمانوں کو قرآن مجید ی یہ بشارت ہمیشہ سے یاد ہے اور ہمیشہ اس نے اری رہنمائی کی ہے کہ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة بإذن الله۔

تاریخ کے اکثر ادوار میں ہم اقلیت میں رہے ہیں اور پیش قدمی کرتے رہے ہیں جس کا تجربہ ہم سب کے سامنے ہے۔

ہندوستان میں اور اس کے بعض حصوں میں اگر ہمیں پچھلے برسوں کچھ مایوسیاں نصیب ہوئیں تو ان کا شاید ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے وسائل و ذرائع اپنی جد و جہد اور توکل علی اللہ کی بجائے کچھ اور مصنوعی سہارے اختیار کر لیے تھے۔

عزیزانِ گرامی۔ ہماری ملت کو متعدد مسائل درپیش ہیں۔ جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ اور اگر نظر غائر دیکھا جائے تو یہ مسائل باہم دگر اتنے پیوست ہیں کہ ایک کو دوسرے سے ہٹا کر دیکھنا اور حل کرنا مشکل ہے۔ تعلیمی مسائل، اقتصادی امور، اخلاقی اصلاح، دینی ارتقاء، معاشرتی استحکام، روحانی احیا اور سیاسی اثرات، یہ سب وہ امور ہیں جن میں فی الاصل امت گیر سطح پر ہمیں ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اور شاید اسی لیے ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے دعوت نامے میں ان سب امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک عملی انسان کی حیثیت سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان سب دائروں میں ہمارے مختلف شعبوں میں الگ الگ کام کرتے ہوئے کہیں ایک جگہ مل بیٹھنے کی کوئی صورت نکالنا ہی چاہیے۔ تاکہ ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اور تعاون حاصل کیا جا سکے۔

جہاں تک تعلیم کے مسئلہ کا تعلق ہے ہم آپ سب ہی کے علم میں ہے کہ یہ محض چند کتابیں پڑھ لینے کا یا تعلیم گاہوں کے مقررہ نصاب کو پورا کر لینے کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم کا بہت گہرا تعلق اس اجتماعی زندگی اس مقاصد حیات اور اس تہذیبی احساس سے ہے جسے کوئی انسانی گروہ اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ تعلیم چاہے سائنسی اور تکنیکی موضوعات کی ہے یا HUMANITIES کی۔ اگر اس میں مقصدیت نہ ہو یا انسان کو محض ایک معاشی حیوان بنا دینا پیش نظر ہو تو ایسی تعلیم بالآخر ایک دردِ سر اور ایک لعنت بن کر رہ جاتی ہے۔ اور ہر طرف جو واویلا مچ رہا ہے اس میں ایک سوال یہ بھی اٹھا ہوا ہے کہ ملک کا تعلیمی نظام انقلاب کا خواہاں ہے کہ اس لیے پورے نظام تعلیم میں کوئی عظیم تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی ابھی مجمل اور مبہم ہی ہے کہ یہ تبدیلی کس قسم کی ہو۔ اور نئے تعلیمی نظام سے کس قسم کی نسل تیار کی جائے۔

ہم الحمد للہ مسلمان ہیں۔ ہمارا مقام شہداء علی الناس کا ہے۔ جس کو دیکھ کر دوسرے مثالیں ڈھونڈیں۔ اور جن کے نقش قدم پر چلنے میں دوسرے اپنے لیے سعادت سمجھیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو اپنا رہنما بنائیں۔ ہمارا کام ہے کہ ہم تعلیم کے سلسلہ میں ایک واضح تصور پیش کریں۔ ایسا تصور جس سے انسان کی خودی کا بھرپور ارتقا ہو سکے اور اس خودی کا رشتہ خود پرستی کی بجائے خدا پرستی سے پوری طرح

۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء

ہفت روزہ چٹان لاہور

جڑا ہوا ہو۔

ایک دور تھا جب مغرب کے زیر اثر ان مسلمانوں میں بھی یہ خیال پیدا کیا جانے لگا تھا کہ اسلام جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرپرستی نہیں کرتا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلی کئی صدیوں سے دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں کو مغلوبیت کا شکار رہنا پڑا تھا اور اس دور میں ان پر ہر طرف سے شورش شروع کر دی گئی تھی کہ اسلام کی صداقت ہمہ گیری جامعیت اور رہنمائی کے بارے میں ان میں تذبذب اور وسوسے پیدا ہو جائیں۔ اس کے دور میں ان کی قوت کا بڑا حصہ لازمی طور پر اس امر پر صرف ہوا کہ اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کا ازالہ کریں۔ اور قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم کی حفاظت کرتے رہیں۔ یقیناً اپنی خدمت کا یہ بھی ایک طریقہ تھا جس کو اس دور کے بزرگوں نے اپنایا لیکن اس سے آگے کی ضرورت یہ ہے کہ دین کو کس طرح دنیا کی رہنمائی کا مقام حاصل ہو۔ اور ہمارا معاشرہ کس طرح نئی نسلوں کی تربیت اور امتحان کرے کہ وہ اسوہ پر چلنے والے مسلمان کی حیثیت سے دنیا کو اس طرح عمل اور علم کا ایک نیا افق عطا کریں جیسا کہ صدر اول میں ہوا تھا۔

دفاع کا دور ہمیشہ باقی نہیں رہتا اور کہا جاتا ہے کہ کبھی اقدام بھی دفاع کی بہترین تدبیر ہوتی ہے اس وقت ضرورت ہے کہ ہماری تعلیمی انجمنیں خواہ وہ شمال میں ہوں یا جنوب میں۔ تعلیم کے بارے میں ایک اقدامی پالیسی اپنائیں اور اس پر یکسوئی کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس کا دائرہ کار زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو، اور علم کے مختلف دائروں میں تعاون و توافق کی ایسی پالیسی و کیفیت پیدا کی جائے، کہ اس میں دین کو بالادستی حاصل ہو، ہمارا مقصد پیوندکاری نہیں ہونا چاہیئے، کہ دو الگ الگ قسم کے کپڑوں کو ایک لباس میں جوڑ دیا جائے بلکہ دین کو تعلیمی زندگی کے رگ و پے میں سمو دینے میں ایسی راہ اپنانی چاہیئے کہ دنیاوی ارتقائے دین کے تابع ہو کر چلے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

جماعت اسلامی نے اپنے حدود کے اندر مسلسل میں جو کوششیں کی ہیں اور جو تجربات کئے ہیں، وہ آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ انہیں اور ملک کی دوسری تعلیمی مساعی میں حصہ لینے والوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور یہی مقصد سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیئے، کہ ابتدا سے ثانوی اور اعلیٰ مرحلے تک نیز بچوں اور خواتین کے لیے ہماری تعلیم کا اساتذہ کا انتخاب اور تربیت بھی معمولی مسئلہ نہیں، اسی طرح قدیم علوم کے مدارس اور جدید تعلیم گاہوں میں خیالات و افکار کا تبادلہ اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے جذبے سے مشترک نشستیں اور کیمپ پھر اچھے ذہین طلبا کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی جانب راہ نمائی سب ہی ہماری انجمنوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں، کہ اس معاملہ میں ایک صحت مند پالیسی اختیار کی جائے جس میں مقصد کی یکسانیت صلاحیتوں کا بھرپور استعمال اور آپس کے تعاون و توافق کا خاص رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس فنی، تعلیمی کے مشوروں کے لیے عمل دفاتر اور معلومات لازمی ہیں، ہماری مشکلات بھی کم نہیں ہیں، مخلص کارکنوں کا ملنا پھر مستقل مزاجی سے ان کا کام کرتے چلے جانا، دینی اور سیکولر حلقوں کو ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنا سرمایہ کی کمی، وہ مختلف انجمنیں ہیں جو راہ میں حائل ہوتی ہیں، لیکن میرا اپنا تجربہ اور مشاہدہ ہے اور یقین ہے کہ اگر خلوص نیت سے مستقل مزاجی کے ساتھ کوئی کام کیا جائے تو اس کے لیے اسباب فراہم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اور باتیں بھی ایسی ہیں، جن کی جانب غالباً آپ خود متوجہ ہوں گے، مگر میں بھی چاہتا ہوں، کہ ہر جگہ سے ایسی باتوں کو مسئلہ سمجھ کر اس کے حل کی تدابیر سوچی جائیں ہماری نصف آبادی یعنی خواتین کا معاملہ ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑا تعمیری مصرف اور معاشرہ کیلئے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا ہمارا بہت بڑا مسئلہ ہے ہمیں اسلامی حدود و حجاب میں رہ کر ایک مثالی

معاشرے کی تعمیر میں لگانا ہے جو اس کے لیے ہے اس حصہ کو نظر انداز کرنا بہت بڑا ظلم اور بہت بڑا نقصان ہوگا، سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں مشترکہ مقصد کے لیے اتحاد عمل کا جذبہ ابھرے اور ایک ساتھ قدم ملا کر چلنے کی عادت پیدا ہو، اتحاد ہی ہماری طاقت ہے اور انتشار سے ہماری ہوا اکھڑنے لگتی ہے، مختلف مسائل میں لوگوں کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن ہماری صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے کہ ہم اختلافات میں سے اشتراک عمل کا راستہ ڈھونڈیں، یقیناً اس کے لیے اپنی انا کے بت کو توڑنے اور خودشکنی کی ضرورت پڑتی ہے۔

دنیا اس وقت ہمیشہ سے زیادہ گمگشتگی اور کی متلاشی ہے، ہم جو دوسروں کی اصلاح کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں، اگر ہماری زندگیاں عمل سے دور ہیں تو ہماری اکثر کوششیں رائیگاں جا سکتی ہیں، اگر ہمارے اندر اتحاد عمل نہیں ہے تو ہماری ہوا اکھڑتی ہے اور ہماری اکثر کوششیں بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

میں اور آپ سب ہی محسوس کر رہے ہیں، کہ ہمارا اپنا معاشرہ مختلف ذہنی سطح اور مزاج کے طبقات میں بنا ہوا ہے، کچھ بڑے شہروں میں اور تعلیمی ذوق رکھنے والے خاندان ہیں، کچھ چھوٹی بستیوں اور دیہات کے لوگ ہیں، اسکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں اور دینی درسگاہوں میں پڑھنے والے طلبا اور دیہات کی آبادیوں میں رہنے والی نسل ان سب ہی کے الگ الگ تعلیمی مسائل ضروریات اور تقاضے ہیں، ان کو اسلام سے پوری طرح آشنا بنانا اور عصر حاضر کا ایک بیدار ذہین فرد بنا کر ابھارنا پھر ذہن کی روشنی میں ایک جامع اور مثالی انسان بنانا، ہمارے تعلیمی مسائل کو حل کرنے والوں کے لیے خاص طور سے دنیا ہے یہ امت ایک نسل کا نام ہے، اس کی ہر کوشش کا سلسلہ دوسری نسل سے اس طرح جڑا ہوا رہنا چاہیئے، جس طرح کی گئی منزل عمارت کی ایک منزل کا جوڑ دوسری نسل سے ہوتا ہے ہم

باقی صفحہ ۲۴۳ پر

مولانا امین احسن اصلاحی

نظمِ قرآن

نظمِ کلام کسی کلام کا ایسا جزوِ لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن، جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے، اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی۔ ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے، ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسرے سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے جس آیات مختلف، مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاں گزیں ہو گیا ہے، جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی۔ اذہان و اسلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم و ترتیب نہیں تھی، تو پھر تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی، جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں، اسی ترتیب کے ساتھ مصحف میں جمع کر دی جاتیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع متعین کیے گئے ہیں، دوسری مناسب ترتیب اختیاری ہو سکتی تھی، یعنی آیتیں برابر کی مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں، لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ صورت بھی نہیں ہے، بلکہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ اور کتنی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنے سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی کچھ غیر ضروری سی ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ حفاظ کی سہولت کے لیے تو یہ پاروں کی حد بندی کافی تھی۔ لیکن ہر صاحبِ علم کو معلوم ہے کہ سورتوں کی حد بندی اور ان کی ترتیب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے۔ در آنحالیکہ پاروں کی تقسیم بہت بعد کی چیز ہے۔

اس خیال کی انہی کمزوریوں کی وجہ سے شروع ہی سے ہمارے ہاں علماء کا ایک ایسا گروہ بھی رہا ہے جو قرآن میں نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے، اور اس گروہ کے بعض اکابر نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ "اتقان" میں لکھتے ہیں

علامہ ابو جعفر بن زبیر، شیخ ابو حیان نے نظمِ قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی۔ اور اس کا نام "البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" رکھا اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے نظمِ قرآن کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کے پہلو بھی واضح کیے ہیں، اسی سلسلے میں نظمِ قرآن کی اہمیت کا اعتراف وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخر الدینؒ کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ حکمتِ قرآن کا اصلی خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں آیت ولو جعلنٰہ قرآنا اعجمیا لقالوا (الآیہ۔ حم السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہِ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتابِ الٰہی پر سخت ظلم ہے، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم گر کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے، حالانکہ یہ کہنا قرآن مجید پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجز ماننا تو الگ رہا، اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے، (اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر اور اس کا نظم بیان کر کے فرماتے ہیں کہ) ہر منصف جو حق پسند ہے، تسلیم کرے

ہفت روزہ چٹان لاہور

گا، کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے،
جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورۃ ایک
ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی
تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ
کریں گی۔"

اسی سلسلہ کی ایک اہم شخصیت علامہ مخدوم
مہائمی کی ہیں، جن کی تفسیر "تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان"
تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے، اس
میں انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق آیات کا نظم
بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی مسلک کے علمبردار ایک عالم علامہ
ولی الدین ملوئی ہیں۔ نظم قرآن سے متعلق ان کا ارشاد
یہ ہے:۔

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید
کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت
تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے، اس وجہ سے اس
میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے، ان کو دھوکہ
ہوا ہے، قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب
حالات جستہ جستہ ہوا ہے لیکن اس کی
ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے۔"

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہے کہ نظم قرآن
سے متعلق ایک گروہ میں اگر غلط خیال موجود رہا
ہے۔ تو شروع ہی سے ایک ایسا گروہ بھی موجود
رہا ہے جس کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس نے اس
نظریے کے مطابق کتاب الٰہی کی خدمت کرنے
کی بھی کوشش کی ہے، پھر یہ بات بھی ذہن
میں رکھنے کی ہے کہ جو لوگ نظم کے منکر ہوئے
ہیں، وہ اس وجہ سے نہیں منکر ہوئے کہ ان کے
پاس انکار نظم کی کوئی دلیل موجود تھی یا وہ بے
نظمی ہی کو کلام کا کوئی ہنر سمجھتے تھے بلکہ اس کی
وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں قرآن میں جگہ جگہ بے
نظمی محسوس ہوئی، اور وہ اس کا کوئی حل نہ پا سکے،
تو جو کڑی دست کرنے کے بعد بھی انہیں نہیں ملی، اسی
آرزو میں انہوں نے پناہ لے لی۔

[illegible]

اگرچہ ان کے لیے صحیح روش تو یہ تھی کہ یہ
قرآن کو متہم کرنے کے بجائے اپنا الزام اپنی
کوتاہی پر رکھتے ہیں۔ لیکن انصاف کیجیے،
دو باتیں ان کے حق میں بھی جاتی ہیں، جن کے
سبب سے ان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے، ایک
تو یہ کہ نظم قرآن کی تلاش سے ہی، ایسا کام کہ ہر
شخص اس کو، کسی کے لیے اپنی زندگی وقف نہیں
کر سکتا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعویٰ
کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود یہ
کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکے جو
اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ
بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال اور
ارشادات نقل ہوئے ہیں، ان میں سے تین بزرگوں
کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب
ہوا ہے۔ میں بلا کسی ارادۂ تنقیص کے عرض کرتا ہوں
کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی
مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمیؒ
اور رازیؒ کی تفسیر تو اب بھی پیش نظر رہتی ہے،
یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں، اس
کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس قسم
کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے

اصل ضرورت اس چیز کی تھی، کہ لوگوں کے
سامنے کوئی ایسی چیز آتی، جو قرآن کے نظم کو اس
طرح واضح کر دیتی، کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ
اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح
کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی
نہیں، بلکہ جو چیزیں آئیں، وہ جیسا کہ ہم نے اشارہ
کیا ہے۔ مایوس کن ثابت ہوئیں، نتیجہ یہ ہوا، کہ
لوگوں نے نظم کی تلاش کو، کوہ کندن کاہ بر آوردن
کا مصداق سمجھ لیا۔

اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش
کی سعادت میرے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ
کو حاصل ہوئی۔ مولانا نے بے شک اس کے حق
میں نہایت مؤثر و دل نشین انداز میں دلائل بھی دیئے

اور متعدد سورتوں کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی جن
کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا، کہ ہر سورہ نہایت حسین
نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ نظم کے دلائل پر
مولانا کا جو رسالہ "دلائل النظام" کے نام سے موسوم
ہے وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، لیکن مولانا
کی تفسیر کے کچھ اجزاء اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور
اردو دونوں میں شائع ہو چکے ہیں جو ذہین اور
منصف مزاج بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ دو باتوں
کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک تو اس
بات کا کہ قرآن مجید کے اندر نظم کا انکار قرآن پر
بہت بڑا ظلم ہے، دوسری اس بات کا کہ قرآن کے
معارف و حکم کا اصل خزانہ درحقیقت اس کے نظم
ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

اگر مولانا حمید الدین فراہیؒ کو اللہ تعالیٰ نے
اتنی مہلت دی ہوتی، کہ وہ اپنے اصولوں کے
مطابق اپنی تفسیر مکمل کر پاتے تو یہ چیز ہر مخالف
کے اوپر حجت ہوتی، لیکن یہ ہماری محرومی ہے، کہ
ان کی تفسیر کا بہت تھوڑا حصہ لکھا جا سکا خاص
طور پر بڑی سورتوں میں سے تو کسی ایک سورہ کی
تفسیر بھی وہ مکمل نہ کر سکے۔

دو سوال اور ان کے جواب

بعض لوگ جو نظم کی قدر و قیمت سے اچھی
طرح واقف نہیں ہیں، وہ عموماً اس مسئلے پر گفتگو
کرتے ہوئے دو سوال اٹھاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظم اگر
ہے بھی، تو اس کی حیثیت نکات یا لطائف کی ہے۔
اس کے اوپر قرآن کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا انحصار نہیں
ہے، پھر اس پر اس شد و مد سے زور دینے کی کیا
ضرورت ہے؟ دوسرا یہ کہ اگر قرآن میں نظم ہے تو
آخر اس قدر مخفی قسم کا کیوں ہے کہ صرف خال خال
لوگ ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے اور
وہ بھی برسوں کی جانکاہی اور دماغ سوزی کے بعد۔
یہاں مختصر طور پر ہم ان دو سوالوں کا جواب بھی عرض
کیا جاتا ہے [illegible]

● ـــــ شیر پاؤ کا خون ● ـــــ قائد اعظم کے غدار

● ـــــ غلط کاری و غلط روی ● ـــــ سر ظفر اللہ خاں لاہور میں

شیر پاؤ کا خون

حیات محمد شیر پاؤ ۸ فروری کو ایک حادثہ فاجعہ کا شکار ہو کر موت کا شکار ہوئے تھے۔ ان کے بعد ملک میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ سرحد میں سرکاری اعلانات کے مطابق گرفتاری کی لہر دوڑ گئی تھی کہ ایک آدھ دن ہی میں نقشہ بدل گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کے صدر خان عبدالولی خان اور ارباب سکندر خان سمیت تمام نمایاں و ممتاز لیڈر پکڑے گئے۔ نیپ کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ بعض دوسری جگہ بھی نیپ کے رہنما اور کارکن گرفتار کئے گئے۔ خان عبدالغفار خان کے سب سے چھوٹے فرزند خان عبدالعلی خان جو ہر دور میں سرکار کے شعبہ تعلیم سے وابستہ رہے اور کوئی نہ کوئی عہدہ سنبھالا۔ حتیٰ کہ ایوب خان کے دور میں لاہور ایچی سن کالج کے پرنسپل رہے، ازاں بعد مرکزی وزارت تعلیم میں چلے گئے اور وہاں جائنٹ سیکرٹری رہے۔ پھر پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ شیر پاؤ کی شہادت کے بعد پشاور کے بعض شہریوں نے ان کے خلاف ہنگامہ کیا۔ تو انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور گھر چلے گئے ـــــ حتیٰ کہ ایک ایسی وزارت بھی برخاست ہو کر گھر چلی گئی جو پیپلز پارٹی کی آشیرواد سے قائم تھی اس کے بعد غیر منتخب نوجوانوں کو صوبائی گورنر کا مشیر مقرر کیا گیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس کو چھٹی دے دی گئی۔ چیف سیکرٹری بدل گئے ان کی جگہ مسٹر بندیال مقرر ہو گئے لیکن اس حادثہ کو ۴۴ دن ہو چکے ہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شیر پاؤ کے خون ناحق کے مرتکبین گرفتار ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایک خون کے مجرمین کی تلاش میں اتنی تاخیر انتظامیہ کی فرض شناسی کو داغدار کرتی ہے۔ قوم کے سامنے جلد سے جلد ان حقیقی مجرمین کو لایا جائے جو اس نوجوان کے خون ناحق کا باعث ہوئے ہیں۔

علی نواز خان ۔ کوہاٹ

قائد اعظمؒ کے غدار

نیشنلسٹ مسلمانوں کے متعلق آپ نے چٹان* میں جو کچھ لکھا وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ اگر زبانی اُلٹش کے علاوہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف کوئی چارج شیٹ ہے تو وہ سامنے لایا جائے۔ یہ غلط ہے کہ ہم کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی باتوں کو سند سمجھیں یا آویزہ گوش بنا ئیں۔ خان عبدالقیوم خاں ہمارے لیے بھی کبھی لائق اعتماد نہیں رہے اور نہ ہم ان کی باتوں کو قابل پذیرائی سمجھتے ہیں۔ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی کہ قائد اعظمؒ کے ملک سے غداری کس نے کی اور کون اس کو دو لخت کرنے کا باعث ہوا۔ بہر حال ان مجرموں میں کوئی نیشنلسٹ مسلمان نہیں؟ نیشنلسٹ مسلمان انگریز کے زمانہ میں قومی آزادی کے شیدائی تھے وہ کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ ملک جو ایک قومی جدوجہد سے آزاد ہوا اُس کی آزادی خراب ہو، حالت غیر مستحکم رہے اور اس کے اقتدار پر وہ لوگ قابض ہوں جو انگریز کے پشتینی خانہ زاد تھے۔ یہ شرف مسلم لیگ کے بزرگوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے نوکر شاہی کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ دے کر گوارا کیا۔ ملک غلام محمد کو محافظ ملت کہا۔ اسکندر مرزا کو دیدہ و دل میں جگہ دی، اُس کا طواف کیا۔ ایوب خان کی چاکری میں پیش پیش رہے۔ یحییٰ خاں سامنے آئے تو کلمہ حق کہنے سے گریز کیا۔ اب تو خیر سیاسی دور ہے لیکن یہ شرف بھی مسلم لیگ کو حاصل ہے کہ اُس کی تینوں شاخوں کے نمایاں بزرگوں نے حالات کے روبرو سپر انداز ہو کر نوکری کی اور اس کا نام خدمت وطن رکھا۔ بہر حال ہمیں اس سے تعرض نہیں ؏

خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی

جو لوگ نیشنلسٹ مسلمانوں پر آزادی کے بعد بھی کیچڑ اُچھالتے ہیں۔ وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈالیں اور جھانکیں کہ اُن کا کردار کس حد تک شرمناک ہے۔

محمد افضل اورکزئی

بنوں

۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء

* بشکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور

پارسال دسمبر تک ملک سے باہر رہے، لیکن جب سے میرزائی اُمت خارج از اسلام ہوئی اور اُس کا تنگا اُن ڈوبا ہے۔ ظفر اللہ خاں اوائل دسمبر سے پاکستان میں فروکش ہیں اور آج کل مستقلاً لاہور میں رہ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عمر کی اس منزل میں ہیں کہ چراغ حیات کسی وقت گل ہو سکتا ہے۔ شاید اس وقت میرزا غلام احمد کے سب سے معمر پیرو ہیں، اب اُن کی وہ حیثیت بھی نہیں رہی جو کبھی تھی لیکن لاہور میں اُن کا قیام اور اُن کے ہاں صبح و شام معتقد سقادیانیوں کا مجمع خالی از علت نہیں۔ وہ استعماری مہرے کی حیثیت سے کسی وقت کے منتظر ہیں۔ لیکن خوش فہمی کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ اگر انہیں یہ خیال ہو کہ اب کوئی نقشہ اُن کی مرضی کے مطابق بن سکتا ہے تو وہ جتنی جلدی اس سے دستبردار ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ وہ چوری چھپے بعض بے غیرت مسلمانوں سے رابطہ بڑھا سکتے ہیں اور اُن سے بیعت و پذیری کر سکتے ہیں لیکن کسی مرحلہ میں انہوں نے کوئی سیاسی پالٹکس چلانا چاہا یا کسی سیاسی جماعت کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان ان سے بے خبر نہیں ہیں اور نہ کوئی بے غیرت مسلمان انہیں سہارا دے سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ دس سال بعد پاکستان میں میرزائیت کا بول بالا ہو گا، جیسا کہ ظفر اللہ خاں نے ایک صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے تو ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دس سال بعد میرزائیت پاکستان سے اس طرح رخصت ہو جائے گی جس طرح نزع کی آخری ہچکی کے بعد جان بلب مریض چلا جاتا ہے۔ ہم ظفر اللہ خاں کی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں۔

انور علی قریشی

لاہور چھاؤنی

* * *

غلط کاری و غلط روی

میں جانتا ہوں آپ پنجابی ہیں، لیکن حق گو پنجابی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا یہ خط شائع کر دیں گے۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کو گالی دینے کا رواج سب سے زیادہ پنجاب میں ہے حالانکہ نیشنلسٹ مسلمان برعظیم کی آزادی کے ہیرو ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اس ملک کی تقدیر میں [illegible] کے ٹوڈی رہتے اور ہم کبھی ان کا سر [illegible] سے [illegible] نہ [illegible] تھے جو انگریزوں کی خدمت گزاری کے [illegible] لئے گئے۔

[illegible] اس قسم کے لوگ ہی نہیں جو پنجاب کے [illegible] اور بزدل سیاست دانوں کی رئیس [illegible] [illegible] بلکہ اور [illegible] [illegible] ان عناصر سے صاف ہے [illegible] [illegible] یہ شرف صرف [illegible] کہ وہ اپنے ہاں اس [illegible] صحافتی و سیاسی رکھتا ہے کہ وہ حب وطن پسند مسلمانوں کے خلاف [illegible] نہ کریں [illegible] ان کا پیشہ بن گیا [illegible] [illegible] ہوتی ہے [illegible] کے باوجود نہیں سمجھ سکا کہ ان [illegible] بیچوں کا [illegible] کیا ہے یا اس طرح وہ اپنی نسلی برتری کا نقش جمانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ کسی غلط فہمی کا شکار [illegible] ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہی رہیں تو بہتر ہے لیکن ہمارے لیے بابائے قوم FATHER OF THE NATION کی حیثیت سے مرجع عقیدت و ارادت ہیں اور اُن کی بے داغ سیرت ملی و قومی اعتبار سے سرمایہ فخر ہے۔ لیکن پنجاب کی دوسری لیڈر شپ و چھوٹے گھٹے چھوٹے افراد کو چھوڑ کر، کوئی شاہی لیڈر شپ نہیں نہ اُن کی کوئی تاریخ ہے اور نہ ہمارے قلم سے وہ کوئی خراج وصول کر سکتے ہیں

عبدالعزیز، کوئٹہ

سر ظفر اللہ خاں لاہور میں

سر ظفر اللہ خاں ایوب خاں کے زمانہ سے لے کر

[illegible] لاہور



مسافر نے کہا

- سیاست دانوں کے جھوٹ انکے نفس کے سوا ہر چیز کو دھوکہ دینے کیلئے ڈھلتے ہیں
- قبریں ہستی سے پستی کی طرف پہلا پڑاؤ ہیں ۔
- کانٹے انسان سے زیادہ نرم گفتار ہیں ۔
- انسان محبت کی تخلیق ہے لیکن محبت فطرت کا بچہ ہے ۔

جھوٹ انسانی رگ و ریشہ میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ لیکن بعض لوگ جھوٹ بولتے اور بعض لوگ جھوٹ کہتے ہیں ۔ سیاست دانوں کے جھوٹ ان کے نفس کے سوا ہر چیز کو دھوکا دینے کے لیے ڈھلتے ہیں۔ پیشواؤں کے جھوٹ اعتقاد کی گہرائیوں تک پھیلتے اور پھر اپنی موت مر جاتے ہیں ۔ حکمرانوں کے جھوٹ ملک و قوم کی مصلحتوں میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ مصوروں کے جھوٹ صرف رنگوں تک محدود رہتے ہیں۔ مغنیوں کے جھوٹ آواز کی لے پر حسن کا روپ اختیار کرتے ہیں ۔ شاعروں کے جھوٹ بلیغ ہوتے اور انسان کو ذہنی مسرتیں مہیا کرتے ہیں ۔ شاعری جھوٹ کی سچائی ہے ۔ اگر زندگی میں شاعری نہ ہوتی تو انسان نصف بیکار ہوتا ۔ شاعروں نے نہ صرف انسانوں کے دکھ بانٹے ہیں بلکہ ان کی وحشی سوچ کو رام کیا اور انہیں خیالوں کی بہشت کے راستہ پر لگایا ہے ۔ دولت اور شعر یکجا نہیں ہو سکتے ۔ دونوں میں عداوت ہے ۔ دولت پیٹ سے سوچتی اور شعر دل سے سوچتا ہے ۔ شاعر انسان کو ان کی دکھی جز ریوں میں سے جاتا ہے جو صرف خیالوں کی ہی بستیوں میں آباد کئے جا سکتے ہیں ۔ جہاں روح کی غذا آگ اور مارخ کی خوراک خیال ہے ۔ شاعروں نے انسانوں کو بگشتہ ہونے سے بچایا لیکن جذبوں کی آگ میں تپایا ہے

جنگ شاعری کے مزاج [illegible]

[illegible]

قدرت ان سے احساس کی دولت چھین لیتی اور پہلو میں انگارے کی بجائے پتھر رکھ دیتی ہے ۔ شاعری اعلیٰ الفاظ کی عبادت اور خیال کی معراج ہے ۔

اور قبرستان میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی قبریں موت کی شاعری ہے ۔ ایک سنگدل ان نوشتوں پر غور کئے بغیر اس طرح گزر جاتا ہے جس طرح "حیا" عصمت یافتہ وجود کے قریب آتے ہوئے ہچکچاتی ہے ـــ قبریں ــــ ہستی سے پستی کی طرف پہلا پڑاؤ ہیں ــــ میں نے قبروں کو صبح کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں یکساں پایا ہے ـــ گویا یہ زندگی کے خلاف زبردست احتجاج ہیں ــــ قبرستان کی بھرپور گود (استعارہ سے بے نیاز) ہمیشہ ہی کھلی رہتی ہے ۔ اس کی شفقت عجیب و غریب ہے ۔ جب ماں بیٹے کو ، بیٹا باپ کو ، بہن بھائی کو اور بیوی شوہر کو ذہنیکہ ہر کوئی اپنوں سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے تو قبرستان اپنی گود کھول دیتا ہے ۔ وہ موت کے دروازے پر چھوڑ جانے والوں سے زیادہ باوفا ہے کہ صور اسرافیل کے پھونکے تک دوست ہے ۔ قبر کی گود جو زندگی کے اختتام پر کھلتی ہے ۔ ــــ قبرستان ــــ یہاں کوئی حکمران نہیں صرف اعمال ہی روحوں پر حکمرانی کرتے ہیں ۔ سب ایک سی نیند سو رہے ہیں اور اس دن کے انتظار میں ہیں جب قم باذن اللہ کی صدائیں گونجیں گی ــ اور فرشتوں کی نہ باتیں کہہ اٹھیں گی کہ

مسافرو ! تمہاری روحیں تمہارا استقبال کرتی ہیں ۔

اور وہ کھوکھلے درخت جو کبھی سرسبز تھے پھر جوان ہو کر بوڑھے ہو گئے جن کی پیٹھ پر صدیوں کا بوجھ ہے ، جو گئے وقتوں کی شاعری ہیں ۔ مسافر نے ان سے سوال کیا ؟

"کیا تمہاری روحوں میں بھی اضطراب کی کوئی چنگاری ہے" ۔

برگد کا بوڑھا درخت مسکرایا ـــ اور اس نے سامنے کھڑے شہتوت کے درخت کی طرف جھانک کر کہا :

انسان کی انا کتنی ظالم ہے کہ گرد و پیش کے سوا اسے کہیں زندگی کے آثار معلوم یا محسوس نہیں ہوتے ہیں ۔

- مسافر نے برگد کے بڑھاپے کی جھریوں کو گھورنا شروع

کیا اور پھر اس کی ایک ایک پتی سے سوال کرتا گزر گیا۔

تم ا اسشارح پرشکن نے کہا،

میں نے جو کچھ دیکھا اس پرشاعری کی نزاکت گفتار بھی قادر نہیں ہو سکتی ۔ لیکن شاعروں کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ عشقوں کو رسوا کرتے اور محبتوں کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ بیمار نہیں، مناد ہیں، ان کی دکان پر راز فروشی ہوتی ہے۔

میرا کام چپ چاپ دیکھنا اور چپ چاپ سوچنا ہے۔

اس تم شاعروں کے ایک انبار نے جواب دیا۔

ہم کچھ نہیں ہم محض امانت دار ہیں۔ ان پیالوں کے جنہیں رات کی تنہائیاں اور سہ پہر کے سناٹے ہمارے سایوں تک لاتے رہتے ہیں ۔ ہم انسانوں کی زبان نہیں سمجھتے، صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب دو گلابی ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں تو ہر گدڑ کا بوڑھا درخت کھلکھلا اٹھتا ہے، جیسے کہ سا ہو میری کھوکھلی ہنسی کی طرح تمہارے عہد بھی کھوکھلے ہیں،

جوانی دیرپا نہیں، یہ ایک خواب ہے، جو بانسری کے بول کی مانند جلد جلد اڑ جاتا ہے۔

مسافر قدم اٹھا کر آگے بڑھ رہا تھا، شہتوت کے درخت نے آواز دی ۔ ٹھہرو، انسانوں نے عشق کی اوٹ میں حسن کا رس اس طرح نچوڑا ہے کہ میرے پھولوں کی مٹھاس جاتی رہی ہے۔

اور کانٹے انسان سے زیادہ نرم گفتار ہیں مسافر نے غنچوں کی بات سنی تو پھول کی طرف دیکھا۔ گلاب نے ہنس کر کہا شاید ہی شاعروں نے کانٹوں پر بڑی طعن طنز کی ہے، ہمیشہ گلاب کے پہلو میں کانٹے، شاعرانہ طعن و تشنیع کی زد میں رہے ہیں، لیکن ان کی ہستی ان دوستوں سے زیادہ بے عیب ہے جو اپنے ہی دوستوں کے پہلو میں بیٹھ کر ان کی کمزوریاں تلاش کرتے اور پھر ان کے عیوب پر چھاپہ مار کر بازاری اشتہاروں کی طرح انہیں دیواروں پر چسپاں کرتے ہیں۔ محسن کش بھیڑیئے سے زیادہ خطرناک اور بھیڑیئے سے زیادہ ظالم ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

محبت کیا ہے؟ مسافر اس سوال پر کچھ دیر کے لیے رک گیا پھر نظر اٹھا کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

تم نے ایک سوال کیا ہے جو ہزاروں جوابات کے باوجود تشنہ ہی رہا ہے اور ہمیشہ کی طرح لوگ اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

محبت بیان سے باہر کی چیز ہے وہ صرف کی جا سکتی ہے، کائنات کی تمام خوبیاں یکجا کرنے کے بعد اگر کوئی ہیولیٰ تیار ہو سکتا ہے ۔ اور پھر اس ہیولیٰ کے لیے کوئی روح بن سکتی ہے تو وہ محبت ہے ـــ محبت خیال کی وادی میں ایک ایسے سرود کا عکس ہے جو فطرت ہی الاپ سکتی ہے۔

انسان محبت کی تخلیق ہے

لیکن محبت فطرت کا بچہ

عشق اور حسن جب ایک دوسرے کی انگلی تھام کر دو جہاں کی ناؤ کھینے کے لیے شعر و نغمہ کے پانی میں اترتے ہیں تو ان کے مرمریں قدموں کی آہٹ سے جو آواز اٹھتی ہے محبت اس کی صدائے بازگشت ہے۔

خود غرضی انسان کی فطرت ہے۔ لیکن جب تک وہ ایثار اور قربانی سے کام نہیں لیتا اسی وقت اسے سچی خوشی اور راحت حاصل نہیں ہوتی۔ نیک نامی اور شہرت انہی ہی کو حاصل ہوتی ہے، جو صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر دوسروں کے لیے قربانی کرتے ہیں۔

نیکی اس شمع کی مانند ہے جو تاریکیوں میں جلتی ہے اور اندھیرے میں دور دور تک روشنی بکھیرتی ہے لیکن بدی ایک ایسی تاریکی ہے جو زندگی کو محیط ہو کر ہر شے کو نگل جاتی ہے۔ نیکی نوشدارو اور بدی زہر ہے۔ لیکن تمہیں کیا پسند ہے اس کا فیصلہ تم ہی کرو۔

بلندی نہیں بلکہ پستی خطرناک ہے۔ وہ پستی جہاں نظر نیچے کی طرف پھیلتی ہے اور ہاتھ روکنے کے لیے اوپر کی طرف اٹھتے ہیں۔

نیک منشور، تم اپنی نیکیوں سے اس طرح محبت کرتے ہو جیسے ماں اپنے بچے سے۔ لیکن یہ بھی کبھی سنا ہے کہ ماں اپنے بچے کی اجرت چاہتی ہے۔

★

بقیہ: نظمِ قرآن

کر دینا چاہتے ہیں۔

نظم کی قدر و قیمت

نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے، کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطہ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک اگر رسائی ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا، وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں، اگرچہ ایک اعلیٰ کتاب کے منفرد احکام اور اس کی منفرد ہدایات کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے، لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے، اس بات میں کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات و خواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزاء سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دیدے۔

جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں اسی طرح نیکیوں اور بدیوں کے بھی شجرے ہوتے ہیں، بعض اوقات ایک نیکی کو ہم معمولی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نیکی کا تعلق نیکیوں کے اس خاندان سے ہوتا ہے، جس سے تمام بڑی نیکیوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح بسا اوقات ایک برائی کو ہم معمولی برائی سمجھتے ہیں، لیکن وہ برائیوں کے اس کنبے سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے جو تمام مہلک بیماریوں کو جنم دینے والا کنبہ ہے۔ جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دق کا پتہ دینے والی بیماری کو نزلے کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش

بحوالہ ہفت روزہ چٹان لاہور

قرار دیدے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظمِ کلام سے واضح ہو جاتی ہے اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورہ کے اندر ان آیتوں کی باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

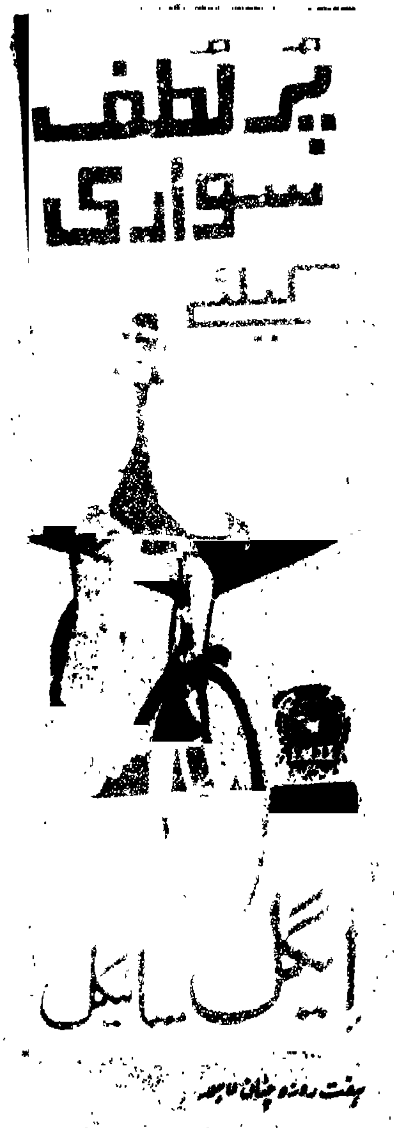
اسی طرح قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی و انفسی یا تاریخی دلائل بیان کیے ہیں اور یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جس شخص پر یہ ترتیب واضح ہو جب وہ اس سورہ کی تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر اس نے ایک نہایت جامع، مدلل اور شرح صدر بخشنے والا خطبہ پڑھا ہے، اس کے برعکس جو شخص اس ترتیب سے بے خبر ہو وہ اجزاء سے اگرچہ واقف ہوتا ہے لیکن اس حکمت سے وہ بالکل ہی محروم رہتا ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا علمی و فکری پہلو ہوا۔ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن مجید کی حبل اللہ المتین ہی کے ذریعہ سے ہوئی ہے اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور متفرق نہ ہوں۔ اس ہدایت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلافات پیدا ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان

میں سے کون سا قول حق ہے۔ کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق و سباق اور نظام ہی ہو سکتے ہیں، لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

فقہی اختلافات سے زیادہ سنگین معاملہ گمراہ فرقوں



کی ضلالتوں کا ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے قرآنی آیات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹا اور جو جی میں آیا وہ اس کے اندر معنی پہنا دیے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلام کو اس کے نظم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے اندر آپ معنی پہنانا چاہیں تو بہت سے معنی پہنا سکتے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصور اس قول کا کہنے والا کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں بہت سی ایسی آیتوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو تحریروں اور تقریروں میں نہایت غلط اور گمراہ کن معنوں میں استعمال ہو رہی ہیں لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا تکلیف کر کے یہ دیکھ لے کہ آیت کس موقع و محل اور کس سیاق و سباق کی ہے، کیونکہ قرآن کے معاملے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان کے نزدیک نظم اور موقع و محل کا کوئی سوال ہی سرے سے نہیں ہے۔

نظم کا اشکال

اب آئیے اس سوال پر غور کیجئے کہ جب قرآن کے سمجھنے کے لیے نظم کی اہمیت یہ ہے تو آخر اس کو اتنا مخفی کیوں کر دیا گیا ہے کہ امام رازیؒ جیسے ذہین آدمی کی کوششیں بھی اس کو کھولنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کا یہ اشکال جو ہے یہ درحقیقت قرآن کا اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اپنا اشکال ہے قرآن نے اول اول جن لوگوں کو مخاطب کیا ان کو اس کے نظم کے بارے میں کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔ زبان ان کی تھی اگرد و پیش ان کا تھا حالات و مسائل اور اعتراضات و سوالات ان کے تھے جو پارٹیاں قرآن کی مخاطب تھیں وہ سامنے موجود تھیں اور جس قسم کے نظریات و معتقدات وہ رکھتی تھیں وہ سب معلوم و معروف تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید کے لطیف سے لطیف اشارات اور مخفی سے مخفی کنایات بھی سمجھ لینے میں انہیں کوئی زحمت پیش نہیں آتی تھی۔ جہاں آیات اتریں بے تکلف ان کے ذہن ہر اشارے و کنایے کے محل پر لگ

تک پہنچ گئے اور انہوں نے کلام کے پورے دائرہ عمل کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اس کے سمجھ لینے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا جو سارے حالات سے خود متعلق بھی تھے اور ذہین بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا حال مذکورہ تمام اعتبارات سے ان سے بالکل مختلف ہے۔ نہ زبان ہماری ہے نہ حالات و مسائل ہمارے ہیں۔ زمانے میں بھی صدیوں اور قرنوں کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے سمجھنے میں ہمیں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بالکل فطری ہیں، بقدر ضرورت عملی و اخلاقی تعلیمات و ہدایات کو سمجھ لینے کی تو اور بات ہے لیکن اگر کوئی شخص ربط و نظام کی باریکیوں اور کلام کے منطقی تسلسل اور اس کے اسرار و حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے نہ صرف زبان کی اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا بلکہ ذہنی و فکری صعود کے ذریعے اس بعد زمانی پر بھی غالب آنا پڑے گا جو اس کے اور قرآن کے زمانۂ نزول کے درمیان حائل ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ ایک عظیم فکری و علمی جہاد کے بعد ہی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزا اور اس کی ترکیب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجزا کا علم بہت آسان ہوتا ہے لیکن ترکیب کے علم کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ نظم کا علم درحقیقت ترکیب کا علم ہے۔ یہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت سے فلاں آیت کا کیا جوڑ ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد دین و اخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو واضح کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک نہایت اعلیٰ مقصد ہے۔ اسی چیز کو حکمت کہتے ہیں۔ حکمت بہرحال ایک مخفی خزانہ ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ قرآن نے عملی زندگی کے سلسلے کیا احکام دیئے ہیں تو اس کے لیے اسے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص دین کی حکمت معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسے بہرحال قرآن کے اندر معتکف ہونا اور اس کے لیے ساری زندگی قربان کرنا پڑے گا۔

★

ڈاکٹر یونس حسنی

اختر شیرانی کا فن

گیت

اختر نے گیت بھی کافی لکھے ہیں، اُردو میں گیت نگاری دَورِ جدید کی دَین ہے، شاعری کو فنِ شریف نہ سمجھنے کی وجہ سے اُردو میں ایک عرصے تک عوامی گیتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا سکی۔ نظیر اکبر آبادی کی کچھ نظمیں گیتوں سے قریب ہیں لیکن خود نظیر کے ساتھ ان کے معاصرین کا جو رویّہ رہا، اس کی موجودگی میں گیت نگاری کے لیے کوئی موقع میسّر نہیں آ سکتا تھا، البتہ ہندی میں گیت نگاری عرصہ دراز سے چلی آتی ہے، سینکڑوں عوامی گیت ہیں کہ ان کے خالق کو کوئی نہیں جانتا، لیکن تخلیق بڑے سے بڑے ادبی شاہکار سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے، اُردو کی شرفا پسندی "اجلافوں" اور "نداقوں" کی صنعت سمجھ کر اسے قبول نہیں کر سکی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں "عوامی دور" کا آغاز ہوا اور اُردو میں بھی گیت لکھے جانے لگے۔

گیت قلبِ انسانی کی وہ مرتعش کیفیات ہیں، جو وفورِ جذبات میں زبان تک بے ساختہ آ گئی ہیں، یہ ایک عام انسان کے جذبات ہیں، اس لیے ان میں نہ تہذیبی تکلف ہے، نہ مرصع کاری، سیدھے سادے جذبات، شیریں و عام فہم زبان میں ادا کیے گئے ہیں، اپندر ناتھ اشک نے گیت کی تعریف یوں کی ہے۔

یہ زبانِ ہندی

"گیت دراصل ہمارے جینے کی شنو کی وہ ہلکی اور گہری لکاوٹیں ہیں، جو دھیش گیتا کے دلدار شبدوں میں آ گئی ہیں، ان کا رنگ اس صورت میں دل پر جم سکتا ہے، بدی دل کی دھڑکنوں سے وہ لکاوٹیں آپ سے آپ چھڑ کریں۔"

گیت میں جذباتِ انسانی کی لطیف پیش کشی اور نفسیاتی باریکیوں کی بازآفرینی اکثر دکھائی دیتی ہے، لیکن حیات و کائنات کے مسائل، فلسفے کے بے کیف و سنجیدہ موضوعات اور ادبِ عالیہ کی خصوصیات اس میں نہیں ملتیں، گیت کی ذہنی سطح اور جذباتی مزاج اس وقت پسندی کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ نازک آبگینہ تند و تیز صبا کو برداشت نہیں کر سکتا، ہلکی اور کیف آور شراب ہی اس میں زیب دیتی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک نے مختار صدیقی سے اتفاق کرتے ہوئے گیت کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ زبانِ ہندی

"اُردو کے یوگ آلوچک شری مختار صدیقی کے ساتھ میں بھی پاٹھکوں سے یہ انورودھ کروں گا کہ گیت میں (وشیش کر پڑھے جانے کے بدلے گائے جانے والے گیتوں میں) اتنی تاب نہیں ہوتی کہ وہ اتّم کاویہ کی باریکیوں کے بل پر پسند کیے جا سکیں۔"

گیت کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے، اس کا مدار بڑی حد تک موسیقی پر ہے، دھنوں کے تقاضے مصرعوں کی ترتیب، الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست و برخاست کے ذمہ دار ہوتے ہیں، الفاظ کا نرم، شیریں اور مترنم ہونا ضروری ہے اور گیتوں کے مزاج میں یہ بات داخل ہو گئی ہے، کہ ان میں ہندی کے رسیلے اور سماعت نواز شبد استعمال کیے جائیں، کبھی کبھی ہندی بحروں کا استعمال بھی روا رکھا جاتا ہے۔

اُردو میں گیت عظمت اللہ خاں اور حفیظ جالندھری نے بھی لکھے ہیں۔

گیتوں میں حفیظ کی مقبولیت اور پنجاب کی نغمہ ریز سرزمین کے زیرِ اثر پنجاب کے اُردو شعراء نے اس طرف خصوصی توجہ دی اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی اُردو میں گیتوں کا سرمایہ جمع ہونے لگا، ہر قسم کے گیت لکھے گئے، یہاں تک کہ سیاسی قسم کے گیتوں سے بھی فضائیں گونج اٹھیں، گیت نگاری کے لیے عام فہم اور عوامی زبان کا استعمال ناگزیر ہے، اُردو کے جن شعراء نے گیت لکھے ہیں، ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دم گیت لکھنا شروع نہیں کر دیا ہے، ان کی زبان پہلے آسان ہوئی، اس میں ہندی الفاظ کی آمیزش ہوئی، بحروں میں ترنم اور روانی پیدا ہوئی، ہلکی پھلکی گیت نما نظمیں کہی گئی ہیں، تب کہیں جا کر انہوں نے گیت لکھنا شروع کر دیا اپندر ناتھ اشک نے اُردو گیت نگاروں کے ہاں اس تدریج کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"گیتوں تک پہنچنے کے لیے اُردو کویتا ہمیشہ پرائے ایک دو مرحلوں سے ہو کر گزرتی ہیں میں نے ایسا نہیں دیکھا، کہ کوئی اُردو کوی ایک دم ہی سرل سیدھے گیت لکھنے لگا ہو۔"

اختر شیرانی کے یہاں یہ مرحلے نمایاں ہیں گیت لکھنے سے قبل ان کی نظمیں گیت کی خصوصیات اپنے اندر سموتی جا رہی تھیں، ترنم کی افراط، عام بول چال کی سادہ زبان، شیریں روانی اور ہندی الفاظ کا

استعمال، ہیئت کا موسیقی کا پابند ہونا، یہ تمام خصوصیات، اختر کی منظومات میں دکھائی دیتی ہیں، "اے عشق کہیں لے چل" "او دیس سے آنے والے بتا" "بستی کی لڑکیوں میں" "تو لیسے سے میں آ پیاری" "آخری اُمید" اور "بانسری کی آواز" ایسی نظمیں جن کی ترقی یافتہ شکل گیت ہی ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر ہم چند بند پیش کرتے ہیں ؎

ہم پریم پجاری ہیں، تو پریم کہنیا ہے
تو پریم کہنیا ہے، یہ پریم کی نیا ہے
یہ پریم کی نیا ہے، تو اس کا کھویا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

"او دیس سے آنے والے بتا" کا یہ بند ملاحظہ کیجیے ؎

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر
پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر
سب ماتھے پر گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے
ہنستے ہوئے چہلیں کرتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

ایک اور نظم کا ایک بند دیکھیے ؎

گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
سرمست ہوائیں آئی ہیں
جو تیرا سندیسہ لائی ہیں
آ بدلی بن کر چھا پیاری
تو لیسے سے میں آ پیاری

یہ نظمیں اپنے آہنگ، اپنی مخصوص ہیئت، الفاظ کی نرمی و سبک روی اور نغمہ باری کی وجہ سے گیت سے بہت قریب آ گئی ہیں، اگرچہ یہ گیت نہیں ہیں، اور ہندی الفاظ کا استعمال تو اختر نے ان نظموں میں بھی کیا جو گیت سے اس قدر قریب نہیں ہیں، مثال کے طور پر جوگن کا یہ بند ؎

یہ موہنی بنی ہے کس کی کھوئی ہوئی جوگن

یہ جنگل دور کس کے غم میں بیٹھی ہے
نی شاید اس کی نظر معصوم آتا نہیں
ہر کی پریم اگنی ہونے لگا رہی ہے
ہر من میں ہر نگر میں ہر گھر میں ہر ڈگر میں
پھر پھر کے اپنے من کی چتا جلا رہی ہے
یا ہر کی جستجو میں پریتم کی آرزو میں
کاشی سے آ رہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کر
پر تاکو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اختر نے ایک بھجن بھی لکھا ہے "دعائے معصوم" یہ ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے، اس لیے ہم نے ضمیمے میں اسے شامل کر دیا ہے، اس میں موضوع کے تقاضے سے مجبور ہو کر اختر نے اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں، کہ اگر اس بھجن کو ناگری رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو یہ اردو تخلیق نہیں رہے گا۔ اس سے ہندی الفاظ کے استعمال پر اختر کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اردو میں چونکہ گیت کی کوئی طویل تاریخ موجود نہیں ہے، اس لیے سبک اور رواں گیت لکھنے سے قبل ہر گیت نگار کو اس کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اختر نے یہاں مندرجہ بالا گیت نما نظموں کا رجحان دراصل گیت لکھنے کی مناسب تیاری ہے، اس تیاری کے بعد ان کے لیے گیت لکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں رہا۔

ہندی شاعری میں اظہارِ عشق عموماً عورت کی طرف سے ہوتا ہے، ہندی کے عشقیہ گیتوں میں بھی یہی روایت پائی جاتی ہے۔ اختر نے اردو گیتوں میں بھی اس کو روا رکھا ہے اور اس طرح اردو ادب میں عورت کے عشقیہ جذبات کی پاکیزہ پیشکش میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، ان کے گیت موضوعات کے لحاظ سے محدود ہیں، انہوں نے صرف پریت اور برسات کے گیت لکھے ہیں، ان کے گیتوں میں عموماً بد نصیب عورت کے جذبات کی پیشکش ہے، چونکہ نسوانی جذبات کی پیش کشی کی گئی ہے، اس لیے ان گیتوں میں الفاظ بھی بڑے نرم، رواں اور سبک استعمال کیے گئے، ان گیتوں میں ہندی کے مترنم، شیریں اور مستعمل الفاظ کو جس فنکاری سے اختر نے استعمال کیا ہے۔ وہ انہی کا حصہ ہے۔

(جاری ہے)

بقیہ: ملتوں کی زندگیاں

نے اب تک دینی احساس پر تعلیمی نظام کے جو تجربات کیے ہیں، وہ سب بہت قیمتی ہیں، ان کی پوری پوری قدر کیجیے، ان تجربات پر مل جل کر ایک دوسرے کے تعاون و اعتماد سے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی جامع خاکہ تیار کیجیے جو ہم آگے بڑھا سکیں اور دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن سکے آئیے ہم یہ تہیہ کر کے بیٹھیں کہ آئندہ ہماری تمام صلاحیتیں تعمیر و اصلاح اور دینی ہدایت کی روشنی میں اپنے تمام مسائل حل کرنے میں صرف ہوں گی اور ہم ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعاون کی راہیں تلاش کریں گے ہم ایک ایک تعلیم گاہ کو نمونہ کا ادارہ بنائیں گے۔ ہماری زبان قلم اور فکر کا ہر دائرہ آپس کی کشمکش سے آزاد ہوگا اور اس طرح خود فکر کے بعد جب ہم اس کانفرنس سے فارغ ہوں گے مسلمانانِ عالمِ اسلام کو ایک زندگی بخش عملی پروگرام دے سکیں گے۔

یقین رکھیں آنے والی ہجری صدی انشاءاللہ اسلام کی صدی ہے اور اس کو قریب میں لانے میں جو بھی سعی کریں گے وہ ہمارے لیے آخرت میں سعادت اور دنیا کی کامرانی کا سبب بنے گی انشاءاللہ۔

بدلِ اشتراک

سالانہ:	۴۰ روپے
ششماہی:	۲۱ "
سہ ماہی:	۱۱ روپے

از:- جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان

"شفاء الملک"

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی۔ اِس نام سے کتنی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ پرانے وضع دار بزرگوں کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کی صفیں آہستہ آہستہ خالی ہوتی جا رہی ہیں، سادہ لباس، درویش صفت، محب وطن، اسلامی ثقافت کے علمبردار، طب مشرق کے بطل جلیل، نکتہ سنج ادیب، مشفق وہمدرد معالج، مجسمۂ شرافت غرض حکیم صاحب کی زندگی کے بے شمار حسین پہلو اہل نظر سے داد طلب ہیں، ان کا دھیما مزاج ان کی شیریں گفتاری سے ہم آہنگ تھا، جب کبھی ان کی خداداد حذاقت طبع سے استمداد کا موقعہ ہوا، ان کے شفقت آمیز رویّہ نے دل میں گھر کر لیا، ان کی باتوں میں ہمارے سنہری ماضی کی خوشبو تھی، ان کی دلآویز مسکراہٹ مریضوں کے دل کا مرہم تھی اور ان کی نبض شناسی کی ممدومعاون، غرباء کے لیے ان کی کشادہ دستی پریشان دلوں کے لیے ہمیشہ سہارا رہی۔

شفاء الملک علامہ اقبالؒ کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ علامہ کی آخری علالت میں ان کی مسیحائی سے کئی نازک مرحلے سکون وطمانیت کے لمحوں میں تبدیل ہو گئے، جس دل سوزی اور توجہ سے انہوں نے شب و روز ایک کر کے ان ایام میں علامہ مرحوم کی تسکین خاطر کا اہتمام کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے، یہی وجہ تھی، کہ علامہ کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوتی، وہ حکیم صاحب کو یاد فرماتے اور اُدھر وقت نا وقت بسر و چشم تعمیل ہوتی، حکیم الامت کے پاس خاطر سے آپ گھنٹوں ان کے بستر علالت سے لگے رہتے، علامہ کی خدمت میں یہ انہماک،

شفاء الملک مرحوم کے جذبہ ملی کی منہ بولی شہادت ہے، کیونکہ علامہ کی ذات ان دنوں ملت کا محور تھی علامہ کی وفات کے بعد تا حیات شفاء الملک اپنے مضامین وتقریر کے ذریعہ سے علامہ کے خیالات کو ملت کی خاطر اُجاگر کرتے رہے اور کیوں نہ ایسا کرتے کہ وہ تحریک پاکستان کے سچے بہی خواہوں میں سے تھے، ایسی پہلو دار شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں، فطرت انہیں عرصہ شہود میں اسی وقت لاتی ہے جب ان سے کوئی اہم کام لینا ہو، ان کی صلاحیتیں پنپ کر اقدار انسانیت کی پیش رفت کا وسیلہ بنتی ہیں مقررہ مدت کے انقضاء پر ان کا پیکر خاکی پھر پردہ خفا میں چلا جاتا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ نے ان انسانوں کی بھرپور خدمت کر کے اپنی زندگی کو ان کے لیے مایہ رحمت ورافت بنایا، ان کے دست شفا نے اپنے چاروں طرف نور صحت پھیلا کر ان کی نجات اخروی کے لیے سامان وافر بہم پہنچایا، جام خدمت پُر ہوا، اُدھر ان کا پیمانہ عمر بھی لبریز ہو کر منزل تک آ گیا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

[illegible] لاہور

حکیم عبدالرشید جیلانی

روح مطالعہ

★ اگر خدا کا قرب چاہتا ہے تو آنکھ کنواری رکھ
★ سیر شکم رہنے والا بصیرت سے محروم رہتا ہے،
★ انسانیت کے محل کی روشنی دراصل بصیرت کی سوغات ہے۔
★ حواس خمسہ کی نگرانی رکھنے والا وجود متلاشیان حق کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
★ علم چراغ حکمت ہے، اور عمل اس کی روشنی
★ مظلوم کی آہ اور مجذوب کی بڑک خدا کے دربار میں استغاثہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا فیصلہ خدائی قوت سے ہوتا ہے، مگر جو مظلوم ظلم سہنے کے ساتھ یا موقع پانے کے ساتھ انتقام لے لے وہ خدا کے دربار میں استغاثہ دائر کرنے کا حقدار نہیں
★ گفتگو شخصیت کی آئینہ دار اور لباس محض نمائش کا دعویدار ہے۔
★ گفتار اور کردار کا تقاضا وقصر شخصیت کا دیمک ہے،
★ علم سے متعلق جہاں بے عمل عالم کی پرواز ختم ہوتی ہے، وہاں سے باعمل عالم کی پرواز جنم لیتی ہے
★ جہاں سراپائے نور حضرت جبریل امینؑ کی پرواز جواب دے گئی، وہاں فدائے انسانیت نبی آخر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پرواز سے

۷ مارچ ۸۵ء

اشتیاق ہے۔

★ عالم بحرِ ظلم میں غواص کی حیثیت سے گوہرِ صادق کی تلاش میں عشق و دوستی کے چراغ جلائے مستغرق رہتا ہے ——— اور ——— عامل تعمیلِ حکم میں ہر لمحہ خالقِ کائنات کے حضور سربسجود رہتا ہے۔

★ عارف باللہ بحرِ ہو میں غوطہ زن ہو کر قرب تک پہنچ جاتا ہے۔

★ جب جنسِ انسانی پر حیوانی قوتیں غالب آجائیں تو عقل و خرد کا وقف ہو جاتی ہے۔

★ انسان خاکی پھول ہے، جو ازل سے دو اقسام

سے کر آیا ہے۔

★ پہلی قسم والا پھول رسمیا، اس کا ایک نام صاحب تقویٰ ہے، یہ اکثر اجتماعی زندگی لے کر آیا، اور اجتماعی زندگی کے لبادہ میں دنیا والوں سے روپوش ہو گیا، مگر اپنی مخصوص خوشبو سے چار دانگ عالم کو معطر و سبز کر گیا۔

★ دوسری قسم بے مہک پھول رجبوٹا، یعنی بے تقویٰ بے مہک پھول جو مرنے کے بعد دھول بنا جو ہر حال دکھ کا نمونہ کہلایا، انفرادی زندگی لے کر آیا اور انفرادی زندگی لے کر چل بسا۔

★ جب رُوح باطنی بیمار ہو تو جسمانی معالجہ بے سود اگر تو جسمانی معالجہ بننے کا خواہاں ہے تو علم الابدان سیکھ اس کے بغیر معالجہ مریض اور معالج دونوں کے لیے خطرناک ہے۔

★ اگر تو روحانی معالج بننا چاہتا ہے تو اپنے نفس کو رضائے حق پر اس طرح نثار کر، جس طرح پروانہ شمع پر جان نثار کرتا ہے، چکور چاندنی کا عاشق ہے۔

★ ماہی پانی کے بغیر زندہ رہنے سے موت کو ترجیح دیتی ہے اگر تو بھی اس کی رضا پر راضی ہے، تو پھر تیری زبان، ہاتھ، پاؤں، کان، سب خدا کی رضا پر چلیں گے۔

★ قصرِ انسانیت کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، اور تکمیل اماں حوا سے۔

بقیہ: عیار جاسوس

گیانی: آپ کا نام کیا ہے؟

میں: از راہ کرم مجھے بے نام ہی رہنے دیں۔

گیانی: لیکن کیوں؟

میں: نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

گیانی: میرا خیال ہے آپ مسلمان ہیں۔

میں: جی ہاں! لیکن اسے رہنے ہی دیجیے!

گیانی: آخر کیوں! مجھے اس شریف آدمی کے نام کا تو پتہ چلنا چاہیے، جس سے میں مخاطب ہوں

میں: (بے حد قلندرانہ آمیز تحمل اور اجتناب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ، میں مجاب سنگھ کا ایک کوچہ گرد ساتھی ہوں۔

گیانی: آپ کا اسم مبارک!

میں: (پوری زمانہ سازی کے بعد، بامر مجبوری میں نے کہا) میرا نام محمد اسمٰعیل ہے۔

گیانی: آپ مجاب سنگھ کو کیوں ملنا چاہتے ہیں؟

میں: وہ ایک مخلص اور سچا دوست ہے۔

گیانی: وہ شادی شدہ ہے؟

میں: جہاں تک مجھے علم ہے، وہ شادی شدہ نہیں

گیانی: کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

میں: جی ہاں، میں تو ہوں!

گیانی: تمہارا گھر کہاں ہے؟

(اس سوال سے بھی، گیانی کا میرے اور میری شخصیت کے متعلق حریصانہ اشتیاق ظاہر ہوتا تھا، اب میں اس کے نزدیک اپنا مقام پیدا کر چکا تھا، اور اس لطیف انداز سے میں نے اس کے ذہن میں اپنے مشن کا مقصد پیوست کر دیا تھا، کہ اگر میں اس کے سوالوں کے جواب نہ بھی دیتا، اور چلنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرنے دیتا، لہٰذا نہ صرف یہ کہ میں نے اس کے سوالوں کا جواب نہ دیا، بلکہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اس انداز میں اس سے اجازت چاہی)

میں: آپ کو میرے ساتھی کا مرید مجاب سنگھ کے متعلق کچھ پتہ نہیں، کیا آپ مجھے بتا سکیں گے کہ گیانی کرتار سنگھ کہاں رہتے ہیں، میں انہیں اس سلسلہ میں ملنا چاہتا ہوں۔

(پیشتر اس کے کہ میں جانے کے لیے مڑتا، حالات یکلخت ایک خوشگوار موڑ پر آگئے، گیانی کی آنکھوں میں مسرت کی ایک پاکیزہ چمک پیدا ہوئی، اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور اس پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے مجھ پر ایک پُراعتماد نگاہ ڈالی۔ اور نہایت پیار اور اثر آفریں آواز میں مجھ سے کہا)

(جاری ہے)

ترجمہ: عبدالعزیز خطیب رحمانی

شاہ عبداللطیف رحؒ بھٹائی

قرآن حکیم ایک مقدس کتاب ہے۔ سرچشمۂ علم عرفان ہے۔ بلا شبہ وحیٔ الٰہی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کریم پر نازل ہوا، جس کا مقصدِ وحید عالم انسانیت کے لیے ہدایت و فیضان ہے۔ قرآن حکیم، مجموعہ ہے الفاظ کا، جس کے جاننے والے حفاظ کہلائے، مجموعہ ہے معانی کا، جس کے جاننے، سمجھنے والے علماء کہلاتے ہیں۔ نیز قرآن حکیم مجموعہ ہے آثار کا، جس کے حامل اولیاء اللہ گردانے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حافظ قرآن، 'صاحبِ لفظ' ہوتا ہے۔ عالم قرآن، 'صاحب معنیٰ' ہوتا ہے اور عامل قرآن 'صاحب اثر' ہوتا ہے۔

'اثر' کی دو قسمیں ہیں، سلبی اور ایجابی۔ نیز 'اثر' کا انحصار صحبت پر ہے۔ اگر اخیار کی صحبت اختیار کی جائے گی۔ تو خیر مرتب ہوگا، اس کے برعکس ہو تو شر مؤثر ہوگا، کیونکہ 'الصحبۃ مؤثر' صاحب اثر یا صاحب نظر ولی ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے ایک شخص حافظ بھی ہو، عالم بھی ہو اور ولی بھی ہو، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو نرا حافظ ہو، وہ ولی بھی ہو، کیونکہ لفظ بغیر معنیٰ کے بے کار ہے اور معنیٰ بغیر اثر کے نادر الوجود۔

قرآن حکیم میں اولیاء الرحمٰن جن معانی میں آیا ہے، اس سے مراد مروجہ اصطلاح اہل تصوف نہ لی جائے، کہ ولی ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس سے غیر معمولی کرامتیں صادر ہوں بلکہ ولی اور عارف کامل سے ہماری مراد اور مفہوم ایسی شخصیت ہے جو خدا پرستی اور نیکوکاری کے خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہو، اور اسلام، ایمان اور احسان کے مرحلہ ہائے شوق کو بخوبی طے کر کے 'تخلقوا باخلاق اللہ' کے رنگ میں رچی بسی ہو، جس کی نگاہ کی تیغ بازی سے ہمارے دل و نگاہ کا زاویہ بدل جائے اور جس کی خدادوستی، خداطلبی اور خدا اعتمادی سے اور اس کی شرف صحبت سے اس کی شخصیت کی خوشبوئے خداپسندی سے ہم اپنی اصلاح کر سکیں۔

آج ہم سرزمین سندھ کے حافظ قرآن، عالم معانی و معارف قرآن نیز صاحب اثر، عارف کامل حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا ذکر خیر کر رہے ہیں۔ تاکہ ہم ان کی غیر معمولی اور عظیم شخصیت کی روشنی سے زندگی کی نمود میں مہمیز کا کام لے سکیں اور زندگی میں جو ذوق سفر کا دوسرا نام ہے ہم شوق طلب میں آگے قدم بڑھا سکیں۔

شاہ عبداللطیفؒ کا خاندانی سلسلہ یہ ہے کہ سید عبداللطیف بن سید حبیب بن سید عبدالقدوس بن سید جمال بن سید عبدالکریم بلڑی والے، بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ شاہ صاحب سید عبدالکریمؒ بلڑی والوں کے پوتے تھے اور بعض کی رائے ہے کہ پڑپوتے تھے۔

بہرصورت اس میں شک نہیں کہ سید عبدالکریم بلڑی والے بزرگ، پرہیزگار اور متدین انسان تھے مٹیاری سے ہالہ میں تشریف لائے۔ حضرت مخدوم نوحؒ سے روحانی رابطہ خاصا استوار رہا، اس کے بعد بلڑی کے مقام پر مستقل سکونت فرمائی۔

حضرت شاہ عبدالکریم (بلڑی) کے تین بیٹے تھے، سید واسٹ رحؒ سید واسعؒ۔ اور شاہ حبیبؒ شاہ حبیبؒ جب بڑے ہوئے تو اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر ہالہ تحصیل میں مقام 'وسی' کے قرب وجوار میں آن کر آباد ہوئے، اور ان کے نام ہی سے یہ گاؤں مشہور ہوا، اور اب اس بستی کے کھنڈرات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کے گھر ۱۱۵۲ھ ۱۶۹۰ء میں ایک فرزند پیدا ہوا، جس کا نام نامی سید عبداللطیف تجویز کیا گیا۔ یہ بقول اہل سندھ 'جائینڈی' جام (پیدائشی طور پر ہی وہ سرشار تھے) ولادت سے لے کر عنفوان شباب تک شاہ صاحب غیر معمولی فوق الفطرت تصرفات و کرامات کے امین اور اسرار و رموز الٰہیہ کے حامل تھے۔

شاہ لطیف ابتدائے شعور ہی سے خلوت پسند، کم آمیز اور دیرآشنا تھے۔ وہ عشق مولائے کریم میں ہمیشہ مدہوش و سرشار رہتے تھے، صحو کی بجائے سکر و جذب کا غلبہ رہا کرتا تھا، اور کیف و مستی کے عالم میں رہا کرتے تھے، عشق الٰہی آپ کی گھٹی میں ازل سے پڑا ہوا تھا، طبیعت کی یہ بے قراری اور کرب انہیں اشیاء کی معرفت اور روحانی رازوں کے حل و کشائش میں سرگرم رکھتی اور آپ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کے ساتھ اس کی مخلوق سے محبت فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شاہ لطیفؒ جوانی کے عالم میں مرزا بیگ (مغل) کی صاحبزادی دوشیزہ کے زلفوں کے اسیر ہوئے۔ وہ تحصیل ہالہ میں سانگڑی نہر کے کنارے رہتی تھی، شاہ صاحب کا یہ مجازی معاشقہ جو اک دن حسن حقیقت کی طلب گاری اور وارفتگی کا پیش خیمہ تھا۔ دن دوگنی رات چوگنی ترقی پر تھا، آخر شاہ صاحب کے ذہن میں تجویز آئی، کہ اس فتنہ پرداز، خوبرو،

حسینہ کے والد مرزا بیگ سے اس کا رشتہ طلب کیا جائے۔ چنانچہ رشتہ طلب کیا گیا لیکن مرزا بیگ جو کلہوڑوں کے عہد سے قبل حکومت کرتا تھا، اپنے تمول اور ثروت پر گھمنڈ کی بنا پر اس نے اس نے اس رشتہ کو ناپسند کیا اور شاہ صاحب کی عسرت و افلاس سے بھرپور زندگی پر انگشت نما زن ہوا، اس نے رشتہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ روایت مشہور و زبان زد خاص و عام ہے کہ شاہ صاحب نے سانگڑی نہر کے کنارے ایک ریت کے ٹیلے پر ڈیرہ ڈال دیا، اور وہیں کچھ عرصہ عالم سوز و ساز میں گزارے کسی کو بھی ان اسرار الہیہ کی خبر تک نہیں تھی، البتہ ایک گڈریا "جام" نامی شاہ صاحب کی خدمت اقدس میں آیا جایا کرتا اور خدمات بجا لاتا، شاہ صاحب نے اپنا اسی ابتدائی دور کی واردات اور کیفیات قلبی کو اپنے اشعار میں اس کچھ انداز سے بیان کیا ہے۔

کہ یہ شب و روز میرے لیے جانگاہ ثابت ہو سکتے ہیں میں نے خون جگر پی کر اور خون کے آنسو رو رو کر اس راہ عشق کی صعوبتوں اور تکالیف کا مقابلہ کیا ہے۔ اس راہ محبت کی مشکلات ابتدائے عشق میں بہت بڑی نظر آتی ہیں۔

لیکن اب میں ان مصائب و آلام کا خوگر ہو چکا ہوں اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ یہ تو معمولی کانٹے ہیں جن کی چبھن کا کوئی خاص احساس بھی نہیں ہوتا جب تک مجھ میں سانس ہے میں اپنے محبوب کی طلب گاری اور جستجو سے باز نہیں آؤں گا۔"

شاہ بھٹائی کے والد ماجد سید حبیب شاہ صاحب انہیں سانگڑی نہر کے کنارے اس ٹیلے سے جہاں شاہ صاحب نے قیام کیا تھا واپس لائے اور انہیں جو حالت جذب میں گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے غسل کرایا۔ اس اثناء میں شاہ صاحب سے غیر معمولی خارق عادات کرامات صادر ہوئیں اور شاہ صاحب نے اپنی معنوی اور روحانی تصرفات سے مخلوق کی بے لوث خدمت کی۔ وہ کلمہ حق کی سربلندی کے لیے

ہفت روزہ چٹان لاہور

اس راہ خدا طلبی و حق پرستی کے مصائب و تکالیف سے دوچار ہونے کے باوجود ثابت قدم، صاحب استقامت، اور اولی العزم رہے۔ وہ اپنی شان استغنا کی وجہ سے اہل دولت، اہل ہوس سے بے نیاز ہو کر اہل دل کے زمرۂ لایحزنون کے نمائندے بن گئے اور خلق خدا کو فیضان پہنچاتے رہے اور رشد و ہدایت کا یہ سرچشمہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے عارفانہ کلام "شاہ جو رسالو" کے ذریعہ تاہنوز جاری ہے۔

مہران کی سرسبز و شاداب وادی کے گل سرسبد شاہ لطیف بھٹائی کے اشعار، کافیوں اور ابیات کا یہ علمی تحفہ "شاہ جو رسالو" کے نام سے مشہور ہے۔ موصوف کے خادم اور مرید خاص فقیر تمر نے جو کاتب خاص بھی تھا، ان کا کلام قلمبند کیا ہے۔ فقیر تمر کے علاوہ شاہ صاحب کے ایک اور مزاج شناس مرید سید بلال نامی بھی تھے۔ جنہیں انہوں نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا، اور وہ ہمہ وقت آپ کی خدمت میں مشغول رہتے تھے۔ سید بلال بھٹ شاہ سے دو میل کے فاصلے پر سانگڑی نہر کے کنارے رہا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ شاہ صاحب لاولد تھے۔ جہاں تک شاہ صاحب کے حقائق و معارف سے بھرپور کلام، شاعری کے فروغ اور مقبولیت کا تعلق ہے۔ شاہ صاحب کے "شاہ جو رسالو" کی غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے عوام و خواص کے دلوں کو موہ لیا، خصوصاً سرزمین سندھ کے عوام ہاری، کاشت کار، زمیندار نیز علماء اور اہل نظر کے علاوہ عوامی، علاقائی گیتوں کے روپ میں فنکاروں اور قوالوں نے اسے محافل سماع کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پھیلایا۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کا عارفانہ اور درویشانہ کلام جس کا ہر بول محبت کے کیف اور عشق کی حلاوت میں ڈوبا ہوا ہے۔ دکھی دلوں کے درد کا مرہم ہے۔ خصوصاً مضافات سندھ کے ہر بچے، بوڑھے اور جوان کو ازبر ہے۔ یہاں تک کہ تھرپارکر کے ریگستانی علاقہ میں بکریاں چرانے والے گڈریاں بھیڑ بکریوں کے چرواہوں اور اونٹوں کے ساربانوں تک کو ان کا کلام یاد ہے، اور انسانی قلوب پر پتھر کی لکیر بنا ہوا ہے۔

شاہ صاحبؒ ممدوح چونکہ لاولد تھے۔ اور آپ کی معنوی اولاد، مریدین و معتقدین کے سوا کوئی ظاہری اولاد نہ تھی۔ اس لیے آپ کے بعد آپ کی خانقاہ کے مسند نشین سید جمال شاہ کے خاندان سے ہوتے جو شاہ حبیب کے بھتیجے تھے۔

ایک مشہور کرامت

شاہ لطیف بھٹائی جب بھٹ میں اپنے مریدین و متوسلین کے ساتھ مستقل طور پر مقیم ہوئے تو آپ کے حلقہ کے فقراء اور درویش راگ الاپتے، طنبورے اور دیگر سازوں سے اپنی جمعیت خاطر کا سامان بہم پہنچاتے، ان راگ رنگ کی مجالس کا علم نگر ٹھٹھہ کے مفتی اعظم مخدوم معین الدین کو ہوا (جو "مخدوم ٹھارو" کے نام سے مشہور تھے)، تو مخدوم ٹھٹوی رخت سفر باندھ کر حضرت شاہ صاحب کے آستانہ اقدس پر حاضر ہو گئے کہ شاہ صاحب کو "سماع" سے (جس کا بنیادی عنصر موسیقی ہے جو بقول مولانا ابو الکلام آزاد شرعاً جائز اور قانوناً منع ہے، بحوالہ مکاتیب "غبار خاطر")، روکیں، یہ بات شاہ صاحب کو کشف سے معلوم ہو گئی تو انہوں نے اپنے مریدین سے فرمایا کہ مفتی مخدوم ٹھارو، نگر ٹھٹھہ سے فتویٰ داغنے آ رہے ہیں لہذا سب مزامیر، طنبورے اور آلات موسیقی آپ نے محفل خانے سے اٹھوا کر ایک کمرے میں رکھوا دیئے اور تالہ لگوا دیا، جب مخدوم ٹھارو یہاں آئے تو اس نے اس کمرہ میں سے سازوں کی آواز محسوس کی، پوچھا ساز کون بجا رہا ہے، شاہ صاحب نے فرمایا، تیب شکستہ دل اور ...

کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

قسم کے لوگ آپس میں باہم مل کر غم کساری کرتے ہیں تو تب کٹریاں بھی آہ و فغاں کرتی ہیں یا کریم یا کریم"

باقی صفحہ ۳۳ پر

قومی ذہن کی تعمیر

وقت کی اہم ترین ضرورت

ڈھاکہ کا سقوط، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، خونِ مسلم کی ارزانی، دین کی بربادی، شعائرِ دین کی پامالی، اور کفر و ضلال کی طغیانی، یہ وہ واقعات ہیں جنہوں نے ہر حساس مسلمان کے قلب کو سراپا ناسور بنا دیا ہے۔ جو مرتے دم تک مندمل نہیں ہو سکتا۔ اس غم و اندوہ سے صرف احساس سے محروم افراد ان سنگدلوں کے دل خالی ہیں، جنہوں نے غداری کر کے پاکستان کو یہ روزِ بد دکھایا۔ اور جو اس کی تباہی سے۔ جن کی مراد بر آئی۔ لیکن اس احساس کے باوجود کیا ہم نے کوئی قوم اس نقصانِ عظیم کی تلافی کے لیے اثاثی یا اپنے طرزِ عمل پر محاسبانہ اور ناقدانہ نظر کی جس سے یہ معلوم ہو تاکہ خود ہم سے تو کوئی ایسی غلطی نہیں سرزد ہو رہی جس کی سزا ہمیں مل رہی ہو؟ افسوس اور حیرت کے ساتھ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دینا پڑتا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے اس حادثہ فاجعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد سے الحق میں زعماءِ ملت کو متوجہ کیا تھا کہ ہماری شدید غلطی یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک اپنے کسی "قومی ذہن" کی تعمیر نہیں کی۔ ہمارے سیاسی اقدامات کی فکری بنیاد انفرادی ذہن یا زیادہ سے زیادہ جماعتی ذہن پر قائم ہوتی ہے۔ نہ ہمارا کوئی قومی ذہن ہے نہ اس کی تعمیر کی طرف ہماری کوئی توجہ ہے ہم غداروں، منافقوں، دوست نما دشمنوں کے فریب میں بار بار صرف اس لیے مبتلا ہوتے ہیں کہ ہمارا کوئی قومی ذہن نہیں جس کی ذکاوت و فطانت کار عیب غداروں کو غدار کرنے سے روک سکے۔ اور اگر کوئی بے حیا اس کی جرأت کرے تو فوراً قوم کو اس سے آگاہ اور اس کے فریب سے ہوشیار کر دے۔

ہمارے قومی ذہن کو دینی ہونا لازم ہے۔ کیونکہ ہماری حقیقی قومیت کی بنیاد دینی ہے نہ کہ نسل وغیرہ مگر افسوس کہ ابھی ہمارے اندر قومی ذہن ہی کا تصور مفقود ہے۔ دینی یا غیر دینی ہونے کا مسئلہ تو اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

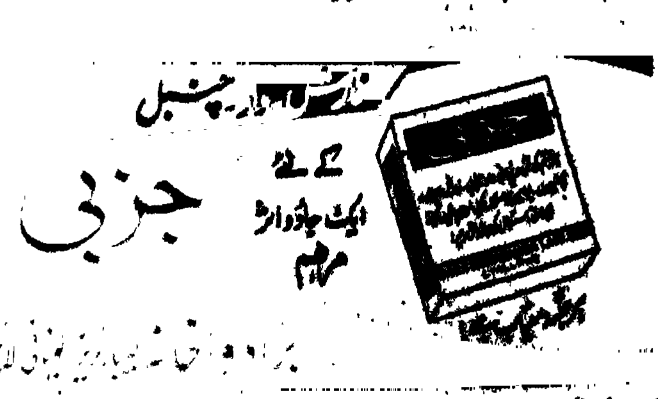
قومی ذہن کی ایک مثال

میں نے انگلستان کو بطور مثال پیش کیا تھا۔ اس کا ایک قومی ذہن ہے اور ہر انگریز اپنے اجتماعی مسائل کو اسی ذہن سے سوچتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ وزارتیں بدلتی رہتی ہیں۔ پارٹیاں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ مگر برطانیہ کی پالیسی کے اصول کبھی نہیں بدلتے۔ چرچل گیا اٹیلی آیا۔ مگر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر پہنچ کر دونوں نے ایک ہی ذہن سے سوچا اور دونوں کی پالیسی اصولی اعتبار سے یکساں رہی۔ امریکہ روس وغیرہ جملہ قومی ممالک و اقوام کو آپ ایسا ہی پائیں گے۔ ان میں سے کوئی قوم بھی قومی ذہن سے محروم نہیں، خواہ وہ ذہن ہمارے نقطۂ نظر سے اچھا ہو یا برا۔ لیکن عالمِ اسلامی عموماً اور پاکستان خصوصاً اجتماعی زندگی کے اس اہم اور ضروری عنصر سے محروم ہے۔ ہمارے زوال و انحطاط اور ہماری تباہی و بربادی میں اس محرومی کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ جب تک قومی ذہن کا وجود نہیں ہوگا، اس وقت تک افرادِ قوم صحیح معنی میں اجتماع کی منزل پر نہیں پہنچتے۔ امت کا شیرازہ پراگندہ ہی رہتا ہے۔ بظاہر جو اجتماعیت نظر آتی ہے وہ بہت کمزور ہوتی ہے جسے معمولی سا صدمہ منتشر کر دیتا ہے۔ ہماری کیفیت یہی ہے اور یہی رہے گی۔ جب تک ہمارا قومی ذہن وجود میں نہ آ جائے جس کی نوعیت خالص دینی ہو۔ اور جس کی تعمیر خالصۃً صرف دینِ حق کی نصرت کے لیے کی گئی ہو۔ ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ اس وقت ایک خالص دینی قومی ذہن کی تعمیر ہے۔

ہماری سیاسی ناکامیاں اور اس کا سبب

داستان کا سرا تو بہت دور ہے معاملات سے بچئے

۱۸/مارچ ۱۹۷۲ء۔



کے لیے بہتر ہے کہ ہم اقتدار جرت پاکستان کے بعد اپنے سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لینے کے لیے عبرت ماضی قریب پر نظر ڈالیں۔ داستانِ پاکستان مطالبہ پاکستان سے شروع ہوتی ہے۔ کیا ہمارا یہ مطالبہ پورا ہوا؟ اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے نام سے جو خطہ ہمیں ملا اسے خواہ کچھ ہی لوگ کامیابی ہی کیوں نہ قرار دیں مگر سچ یہ ہے کہ وہ ہماری ناکامی کی بہت عبرتناک مثال ہے۔

یہ کٹا پھٹا پاکستان جس میں پنجاب اور بنگال کو کاٹ کر لاکھوں مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا مطالبہ کے وقت قوم کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔ بلکہ قوم صرف یہ چاہتی تھی کہ برصغیر کے وہ ایسے خطے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آزاد مسلم اسٹیٹس کی صورت میں تبدیل کر دیئے جائیں۔ پاکستان کا یہی تصور جملہ اہلِ سنت کے ذہنوں میں تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نہ خونِ مسلم کی یہ ارزانی ہوتی، نہ لاکھوں مسلمان خانہ برباد ہوتے، نہ ترکِ وطن کی کوئی ضرورت پیش آتی اور نہ آج پاکستان زخم کاری کھا کر اپنے آدھے حصے سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتا۔ ہمارا تصور کیا تھا؟ اور ہمیں کیا ملا؟ اس پر غور کیجئے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ ہمیں سخت ناکامی ہوئی اور ہم اپنے اصل مقصد کو نہ حاصل کر سکے۔

حصولِ پاکستان کا مقصد ہمارے دیندار طبقہ نے یہ بیان کیا تھا کہ اس خطہ ارضی میں اسلامی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔ اس مقصد میں تو اس بری طرح ناکامی ہوئی کہ قوم کے ذہن میں یہ تصور بھی دھندلا ہو گیا۔ سنجیدہ اور پڑھے لکھے عوام کی بڑی تعداد اس کے حصول سے مایوس اور خواص کا بھی ایک معتد بہ گروہ برداشتہ خاطر ہو چکا ہے۔

اسلامی نظام کا نعرہ لگانے والے قائدین سے میں پوچھتا ہوں کہ پیچھے مڑ کر دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ ۲۵ سال کی مدت میں آپ اسلامی نظام کی منزل سے قریب ہوتے ہیں یا دور؟ واضح بات ہے کہ آج سے ۲۵ سال پہلے اسلامی نظام کے قائم ہونے کے جتنے امکانات [illegible] باقی ہیں [illegible]

کا عالم یہ ہے کہ جو مقصد دیا گیا اس مقصد اس کے وجود کے امکان کا دائرہ تنگ ہو گیا۔ اگرچہ آج شاید ہر سیاسی جماعت "اسلامی نظام" کا نعرہ لگا رہی ہے مگر اس کے قیام کا تو قع روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ کیا اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم اپنے اس سیاسی مقصد میں بھی بالکل ناکام نہیں ہو گیا۔ ہماری سیاسی زندگی اس عہد کا اصل ناکامی و نامرادی ہے۔ واقعہ روزِ روشن سے زیادہ روشن ہے جس کا انکار بدیہیات کا انکار ہے۔ کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے طرزِ عمل پر ناقدانہ نظر ڈال کر اس بے ہیبت اور ناکامی و نامرادی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کریں؟

دین و سیاست

سیاست دین کا ایک شعبہ بھی ہے اور اس کا خادم و محافظ بھی۔ اس راہ کے رہنما اگر غفلت یا غلطی کریں تو کاروانِ امت کی متاعِ دین خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سیاست کی راہ میں جو بے دینی آتی ہے وعظ و تذکیر سے اس کو روکنا قریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ کتاب و سنت نے سیاست کو دین کا محافظ اور اس کا مددگار بتایا۔ ارشادِ حق ہے:

یہ وہی صحابہ کرام ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمادیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں گے۔

بالفاظِ دیگر سیاسی اقتدار کا مقصد دینِ حق کا فروغ اور غلبہ ہے۔ اس میں یہ اصولی تعلیم پنہاں ہے کہ ہمارا ہر سیاسی اقدام صرف دینِ حق کی نصرت و غلبہ کے لیے ہونا چاہیئے۔ ہر قدم بھی ہم اٹھائیں اس میں دین کی مصلحت اور اس کی نصرت مدِ نظر ہو۔ ہم دین کے غلبہ کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے تن پیٹ کا خود ہی انتظام فرما دیں گے۔ لیکن کیا ہماری سیاست آج تک اس راستہ پر بھی چلی؟ یا آج اس راہ پر گامزن ہے؟ افسوس کے ساتھ جواب نفی میں دینا پڑتا ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہی ہے جس نے ہمیں ناکامیوں سے دوچار کر دیا۔ ممکن ہے

کہ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر غور و فکر کے بعد انشاء اللہ سمجھ میں آجائے گی۔ آئندہ سطریں اس کے سمجھنے میں انشاء اللہ معاون ہوں گی۔

سیکولر ذہن

نعرے فضا کو مضطرب کر سکتے ہیں مگر حقیقتوں کا بدل نہیں ہو سکتے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی اسلامی نظام کا نعرہ فضا میں گونجنے لگا تھا۔ اور اب تو کیفیت یہ ہے پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جو یہ نعرہ نہ بلند کر رہی ہو۔ یہاں تک کہ جو جماعتیں کھلم کھلا اسلام کے گلے پر چھری پھیر رہی ہیں۔ وہ بھی یہی نعرہ لگا کر چھری پھیرتی ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہماری سیاست بالکل دنیاوی ہے۔ اور ہمارے پچھلے سارے سیاسی اقدامات میں نصرتِ دین کا عنصر بالکل مفقود معلوم ہوتا ہے۔ ان سیاسی لیڈروں کا تذکرہ نہیں جو پکے دنیادار اور فاسق ہیں۔ ان دیندار قائدین کے متعلق عرض ہے جن کی انفرادی زندگی تقویٰ و دینداری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ جب وہ اجتماعی زندگی میں پہنچتے ہیں اور کوئی سیاسی قدم اٹھاتے ہیں تو دنیاوی مصلحتوں اور مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ دینِ حق پر ان کے اقدام کا کیا اثر ہوگا؟ یہ سوال ان کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جماعتی، قومی، صوبائی، ملکی، اقتصادی وغیرہ مختلف قسم کی مصلحتیں ان کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ مگر دینی مصلحت کا نام اس فہرست میں کہیں نظر نہیں آتا۔ بالفاظ مختصر جن قائدین کا ذہن اپنی انفرادی زندگی میں خالص دینی ہوتا ہے۔ وہ بھی سیاسی مسائل کو سیکولر (SECULAR) ذہن سے سوچتے ہیں۔

سنی ذہن کی ضرورت اور اس کا فقدان

سیاسی پیشہ وروں پر اسلام کا نام لینے کا رواج اب بھی ہے۔ پاکستان بنانے کے لیے بھی اسی نام سے کام لیا گیا تھا۔ مگر ہمارے سیاسی قائدین یعنی اسلام کی حمایت و نصرت کا دم بھرتے ہیں جس کا منشا ہی کسی [illegible]

جو نہ کوئی عقیدہ رکھتا ہو نہ عبادت۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہر تشخیص اور تعین سے آزاد ہو۔ اگر ایسے انسان کا دنیا میں وجود نہیں تو ایسے "اسلام" کا وجود کیسے ہو سکتا ہے جو سنیت، شیعیت، قادیانیت وغیرہ ہر تشریح سے ماوراء اور آزاد ہو۔ سیکولرزم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاسی ادارہ بد دین اور دشمن دین ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت ادارہ سیاسی اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ نہ وہ کسی مذہب کی حمایت یا مخالفت کرتا ہے۔ اس میں شامل ہونے والے افراد جو مذہب بھی رکھیں ادارے کو بحیثیت ادارہ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ یہی طرزِ عمل ہمارے سیاسی اداروں کا ہے۔ ہمارے سنی لیڈروں نے "اسلام" کی کوئی ایسی تعریف معلوم کر لی ہے جو ہر قید سے آزاد اور "سیکولر" ہے۔ وہ اسی اسلام کی حمایت و نصرت کا دم بھرتے ہیں۔ حقیقی اسلام جس کا نام دینِ اہلِ سنت ہے سیاست نہیں، کبھی ان کا موضوعِ سخن نہیں بنتا۔ اسی طرزِ فکر کا نام سیکولر ذہن ہے۔ جب کہ ہماری فلاح کے لیے "سنی ذہن" کی ضرورت ہے۔

ہم سنی ہیں اور ہم اس دین کو اسلام کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی رسول کی سنت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور سنت وہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی اور جس کا عملی نمونہ مقبولانِ بارگاہ الٰہی کی یہی اولین اور افضل ترین جماعت تھی۔ اسی اسلام کا دوسرا نام مذہب اہل سنت والجماعت ہے۔ جو اسلام صحابہ کرامؓ پر بے اعتمادی پر مبنی ہو یا جو کتاب و سنت میں کسی دوسری کتاب یا کسی دوسرے کی سنت کا ضمیمہ لگا سکے تعلیم دے اسے ہم حقیقی اسلام نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے اوپر اسی اسلامؓ کی نصرت و حفاظت کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ جسے ہم اسلام حقیقی کہتے ہیں کسی مبہم [illegible] اسلامؓ کی نصرت و حفاظت کا نعرہ بلند کر کے ہم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہم بہت سے معیاری اسلام کے ساتھ [illegible] کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ کس طرح ممکن نہیں کہ

ہم انہیں خوش کرنے کے لیے اپنے دین کی نصرت و حفاظت سے دستبردار ہو جائیں۔ ہمارے سیاسی قائدین "سنت" اور "سنی" کا لفظ بھی اپنی زبان پر لانا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان میں سے گنے چنے لوگ کبھی کبھار قادیانیوں کے بارے میں کچھ کہہ کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جس اسلام کے غلبہ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ اس میں قادیانیت کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ مگر "سنی" کا لفظ کبھی بھولے سے بھی ان کی زبان پر نہیں آتا اور شیعوں سے مغائرت کا کوئی پہلو ان کے کسی قول و اقدام سیاسی میں نہیں نکلتا۔ گویا وہ جس اسلام کی نصرت کے دعویدار ہیں وہ شیعیت کے اعتبار سے سیکولر ہی رہتا ہے۔

ہمارا سیاسی کارواں شروع سے اسی راہ پر گامزن ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی سیاست ستر فیصد شیعی، بیس فیصد قادیانی اور دس فیصد سیکولر سیاست رہی اور آج بھی یہی تناسب قائم ہے۔ سنی سیاست کا اس میں کوئی جز نہیں۔ یہ دس فیصد سیکولر سیاست بھی درحقیقت اول الذکر دونوں سیاستوں کی خادم و معاون ہے۔ اور اہل سنت کے لیے صرف نعرۂ "اتحاد اسلامی" کی افیون مہیا کرتی ہے۔ سیاسی میدان میں شیعوں اور قادیانیوں کے درمیان اتحاد کامل ہے۔ قادیانی اقلیت میں نہیں اس لیے اگر اس فیصد کو بھی ہم شیعہ سیاست ہی کا ایک جز کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ہماری کوئی سیاسی جماعت شیعی اثر سے خالی نہیں۔ اکثر و اغلب سیاسی جماعتوں میں تو شیعہ صاحبان باوجود قلت مقدار عنصر غالب DOMINANT FACTOR کی حیثیت سے داخل ہیں۔ بہت قلیل تعداد ایسی جماعتوں کی ہے جن میں یہ حضرات رکن کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔ مگر وہ بھی ان کے زیر اثر ہیں۔ اور اپنی مرضی کے خلاف



کسی اقدام کی جرأت نہیں کر سکتیں حد یہ ہے کہ ان میں سے بعض دینی رنگ رکھنے کے باوجود "سنی" کا لفظ زبان پر نہیں لا سکتیں جب اس لفظ کے بارے میں بھی احتیاط کا یہ عالم ہے تو اس کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ کہ یہ سیاسی گروہ اور یہ قائدین کرام بھی اہل سنت کے حقوق واجبہ اور تناسب آبادی کے اعتبار سے مملکت میں ان کے صحیح حصے کے بارے میں کوئی لفظ زبان پر لا سکیں گے۔ یا مذہب اہل سنت کی نصرت و حفاظت کے لیے کبھی کوئی قدم اٹھائیں گے۔ یہ لوگ اور تو کیا کر سکتے ان میں سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ مملکت پاکستان کو "سنی" مملکت قرار دیتے۔ حالانکہ یہاں غالب اکثریت سنیوں کی ہے۔ مملکت کا مذہب "سنی" ہونا لازم ہے۔ "اسلامی نظام" کے داعی ہونے کے باوجود اس نظام کی صحیح نوعیت متعین نہ کر سکے۔ نہ یہ سوال کبھی ان کے ذہن میں پیدا ہوا۔

سیاسی قیادت کے اسی طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی سنی ذہن وجود میں نہ آ سکا۔ بلکہ انفرادی ذہن میں بھی پسپائی کے آثار پیدا ہونے لگے اور اب تو حال یہ ہے کہ عوام تو عوام خواص میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد بہت قلیل رہ گئی ہے جن میں اپنے مذہب اہل سنت کے لیے حمیت کا جذبہ باقی ہو یا جو اپنی انفرادی زندگی میں بھی سنی ذہن سے سوچتے ہیں۔

اسی ذہن کی شکست نے سلطنت مغلیہ کی فلک بوس عمارت کو زمین بوس کر دیا۔ اسی محرومی نے ہمیں پاکستان کے ایک بڑے حصے سے محروم کیا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے لیے کوئی حادثہ بھی عبرت انگیز اور بصیرت افروز ثابت نہ ہوا۔

حافظ کے مرید تھے اور مولانا محمد یوسف بنوری کا اعتقاد حاصل تھا کوئی بھی دینی حیثیت کبھی تنگ نظر تھے ہر دینی شخصیت سے رابطہ رہا اور اپنے مسلسل مطالعہ کی بنا پر اپنے پہلو میں ایک متبادل اور اس حل میں ایسی خوبی رکھتے تھے جو آگ کو لالہ زار بنا دیتا اور آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کو دیکھتے تو مصرعہ ذیل پڑھا کرتے تھے

عزیز خاطر آشفتہ حالاں

مولانا ظفر علی خان علیہ الرحمۃ نے ایک دفعہ آپ کے ذوق ایمانی کی حرارت سے متاثر ہو کر آپ سے متعلق پانچ شعر فی البدیہہ کہے تھے۔ افسوس کہ اس وقت حافظ جی نہیں یا مولفوں میں کہیں محفوظ ہیں۔ انشاء اللہ شائع کیے جائیں گے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ سے کسی مدرسہ فکر کی شخصیت کو اختلاف نہیں تھا۔ آپ سیاسی اختلافات کے بازار سے گزرتے ہی نہیں تھے۔ آپ کا ایک ہی موقف تھا کہ پاکستان کی خدمت کرو کہ مسلمانوں کا گھر ہے اور اسلام کے وفادار رہو کہ اس کے بغیر پاکستان کی شمع روشن نہیں رہ سکتی ہے۔

حافظ جی سندھ کی سیاست سے متعلق بڑی گہری نگاہ رکھتے اور مختلف ادوار کی کہانیاں سنا کر محو حیرت کر دیتے تھے۔ آپ کو اکابر سندھ کے مزاج و سرشت اور ذوق و سیاست کے متعلق حیرت انگیز معلومات حاصل تھیں۔

آپ کو آخری ایام میں اس سے متعلق انتہائی قلق تھا کہ ہم نے پاکستان کے وجود و استحکام کا احترام نہیں کیا۔ اپنا گھر رہا ملک اپنی سیاسی آلائشوں سے گندا کیا اور غیر ملکی سیاست کے استعماری ہتھکنڈوں کا شکار ہو گئے۔ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کا ایک قلعہ تھا اور دو قومی نظریے کی بنا پر حاصل کیا تھا لیکن ہم نے اس قلعہ میں خود ہی شگاف ڈالا اور اس کے لیے خود ہی میر جعفر و صادق بنے

گئے ہم نے وہاں جی ویکھا تو وہی قمیت ہم اپنے ہاتھوں سے کر رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہی کا نام کفران نعمت تھا۔

حافظ جی ملک کے لادینی رجحانات سے سخت بیزار تھے آپ کو اس کا شدید صدمہ تھا کہ ہم پاکستان میں سیاسی تجربے کر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ ہم نے اس کو مختلف نظریوں کا محل بنایا ہے حالانکہ پاکستان خود ایک سیاسی تجربہ تھا اور اسے کامیاب بنانا ہم سب کا فرض تھا اور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حافظ جی کی موت سے نہ صرف ان کے دوستوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا بلکہ دینی حلقے بھی اپنے ایک سرگرم کارکن سے محروم ہو گئے۔ آپ کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی ابھی ساٹھ سال کے پیٹے میں تھے۔ تمام عمر جدوجہد میں بسر کی، لیکن زندگی خوشگوار ہوئی تو یہ ناگوار حادثہ پیش آ گیا اور آپ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر کے اس دنیا میں چلے گئے جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت کریں۔ فی الحقیقت آپ کے اٹھ جانے سے حلقہ یاراں کی رونق اٹھ گئی اور ایک ایسا متحرک وجود ہماری محفل چھوڑ گیا جو ہم سب کے لیے باغ و بہار تھا۔

> بقیہ: محفل سماع

وحدت میں جمع کر دیا ہے۔ دل پر گیا دماغ ٹھہر گیا طبیعت گرما گئی۔ [illegible] لگا کر ہم گنبد خضریٰ کے سامنے [illegible] حضرت قبلہ پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ سرکار دوعالم میں شعر پڑھا جا رہا ہے۔ حضور سن رہے ہیں اور ہم سرفراز [illegible] تک یہ عالم رہا کہ دنیا ہی بدلی ہوئی [illegible] آستانہ عالیہ پر حاضر ہو جائیں۔ ان [illegible] عقیدت بجا لائیں اور اپنے بخت پر [illegible]

[illegible] سے تریاں [illegible] وہ لوگ جو وہاں حاضر ہوتے [illegible] بجا لانے کے بعد آستانہ رہا [illegible] ہیں۔

> بقیہ: حافظ عزیز الرحمٰن

کو بے نقاب کیا۔ اس تحریک کے دوران میں کراچی میں جس قدر جلسے ہوئے آپ ہی اُن کے مہتمم رہے اور کراچی کو جدوجہد کے میدان میں ایستادہ کیا۔ قدرت نے آپ کو ایک جری دل، ایک دانشور کا دماغ اور ایک سپاہی کا حوصلہ دیا تھا۔ کئی دفعہ کراچی سے راولپنڈی آ کر مجلس عمل کے اجلاس میں شریک ہوئے مجلس تحفظ ختم نبوت کی

ہفت روزہ چٹان لاہور

آنسہ زبیدہ امیر پوری

مساواتِ اسلامی کی ایک جھلک

۱۳۸۵ھ کا اختتام ہے، ذی الحجہ کا چاند نظر آگیا ہے، اب سطوتانِ حریم جلال فریضۂ حج سے فارغ ہو کر تمنائے آستانہ بوسی دیارِ محبوب میں بعد اضطراب دوڑے جا رہے ہیں۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں کی قطاریں آہ عاشقاں کی طرح مسلسل نظر آ رہی ہیں، عرب کی خشک وادیاں اور پہاڑیاں عشاق برگشتہ جگر کے چشم پرنم سے جنت کی لہلہاتی ہوئی کیاریاں بنی ہوئی ہیں۔ عرب کے رہنے والے شتربان جن کے تمدن اور معاشرت کا سنگ بنیاد صرف موسم حج کی آمدنی ہے۔ مزدوروں کی کمی بیشی پر ہنگامہ کارزار گرم کیے ہوئے ہیں۔

مدینہ منورہ میں محمد بن عمران طلحی قاضی دگورنر ہیں، روزانہ سینکڑوں مقدمات عدالت میں پیش ہوتے ہیں، اور ہر روز فیصلے ہوتے ہیں، نہ اشامپ کی ضرورت اور نہ کورٹ فیس کی۔ اسلامی قانون کی سچی عدالت ہے، ناممکن ہے کہ کسی کا حق غصب ہو جائے۔ امسال حج کی رونق اور حجاج کی کثرت میں یوں بھی چار چاند لگ گئے ہیں، کہ خلیفہ منصور بھی بغداد سے مناسک حج کی ادائیگی کے لیے ربِ کعبہ کے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔

محمد بن عمران طلحی مسند عدالت پر رونق افروز ہیں، مستغیثوں کا ہجوم دادرسی کے لیے عدالت میں حاضر ہے۔ ایک شکستہ حال بدوی استغاثہ پیش کرتا ہے۔ قاضی صاحب، اپنے پیشکار کو حکم دیتے ہیں کہ استغاثہ پڑھا جائے۔ جو یہ ہے:۔

"اعلیٰ حضرت امیر المومنین خلیفہ منصور نے میرے اونٹ کرایہ پر لیے تھے لیکن اب مقررہ اجرت سے کم [illegible] عدالت سے استدعا ہے کہ میری اجرت پوری دلائی جائے۔"

عدالت میں سناٹا چھایا ہے۔ خلیفہ منصور کوئی معمولی حکمران نہیں ہے۔ امیر المومنین بھی ایسا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا حکمران جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا، جس کے دبدبے سے بڑے بڑے بادشاہ کانپ جاتے تھے۔ جس کا سکہ مشرق و مغرب میں چل رہا تھا۔

قاضی صاحب حکم دیتے ہیں کہ حسب قانون شریعت منصور کی حاضری کا حکم جاری کردو، منشی نے عرض کیا، حضور ذرا خیال سے فیصلہ فرمائیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا، ہاں میں نے سب غور کر لیا ہے۔ منشی نے عرض کیا، کہ چند پیسوں کی حقیر رقم کے واسطے ایک عظیم الشان بادشاہ کو مجرموں کے کٹہرے میں طلب کرنا خلافِ مصلحت ہے، میں یہ رقم بادشاہ کی طرف سے بدوی کو دیئے دیتا ہوں، قاضی صاحب نے غصہ سے فرمایا، مطالبہ صرف رقم کا ہی نہیں بلکہ مدعا علیہ پر یہ جرم بھی ہے کہ مقررہ اُجرت سے رقم کیوں کم دی گئی۔ اور ایک غریب کو پریشان کیا گیا۔ آخر سمن لکھا گیا جو یہ ہے:۔

"چونکہ ایک بدوی نے جس کے اونٹ تم نے کرایہ پر لیے تھے اور اب اس کی اُجرتِ مقررہ ادا نہیں کرتے، اس بنا پر بدوی نے استغاثہ دائر کیا ہے۔ لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ عدالت میں حاضر ہو کر بیان کرو، کہ کیوں نہ تم سے اس بدوی کی پوری اُجرت وصول کی جائے۔ اور کیوں نہ تم کو سزا دی جائے کہ تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے ایک مزدور کو پریشان کیا۔"

عدالت کا چپراسی سمن لے کر دربارِ خلافت میں حاضر ہوا، خلیفہ منصور ایک خاص کام میں مصروف تھے، مگر عدالت کا حکم پہنچتے ہی کھڑے ہو گئے، اور حکم دیا، کہ میرے ساتھ کوئی نہ آئے۔

جب خلیفہ منصور عدالت میں پہنچے تو قاضی صاحب نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور خلیفہ ملزمین کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ جب اس استغاثہ کی باری آئی، تو چپراسی نے آواز دی۔

منصور ملزم حاضر ہے؟

خلیفہ جو اب ملزم کی حیثیت سے کھڑے تھے آواز دی، کہ حاضر ہے۔

منشی نے استغاثہ سنایا، قاضی صاحب نے فرمایا کہ

اس بدوی نے جو استغاثہ دائر کیا ہے، کیا تمہیں تسلیم ہے؟

منصور نے کہا، مدعی کا دعویٰ بالکل درست ہے، اور مطلوبہ رقم فوراً عدالت میں حاضر کر دی اور بدوی سے معافی چاہی۔

عدالت نے استغاثہ خارج کر دیا۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں عدالت سے چلے گئے۔

اسی رات خلیفہ منصور نے محمد بن عمران طلحی کو دربار میں بلایا۔ قاضی صاحب درباری لباس میں حاضر ہوئے، اور وہ تمام آدابِ شاہی جو تھے بجا لائے۔

منصور نے کہا کہ آج دوپہر جب میں عدالت میں آیا تھا تو میری آپ نے نہ تو کوئی تعظیم کی اور نہ کوئی توجہ دی، مجھے مجرموں کی طرح ذلت سے بٹھا دیا گیا۔ حالانکہ میں اب بھی وہی ہوں، جس کے [illegible]

[illegible]

ہفت روزہ چٹان لاہور

آپ دست بستہ کھڑے ہیں۔
قاضی صاحب نے عرض کیا، کہ آپ کا یہ خیال غلط ہے، آپ دوپہر کو وہ منصور نہ تھے جو آپ ہیں، وہ نیم درباری تھا جو آپ ہیں، خلیفہ منصور بہت خوش ہوئے۔ اور شکریہ ادا کیا کہ میری سلطنت میں عدل و انصاف پوری طرح موجود ہے۔

بقیہ: تذکرۂ اولیا

اور جان کی رگیں بھی "تو ہی تو" کا ذکر کرتی ہیں، وہ ہیں آہ و زاری کرتے ہیں جو کافی عرصہ جدائی کے بعد آپس میں ملے ہوں، شکستہ دل اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق ہیں جو شکایت کرتے ہیں مگر جس درد سے ان کے دل بھرے ہوئے ہیں اس کا اظہار نہیں کرتے وہ اپنے دل کا دھواں، بھاپ اور بھڑاس بھی نہیں نکالتے، محض سوز و عشق کے عالم میں اپنے مقصد کی طلب میں مشغول ہیں۔"

شاہ صاحب کے ان الفاظ نے مخدوم نھارو کے دل پر ایک عجیب اثر ڈالا اور وہ شاہ صاحب کے مرید ہو گئے۔ مخدوم معین الدین ٹھٹھوی اور شاہ صاحب تقریباً ہم عمر تھے۔

جب شاہ لطیف صاحب جوان تھے تو آپ ٹھٹھہ جا کر مخدوم موصوف کا وعظ سنا کرتے تھے شاہ صاحب اکثر سیاہ فقرا کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔
شاہ صاحبؒ نے ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی، حالانکہ آپ کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ تاہم آپ نے وصیت فرمائی، کہ مجھے بھٹ میں دفن کیا جائے اور اسی گنبد والی مسجد کے قریب جس کی تعمیر شاہ صاحبؒ نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی، آپ مدفون ہوئے۔ سکھر کے مشہور حاکم راز ی عیدن نے غلام شاہ کلہوڑے کے حکم سے شاہ صاحب سے تیار کرایا (۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء)
دوسری قبریں آپ کے خاص خدام اور فقرا کی ہیں اور آپ کے خاندان کی قبریں بھی آپ کے مزار مقدس کے قریب ہیں۔ نیز لیپ میرس کے لوگ فقیر نے (جو شاہ صاحب کا عقیدت مند اور مرید تھا) بھٹ شاہ میں ایک کنواں کھدوا دیا۔

(جاری ہے)

بقیہ: شذرات

میلہ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ مصنوعی ہوتا ہے اور سرکاری بل پر ہوتا ہے اور ہر چیز فرضی ہوتی ہے حتیٰ کہ مجرموں کی تلاش کے لیے تو پولیس ملتی نہیں، تھانے خالی رہتے ہیں لیکن میلے کی نگہداشت کے لیے پولیس کے ٹھٹھ لگا دیے جاتے ہیں اور اگر اسکولوں کے چھ ہزار بچوں یا بچیوں کو جسمانی ورزش کا مظاہرہ کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ تو یہ اُن پر ایک جبر ہے نارروا اور غلط اور حاضری اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی کسی سینما ہال میں نئی فلم لگنے پر ہوتی ہے۔

چھٹیوں کا زور

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار کے پہلے دن اعلان کیا تھا کہ وہ صرف کام چاہتے ہیں اور چھٹیوں کے طرفدار نہیں۔ آپ نے ۲۵ دسمبر کی چھٹی بھی منسوخ کر دی تھی حالانکہ یہ دن عیسائیوں کے لیے حضرت مسیحؑ کا یوم ولادت ہے۔ دوسرے پاکستان میں قائد اعظمؒ کی پیدائش کا دن ہے۔ گویا چھٹی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد چھٹیوں کی بھرمار ہونے لگی۔ کئی چھٹیوں کا اضافہ کیا گیا یکم مئی کی چھٹی بلاوجہ شامل کی گئی۔ آخر اس دن سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ اب پچھلے دنوں فروری میں ایک ہڑتال کی چھٹی ہوئی اور ایک ویسٹ انڈیز سے میچ کی چھٹی، دن کا مہینہ چار رات وار نکل گئے گویا کل ۲۲ دن کام ہوا۔ اب خود حکومت کے دانشور ہی غور کریں کہ چھٹی سے کیا، اور اس سے فائدہ؟ اب بدھ ۱۲ مارچ کو عوامی میلہ کے لیے لاہور میں چھٹی کی گئی۔ اس کے علاوہ مہینوں کی چھٹیوں پر غور کر لیجیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چھٹیوں کا شوق کس پس منظر میں ہے۔ کرکٹ کا میچ ہو تو چھٹی، عوامی میلہ ہو تو چھٹی۔ کوئی اور ایسا ہی مشغلہ ہو تو چھٹی۔ کیا ارباب حل و عقد کو اندازہ نہیں کہ اس سے نقصان ہوتا ہے یا فائدہ؟ بہتر یہی ہے کہ اس قسم کی چھٹیوں کو منسوخ کیا جائے اور جس قدر چھٹیاں دینے والے کا شوق ہے ان کی ایک فہرست پہلے سے مرتب کر لی جائے ورنہ تو عوامی میلہ کوئی قومی تہوار ہے اور نہ کرکٹ کا میچ کوئی ملی کھیل ہے، محض مینا رہ ہے۔

کیا انہیں پرنٹ لائن معاف ہے

مرزائیوں کے متعلق منبر و محراب کی ہر تنقید پر حکومت پنجاب چیں بہ جبیں ہوتی ہے۔ ممکن ہے لا اینڈ آرڈر کا یہی منشا ہو، لیکن مرزائی اپنی روش پر نظر ثانی نہیں کرتے۔ وہ اپنا لٹریچر بدستور بھیج رہے ہیں اور لانہ ماکس بہتے پرتا پانی تیار کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں سر ظفر اللہ خاں نے اپنے ایک ہفتہ وار کو انٹرویو دیا جس میں بہ لطائف الحیل مرزا غلام احمد کا نقش جمانا چاہا مرزا غلام احمد کا نقش تو قیامت تک جم نہیں سکتا۔ وہ جس کھونٹے پر ناچ رہے ہیں اُس کھونٹے کو بھی آزما کر دیکھ لیں۔ لیکن ایک چیز ہمارے لیے تعجب کا باعث ہے کہ حکومت کی پریس برانچ جو ہم ایسوں کے لیے تو پرنٹ لائن کا حذف ہونا تو ناقابل معافی جرم سمجھتی ہے مگر مرزائی لٹریچر بغیر پرنٹ لائن کے چھپتا رہے اس کے لیے کوئی باز پرس نہیں۔ اب راولپنڈی سے ظفر اللہ خاں کا مذکورہ انٹرویو ایک مختصر کتابچہ کی شکل میں چھپ کر تقسیم کیا گیا اور ڈاک کے ذریعہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس کتابچہ پر کوئی پرنٹ لائن نہیں۔ سوال یہ ہے یہ رعایت کیوں ہے؟ کیا ظفر اللہ خاں قانون سے ماورا ہیں ان کے لیے کوئی قانون نہیں اور انہیں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی اجازت ہے۔ یہ عرض کرنا غلط ہو گا کہ ظفر اللہ خاں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ پاکستان میں اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں لیکن پرچار نہیں کر سکتے۔ حکومت انہیں بخش سکتی ہے لیکن ہمارے پاس اُن کا جواب ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور
مدیر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ـــــ شمارہ ۱۲
۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء
قیمت ـــــ ایک روپیہ

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کیلئے لمحۂ فکریہ

غداری کے بعد سب سے نازک چیز خوشامد ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک دفعہ اپنے ایک ڈپٹی کلکٹر مرید کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں ہمیشہ کسی نہ کسی غلطی یا کوتاہی پر ٹوکتا ہوں اور جو چیز مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتی اس سے متنبہ کرتا ہوں اور یہ سب اس اخلاص کے باعث ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے پیدا ہو چکا ہے لیکن تم ہمیشہ میری بے جا تعریف کرتے اور مجھے مافوق البشر سمجھتے ہو کیا یہ تمہارے نفس کی گمراہی نہیں اور میرے نفس کو فریب دے کر گمراہ کرنے کی ناروا حرکت نہیں؛ اسی کا نام خوشامد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں کو اقتدار کا دوست نہیں سمجھتے جو اس کی قصیدہ خوانی کو فرض گردانتے اور اس طرح خوشامد کا ارتکاب کر کے معصیتِ ضمیر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ ہم نے زندگی بھر جن اکابر کے افکار و سوانح کا مطالعہ کیا اور جن شخصیات کے ساتھ ہم سفری کا اعزاز حاصل کیا وہ اس پائے کے انسان تھے کہ انہوں نے ہمارے دماغ و دل کی دنیا پلٹ ڈالی۔ ہمارے خون میں حمیت و غیرت کی روانی پیدا کر دی اور ہمیں آج کی دنیا کے عام انسانوں سے مختلف کر دیا۔ ہمارے لیے قصیدے پڑھ کر اور خوشامدیں کر کے حکمرانی کا قرب حاصل کرنا مشکل نہ تھا ہم دولت کے انبار بھی لگا سکتے تھے لیکن ہم نے اپنے وجود میں سے بجز خوفِ خدا ہر خوف نکال دیا اور اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھا کہ عمرِ حیات کی آخری منزل موت ہے۔ ہمیں ایک دن اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے خدا نہ کرے کہ ہم قیامت کے دن اپنے آقا و مولا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور شرمندہ چہرہ لے کر پیش ہوں ہم گوشت پوست کے انسان ہیں اپنے گناہوں سے باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان کو اپنے ہی گناہ لرزہ کرتے ہیں لیکن ہم اس بات پر ضرور فخر کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ختم المرسلین کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے میں ہمیں سیاست، صحافت اور خطابت کے بازار کی خرید و فروخت سے بالا رکھا اور کسی بڑے سے بڑے انسان کو یہ حوصلہ نہ ہوا کہ وہ ہمارے قلم و زبان کے بول خرید سکے ہم نے اپنے خدا سے ہمیشہ یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ تو نے ہی پیدا کیا بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے اس سے پہلے کہ ہمارا ہاتھ کسی فانی خدا کے سامنے دراز ہو اور ہم جنسِ بازار ہو جائیں ہم تیری قدرتِ کاملہ سے منت و التجا کرتے ہیں کہ اس کرۂ ارضی سے ہمیں فی الفور اٹھا لے۔ ایسی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔

اس تمہید کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہماری قوم سوءِ ظن کا شکار ہے اس کی بدگمانی بیکراں ہے اور جب کوئی چھوٹا آدمی کسی بڑے آدمی سے مصافحہ کرتا ہے یا اس سے ملاقات کی راہ پیدا ہوتی ہے تو ہماری قوم کے مخصوص عناصر اس کے خلاف اتہام طرازی پر اتر آتے ہیں اور انھیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ فلاں آدمی نے اپنا ضمیر و ایمان فلاں قصرِ ایوان کے ہاں فروخت کر دیا ہے۔ یہ الفاظ ہمارے قلم سے اس لیے نکل رہے ہیں کہ پاکستان جن حالات میں سے گزر رہا ہے وہ بے حد تشویش ناک ہیں اور حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف کے تمام فہیم و زیرک رہنما ملک کے ان حالات پر متفق الرائے ہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر ہم بعض نئی باتیں عرض کیا چاہتے ہیں وہ حزبِ اقتدار کے لیے بھی نئی ہیں اور حزبِ اختلاف کے لیے بھی [illegible] پچھلے تین ساڑھے تین سال کی سیاسی [illegible] کے مسائل میں مرکزی حکومت کے طرزِ عمل سے متفق نہیں۔ ہماری ایماندارانہ سے یہ رائے ہے کہ سرحد و بلوچستان میں منتخب نمائندوں سے مرکزی قیادت کا تصادم ملک و قوم کے منافی ہے۔ اگر ان دونوں صوبوں میں صورت حال اسی

موڑ پر ہوتی جہاں اس وقت ہے تو پاکستان کے لیے اندرونی حالات زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوتے اور کسی بیرونی طاقت کو ہمارے اندرونی مسائل میں مداخلت کا حوصلہ ہوتا لیکن اس خیالی ہوش کے باوجود ہمیں حقیقتوں کو اُن کے اصل روپ میں دیکھنا چاہیے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہندوستان گئے تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے انہیں جوش ولولہ جذبات کے ساتھ روانہ کیا ملک کا آئین بنا اور ہم دستور کی دات ورثے تو سب جماعتوں نے متفقہ طور پر دستخط کیے اور نیشنل اسمبلی نے کاملاً اشتراک کے ساتھ آئین کی منظوری دی پھر جب قادیانی مسئلہ اٹھا تو سب جماعتوں کے نمائندوں نے نیشنل اسمبلی کے اندر اور نیشنل اسمبلی کے باہر اجتماعی فیصلہ کیا اور اس پر ملک کے طول و عرض میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اگر یہی چیز بعض دوسرے مسائل میں قائم رہتی تو آج ملک کے سیاسی حالات باہم دیگر متصادم نہ ہوتے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں ٹکراؤ جاری ہے اور اس کا نقصان ملک کو ہو رہا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایک نابغۂ روزگار سیاست دان ہیں اُن کے دل و دماغ جھکتے نہیں اور نہ اُن کے متحرک ہونے میں کوئی شبہ ہے ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ملک میں کوئی نامور شخصیت غدار ہے یا پاکستان کو شکست پہنچانے کے لیے اُس کا بیرونی طاقتوں سے کوئی مخفی رشتہ ہے۔ ہمارے زیر نگاہ اداریہ کا موضوع یہی ہے ہمارے لیے بہتر ہوتا کہ ہم تمام بڑے بڑے راہنماؤں کو یکجا کرتے اور انہیں جمہوریت کی بنیاد پر سیاسی معانقہ کی دعوت دیتے لیکن ہمارے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دردناک چیز نہیں کہ ہمارے راہنماؤں نے سیاست کی جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف زبان کی تلواریں بے نیام کر رکھی ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی آمریت کے خلاف نبرد آزما تھے اور جنرل یحییٰ خان نے انہیں جیل میں [illegible] مارشل [illegible]

ہفت روزہ [illegible]

خالق حق کے لیے بے تاب ہو کر میدان میں آگئے پھر جب مسٹر بھٹو کا مقدمہ [illegible] جیل میں شروع ہوا تو مارشل لاء منتظمین پر الزام تراشی لگتے اور جاتے کے وقفہ میں مسٹر بھٹو کو سلام کر دیر تک مبارکباد اور افکار کرتے رہتے آج وہ اخلاق کہاں چلا گیا ہے کیا ملک میں ایسا کوئی فرد نہیں جو ان دونوں کو ملا سکے تاکہ فضا کی ذہنی ویرانی ختم ہو۔

اگر مسٹر بھٹو مسلم لیگ کے بڑے بڑے راہنماؤں سے کام لے سکتے ہیں تو جو راہنما پیچھے رہ گئے ہیں اُن سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے سوال صرف پاکستان کی محبت کا ہے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اپنے خیالات کی رعایت سے مستقل مزاج انسان ہیں مسٹر بھٹو اُن سے پہلے بھی ملے ہیں اور اب بھی مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ حزب اختلاف میں دو جماعتیں متحد العمل طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی متحدہ اپوزیشن میں شریک ہیں ایک جماعت اسلامی دوسری کالعدم نیشنل عوامی پارٹی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پاکستانی ذہن کی متحرک علمی کاوش ہیں اُن کے ذہن کو ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کا اسلامی ذہن مولانا کے احترام میں پیش پیش ہے۔ مولانا کا دل اسلام اور پاکستان کے لیے دھڑکتا ہے وہ اسلام اور اپنے ملک کے سوا کسی کے وفادار نہیں اور نہ کوئی ذاتی غرض یا خواہش رکھتے ہیں۔ کاش ملک میں کوئی رجل رشید ہوتا جو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی عظیم ذہانت کو اس سے آگاہ کرتا کہ ابوالاعلیٰ مودودی کس دانائی اور سچائی کا نام ہے اور مولانا ملک و قوم کے لیے کیونکر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں شروع ہی سے قحط الرجال ہے کوئی ایسا شخص نہیں جو نفرت کی خلیج کو پاٹ سکے۔ یہاں تماشا دیکھنے والے بہت سے ہیں غرض مند ہیں اقتدار کے بھوکے ہیں، وحدت کے بیوپاری ہیں طاقت کے پجاری ہیں اگر ملک کے درد کو محسوس کرنے والے ہوتے اور انہیں اپنے ملک سے پیار ہوتا تو [illegible]

ہوتا اور بزنجو، مینگل اور مری جیل میں بند ہوتے نہ عبدالولی خان، ارباب سکندر خان اور اُن کے ساتھی قید و بند میں ہوتے۔ کیا ہمارے ملک میں ایسا کوئی انسان نہیں جو وزیراعظم بھٹو اور ان شخصیتوں کے درمیان مفاہمت کرا دے۔ ہم اُن لوگوں کو تو جانتے ہیں جو اختلافات کا باعث ہوتے اور جن کا اقتدار ایسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ عبدالولی خان، ارباب سکندر خان، غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری قید خانے میں رہیں۔ ایک فیصلہ تو وہ ہے جو سپریم کورٹ میں نیشنل عوامی پارٹی کے متعلق حکومت کے استغاثہ پر صادر ہوگا اور وہ ہم سب کے لیے قابل قبول ہے لیکن یہ بات پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ جو شخص پاکستان کا بدخواہ ہے وہ پاکستان میں رہنے کا حقدار نہیں اور اس کو برباد کرنے والے کڑی سے کڑی سزا کے مستحق ہیں لیکن حزبی ناسازیوں کا سیاسی حادثہ بن جانا انتہائی افسوسناک ہے۔ کیا اس ملک میں ایسا کوئی فرد نہیں جو وزیراعظم بھٹو اور ان شخصیتوں کے مابین سمجھوتے کی راہ پیدا کر سکے اور ملک اُن خطرات سے نکل جائے جو اس وقت سب کو محسوس ہوتے ہیں۔ حزب اقتدار کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ حزب اختلاف محب وطن عناصر پر مشتمل ملک کی بہی خواہ ہے اور حزب اختلاف کو بھی یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ وزیراعظم بھٹو کے خلاف ذاتیات چھیڑ کر ہم ملک کی خدمت نہیں کریں گے بلکہ ملک کو نقصان پہنچے گا۔ مسٹر بھٹو کو ملک کے عوام نے منتخب کیا ہے تو متحدہ محاذ کو بھی ملک پر حکومت کا جمہوری حق ہے مسٹر بھٹو کے ساتھ انتخاب کے میدان میں مقابلہ کیجیے لیکن مسٹر بھٹو کو شکست دینے کے در پے تمام [illegible] اب یہ بحث نہیں کہ ایک جمہوری طاقت کو شکست دے کر کسی ایسے انقلاب کا راستہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

آج تک کسی عوام دشمن کو سزا نہیں ملی

توسیع و ترقی کی عجیب و غریب شاہراہیں

لاہور سے ۱۵ مارچ کی صبح کو شائع ہونے والے خبارات میں سٹاف رپورٹروں کے حوالے سے اس رکی خبر شائع ہوئی کہ وفاقی حکومت نے پنجاب کے پانچ پرنٹنڈنٹ پولیس، پندرہ ڈی ایس پی اور پندرہ نسپکٹروں کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا ہے۔ ان ں بعض افسروں پر بدعنوانیوں کے الزامات ہیں اور کچھ افسروں کی پچیس سالہ ملازمت پوری ہو گئی ہے۔ خبر کے مطابق مرکزی حکومت نے سرکاری ملازمین کی سکریننگ کے تحت یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے کا آغاز ایوب خان کے برسر اقتدار آنے سے شروع ہوا تھا اور اس میں کئی ایک افسر بعض وجوہ کی بنا پر جرم بے گناہی میں برخاست کئے گئے تھے۔ جن بڑے افسروں نے اپنے سے چھوٹے افسروں کو ملازمت سے علیحدہ کروایا اُن کا عناد بعض افراد سے شخصی تھا

پھر اُن کے اپنے ساتھ جو بیتی وہ بھی ظاہر و باہر ہے ہم اُس داستان کو چھیڑ کر کسی کے زخموں پر نمک پاشی نہیں کرنا چاہتے لیکن سبکدوشی کے اُس سانحہ سے دوسرے افسر سبق حاصل کرتے تو ملک و قوم کے علاوہ خود اُن کے لیے مفید ہوتا لیکن انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات سے کبھی سبق نہیں لیتی بلکہ ہمیشہ خود نیا تجربہ کرنا چاہتی ہے گو اس قسم کے تجربات کے نتائج ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ ایوب گئے تو یحییٰ خان آ گئے۔ انہوں نے بھی مختلف محکموں میں جھاڑو پھیری اور بہت سے افسر رخصت کر دیئے۔ یحییٰ خان گئے تو جمہوریت کا دور شروع ہو گیا مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے منتخب نمائندے کی حیثیت سے سرکاری ملازموں کی ایک بہت بڑی کھیپ کو نکال باہر کیا ظاہر ہے کہ اس میں کئی ایک افسر (اگرچہ اُن کی تعداد زیادہ نہیں) اس لیے سبکدوش ہو گئے کہ اُن سے پیپلز پارٹی کے بعض ارکان کو شکایتیں یا رنجشیں تھیں۔ ہم نے اس عنوان سے کسی دور میں کچھ نہیں لکھا اور لکھا تو صرف یہ لکھا کہ جو لوگ نکالے جا رہے ہیں انہیں ضرور چارج شیٹ ملنا چاہیئے وہ اس سے آگاہ رہیں کہ اُن کا جرم کیا ہے؟ بہرحال اُن میں ایک بڑی اکثریت ملازمتی اعتبار سے بدعنوانیوں کے مرتکبین کی تھی یا اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ ملازمت سے ماورائی سیاست کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے اور جمہوریت کو زیر کرتے تھے لیکن ایک چیز جس کی ہمیں توقع تھی اور جو ایک عوامی دور کا خاصہ ہونا چاہیئے تھا وہ پوری نہ ہوئی اور نہ سامنے آئی یعنی جن ظالموں نے ایوب خان کے زمانے میں عوام سے بدسلوکی کی اور آمریت کے اُس مکروہ دور کی حفاظت کے لیے قانون کی منصفانہ روایات کو پس پشت ڈال کر وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا انہیں کوئی سزا نہ ملی بلکہ ترقی پا کر وہ خود سر ہو گئے ان ظالموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن مثال کے طور پر وہ تمام پولیس افسر عوامی دور کی آنکھ کا تارا ہوتے چلے گئے جن کا گھناؤنا کردار عوامی تحریک کے دنوں میں غایت درجہ شرمناک تھا اور لوگ اُن کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں انتہائی نفرت رکھتے تھے۔ ہم کسی کا نام لکھ کر اُس کو اہمیت دینا نہیں چاہتے کیونکہ اس قسم کے لوگ ہماری نکتہ چینی کا سہارا لے کر عموماً ترقی ہی پا جاتے ہیں۔ لیکن ایسے مکروہ چہرے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مثلاً آج ہی مسٹر حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب نے اپنے ایک بیان میں تسلیم کیا ہے کہ ۲۸ فروری کو لائل پور میں طلباء کے خلاف پولیس نے جو لاٹھی چارج کیا اُس کے متعلق انتظامیہ نے انہیں غلط رپورٹ دی۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ لائل پور میں طلباء کے خلاف پولیس کی کارروائی پر انہیں افسوس ہے اُن کی حکومت عوام کو چُپ کرانے کے لیے کبھی طاقت استعمال نہیں کرے گی۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ جن لوگوں کے ووٹوں سے ہم برسرِ اقتدار آتے ہیں اُن لوگوں کو کچلنے کے لیے ظالمانہ احکامات کئے جائیں۔ آپ نے تسلیم کیا کہ گزشتہ طویل عرصہ میں نوکر شاہی تمام اختیارات کا مرکز بن گئی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ افسر اپنی حاکمیت جتاتے ہیں انہیں عوام کے جذبات واحساسات کا احترام کرنا پڑے گا۔ اس سے اگلے دن کی خبر ہے کہ طلباء پر تشدد کے ذمہ دار سٹی انسپکٹر پولیس مسٹر اکرام اللہ نیازی کو لائل پور سے سرگودھا تبدیل کر دیا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ حنیف رامے ایک صاحب قلم انسان ہیں اگر مذکورہ سٹی انسپکٹر پولیس طلباء پر تشدد کا فی الواقعہ ذمہ دار ہے تو ہم یہی عرض کر سکتے ہیں کہ لائل پور سے اس کی تبدیلی کوئی سزا نہیں۔ اسی قسم کے پولیس افسر ہیں جنہوں نے پچھلے ۲۰ برس میں لوگوں کو

اُنکی آزادی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس سے کہیں افسوسناک واقعہ لاہور میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کی زیرِ سرکردگی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن بورڈ لاہور کے زنانہ پرائمری سکولوں کی تقریباً دوسو پردہ نشین معلمات پر پولیس کا لاٹھی چارج ہے۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ لاہور سول سیکرٹریٹ کے باہر پردہ نشین معلمات دور دراز علاقوں میں اپنے تبادلوں کے خلاف صوبائی وزیرِ تعلیم سے ملاقات کی خواہش لے کر آئی تھیں لیکن پولیس نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے بہانے انہیں منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج کیا۔ اخباری اطلاع کے مطابق ان معلمات کی بے عزتی کی۔ ان کے منہ پر تھپڑ مارے۔ ان کے بال نوچے اور ان کی گھڑیاں اور بالیاں اتار لیں۔ انہیں دھکے مارے اور گالیاں دیں۔ زنانہ پولیس نے انہیں لاٹھیوں سے زدوکوب کیا۔ ان معلمات کی روایت کے مطابق وہ کوئی مظاہرہ نہیں کر رہی تھیں بلکہ وزیرِ تعلیم سے اپنی مشکل بیان کرنے آئی تھیں۔ اگر واقعہ صرف اتنا ہے تو انتہائی افسوسناک اور شرمناک ہے۔ اس قسم کے غلط کار ہی مسٹر بھٹو کے دورِ اقتدار کی ہوا خیزی کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے ان کے ذہنوں میں کسی تخریبی سازش کے جراثیم ہیں۔ روزنامہ "نوائے وقت" نے ۱۴ مارچ کے اداریہ میں اس افسوسناک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "کسی ہندو معاشرے میں اس زیادتی اور ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شقی القلب ڈاکوؤں کے ہاتھ بھی خواتین پر اٹھتے وقت رُک جاتے ہیں اور انہیں بھی اپنی ماں، بہن، بیوی، بیٹی یاد آجاتی ہے لیکن انتہائی دُکھ کی بات ہے کہ سول سیکرٹریٹ کے سامنے پولیس نے شائستگی و مروت اور عزت و احترام کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھ دیئے اور صوبائی انتظامیہ کے سب سے بڑے مرکزی دفتر میں کسی ایک بااختیار افسر کا دل قوم کی بچیوں کو پڑھانے والی قابلِ احترام معلمات پر اس زیادتی سے نہ پسیجا۔"

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور)

ہم نہیں کہہ سکتے وزیرِ تعلیم نے معلمات سے ملنے کی زحمت کیوں گوارا نہ کی؟ ہم یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ صوبائی وزیرِ تعلیم آئے دن کے تبادلوں سے بہت خوش ہوتے اور اس قسم کے تبادلوں کو شاید اپنے سیاسی ذوق کے باعث مختلف معلمات کی سزا ہی کے لیے پسند کرتے ہیں۔ اس کا جواب تو وزیرِ تعلیم ہی دے سکتے ہیں لیکن پولیس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس کا گھناؤنا پن صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ٹرسٹ کے اخباروں نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس بہیمانہ سلوک کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ صوبائی اسمبلی کے مرنجاں مرنج اپوزیشن لیڈر علامہ رحمت اللہ ارشد نے بھی اُن پولیس حکام کو سزا دینے پر زور دیا ہے جو اس سلسلے میں اختیارات سے تجاوز کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ہم وزیرِ اعلیٰ سے مطالبہ نہیں کرتے بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں ذمہ دار پولیس افسر یا متعلقہ افسروں کا شدید سے شدید محاسبہ کریں انھیں ہم سے کہیں زیادہ علم ہے کہ جس سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ اپنی سب انسپکٹری کے زمانے سے نیک نام افسر نہیں اُس نے مسٹر بھٹو کی عوامی تحریک کے زمانے میں بھی اپنے اختیارات کا مجرمانہ استعمال کیا تھا، ایسا شخص مسٹر بھٹو کے اقتدار میں آتے ہی اول تو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جانا چاہیئے تھا اگر ایسا ممکن نہیں تھا تو سینکڑوں افسروں کے ساتھ اس کا برخاست کیا جانا عوامی فریضہ تھا لیکن اُلٹا اس شخص کو ترقی دی گئی حتیٰ کہ ملازمت کی میعاد پوری ہو جانے کے بعد توسیع دی گئی اور

کئی ایک اضلاع میں لگایا گیا۔ اس شخص نے گذشتہ سال عشقِ ختمِ نبوت کے جرم میں دو نوجوانوں کو اپنے ریوالور کا نشانہ بنایا۔ اس کی انکوائری شب چند کی گئی پھر اس کو ایک دوسرا ضلع دیا گیا اب وہاں سے لاہور لگا دیا گیا ہے اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، خدا ہی جانتا ہے لیکن ہم یہ پیش گوئی کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس شخص کی بدولت لاہور میں کوئی چاند ضرور طلوع ہو گا کاش وزیرِ اعلیٰ اس کو لاہور میں چسپاں کرنے سے پہلے غور کر لیتے کہ وہ کس شہرت کے انسان کو کہاں لا رہے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں کوئی سا تبصرہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہمیں اس سے غرض ہے کہ اسے لاہور میں کیوں لایا گیا، جو لوگ اپنے گریبانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں وہ اس قسم کے انسانوں سے نہیں ڈرتے۔ اگر ہمیں ایک دن اپنے اللہ کے ہاں جانا ہے تو انھیں بھی ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ چونکہ ہم مسٹر رامے کو اپنے مختلف سیاسی سفر کے باوجود ایک شریف انسان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اُن کی خاندانی روایتیں نہایت عمدہ ہیں۔ ایک شگفتہ اخلاق کے مالک ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہیں قدرت نے ایک حساس ادیب کا قلم دیا ہے اور وہ علم و ادب کے تیور شناس ہیں اس لیے ہم اُن سے یہ ضرور عرض کریں گے کہ پہلے اس شخص کی ملازمت میں توسیع پنجاب کے رُخسار پر زناٹے کا تھپڑ تھا۔ اب لاہور میں اس کا تقرر عوام کی پسپائی ہے تو حکومت کی بھی رسوائی ہے۔ ہم جیسے لوگ بھی یہ محسوس کرنے پر مجبور ہیں کہ فوجی عہد ہو یا عوامی دور کسی عوام دشمن کے لیے کوئی سزا نہیں ہے۔

از ڈاکٹر سید عبداللہ

مغرب کے سیاسی فکر پر اقبالؒ کی تنقید

۱. قومیت ۲. سوشلزم ۳. سرمایہ داری

سابقہ مقالے میں مغربی جمہوریت اور مادہ پرستانہ سیاست پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا اب سیاستِ فرنگ کے دوسرے تصورات زیرِ بحث لائے جا رہے ہیں۔

قومیت کا تصوّر

قومیت یا نیشنلزم کے متعلق اقبال کے عقائد اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان پر طویل تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اقبالؔ نیشنلزم کے ہر اس تصور کے مخالف ہیں، جس کا معیار وطن، رنگ، نسل اور زبان ہو، اقبالؔ کے نزدیک اسلام اور نسلی امتیاز باہم متناقض ہیں۔ اقبالؔ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"جب میں نے یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے دنیائے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا، کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں تو حیثیت ایک مسلمان اور محبِ نوعِ کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں

ہفت روزہ چٹان لاہور

اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء اور نشوونما میں قبیلے اور قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں، لیکن جب انہیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں۔"

اس بحث کو زیادہ طول دیئے بغیر میں چاہتا ہوں، کہ اقبالؔ کے ان سینکڑوں اشعار کی طرف توجہ دلا دوں، جن میں اقبالؔ نے نیشنلزم کی مخالفت کی ہے اور مسلمانوں کو جغرافیائی اور دوسری غیر فطری قیود سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے۔ وطنیت کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس قسم کے اشعار کو ریزے لیمد کی کتاب کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اقبالؔ کے خیالات کی صداقت کا مزید یقین ہو جائے گا، جو لوگ اقبالؔ کے نقطۂ نظر کے مطابق عالمگیر برادری اور وسیع انسانی اخوت کے تخیل کو سمجھتے ہیں، وہ نیشنلزم کی شدید مخالفت کے بارے میں اقبال کو ضرور حق بجانب سمجھیں گے۔ کیونکہ یہ وہ تصور ہے جس سے خود یورپ بھی تنگ آ چکا ہے، اور اس جماعت تراشی سے بھاگ کر جمعیت الاقوام اور اب یو۔ این۔ او یونیسکو وغیرہ کے تصور میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر اقبالؔ جمعیت اقوام کے خلوص اور حسن نیت کے بارے میں بھی متشکک تھے وہ اس اجتماعی نظام کو کفن چوروں کی انجمن کا خطاب دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس "داشتہ پیرک افرنگ" کا منتہا بھی جماعتی شوق استیلا ہے، یہ جمعیت اقوام غالب ہے نہ کہ جمعیت آدم، جمعیت اقوام کے متعلق اقبالؔ کے خدشات درست نکلے، یہ اپنی عارضی زندگی میں کمزوروں کی حفاظت نہ کر سکی۔ یعنی تخفیف اسلحہ کی کوشش بقول ریزے میں نئی اسلحہ اندوزی پر ختم ہوئیں، جس کا نتیجہ دوسری جنگ عظیم کی صورت میں نکلا۔ آخر لیگ انہی امراض کی بدولت ختم ہو گئی جن کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا تھا اور ضربِ کلیم کی پیش گوئی تا دمِ تحریر آخر پوری ہو کر رہی ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے!
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

۲۴ مارچ ۷۵ء

[illegible] ہے ویسکن
پیران کلیسا کو دعا ہے کہ یہ ٹل جائے

اب یورپ اور ایشیا کا دہی رنگ دہی انداز ہے یہ بھی جمعیت اقوام غالب ہی ہے اور شاید اس کا حشر بھی دہی ہو، جو پہلی لیگ کا ہوا تھا۔ اقبال نے نیشنلزم کی مخالفت کی۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ وہ آزادیٔ وطن کے مخالف تھے اقبال نیشنلزم کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ وہ آزادیٔ وطن کے مخالف یا غلامی کو محبوب سمجھتے ہیں بلکہ اس کی بعض محرک ایسی باتیں ہیں، جن کے متعلق اجمالی طور پر،

آئیڈیل سوسائٹی کے ضمن میں بحث ہو چکی ہے حیرت کا مقام ہے کہ جس نامور نے عمر بھر افراد اور ملتوں کو خودی کا سبق پڑھایا، جس نے بندگی نامہ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ بندگی اور زندگی دو مختلف چیزیں ہیں، جس نے انسانوں کو عام حریت، عام اخوت، عام انصاف اور عام رواداری کا پیغام دیا۔ جس نے "پس چہ باید کرد"، بال جبریل اور ضرب کلیم میں ہندوستان کی غلامی اور ہندوستانیوں کے افتراق پر آنسو بہائے اس کے متعلق یہ خیال پھیل جائے کہ اسے غلامی سے لگاؤ تھا، یہ اقبال کے ساتھ سخت ناانصافی ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال یونیورسلسٹ اور آفاقیت دوست ہیں۔ ہر وہ چیز جو ان کے اس خاص اجتماعی نصب العین سے ٹکراتی ہے۔ اس کی وہ مخالفت کرتے ہیں۔ یہی اجتماعیت کی اس تبلیغ کو بعض معترضین "پین اسلامزم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اقبال صرف مسلم اقوام کے نہیں بلکہ تمام اقوام کے اجتماع کے قائل ہیں۔ چنانچہ "پس چہ باید کرد" میں تمام اہل مشرق کو تطہیر فکر کی دعوت دی ہے اور مہر عالم تاب کو خطاب کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی ہے ؎

فکر شرق آزاد گرد و از فرنگ
از سرود من بگیرد آب و رنگ

اقبال کے نزدیک مشرق میں جمعیت اقوام کی کامیابی ممکن نہیں ہے کیونکہ مشرق کا مزاج سوداگری اور نفع پرستی سے نفور ہے، یہ درست ہے کہ اقبال جا بجا مسلمان اقوام کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں، اور وطن و نسل کے امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم کے زیر اثر صرف مسلمان اقوام ہی اس خیال کو اپنا سکتی ہیں۔ باقی اقوام نیشنلزم سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اس یونیورسل اپیل کو جنت الحمقا سمجھیں گی یا اسے اپنے تسلط کے منافی سمجھ کر ٹھکرا دیں گی

سوشلزم اور سرمایہ

اس موضوع پر اقبال نے بڑے واضح الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال مزدور کے حامی ہیں سرمائے کی معذرتوں اور ناانصافیوں پر کئی نظموں میں تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور "خضر راہ" میں بڑے بلیغ پیرائے میں مزدور کی محکومی اور مجبوری کی تصویر کھینچی ہے۔ اقبال جس طرح اپنے باقی نظریات میں ایک مستقل راہ اور رائے رکھتے ہیں، اسی طرح وہ اس معاملہ میں بھی اپنے خاص نصب العین کو مدنظر رکھتے ہیں اس کی واضح ترین صورت ہمیں "جاوید نامہ" میں ملتا ہے جہاں جمال الدین افغانی کی زبانی یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ قیصریت کی شکست، سود کی مذمت "الارض للہ" اور انسانی برادری کی مساوات وغیرہ میں مسلمان اور روسی متحد الخیال ہیں، لیکن روسی اشتراکی نظام اور اسلامی نظام میں بڑا فرق یہ ہے، کہ روس کے تصور کی بنیاد "شکم" پر ہے اور روح کی ترقی کی بجائے اس کا منتہائے نظر جسم کی پرورش ہے۔ روس کی تہذیب مدح کی مستحق اس لیے نہیں کہ اس میں "ذکر حق" کی کمی ہے۔ اس لیے اس سے بھی احتراز لازم ہے۔ چنانچہ کارل مارکس کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے "جاوید نامہ" میں لکھا ہے ؎

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
[illegible] پیغمبر ہے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

غربیان گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جان پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبر ناحق شناس
بر مساوات شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

اقبال سوشلزم کو وسیع تر انسانی برادری کی تعمیر اور ترکیب کے سلسلے میں ناکافی اور ناقص سمجھتے ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ثابت کیا ہے کہ یورپ سوشلزم پر غلبہ پانے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن اسلام اس فتنے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اقبال کے خیالات لینن کے متعلق بُرے نہیں، کیونکہ لینن نے تہذیب فرنگ کو چیلنج کیا ہے۔ وہ اشتراکی نظام کو سرمایہ داری کا ردِّ عمل سمجھتے ہیں۔ لیکن انہیں اعتراض ہے کہ یہ ساری تحریک "لا" پر مبنی ہے "الا" کی منزل تک نہیں پہنچتی۔

اقبال نے اپنے سیاسی تصورات کا کوئی مربوط نظام قائم نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان کا اولین مقصد احیائے احساس تھا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سیاسی نظامات پر تنقید کی ہے اور اس کے ضمن میں اپنے تصور کے سیاسی نظام کے خارجی خط کھینچے ہیں۔ جزئیات اور تفصیلات کو اپنے دائرے سے خارج سمجھ کر عموماً نظر انداز کر دیا ہے اس کے باوصف مجموعی نظر ڈالنے سے ان کے یہاں سیاست کا ایک قابل فہم نظام سامنے آجاتا ہے۔

اقبال نے ملک کی عملی سیاست میں دلچسپی تو لی ہے اور کبھی کبھی کھل کر بھی سامنے

باقی صفحہ ۳۴ پر

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ

عادی مجرموں کی زباں درازیاں

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اُن دنوں دہلی میں مسلم لیگ کا ایک جلسۂ عام تھا۔ کسی نہ کسی طرح لیگ کے مقامی راہنما مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت کو جلسہ میں لے آئے۔ خوب دھواں دار تقریریں ہوئیں۔ تقریباً تمام یاوہ گو مقرروں نے مولانا حسین احمد کے خلاف انتہائی گندہ زبان استعمال کی اور اس طرح اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ یہی اُن کا سرمایہ تھا اور شاید وہ اِس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کا خلاصۂ بیان اس پر ختم ہوتا کہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ نہیں مولانا محمد الیاس ہیں اور اُن کی تعریف میں دو چار زور دار کلمات کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دیتے۔ آخر میں مولانا محمد الیاس نے خطاب کیا اور صرف چند کلمات کہہ کر اپنی تقریر ختم فرما دی۔ مولانا نے فرمایا کہ "مولانا حسین احمد کی سیاسی رائے میری سمجھ سے بالا ہے اگر میں اُس سے اتفاق کرتا تو اُن کی کفش برداری کرتا لیکن میں اُن کی ذات کے خلاف کوئی کلمہ اپنی زبان پر لا کر جہنم کی آگ خریدنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اللہ کے نزدیک اُن کے مرتبہ سے آگاہ ہوں۔ اس قسم کا حوصلہ وہی نوجوان کر سکتے ہیں جو حسین احمد کے درجہ و مقام سے واقف نہیں ہیں اور نہ قرآنی اخلاق کے اسلامی حدود سے بہرہ ور ہیں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن مولانا مدنیؒ نے اُن کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا اور وہ اُن کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی مسلم لیگ کے حلقۂ سیاست میں شیخ الاسلام تھے۔ اُن کا مرتبہ و مقام بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ جب کبھی اُن سے مولانا مدنیؒ کے متعلق سوال کیا گیا انہوں نے عموماً یہی کہا کہ مدنی صداقتِ اسلام کی دلیل ہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع بفضل تعالےٰ بقید حیات ہیں اور زمانۂ دیوبند سے مسلم لیگ کے طرفدار ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کی خدمت کی ہے۔ اُن سے پوچھئے کہ مدنی غیرتِ اسلام کی دلیل تھے اور فقرِ اسلام کا نمونہ یا ملتِ اسلامیہ کے غدار تھے؟ اور ہندو کے اجیر؟ ہم مولانا احتشام الحق تھانوی کو دین کے بجائے دنیا کا انسان سمجھتے ہیں اُن میں واعظانہ خوبیوں کے باوجود کسی حکومت سے ٹکراؤ کا حوصلہ نہیں وہ سیاسی اقتدار کے انسان ہیں اُن سے دیانت رکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ ہم نے دس پندرہ سال پہلے جالندھر کے ایک راسخ العقیدہ لیگی نوجوان ڈاکٹر مولوی محمد اکرام الحق مرحوم کی زندگی میں اُن کی اِس روایت کو لکھا تھا کہ مولانا مدنی جالندھر اسٹیشن سے ٹرین میں جا رہے تھے تو لیگ کے دو نوجوان اُن کے ڈبے میں گھس گئے۔ ایک نے مولانا مدنی کی داڑھی پکڑ لی دوسرے نے اُس پر تھوکا۔ مولانا مدنی نے آہ تک نہ کی جب یہ کر چکے کہ مولانا حسین احمد مدنی آیاتِ الٰہی میں سے تھے یا ہندو کے ایجنٹ تھے؟

جن دوستوں نے چٹان کو لگاتار اپنے مطالعہ میں

ہفت روزہ چٹان لاہور

روایت ان نوجوانوں نے جالندھر مسلم لیگ کے صدر مولانا عظامی کو سنائی تو مولانا عظامی نے ان نوجوانوں سے کہا بڑا ظلم کر رہے ہو یا واقعی تم نے ایسا کیا اور اس پر فخر کر رہے ہو؟ جب دونوں نوجوانوں نے تصدیق کی کہ فی الواقعہ وہ یہ کر آئے ہیں تو مولانا عظامی نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو۔ مدنی اہل اللہ میں سے ہے اس نے مدتوں روضۂ رسولؐ کی پلکوں سے جاروب کشی کی اور آستانۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھائی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے مدنی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ پانی میں ڈوب جائیں گے یا انہیں آگ چاٹ لے گی۔ ڈاکٹر اکرام الحق راوی تھے کہ ان دو نوجوانوں میں سے ایک تقسیم کے وقت دریائے بیاس کی نذر ہو گیا دوسرا پاکستان میں آکر پولیس کی معرفت ایک ملک لیڈر ہی کے ہاتھوں آگ کی بھٹی میں پھینک دیا گیا اور بھسم ہو گیا۔

یہ اتنی واضح اور بین شہادتیں ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی بدکردار اور بدقماش قلمکار مولانا مدنی کی شان میں گستاخی کرتا اور قائداعظمؒ کی آڑ لے کر انہیں یا ان کے ساتھیوں کو اجیرِ علماء لکھتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بدبخت انسان ہے اور اسے اپنے نفس کی غلاظتوں پر ساری دنیا کا قیاس ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی چراغِ مصطفوی پر شرارِ بولہبی سے ہمیشہ ایک حملے کئے ہیں۔ جو لوگ اپنے دل میں خدا کا خوف رکھتے ہوں وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ اس ژاژخائی کا حوصلہ صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اپنے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ کس کشتی کا پتا ہیں؟ آج دنیا میں نہ قائداعظم رہے نہ علامہ اقبالؒ نہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد وہ پرانی بساط تمام تر لپٹ چکی ہے اب ان سب کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے لیکن ان اکابر کی موت کو سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جو لوگ ایک کی آڑ میں دوسرے کو برا کہتے ہیں وہ بہرحال انسان نہیں

ہیں۔ گو اس قسم کے افراد گنے چنے ہی ہیں مثلاً صحافیوں میں قادیانی امت کے دسترخوان کا ایک دلدادہ تن تنہا اس طرز کا ہذیان بکنے میں پیش پیش ہے اور اکثر و بیشتر آڑ یہ لی جاتی ہے کہ علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق درج ذیل قطعہ لکھا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اشعار بالا ارمغانِ حجاز کے آخر میں درج ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرمایا — ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے اور ارمغان حجاز ان کی ترتیب و تدوین سے شائع ہوتی تو یہ اشعار اس میں کبھی نہ ہوتے۔ علامہ اقبالؒ شخصیات کی مدح و قدح سے بالا بلند تھے اور عمر کے آخری دور میں یہ چیزیں ان کے تصور ہی سے منقا ہو چکی تھیں انہوں نے اس طرز کے تمام اشعار اپنے کلام سے ہمیشہ خارج کر دیئے۔ اگر مرتبین اتنے ہی دیانتدار تھے تو انہیں کم سے کم مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ارمغان میں ضرور شامل کرنا چاہیئے تھا جو ایک روزنامے ہی کے صفحۂ اول پر شائع ہوا اور ملک کے تمام اخباروں نے نقل کیا اور شاید کوئی دوسرا مرثیہ اس پائے کا نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو وقتی سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور علامہ اقبالؒ ہی کے قلم سے نکلی ہیں مثلاً حضرت علامہ نے علی برادران کی رہائی پر جو اشعار لکھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ امرتسر میں پڑھ کر سنائے لیکن بانگ درا میں جب کہ ان کا ابتدائی دور شائع کیا گیا تو علی برادران کا ذکر نہ کیا اسی طرح مہاتما گاندھی کی تعریف میں جو اشعار لکھے جن میں انہیں مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا وہ اشعار سود دسمبر ۱۹۱۹ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری ایام میں قائداعظمؒ کے ساتھ تھے لیکن ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں محمد علی جناح سے بھی پانچ شعروں میں چٹکی لی۔ اسی طرح پہلی جنگِ عظیم میں علامہ نے دہلی کی وار کانفرنس میں ترکیب بند کی ایک مسدس لکھ کر سنائی جس میں شہنشاہ انگلستان سے متعلق دو بند قصیدے کا انتہائی غلو رکھتے ہیں۔ جب یہ تمام نظمیں شاعرانہ محاسن کے باوجود علامہ نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیں تو مولانا حسین احمد سے متعلق تین اشعار کا ارمغانِ حجاز میں شامل کئے جانا فی الواقعہ سیاسی بدمذاقی اور ذہنی حادثہ ہے۔ اس صورت میں یہ اشعار اور بھی افسوسناک معلوم ہوتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے جس خبر سے متاثر ہو کر یہ اشعار لکھے تھے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی روزنامہ 'احسان' میں اس مطلب کا ایک خط چھپوا دیا کہ مجھ کو اس صراحت کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں (ملاحظہ ہو انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، پیش لفظ جناب ممتاز حسن سابق فنانس سیکرٹری حکومتِ پاکستان، شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی)

علامہ اقبالؒ نے جناب طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا مدنی کی توضیح کے بعد اپنے اشعار کی تلخی کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

اس حقیقت کشائی کے بعد اگر کوئی قلم دراز یا زبان دراز مولانا مدنی اور ان کے رفقاء پر نشتر زنی کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی فضا سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی روحوں کو بھی صدمہ پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غلط کار لوگ پاکستان میں غالباً یہ تصور کئے بیٹھے ہیں کہ وہ کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی کالک اپنے چہرے پر مل رہے ہیں۔

*

کیا طلبہ اب طلبہ نہیں رہے کچھ اور ہو گئے ہیں

پنجاب یونیورسٹی یونین کے انتخابی ہنگامے

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو جو افسوسناک اور شرمناک صورتحال پیدا ہوئی اس سے ہر محب وطن پاکستانی اور صاحب اولاد انسان کا دل دکھا۔ ہم کسی حلقہ کی حمایت وطرفداری کے بغیر کہ یہ ہمارا مسلک نہیں اس قدر عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ سٹوڈنٹس یونین کا سالانہ انتخاب ایک مستقل روگ بن گیا ہے اور تعلیم کا مستقبل بڑی تیزی سے تباہ ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کے انتخابات میں کبھی اس انداز کی لاقانونی اور تشدد کے مظاہرے نہ ہوتے تھے لیکن پچھلے چار سال سے بالخصوص ان بے قابو ہنگاموں کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے طلبا، طلبا نہیں رہے بلکہ کچھ اور چیز ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سیاست کے مزاج کا اکھاڑہ بن چکی ہیں۔ طلبا، قرطاس وقلم کی بجائے ریوالور اور پستول سے محبت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک قانون قانون نہیں رہا کسی بیسوا کی داغدار تنہائی ہو گئی ہے۔

لا اینڈ آرڈر کی اس رسوائی کے پہلو بہ پہلو سب سے خطرناک چیز اساتذہ کی بے بسی وبے کسی ہے۔ اس قسم کے ہنگاموں میں اساتذہ اپنے طلبا سے خوفزدہ رہتے اور پٹائی کے ڈر سے اخلاق کی تلقین کرنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتے۔ مثلاً ایک ثقہ روایت کے مطابق جب ۱۴ مارچ کو گورنمنٹ کالج کے افسوسناک تصادم میں بعض متین وسنجیدہ لیکن تماشائی پروفیسرز سے کہا گیا کہ وہ طلبا کو سمجھائیں تو ان میں سے ایک دو نے جواب دیا کہ ہم نے جس گروہ کو سمجھانے کی کوشش کی وہی ہمارا مخالف ہو جائے گا اور اس کے حامی اخبارات ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہم اپنی عزت محفوظ رکھیں تو زیادہ بہتر ہے اب طلبا، شاگرد نہیں رہے بلکہ خریدار کی حیثیت سے استادوں کے پاس آتے ہیں۔ معاملہ اُن کی مرضی کے مطابق ہو جائے تو سب اچھا اس کے برعکس ذرا برابر روگردانی کام نہیں آتی۔ چنانچہ ۱۳ مارچ کے ہنگامے میں تعلیم وتحقیق کے شعبہ میں ایک پروفیسر میاں عبدالعزیز کو پیٹا گیا ہم اس حادثہ کے مرتکب طالب علم یا طالب علموں کا نام نہیں لینا چاہتے ہیں لیکن وہ نسل کیونکر پنپ سکتی ہے جو اپنے اساتذہ کی پٹائی پر فخر کرتی ہو اور وہ ہاتھ کیونکر بلند ہو سکتے ہیں جنہیں اپنے اُستاد کے گریبان پھاڑنے کی ہمت ہو۔ دو ہی چیزیں ہیں یا اُستاد وہ اُستاد نہیں رہے یا طالب علم، طلب علم سے دستبردار ہو کر اُستادوں کی آبرو کے میدان میں کبڈی کھیلنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بہرحال جو کچھ طلبا نے ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو تعلیمی فضا میں کیا اس نے پولیس کو اس امر کا جواز مہیا کیا ہے کہ پچھلے دنوں پولیس نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اقامت گاہوں سے جو اسلحہ برآمد کیا یا برآمد کرنا چاہا وہ اقدام غلط نہیں تھا اس سلسلہ میں ہم سوچتے ہی نہیں کہ طلبا کس طرف جا رہے ہیں اور ہم انہیں کدھر لے جا رہے ہیں؟

اخبارات کسی وجہ سے اصل واقعات کی تصویر نہ



نیو کیمپس میں نعرہ بازی



منظور خان پولیس تشدد کے خلاف وائس چانسلر کے سامنے احتجاج کر رہا ہے۔

روایت ہیں۔ نوجوانوں نے جا لندھر مسلم لیگ کے صدر مولانا مظاہری کو سنائی تو مولانا مظاہری نے ان نوجوانوں سے کہا بڑا ناک رہے ہو یا واقعی تم نے ایسا کیا اور اس پر فخر کر رہے ہو؟ جب دونوں نوجوانوں نے تصدیق کی کہ فی الواقعہ وہ یہ کر آئے ہیں تو مولانا مظاہری نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو۔ مدنی اہل اللہ میں سے ہے اُس نے مدتوں روضۂ رسولؐ کی پلکوں سے جاروب کشی کی اور آستانۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھائی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے مدنی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ پانی میں ڈوب جائیں گے یا انہیں آگ چاٹ لے گی۔ ڈاکٹر اکرام الحق راوی تھے کہ اُن دو نوجوانوں میں سے ایک تقسیم کے وقت دریائے بیاس کی نذر ہو گیا دوسرا پاکستان میں آکر پولیس کی معرفت ایک لیگی لیڈر ہی کے ہاتھوں آگ کی بھٹی میں پھینک دیا گیا اور بھسم ہو گیا۔

یہ اتنی واضح اور بین شہادتیں ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی بدکردار اور بدقماش قلمکار مولانا مدنی کی شان میں گستاخی کرتا اور قائد اعظمؒ کی آڑ لے کر انہیں یا اُن کے ساتھیوں کو اجیر علماء لکھتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بدبخت انسان ہے اور اُسے اپنے نفس کی غلاظتوں پر ساری دنیا کا قیاس ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی چراغِ مصطفوی پر شرارِ بولہبی نے ہمیشہ رکیک حملے کئے ہیں۔ جو لوگ اپنے دل میں خدا کا خوف رکھتے ہوں وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ اس ژاژ خائی کا حوصلہ صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اپنے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ کس کھیتی کا بتا ہیں؟ آج دنیا میں نہ قائد اعظم رہے نہ علامہ اقبالؒ نہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد وہ پرانی بساط تمام تر لپیٹ چکی ہے اب ان سب کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے لیکن ان اکابر کی موت کو سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جو لوگ ایک کی آڑ میں دوسرے کو بُرا کہتے ہیں وہ بہرحال انسان نہیں ہفت روزہ چٹان لاہور

ہیں۔ گو اس قسم کے افراد گنے چنے ہی ہیں مثلاً صحافیوں میں قادیانی اُمت کے دسترخوان کا ایک زلہ رُبا تن تنہا اس طرز کا ہذیان بکنے میں پیش پیش ہے اور اکثر و بیشتر اُڑائی جاتی ہے کہ علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق درج ذیل قطعہ لکھا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اشعارِ بالا ارمغانِ حجاز کے آخر میں درج ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرمایا — ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے اور ارمغانِ حجاز اُن کی ترتیب و تدوین سے شائع ہوتی تو یہ اشعار اُس میں کبھی نہ ہوتے۔ علامہ اقبالؒ شخصیات کی مدح و قدح سے بالا بلند تھے اور عمر کے آخری دور میں یہ چیزیں اُن کے تصور ہی سے منفک ہو چکی تھیں انہوں نے اس طرز کے تمام اشعار اپنے کلام سے ہمیشہ خارج کر دیئے۔ اگر مرتبین اتنے ہی دیانتدار تھے تو انہیں کم سے کم مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ارمغان میں ضرور شامل کرنا چاہیئے تھا جو ایک روزنامے ہی کے صفحۂ اول پر شائع ہوا اور ملک کے تمام اخباروں نے نقل کیا اور شاید کوئی دوسرا مرثیہ اُس پائے کا نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو وقتی سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور علامہ اقبالؒ ہی کے قلم سے نکلی ہیں مثلاً حضرت علامہ نے علی برادران کی رہائی پر جو اشعار لکھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ امرتسر میں پڑھ کر سنائے لیکن بانگ درا میں جب کہ اُن کا ابتدائی دور چھا شائع کئے تو علی برادران کا ذکر نہ کیا اسی طرح مہاتما گاندھی کی تعریف میں جو اشعار لکھے جس میں انہیں مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا وہ اشعار ۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری ایام میں قائد اعظمؒ کے ساتھ تھے لیکن ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں محمد علی جناح سے بھی پانچ شعروں میں چشمک لی۔ اسی طرح پہلی جنگِ عظیم میں علامہ نے دہلی کی وار کانفرنس میں ترکیب بند کی ایک مسدس لکھ کر سنائی جس میں شہنشاہ انگلستان سے متعلق دو بند قصیدے کا انتہائی غلو رکھتے ہیں۔ جب یہ تمام نظمیں شاعرانہ محاسن کے باوجود علامہ نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیں تو مولانا حسین احمد سے متعلق تین اشعار کا ارمغانِ حجاز میں شامل کئے جانا فی الواقعہ سیاسی بددیانتی اور ذہنی حادثہ ہے۔ اس صورت میں یہ اشعار اور بھی افسوسناک معلوم ہوتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے جس خبر سے متاثر ہو کر یہ اشعار لکھے تھے اُس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی روزنامہ "احسان" میں اِس مطلب کا ایک خط چھپوا دیا کہ مجھ کو اِس صراحت کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اُن پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں اُن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں (ملاحظہ ہو انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، پیش لفظ جناب ممتاز حسن سابق فنانس سیکرٹری حکومتِ پاکستان، شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی)

علامہ اقبالؒ نے جناب طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا مدنی کی تصحیح کے بعد اپنے اشعار کی تلخی کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

اِس حقیقت کشائی کے بعد اگر کوئی قلم ور انہ یا زبان ور انہ مولانا مدنی اور اُن کے رفقا پر نشتر زنی کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی فضا سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی روحوں کو بھی صدمہ پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اِس قسم کے غلط کار لوگ پاکستان میں غالباً یہ تصور کئے بیٹھے ہیں کہ وہ کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی کالک اپنے چہرے پر مَل رہے ہیں۔

کیا طلبہ اب طلبہ نہیں رہے کچھ اور ہو گئے ہیں

پنجاب یونیورسٹی یونین کے انتخابی ہنگامے

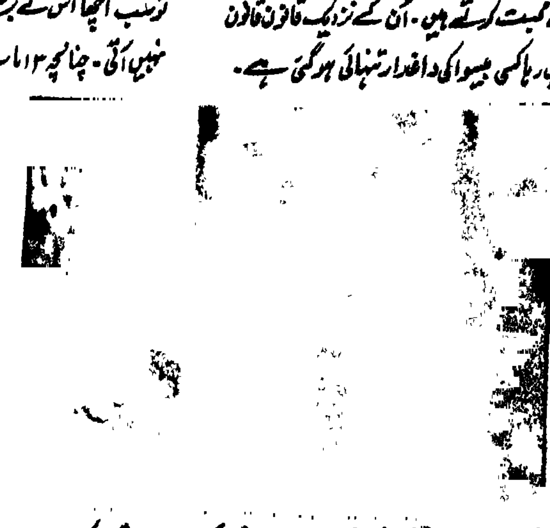
پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو جو افسوسناک اور شرمناک صورتحال پیدا ہوئی اس سے ہر محب وطن پاکستانی اور صاحب اولاد انسان کا دل دکھا۔ ہم کسی حلقہ کی حمایت و طرفداری کے بغیر کہ یہ ہمارا مسلک نہیں اس قدر عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ سٹوڈنٹس یونین کا سالانہ انتخاب ایک مستقل روگ بن گیا ہے اور تعلیم کا مستقبل بڑی تیزی سے تباہ ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کے انتخابات میں کبھی اس انداز کی لاقانونی اور تشدد کے مظاہرے نہ ہوتے تھے لیکن پچھلے چار سال سے بالخصوص ان بے قابو ہنگاموں کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے طلبا، طلبا رہی نہیں رہے بلکہ کچھ اور چیز ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سیاست کے مزاج کا اکھاڑہ بن چکی ہیں۔ طلباء قرطاس و قلم کی بجائے ریوالور اور پستول سے محبت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک قانون قانون نہیں رہا کسی جیسوا کی داغدار تنہائی ہو گئی ہے۔

لا اینڈ آرڈر کی اس رسوائی کے پہلو بہ پہلو سب سے خطرناک چیز اساتذہ کی بے بسی و بے کسی ہے۔ اس قسم کے ہنگاموں میں اساتذہ اپنے طلباء سے خوفزدہ رہتے اور پٹائی کے ڈر سے اخلاق کی تلقین کرنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتے۔ مثلاً ایک ثقہ روایت کے مطابق جب ۱۴ مارچ کو گورنمنٹ کالج کے افسوسناک تصادم میں بعض متین و سنجیدہ لیکن تماشائی پروفیسرز سے کہا گیا کہ وہ طلبا کو سمجھائیں تو ان میں سے ایک دو نے جواب دیا کہ ہم نے جس گروہ کو سمجھانے کی کوشش کی وہی ہمارا مخالف ہو جائے گا اور اُس کے حامی اخبارات ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہم اپنی عزت محفوظ رکھیں تو زیادہ بہتر ہے اب طلبا، شاگرد نہیں رہے بلکہ خریدار کی حیثیت سے استادوں کے پاس آتے ہیں۔ معاملہ اُن کی مرضی کے مطابق ہو جائے تو سب اچھا اُس کے برعکس ذرا برابر روگردانی کام نہیں آتی۔ چنانچہ ۱۳ مارچ کے ہنگامے میں تعلیم و تحقیق کے شعبہ میں ایک پروفیسر میاں عبدالعزیز کو پیٹا گیا ہم اس حادثہ کے مرتکب طالب علم یا طالب علموں کا نام نہیں لینا چاہتے ہیں لیکن وہ نسل کیونکر پنپ سکتی ہے جو اپنے اساتذہ کی پٹائی پر فخر کرتی ہو اور وہ ہاتھ کیونکر بلند ہو سکتے ہیں جنہیں اپنے اُستاد کے گریبان پھاڑنے کی ہمت ہو۔ دو ہی چیزیں ہیں یا اُستاد وہ اُستاد نہیں رہے یا طالب علم، طلب علم سے دستبردار ہو کر اُستادوں کی آبرو کے میدان میں کبڈی کھیلنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بہر حال جو کچھ طلبا نے ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو تعلیمی فضا میں کیا اُس نے پولیس کو اس امر کا جواز مہیا کیا ہے کہ پچھلے دنوں پولیس نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اقامت گاہوں سے جو اسلحہ برآمد کیا یا برآمد کرنا چاہا وہ اقدام غلط نہیں تھا اس سلسلہ میں ہم سوچتے ہی نہیں کہ طلبا کس طرف جا رہے ہیں اور ہم انہیں کدھر لے جا رہے ہیں؟

اخبارات کسی وجہ سے اصل واقعات کی تصویر نہ



نیو کیمپس میں نعرہ بازی



منظور خان پولیس تشدد کے خلاف وائس چانسلر کے سامنے احتجاج کر رہا ہے۔

دیں اور دایاں اور بایاں بازو کے ذہن میں بیٹھ رہیں تو ان کی ایک راستہ ہے اور وہ شاید اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ نئی نسلیں کس سرعت سے ڈوب رہی ہیں، ہماری اطلاع کے مطابق ۱۳ مارچ کو نیو کیمپس میں ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لیے ڈھائی گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی اکثر روزناموں نے اس سلسلے میں کئی ایک طلباء کے نام بھی شائع کئے ہیں اور جن طلباء نے اخلاق کے شیش محل کی توڑ پھوڑ کی ہے۔ بعض مصدقہ اطلاعات کے مطابق اُن کی شہرت اچھی نہیں ہے انہیں یونیورسٹی میں سیاسی ضرورتوں کے مطابق داخلہ ملا اور وہ سیاسی ضرورتوں کے آلہ کار ہیں آخر اس پر کیونکر فخر کیا جا سکتا ہے جبکہ ۱۴ مارچ کو گورنمنٹ کالج کے باہر طلباء کے دو گروہوں میں خطرناک تصادم ہو گیا جس سے ایک بے گناہ نوجوان محمد حنیف جو گورنمنٹ کالج میں فسٹ ایر کا طالب علم تھا خنجر سے شہید ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ کو داغ جُدائی دے گیا اس معصوم نوجوان کے علاوہ لاہور کالج برائے طالبات کی ایک لیکچرار مسز شجاع بھی زخمی ہوئیں اور چار دوسرے طالب علموں کو بھی زخم آئے۔ اخباری اطلاع کے مطابق طلباء کے دونوں گروہوں میں دیر تک خنجروں اور پستولوں کا آزادانہ استعمال ہوتا رہا۔ فائرنگ کے باعث ارد گرد کی فضا میں دہشت پھیل گئی۔ راہ گیروں اور غیر متعلقہ طلبہ نے ادھر اُدھر بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔

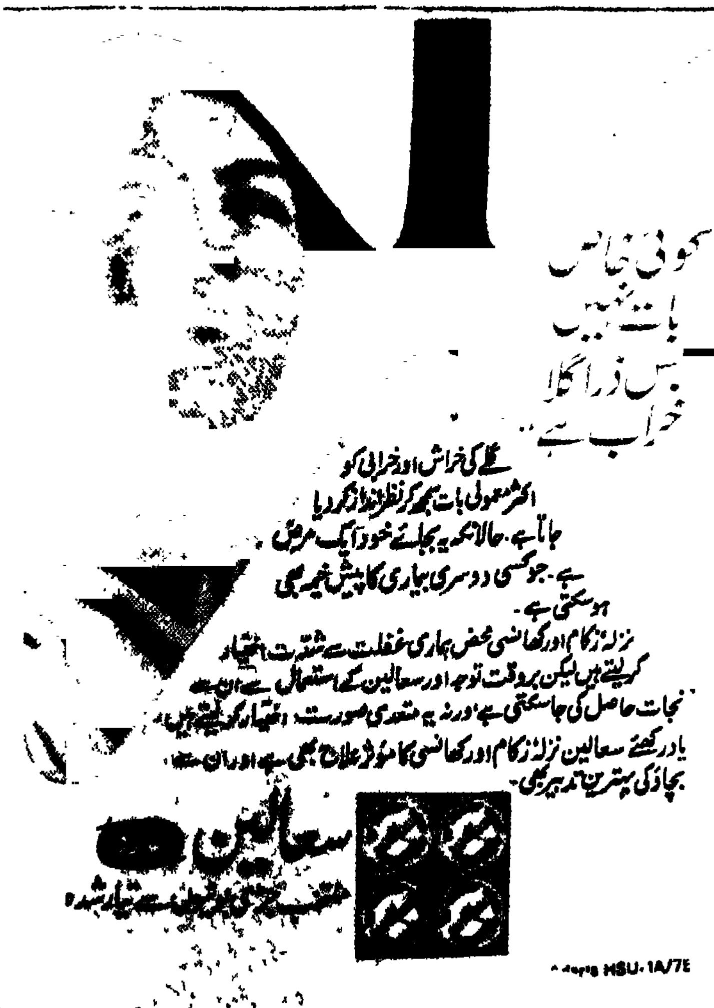
کہا جاتا ہے کہ طلباء کی ایک پارٹی نے گورنمنٹ کالج کے بعض کمروں میں گھس کر فرنیچر بھی توڑ دیا۔

خدا گواہ ہم طلباء کے ہر گروہ کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ لیکن پولیس کے اس رویئے پر کبھی صاد نہیں کر سکتے اُس نے اس سلسلے میں جو گرفتاریاں کی ہیں وہ قطعاً جانبدارانہ اور سیاسی ذہن سے ہیں ہم اس سلسلہ میں کئی ایک راز ہائے درونِ پردہ جانتے ہیں جس کا جتنا جرم ہے اُس کو اُتنی ہی سزا ملنی چاہیئے۔ یہ غلط ہے کہ ہم کسی طالب علم کے معصوم خون کو اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کے لیے استعمال کریں۔ پولیس نے پنجاب یونیورسٹی کے صدر منتخب مسٹر عبدالشکور، جنرل سیکرٹری

ہفت روزہ چٹان لاہور

احسان اللہ وقاص اور اُن کے دو دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے کسی بیہودہ کارکردگی کا ثبوت نہیں دیا اگر ان میں فی الواقعہ کوئی مجرم ہے تو ہم اُس کی حمایت سے اپنے قلم کو گناہگار کرنا نہیں چاہتے لیکن ایک ذہن کے نوجوانوں کو پکڑ لینا اور اسلامی جمعیت طلباء کے چند اوں کو معتوب ٹھہرانا کسی ہوشمندی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تمام غلط راستے ہیں اور ان غلط راستوں کا نتیجہ ملک و قوم و حکومت کے لیے مفید نہیں۔ ہم نے وہ بیان بھی پڑھے ہیں جو اس سلسلے میں گورنمنٹ کالج سٹوڈنٹس یونین نے جاری کئے ہیں پھر اس سلسلے میں اسلامی جمعیت طلباء لاہور نے جو کچھ کیا ہے وہ بھی دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طلباء سے کیونکر مخاطب ہوں؟ جو لوگ طلباء کو سیاسی طور پر استعمال کر رہے ہیں وہ شاید خود اولاد سے محروم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طلباء میں بایاں بازو اور دایاں بازو کی تفریق بالکل غلط ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان عناصر کو کہاں سے مدد مل رہی ہے طلباء کی زبردست اکثریت طالب علم ہی رہنا چاہتی ہے وہ سیاسی فضا سے متاثر ضرور ہوتی ہے اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتی ہے لیکن حقیقی طلبہ کسی تصادم اور فساد کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ بعض پروفیسروں کا رویّہ سخت غلط ہے وہ طلبہ کو استعمال کرتے اور اپنے مقاصد کی جوت جگاتے ہیں۔ جب تک اس قسم کے پروفیسر یونیورسٹی کی فضا میں موجود ہیں اُس وقت تک طلباء سے کج روی کا ختم ہونا ناممکن ہے طلباء کا تمام پالیٹکس چند پروفیسروں اور دو چار درجن طلباء نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ نتیجۃً خام ذہن اُن کے ہاتھوں استعمال ہو کر عظیم سے عظیم خرابی کا باعث ہو رہے ہیں۔

باقی صفحہ ۲۷ پر



سر ظفر اللہ خاں کی اچھوتی منطق

پوچھا ہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب قادیانی کا ایک مضمون "میرا دین" کے عنوان سے ہفت روزہ "لاہور" (۱۰ فروری ۷۵ء) اور ہفت روزہ "پیغام صلح" (۵ مارچ ۷۵ء) میں شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے اپنے نظریات کا ایک "مصنوعی خاکہ" پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"یہ مختصر بیان میرے دین و عقائد کا ہے، پاکستان کی پارلیمنٹ نے قرار دیا ہے کہ یہ دین اور عقائد رکھتے ہوئے پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت کے نزدیک آئین و قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہوں، میں اس کا جواب یہی دے سکتا ہوں ؎

بعد از خدا بعشق محمد مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

میرے دین کا خلاصہ یہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میرے دین کا پارلیمنٹ خواہ کچھ نام تجویز کر لے، میرا حق ہے کہ میں اپنے دین کا، جس طور پر میں اس پر ایمان رکھتا ہوں، آزادانہ اعلان کروں اس پر عمل کروں اور اس کی اشاعت کروں۔"

(پیغام صلح ۵ مارچ ۷۵ء، ص ۳)

چودھری صاحب نے اپنے دین و عقائد کا [illegible] کیا ہے۔ ان پر اگرچہ [illegible] ایک علیحدہ مضمون کے [illegible] سے تفصیلی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے مگر زیر قلم سطور میں مجھے موصوف کے مندرجہ بالا قانونی نکات کے بارے میں چند اصولی باتوں پر اظہار خیال کرنا ہے۔

اول:۔ چودھری صاحب سے ہمیں ہزار نظریاتی اختلاف ہو، جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے وہ قانونی مہارت میں عالمی شہرت کے حامل ہیں اور کم از کم ذاتی حد تک میں انہیں ایک منجھا ہوا سیاست دان اور ایک سنجیدہ انسان تصور کرتا رہا ہوں۔ مگر اپنے مضمون "میرا دین" میں انہوں نے ایک اسلامی ملک کے باوقار آئین ساز ادارے کا جس نازیبا طریق سے مذاق اڑایا ہے اس کی توقع کسی چلے کے "چھچھورے مرزائی" سے تو کی جا سکتی تھی، مگر "پاکستان کے سابق وزیر خارجہ" سے اس کا مظاہرہ بہت ہی تعجب انگیز ہے اور اس سے غالباً قادیانی امت کی اس مصنوعی شہرت کو بھی ٹھیس پہنچے گی، جو مرزا غلام احمد نے انگریزی حکام کے دور سے کر رکھی تھی، کہ یہ فرقہ بڑا مہذب ہے۔



خان ضیا محی الدین۔ آپ نے قبل اور بعد از آزادی عوامی خدمات کا ایک عظیم الشان مجلسی ریکارڈ قائم کیا۔

دوم:۔ چودھری صاحب ایک عرصہ تک عالمی عدالت کی کرسی صدارت پر فائز رہے ہیں انہیں معلوم ہو گا، کہ ملزم کی صفائی کا موزوں موقع عدالت کا کٹہرہ ہے۔ عدالت میں ملزم کو حق حاصل ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ماہرین قانون کی خدمات حاصل کرے، استغاثہ کی کہانی کا فرضی ہونا ثابت کر دکھائے، استغاثہ کی شہادت پر جی کھول کر جرح کرے اور عدالت کو یقین دلا دے کہ وہ الزام سے بری اور قطعاً بری ہے۔ لیکن مقدمہ کی کارروائی مکمل ہونے اور عدالت کا فیصلہ منظر عام پر آ جانے کے بعد ملزم کا اخباری بیانات جاری کرنا، اپنے کیس کو دہرانا اور عدالت کے فیصلہ کو ٹھکرا کر یہ فخر کرنا کہ اگر اسی کا نام "جرم" ہے تو مجھے ناز ہے کہ میں نے یہ "جرم" کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی

یہ حرکت تو توہینِ عدالت کے ذیل میں آتی ہے اور عرفِ عام میں بھی اس کو کوئی مستحسن امر نہیں سمجھا جاتا، بلکہ جرم پر فخر کرنا خود ایک بدترین اخلاقی جرم ہی تصور کیا جاتا ہے۔ چودہری صاحب تو ماشاء اللہ عالمی قانون کے ماہر ہیں۔ مگر افسوس ہے، کہ شدتِ جذبات میں ان کی نظر سے یہ قانونی و اخلاقی نکتہ اوجھل رہا، جس سے معمولی عقل و فہم کے گنوار کو بھی ناواقف نہیں ہونا چاہیئے۔

سوئم: پارلیمنٹ کا فیصلہ کوئی اوپرے ٹھونسا ہوا فیصلہ نہیں، بلکہ دو اڑھائی مہینے تک اس مقدمہ پر بحث ہوتی رہی۔ قادیانی امت کے دونوں فرقوں کو اپنی صفائی اور استغاثہ کے دلائل پر جرح کا موقعہ دیا گیا۔ دونوں پارٹیوں کے سربراہ (مرزا ناصر خلیفہ ربوہ۔ اور صدرالدین صاحب امیر لاہوری گروپ) بنفسِ نفیس عدالت میں پیش ہوئے۔ مسلسل گیارہ بارہ دن تک ان کے بیانات کا تجزیہ ہوتا رہا۔ اور انہیں ہر جرح کے جواب کا موقعہ دیا گیا اس کے باوجود قادیانیوں کی یہ دونوں قابلِ احترام شخصیتیں اپنا مقدمہ ہار گئیں۔ اب چودہری صاحب کی جذباتی رائے خواہ کچھ بھی ہو، مگر عالمی عدالتِ انصاف کے سابق صدر کی حیثیت سے انہیں سوچنا چاہیے۔ کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

چہارم: چودہری صاحب کا میرا دینا شائع کرنا اس لحاظ سے بھی محلِ نظر ہے کہ قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے سامنے کسی خانصاحب یا چودہری صاحب کے عقائد و نظریات کا سوال نہیں تھا، اس کے سامنے جو نکتہ زیرِ بحث تھا، وہ یہ تھا کہ آیا مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں؟ پھر یہ کہ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت اسلام کے مسلّمہ عقیدہ "ختم نبوت" کے منافی ہے یا نہیں؟ اور اس سے خاتم النبیینؐ کی مہر ٹوٹتی ہے یا نہیں؟

الغرض خصوصیت کے ساتھ چودہری محمد ظفر اللہ خان بہادر کے عقائد کا سوال قطعاً زیرِ غور نہیں تھا بلکہ اصل موضوعِ بحث مرزا غلام احمد صاحب کا دعویٰ نبوت تھا۔ عدالت میں اصل ملزم مرزا غلام احمد صاحب تھے۔ مرزا ناصر احمد اور جناب صدرالدین اپنے اعوان و انصار کے ساتھ مرزا صاحب کے وکیل تھے۔

عدالت کسی کیس کی تفتیش کے بعد جب ملزم پر فردِ جرم عائد کرتی ہے اور وہ عدالت کے کٹہرے سے باہر آکر احتجاج کرتا ہے کہ مجھ سے بے انصافی ہوئی ہے تو (اس سے قطع نظر کہ اس کی یہ حرکت قانون و اخلاق کی نظر میں، بجائے خود جرم ہے) اس کے احتجاج کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ میں نے یہ جرم کیا نہیں کیا، پھر اس بے گناہ کو عدالت میں مجرم قرار دیئے جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں:۔

اوّل: یہ کہ وہ بے گناہ تھا، مگر اس کے وکیل صفائی اپنی نااہلی اور عدم لیاقت کی وجہ سے عدالت کو مطمئن نہیں کر سکے۔

دوم: یہ کہ عدالت پر اس کا بے گناہ ہونا روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیا گیا تھا۔ مگر عدالت نے حق و انصاف کے تقاضوں کو دانستہ پامال کرتے ہوئے ناحق اس پر فردِ جرم عائد کر دی۔

افسوس ہے کہ چودہری صاحب کا جذباتی مضمون اپنے وکلاء کے کردار سے شکایت نہیں کرتا بلکہ ان کا سارا نزلہ عدالت کے کردار پر گرتا ہے اور طرہ یہ کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ملزم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور وہ دل کی گہرائی سے ایمان رکھتے ہیں کہ ملزم حقیقتاً نبی تھا اور اس کے جرم پر ساری دنیا کو ایمان لانا چاہیئے۔ کیا چودہری صاحب کے نزدیک عدل و انصاف اسی کا نام ہے کہ وہ ایک طرف

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

جالندھر میں قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے ہمراہ [illegible]
خان [illegible] مرحوم

ہفت روزہ چٹان لاہور

مولانا محمد عبداللہ خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد

کے اغوا کی کہانی اُن کی اپنی زبانی

۱۳ مارچ بروز جمعرات شام پونے پانچ بجے ایک نوجوان شخص نے مجھے گھر سے بلایا اور کہا کہ آپ سامنے کھڑی ہوئی کار تک چلیں، ایک بات کرنی ہے یہ کار سفید رنگ کی تھی اور میرے گھر کے سامنے مفرب کے رُخ کھڑی تھی، کار کی اگلی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر چھوٹی سی داڑھی والا ایک شخص بیٹھا تھا، جس شخص نے مجھے گھر سے بلایا تھا، اُس نے کہا، صوفی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ جب میں بیٹھا تو وہ شخص بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی چلادی۔ اس پر مجھے خطرہ محسوس ہوا تو میں نے شور مچایا انہوں ے کپڑے سے میرا منہ بند کرنا چاہا، تو مَیں نے مزاحمت ی اور ہاتھ پاؤں مارے۔ اس پر انھوں نے ریوالور سے مجھے دھمکایا اور مجھ پر کمبل ڈال کر بے بس ر دیا، اس دوران کار اسلام آباد سے نکل چکی تھی، انھوں نے ڈرائیور کو کہا کہ اٹک چلو۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق کار لاہور کے راستہ پر چل رہی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد انھوں نے سی حالت میں مجھے کار سے اتارا اور ایک جیپ میں سوار کیا جو پیلے رنگ کی تھی۔ جیپ میں میرے ہاتھ پاؤں اور کمر کو علیٰحدہ علیٰحدہ باندھ کر ٹا دیا گیا۔

راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے سے چند باتیں معلوم کرنی ہیں، وہ معلوم کرکے ...کر چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد وہ تین گھنٹے [illegible] چلتی رہی اور وہ خاموش بیٹھے رہے۔

پھر انہوں نے پہلا سوال مجھ سے یہ کیا کہ

مولوی رویس خان کہاں ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟

مَیں نے کہا وہ میرا ایک ساتھی اور دوست ہے، پہلے اسلام آباد میں خطیب تھا اور اب میرپور میں مفتی ہے۔

راستے میں ہی انھوں نے مجھے بتایا کہ ہم صبح سے تمہارے پیچھے پھر رہے ہیں اور ہمیں تمہاری آج کی ساری نقل و حرکت کا علم ہے۔ تقریباً پانچ گھنٹے کے بعد مجھے جیپ سے اتار کر ایک بند کمرے میں لے جایا گیا اور چار مسلح نوجوانوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ ان کے پاس ریوالور اور ڈنڈے تھے یہاں میری آنکھوں کو کھول دیا گیا اور میرے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیئے گئے۔ میرے خیال میں یہ بند کمرہ لاہور شہر کی کوئی جگہ تھی، جب کہ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم سرگودھا شہر میں ہو، اس لیے کہ پہرہ داروں نے انجانے میں آپس میں مولانا کوثر نیازی کا تذکرہ کیا تھا کہ وہ آج یہاں آئے ہیں اور مولانا موصوف اس دن (یعنی ۱۳ مارچ کو) لاہور میں تھے۔ مزید برآں یہ کہ جیپ جب شہر میں داخل ہوئی تھی تو تقریباً آدھ گھنٹہ چلتی رہی اور رکشوں وغیرہ کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرے خیال میں سرگودھا میں رات ۱۰ بجے تک اتنے رکشے نہیں چلتے۔

اِس کمرہ میں، مَیں نے اسی حالت میں نمازیں پڑھیں اور کھانا وہ خود اپنے ہاتھ سے کھلاتے رہے۔ یہاں مجھے انھوں نے ریوالور وغیرہ دکھایا، اور کہا کہ ہمیں سچ سچ بتانا ورنہ ہم تمہیں بجلی کے تار لگائیں گے یا گولی مار دیں گے اور پوچھا کہ تم کس سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہو، میں نے جواب دیا کہ اللہ رسول کی پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں اور بس۔ پھر انہوں نے کہا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بدنام کرنے کے لیے کچھ کام تو نہیں کیا، مَیں نے کہا

کہ میں کسی آدمی کی تعریف یا توہین دونوں سے الگ رہتا ہوں، صرف قرآن و حدیث کی بات مسجد میں کرتا ہوں۔

اس کے بعد انھوں نے جبراً مجھ سے دو حلفیہ بیان لکھوائے، ایک یہ کہ

"میں آئندہ سربراہ مملکت اور ان کی کابینہ کی شان میں کوئی گستاخی اور ناشائستہ بات بات نہیں کروں گا اور اب تک جو کیا ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

حالانکہ میں نے کبھی بھی کوئی ایسی نازیبا بات نہیں کی اور نہ ہی یہ میرا اصول ہے۔ دوسرا یہ کہ

"میں برضا و خوشی ذاتی کام سے سرگودھا آیا ہوں اور مخالفین نے گھر والوں کو پریشان کرنے کے لیے اخبار کی خبر شائع کرائی ہے"

اور یہ مضمون انہوں نے ایڈیٹر نوائے وقت کے نام لکھوایا تھا۔

انہوں نے مجھ سے یہ سوال بھی کیا کہ تم آئندہ دو تین دن میں کیا کرنے والے تھے اور اس کے لیے تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنایا ہے انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے آئندہ کوئی گڑبڑ کی تو ایک دو تین کر کے تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے گا۔

اسی طرح انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہاری طرح مولوی روڈ بھی ہمارے قبضے میں آچکا ہے اور تمہاری پارٹی کے دوسرے افراد کو بھی اسی طرح حراست میں لیا جائے گا۔

پہلی رات کے دس بجے سے دوسری رات کے صبح دو بجے تک مجھے اسی کمرہ میں رکھا گیا پہلی ساری رات میرے ہاتھ پیچھے بندھے رہے لیکن جب [illegible] سو گئے تو پھر نماز کے لیے کھول دیئے [illegible] وقت میں تقریباً ہر آدھ گھنٹہ بعد پہرہ دینے کے لیے آتے رہے۔

دوسری رات کو ایک شخص کو لایا گیا اور مجھے متعارف کرایا گیا کہ یہ صاحب پیپلز پارٹی سرگودھا کے چیئرمین ہیں اور ہم سب لوگ سرکاری ملازم نہیں ہیں بلکہ پی۔ پی۔ پی کے ورکر ہیں۔ اسی رات گیارہ بجے مجھے بتایا گیا، کہ ہم نے تحقیقات کر لی ہیں اور آج تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

چنانچہ رات ۲ بجے میری آنکھیں باندھ کر ایک کار میں سوار کیا گیا اور صبح ۵ بجے تک پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سفر کرتے رہے۔ ایک سنسان جگہ کار کھڑی کر کے مجھے اتارا اور ایک سڑک کے ساتھ ایک گڑھے میں بٹھا کر مجھ پر چادر دے دی اور کہا کہ پانچ منٹ بعد آنکھیں کھولنا۔ چنانچہ ان کے ڈر سے ہی پانچ منٹ بعد اٹھا اور سڑک پر ایک شخص کی طرف چل دیا، تقریباً فرلانگ تک چلا تو وہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی، وہاں میں نے فجر کی نماز پڑھی اور پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ جگہ سوہاوہ ہے جو منڈی بہاؤالدین سے چار میل دور ہے اور یہاں سے ایک سڑک سرگودھا کو جاتی ہے۔ اور ایک پھالیہ وغیرہ کو وہاں سے میں جی۔ ٹی۔ ایس کی بس نمبر ۱۷۱ آر۔ آئی۔ ڈی۔ پر پنڈی پہنچا اور صبح ساڑھے دس بجے گھر پہنچ گیا۔ واپسی پر میں نے اُن سے کہا تھا کہ میرے پاس کرایہ کے لیے پیسے نہیں ہیں تو انھوں نے مجھے ۲۰ روپے دیئے تھے اور جو چادر انہوں نے مجھ پر ڈالی تھی، وہ بھی میرے پاس ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

بازار سیاست

صرصر ہے بیا باد صبا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست — دشت و چمن میں حشر بپا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

ولتے زمانہ حدِ نظر تک روک لیا حالات نے رستہ — سوچ رہا ہوں بات یہ کیا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

منبر و مسجد، جادہ و منزل، دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، — ہر جانب دھوکہ ہے دغا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

آؤ چلیں تقدیر کو لے کر راہبروں سے کیا لینا ہے — راہزنوں نے گھیر لیا ہے، اف ری تمنا ہائے سیاست

ملاحوں سے کیا شکوہ ہو جب اپنی تقدیر یہی تھی — خود ہی سفینہ ڈوب رہا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

کچھ غمِ دوراں، کچھ غمِ جاناں، کچھ غم منزل، کچھ غم جادہ — ٹوٹا ہوا دل نالہ سرا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

لالہ و گل میں کیا رکھا ہے سرو و سمن میں آگ لگا دو — فطرت نے اعلان کیا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

دور شفق کا سرخ جزیرہ آگ کے پرچم کھول رہا ہے — دھرتی سے طوفان اٹھا ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

ہم دل ریش مسافر شورشؔ ہر نگری میں گھوم چکے ہیں
یہ منزل، یہ راہ نما ہے اف ری تمنا ہائے سیاست

شورش کاشمیری

گلہائے رنگ رنگ

• انسان کا کردار • نظر کے زاویئے • شخصیت کا مفہوم • مجاج کی پختہ اعتقادی • زبان کا مزاج

انسان کا کردار

انسان کے کردار کی ترقی اور نشوونما کے لیے مادی اشیا کے ساتھ ساتھ روحانیت کی بھی سخت ضرورت ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ سکول کی زندگی طالب علم کے کردار کو اس کی شخصیت کو بڑی حد تک متاثر کرتی ہے۔ اس لیے سکولوں کے نظام میں مادی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی علوم کا ہونا بھی بہت زیادہ ضروری ہے لیکن ان اداروں میں جن میں مغربی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ ان علوم کا فقدان ہے جن سے انسان میں اوصاف حسنہ اور نیک خصائل پیدا ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ طالب علم کی عقل بڑھ سکتی ہے ان کی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے وہ ایک خطرناک سائنس دان بن کر ایٹم بم بنا سکتا ہے لیکن ایک بلند کردار انسان نہیں بن سکتا۔ ہر فرد مغربی علوم کا لوہا مانتا ہے کیونکہ ان کے ذریعہ بڑی بڑی ایجادیں ہوئیں۔ مادی دنیا میں بڑی بڑی ترقیاں ہوئی ہیں ہمارے ملک میں بھی یونیورسٹیاں، کالج ان علوم کی اشاعت کے لیے موجود ہیں۔ اربوں روپیہ ان کے انتظام پر خرچ کیا جاتا ہے لیکن اخلاق اتنے روپیہ سے کہاں تک پیدا ہوتی ہیں یہ بات سنجیدگی سے غور طلب ہے۔

(الجمعیۃ دہلی)

نظر کے زاویے

• جب اخبار نویس خود اعتماد ہو جاتے ہیں تو صورت حال کافی سے زیادہ نازک ہو جاتی ہے۔

(انیورن بیوان)

ہفت روزہ چٹان لاہور

• ایشیائی باشندے کھلے بندوں بوس و کنار کے عادی نہیں یہ شرف تو صرف مغرب ہی کو حاصل ہے۔ (لم چین مانگ)

• ہائیڈروجن بم کا ذکر اذکار جن لوگوں کی زبانوں پر رہتا ہے مجھے ان کی مرکز گریزی پر افسوس آتا ہے کیا اچھا ہوتا کہ یہ لوگ کوئی اور مفید کام کرتے۔ فارغ اوقات میں وہ اپنے ملک کی اقتصادی مشکلات کا علاج بھی تو سوچ سکتے ہیں۔

(فیلڈ مارشل منٹگمری)

• نہ معلوم آج دنیا کس مخمصے میں مبتلا ہے میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اس کا نہ کوئی فلسفۂ حیات ہے اور نہ کوئی نصب العین۔

(مسر رچرڈ ونگ سٹون)

• مغربی اقوام کے زوال اثر و اقتدار کی نوعیت تمثیلی ہے لیکن اس کے باوجود اسے کافی اہمیت دی جا رہی ہے۔

(مسٹر والٹر لپ مین)

• سائنس ابھی تک ایک سربستہ راز ہے۔

(مسز ریانڈ پیٹلے)

• زندگی کا مقصد تن آسانی کیسے ہو سکتا ہے۔

(مسٹر ہربرٹ ہوور)

• کامیاب شعرا کی کمی نہیں البتہ کامیاب ماہرین موسمیات کا فقدان ضرور ہے۔

(کمانڈر الف۔ ایم۔ سائمن)

• ہمیں ان اخبار نویسوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے جو اپنے قارئین کو جذبات کی رو میں بہا لے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح رفتہ رفتہ قارئین کے دل و دماغ پہ یہ نقش بیٹھ جائے گا کہ زندگی کی تعمیر کے لیے جذبات کی نہیں بلکہ صحت مند تصورات کی ضرورت ہے۔

(مسٹر فلورینس سکر گلمٹن)

• اگر مجھے ایک بار اور زندگی بسر کرنے کا موقع مل جائے تو میں اخبار نویسی کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کروں گا۔ (مسٹر سام گولڈون)

• سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں اگر ان حضرات کا ہاتھ ہوتا جو کسی نہ کسی مکتبِ فکر کے بانی رہے ہیں تو ان کی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔

(مسٹر جان اردن)

• خوشامد سے بڑے بڑے آدمی تو رام ہو جاتے ہیں لیکن نچلی سطح کے لوگوں پر یہ حربہ کارگر نہیں ہوتا۔ خوشامد سے ان کا دماغی توازن برقرار نہیں رہتا۔

(مسز ہیررے بکنیش)

• کھانا پکانا میرا محبوب شغل ہے یہ شغل مجھے اس لیے محبوب ہے کہ اس سے مجھے درس تخلیق ملتا ہے۔ (مسٹر نوئیل کاورڈ)

• صنعت و حرفت بھی ایک قسم کا ایٹمی بم ہے معاشرہ میں انتشار کا سبب اگر کچھ ہے تو یہی ہے۔

(آرچ بشپ آف کینٹربری)

• پریم واقعات کی گود میں پروان چڑھتا ہے۔

(داسل اٹیلی)

• مشنری کے کام میں جو لوگ مہارت رکھتے ہیں ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ان کی تعلیم بھی اعلیٰ ہو۔

(مسٹر اے پیسٹ وچ)

عرفِ عام میں شخصیت سے مراد کسی ایسے شخص کا وجود ہے جو ہر اعتبار سے انسانیت کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے اندر انسانیت کے جوہر کوٹ کوٹ کے بھرے ہوئے ہیں تو اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان شخصیت کا حامل ہے۔ شخص صرف کسی ذات کا مظہر اور شخصیت ذات و صفات دونوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب تک ایک شخص صرف ایک شخص ہے معاشرہ میں اُسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن جیسے ہی یہ شخص شخصیت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں شخصیات کی تعداد ہمیشہ مختصر رہی ہے۔ اتنی مختصر کہ جسے انگلیوں پر گنا جا سکے۔

جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں منزلِ حیات کے ہر موڑ پر اشخاص ہی اشخاص نظر آتے ہیں۔ گنی چنی شخصیتیں جن کے وجود سے ہمیں انکار نہیں، کچھ ایسے گمنام تھے نقاب منہ پر ڈالے ہوئے ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ہم سوچے سمجھے اور جانچے پرکھے بغیر انہیں بھی اشخاص ہی پر محمول کر لیتے ہیں چونکہ فکر و نظر کے زاویے مختلف ہوتے ہیں اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ شخص اور شخصیت کے معیار سب کے نزدیک ایک ہی جیسے ہوں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی معکوس نگاہی کی بدولت اشخاص و شخصیات کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ کبھی بڑی سے بڑی شخصیت ان کی نظر میں شخص ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس کے برخلاف معمولی سے معمولی شخص کو ان کی نگاہِ کرشمہ ساز شخصیت کی سند دے دیتی ہے۔

ان حالات میں یہ سوال کہ ہم کسے شخص کہیں اور کسے شخصیت ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے ؎

کس کا یقین کیجیے کس کا یقین نہ کیجیے

لائے ہیں بزمِ یار سے لوگ خبر الگ الگ

ہمارے خیال میں شخصیت کی تحقی دو صورتوں میں اور شاید ضمیر کی آواز۔

زبانِ خلق پہ اگر ہم تکیہ کریں تو بے شمار ایسی تاریخی شخصیتیں گمنام افراد سے بھی زیادہ کم وقیع نظر آئیں گی۔ جن کے افکار و خیالات نے ہر دور میں معاشرہ کو چار چاند لگائے ہیں۔ ضمیر کی آواز ایسے ایسے اشخاص کو شخصیت کے معیار پر فائز سمجھتی ہے جنہیں دنیا نے کبھی جانا نہ پہچانا۔ (ایک مفکر)

حجاج کی پختہ اعتقادی

شہر واسط میں حجاج کا قصر تھا۔ حجاج جب اس میں منتقل ہوا تو اس کی ایک نوجوان اور حسین بیوی سخت بیمار ہو گئی۔ ہزار علاج کیا لیکن شفا نہ ہوئی لوگوں نے تشخیص کی کہ اس پر جن کا سایہ ہو گیا ہے۔

حجاج نے عبد اللہ ابن ہلال کو بلوایا یہ شخص اپنی ساحری اور عملیات و وظائف کی بنا پر بڑا مشہور تھا۔ اور لوگ اس سے خوف کھاتے تھے اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ وہ عوام میں "رفیق الشیاطین" کے نام سے مشہور تھا۔ عبد اللہ بن ہلال نے حجاج کی بیوی کا علاج کیا اور وہ شفایاب ہو گئی۔ حجاج کو شبہ ہوا کہ شاید اس قصر پر بھی جنوں کا اثر ہے اپنے اس شبہ کا ذکر اس نے عبد اللہ سے کیا تو اس نے کہا:

کیا مضائقہ! میں تدارک کر دوں گا۔

عبد اللہ بن ہلال لوہے کا ایک گولہ لے کر آیا اس میں ایک کڑا لگا ہوا تھا اور مہر شدہ تھا۔ اس نے حجاج کو یہ گولہ دکھا کر کہا۔ قصر کا صحن کھدوائیے تاکہ میں اس گولے کو اس میں گاڑ دوں۔

حجاج نے اس گولہ کی خاصیت اور اثر کے متعلق شبہ ظاہر کیا تو عبد اللہ بن ہلال نے کہا اس گولہ کا وزن پانچ رطل (ڈھائی سیر) سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ دس آدمیوں کو بلوائیے کہ وہ زور لگا کر اسے زمین سے اٹھائیں۔ حجاج نے فوج کے طاقتور ترین دس آدمیوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اس گولے کو اٹھائیں ان سب نے پورا زور لگایا لیکن گولا اس سے مس نہیں کے چہرے پر خفت کے آثار ظاہر ہوئے اور اس نے اس لکڑی کے سرے کو جو اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی گولے کے کڑے میں ڈال دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

ان ربکم اللذی خلق السمٰوٰتِ والارض فی ستۃ الایام ثم استوی الی العرش پڑھ کر اس گولہ کو پھول کی طرح اٹھا لیا۔ جب گولہ اُٹھ گیا تو اس نے حقارت سے اسے پرے پھینک دیا۔ اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اور آخر اس نے عبد اللہ بن ہلال سے کہا۔

اپنا یہ گولہ اٹھا کر لے جاؤ، میں اسے اپنے قصر میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر میں نے گولہ رکھ لیا تو میرے بعد جب اس قصر میں دوسرے لوگ آئیں گے اور ان کو یہ گولہ نظر پڑے گا تو دنیا میں طرح طرح کی باتیں پھیلیں گی لوگ مجھ پر لعنت کریں گے اور انہیں غلط فہمی ہوگی کہ میں سحر اور جادو کے زور سے ان پر حکومت کرتا تھا۔

اس واقعہ سے باوجود حد درجہ شقی القلب ظالم اور مغلوب الغضب ہونے کے حجاج کی دینداری، عقیدے کی پختگی اور ایمان کی مضبوطی کا ثبوت ملتا ہے اس کی ایسی ہی اچھی عادتیں تھیں جنہوں نے اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی ذات کو بحث و تمحیص کا مرکز بنائے رکھا۔ اس کی وفات کے بعد جب لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی الزامی باتیں کر رہے تھے تو عبد الوہاب ثقفی نے غصہ کے ساتھ کہا تھا:

تم اس کی برائیاں دیکھتے ہو! مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے درہم و دینار پر کلمہ توحید نقش کرایا۔ وہ خلفاء راشدین کے بعد پہلا حاکم تھا جس نے نئے شہر بسائے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اعراب لگا کر قرآن کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ وہی تھا جس نے عورتوں کے لیے محملیں تیار کرائیں اور واسط سے قزوین اسکے بیکروں پر آگ جلانے کا رواج شروع کیا تاکہ خبر رسانی میں عجلت اور آسانی پیدا ہو جائے۔ عجب ہستی تھی جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

زبان کا مزاج

ہر زبان کا مزاج یا لہجہ علیحدہ ہوتا ہے اور اس

کا تعلق اس ملک کے جغرافیائی حالات اور تہذیبی و سماجی محرکات سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کے بیشتر الفاظ کے تلفظ میں ایک خاص قسم کی ثقالت اور ناملائم کیفیت پائی جاتی ہے جو ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور یہاں کے اختلاف فضا کے سبب سے ہمارے لہجہ میں وہ کرختگی نہیں ہے جو عربی کا خاصہ ہے یا فارسی کے بہت سے الفاظ میں موجود ہے۔ مثلاً حیال عربی لفظ ہے عربی میں عین پر کسرہ ہے اور وہاں کے لہجہ کے اعتبار سے بجا ہے۔ لیکن اگر ہم کسرہ میں پڑھیں تو لہجہ میں عجیب غرابت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح فارسی میں فرشتہ کی فا پر زیر ہے۔ یہ فارسی کے لیے ٹھیک ہے لیکن اردو میں فا مکسور پڑھا جائے تو ذہن بگڑنے کا احتمال ہوگا۔

زبان پہلے بنتی ہے۔ تو اعد و لغت کی کتابیں بعد کو مرتب کی جاتی ہیں۔ اس طرح اصولی طور پر ہونا یہ چاہیے کہ جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اس کو اسی طرح درج کیا جائے۔ لیکن اردو لغات میں ایسا نہیں ہے اور اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ہندوستان میں جس وقت اردو کی ابتدا ہوئی اس وقت اور اس کے دنوں بعد تک یہ عالم رہا کہ عام طور پر لوگ السنۂ شرقیہ کے ماہر ہوتے تھے۔ آج خاص خاص لوگ ان کے متعلق جتنی معلومات رکھتے ہیں اس وقت کے عام پڑھے لکھے افراد ان سے زیادہ واقف ہوتے تھے فارسی اور عربی چونکہ مقدس زبانیں تھیں اور لوگ ان سے بڑی حد تک واقف ہوتے تھے لہٰذا اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ عربی و فارسی الفاظ میں حتی الامکان قطع و برید نہ ہونے پائے اردو میں اساتذہ نے جو عطف و اضافت وغیرہ کو نار وا رکھا اس کی یہی وجہ تھی لوگ بالعموم فارسی و عربی الفاظ کے تلفظ معانی اور صحیح اشتقاق سے واقف ہوتے تھے اس لیے گفتگو اور تحریر میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔ اس لیے عام گفتگو میں الفاظ کا کتابی تلفظ ہی قائم رہا۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مفرد الفاظ کی حرکات اور ان کے محل استعمال کا فیصلہ عموماً لغات کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ لغات اساتذہ و معتبرین کے کلام کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیے جاتے ہیں اس طرح ہوتا یہ ہے کہ جن الفاظ کو اساتذہ نے جن حرکات کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ لغت میں بھی ان کی وہی حرکات درج کر دی جاتی ہیں۔ اردو میں مدت تک زبان و ادب کا مفہوم صرف نظم رہا۔ شعر میں صرف نظم کی حرکت کا تعین بالعموم قافیے میں کیا جاتا ہے۔ قافیہ کے علاوہ ساکن و متحرک حروف کا تعین تو بعض اوقات شعر میں کسی دوسری جگہ ہو جاتا ہے لیکن زیر زبر کا تعین نہیں ہو سکتا۔ قافیے میں روی و ماقبل روی کی حرکات محسوب ہوتی ہیں اس طرح جو لفظ سحرفی و چہار حرفی یا اس سے زائد حروف سے مرکب ہوتا ہے اس کے حروف کی حرکات کا ضبط بحث سے خارج رہتا ہے اس طرح ان الفاظ کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس حرکت کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔

ارباب فن نے بہت سختی کے ساتھ اس بات کا خیال رکھا کہ نظم میں عموماً اور قافیے میں خصوصاً جو الفاظ آئیں خواہ عام بول چال میں وہ کسی طرح استعمال کیے جاتے ہوں لیکن نظم میں وہ فارسی و عربی کی اصل حرکات کے ساتھ آئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے جتنے لغات مرتب کیے گئے ان میں اول تو فارسی و عربی الفاظ کو لکھا ہی نہیں گیا۔ صرف اس خیال سے کہ ان کے لیے عربی و فارسی لغات کافی ہیں اور اس طرح ان کی حرکات میں کسی تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا دوسرے ان زبانوں کے جو الفاظ لکھے گئے تو ان میں اصل زبان کی حرکات کو نقل کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اگر کوئی شخص اردو کے کسی ایسے لغت کو دیکھنا چاہے جس میں استعمال عام کا بھی ذکر ہو تو اس کو مایوس ہونا پڑے گا۔ کچھ الفاظ ایسے ضرور تھے جن کی حرکات حد سے زیادہ ثقالت کی بنا پر اردو کے اساتذہ کے نزدیک بھی قابل تبدیلی قرار پائیں جیسے حیال، کہ ایک مشہور روایت کے مطابق جلال نے کہا تھا کہ اب ہم اس کو بہ کسر حرف اول کے بجائے بہ فتح اول ہی بولیں گے۔ لیکن قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اول تو اجتہاد کا دائرہ صرف چند الفاظ تک محدود رہا۔ دوسرے یہ کہ ایسے الفاظ کو کسی لغت میں درج نہیں کیا گیا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا کہ فلاں فلاں الفاظ میں تصرفات کیے گئے ہیں بس یہ سلسلہ سینہ بہ سینہ روایات تک محدود رہا۔ جس سے بات وہیں کی وہیں رہی۔ اور جن چند الفاظ پر اساتذۂ اردو نے تہذیب کا یہ عمل جاری کیا تھا۔ ان کا پتہ لگانا بھی محال ہو کر رہ گیا۔ اردو میں الفاظ کی حرکات اور اس کے اشتقاق سے متعلق اختلافات شروع میں بالکل نہیں تھے لیکن زبان جتنی جلدی آگے بڑھتی گئی اور شرفا کے محدود طبقہ سے نکل کر طبقۂ عوام میں پھیلتی گئی۔ اتنے ہی اس میں تلفظ و حرکات کے اختلافات نمایاں ہوتے گئے۔ ہر زبان پر ابتدا میں اہل زبان کی گرفت سخت نہیں ہوتی ہے۔ ہاں جب وہ ایک خاص درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو اس میں تراش خراش کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ناسخ اور ان کے متبعین کا دور اردو کا درمیانی دور تھا زبان جب درمیانی دور سے نکل کر آگے بڑھتی ہے تو بہت سے ضابطے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں یہی ہوا اور یہی ہو رہا ہے۔ اس بنا پر ہم کو مان لینا چاہیے کہ دوسری زبانوں کے جو الفاظ آج عام طور پر پڑھے لکھے لوگ جس طرح استعمال کرتے ہیں وہ اسی طرح صحیح ہیں۔

★

بقیہ: اداریہ

زندگی کا حرف آخر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپوزیشن کے پاس مسٹر بھٹو کا بدل نہیں ہے اور نہ برسر اقتدار پارٹی کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپوزیشن کے اخلاص پر شبہ کرے۔ اس کی حب الوطنی پر انگشت نما ہو سیاسی مسائل سیاسی سطح ہی پر حل ہو سکتے ہیں ان کے لیے قانون کی شدت، پولیس کی حدت اور فوج کی حدت کا سہارا لینا غلط ہے۔

خدا کی لاٹھی بے آواز ہے

ابھی حال ہی میں وفاقی حکومت نے پنجاب پولیس کے جن پانچ سپرنٹنڈنٹوں کو ملازمت سے سبکدوش کیا ہمیں ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی ذاتی پرخاش یا شخصی شکایت نہیں اور نہ ہم سب سے واقف ہیں۔ لیکن ان کی سبکدوشی میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو پولیس کے بعض اہل کاروں کو لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہے۔ مثلاً ڈیرہ غازی خاں میں جب پولیس سپرنٹنڈنٹ قزلباش کے زمانہ میں ڈاکٹر نذیر احمد قتل ہوئے وہ بیک بینی و دو گوش رخصت کر دیئے گئے ہیں۔ پھر ڈیڑھ دو سال پہلے ملتان کے سپرنٹنڈنٹ پولیس واحد بخش نے شرفاء اور طلباء کو بے عزت کرنے کی جو ذلت و رسوائی حاصل کی وہ سب کے حافظے میں ہے۔ اس شخص کو بھی چھٹی دے دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ساہیوال میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک سیف اللہ ٹوانہ تھے۔ وہ ملک حق نواز ٹوانہ کے بھانجے ہیں۔ ملک حق نواز ٹوانہ اب تو اپنے خدا کو حساب کتاب دے رہے ہیں لیکن ان کی ایک چیز حیرت منیر کا سبب ہے بڑا ازخم ہے کہ انہوں نے غلط انسانوں پر مشتمل سیکرٹری پولیس کا سانچہ تیار کیا۔ ملک سیف اللہ ٹوانہ بھی رخصت پا گئے ہیں۔

ہمیں ان میں سے کسی کے زخموں پر نمک چھڑکنا مقصود نہیں لیکن ہم ان سے یہ ضرور عرض کریں گے

بقیہ صفحہ ... چٹان لاہور

کہ کسی اہل اللہ کی خانقاہ میں جا کر مراقبہ کریں کہ جو کچھ انہوں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے کیا وہ من جملہ معصیت تھا یا فرائض کا تقاضہ؟ وہ پولیس افسر جو آقایان ولی نعمت کی خاطر خدا اور رسول کے خوف کو بھی آگ لگا دیتے ہیں۔ انہیں ضرور سوچنا چاہیے کہ اقتدار کا گھمنڈ، شراب کا نشہ اور طوائف کا بستر یکساں قدر و قیمت کی چیز ہیں۔

مدیر الفرقان ربوہ کی خدمت میں

ماہنامہ الفرقان ربوہ کے ایڈیٹر جناب ابوالعطاء جالندھری نے مارچ کے شمارے میں اپنا اداریہ ایڈیٹر چٹان کے ایک خط سے متعلق رقم کیا ہے۔ یہ خط نجی تھا اور فی الواقعہ ایڈیٹر چٹان نے میرزا ناصر احمد صاحب "خلیفہ ثالث" کے نام رجسٹرڈ ارسال کیا تھا۔ ہم بزدل نہیں کہ اس سے انکار کریں یا اس کی تعبیر میں قلم کی شوخی دکھائیں۔ یا کسی عذر کے باعث ذو معنی روش اختیار کریں۔ جو کچھ لکھا ہم نے لکھا۔ ہم فی الحال اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم جناب ابوالعطاء جالندھری سے ایک ہی سوال کرنا چاہتے ہیں کہ دل آپ کے خلیفہ صاحب ہی کا ہے جس کو آزار پہنچتا ہے یا کسی اور کے پاس بھی دل ہے اور اس کو بھی آزار پہنچ سکتا ہے۔ آپ کے جس لاہوری ہفتہ وار نے ہم کو لگاتار عریاں و فحش گالیاں دیں کیا وہ آپ کے سامنے نہیں؟ بہتر ہوتا کہ آپ ایک "مسلم جماعت" کا "مبلغ" ہونے کی حیثیت میں اس سے متعلق روشنی ڈالتے کہ وہ کیا ہے؟ کیا اس کا نام آپ کے مذہب میں میرزا غلام احمد صاحب کی متابعت ہے۔ آپ کے خلیفہ صاحب نے کبھی اس کو روکا اور ٹوکا؟ ہم نے اس شخص کا کبھی نام تک نہیں لیا حتیٰ کہ پچھلے دو شماروں میں اس کا نام لینا اپنے قلم کی اہانت سمجھا۔

جناب محترم! اگر آپ اصولی بحث کریں اور خیال سے خیال کا تبادلہ کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن جب آپ کے "نبی" کا ایک امتی مبتذل سے مبتذل سوقیانہ زبان استعمال کرتا ہے، تو آپ بولتے نہیں۔ ہم کچھ عرض کریں تو آپ مضطرب ہو جاتے ہیں۔ آخر اس میں کونسی منطق ہے۔ اس کو سمجھا دیجئے گندی زبان ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے ہم کسی حالت میں برداشت نہیں کریں گے خواہ ہم پر قیامت گزر جائے۔

آغا شورش کاشمیری

حیدر آباد اور کراچی میں

آغا شورش کاشمیری ۲۲ مارچ کو حیدر آباد سندھ میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر تقریر کریں گے۔ اس کے بعد آپ ۲۳ مارچ کی صبح کو کراچی چلے جائیں گے اور وہاں دو تین روز ٹھہریں گے۔ (ادارہ)

غیر جانبدار رہیئے

عزیز محمد حنیف طالب علم گورنمنٹ کالج لاہور کی شہادت ہم سب کے لیے ایک المیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک معصوم نوجوان کو بے جرم و گناہ قتل کر دینا ایک ایسا وحشیانہ فعل ہے کہ ہم اصل مجرموں کی گرفتاری اور واقعی سزا کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں۔ پولیس چاہے تو طلبہ کی ڈار میں سے اصل مجرموں کا پتہ لگا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ چیز انتہائی تعجب انگیز اور خوفناک ہے کہ پولیس نے اسلامی جمعیۃ طلبہ کے ارکان پر مشق احتساب شروع کر رکھی ہے اور اس سلسلہ میں بعض طلبہ کا رویہ انتہائی افسوسناک ہے۔ انہیں غلط فہمی ہے کہ وہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخاب میں اپنی شکست کا انتقام اس طرح لے سکتے ہیں۔ اسی قسم کے طلبہ حکمران جماعت کے لیے کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ ہمارا ضمیر نہیں مانتا کہ عبدالشکور

اعمال و قاتلوں اور ان کے دو ساتھی اس خونخوار منصوبہ کے مجرم ہو سکتے ہیں۔ اگر فی الواقعہ مجرم ہوں تو ہماری ان کے ساتھ کبھی ہمدردی نہیں لیکن ایک معصوم فرد کو سیاسی تعلق سے داغدار کرنا ہمارے نزدیک افسوسناک جسارت ہے اور اس کا نتیجہ کسی حالت میں مفید نہیں۔

افغانستان کہاں ہے

یہ چیز ہمارے لیے انتہائی افسوسناک ہے کہ افغانستان شروع دن سے پاکستان کے معاملے میں غیر مخلصانہ بلکہ مخاصمانہ ذہن رکھتا ہے ہم نے ہر لحاظ سے اس کی اس روش پر سوچا ہے۔ خدا گواہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے منفی جذبات سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے کبھی اس کے مفاد کو ذرہ برابر گزند نہیں پہنچائی نہ کبھی اس کے کسی استحقاق پر مخالفانہ یا معاندانہ لب کشائی کی ہے۔ اس کے حدودِ مملکت کی ایک انچ زمین بھی ہمارے قبضے میں نہیں ہم نے اس کی حکمرانوں کا ہمیشہ احترام کیا اور اسلامی رشتۂ اخوت کی بنیاد پر اس کو اپنا بھائی سمجھا ہے لیکن افغانستان کا رویہ اکثر و بیشتر غیر خوشگوار رہا۔ جب سے سردار داؤد خان نے افغانستان پر فرمانروائی حاصل کی ہے پاکستان سے افغان حکمرانوں کی مخاصمت کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے۔ سردار داؤد اور ان کے حکومتی رفقاء از راہ کرم یہ بتائیں کہ ہم نے انہیں کیا نقصان پہنچایا ہے؟ یا وہ کون سا موڑ ہے کہ انہیں ہمارے ہاتھوں کسی رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آج افغانستان کو محض اپنے فرمانروایانہ مفادات کے باعث ڈیورنڈ لائن سے اس طرف کے پٹھان یاد آتے ہیں اور بعض جغرافیائی حدود پر اس کی للچائی نظریں اٹھتی ہیں کیا اس لیے کہ اب یہ علاقے آزاد ہیں اور یہاں مسلمانوں کی آزاد حکمرانی قائم ہے۔ انگریزوں کے دورِ غلامی میں افغانستان نے یہ سوال کبھی نہ اٹھایا تھا، پاکستان بنتے ہی اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا۔ ہم میں داخلی سیاسی اختلافات ہیں تو اس کی بنیادیں جمہوری ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم پاکستان کے استحکام و آبرو پر سب کچھ نثار کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی بیرونی مداخلت کے سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتے۔ پاکستان تو ہمارا اساس ہے۔ ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے تو افغانستان کی آزادی کے دشمنوں کو بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے غلط نہیں کہا کہ ملک کے مفاد کی خاطر پاکستان کا بچہ بچہ مسلح افواج کے شانہ بشانہ لڑنے کو تیار ہے اور دنیا کی کوئی سی طاقت ڈیورنڈ لائن کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ افغانستان کو ایک بھائی ملک کی حیثیت سے ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیے نہ کہ ہمارے خلاف دشمن طاقتوں کا آلۂ کار بن کر مشکلات پیدا کرنی چاہئیں۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک دوسرے کی سرحدوں سے جڑے ہوئے اسلامی ملک آپس میں ٹکراؤ کریں اور استعماری طاقتوں کے آلۂ کار بنیں جو اسلامی ریاستوں ہی کی نہیں بلکہ اسلام کی بھی دشمن ہیں۔ سردار داؤد کو پاکستان کے مسلمانوں سے متعلق اس غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیے کہ وہ کوئی لقمۂ تر ہیں یا ملک کے اندر سیاسی تنظیموں کی باہمی آویزش اس کی خاطر کوئی راہ ہموار کر سکتی ہے۔

ہم نوائے وقت کے اس نقطۂ نگاہ سے کاملاً متفق ہیں کہ مسلمان ملکوں میں سے کسی ریاست کا سربراہ افغانستان اور پاکستان میں مفاہمت کے لیے آگے بڑھے اور سردار داؤد کو کم سے کم یہ ضرور بتائے کہ وہ پاکستان کے خلاف عالمی سیاست کا مہرہ نہ بنے۔ خدانخواستہ پاکستان مٹ گیا تو افغانستان پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔

بقیہ: سر ظفر اللہ خاں

ملزم کے جرم پر ایمان لانے کا اعلان بھی کریں اور دوسری طرف عدالت کے فیصلہ کو ظالمانہ بھی قرار دیں؟ ——— کیا وہ اپنی ساری زندگی میں اس قانون دانی کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ ایک چور اپنی چوری کا اعلان بھی کرے اور ساتھ ہی یہ احتجاج بھی کرے کہ عدالت نے مجھے چور کی سزا دے کر عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو کچل ڈالا ہے۔

پنجم: چودھری صاحب کا قومی اسمبلی کے خلاف احتجاج کرنا ایک اور پہلو سے بھی غیر قانونی ہے، وہ یہ کہ چودھری صاحب اپنی جماعت میں خواہ کتنے ہی محترم اور بزرگ مانے جاتے ہوں، لیکن آئینی لحاظ سے ان کی حیثیت صفر ہے، وہ مرزا غلام احمد کے خلیفہ سوم کے ایک ادنیٰ مرید ہیں۔ آئینی طور پر قادیانی جماعت کی جانب سے بولنے کا اگر حق حاصل ہے، تو ان کے "امیر المؤمنین" اور "خلیفۃ المسلمین" کو حاصل ہے ——— چودھری صاحب ہزار بار "میرا دین" شائع کریں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آئینی فیصلہ کے خلاف احتجاج کرنے کی، انہیں کون سی اتھارٹی حاصل ہے؟ "امام جماعت احمدیہ" کے بجائے چودھری صاحب کا اپنے دین و عقائد پر اظہار خیال کرنا کیا "امام جماعت احمدیہ" کی حیثیت خود حاصل کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ ممکن ہے چودھری صاحب "ظلی طور پر" یہی حیثیت رکھتے ہوں، مگر افسوس ہے کہ ان کی یہ حیثیت کسی دوسرے کو ان کی جماعت میں مسلّم نہیں، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ربوہ کے سرکاری آرگن روزنامہ "الفضل" نے اسے آج (مورخہ ۱۳ مارچ) تک شائع کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا ——— اب چودھری صاحب خود فرمائیں کہ جب ان کا "دین" خود ان کے "ذریت" حلقوں میں سند کی حیثیت نہیں رکھتا تو ان کے مخالفین کے نزدیک اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ اور پھر قومی اسمبلی کے فیصلہ پر ان کا یہ مضمون کس حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے؟

افسوس ہے کہ چودھری صاحب نے اس قانونی نکتہ کو بھی ملحوظ نہیں رکھا، اور صرف اس بناء پر کہ وہ ملک سے باہر ہیں، ہمارے ملک کے مقتدر اداروں کے خاک اڑانے کی کوشش کی ورنہ اگر وہ ملک کے اندر ہوتے تو اپنے خلیفہ صاحب کی طرح صبر و رضا ہی کے مضامین ارشاد فرماتے۔

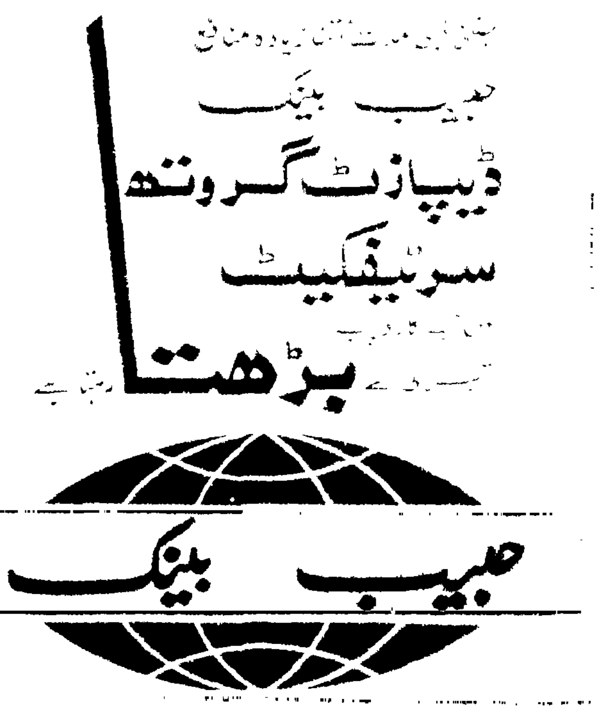
ششم: چودھری صاحب کو شکایت ہے کہ جب میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہوں۔ تو آخر کیوں اسمبلی کی اکثریت کے نزدیک میں آئینی و قانونی اغراض کے لیے کیوں مسلمان نہیں؟ میں جانتا ہوں، کہ چودھری صاحب قرآن کریم والے محمد رسول اللہ کے قائل ہیں؟ یا براہین احمدیہ والے خانہ ساز محمد رسول اللہ کے؟ مگر میں یہاں یہ جزئیاتی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا بلکہ اصولی طور پہ صرف یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تو پچاس کروڑ مسلمان بھی قائل تھے۔ یہ اصول جو آں جناب کو آج یاد آیا ہے۔ اس وقت کیوں نہ یاد آیا، جب مرزا غلام احمد بیک جنبش قلم تمام امت اسلامیہ کو کافر، جہنمی، مشرک، ملحد اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے رہے تھے۔؟

پھر اس زریں اصول کی طرف آں جناب کی نظرِ انصاف اس وقت کیوں نہ ملتفت ہوئی، جب آپ کے "مصلح موعود" اعلان کر رہے تھے کہ

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں، کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ یہ دین کا معاملہ ہے، اس میں کسی کا اختیار نہیں۔" (انوار خلافت ص ۹۰)

پھر اس اصول کی جانب اس وقت آنجناب کا دھیان کیوں نہ گیا، جب آپ کے "قمر الانبیاء" صاحب دھڑلے سے لکھ رہے تھے۔

"ہر ایک شخص جو موسیٰ کو تو مانتا ہے، مگر عیسیٰؑ کو نہیں مانتا یا عیسیٰؑ کو مانتا ہے، مگر محمدؐ کو نہیں مانتا یا محمدؐ کو مانتا ہے مگر مسیح موعود (غلام احمد) کو نہیں مانتا، وہ نہ صرف



ہے"۔ (کلمۃ الفصل مندرجہ ریویو آف ریلیجنز)

اور پھر یہی اصول آپ کو اس وقت کیوں نہ یاد آیا، جب بابائے قوم کے جنازہ میں شرکت کی وجہ بیان کرتے ہوئے عزت مآب نے فقرہ چست کیا تھا کہ :۔

"آپ مجھے کافر حکومت کا مسلمان ملازم سمجھ لیں یا مسلمان حکومت کا کافر نوکر"

(زمیندار لاہور ۸ فروری ۱۹۵۰ء)

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حقیقی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والوں کو کافر کہا جائے تو چوہدری صاحب کی جبینِ انصاف پر کوئی شکن نہیں آتی اور اگر ظلی و مجازی محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والوں سے ملک کا معزز ترین ادارہ یہی سلوک کرے تو چوہدری صاحب کی عالمی عدالت کی سابق کرسیٔ صدارت یکا یک جنبش میں آ جاتی ہے اور وہ بلند بانگی سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ بے انصافی ہے ۔۔۔

سوال یہ ہے کہ چوہدری صاحب کی عدالتِ انصاف کے لینے اور دینے کے دو الگ الگ پیمانے کیوں ہیں ؟ آخر یہ کیا اندھیر ہے کہ حقیقی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے تو حقیقی "مسلمان" کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ چوہدری صاحب کے دین میں پکے کافر ہیں۔ لیکن ظلی بروزی اور خانہ ساز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) پر متاعِ ایمان فروخت کرنے والے "مسلمان" ہیں اور ان کو غیر مسلم قرار دینا بے انصافی ہے ؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ہفتم :۔ چوہدری صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ "جماعت احمدیہ کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جس کی اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا"

چوہدری صاحب کو معلوم ہے کہ ان کی جماعت سے بہت ہی نرم سلوک روا رکھا گیا اور انہیں صرف ... اسلام نے ... [illegible] ... کے لئے جس قانون کا التزام کیا گیا ہے وہ اسلام صرف اجازت نہیں بلکہ جس قانون کا حکم دیتا ہے، وہ "من بدل دینہ فاقتلوہ" ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور تمہارے نبی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

غالباً مرزا غلام احمد کا خط بنام ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب مندرجہ "الذکر الحکیم" چوہدری صاحب کی نظر سے نہیں گزرا ہوگا۔

(باقی آئندہ)

★ ★ ★

آغا شورش کو خط نہ لکھیں

چٹان کے قارئین کرام اور بعض دوسرے احباب اپنے مضامین نظم و نثر اور کاروباری معاملات سے متعلق آغا شورش کاشمیری کے نام خط لکھتے ہیں۔ ان حضرات سے التماس ہے کہ وہ کاروباری معاملات میں انتظامیہ کو خط لکھا کریں اور نظم و نثر کے بارے میں ادارے کو تحریر کریں۔ آغا صاحب اپنی علالت کے باعث کوئی ڈاک نہیں دیکھتے اور نہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں۔

(ادارہ)

آخری قسط

مولانا امین احسن اصلاحی

نظمِ قرآن

تیسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان کی (بالخصوص اس زبان کی جس میں قرآن ہے) کچھ خصوصیات ہیں، جو صرف اسی زبان کے ساتھ خاص ہیں، بلیغ عربی زبان میں تعبیر مدعا کے لیے الفاظ کا سہارا اسی حد تک لیا جاتا ہے، جس حد تک ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ کلام کا عیب ہے۔ جس کو قائل کے عجز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ نہایت ذہین تھے، اس وجہ سے وہ کلام کے اندر سے ان تمام اجزا کو حذف کر دیتے تھے۔ جن کو ایک ذہین سامع خود سمجھ لیتا ہے یا اسے سمجھ لینا چاہیے

زمانۂ نزولِ قرآن کے ادب اور قرآن کے مطالعے سے اس حذف و ایجاز کے بہت سے اصول سامنے آتے ہیں۔ جو ایک فنی ترتیب کے ساتھ میرے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی ایک کتاب ـــــ کتاب الاسالیب ـــــ میں جمع کر دیئے ہیں۔ میرے لیے ان تمام اصولوں کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک بات محض بطور مثال عرض کرتا ہوں، جس سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا، جس کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے اور اہلِ عرب کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم ایک بات کے بعد جب دوسری بات اس کی دلیل یا اس کی مثال یا اس کے نتیجے یا اس کی تکمیل یا اس سے استدراک یا کسی اور جہت سے متعلق کہیں گے تو اس رابطہ کو لازماً ظاہر کریں گے، جو دونوں کے تعلق کی نوعیت کو واضح کرے اس مدعا کے لیے ہماری زبان میں بہت سے الفاظ اور اسلوب ہیں، جن کا سہارا لیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔

اہلِ عرب کا طریقہ اس معاملے میں ہمارے طریقے سے بالکل مختلف ہے، وہ اس طرح کے مواقع میں زیادہ اعتماد سامع کی ذہانت پر کرتے ہیں اور رابطے کو حذف کر دیتے ہیں، کہ سامع کا ذہن خود اس خلا کو بھر لے گا۔ اہلِ عرب اس حذف و ایجاز کو کلام کا حسن اور اس کی بلاغت قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہی چیز ہمارے لیے نظم کی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ہم کلام کی مخفی کڑیوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہر بات کو الگ الگ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اس میں تمام علمِ اولین و آخرین ہے، اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں، یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لیے تمام صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی۔ قوموں کے بعد قومیں اٹھیں گی۔ ان میں سے جو اس کی طرف رجوع کریں گی، وہ سب اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصہ پائیں گی، لیکن سب کے حصہ پانے کے بعد اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سمندر سے ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے، قیامت تک سب مل کر بھی اس سے زیادہ اس کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ سارا خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس کی نوعیت کسی سپاٹ کتاب کی نہیں ہے کہ آپ اس کو دو چار مرتبہ پڑھ لیں، اور اس کے اندر جو کچھ ہے۔ اس کو اخذ کر لیں۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک معدن کی سی ہے۔ جس کے اندر جتنی ہی گہری کھدائی کی جائے، اتنے ہی اس سے خزانے پر خزانے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک دو بار پڑھ لینے کی ہدایت نہیں ہوئی، بلکہ بار بار مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں تلاوت کرتے رہنے اور اس پر برابر تدبر کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی۔

قرآن کا نظام بحیثیت مجموعی

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق ہر سورہ کے اندرونی نظم سے ہے۔ یعنی ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے۔ اس کا ایک علیحدہ عنوان و موضوع (عمود) ہے۔ اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا

ہوں، کہ قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آسکتا ہے۔ لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور و تدبر سے سامنے آتا ہے۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر بالاجمال روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کے ظاہری پہلو پر نظر ڈالیے۔

قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو

اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی، کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں۔ جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔ پہلا گروپ فاتحہ فاتحہ سے سے شروع ہوتا ہے۔ مائدہ پر ختم ہوتا ہے اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے۔ باقی چار مدنی ہیں دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال اور توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلی ۱۴ سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورۂ نور ہے۔ جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم اپنی تفسیر میں مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۸ سورتیں مکی ہیں، آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ مکی ہیں اور آخر تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہوتا ہے اور تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلی سات مکی ہیں، اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورہ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے۔ لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں، اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب جو صاحب علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین علیہ السلام، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے۔ ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ کرامؓ بھی رمضان میں قرآن کریم سنتے سناتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ ساتوں گروپوں کی تلاوت اگر بار بار غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس کی ترتیب کی بہت سی حکمتیں واضح ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

(۱) جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہوتا ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اس جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہوتی ہیں مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس اشتراک کے ساتھ ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہوتی ہے الگ الگ ہر گروپ کے موضوع پر بحث کے لیے موزوں جگہ یہاں نہیں ہے بلکہ تفسیر میں ہر گروپ کی تمہید میں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اتنی بات ذہن میں رکھیے، کہ کسی گروپ میں قانون و شریعت کا رنگ غالب ہے کسی میں ملت ابراہیم کی تاریخ اور اس کے اصول و فروغ کا کسی میں کشمکش حق و باطل اور اس کے بارے میں سنت الٰہیہ کے بیان کا حصہ نمایاں ہے۔ کسی میں نبوت و رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات کا کسی توحید میں اور اس کے لوازم و مقتضیات اجاگر ہوئے

آئیں گے جس میں بعث اور عشر و نشر اور ان متعلقات آخری گروپ منذرات کا ہے جو تر ان مکی سورتوں پر مشتمل ہے جو جھنجھوڑ نے ریجگانے والی ہیں۔ اور جنہوں نے پورے عرب ن ہلچل برپا کردی۔

۲) ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں، اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہم رنگ ہیں، وہ اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت رکھتی ہیں جو مناسبت کسی رخت کی جڑ اور شاخوں میں ہوتی ہے۔

۳) ہر سورہ زوج زوج ہے۔ یعنی ہر سورہ پنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں ں، اسی طرح کی مناسبت ہوتی ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک ں جو خلا ہوتا ہے، دوسری اس خلا رکو بھرتی ہے، ایک میں جو پہلو مخفی ہوتا ہے۔ دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے اور اس طرح دونوں مل کر چاند و سورج کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی سورتوں یں اس کو بقرہ اور آل عمران کی مثال سے اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کی مثال سمجھئے۔ قرآن یں یہ نظام بالکل کائنات کے نظام کے مشابہ ہے س کائنات میں بھی ہر چیز جوڑا ہے۔ یہ بات بھی ور کھنے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں ں بالعموم سورتوں کی تلاوت میں اس نسبت کو حوظ رکھتے تھے۔ سورہ قیامہ اور دہر، سورہ صف ور سورہ جمعہ، اعلیٰ اور غاشیہ عموماً آپ نمازوں ں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

) صرف سورہ فاتحہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ س کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ درحقیقت پورے ن کے لیے بمنزلہ دیباچہ ہے۔ اس سورہ کی ر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اس نے اپنے پورے قرآن کے بنیادی حقائق جمع کر لیے ے اپنے گروپ کے لیے بھی دیباچہ کی حیثیت ہے۔ اور پورے قرآن کے لیے بھی۔ اس کے مختلف ناموں میں سے ایک نام کافیہ بھی ہے اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خود مکتفی سورت ہے یہ اپنے ساتھ کسی دوسری سورت کے ملنے کی محتاج نہیں ہے۔

(۵) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں، جن کی حیثیت ضمنی سورت کی ہے یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق سورہ کی کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال سورہ حجرات ہے جو اپنی سابق سورہ کی ایک آیت کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس کی وضاحت آئے گی۔

(۶) ہر گروپ پر الگ الگ تدبّر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے۔ کہ ہر ایک کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدار سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوتے ہیں۔ البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہوتا ہے، نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہوتے ہیں۔

(۷) یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو دوسرے تمام گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور منذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انذار سے مقصود درحقیقت لوگوں کو غلط راہ سے موڑ کر صحیح راہ پر لگانا ہے اور شریعت کی راہ ہے۔ اس وجہ سے جو چیز غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر سب سے پہلے نگاہ پڑنی چاہیے۔ اُمت کو بحیثیت امت مسلمہ جو دولت عطا ہوئی ہے وہ درحقیقت شریعت ہی ہے جو اہل کتاب سے اس امت کو منتقل ہوئی۔ اس وجہ سے پہلے گروپ میں اہل کتاب کی معزولی بھی بیان ہوئی اور شریعت اسلامی کی تفصیل بھی۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا، کہ قرآن کے پہلے گروپ اور اس کے آخری گروپ میں وہی نسبت ہے جو نسبت ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتی ہے جہاں تک تعمیر کا تعلق ہے۔ تعمیر پہلے بنیاد ہوتی ہے۔ لیکن عمارت ہو چکنے کے بعد سامنے جو چیز آتی ہے وہ عمارت ہوتی ہے، بنیاد نیچے ہوتی ہے۔

جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بیساختہ میرا ذہن "ولقد آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم" (۸۷۔ حجر) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس آیت سے متعلق چونکہ بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ اس وجہ سے اس پر مفصل گفتگو اپنے مقام پر ہی ہو .... سے گی۔

بقیہ:۔ پنجاب یونیورسٹی

ہم انتہائی دردِ دل کے ساتھ صوبائی حکومت کے انقلابی سیاست دانوں سے عرض کریں گے کہ وہ حقائق کو حقائق کی حیثیت سے پرکھیں۔ دوسری طرح کوئی بیل منڈھے نہیں چڑھتی بلکہ جذبات کا سانپ زہریلا ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے دوستوں کو اس امر کا اندازہ نہیں کہ طلبار کا مزاج کیا ہے؟ اور وہ کیا چاہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ طلبار کی بہت بڑی اکثریت پاکستان سے دلی لگاؤ رکھتی ہے اور اسلام سے کسی حالت میں دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور جو لوگ انہیں مادی نظریوں میں گھسیٹ رہے اور اس غرض سے کسی انقلاب کے داعی ہیں وہ نہ صرف پاکستان کی نئی نسلوں کو تباہ کر رہے ہیں بلکہ پاکستان کا حقِ دوستی ادا نہیں کر رہے۔ راستہ ایک ہی ہے کہ برسرِ اقتدار سیاستدان طلبار میں اپنے فلسفہ کی آبیاری چھوڑ دیں سیاسی مداخلت نہ کریں۔ یہی ایک شگفتہ، مستحسن اور صالح راستہ ہے۔ سیاست دانوں کو اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ اس طرح وہ نہ صرف طلبار کے مستقبل کو آگ لگا رہے ہیں بلکہ پاکستان کا حقِ دوستی بھی ادا نہیں کر رہے۔ آخر طلبار میں سے ان آوارہ مزاج نوجوانوں کو اپنا مشیر بنانے کی کیا ضرورت ہے جن کے متعلق اس حقیقت ثابتہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ملک میں نراج کے شہ پارے ہیں۔ اور ان کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔

ترجمہ عبدالعزیز خطیب بھٹائی

شاہ عبداللطیف بھٹائی

(آخری قسط)

الغرض شاہ صاحب غیر معمولی خوبیوں اور بڑی صفات حمیدہ کے مالک تھے آپ کا عارفانہ کلام انسانی زندگی کے لیے ایک مستقل پروگرام اور پیغام ہے۔ جس میں انسانی اور اخلاقی قدروں کی تکمیل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

چونکہ شاہ صاحبؒ نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے، اس لیے ان کا کلام خدا پرستی اور نیکوکاری کے ساتھ ساتھ انسانیت دوستی کی بھی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے مذہبی تعصب، تنگ نظری اور منافرت سے بلند و بالا ہے، ان کا کلام انسانوں سے باہمی خلوص و محبت نیز ہمدردی پر آمادہ کرتا ہے نیز ان کے کلام اور پروگرام کا تعلق نہ کسی عارضی دور سے تھا، نہ ہی کسی خاص حلقہ اثر سے متعلق تھا بلکہ بقول ڈاکٹر ایچ ٹی شورلی،

"شاہ لطیف کا کلام اس قابل ہے کہ اس سے ہر شخص فائدہ اُٹھائے۔"

لیکن افسوس ہے کہ شاہ صاحب کا کلام جس زبان سندھی میں ہے، اس کے جاننے والے تک شاہ صاحب کے تعلیمات اور ان کے عارفانہ کلام کی عظمتوں سے ابھی تک بے بہرہ ہیں، اب ہم آخر میں شاہ صاحب کے کچھ ملفوظات درج کرتے ہیں۔

ملفوظات شاہ لطیف بھٹائیؒ

"دغا اور مکر و فریب سے دور رہو، وگرنہ تم محض نام کے مسلمان کہلاؤ گے، جھوٹ کبھی بھی نہ بولو۔ اپنے دوستوں کے گھر بار بار مت جاؤ، کیونکہ ہلکا پن اور تمہاری عزت و وقار کے خلاف ہے، اور پڑوسیوں کے لیے بے محل گفت گو کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔"

"یہ دنیا فانی ہے، بالآخر رب واحد ہی کیطرف لوٹنا ہے، اس لیے دنیا کی عارضی لذتوں پر ریجھ کر تم آخرت کو فراموش نہ کر دو۔ اس دنیا میں زبانی طور پر ہر شخص تمہارا دوست کہلاتا ہے لیکن آڑے وقت میں وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں خلوص اور قربانی کا مادہ لوگوں میں مفقود ہو گیا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ شہرت اور ناموری ترک کر کے سرخرو اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر اس دنیا سے سدھارو، تو خود غرضی اور بغض و کینہ سے اپنا دل پاک رکھو۔"

"دنیا میں زندہ رہ، جتنا وقت تمہیں ملتا ہے اسے ضائع مت کرو، بلکہ اپنے دینی اور دنیاوی فرائض بجا لاؤ۔ گزرا ہوا وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔ اس لیے اپنا فرض وقت پر سرانجام دیتے رہو، تاکہ پچھتاوے کے دن، روز حشر تمہیں پچھتانا نہ پڑے، دعا اور عبادت اگر تم کثرت سے نہیں کر سکتے تو تھوڑی ہی کر لیا کرو، یہ غفلت اچھی نہیں ہے بُرے لوگوں کی صحبت سے کنارہ کش رہو، وگرنہ بُروں کی بُری عادتیں اپنا کر تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔ مصائب و آلام میں بلند حوصلہ رہو اور صبر و بردباری سے کام لو۔ گھبرانے سے کام بگڑ جاتے ہیں۔ مصیبت زدہ کی وہی مدد کرتا ہے، جس میں جذبہ، ایثار و قربانی بھرا ہو، اور بنی نوع انسان کے بے لوث خدمت کا مادہ رکھتا ہو، وگرنہ عام طور پر سب لوگ اپنے ذاتی مفاد ہی کے لیے کوشاں ہیں۔"

"قضا و قدر کے سامنے انسان بے بس ہے تقدیر کے آگے تدبیر بے کار ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو بھی عطا ہو، اس پر راضی برضا رہو، حسب و نسب اور اپنی نسل پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی فضیلت اور رتبہ جسے چاہے بخشدے وہ قادر مطلق اور غالب کُل ہے۔



مولانا ولایت اللہ صاحب صدر جمعیت ... شاہ عبداللطیف ... کے عرس ... سے خطاب کر رہے ہیں۔

سوالات و جواب

سوال: کیا یکسوئی کے لیے تنہائی شرط ہے؟

جواب: لوگوں کے مزاج اور طبعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض لوگ تو ایسے ہنگامہ پسند واقع ہوئے ہیں کہ جب تک حالات پُرسکون ہوتے ہیں، ان کا دل بجھا بجھا سا اور طبیعت مری مری سی رہتی ہے سوائے لیٹے رہنے کے وہ کوئی کام اور کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن جہاں ان کے سکون میں فرق آیا ان کی طبیعت جولانیوں پر آجاتی ہے۔ ایک صحافی سے ملنے کا اتفاق ہوا، باتوں باتوں میں ہم نے اس سے پوچھا کہ آپ کے قلم سے جو مضامین نکلتے ہیں۔ اُن پر آپ کن اوقات میں طبع آزمائی کرتے ہیں؟ اس صحافی نے جواب دیا کہ صحافت میں اوقات کے تعین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم ہر وقت کیل کانٹے سے لیس رہتے ہیں۔ پریس کے مشینوں کی کھڑ کھڑ ہو کر لوگوں کا شور وشغب اس کا اثر ہمارے قلم کے فراٹے پر نہیں پڑتا بلکہ اس سے ذہن کو ایک قسم کی غذا ملتی ہے۔ ہم نے اس سے صحافی سے پوچھا تو پھر آپ یکسوئی نہیں رہتے؟ یہ صحافی ہنسا اور اس نے کہا یہ خوب رہی ــــــ،

آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں یکسوئی نہیں چاہتا، بھلا یکسوئی کے بغیر کوئی کام ہو سکتا ہے؟ ہاں البتہ چیز یہ ہے، کہ میری نظر میں یکسوئی کے لیے تنہائی ضروری نہیں، یہاں تو یہ عالم ہے کہ اگر کبھی خلوت نصیب بھی ہو جاتی ہے تو اسے بھی ہم انجمن ہی سمجھتے ہیں ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب ہم نے اس صحافی کا حال رکھا وہ لوگ بھی [illegible] کا تعلق زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہے ان [illegible]

کا جی بھی تنہائی میں اکتا جاتا ہے وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ احباب کے ہنستے، بولتے اور مسکراتے چہرے نگاہوں کے سامنے ہوں اور اس حسین و جمیل ماحول میں دل و دماغ کی پوری تازگی کے ساتھ کسی نہ کسی موضوع پر طبع آزمائی ہو رہی ہو، مصائب و آلام نے جب کسی کو ہر چہار طرف سے گھیر رکھا ہو تو ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ اسے یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ کوئی دماغی کام نہیں کر سکتا۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بعض شہرۂ آفاق تصانیف جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں لکھی گئی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ ہر حال میں یکسوئی کا ماحول پیدا کر لیتے ہیں، ان کے لیے تنہائی شرط نہیں۔ یکسوئی کی مشق بہم پہنچانے کے لیے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے؟

(۱) راتوں کی نیندیں اپنے اوپر حرام کر دیتے ہیں، حالانکہ نیند ایک قدرتی تقاضا ہے اور اسے پورا نہ کرنا کسی صورت میں بھی مفید نہیں ہو سکتا سکتا۔

(۲) زندگی کے تفریحی مشاغل میں صرف ہونا چاہیئے، اسے بھی یکسوئی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ــــــ،

(۳) دماغ حاضر ہو یا نہ ہو، ادق سے ادق کتاب کے مطالب پر توجہ صرف کر دیتے ہیں۔

(۴) کسی مسئلہ پر غور و خوض کرتے وقت جب انہیں اپنے دماغ سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ تو وہ یہ نہیں سوچتے، کہ آیا ہم نے دماغ کے کل پرزوں کو تیل بھی دیا ہے یا نہیں؟

سوال: دماغی توازن اور خود اعتمادی کے جوہر کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟

جواب: دماغی توازن اور خود اعتمادی لازم و ملزوم ہیں اگر کسی کے اندر خود اعتمادی کا جوہر ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا دماغی توازن بھی صحیح ہے خود اعتمادی خود اعتمادی کی صلاحیت ایک انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے بارے میں ہر قسم کے منفی تصورات کی نفی کرتا ہے نیز:

(۱) وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ میں دوسروں سے کس حیثیت میں کم ہوں۔

(۲) خواہ وہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اس کا بھی ایک مقام ہے اور

جس مقصد کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے، اس سے خود ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

(۳) احساس کمتری کبھی اس کے دل و دماغ پر قابو نہیں پاتا۔

(۴) اگر حال میں اس نے کوئی نمایاں خدمت سرانجام نہیں دی تو وہ اس سے پست حوصلہ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مستقبل کا وسیع میدان ابھی ناسپردہ ہے، اس میں نقش قدم ابھر سکتی ہیں۔

(۵) اگر اس سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو وہ ندامت سے زیادہ اس کے ازالے پر زور دیتا ہے، وہ جانتا ہے کہ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟

سوال: کسی کے ساتھ دوستی کس صورت میں برقرار رہ سکتی ہے؟

جواب: اپنے دماغ میں یہ بات بٹھا لینی چاہیئے کہ ہر انسان میں صرف اچھائیاں ہی نہیں ہوتیں، برائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر کسی کے اندر یہ خوبی ہے کہ وہ برائیاں نظر انداز کر سکتا ہے تو دنیا میں ہر شخص سے اس کے دوستانہ تعلقات قائم ہو سکتے ہیں، یہ خوبی آسانی سے پیدا نہیں ہو سکتی، اس کے لیے بہت بڑے ایثار کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص ان کوتاہیوں پر قابو پا لے۔ تو ہر شخص اُسے اپنا دوست سمجھے گا، خواہ اسے اس دوستی کا علم ہو یا نہ ہو۔ یہ کوتاہیاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) کسی کے ناشائستہ افعال پر دلآزار انداز میں تنقید

(۲) کسی کی طرف سے خواہ مخواہ یہ بدگمانی کہ وہ احساس برتری کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے اسے حقیر نظر آتے

ہیں ـــــ

(۳) اپنے بارے میں یہ خیال کہ میرے قول و فعل میں ہم آہنگی ہے اور دوسرے میرے پاسنگ بھی نہیں۔

(۴) ہمیشہ اپنے مفاد کے درپے رہنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ اس کے اوپر دوسروں کے حقوق بھی ہیں

(۵) اپنے اوپر کسی کی تنقید گوارا نہ کرنا۔

(۶) کج خلقی اور طوطا چشمی سے دامن انسانیت الجھا کرنا حالانکہ چاہیے یہ کہ اخلاقی اعتبار سے اپنی عادات و خصائل کے آئینے پر کچھ اس انداز سے ہم صیقل کریں کہ دوسرے ایک ہی نظر میں فریفتہ ہو جائیں۔

سوال: قوت فیصلہ کسبی ہے یا وہبی؟ اگر کسی میں اس قوت کا فقدان ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب: قوت فیصلہ وہبی یا خداداد صلاحیت نہیں ہے یہ قوت کسبی ہے، ہر شخص کے اندر پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ:

(۱) یہ سمجھے کہ جس طرح دوسروں میں کچھ صلاحیتیں ہیں میرے اندر بھی ہیں۔

(۲) جب لوگ اپنی محنت و قابلیت سے کسی کام پر قابو پا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ میں نہ پاسکوں۔

(۳) جب میرے پہلو میں دل ہے اور مجھے سوچنے کے لیے دماغ بھی ملا ہے تو میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتا ہوں اور اپنے لائحہ عمل کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ بھی کر سکتا ہوں۔

سوال: کامیاب زندگی کے کچھ اصول بیان کیجیے

جواب: حال پر ماضی کی پرچھائیں نہ پڑنے دو، کامیاب زندگی اسی کی ہے جو حال کی تعمیر ہر حال میں مقدم سمجھتا ہے۔

★ جب کچھ کرنا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہ اسے خوش اسلوبی سے سرانجام دیا جائے۔

★ جو شخص منزلِ مقصود تک رسائی چاہتا ہے، اسے صرف ایک ہی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہیئے مختلف راہوں میں بھٹکنے سے کوئی فائدہ نہیں

★ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر ساعت و ہر لحظہ شاہراہ ترقی پر گامزن رہیں۔

★ بہترین تعلیم وہ ہے جو جدوجہد اور کاوش اور کاہش کا حاصل ہو۔

★ کامیاب زندگی کے تین اصول یہ ہیں:۔

(۱) خود پذیری (۲) خود گزینی (۳) خود درندی

تحریر: معتبہ یونس حسنی

اختر شیرانی کا فن

یہ گیت ظاہری ہیئت کے اعتبار سے غزل کے انداز میں ہے لیکن ترنم اور نغمگی، ہندی الفاظ کے فنکارانہ استعمال اور عورت کے لطیف و نازک جذبات کی عکاسی نے اس گیت کو بڑا دل آویز بنا دیا ہے۔ طویل بحر میں ایسی روانی مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ چھوٹی بحر کے ایک گیت "پردیسی سے" کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔ اس گیت میں سادہ اور بے تکلف جذبات کی پیش کشی اور زبان میں روزمرہ کا لحاظ قابلِ غور ہے سے

میں تو الہڑ بھولی بھالی
گاؤں کی سادہ رہنے والی
من تھا مورکھ پریم سے خالی

من تھا مورکھ تو تھا سیانا تو تھا سیانا اور پردیسی
بھول نہ جانا او پردیسی او پردیسی بھول نہ جانا

ایک اور گیت "پردیسی کی پریت" کا ایک بند دیکھیے۔ تشبیہات کا دیہاتی ماحول اس کو کس قدر فطری بنا دیتا ہے سے

پردیسی سے دل کا لگانا بہتے پانی میں ہے نہانا
کوئی نہیں ندی کا ٹھکانا
رستے جوگی کس کے میت

پردیسی کی پریت ہے جھوٹی جھوٹی پردیسی کی پریت

گیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ گایا جا سکے۔ گویا بغیر راگ کے گیت کا وجود بے معنی ہے گویا دورِ جدید میں ایسے ادبی گیت بکثرت لکھے گئے ہیں جن کا مقصد تخلیق گانا نہیں ہے لیکن گیت ہمیشہ سے گائے جانے کے لیے ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ اس لیے ادبی گیتوں کو کبھی عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ البتہ گائے جانے والے گیت قبولِ عام سے سرفراز کیے گئے ہیں۔ اختر کے گیت گائے جانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ گائے جانے والے گیت موسیقی سے غیر معمولی شغف کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے۔ اختر گیت کے بولوں کو بھیروں اور راگوں کا پابند رکھتے ہیں۔ نغمۂ حرم میں ایک گیت "پنہاریاں" بھی شامل ہے۔ یہ گیت گائے جانے والے گیت کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔ اس کو دیکھ کر موسیقی میں اختر کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے اختر کے دوسرے گیتوں سے نمونے پیش کرنے کی بجائے ہم یہ پورا گیت نقل کر رہے ہیں سے

پنگھٹ پر پنیا بھرن کو آئی پنہاری
پنگھٹ پر

روپ انوکھا سج دھج نیاری مد بھری انکھیاں میں متواری
سندر صورت پیاری پیاری

پنگھٹ پر پنیا بھرن کو آئی پنہاری
گورے گورے ہاتھ سجیلے کالے کالے نین نشیلے
میٹھے میٹھے ہونٹ رسیلے

پنگھٹ پر پنیا بھرن کو آئی پنہاری
چاند سا مکھڑا، بالی عمریا دیکھنے والے بھولیں ڈگریا
پنگھٹ پر پنیا بھرن کو آئی پنہاری
پنگھٹ پر!

ماہیا

ماہیا پنجاب کا مقبول ترین عوامی گیت ہے۔ اردو فارسی یا ہندی وغیرہ میں کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں جو اس سے مماثلت رکھتی ہو۔ لیکن ماہیے کی صنفی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ہم اسے اردو غزل، مستزاد اور گیت کی ملی جلی خصوصیات کا حامل سمجھ سکتے ہیں۔ غزل کی طرح ماہیے کا بنیادی موضوع بھی داستانِ حسن و عشق ہے۔ اس میں بھی غزل کی سی جامعیت ہوتی ہے اور حیات و کائنات کے مسائل کو ساغر و مینا کے انداز میں بڑی خوبی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اپنی اسی موضوعاتی وسعت کی بنا پر ماہیا عرصہ دراز سے پنجابی میں رائج چلا آتا ہے لیکن اس کی جاذبیت میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ماہیے کی موضوعاتی وسعت کے بارے میں احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں :

"رموزِ حسن و عشق کے علاوہ اس میں فلسفہ و نفسیات تک کے نکات مل جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ان پڑھ چرواہا ماہیا کے روپ میں جو تنومند فکری نظریہ پیش کرتا ہے، وہ شیکسپیئر، گوئٹے، غالب اور اقبال کے ہاں ہی مل سکتا ہے۔ اور پھر یہ نظریہ کتابی مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اسے زندگی کی حقیقتیں اور بے نقاب فطرت کی ناز آفرینیاں پیدا کرتی ہیں سے

جوڑا اداناں دا مڈھ توں نہیں کوئی اتبار نہ پاناں دا
(ملیوں کی ایک جوڑی ہے) (رشتے کو مضبوطی سے جکڑنا چاہیے کیونکہ بھنگیوں پر تو اعتماد کیا ہی نہیں جا سکتا)"

ماہیے کا ہر شعر اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شعر میں ایک علیحدہ مضمون باندھا جاتا ہے اور ردیف و قافیہ کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے

ماہیا اردو اور فارسی کی غزل سے بہت قریب ہے۔ لیکن غزل اور ماہیے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غزل کا ایک شعر مکمل دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن ماہیے میں ڈیڑھ مصرع ہوتا ہے۔ یعنی ایک مکمل مصرع اور ایک باوزن مستزاد۔ جو مکمل مصرعے کا ہم ردیف وہم قافیہ ہوتا ہے۔ لیکن اردو مستزاد اور ماہیے میں بھی فرق ہے۔ مستزاد میں ایک مکمل مصرع ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک ٹکڑے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ماہیے میں مستزاد کا ٹکڑا شعر کے لیے ردیف قافیہ فراہم کرتا ہے اس لیے وہ پہلے رکھا جاتا ہے اور مکمل مصرع بعد میں جیسا کہ درج بالا شعر سے ظاہر ہے۔ مستزاد اور ایک مصرعے کا مل کر ایک شعر ہوتا ہے جسے کلی کہتے ہیں۔ ماہیے میں اس قسم کی کئی کلیاں ہو سکتی ہیں جن کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ لیکن ہر کلی مضمون کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ گویا ماہیے میں بھی وہی شوریدگی ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ ماہیے کا آہنگ گیت کے آہنگ سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ عوامی گیت ہے اور گائے جانے کے لیے لکھا جاتا ہے اس لیے لَے اور غنائیت اس میں بنیادی چیز ہے۔ نازک اور رسیلے الفاظ کا استعمال بھی اسے گیت کے قریب لے آتا ہے۔ لیکن اختصار، جامعیت، اشاریت اور موضوعات کی رنگارنگی اس میں غزل کی سی کیاری اور اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔

ماہیے میں دو ٹکڑے ہوتے ہیں چھوٹا ٹکڑا اکثر بے معنی اور مکمل مصرعے یا اصلی کلی سے غیر متعلق ہوتا ہے۔ اس کا کام اصل کلی کے لیے ردیف قافیہ فراہم کرنا ہے اور بس۔ اصل کلی معنی کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہے اور اس کا ردیف و قافیہ سختی کے ساتھ ابتدائی ٹکڑے کا پابند ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کلی ـ

چولا شاہیے دا   کمل نہیں پریا کھرا ایچ دیسی ماہیے دا

(اے بے پروا تو نہ چل ورنہ میرے محبوب
کا نقش قدم مٹ جائے گا)

کبھی کبھی ماہیے کی ابتدائی کلی کے مفہوم میں ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ماہیے میں جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آجکل اس قسم کے ماہیے اکثر سننے میں آتے ہیں۔ ایک ایسا مربوط اور بامعنی ماہیا دیکھئے ـ

خط آیا یار داوں   کونجاں وچھڑیاں جیویں کرلاون پاریوں

(میرے محبوب کی طرف سے خط آیا ہے)   (اس خط کی کیفیت ایسی ہے جیسے دریا کے اس پار ڈار سے بچھڑی ہوئی کونجیں کرلاتی ہوں)

اختر کو پنجاب کی سرزمین نے اختر بنایا۔ اس سے انھیں بڑی محبت تھی۔ اس لیے ایک پنجابی لوک گیت سے متاثر ہونا ان کے لیے تعجب کی بات نہیں۔ پھر ماہیے کی غنائیت نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا حسن پسندی ان کے مزاج میں داخل تھی ہی۔ ان سب باتوں نے مل کر ان کو اردو میں ایک نئی صنف سخن کا موجد بنا دیا۔ اختر کے کلیات میں کل دس ماہیے ہیں۔ جن میں چالیس کلیاں ہیں اور یہ ایسی تعداد ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اختر نے ماہیے کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اس میں جہاں اسے اردو کے مزاج سے قریب لانا مقصود تھا وہیں اپنی ایک کمزوری کا اخفا بھی ملحوظ تھا۔ اختر جو نظم نگاری نے جو تفصیل پسندی اور مسلسل بیانی کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔ وہ منتشر خیالات کو جامع انداز میں پیش کرنے میں مانع ہوتا تھا۔ اسی لیے غزل میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ماہیے میں بھی انھیں یہی دشواری درپیش تھی۔ چنانچہ ان کے ماہیے منتشر ہونے کے بجائے مربوط ہیں۔ ابتدائی کلی اور اصل کلی کا مربوط ہونا تو ماہیے کے حسن و لطافت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے لیکن اس کی مختلف کلیوں کا باہم مربوط ہونا ماہیے کے مزاج کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس سے اختر کے ماہیوں کی معنویت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ان میں تلوار کی سی کاٹ پیدا ہو گئی ہے لیکن نشتر کی سی وہ آبداری کہاں جو زخم دے کر کسک بھی چھوڑ جاتے۔

ماہیے میں تسلسل پیدا ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس کی ہیئت بھی کسی قدر بدل جائے۔ چنانچہ اختر نے ماہیے کی ہیئت میں بھی تصرف کیا ہے۔ ان کے ہاں ماہیے کی پہلی کلی ان کے مربوط ماہیے کا مطلع ہوتی ہے۔ اس کا ابتدائی ٹکڑا ماہیے کے لیے بنیادی ردیف اور قافیہ مہیا کرتا ہے دوسرے شعر کا ابتدائی ٹکڑا اسی ردیف و قافیہ کا پابند ہوتا ہے لیکن بنیادی کلی کا آخری ٹکڑا اسی ردیف و قافیہ پر مشتمل ہوتا ہے جو مطلع کے ابتدائی ٹکڑے نے فراہم کیا تھا۔ اس طرح ہر شعر میں خیال کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ اختر کے ماہیے کی ہیئت کو واضح کرنے کے لیے ہم ان کا ایک مکمل ماہیا "سوالات" پیش کر رہے ہیں ـ

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں
کیوں چھیڑتے ہیں مجھ کو کیوں مجھ کو ستاتے ہیں؟
چپ چپ سے وہ رہ رہ کر
کچھ آنکھوں میں کہہ کہہ کر کیوں مجھ کو ہنساتے ہیں؟

باقی صفحہ ۳۴ پر

بقیہ: اختر شیرازی

تنگ آئی ہوں عادت سے
ہر وقت شرارت سے کیوں مجھ کو ستاتے ہیں؟

اظہار محبت سے
اقرار محبت سے کیوں مجھ کو بناتے ہیں؟

جب ہوتی ہوں رنجیدہ
تب ہو کے وہ رنجیدہ کیوں مجھ کو مناتے ہیں؟

کرتی ہوں گلہ جب میں
ہوتی ہوں خفا جب میں کیوں پیار جتاتے ہیں؟
وہ جب کبھی آتے ہیں

بعض ماہیوں میں اختر نے ایک اور تکنیک اختیار کی ہے۔ ردیف اور قافیہ فراہم کرنے والے ٹکڑے کو انہوں نے بنیادی کلی سے قبل اور اس کے بعد بھی دوہرایا ہے۔ اس طرح ایک شعر کے تین حصے کر دیئے ہیں۔ ابتدائی ٹکڑا۔ بنیادی کلی اور پھر ابتدائی ٹکڑا۔ مطلع کے بعد کے اشعار میں نیا ابتدائی ٹکڑا فراہم کیا ہے۔ اصل کلی کا ابتدائی حصہ ردیف و قافیہ کا حامل ہے۔ اور یہ اسی ابتدائی ٹکڑے کے ردیف و قافیے کا پابند ہے لیکن آخری حصے کا ردیف و قافیہ مطلع کے ابتدائی ٹکڑے کا پابند ہے۔ اس کے بعد مطلع کا ابتدائی ٹکڑا دوہرایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس قسم کا ایک ماہیا ملاحظہ کیجیے ؎

دل ہم کو لٹا بیٹھا، ہم دل کو لٹا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

مت جا کے یہ بیٹھے ہے
اس عشق میں بیٹھے ہیں ہم ہوش اڑا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

دم عشق کا بھرتے ہیں
ہم یاد انہیں کرتے ہیں وہ ہم کو بھلا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

لکھا تھا یہ قسمت میں
آخر کو محبت میں ہم جان گنوا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

اس تکنیک کی وجہ سے کہیں کہیں صنعت ترصیع پیدا ہو جاتی ہے جس سے حسن کلام میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے لیکن جہاں یہ صنعت پیدا نہیں ہوتی وہاں بھی نغمگی مزید برقرار رہتی ہے۔

اختر کے ماہیوں میں اشعار کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ چھ کلیوں پر مشتمل ماہیئے لکھے ہیں گویا ان کے نزدیک مربوط ماہیے میں اختصار ضروری ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اختر کے ماہیئے رموز حسن و عشق پر ہی مشتمل ہیں۔ ان میں جہاں مردوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے وہیں عورتوں کے احساسات کی ترجمانی سے بھی غفلت نہیں برتی ہے۔ کہیں کہیں فکری موضوعات بھی نظم کر دیتے ہیں لیکن ان کی نوعیت فلسفیانہ نہیں ہے یہ زندگی کے عملی تجربے کے حامل ہیں۔ اور یہ تجربے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے ایک چرواہے کو بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان میں عمومیت اور سادگی ہے ؎

غم خانۂ ہستی میں
اس خواب کی بستی میں جو چیز ہے فانی ہے
دو دن کی جوانی ہے

اک خواب شبانہ ہے
آہوں کا فسانہ ہے، اشکوں کی روانی ہے
دو دن کی جوانی ہے

اختر کے ماہیوں میں تسلسل کی فراوانی نے یقیناً ایک خامی پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ان کے یہاں معنویت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پھر اختر کے ماہیئے اردو میں ابتدائی نمونے ہیں۔ اختر کی اہمیت دراصل اس میں ہے کہ انہیں اس صنف کو اردو میں منتقل کرنے میں اولیت حاصل ہے۔

بقیہ: سید عبداللہ

نے بہت لیکن انہی میں خارجی طور پر زیادہ سرگرم نہیں رہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مفکر تھے اور ان کا عمل ان کی فکری کاوش تھی اور ان کی طبیعت عملی سیاست سے مانوس نہ تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کا یوں اعلان کیا ہے ؎

ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظ رنگین نوا نے راز یہ فاش

گرت ہواست کہ با خضر ہمنشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چو آب حیواں باش

مگر اس علیحدگی تنہائی اور خلوت نشینی کے باوجود اقبال نے سیاسی تحریکوں کو بہت متاثر کیا ہے، جس طرح روسو اور والٹیر فرانس میں ایک زبردست انقلاب کے پیشرو ثابت ہوئے اسی طرح اقبال بھی ایشیا میں ایک عظیم الشان ذہنی انقلاب کے پیامبر ثابت ہوں گے۔ اور پاکستان..... ایک اسلامی وطن کی تخلیق تو اب ایک حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔ آئندہ کے انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

چٹان
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ـــ شمارہ ۱۳

۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء

قیمت ـــ ایک روپیہ

قلم کی آواز

یا صورِ اسرافیل یا نغمۂ جبرئیل

کسی چیز کو چھپایا جائے اور کتنے ہی پردوں میں رکھا جائے تو وہ معدوم نہیں ہوتی اور نہ زائل ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد جو چیز قومی خسران کا باعث ہوئی وہ اخبارات پر سرکاری تصرفات کا آغاز تھا۔ جو شخص اقتدار میں نہ ہو خواہ زمانۂ اقتدار میں ہمارا جانی دشمن رہا ہو ہم اس کے خلاف شاذ ہی قلم اٹھاتے ہیں اور نہ ہر شخص مخاطبت کا مستحق ہوتا ہے بہر حال یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ صحافتی آزادی پر سب سے پہلے جس شخص نے چھاپہ مارا وہ خواجہ شہاب الدین تھے جو نہ تو سیدھی بات کرنا جانتے تھے اور نہ اُن کی طبیعت کا یہ شعار تھا۔ انہوں نے ملک بھر میں تقریباً سبھی اخبار اپنی جیب میں ڈال لیے۔ صرف دو تین اخبار آزادیٔ تحریر کے نام پیارہ گئے۔ خواجہ صاحب کی "دُعا برکت" سے اخبارات کا ایک عجیب و غریب سانچہ تیار ہوا۔ ہمیں آج تک یاد ہے کہ پی، این، ای، سی میں کیونکر کراچی کے دکشنہ ڈرائیوروں اور کوچوانوں کو لاکر سیفٹی ایکٹ کے تحت کارروائی کرنے کا اختیار حاصل کیا گیا اور کیسے کیسے اُمّ علم لوگ پی، این، ای، سی کی مجلسِ عاملہ میں شامل کئے گئے۔ اس وقت پاکستان کے تمام ایڈیٹروں میں حمید نظامی، فیض احمد فیض، زیڈ اے سلہری اور شورش کاشمیری ایک طرف تھے دوسری طرف وہ سب لوگ تھے جنہیں آج نظریۂ پاکستان کا درد ستاتا ہے۔ قارئین کرام جانتے ہیں کہ اس کے بعد صحافت پر کیا بیتی۔ کراچی میں بڑے بڑے اخبار تھے لیکن اُن کا ذہنی میلان بہر وجوہ دوست کی طرف تھا۔ اندرون سندھ کوئی ممتاز و نمایاں اخبار نہ تھا۔ بلوچستان کا انحصار بھی سندھ کی طرح کراچی کے اخبارات پر تھا۔ پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ نے وزارت کی واحد آواز "نوائے وقت" کا گلا گھونٹ کر باقی اخبارات کو ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی بنا لیا تھا۔ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" دولتانہ کے ہاتھ میں نہ تھے لیکن اُن کا مزاج اور اُن کی روش مرکزی یا صوبائی حکومتوں کے لیے ایسی نہ تھی کہ وہ اُن کے لیے خطرناک ہوں۔ بہر حال وہ اپنی وضع کے آزاد اخبار تھے، صوبۂ سرحد میں قابلِ ذکر ایک ہی اخبار روزنامہ "شہباز" تھا اور وہ خان عبدالقیوم خان کی سرّوں میں دُکھ پیدا کرتا تھا۔ خان صاحب نے پورا صوبہ ایک جیل خانہ بنا رکھا تھا اور یہ صورتِ حال خوشگوار نہ تھی گو آزادیٔ تحریر کی ہوائیں چلتی تھیں لیکن جو لوگ مستقبل پر نگاہ رکھتے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ ان ہواؤں کے بعد سموم و صرصر کے دور کا آغاز ہوگا۔ خواجہ شہاب الدین نے اخبارات کو عبادت کی بلندی سے گرا کر صنعت کے غار میں پھینک دیا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اقتدار کی مسند پر فروکش ہوئے تو انہوں نے صحافت کی روایتوں کو اپنے اقتدار کے بل پر تہس نہس کر ڈالا۔ سب سے پہلے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی مالکانہ حیثیت ختم کی گئی۔ اُن پر سرکاری قبضہ ہو گیا پھر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے وہ سلوک ہوا جو بردہ فروش مغویہ لڑکیوں سے کرتے ہیں کئی چہرے خریدار ہو کر دستبردار ہو گئے۔ بالآخر اس ملک کے صنعت کاروں کی ملی بھگت سے نیشنل پریس ٹرسٹ بنایا گیا جو ہر کا بدولت مدار کی داشتہ تھا۔ ہم نے اس زمانے میں لکھا تھا کہ صنعت کاروں نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے عفریت کو پیدا کر کے اپنے لیے کوئی تحفظ حاصل نہیں کیا۔ یہ سانپ بالآخر انہیں ڈسے گا اور یہی ہوا۔ پچھلے چار سال میں صنعت کاروں سے بڑھ کر ملک میں کوئی درماندہ طبقہ نہیں۔ اُن کی مٹی خراب کرنے میں سب سے زیادہ حصہ ٹرسٹ کے اخباروں ہی نے لیا۔ ایوب خان کے دور میں صحافت کا شدید ترین صدمہ حمید نظامی کی موت تھا وہ ملکی صحافت کی ویرانی کے ہاتھوں جوان مرگ ہو گئے۔ اجتماعی نقصان یہ پہنچا کہ صحافت صنعت و تجارت ہو کر رہ گئی اور ایڈیٹر اہلکار ہو گئے۔ ایک زمانے میں ایڈیٹر قلم کی آبرو تھے۔ ایوب خان نے انہیں تاجر و ملازم بنا دیا اور صحافیوں میں یہ عقیدہ رواج پا گیا کہ اخباروں میں وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے اور نہ اپنے دل کے محسوسات پیش کرتے ہیں بلکہ جس ادارے کے

ملازم ہوتے ہیں اُن کے خیالات کی خدمات بجا لاتے ہیں۔ وہ ملازم ہیں صحافی نہیں۔ جب ایوب خان بکھڑی کے مرحلے میں تھے اخبارات کا یہ حال تھا کہ وہ حقائق کے اظہار سے کنی کتراتے سچائیوں سے آنکھیں بند رکھتے عوام سے منحرف ہوتے اور جھوٹ سے اپنے صفحات کا پیٹ بھرتے تھے۔ اس زمانے میں اخباروں نے کتنے ہی "لیڈر" پیدا کئے لیکن ایوب خان کا سنگھاسن ڈول گیا تو تمام لیڈر پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئے اُن کی مثال ہوائی اخباروں کی تھی ہوا نکل گئی تو ختم ہو گئے۔ ایوب خان کے اس دور میں اخباروں نے اپنے رنگ و روغن میں خوب اضافہ کیا۔ پیسہ بھی خوب کمایا لیکن قوم کو قربوں کی کہانیاں سنائیں۔ عیاشیوں کے افسانے لکھے اور جمود و انحطاط کی روداویں قلمبند کیں۔ اس دور کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ سچائی کو چھپاتے اور دروغ کو اچھالتے تھے۔ نتیجۃً مواد اندر ہی اندر پکتا رہا پھر جب آتش فشاں پہاڑ یکایک پھٹا تو اخباروں نے بھی عوامی دباؤ کے جھٹکے محسوس کئے۔ ایوب خان کی سیاسی لاش کو قلم سے زدوکوب کیا لیکن یہ اُس وقت ہوا جب ایوب خان کے اقتدار کا عالم نزع تھا اور سنکرنا نہیں جانتا کہ ٹرسٹ کے اخبار ایوب خان کو ماس موبلنڈ کی حیثیت سے پیش کرتے اور ہر چھوٹی بڑی تقریب پر اُن کی بڑی سے بڑی تصویر چھاپ کر ثواب دارین حاصل کرتے تھے۔ یحییٰ خان آگئے تو ہر ایڈیٹر بخوبی جانتا تھا کہ اُن کے صبح و شام کیونکر بسر ہوتے ہیں لیکن جب تک وہ اقتدار میں رہا اُس کی پرستش کی گئی ادھر اُس کے اقتدار کا سورج ڈوبا ادھر اُس کے شب و روز برہنہ ہو کر سامنے آگئے۔ پھر اُس کے رقص و سرود کی تصویریں چھاپی گئیں۔ اقلیم رانی کی داستان لکھی گئی اور شیشہ و سبو کا ذکر چھیڑا گیا۔ پھر ان اخباروں کے نزدیک یحییٰ خان عصر حاضر کا سب سے بڑا عیاش و اوباش تھا۔

ہمیں یقین تھا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چونکہ عوام کے منتخب نمائندہ ہیں اُن کے سیاسی تیوروں

ہفت روزہ چٹان لاہور

میں جوش و خروش ہے وہ ایک ذہین و فطین سیاستدان ہیں انہیں عوام پر اور عوام کو اُن پر اعتماد ہے لہذا وہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیں گے اور صحافت کی آزادی بحال کر کے اُس کو عوام کے جذبات سے آگاہی کا ذریعہ بنائیں گے، لیکن نہ جانے یہ چیز کیوں نہ ہوئی؟ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جہاں کئی ایک انقلابی اقدام کئے وہاں نیشنل پریس ٹرسٹ کو ختم کرنے سے کیوں اجتناب کیا اور اب تک وہ اس بارے میں کیوں غور نہیں فرماتے؟ ہم سے ہزار گنا بڑھ کر خود مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جانتے ہیں کہ جب وہ ملک کو عوامی جدوجہد کے بال و پر دے رہے تھے تو ان اخباروں کا اُن کے ساتھ کیا سلوک تھا جس طرح ہندو عورت اپنے خاوند کا نام نہیں لیتی نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبار مسٹر بھٹو کے انقلابی و اثباتی تذکرے سے گھبراتے تھے لیکن مسٹر بھٹو جانتے ہیں کہ ملک بھر کے اخبارات اکٹھے ہو کر بھی اُن کی تحریک کو شکست نہ دے سکے اور جب حقیقتیں اُبھر کر سامنے آئیں تو صدر ایوب کا سورج ڈوب رہا تھا۔ یحییٰ خان کا دُمدار ستارہ بھی غروب ہو گیا اور پاکستان کی جمہوری سیاست کے اُفق پر مسٹر بھٹو طلوع ہو گئے۔ لیکن نیشنل پریس ٹرسٹ کا شغل اب بھی وہی ہے وہ سب کچھ لکھتے ہیں لیکن جو مسائل ملک کو در پیش ہیں اور جن واقعات میں سے عوام گزر رہے ہیں اُن کے بارے میں مُہر بلب ہے اور یہ وہی چیز ہے جس سے ہم ایوب خان اور یحییٰ خان کے ادوار میں دوچار تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کی خدمت یہ نہیں کہ اخبارات تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کریں اور خود احتسابی کا شکار ہوں۔ اخبارات کا فرض ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی لائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ واقعات کا دھارا کیا ہے؟ حالات کس سمت جا رہے ہیں؟ اور قوم و ملک کی سیاسی ضرورتیں کیا چاہتی ہیں؟ مسٹر بھٹو کو اپنی ذہنی طاقت پر اعتماد کرنا چاہیئے اور اخبارات سے متعلق یہ طے کر دینا چاہیئے کہ اُن کی آزادی ملک و قوم کے لیے زیادہ مفید ہے۔ جمہوری سیاست کی روایت کے مطابق اخبارات قصرِ حکومت کا پانچواں ستون ہوتے ہیں۔ بے شک حکومت اپنے ذرائع سے عوام کے خیالات فراہم کرتی ہے لیکن خیالات کی فراہمی کا بہترین ذریعہ اخبارات ہیں جب ملکی اخبارات تعمیری جذبے کے تحت مختلف رعائتوں، انشائیوں اور حکائتوں کو حکومت کے نوٹس میں لائیں گے تو اُس سے ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا اور حکومت کو اصلاح احوال میں آسانی ہوگی۔ بہرحال ہم اتنی بات عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اخبارات کی بہت بڑی اکثریت قوم کے جذبات سے مختلف مزاج رکھتی ہے۔

قادیانی اُمّت کی شوخیاں

حکومت اِن کا نوٹس لے

جب سے قادیانی اُمت کو پاکستان کی نیشنل اسمبلی نے متفقہ طور پر خارج از اسلام قرار دیا ہے اور اُس کی حیثیت پاکستانی اقلیت کے طور پر متعین ہو گئی ہے۔ ہم نے اکثر و بیشتر یہی لکھا ہے کہ اب مرزائیوں کو جان و مال کا تحفظ دینا ہمارا قانونی فرض ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان معاشرے میں غیر مسلم اقلیتوں کے لیے جو تحفظات مقرر کیے ہیں انہیں بجالانا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ لیکن یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ مرزائیوں نے اپنی آئینی حیثیت کو قبول نہیں کیا۔ اور وہ بدستور قرآن و سنت کے استخفاف کو اپنا لازمۂ حیات بنائے بیٹھے ہیں۔ کہ عالمی استعمار سے گٹھ جوڑ کے بعد ان کے حملے روز بروز بے قابو ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ہوں نے اپنا لٹریچر دوبارہ چھپانا پھیلانا اور بٹنا شروع کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں ان کے ایک مقامی ہفتہ وار نے اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق مدیر چٹان کو فحش گالیاں دیں۔ ہم نے اس کا نوٹس لیا۔ حکومت کو توجہ دلائی کہ وہ الفضل ربوہ کے اس ہم زلف کو روکے بصورت دیگر نتائج و عواقب کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی۔ ہم اس سلسلے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن زبان پر اس لئے نہیں لاتے کہ حکومت کے لیے اس مسئلے میں لاء اینڈ آرڈر کی کوئی سی شکل پیدا کرنا ہمیں پسند نہیں نہ یہ کوئی اچھی بات ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنی غیرت ایمانی ضرور دی ہے کہ ہم الفضل

ہفت روزہ چٹان لاہور

کے لاہوری ہم زلف کو ایسا سبق دیں کہ وہ خود اعتراف کرے کہ اُس نے جو کچھ لکھا وہ اسی سزا کا مستحق تھا۔ ماہنامہ الفرقان ربوہ نے اس سلسلہ میں ہمارے ایک خط کو اپنے ایک اداریہ کا موضوع بنا کر حقائق سے انحراف کیا ہے۔ ہم اُس کا جواب تو پچھلے شمارہ میں دے چکے ہیں اس پر اور کچھ لکھنا بے معنی ہوگا۔ اگر بحث و نظر کا دائرہ اصولی ہو تو ہم اس پر معترض نہیں۔ لیکن اگر مرزائی جرائد یا اُن میں سے کوئی ایک سب و شتم پر تل جائے تو ہم یہ سوچنے اور کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ حکومت اس بارے میں کیا کر رہی ہے۔ اگر حکومت کوئی ایکشن نہ لے اور مرزائی قلمکار بے لگام ہوتے چلے جائیں تو پھر طمانچہ بر رخسار یزید، ہمارا طبعی حق ہے اور یہی عین اسلام ہے۔

حیرت ہے کہ اقلیت قرار پا جانے کے بعد بھی میرزائی اُمت ڈنڈ پیل رہی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت ۷ ارمارچ کا الفضل ربوہ ہے اُس کے صفحہ اوّل پر "ایک ضروری وضاحت" کے تحت جناب مدیر یا جماعت قادیانیہ کے کوئی صاحب رقم طراز ہیں۔

"شناختی کارڈ حاصل کرنے کا جو فارم پُر کرنا پڑتا ہے اُس میں ایک خانہ "مذہب" کا ہے۔ اسی طرح سکولوں میں داخلہ کے لیے فارموں میں بھی "مذہب" کا خانہ ہے۔ بعض اور فارموں میں بھی ہوگا۔ متعلقہ افسران اصرار کرتے ہیں کہ احمدی اپنے آپ کو غیر مسلم درج کریں۔ اُن کا یہ مطالبہ غیر آئینی اور بالکل غیر منصفانہ ہے۔"

اس سلسلہ میں الفضل نے ایک چوکھٹے میں آئین پاکستان کی دفعہ ۲۰ کی سرخی لگا کر آئین کی حسب ذیل دو شقیں نقل کی ہیں۔

ا ۔ ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اختیار کرے اور تشہیر کرے۔

ب ۔ ہر مذہبی فرقے کو حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی ادارے قائم کرے۔

بے شک یہ آئین کی دفعہ ۲۰ ہی کی دو شقیں ہیں۔ لیکن سوال تو اپنے مذہب کا ہے۔ نہ کہ دوسرے مذہب میں سرقہ کرنے کا! یہ بھی صحیح ہے کہ ہر مذہبی فرقہ اپنے ادارے قائم کر سکتا ہے لیکن ان داروں میں اُس کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے مذاہب کا مال چرا کر اپنی دکان چلائے۔ میرزا غلام احمد کے پیرو اگرچہ اسلام کی رُو سے مرتد ہیں لیکن جب آئین پاکستان نے انہیں "اپنے مذہب" کا تحفظ دیا ہے تو ان کو لازم ہے کہ اپنے مذہب ہی میں رہیں نہ کہ اسلام کے گنج شائیگاں کی چوری کر کے اپنے خزف ریزوں کو گوہر نایاب بنانے کی جسارت کریں۔

اس سلسلہ میں الفضل نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر کے حسب ذیل فقرے نقل کئے ہیں۔ واضح رہے کہ وزیر اعظم نے یہ تقریر ۷ ستمبر کو نیشنل اسمبلی میں کی تھی۔

"ہم دورِ جدید میں رہتے ہیں۔ ہمارا آئین

کسی مذہب و ملت کے خلاف نہیں۔ ہم نے پاکستان کے تمام شہریوں کو یکساں حقوق دیئے ہیں۔ ہر پاکستانی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ پورے اعتماد سے بغیر کسی خوف کے **اپنے** مذہبی عقائد کا اظہار کر سکے۔ پاکستان کے آئین میں پاکستان کے شہریوں کو اس امر کی ضمانت دی گئی ہے۔"

ہم نے اس اقتباس میں **اپنے** کے لفظ کو جلی کر دیا ہے۔ بات وہی ہے کہ مرزائی اپنے عقائد کے محدود رہیں اور اسلام سے تلعب نہ کریں۔ یہ ان کی دیدہ دلیری ہے کہ وہ اپنی کوئی سی متاع نہیں رکھتے۔ اسلام کے ایوان میں گھس کر چوری کرتے اور مرزا غلام احمد کی نبوت کا کھڑاگ رچاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مرزائی قادیوں کے بادشاہ ہیں۔ انہیں غلط فہمی ہے کہ وہ دو چار لاکھ ہو کر عالمی استعمار کی شہ پر اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی غیرت دینی سے کھیل سکتے ہیں۔ ہم اگر آئین کی پابندی کرتے ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں کوئی سی بدامنی گوارہ نہیں کرتے۔ اور دستور کی بنیادوں کے خلاف سر اٹھانا حب الوطنی کے مصداق ہے۔ بہتر یہی ہے کہ مرزائی اپنے اعمال و افکار پر نظر ثانی کریں۔ اُن کے ساتھ اس ملک کا اسلامی ضمیر نہیں۔ اگر ایک دو ضمیر فروش ڈائری نویس صحافی ان کے ساتھ ہیں یا چند لادین افسران کی جیب میں ہیں تو وہ مسلمانوں کے نمائندہ نہیں۔ اپنے پیٹ اور اپنے نفس کے نمائندہ ہیں۔ ہم نے آج تک ان لوگوں کا لحاظ ہی کیا ہے۔ اب زیادہ دیر شاید مروت نہ کر سکیں۔ اگر یہ نام نہاد صحافی اپنی روش سے باز نہ آئے تو پھر انہیں بے نقاب کرنا ہمارا دینی فرض ہوگا اور ہم انہیں مسلمانوں کے سامنے اسی طرح بے نقاب کر دیں گے جس کی ایک دھندلی سی تصویر غالب کے اس شعر میں ہے ؎

تھی بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

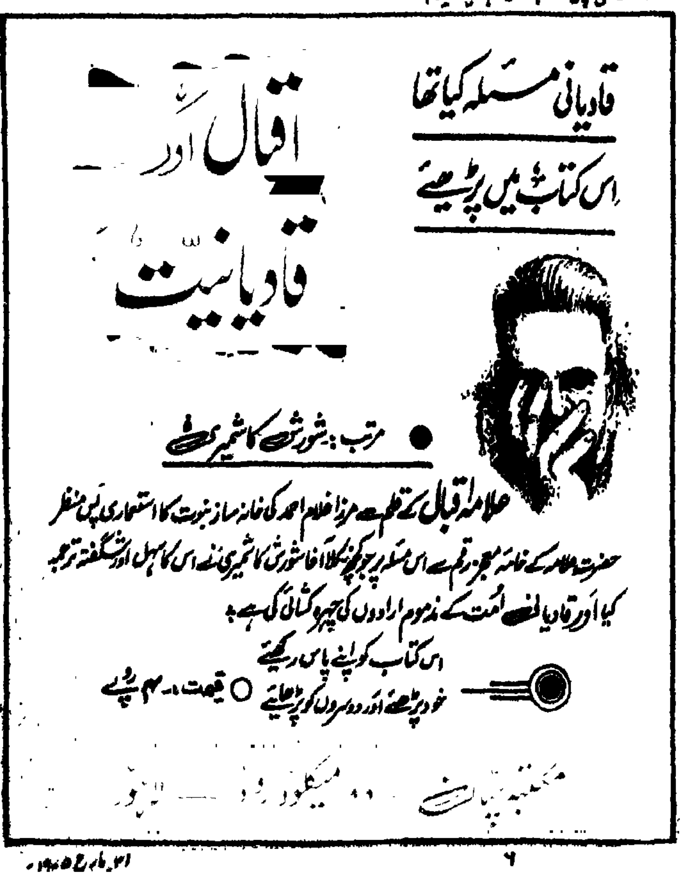
ہفت روزہ چٹان لاہور

[illegible]
پھر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہیے۔ ہم حکومت پاکستان سے متفق ہیں کہ وہ ان کا نوٹس لے۔ جب ایک گروہ کو آئین نے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے تو یہ غلط ہے کہ وہ اس کو تسلیم کرنے میں شوخیاں کرے اور سواد اعظم کے مقابلہ میں ڈٹا رہے۔ اس لحاظ سے مرزائی نہ صرف آئین کے مجرم ہیں بلکہ پاکستانی قوم کے بھی مجرم ہیں۔ گویا وہ دستوری و قومی لحاظ سے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک طرف حکومت سیاسی اعتبار سے اپنی حریف جماعتوں کو سانس نہیں لینے دیتی اور اُس نے محض سالمیت کا نام لے کر نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے حتیٰ کہ اس کا مقدمہ بھی سپریم کورٹ کو پیش کر دیا ہے۔ لیکن جو جماعت اسلام کی وحدت کے خلاف ہے اور جس اعتقاد پر مسلمان قوم قائم ہے اس میں نقب لگاتی ہے اس جماعت کو اپنی خرافات اگلنے کی کھلی چھٹی ہے اور وہ دستور کے فیصلے کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ تو یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے والے گروہ کو کھلی چھٹی دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

[illegible] سر چڑھا ہوا ہے
کوئی حد بھی ہے آخر احترامِ آدمیت کی

ہم مرکزی حکومت سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قادیانی جماعت کو مزید انتباہ کرے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ مرزائی اس ملک میں انتشار پیدا کر کے بیرونی طاقتوں کی ملی بھگت سے سیاسی انقلاب لانا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کے دماغ کا واہمہ ہے۔ اُن کی ساری اہمیت کوئی ہے تو اس قدر ہے کہ حکومت ان سے مروت کر رہی ہے اور اُن سے تعرض نہیں کرتی ورنہ مرزائی امت میں نہ حوصلہ ہے نہ طاقت اور نہ کسی اعتبار سے وہ اتنی صاحب حیثیت ہے کہ حکومت کی نگاہ کے خلاف جا سکے۔

ہم اب تک مرزائیوں کو یہی مشورہ دیتے رہے ہیں کہ وہ آئین کا فیصلہ قبول کر لیں۔ اگر انہوں نے اپنی شرارت جاری رکھی تو ہم یہ مطالبہ حکومت سے کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ اس فرقہ کو خلافِ دستور قرار دے کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔



سال اقبال کے ۴۰ اہم مقالات

بیسواں مقالہ

از ڈاکٹر سید عبداللہ

پنجاب یونیورسٹی میں علامہ اقبال کے چند عقیدت مند

میں سلسلۂ گفتگو کو توڑتے ہوئے آج
مہ اقبال کے چند عقیدت مندوں کا تذکرہ کرتا ہوں
حضرت علامہ کے فیض سے تحریک پاکر پنجاب
یونیورسٹی میں علم و تحقیق کے ایک اہم دبستان کے
ئے، یہ حضرات تھے، پروفیسر ڈاکٹر مولوی
شفیع، پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اقبال اور حافظ محمود
شیرانی۔ انھوں نے اپنے دور (۲۰ تا ۴۰ء)
مسلم تشخص کی بیداری میں حصہ لیا۔

چند دن ہوئے، میں نے ان کے متعلق ـــ
علم شرق شناسی کے زیر اہتمام پاکستان نیشنل سنٹر
ایک مقالہ پڑھا تھا۔ میں اسے نذر قارئین کرام
رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ ان بزرگوں کے کارنامے
در اصل فیض اقبال ہی کا ثمر ہے۔

بزم شرق شناسی میں، میں نے عرض کیا کہ آج
تقریب کا اہتمام استاد بزرگ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع
میں کیا گیا ہے جو ۱۹۶۳ء میں ۱۳ اور ۱۴ مارچ
درمیانی شب میں فوت ہوئے اور ۱۴ مارچ کی
سپرد خاک ہوئے۔ ان کے فرزند، شاگرد اور
ت ان کے بارے میں مضمون پڑھیں گے
لیکن یہ حقیقت ذہن نشین کرانی ضروری ہے
مرحوم کو فرد واحد سمجھنا غلط ہوگا، وہ ایک
تھے اور میر انجمن بھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں
کے زیر اثر اہل علم و تحقیق کا ایک ایسا گروہ
جمع ہو گیا تھا، جسے شرقیات کا دبستان لاہور کہہ
دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی سرپرستی میں
کلکتہ میں۔۔۔۔۔۔۔ اور علامہ شبلی نعمانی کے زیر اثر
اعظم گڑھ میں مشرقی و اسلامی تحقیق کی ایک خاص
روایت ملک میں موجود تھی۔

۱۹۱۸ء کے بعد جدید انداز تحقیق و تدوین کی
ایک نئی روایت لاہور میں پروفیسر محمد شفیع نے
پیدا کی، جس میں ان کے رفقاء پروفیسر حافظ ڈاکٹر
محمد اقبال (پروفیسر فارسی پنجاب یونیورسٹی) اور پروفیسر
حافظ محمود خان شیرانی بھی شریک اور سرگرم ہوئے

ان تینوں بزرگوں کی مثال اور تحریک سے
لاہور میں محققین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔
جس میں پروفیسر عبدالعزیز بار ایٹ لاء (مصنف
مغلوں کا منصبداری نظام)، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
(فنون اسلامی کا محقق) خان بہادر مولوی ظفر حسن
(ماہر سکوکات) پروفیسر سراج الدین آذر (مشہور
استاد، ماہر موسیقی اور قلمی کتابوں کا جمع کرنے والا)
پروفیسر فضل الدین قریشی (البیرونی کی کتابوں کا محقق)
ڈاکٹر وحید مرزا (امیر خسرو کی سوانح و تصانیف
کا محقق) ڈاکٹر محمد ناظم (محمود
غزنوی کا سوانح نگار)، قاضی فضل حق، ڈاکٹر سعید الدین
پروفیسر میترا۔۔۔۔۔۔۔۔ ان بزرگوں کے شاگرد
میں ڈاکٹر برقی، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ
صوفی تبسم، غلام ربانی عزیز، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار
ڈاکٹر غلام یلسین خان نیازی۔۔۔۔۔۔ وغیرہ نے
اپنے اپنے انداز میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔

آج کی تقریب میں ضمنی طور پر، مذکورہ بالا
محققین میں سے بعض اکابر پر بھی مختصر تقریریں
ہوں گی، تاکہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کو اپنے رفقاء کے
حلقے میں دکھایا جائے۔

ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ شرقیات کے
دبستان لاہور کے بارے میں کچھ مواد جمع ہو جائے
اس کے علاوہ، اس عظیم دبستان کی عظیم علمی تحریک
کی صحیح قدر و قیمت سے، موجودہ علمی دنیا کو آگاہ
کیا جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آج جبکہ قدریں بھی
بدل چکی ہیں اور روایات کی یادیں بھی ختم ہو رہی
ہیں، لاہور کی تاریخ کا یہ باب بھی رقم ہو ہی جائے
تو اچھا ہے۔

میں لاہور کے جس دور کا ذکر کر رہا ہوں وہ
مسلم تشخص کی بیداری کا دور تھا، اس کی صحیح تصویر
دیکھنے کے لیے مقابلے کے دو منظر دیکھیے،

ایک منظر سے انگریزوں اور ہندوؤں کے
تسلط کا تصور دلانا مقصود ہے، دوسرے سے
مسلم قومیت کی بیداری کا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کا
شعبۂ تاریخ ہے، اس میں تحقیق کی ساری توجہ سکھوں

کی تاریخ پر ہے، حکمت عملی یہ ہے کہ سارا تاریخ کو چھوٹے چھوٹے رسالوں کے زمانے کی کہانی پہ تفصیل مرتب ہو۔ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر سیتا رام کوہلی ظفرنامہ رنجیت سنگھ ایڈیٹ کر رہے ہیں۔ سارے ریسرچ سکالر سکھی دور کی تاریخ پر لگے ہوتے ہیں یونیورسٹی لائبریری میں جو ماخذ جمع کئے جا رہے ہیں وہ بھی اس دور سے متعلق ہیں۔ گویا مسلم شعور کو دبایا جا رہا ہے۔ آثار قدیمہ کا مطالعہ و اکتشاف بھی مسلمانوں کے عہد سے غافل ہے۔ عجائب گھروں میں مسکوکات اور دوسرے طوائف و ظرائف بھی اس دائرے سے خارج ہیں۔ اورینٹل کانفرنسیں ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے اجتماعات ہوتے ہیں ان میں اسلامی تاریخ و تہذیب و ادب کو، صرف پچھلی صفوں میں معمولی نشست ملتی ہے۔

پھر یکایک مسلم تشخص بیدار ہوتا ہے —
بیک وقت دو دروازے کھل جاتے ہیں۔ —
ایک طرف بخاری و تاثیر اور نیاز مندانِ لاہور اردو ادب کو نئی نظر عطا کرتے ہیں، دوسری طرف شفیع، اقبال، شیرانی، مسلمانوں کے کلاسیکی علوم و فنون کے چراغ روشن کرنے لگتے ہیں ؂

گلستان کے تھے دونوں پتے ہرے
بہار اک طرف اک طرف ابر تھا (میرؔ)

اورینٹل کالج میگزین جاری ہوتا ہے، تحقیق کے نئے زاویے ابھرنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کے متن شائع ہوتے ہیں، تنقید شعر العجم اور پنجاب میں اردو جیسی کتابیں تہلکہ مچا دیتی ہیں قلمی کتابوں کی جستجو مشرب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فن تصویر کا مسلم دور ابھرنے لگتا ہے۔ خطاطی و مصوری کے محاسن اور معیار تصور ہونے لگے ہیں، فرامین جمع ہو رہے ہیں، وصلیاں اکٹھی کی جا رہی ہیں، مرقعے ڈھونڈے جا رہے ہیں ملک کے طول و عرض میں گم شدہ عمارات کی تلاش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ عمارتوں کے کتبے دیکھے جا رہے ہیں۔

یہ بہادر شاہ ہیں جو نوادر کی دکان پر بیٹھے ہیں یہ شائق مشتاق حسین ہیں، جو مخطوطات و فرامین کا ذخیرہ لیے بیٹھے ہیں یہ دین محمد خوش نویس ہیں، یہ عبدالمجید پرویں رقم ہیں۔ ..... یہ سنگی کتبہ ہے جو عہد غلامان سے تعلق رکھتا ہے، شیرانی اسے کہیں سے لائے ہیں اور شاگردوں کو دکھا رہے ہیں کہ یہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے یہ عبدالقیوم اور خواجہ عبدالوحید ہیں۔

یہ ادارہ معارف اسلامیہ ہے جو ہندو کانفرنسوں کی بدسلوکی کے رد عمل کے طور پر قائم ہوا ہے، یہ حبیب الرحمٰن شیروانی، حبیب یار جنگ، یہ سید سلیمان ہیں یہ سر فضل حسین ہیں، یہ سر عبدالقادر ہیں، یہ خلیفہ شجاع الدین ہیں، یہ عبداللہ یوسف علی ہیں جو اس ادارے کی کانفرنسوں کی صدارت کر رہے ہیں یہ شبلی بلگرامی ہیں، یہ نور الحق ہیں، یہ مولانا احمد علی لاہوری ہیں، یہ مولانا ندوی ہیں، یہ سید عبدالقادر، یہ ایم لطیفی ہیں اور یہ سید عبداللہ ہے جو یونیورسٹی کی عربی فارسی سوسائٹی کے جلسے کرا رہا ہے، ادھر پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال اور پروفیسر شیرانی ہیں جو علمی تحقیقی سرگرمیوں کی تنظیم میں مصروف ہیں ...... اور ان سب کے سلطان یہ علامہ اقبال ہیں، جس سے مسلم تشخص کی ہر تحریک کو رہنمائی ملتی ہے۔

اور اس دور میں ایک مجذوب حفیظ الرحمٰن ایسا بھی نکلتا ہے جو اردو میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی طرز کا ایک انسائیکلوپیڈیا تن تنہا مرتب کرنے تُل جاتا ہے ...... اور بالآخر اس کے سے اپنے گھر واقع پیسہ اخبار میں الماریوں کی الماریاں بھر دیتا ہے، یہ اولوالعزمی، یہ جاں فشانی، یہ محبت کسی بڑے جذبے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

آج ہم تشخص کی جستجو اس طرح کرتے ہیں، جیسے کوئی آسمان سے ٹپک پڑا ہو اور اسے اپنے شان نزول کا پتہ ہی نہ ہو .... پورے ایک ہزار سال کی تاریخ کے بعد کہ اس کا ایک ایک واقعہ زندہ و محفوظ ہے۔ یہ گم شدگی، یہ گم گشتگی بلکہ جہالت اس پر گریہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

بہرحال جسے اپنے تشخص کو قریبی تاریخ دیکھنا ہو وہ کم از کم ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کے اس عہد کو دیکھ لے، جس کے اندر سے تحریک پاکستان اور تشخص کا محسوس نشان بن گئی۔

غرض یہ پرانا لاہور تھا جس کی تاریخ ابھی رقم ہونی ہے، بزم شرق شناسی کی تمنا ہے کہ استاد مولوی محمد شفیع اور ان کے رفقاء ......

اور ان کے زمانے کے اہل کمال کی یاد کی تقریبوں کے ذریعے آہستہ آہستہ یہ سرگزشت مرتب ہو ...... آج کے اجلاس سے اس کی ابتدا ہے۔ آگے توفیق خدائے کارساز کے ہاتھ ہے۔

★ ★

جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین خان

عدلیہ کی آزادی اور اربابِ حکومت

قصہ شورش کاشمیری کی نظر بندی اور رہائی کا

ذیل کا مضمون جسٹس بشیر الدین خان کے قلم سے ہے۔ آپ اُس بنچ کے سینئر رکن تھے جس نے آغا شورش کاشمیری کی نظر بندی کے مشہور مقدمہ (۱۹۶۸ء) کی سماعت کی اور قانون و انصاف کا بول بالا کیا۔ دوسرے رکن جسٹس شوکت علی تھے۔ آپ آجکل پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ گورنر مغربی پاکستان جنرل محمد موسیٰ تھے اور ایڈ سید اکبر ایڈووکیٹ جنرل۔ اس واقعہ کی پوری روداد آغا شورش کاشمیری کی مشہور کتاب "موت سے واپسی" میں درج ہے جس سے ان سنگین واقعات کی پردہ کشائی ہوتی ہے۔ مسٹر ایس اے حق اُس زمانے میں صوبہ کے چیف سیکرٹری تھے اور جنرل موسیٰ کی ایک دو غیر حاضریوں میں ایکٹنگ گورنر بھی رہے۔ جنرل موسیٰ آغا شورش کاشمیری کو ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتے تھے۔ مسٹر ایس اے حق نے مرکزی حکومت کو بذمانہ یحییٰ خان جو خفیہ یادداشت لکھی اس سلسلہ میں اُس کا اہم اقتباس آغا صاحب کی کتاب "موت سے واپسی" کے صفحہ آخر میں مع ترجمہ درج ہے۔

ذیل کا مضمون معاصر عزیز "نوائے وقت" کی اشاعت مجریہ ۲۱ مارچ میں ادارتی صفحہ پر شائع ہوا ہے۔ ہم معاصر عزیز کے شکریہ سے چٹان کے صفحات میں نقل کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہوتا رہا اُس کی پوری کہانی "موت سے واپسی" میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔

عبدالسلام ملک
مدیر معاون

حال ہی میں آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کی کتاب "موت سے واپسی" میری نظر سے گذری۔ اس کے تجسب ہائی کورٹ کی توہین کی گئی کے زیر عنوان حصہ کی ایک اور کڑی میرے حافظہ میں محفوظ ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے سپردِ قلم کی جاتی ہے۔ میں بحیثیت جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے اس ڈویژن بنچ کا ایک رکن تھا جو نظر بند کی رہائی کے متعلق درخواست کی سماعت کر رہا تھا۔ آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کو گرفتاری کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان جیل منتقل کر دیا گیا۔ اس جیل کے انتخاب پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ وہاں نہ صرف سیاسی قیدیوں کے لیے سہولتوں کا فقدان ہے بلکہ عام علاج معالجہ کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ مزید یہ کہ نظر بند کے لواحقین کے لیے اس دور دراز مقام پر جانا اور اس سلسلہ میں کثیر اخراجات برداشت کرنا ناممکن ہے اس صورت حال کے پیش نظر ہم نے حکومت کا موقف معلوم کرنا چاہا اور خیال ظاہر کیا کہ مناسب ہوگا کہ اگر نظر بند کو پشاور منتقل کر دیا جائے جواب ملا کہ نظر بند کو کس جیل خانہ میں رکھا جائے یہ حکومت کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے اور اگر حکومت چاہے تو آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کو مچھ جیل میں بھی رکھ سکتی ہے۔ نیز حکومت نے یہ بھی کہا کہ اگر نظر بند کو پشاور منتقل کیا گیا تو اس صورت میں وہاں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ نظر بندی کے خلاف لاہور میں درخواست کی سماعت کے متعلق بھی حکومت کو یہی اعتراض تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ درخواست کی سماعت کراچی میں ہو لیکن نظر بند کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرے کیونکہ کراچی میں سماعت کا فیصلہ حکومت کی استدعا پر کیا گیا تھا۔ اس حکم کے خلاف حکومت نے اپیل کی لیکن ناکام رہی۔ نظر بند کا موقف یہ تھا کہ ایک وزیر نے اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان سے نظر بندی کے احکامات ذاتی مخاصمت یا رنجش کی بناء پر حاصل کئے تھے۔ اس موقف کی تائید یا تردید کے لیے اس وزیر کا بیان قلمبند کرنا ناگزیر تھا۔ حکومت کی کوشش تھی کہ اس وزیر کو بطور گواہ عدالت میں نہ بلایا جائے اور صدر مملکت نے بھی وزیر موصوف کو تحفظ کا یقین دلایا تھا (بحوالہ نوائے وقت ۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء)۔



بنچ کے دوسرے جج کی رائے کے مطابق جناب صدر نے ... میٹنگ میں یہ تک کہا کہ اگر کوئی جج ان کے ... کی طرف انگلی اٹھائے گا تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ ان تکلیف دہ حالات میں ہم کو گوناگوں مشکلات کا سامنا تھا۔ میں نے صدر پاکستان سے رابطہ قائم ... کی اور اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جانے کی درخواست کی۔ صدر محترم نے مجھ سے استفسار کیا کہ ... کے بعد مجھے استعفیٰ دینے کی نوبت کیوں آ پڑی ہے تو میں نے واشگاف الفاظ میں ان کو بتایا کہ ... کے صوبائی گورنر انصاف کی راہ میں جب بھی مخل ہوتے ہیں تو میرے لیے سوائے مستعفی ہونے کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ کراچی جا کر درخواست کی سماعت کرو نیز یہ بھی یقین دلایا کہ حکومت کی جانب سے کوئی مداخلت نہ ہو گی۔ ڈویژن بنچ کراچی گیا اور ایک روز سماعت کے دوران بنچ کے دوسرے جج اور سرکاری پیروکار کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد لاہور سے ٹیلیفون پر مجھے بحیثیت اس بنچ کے سینئر رکن کے یہ کہا گیا کہ میں بنچ کے دوسرے جج سے یہ کہوں کہ وہ درخواست کی سماعت سے دستبردار ہو جائیں۔ میں نے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ برابر کے جج ہیں اور میں ان کو یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔ اس پر یہ کہا گیا کہ اچھا سماعت جاری رکھیں۔ جب لاہور بنچ واپس آئے گا تو ان کو سمجھا دیا جائے گا۔ اس سمجھا دینے والی بات پر مجھے تعجب ہوا۔ سماعت اگلے روز پر ملتوی ہوئی۔ اگلی صبح پھر فون آیا اور یہ کہا گیا کہ سماعت کے دوران بنچ کوئی متنازعہ آرڈر پاس نہ کرے میرے استفسار پر یہ وضاحت کی گئی کہ متعلقہ وزیر کو بنچ بطور گواہ طلب نہ کرے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنچ کے دائرہ کار میں دخل دیا جا رہا ہے جو سراسر انصاف کے منافی ہے۔ میں نے بنچ کے دوسرے جج کے ساتھ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ ... ابتدائی سماعت کے دوران ہی ان کو ایک ... سماعت سے ... پیغام بھیجا جا رہا ہے

کہ درخواست مسترد کر دی جائے۔ مزید یہ پیغام بھی گورنر کی جانب سے ان کو پہنچا کہ اگر جج حکومت کو پریشان کرنا چاہتے ہیں تو حکومت بھی ان کو پریشان کر سکتی ہے۔ چونکہ ڈویژن بنچ نے حکومت کے نقطہ نظر سے اتفاق نہ کیا جس کی وجہ سے حکومت پر یہ بات واضح ہو گئی کہ بنچ متعلقہ وزیر کو بطور گواہ ضرور طلب کرے گا۔ اس کے بعد حکومت کے کارکنوں نے ایک ڈرامہ کیا جس کے نتیجہ میں ہم دونوں جج احتجاجاً نظربندی کے خلاف درخواست کی سماعت سے دستبردار ہو گئے۔ ہم لاہور واپس آ گئے۔ لاہور آ کر ان جج صاحب سے جو گورنر کی جانب سے پیغام لاتے رہے تھے میں نے علیحدگی میں اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔ میں حیران رہ گیا۔ دو ایک روز کے بعد شاید عید کے موقع پر ایک تقریب منعقد ہوئی تو میں نے من و عن جو کچھ بنچ کو کراچی میں پیش آیا تھا

... گیا اور سخت احتجاج کیا اور یہ بھی ذکر کیا کہ ایک جج صاحب گورنر کی جانب سے پیغام لاتے رہے تھے کہ درخواست ابتدائی سماعت کے دوران ہی خارج کر دی جائے۔ طے پایا کہ اس معاملہ کو اس روز وہیں ختم کر دیا جائے اور اگلے روز میٹنگ میں فیصلہ کیا جائے کہ آئندہ کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ میٹنگ ہوئی جس میں اس جج کا جو گورنر کی جانب سے پیغام لاتے تھے کا بھی ذکر کیا گیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ گورنر نے یہ تجویز کی تھی کہ ہم دونوں ججوں کو بیرون ٹریبونل پر بھیج دیا جائے لیکن اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ نیا بنچ جو تشکیل کیا گیا تھا درخواست کی سماعت نہ کر سکا کیونکہ نظربند نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ معاملہ کچھ دیر اسی طرح لٹکتا رہا لیکن بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور نظربند رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مسجد میں شراب

ساہیوال پولیس کے الٹے تلّے

راقم کراچی سے ملتان پہنچا تو اگلے دن ار فروری کو صبح سویرے یہ خبر سُنی، کہ آج رات ساہیوال کے دو دینی اداروں جامعہ رشیدیہ اور جامعہ فریدیہ پر پولیس نے چھاپہ مارا، دونوں جگہ سے اسلحہ اور بارود مسجد رشیدیہ کی صفوں کے نیچے سے "شراب کی بوتل" برآمد کی ـــــ خبر کچھ ایسی عجیب و غریب نوعیت کی تھی کہ سن کر عقل ہی سُن ہو جائے خیال ہوا شاید دینی درسگاہوں کے خلاف کسی نئی سازش کی تمہید تیار ہو رہی ہو گی، لیکن اگلے دن اخبارات کی شہ سرخیوں نے ساری حیرت دور کر دی اور یہ نیا انکشاف ہوا کہ پشاور سے کراچی تک کی تمام تعلیم گاہوں سے بھاری مقدار میں اسلحہ اور شراب برآمد ہوئی، اور گویا کالج اور یونیورسٹیاں درسگاہوں کی بجائے ناجائز اسلحہ کے گودام اور شراب کی بھٹیاں ثابت ہوئیں۔ فیا للعجب

تعلیم گاہوں کی حیثیت تو جو ہو سو ہو، لیکن "جامع مسجد" اور "شراب کی بوتل" کا باہمی ربط اب بھی عقل سے بالاتر ہی رہا۔ جامع مسجد کے نمازی مسجد میں نماز پڑھتے پڑھتے "شرابی" بن گئے؟ یا کسی "شرابی" کو بوتل سمیت مسجد میں سربسجود ہونے کی توفیق ہو گئی؟ یہ معمّا لاینحل ہی رہا۔ اور اس حادثہ میں ایک معاقی پہلو یہ بھی پیدا ہوا کہ راقم کئی سال تک اس "جامع مسجد رشیدیہ" میں ... کم از کم اپنے ۸ سالہ دورِ قیام میں تو یہی دیکھا

ہفت روزہ چٹان لاہور

کہ جامع مسجد کا کوئی نمازی شراب کے رنگ و بو سے آشنا نہیں ـــــ الٰہی، دو تین مہینے میں یہ کیا انقلاب آ گیا، کہ خانۂ خدا، شراب کی بوتلوں کا سٹور بن گیا؟

حیرت و استعجابات کے عالم میں ساہیوال کا سفر کیا۔ مولانا حبیب اللہ رشیدی ناظم اعلیٰ جامعہ رشیدیہ اور مولانا ابوالنصر منظور احمد شاہ مہتمم جامعہ فریدیہ سے ملاقات ہوئی اور اصل حقائق سامنے آئے۔

جامعہ رشیدیہ

جامع مسجد رشیدیہ میں پولیس نے کوئی ساڑھے تین بجے، جب کہ پورے شہر میں سناٹا تھا، مورچے سنبھالے، اور مولانا حبیب اللہ صاحب کو بالاخانہ سے طلب فرمایا، وہ لباس خوابی میں اسی طرح اتر آئے۔ دروازے پر پولیس کے سپاہی استقبال کے لیے حاضر تھے، خیال ہوا کہ غالباً گرفتاری کا کوئی پروانہ رات کی تاریکی میں آیا ہو گا، اس لیے معزز مہمانوں سے گزارش کی گئی، کہ آپ حضرات تیار ہو کر آئے ہیں اس لیے میں بھی تیار ہو کر حاضر ہو جاتا ہوں ـــــ بولے نہیں، آپ کو گرفتار کرنا مقصود نہیں۔ بس ذرا ڈی۔ایس۔پی صاحب کی بات سن لیجئے! وہ بہت اچھا کہ مسجد کے احاطہ میں ان کے ساتھ آ گئے۔ صاحب سے ملاقات ہوئی، ارشاد ہوا کہ مابدولت کو اطلاع پہنچی ہے کہ آپ کے مدرسہ میں کسی نے بم رکھ دیا ہے اور ناجائز اسلحہ بھی ہو گا، ہم تفتیش کے لیے آئے ہیں۔ تفتیش شروع ہو گئی، اوپر نیچے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھا، کچھ نہ ملا، چھوٹے بچوں کے اٹیچی کیس اور ٹرنک بھی کھول کر بکھیرے گئے۔ دو ایک چاقو نکل آئے۔ حاجی صاحب کے کمرے میں سبزی اور گوشت بنانے کی ایک دو چھریاں پڑی تھیں، وہ بھی "تحویل" میں لے لی گئیں۔ تہ خانے کی سیڑھیوں سے ہی واپس لوٹ آئے۔ پاس ہی مسجد کی صفیں رکھی تھیں۔ ایک سپاہی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ان صفوں کے نیچے کچھ ضرور ہو گا، صفیں ہٹانا شروع ہوئیں، ابھی دو تین صفیں ہٹائی گئیں کہ نیچے سے ایک کالی دار چاقو اور پانچ چھ اونس کی ڈیٹول کی آدھی شیشی برآمد ہوئی۔ جس میں سرخ رنگ کا محلول سا تھا۔ اسپرٹ کی بُو سی آ رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا مولانا! یہ کیا ہے؟ اور پھر خود ہی جواب بھی مرحمت ہوا کہ یہ شراب کی بوتل ہے۔

ناظم صاحب نے عرض کیا کہ صاحب یہ تو آپ حضرات ہی جانتے ہوں گے کہ یہ کیا ہے۔ ہمیں تو سرخ رنگ کی دوائی سی نظر آ رہی ہے۔

"نہیں! نہیں!! یہ شراب ہے"

"بہت اچھا وہی ہو گی"

اتنے میں ایک سپاہی اوپر سے آیا اور کہا

تھیں برآمد ہونے کے اوپر کا دوبارہ معائنہ کرنا
چاہئے، ابھی مسجد پر ہی نہ پہنچے تھے کہ مسجد
کے جنوبی و بیرونی دروازے کی دہلیز پر اسلحہ
طرح پڑا، دو ٹوٹے ہوئے پستول ایک بوسیدہ پیٹی
اور کارتوس۔ ناظم صاحب کو اٹھانے کا حکم دیا
گیا، انہوں نے معذرت کر دی۔

بالآخر یہ ناخوشگوار فرض جناب انسپکٹر صاحب
کو ادا کرنا پڑا۔ پولیس نے اپنی کارگزاری کا چارٹ
تیار کیا، مجسٹریٹ اور ناظم صاحب کے دستخط ہوئے
اور باہر سے لائے ہوئے دو سبزی فروشوں کے
بحیثیت گواہ مواہیر بھی ثبت کرائے اور تفتیش
کا عمل مکمل ہو گیا۔

جامعہ فریدیہ

جامعہ فریدیہ شہر سے باہر کی
طرف ہے اور اس کے بانی و مہتمم مولانا منظور احمد
شاہ صاحب ڈسٹرکٹ خطیب ساہیوال کا قیام
شہر ہی میں ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت جامعہ فریدیہ
کی تفتیش کا تھا، پولیس نے معصوم بچوں کو جگا جگا
کر ڈرایا دھمکایا۔ کسی طرح شہر میں مولانا کو اطلاع
پہنچ گئی، وہ فوراً وہاں پہنچے جا کر دیکھا تو عجیب
درد ناک منظر تھا۔ دس گیارہ سال کے دو بچے لائن
حاضر ہیں، اور پولیس افسر بصد جاہ و جلال ان سے
پوچھ گچھ فرما رہے ہیں، جرم یہ تھا کہ ان بچوں کے
بکسوں سے قلم بنانے کے چاقو برآمد ہوئے تھے
علاوہ ازیں پولیس نے مزید گشت لگایا تو ہال خانے
کے بند روشندان کی بیرونی جانب سے ایک زنگ آلودہ
شکستہ پستول برآمد کر لیا، کارگزاری کا چارٹ مرتب
کیا، دستخط ہوئے اور تفتیش مکمل ہو گئی۔ سنا ہے
ان دو معصوم ملزموں کو پولیس تھانے لے گئی،
لیکن از راہ مراحم خسروانہ ان کو رہائی عطا فرما دی
گئی۔

ردِ عمل

صبح ہوئی تو مسجد سے شراب اور
مقدس دینی اداروں سے ناجائز
اسلحہ کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی
ہر شخص کی زبان پر پولیس کی کارروائی کے خلاف
غم و غصہ کے الفاظ تھے۔ جمعہ کے اجتماعات میں
اس کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا، مذمت
کی قراردادیں منظور کی گئیں، مجلس عمل، متحدہ جمہوری
محاذ، جمعیۃ علماء پاکستان، جماعت اسلامی،
بار روم اور خود عوامی پارٹی کے سنجیدہ حلقوں نے
اسے شرمناک حرکت قرار دی۔

اسباب و عوامل

راقم الحروف کو سیاست
سے اتنا ہی بُعد ہے
جتنا کہ یہودیت اور مرزائیت کو اسلام سے۔ اس
لیے اس واقعہ پر کوئی سیاسی تبصرہ کرنا بھی چاہوں
تو نہیں کر سکتا کہ خود اس فن شریف سے نابلد ہوں
تاہم عام خیال یہی ہے کہ یہ حرکت ان لوگوں کے
اشارے کی رہین منت ہے جو ۷ ستمبر کے فیصلہ
کے بعد مسٹر بھٹو اور حکومت کے دشمن نمبر اول
بن گئے ہیں اور وہ ہر الٹی تدبیر بروئے کار لاتے
ہیں، جس سے عوام میں اشتعال پیدا ہو، معاشرہ
میں انتشار کی پھیلے اور لاقانونیت کی فضا عام ہو جائے
ان لوگوں کے لیے ملک کا اتحاد و استحکام پیغام
موت ہے۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر بھی ملک
کی فضا کو پُر سکون دیکھنے کے لیے آمادہ نہیں۔
سرحد کے آئی جی کی معطلی اس نظریہ کی مؤید ہے۔

آثار و نتائج

(۱) اسلام اور اسلامی معاشرہ
میں خانۂ خدا کو جو عظمت
اور تقدس حاصل ہے وہ کسی باشعور سے مخفی
نہیں، انگریز برصغیر میں ڈیڑھ سو سال حکمران رہا مگر
اس کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ مسجد سے شراب
برآمد کرنے کی ذلیل حرکت کرے۔ جن لوگوں نے
یہ گھناؤنا منصوبہ تیار کیا، انہوں نے اللہ کے گھر کی

باقی ص۲۹ پر

۲

غداری کا معیار

پاکستان آزاد ہوا تو وہ تمام مسلمان جو انگریزی استعمار سے لڑتے رہے اس مملکت خداداد میں قائد اعظم کی وفات کے بعد حکمرانوں کے معتوب ہو گئے۔ اُن کے خلاف نہ صرف یہ کہ سیاسی حکمرانوں نے غیظ و غضب کا اظہار کیا بلکہ بعض ذلیل قسم کے جرنلسٹوں نے انھیں گالی دینا اپنا جزوِ حیات بنا لیا۔ بعض حادثاتی سیاستدانوں نے انھیں غدار کہنا شروع کیا حتیٰ کہ برطانوی سرکار کے وہ ملازم بھی اُن کا لہو چاٹنے لگے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کو منتقل ہوئے تھے۔ آج ۲۷ برس گزر چکے ہیں لیکن اِن تینوں گروہوں کا ڈنکا بدستور قائم ہے اِن لوگوں نے انگریز کے بڑے سے بڑے پشتینی وفادار کو گوارا کیا اُس کے گن گاتے اُس کی پوجا کی اور اُس کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے۔ لیکن آج تک کوئی استعمار دشمن مسلمان اِن کی نگاہوں میں جچا نہیں اِن کے نزدیک وہ سب لوگ گوارا ہیں جو انگریزوں کے نمک خوار و وفادار تھے اور اُن کی سلطنت کے لیے تمام محاذوں پر لڑتے رہے لیکن گوارا نہیں تو وہ لوگ جن کی تاریخ برطانوی استبداد کے خلاف جد و جہد کی تاریخ ہے۔ خان لیاقت علی خان کے زمانے میں خان عبدالقیوم خان نے خان عبدالغفار خان کو جیل میں ڈالا اور وہ بڑھاپے کی عمر میں طویل عرصہ تک قید و بند کی تنہائیوں میں رہے۔ اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو بھی مدۃ العمر نظر بند رکھا گیا۔ پھر جب خان قیوم کو مرکزی سیاست نے اقتدار سے محروم کر دیا اور ایک نیا انقلاب حکومتی دوائر میں پیدا ہوا۔ ملک کے وزیر اعظم چودھری محمد علی بن گئے تو ڈاکٹر خان صاحب کو ون یونٹ یعنی مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

ڈاکٹر خان صاحب نے افغانستان کی حکومت کو پختونستان کے مسئلہ میں للکارا تو اِس سیاسی للکار پر وہ دم بخود ہو گئی لیکن جب ڈاکٹر خان صاحب لاہور میں قتل کر دیے گئے تو اُس کے بعد اِتنا معلوم ہوا کہ اُن کا قاتل پھانسی پا گیا لیکن یہ راز نہ کھل سکا کہ ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کا پس منظر کیا تھا؟ یہ سازش کہاں سے اُٹھی۔ کیونکر چلی اور کس طرح تکمیل کو پہنچی؟ پھر کسی نے خان صاحب کو آج تک یاد نہیں کیا حالانکہ وہ شہید ہی ہوئے تھے۔ اگر وہ غدار ہوتے جیسا کہ خان عبدالقیوم خان اُن پر یا اُن کی جماعت پر الزام عائد کرتے تھے تو اُن کی کابینہ میں نواب افتخار حسین ممدوٹ سید عابد حسین اور بعض دوسرے راسخ العقیدہ پاکستانی کبھی شریک نہ ہوتے نہ انہیں نواب مشتاق احمد گورمانی بطور گورنر قبول کرتے نہ چودھری محمد علی صاد کرتے اور نہ ابتداءً میاں ممتاز دولتانہ اُن کے ساتھ ہوتے۔ اگر میاں صاحب بعد میں الگ ہو گئے تو اُس کے وجوہ دوسرے تھے کوئی اصولی سوال نہ تھا۔ میاں صاحب نے پاکستان بن جانے کے بعد اپنے قائد نواب ممدوٹ سے بھی یہی سلوک کیا تھا اور جب خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم تھے تو اُن کے خلاف بھی پنجاب سے مُہرہ بازی کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے سوا پاکستان کی مرکزی و صوبائی حکومتوں میں کوئی شخص کبھی ایسا نہیں رہا جس نے برطانوی غلامی کے خلاف جد و جہد کی ہو۔ قاضی عطاء اللہ جان سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت میں فنانس منسٹر تھے۔ خان عبدالقیوم خان نے انھیں بھی جیل میں ڈالا۔ وہ قید کے دوران ہی میں مرض الموت کا شکار ہوئے اور لاہور کے میو ہسپتال میں دَم توڑ دیا۔ جس وقت اُن کا انتقال ہوا اُس وقت اتفاق سے خان عبدالقیوم خان لاہور میں فیروز سنز کے ہاں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں اطلاع ہوئی تو اپنی خدائی کی ترنگ میں فرمایا کہ یہ سب لوگ یہی طرح مریں گے۔

موت و حیات تو اللہ کے اختیار میں ہیں لیکن قاضی صاحب کی رحلت معمولی حادثہ نہ تھا۔ لیکن جن تین گروہوں کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے اُن کے لیے غالباً مژدہ جانفزا تھا۔ سرحد میں خدائی خدمت گار بہرحال ایک طاقت تھے انہیں خان عبدالقیوم خان کے ہمنواؤں نے آج تک معاف نہیں کیا اور جن لوگوں کے باپ دادا انگریزی عہد میں پولیٹیکل ایجنٹ رہے اُن کا یہی فرض ہے کہ وہ انہیں کبھی معاف نہ کریں۔ پنجاب میں احرار ایک بڑی طاقت تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے پاکستان بن جانے کے بعد احرار کا سیاسی کردار ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ جو سیاست میں حصّہ لینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ میں چلے جائیں اور جو دینی و عمرانی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہ اُن کے ساتھ رہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے احرار کو سیاسی طور سے قبول ہی نہ کیا اُن پر اپنے دروازے بند رکھے۔ اُدھر جب احرار نے قادیانی عزائم سے آگاہ ہو کر مرزائی اُمت کا تعاقب شروع کیا اور اس سلسلے کی تحریک راست اقدام تک پہنچی تو احرار کے خلاف اُس کا

(باقی صفحہ ۲۴ پر)



از عبدالحکیم عامر
شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی

طالب علم کی ڈائری

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں امسال بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے نامزد کردہ امیدواروں نے حسب روایت اپنے مدمقابل فریق (انقلابی پینل) کو شکست دے دی۔ گزشتہ سالوں کے انتخابی نتائج کا اگر موجودہ نتیجہ سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو شاید جمعیت والوں کی کوئی خاص ادا پسند آئی کہ بڑے سخت مقابلے کے بعد بھی انقلابی حضرات جمعیت کے امیدواروں کو شکست نہ دے سکے حالانکہ اس بات سے جامعہ کا ہر طالب علم بخوبی آگاہ ہے کہ ووٹ کاسٹ کرنے کے اوقات ختم ہونے تک دونوں فریق خوش فہمی کا شکار رہے۔ اگر جمعیت والوں کو طلبا و طالبات کی اسلام دوستی اور شعور پر ناز تھا تو بائیں بازو کے امیدوار بھی الیکشن کے سلسلے میں کی جانے والی اپنی محنت اور دوڑ دھوپ سے مطمئن تھے اور یہ سلسلہ تقریباً چار بجے تک جاری رہا۔ دونوں فریق مختلف شعبوں کے نتائج سے آشنا ہونے کے لیے مارے مارے پھرتے رہے۔ جب شعبہ صحافت جسے جمعیت کا گڑھ کہا جاتا ہے کا نتیجہ سامنے آیا تو بائیں بازو کے طلبا و طالبات نے فرط مسرت سے طوفان بپا کر دیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب دوسرے شعبوں سے نتائج موصول ہونا شروع ہوئے تو بائیں بازو کے طلبہ کی خوشی کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اگر ایک شعبے سے جمعیت کے جیتنے کی اطلاع آئی تو چند لمحوں بعد ہی کسی دوسرے شعبے سے بائیں بازو والے اپنی کامیابی کی نوید سنا دیتے۔ بالآخر تقریباً ساڑھے پانچ بجے تک تمام شعبوں سے اطلاعات موصول ہو چکی تھیں جن کے مطابق سبز نے سرخ کو شکست دے دی تھی۔ بس پھر کیا تھا، اسلامی جمعیت طلبہ کے حامی طلبا و طالبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نو منتخب شدہ صدر عبدالشکور کی قیادت میں رواں دواں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جمعیت سے تعلق رکھنے والے ناظمہ سے اور طلبا نے لان میں نماز شکرانہ ادا کی۔ جب یہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو بعض یار لوگوں نے انہیں ہوٹ کرنا چاہا مگر انہیں روک دیا گیا۔ اب جمعیت اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک بار پھر جامعہ پنجاب میں سرخرو ہو گئی تھی اور انقلابی دوست اپنی ناکامی کو سخت مقابلے کی وجہ سے کامیابی کا نام دیتے ہوئے آہستہ آہستہ تتر بتر ہونے لگے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقابلہ اتنا سخت کیوں رہا کہ آخری اطلاعات آنے تک دونوں فریق خوش فہمی کا شکار رہے تو اس کے بھی چند اسباب ہیں جنہیں میں ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے نوک قلم پر لانا چاہتا ہوں۔

۱۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تمام تنظیموں کے مکمل اتحاد نے امسال انقلابی پینل کی پوزیشن گزشتہ سالوں کی نسبت کافی مضبوط کر دی تھی، ویسے بھی آزاد صدارتی امیدوار مسٹر عابد حفیظ، غلام عباس کی حمایت میں دستبرداری کا اعلان کر چکے تھے۔

۲۔ بائیں بازو کے امیدوار اور طلبا امسال اسلام کا نام لے کر میدان میں آئے تھے جس کی وجہ سے بعض آزاد طلبا و طالبات کی ہمدردیاں بھی انہیں حاصل ہو گئی تھیں۔ (کاش یہ لوگ اسلام سے مخلص ہوتے)

۳۔ بائیں بازو کے صدارتی امیدوار غلام عباس کے ذاتی مراسم نے بھی انقلابی پینل کی پوزیشن مضبوط کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے امیدواروں اور طلبا و طالبات میں اتحاد گزشتہ سالوں کی طرح برقرار رہا۔ اسلام کی علمبرداری بھی جمعیت کے منشور کا اہم حصہ ہے۔ رہے ذاتی مراسم تو ماشاء اللہ عبدالشکور کے ذاتی مراسم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ایسے عالم میں نتائج سے بیشتر کوئی شخص بھی کسی فریق کی کامیابی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا اور یہی وجہ ہے کہ آخری دم تک دونوں فریق خوش فہمی کا شکار رہے۔ نتیجتاً صدر عبدالشکور، نائب صدر منظور خان، جنرل سیکرٹری احسان اللہ وقاص، جائنٹ سیکرٹری سید محمد نعیم اور مجلس خواتین کی چیئرمین مس فاطمہ اطہر منتخب ہوئیں (واضح رہے مس فاطمہ اطہر بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں)

انتخابات کے دوران چند ناخوشگوار واقعات بھی رونما ہوئے جنہیں کسی بھی ذی شعور اور پرامن طالب علم یا طالبہ نے پسند نہیں کیا۔ پہلا ناخوشگوار واقعہ تقریباً سوا بارہ بجے آئی آر لان میں اس وقت پیش آیا جب احسان اللہ وقاص اور منظور خان وغیرہ ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلبہ غلام عباس کی قیادت میں وہاں پہنچ گئے۔ اب دونوں فریق کچھ دیر تک اپنے اپنے

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

تحریر: رحمت علی

افراطِ زر

موجودہ تہذیب کے لئے شدید خطرہ

آج دنیا معاشی بحران کے ایک سنگین دور سے گزر رہی ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کو بے شمار معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ جیسے آبادی میں اضافہ، غذا اور دیگر اشیائے صرف کی قلت، سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کی کمی وغیرہ۔ ان مسائل کے علاوہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ افراطِ زر کا ہے۔ اور اس نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ اس کو موجودہ تہذیب کے لئے شدید خطرہ سمجھا جانے لگا ہے۔ موجودہ معاشی حالات اس لئے بھی زیادہ خطرناک سمجھے جا رہے ہیں کہ کساد بازاری اور قیمتوں کا اضافہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور بیروزگاری پھیل رہی ہے۔ شرحِ سود میں اضافہ ہو رہا ہے اور سرمایہ کاری کے مواقع گھٹ رہے ہیں۔ مختلف شعبوں میں پیداوار کے ساتھ پیداآوری بھی گھٹ رہی ہے۔ مختلف صنعتیں کساد بازاری کا بوجھ محسوس کر رہی ہیں۔ مغربی دنیا میں افراطِ زر کی رفتار ۱۰ فیصدی اور ۱۵ فیصدی کے درمیان ہے۔ میکسیکو اور جنوبی امریکہ کے کچھ دوسرے ملکوں میں یہ اضافہ ۴۰ فیصدی تک پہنچ چکا ہے۔ سوڈان، بنگلہ دیش اور سنگاپور میں یہ اضافہ ۳۰ اور ۵۰ فیصدی کے درمیان ہے۔ ہندوستان اور برازیل میں یہ اضافہ ۲۰ سے ۳۰ فیصدی کے درمیان شمار کیا جاتا ہے۔

یہ ایک طویل بحث ہے کہ موجودہ معاشی بحران افراطِ زر کا نتیجہ ہے یا افراطِ زر معاشی بحران کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بحث اسباب اور نتائج کے گڈمڈ ہو جانے کی وجہ سے طویل اور مبہم ہو گئی ہے۔ ماہر معاشیات، معاشی بحران اور افراطِ زر کے وقوع پذیر ہونے کی وجوہات، نتائج اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے حالات کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں مختلف معاشی پالیسیوں کے علاوہ حکومت کے براہِ راست یا بالواسطہ مداخلت کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ یہ مختلف معاشی اقدامات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ معاشیین اس بات سے واقف ہیں کہ افراطِ زر کی کسی منزل پر کونسا قدم اٹھایا جائے، لیکن اس کے باوجود موجودہ حالات میں افراطِ زر کا مسئلہ قابو سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ معاشیین افراطِ زر سے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ افراطِ زر کو روکنے والے اقدامات عام معاشی حالات پر برا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ جس میں بے روزگاری کا بڑھتا ہوا فیصد بھی شامل ہے۔ افراطِ زر ہی کیوں، دیگر معاشی اور سماجی مسائل بھی کچھ اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ماہرین کبھی بھی ان اقدامات کے بارے میں ایک رائے نہیں رکھتے جو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اٹھائے گئے ہیں اور ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کو حل کرنے والے اقدامات دوسرے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان حالات میں یہ طے کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کونسی باتیں سماج کے لیے نسبتاً زیادہ اہم اور بہتر ہیں۔ اس قسم کے فیصلوں میں فیصلہ کرنے والوں کی ذاتی پسند، سماجی سوجھ بوجھ اور سیاسی نظریات کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

معاشی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ۱۹۳۰ء کے دہے سے پہلے زر کی رسد کا اضافہ بہت ہی برا سمجھا جاتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کلاسیکی معاشیین کے نظریات عام تھے۔ ہر طرف "آزاد معیشت" کا پرچار ہو رہا تھا اور مرکزی بنک زر کی رسد پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک مغربی دنیا میں زر کی رسد میں ۳۰ فیصدی کی حد تک کمی کر دی گئی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے دہے کی کساد بازاری نے معاشیین کو اپنے نظریات پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ لارڈ کینس کی معاشیات منظرِ عام پر آئی۔ اس نے کلاسیکی نظریات پر سخت تنقید کی اور سرمایہ دارانہ نظام کی طویل مدتی خودکاری پر بھروسہ کرنے والے معاشیین کو اس کساد بازاری اور تباہ حالی کا ذمہ دار قرار دیا۔ لارڈ کینس کی معاشیات بڑی حد تک کلاسکی منطق کے برخلاف تھی۔ اس تفصیل میں گئے بغیر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے حکومتی اخراجات کے ذریعے آزاد معیشت کو سہارا دینے اور زندہ رکھنے کا طریقہ پیش کیا۔ حکومتی اخراجات میں اضافے کے ساتھ ہی افراطِ زر کے لیے راہ ہموار ہوتی گئی۔ اس طرح افراطِ زر کی مدد سے مغربی دنیا کی معیشت کو عظیم کساد بازاری سے نکال کر خوشحالی کے راستہ پر ڈال دیا گیا۔ دنیا کینس کی اس کامرانی پر شاداں و فرحاں تھی۔ کامرانی کی مسرتوں میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اس وقت کا "حل" مستقبل میں کسی وقت خود ایک مسئلے کی شکل اختیار کر لے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں بھی حکومت کے اخراجات اور افراطِ زر بڑھتے گئے۔ جنگ کے اختتام پر میدانِ جنگ سے واپس آنے والے شہریوں کو پھر سے بسانے اور انہیں روزگار فراہم کرنے کے لیے حکومت کے اخراجات کی تائید کی گئی، کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ مجبوری بھی تھی کہ ان اخراجات کی موجودگی میں افراطِ زر کو کم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امریکہ نے جنگ کے اختتام پر متاثر ہونے والی ترقی پذیر اقوام کی امداد کا بیڑا اٹھایا، جس کے نتیجہ میں اس ملک میں افراطِ زر کے رجحانات تقویت پانے لگے۔ ۱۹۵۰ء کے وسط سے ہی معاشیین نے افراطِ زر کے خطرے سے دنیا کو متنبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور قیمتوں کو متوازن سطح پر رکھنے کی حمایت میں بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی، لیکن قیمتوں پر روک لگانے کے نتیجے میں روزگار میں کمی ہونے لگی۔ معیشت کی سالانہ شرحِ نمو گھٹنے لگی اور عام معاشی ترقی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا کے دو بڑے بلاکوں میں معیارِ زندگی کو اونچا کرنے اور ملک کو معاشی اور فوجی حیثیت سے مضبوط بنانے کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ان حالات میں مغربی دنیا کسی قیمت پر بھی شرحِ نمو میں کمی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بے روزگاری سے مقابلہ کرنے اور ملک میں کل مانگ کو بڑھانے کے لئے آسان زر کی پالیسی اختیار کی گئی۔

۱۹۵۰ء کے اواخر میں بدلتے ہوئے حالات معاشیین کے لیے تشویش کا باعث تھے۔ ہوا یہ کہ قیمتوں میں اضافے کے باوجود معاشی ترقی کی رفتار سست رہی۔ بے روزگاری کافی حد بڑھ گیا اور پیداوار میں کمی ہونے لگی۔ اس سے پہلے معاشی اتار چڑھاؤ کا کام معاشی حالت اور قیمتوں کی سطح سے مثبت تعلق ہوا کرتا تھا، یعنی یہ کہ خوشحالی کے زمانے میں قیمتوں میں اضافہ ہوتا تھا اور معاشی سست رفتاری اور مندی کے دور میں قیمتیں خود بخود کم ہو جاتی تھیں۔

ان حالات میں بحث اس بات پر چھڑی تھی کہ معاشی سست رفتاری کو برداشت کرتے ہوئے قیمتوں میں کمی کرنا چاہیئے یا نہیں۔ ترقی پسند طرزِ فکر رکھنے والے ہمیشہ معاشی ترقی کی رفتار کو ترجیح دیتے تھے۔ چاہے اس کی وجہ سے قیمتوں میں کچھ اضافہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس طرح قیمتوں میں مسلسل اضافہ ایک حقیقت بنتا جا رہا تھا۔ پچھلے تیس چالیس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ معاشی خوشحالی کے زمانے میں قیمتوں میں ہونے والا اضافہ معاشی سست رفتاری کے زمانے میں کمی کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اگر معاشی ترقی میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ قیمتیں بھی بڑھتی گھٹتی رہتیں تو قیمتوں میں اضافہ آج اتنا شدید نہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ کساد بازاری اور قیمتوں میں اضافہ کا بیک وقت وقوع پذیر ہونا معاشیین کے لیے سخت امتحان کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ کساد بازاری کو دور کرنے کے لیے افراطِ زر کا سہارا لیا جاتا رہا ہے، لیکن آجکل کے حالات میں اس قسم کا اقدام قیمتوں میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ کساد بازاری کے حالات کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اس پس منظر کے ساتھ افراطِ زر کے رجحانات کا بہتر طور پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے چار دہوں کے حالات، اجرت کا مسلسل اضافہ، معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کے علاوہ نیوکلیائی تجربات، ہتھیار بندی کی دوڑ اور خلائی پرواز کے تجربوں نے افراطِ زر کو تیز سے تیز تر کر دیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ معاشی بحران سیاسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے، ہم اس موضوع بحث کو مختلف ملکوں کے برسرِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے سرگرم ارکان کے لیے چھوڑتے ہیں۔

دنیا اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ افراطِ زر کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور زر پر سے اعتماد ختم ہونے لگتا ہے۔ اور معاشی جدوجہد متاثر ہوتی ہے۔ افراطِ زر کو نوعیت کے اعتبار سے دو صورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مانگ کا افراطِ زر کہلاتا ہے اور دوسرا لاگت کا افراطِ زر ہے۔ پہلی قسم کا افراطِ زر قلت پر مبنی ہے۔ اگر زر کی رسد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ پیداوار میں اضافہ نہ ہو تو لوگوں کے ہاتھ میں موجود قوتِ خرید اور ملک کی پیداوار کا تناسب بگڑ جاتا ہے۔ اشیا کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ اور قیمتوں میں اضافہ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ مستقبل میں اضافۂ قیمت کے ڈر سے لوگ مال خرید کر اکٹھا کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل قیمتوں میں مزید اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے قسم کے افراطِ زر میں لاگتِ پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ خام مال کی قیمت، انٹرسٹ منافع اور اجرت کی شرح میں تیز اضافہ، اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ پہلے قسم کا افراطِ زر ترقی پذیر ملکوں کے حصے میں آیا ہے۔ کیونکہ یہاں قلت نسبتاً زیادہ ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں قیمتوں کا اضافہ بہت کچھ دوسری نوعیت کا ہے۔ معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کا انحصار عوامل پیداوار کے معاوضے پر ہے اور خصوصاً اجرت کی شرح میں مستقل اضافے نے یہ صورتِ حال پیدا کی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے مغربی ملکوں میں اجرت کی شرح کو منجمد کرنے کی پالیسی کو اپنایا گیا تھا۔ مانگ اور لاگت کے افراطِ زر کا ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں سے جو تعلق قائم کیا گیا ہے وہ قطعی نہیں ہے۔ ایک طرف ترقی یافتہ ملکوں میں بھی لاگت کے ساتھ ساتھ مانگ کا افراطِ زر بڑھ رہا ہے اور دوسری طرف ترقی پذیر ملکوں میں اجرت کی شرح اور دیگر عوامل کے معاوضہ میں اضافہ ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے اشیاء کی لاگتِ پیداوار بڑھ رہی ہے۔ ملک کی معاشی حالت اور افراطِ زر کی اقسام سے قطعِ نظر یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ افراطِ زر ایک متعدی عمل ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھیلتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کو زیادہ نقصان پہنچتا

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

میرے استاد ـــ حافظ محمود شیرانی

تحقیق کا طریق کار اور معیار

بعض آدمی یہ کہتے سنے گئے ہیں، کہ شبلیؒ کی شعرالعجم زندۂ جاوید کتاب ہے اور شیرانی کی تنقید شعرالعجم کے باوجود تا ابد زندہ رہے گی لیکن تنقید شعرالعجم کی عمر کوئی لمبی نہیں ہے۔ راقم ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں معروضات کاملاً درست نہیں ہیں۔ جو لوگ فارسی شاعری کی ادبی چاشنی سے لذت اندوز ہونا چاہیں گے۔ اور سرسری طور پر اس کے تاریخی پس منظر سے شناسائی چاہیں گے، وہ ہمیشہ شعرالعجم سے استفادہ کرتے رہیں گے، لیکن جو طالب علم صدق و حقائق کی تلاش میں نکلیں گے وہ تنقید شعرالعجم سے ضرور صحیح راہ تلاش کریں گے۔ اسی حیثیت سے یہ دونوں آثار فارسی علم و ادب کے میدان میں معرکۃ الآرا تخلیقات ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے جہاں ایران میں شعرالعجم کا فارسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے، وہاں تنقید شعرالعجم کو بھی فارسی لباس اوڑھایا گیا ہے اور شیرانی کے کسی طور سے کر آج تک بھلایا نہیں جا سکتا۔

استاد گرامی حافظ محمود خان محمود شیرانی اپنے عہد کے غالباً سب سے بڑے محقق تھے جنہوں نے پاک و ہند اور ایران سے متعلق فارسی میں محفوظ علم و ادب اور تاریخ اور اردو زبان پر اسی تحقیق تفصیلیت کے ساتھ قلم اٹھایا کہ اس کی مثال نادر الشاذ ہے۔ اردو کے شعراء اور ادبا، تاریخ ادب و اردو کی تدوین میں ایک عرصے سے مشغول ہیں، انہوں نے تنقید و تبصرہ کے میدان میں بعض وقیع کام کیا ہے۔ لیکن لسانی تحقیق میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس سنگلاخ وادی میں غالباً سب سے پہلے شیرانی صاحب اترے ہیں۔ اور انہوں نے غیر پنجابی ہونے کے باوجود پنجاب سے اردو کے قدیم رشتوں کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے یہ کام بڑا کٹھن تھا، کیونکہ عام تجربہ یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے معروف اہل زبان چونکہ زبان کی پیدائش کے علاقے پیدا ہونے کو نہیں پہچانتے، جس کے ایک حصے کا نام دو تین صدیاں پہلے پنجاب پڑ گیا تھا، اس لیے وہ لسانی اعتبار سے تحقیقی کام کرنے کی استعداد اور اہلیت بھی پیدا نہ کر سکے ــــ لیکن مرحوم شیرانی نے ان پیدائشی Drawbacks کے باوجود بڑی پامردی سے اس میدان میں قدم رکھا اور لسانی تحقیقات کرنے والوں کو کئی نئی راہیں سمجھائیں۔

آپ کی صحبت میں، میں اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے اپنے استاد شیرانی مرحوم کے طریق کار کو پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ہمارے معاصر اور ہم سے بعد میں آنے والے حضرات کو معلوم ہو سکے، کہ وہ اتنے اعلیٰ معیار کی تحقیق کس طرح کیا کرتے تھے۔

شیرانی صاحب دراصل وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے، اس زمانے میں میٹرک پاس طلبا کو بیرسٹری میں داخلہ مل جاتا تھا۔ حافظ صاحب مرحوم کی یہی تعلیم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، بدقسمتی سے اپنے والد کی وفات کی وجہ سے وہ انگلستان میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے فارسی عربی کا مطالعہ شروع کیا، یہ معلوم نہیں کہ مجوزہ تعلیم کا منصوبہ ترک کرنے کے بعد کن لوگوں سے ان کے روابط استوار ہوتے لیکن ایک بات واضح ہے کہ معیاری تحقیق کا جذبہ اسی وقت بیدار ہوا۔

وطن واپس پہنچے تو سر شیخ عبدالقادر کی سفارش پر انہیں اسلامیہ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کام ملا، لیکن تدریس کی بجائے ان کا تمایل تحقیق کی طرف زیادہ تھا۔ اور وہ سوچنے لگے تھے کہ اردو کی پیدائش کیسے اور کہاں ہوئی؟ ان کا اولین معیار تحقیق یہ تھا کہ

جب تک قوی شواہد موجود نہ ہوں اس وقت

کمیاب تھا اس وجہ سے اندازاً قیمت کا
نہیں پہنچے

پھر شیرانی کی تلاش میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور اس کے لیے وہ بسا اوقات ... بیان کرتے رہے۔ مثلاً ایک سکے کے سوا اکبر کے سکوں کا پورا سلسلہ ان کے پاس موجود تھا، یہ بات میں بعد میں بیان کروں گا، کہ شہنشاہوں کے سکوں کے کامل سلسلے بہم پہنچانے میں ان کے ملحوظ خاطر کیا مقصد تھا، اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت کیسے کی اجمالاً صرف یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ انہوں نے ایک دن مجھے اس صورت حال سے آگاہ کیا، اور اپنے ساتھ گجرات چلنے کو کہا، میں اس وقت (۱۹۳۲ء میں) ان کا طالب علم تھا اور اس سے پہلے گورنمنٹ کالج گجرات میں زیر تدریس رہنے کی وجہ سے شہر گجرات کے جغرافیہ اور اشخاص سے مانوس تھا۔ گجرات میں اس وقت ایک پادری رٹن صاحب سکے جمع کر کے بیچا کرتے تھے، ریلوے سٹیشن سے تانگے کر مارٹن کے گھر پہنچے، پادری بڑی تواضع سے پیش آیا اور جب ان کا مطلوبہ سکے کا مطالبہ کیا تو وہ فوراً اندر سے سکہ لے آیا۔ شیرانی صاحب نے اس سکے کو ایک نظر دیکھا تو چار پائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مارٹن مول تول کرنے کی تجاویز کر رہا تھا لیکن شیرانی صاحب اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔ واپسی پر راستے میں انہوں نے بتایا کہ اس آدمی کے پاس اکبر کا سکہ یا موجود ہے یا اس کی دسترس میں ہے، یہ اس کی جعلی نقلیں تیار کر کے بیچ رہا ہے اور جب تک یہ کاروبار جعلی سکے فروخت ہو رہے گا اس وقت تک یہ اصل سکہ فروخت کے لیے تیار نہ ہوگا، اس لیے اس وقت سودا کرنا بے کار ہے ... سکے ... بازار میں پہنچ ... معقول قیمت ...

شیرانی صاحب نے مختلف ذرائع سے رابطہ کیا اور پھر ایک دن ان کا ہرکارہ آ گیا، انہوں نے ایک تھیلی میں بندھے ہوئے تانبے اور چاندی کے سکے ڈھیر کر دیئے۔ شیرانی صاحب نے ان کو ایک نظر الٹ پلٹ کر دیکھا اور شنار سے سودا کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چاندی کے تمام سکے چاندی کے بھاؤ تول کر دیئے جائیں گے اور تانبے کے چار آنے فی سکہ کے حساب سے ہر سکے کو تول دیئے اور شیرانی صاحب نے قیمت ادا کر دی۔

وہ جب کہنا مرے سکانے پر گجرات میں تھا وہاں آپ نے چھوٹے سے کمرے میں ایک سکہ نکال کر اسے غور سے دیکھنا شروع کیا پھر مسکراتے ہوئے اسے میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور ساتھ ہی فرمایا: تم نے سنا، مارٹن صاحب اسی اکبر کا ذکر کر رہے تھے اور غالباً اسی اکبر کے اس سکے کی نقلیں بنوا رہے تھے، پھر نقل کی قیمت دس گنا مانگ رہے تھے میں نے اصل سکہ چاندی کے وزن کے حساب سے خرید لیا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش نظر آتے تھے۔

سکوں اور مغل تصویروں کی جستجو کے وقت شیرانی صاحب نے متعدد مرتبہ یہ محسوس کیا کہ شہنشاہ انہیں جب معلوم ہوتا، کہ ہندوستان کے فلاں شہر میں فلاں شخص کے پاس ایک مخطوطہ نسخہ یا سکہ ہے تو وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ان کے پاس مغل تصویروں کا ایک نادر ذخیرہ موجود تھا اور مغل شہنشاہوں کے سکوں کے نمونے اور چاندی کے کامل سلسلے بھی تھے۔

شواہد اور ثبوت کے متعلق بھی شیرانی صاحب کا معیار نہایت بلند تھا وہ صحیح طور پر سمجھتے تھے کہ کسی کے واقعات کو صحیح سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ... بہت ضروری ہے۔

معاصر ... شہادت اور ... جس کی ... کے مطابق ... ہو تو یہ چیز اس تاریخ کے بارے میں ... کی معاصر شہادت مرتب کی ہے۔ کیونکہ ہر تاریخ جب ... یا اپنے سے پہلے لوگوں سے تاریخی واقعات نقل کرتا ہے تو اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ اس سے شک اور ظن کی بدولت حقیقت مسخ ہو جائے۔

شیرانی صاحب اس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر کتابوں کے معاصر نسخے اور سکے جمع کیا کرتے تھے تاکہ واقعات کی چھان بین کے لیے صحیح طور پر استفادہ ہو سکے۔ ایک مثال عرض کروں گا۔

امیر خسرو کی بیاض سے کلیات مثنوی تغلق نامہ مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد (دکن) کی طرف سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مثنوی مولوی رشید احمد مرحوم نے کتاب خانہ حبیب گنج کے ایک قلمی نسخہ سے نقل کی تھی، مرحوم کی بے وقت موت کے بعد یہ مثنوی سید ہاشمی فرید آبادی نے ایک دیباچہ اور خلاصۂ مثنوی کے اضافے کے ساتھ شائع کی۔ اس دیباچے اور مقدمے پر سید مقبول احمد صمدانی نے ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی رسالے (اشاعت جولائی ۱۹۳۴ء) میں تنقید و تبصرہ کیا۔ شیرانی صاحب کو اس تبصرے سے اختلاف تھا انہوں نے مجھے اس کی تردید لکھنے کے لیے کہا۔ میں اس وقت ان سے تربیت حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسسٹنٹ



کی حیثیت سے [illegible] صاحب نے
[illegible] ہوئے تھا
تھا کہ ـــــــ اس مثنوی سے بہت سے
تاریخی واقعات کی تفاصیل ہم تک پہنچی ہیں اور کئی ایک
مؤرخین کے غلط بیانات کی تصحیح ہوتی ہے ۔
اسی سلسلے میں آپ نے قطب الدین مبارک کے
قتل کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۷۲۰ھ کی چاندرات
امیر خسرو کے ذیل کے اشعار سے اخذ کی ۔

چو تاریخ عرب شد ہفتصد و بیست
ثبات قطب شد کم جانب زیست
بجادو در مبین را شد پدیدار
ہلال تیرہ و تاریک دیدار
شد آن مہ بر جہ گیہان مبارک
نگر بر طالع سلطان مبارک

اور پھر غازی ملک تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ پہلی شعبان ۷۲۰ھ ذیل کے شعر سے نکالی ۔

چو صبح غرۂ شعبان فرخ
نمود از تخت گاہ آسمان رخ

سید مقبول احمد اس پر معترض تھے، اور مشہور مستشرق بیل Beale اور اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری کے مصنف اور معروف مؤرخ فرشتہ کے حوالے سے اس پر مُصر تھے کہ خلجی سلطان قطب الدین مبارک کا قتل اور غازی ملک تغلق کی تخت نشینی ۷۲۰ھ میں نہیں بلکہ ۷۲۱ھ میں ہوئی تھی۔ شیرانی صاحب نے میری راہنمائی کرتے ہوئے سمجھایا کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے، فرشتہ اور بیل دونوں قطب الدین مبارک سے بہت بعد کے آدمی ہیں ان کی بات سند کا درجہ نہیں پا سکتی، تاریخ فیروز شاہی کا مصنف برنی اس عہد کے قریب اور معاصر ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل اعتماد ہے [illegible] دیکھا تو اس نے صرف [illegible] تغلق شاہ کا [illegible] بیان کیا ہے۔ [illegible]

پر شیرانی مرحوم سکوں سے بھی مدد لیا کرتے تھے اور سکے جمع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخی واقعات کی جانچ پرکھ کے لیے انہیں استعمال کیا جاسکے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان دونوں بادشاہوں کے سکے تلاش کرنے شروع کیے۔

ہندوستان میں سلاطین دہلی کے جو سکے اس وقت موجود تھے، ان کی مفصل فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں قطب الدین مبارک کے سونے، چاندی اور تانبے کے دستیاب ہونے والے سکوں کی جو تفصیل درج ہے وہ سب کے سب ۷۱۷ھ اور ۷۲۰ھ کے بیچ میں مسکوک ہوئے ہیں، ۷۲۱ھ کا کوئی سکہ نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک کا عہد ۷۲۱ھ سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور وہ ۷۲۱ھ میں زندہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ۷۲۱ھ کے سکے دستیاب نہ ہوسکے ہوں۔

اس کے بعد مجھے ناصر الدین خسرو خان کے سکے تلاش کرنے پڑے۔ یہ غدار وزیر اور قطب الدین مبارک کا غلام اپنے آقا کو قتل کر کے تخت دہلی پر متمکن ہو گیا تھا۔ دہلی کی ٹکسال کا ایک سکہ دستیاب ہوا، جو خسرو خان نے ضرب کرایا تھا اور اس کے حاشیے پر ۷۲۰ھ کا سال حروف میں درج تھا۔ ظاہر ہے کہ خسرو خان اپنے بادشاہ کی موجودگی میں اپنے نام کا سکہ نہیں چلا سکتا تھا اور اس وقت مبارک کا قتل ہو چکا تھا۔ راقم نے پھر غیاث الدین تغلق شاہ کے سکے تلاش کیے تو اس کے بھی ۷۲۰ھ کے متعدد سکے مل گئے، ان سے بھی ثابت ہوا کہ خسرو خان کے بعد تغلق شاہ بھی ۷۲۰ھ میں تخت پر بیٹھ گیا تھا میری یہ ساری تحقیق معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہوئی اور شیرانی صاحب اسے دیکھ کر بہت مطمئن ہوئے ۔

شیرانی مرحوم کا تحقیقی معیار یہ بھی تھا کہ وہ سند

سے بغیر کسی دعوے کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے جب انشعر العجم کھسرالی تو شعرالعجم کی جابجا تغلیط کی۔ انہوں نے صرف ایک ہی طریقہ اختیار کیا کہ شعرا کے اپنے کلام اور معاصر تواریخ سے شواہد اور دلائل فراہم کئے۔ انہوں نے مولوی شبلی نعمانی کی علمیت اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے تحقیق کے میدان میں ان کے روایتی قد کاٹھ کو نہ ماندی اور مستند حوالوں سے انہیں جو کچھ دستیاب ہوا اس کے بل پر شبلی کی تصحیح کی۔

مختصراً شیرانی مرحوم کا طریق کار یہ تھا کہ موضوع زیر بحث پر تحقیق کرنے کے لیے سب سے پہلے مستند مواد جمع کیا جائے، تاریخی اذہان اور ادبی مواد میں وہ صحیح معاصر قلمی نسخوں، سکوں، فرامین اور تاریخ وار ظروف، کتبوں، پارچات اور چوبی نوادر وغیرہ کو اولیت کا درجہ دیتے تھے۔ پھر اگر روایت کے تواتر کے شواہد ہاتھ آتے تو وہ انہیں ثانوی حیثیت سے سنین کے قریب و بعید کے مطابق درجہ دے کر استعمال کرتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تجربہ کی کثرت اور تاریخ کے عمیق مطالعہ اتنی مہارت پیدا کر لی تھی، کہ وہ اصل اور نقل میں آسانی سے تمیز کر لیتے تھے اور بسا اوقات کاغذ دیکھ کر قلمی نسخے کی عمر معین کر لیتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ مغل شہنشاہوں کے دور میں شاہجہاں کا زمانہ کثرت ثروت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور عمدہ وقت ہے۔ لہٰذا اسی دور میں ہندوستان میں کاغذ بھی عمدہ بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح سے شاہجہاں کے زمانے میں جب ہندوستان میں قالین بافی شروع ہوئی تو ہندوستان کے بنے ہوئے قالین ایرانی قالینوں سے زیادہ قیمت پر بکنے لگے۔ شیرانی مرحوم کا خیال تھا کہ ہندی مسلمانوں نے جہاں کتابت، مصوری اور معماری میں عدیم المثال اور نادر نمونے پیش کئے ہیں، وہاں پارچہ بافی اور قالین بافی میں بھی اپنے ہنر کی حسین و جمیل نمائش کی ہے اور لطافت اور دستکاری کی کثیر و تقلیل کے ساتھ جنہوں نے ان کی صفت اور تنزلی کی جزئیات کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے خود بڑے خوبصورت اور حسین کیس جمع کر رکھے تھے اور قدیم کپڑوں کی عمر بھی وہ ان کے معیار کو جانچ کر مقرر کر سکتے تھے یعنی ان کے مطالعہ اور تحقیق کا عملی اور مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے علم سے ماضی کے دریچوں میں بے فرق جھانک سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ شیرانی کی روایت بہت دور اور بہت دیر تک نہ چلی۔ استقلال پاکستان سے ذرا پہلے ان کا قیمتی کتب خانہ تو پنجاب یونیورسٹی کے قبضے میں آ گیا، لیکن پاکستان کی ہیئات مقتدرہ کی عدم توجہی کی وجہ سے ان کے سکے توڑ کر ایک ہندو مارواڑی ہندوستان لے گیا۔ ان کے دام غالباً ۲۵ ہزار پڑے۔ وزن کے حساب سے بھی یہ اپنے ۲۵ ہزار کے ہوں گے لیکن قدر کے اعتبار سے شاید انمول تھے۔ کیا یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق پرانے نقوش بک کر اپنے ممالک میں لے جا رہے ہیں، اور یہاں جن لوگوں کے پاس پڑے ہیں وہ ضائع ہو رہے ہیں، کیونکہ یہاں تحقیق کرنے والے خاندانوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے جہاں کتابوں، سکوں، فرامین اور دیگر وثائق کو کوڑی کی کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں بہت سے شیرانی پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے ہیں۔

فرمودات اقبالؒ

تاریخ کی مادی تعبیر

میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان معاشرے نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (سید ین کے نام خط)

نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(صوفی تبسم کے نام خط ۱۹۲۵ء)

زبان

میں زبان کو ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ سمجھتا ہوں زندہ زبان، انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ (نشتر کے نام خط)

ہندوستانی مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام

عناصر اربعہ

صوفیاء میں حضرت مجدد الف ثانیؒ علماء میں شاہ ولی اللہؒ، شعراء میں میرزا عبدالقادر بیدل اور سلاطین میں سلطان ٹیپو شہید کا بالاستعاب مطالعہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی اور تہذیبی کارناموں کی تاریخ کے اہم ستون ہیں۔

(بروایت راجہ حسن اختر)

شاہین

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

(۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

(۳) بلند پرواز ہے۔

(۴) خلوت پسند ہے۔

(۵) تیز نگاہ ہے۔

ظفر احمد صدیقی کے نام خط)

حق گوئی!

دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اقبال کی زندگی صوفیانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔ (غلام بھیک نیرنگ کے نام خط)

علی وجہ البصیرت

یہ بات میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد ہندوستان کی سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے میرے خیال میں شدھی کا خطرہ، اس خطرے کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا تھا۔

غلام بھیک نیرنگ کے نام)

عزلت نشینی

اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوحؑ سمجھتا ہے

(شوکت علی کے نام ۱۹۱۴ء)

نشان ہلال

نشان ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے جہاں تک مجھے علم ہے یہ نشان نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں مروج نہ تھا، بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا، بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں میرے خیال میں ترکوں کو اس کی ترویج سے کوئی تعلق نہیں غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی، عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں اس کا آغاز ہوا ہو۔ صلاح الدین، ایوبی تھے۔ ترک نہ تھے۔ کرد تھے۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا ہے۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کر لیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا، ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ تاریخی پہلو

رڈ نمبر ال (۵۲۰)

جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ اقبال احمد)

بقیہ : افراطِ زر

ہے۔ کیونکہ ترقی پذیر ممالک اپنی منظم معیشت کی وجہ سے حالات کے مقابلے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان ممالک میں معاشی پالیسیوں کو زیادہ موثر انداز میں کام کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ قیمتوں میں اضافہ کی مدد لے کر معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور بے روزگاری کے فیصد کو کم کرنے کی مستقل حمایت کی جاتی رہی ہے۔ ان نظریات پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ پچھلے دہے میں قیمتوں اور اجرت دونوں میں اضافہ ہوا، لیکن اجرت کا اضافہ قیمتوں کے اضافہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح لوگوں کو قیمتوں کے اضافہ کے باوجود بہت کچھ فوائد پہنچے ہیں۔ مثلاً ہم کو دس گھنٹے کام کر کے حاصل ہونے والی مزدوری سے جو شے خریدنی ہوتی تھی، اگر وہ صرف ۸ گھنٹوں کی مزدوری سے خریدی جائے تو قیمت میں اضافہ تکلیف دہ نہیں ہوگا۔ یہ بات ترقی یافتہ ملکوں کیلئے درست ہے، لیکن ترقی پذیر ملکوں کے لیے زیادہ صحیح نہیں، کیونکہ ان ملکوں میں اجرت کے مقابلہ میں منافع کی رفتار زیادہ تیز رہی ہے۔ اس کے علاوہ افراطِ زر کی موجودہ رفتار کے پیش نظر اس قسم کی دلیلیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں اور افراطِ زر کی موجودہ رفتار جمہوری نظام اور مغربی تہذیب کے لیے تباہ کن سمجھی جا رہی ہے۔ امریکہ اور یورپ کے قدامت پسند اور آزاد خیال دونوں ہی اس بات سے متفق معلوم ہوتے ہیں۔

موجودہ حالات میں معاشی ترقی کی سست رفتاری کے باوجود غذا اور ایندھن کی قیمتوں میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ معاشین کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ مثلاً انگلستان میں ختم اپریل ۷۴ء کے بعد سے تین چار مہینوں کے اندر ہی یہ اضافہ ۱۰ فی صد تک پہنچ چکا تھا۔ ایسی حالت میں شرح سود میں اضافے کے باوجود بھی سرمایہ کاروں کی حقیقی آمدنی میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوتا اور سرمایہ کاری گھٹنے لگتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی نئے کارخانے کو شروع کرنے کے لیے آج سے ۱۰ سال قبل کے مقابلہ میں دوگنی رقم درکار ہے۔ انگلستان کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے معاشی جائزے کے مطابق ۷۳ء اور ۷۴ء کے دو برسوں کے درمیان انگلستان کے عوام نے اپنی حقیقی قابل خرچ آمدنی کا ۵ فیصدی حصہ کھو دیا تھا۔ یہ کمی برطانیہ کی معاشی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ حد یہ کہ ۱۹۳۰ء کی عظیم کساد بازاری کے زمانہ میں جب کہ بیروزگاری ۲۱½ فی صدی تک پہنچ چکی تھی، حقیقی قابلِ خرچ آمدنی میں اتنی کمی نہیں ہوئی تھی۔

اب یہ صورت حال کے تجزیہ پر منحصر ہے کہ آپ ان واقعات کو کس طرح جانچنا چاہتے تھے۔ ۲۱½ فی صدی بے روزگاری کے باوجود حقیقی قومی آمدنی میں ۵ فی صدی کی حد تک بھی کم نہ ہو سکی۔ یا یہ کہ آج کے حالات میں حقیقی آمدنی میں اتنی شدید کمی کے باوجود بے روزگاری کافی حد ۵ فیصدی پر روک دیا گیا ہے۔ انگلستان کے معاشی حالات کے بارے میں پچھلے مہینے شائع ہونے والی ہڈسن رپورٹ نے پیش گوئی کی ہے کہ ملک کی معاشی حالت ۱۹۸۰ء تک ابتر رہے گی۔ موجودہ سرمایہ کاری ۱۹۸۰ء کے بعد بار آور ثابت ہوگی اور حالات بہتری کی طرف جائیں گے۔ اس وقت تک دہی کاٹنا ہوگا جو کہ پچھلے دنوں بویا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے سال تک انگلستان کے باشندوں کی فی کس آمدنی گھٹ کر فرانس، جرمنی اور ڈچ اقوام کے مقابلے میں نصف رہ جائے گی۔ حالات کی خرابی کی ذمہ داری مزدور انجمنوں پر بھی ہے۔ ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اس موسم سرما کے ختم تک اجرت میں ۲۵ فیصدی کا اضافہ کیا گیا جب کہ پیداآوری گھٹ رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ زراعت یا صنعت کے شعبوں کے مقابلہ میں خدمت کے شعبہ میں پیداآوری تیزی سے کم ہوئی ہے۔ اور اسی شعبہ میں اجرت کی شرح زیادہ تیز رفتاری سے بڑھی ہے۔ ان حالات کی روشنی میں انگلستان کے مشہور معاشی رابنس نے دو ماہ قبل اس بات پر زور دیا تھا کہ مزدور کی پیداآوری میں اضافے کے بغیر اجرت میں اضافہ کرنے کی صورت میں بیروزگاری پھیلنے لگتی ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ پیداآوری میں اضافہ کیا جائے اور تھوڑی سی بے روزگاری کو برداشت کرتے ہوئے افراطِ زر پر روک لگائی جائے اور ساتھ ہی پیداآوری اور اجرت میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ: طالب علم کی ڈائری

نظریاتی نعروں میں مصروف رہے۔ لان کے اوپر والی منزل کے برآمدے میں کھڑی ہوئی جمعیت کی طالبات بائیں بازو والوں کے خلاف نعرے لگا رہی تھیں۔ وہاں پر کھڑے ہوئے بعض طلبا نے جوابی نعرے لگائے جس پر جمعیت کے چند کارکن مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے جوابی نعروں کو طالبات کی بے عزتی تصور کیا۔ چنانچہ انہوں نے جوابی نعرے لگانے والے طلبا کو منع کیا جس پر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ بائیں بازو کے ایک طالب علم نے پستول سے ہوائی فائر کیا۔ گولی چلتی دیکھ کر لان میں موجود طلبا ادھر ادھر بھاگنا شروع ہو گئے۔ دو منزلہ برآمدوں میں کھڑی ہوئی طالبات کی چیخ و پکار سے دل دہل کر رہ گئے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر طالب علم یا طالبہ بھاگ کر اپنی جان بچانا چاہتی تھی۔ ایک طالب علم نے خنجر بھی استعمال کیا۔ ابھی طلبا و طالبات جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ ہی رہے تھے کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے جوان کیمپس لان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو آنسو گیس پھینکی پھر بے تحاشا لاٹھی چارج کیا۔ فورس کے جوانوں نے لاٹھیوں کے علاوہ رائفلوں کے بٹ بھی استعمال کئے۔ نتیجۃً کئی طالب علم زخمی ہوئے۔ طلبہ کے دونوں گروہوں کے ہنگامے کے باعث ضیاء الحق غوری، بشریٰ نائب صدارت کے امیدوار منظور خان اور پروفیسر میاں عبدالعزیز زخمی ہو گئے۔ دوسرا ناخوشگوار واقعہ پہلے واقعہ کے کچھ ہی دیر بعد پیش آیا۔ جمعیت کے ایک کارکن نے پولیس کو بتایا کہ شعبہ صحافت میں موجود ایک طالبعلم کے پاس پستول ہے۔ آگے آگے مخبر اور پیچھے پیچھے پولیس کے جوان دندناتے ہوئے شعبہ صحافت میں داخل ہو گئے اور موصوف کو پکڑ لیا۔ اطلاع پاتے ہی غلام عباس نے موقع پر پہنچ کر زیر حراست طالبعلم کو رہا کرا لیا۔ اس کے بعد تھوڑا بہت ہنگامہ ہوا یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سارے ہنگامے کے دوران وائس چانسلر پروفیسر امتیاز کا کردار نہایت ہی عمدہ رہا۔ انہوں نے واقعی باپ بن کر پولیس سے طلبا کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ بات بڑے

افسوس سے کہی جاتی ہے کہ ہنگامہ کے دوران یونیورسٹی کے طلبا سے زیادہ بیرونی عناصر دکھائی دے رہے تھے۔ بیرونی نوجوان تو رہے درکنار بیرونی نوجوان لڑکیاں بھی کثیر مقدار میں دیکھنے میں آئیں۔ چنانچہ جامعہ پنجاب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ایک گزارش حکومت اور انتظامیہ کے گوش گزار کرانا چاہتا ہوں کہ آئندہ اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے کہ بیرونی عناصر خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں یونیورسٹی میں الیکشن کے دن آنے نہ پائیں۔

بقیہ: شیشہ و سنگ

سیاسی ماضی استعمال کیا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں یہ پراپیگنڈہ عام ہو گیا کہ احرار پاکستان کے دشمن ہیں انہوں نے ملک کو تباہ کرنے کے لیے تحریک ختم نبوت چلائی ہے۔ اس ضمن میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے مُلا اور اقبال جیسی بیہودہ تحریر لکھی لیکن سب سے افسوسناک منیر انکوائری رپورٹ تھی جس میں جسٹس منیر نے احرار کے خلاف پاکستان دشمنی کا فرسودہ اتہام جڑ کر نہایت شرمناک الفاظ میں حاشیہ آرائی کی۔ اس رپورٹ میں بعض سرکاری افسروں اور سی آئی ڈی کے دانشوروں کی رپورٹوں اور تقریروں کے فقرے نقل کئے گئے جن سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ انگریزوں کی ہندوستانی پولیس کے ملازم تھے انہوں نے کس قدر شرمناک الفاظ میں اُن لوگوں کے خلاف یاوہ گوئی کی ہے جو برطانوی عہد میں اُن کے آقایان ولایت کے خلاف لڑتے رہے اور اپنی دو تہائی جوانی قید و بند میں گزاری۔ ہم آج تک اس ذہنیت کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں کہ جو لوگ محمد عربی کے مقابلے میں مرزا غلام قادیانی کی نبوت گوارا کرتے ہیں اور انہیں اس استعماری اُمت کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں اور اعتراض ہے تو اُن لوگوں پر جو قائداعظم کی سیاسی شخصیت سے اختلاف رکھتے تھے حیرت ہے کہ محمد عربی کے مقابلے میں غلام احمد قبول ہے لیکن قائداعظم سے قبل از تقسیم کا سیاسی اختلاف ہمیشہ کے لیے ناقابل معافی ہے۔ اب ذرا ایک فہرست بنا لیجیے اور اُن تمام لوگوں کے نام یکجا کر لیجیے جو انگریزی سامراج کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں کہ وہ تو آج تک غدار ہیں اور جنہوں نے انگریزوں کی خاطر جہاد منسوخ کیا۔ نبی بن بیٹھے مسلمان ملکوں پر چڑھائی کی۔ حرمین شریفین سے لے کر انقرہ و قسطنطنیہ میں جاسوسی کرتے رہے اپنے ملک میں اپنی قوم کے خلاف برطانوی ایما پر خدمت بجا لائے اور سرمائیکل اڈوائر کو سپاسنامہ پیش کیا، وہ پاکستان میں محب الوطن اور قوم کی متاع ہیں۔ اگر معیار یہ ہے تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ تاریخ کے اصل فیصلہ کا انتظار کرو۔ تمہارے ماضی کی کالک آب کوثر بھی نہیں دھو سکتا۔

اشتہار زیر دفعہ ۵، رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب چودہری انور علی سینئر سول جج صاحب گجرات۔

دعویٰ نمبر ۳۸ سنہ ۱۹۷۴ء

مسماۃ بشریٰ بیگم دختر سید بشیر حسین شاہ قوم سید گلی مستریاں نزد موسیٰ شاہ والی فتو پورہ گجرات۔

بنام اسجاد حیدر ولد رشید حسین شاہ قوم سید سکنہ نیو سمن آباد۔ لاہور

دعویٰ تنسیخ نکاح

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی سجاد حیدر مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے۔ اس لیے اشتہار ہذا بنام سجاد حیدر ولد رشید حسین شاہ مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر سجاد حیدر مذکور تاریخ ۲۸ اپریل ۷۵ء کو مقام گجرات حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہو گا تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۱۰ مارچ ۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سینئر سول جج

(مہر عدالت)

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیّار جاسوس

گیانی: برائے مہربانی تشریف رکھیے۔ گیانی کرتار سنگھ ایک نو عمر اُستاد ہے اور پرانے طالب علموں کے متعلق بہت کم جانتا ہے۔ آپ مجھے دیش بھگت معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ ایسے لوگوں کی بے انتہا عزت کرتا ہوں۔ ’دیش بھگت‘ ایک ایسا نام ہے، کہ آجکل ملک میں ہر کہیں اس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ دیش بھگتوں کو دیکھنا، انہیں محبت کرنا ہے۔ دیش بھگت کے نام ہی میں باقی سب کچھ ہے۔ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ اعتماد انہی پر ہے حقیقتاً یہی لوگ اصل کام کے آدمی ہیں اور انہیں ملنا باعث مسرت ہے۔ یقین کریں، آپ ایک حیرت انگیز متاع ہیں۔ ایک دیش بھگت سے واقفیت، بہت بڑا اعزاز ہے اور میں خوش قسمت ہوں، کہ آپ سے واقفیت ہو گئی۔ آپ نے میرے غریب خانہ پر آ کر مجھے بے پایاں مسرت بخشی ہے۔ آپ کا آنا کس درجہ مبارک ہے اندر میں عرض نہیں کر سکتا کہ اس سے مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ آپ اس اہم موقع پر مجھ پر پورا پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ آپ تو وہ لوگ ہیں جو ہماری تاریخی جدوجہد آزادی کے اصل ہیرو ہیں۔ آپ مجھے ہی عجائب سنگھ سمجھیں، وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہے۔

(گیانی کے اس دیا کھیان سے مجھے حتمی طور پر معلوم ہو گیا، کہ گیانی سیوا سنگھ ہی وہ آدمی ہے جس کی وساطت سے عجائب سنگھ نے اپنے آپ کو خفیہ رکھا ہوا ہے اور یہ کہ گیانی نے مجھے ایک حقیقی دیش بھگت اور عجائب سنگھ کے معتمد اور ہمراز کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اب آثار کچھ امید افزا دکھائی دینے لگے۔ مجھے لب ساحل ایک قلعہ کی تلاش تھی جو میں نے پا لیا اور سنگ منزل اب میری نظروں میں تھا۔ گیانی نے دیش بھگتوں کے ساتھ اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کیا اور اس نے مجھے بھی، میرے رول کے پیش نظر ایک دیش بھگت ہی سمجھا۔ لہٰذا میں اظہار اطمینان کے طور پر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بیٹھ گیا اور کہا۔

میں: شکریہ گیانی صاحب، آپ سے مل کر انتہائی سکون حاصل ہوا ہے اور مجھے آپ سے شناسائی پر فخر ہے۔ آپ کے پاکیزہ ہاتھوں میں آ کر میں کتنا خوش قسمت واقع ہوا ہوں، میں یہاں قطعی طور پر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔

(ہم نے ایک دوسرے کو یقین دلایا کہ ہماری شناسائی دونوں کے لیے عزت افزائی اور مسرت و انبساط کا باعث ہے)

گیانی: آپ کے احوال کیا ہیں؟ آپ کو تو گھر جانا تھا؟

(اس سوال سے مزید واضح ہو گیا کہ گیانی کو اس بات کا علم ہے کہ امرتسر کے گردوارہ میں عجائب سنگھ سے آخری ملاقات کے بعد اسماعیل کو سیدھا اپنے گھر جانا تھا۔ اب میرے ذہن میں اس امر کے متعلق ذرا برابر بھی شک نہ رہا، کہ عجائب سنگھ نے گیانی کو وہ تمام کچھ بتایا ہوا ہے، جو اس کے اور اسماعیل کے درمیان پیش آیا۔ ان حالات میں، میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس بات کی نفی یا تردید نہ کرنا چاہیئے، جو عجائب سنگھ پہلے ہی گیانی کو بتا چکا ہے، لہٰذا میں نے اُسے دوبارہ یقین دلاتے ہوئے کہا۔)

میں: جی ہاں! مجھے اپنی والدہ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا، اس لیے میں گھر چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر جب مجھے یہ علم ہوا، کہ پولیس واپس وطن لوٹنے والوں کی چھان بین کر رہی ہے تو میں سخت ہراساں ہوا، ممکن تھا پولیس مجھے بھی اس سلسلہ میں آ لیتی۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں میں بھی پولیس کے ریکارڈ میں نہ آ جاؤں اور اس طرح کسی بدقماش پولیس افسر کی جھاڑ پوچھ گچھ کا شکار نہ ہو جاؤں۔ میں نے چُپ سادھے رکھی اور جب معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو گھر چھوڑ دیا۔ میں اپنی آمد اور رخصت کا کسی سے ذکر کیے بغیر راتوں رات وہاں سے بھاگ لیا۔ اُس دن سے میں مختلف بھیسوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اور یہاں بھی مجھے اس ناپائیدار دنیا میں چلنے والی حالات کی مخالفانہ ہوائیں ہی اُڑا لائی ہیں۔ میں مسلسل بھاگ رہا ہوں نہایت مشکل سے روزی کماتا ہوں، میں ایک کمزور، تھکا ماندہ اور کوچہ گرد انسان ہوں جو

روٹی کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترستا ہے
جس کا حلیہ بگڑ چکا اور لباس بوسیدہ ہو چکا
ہے جو تنگ و تاریک جگہوں میں چھپ کر
گردش لیل و نہار کو دھوکا دے رہا ہے جس
کے پاس نہ کھانے کو روٹی، نہ رہنے کو مسکن
ہے۔ جس کا کوئی متعین پتہ ہی نہیں اور جسے
کپڑا بدلنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ لیکن میں محسوس
کرنے لگا ہوں کہ جب کوئی منزل ہی نہ ہو
تو بلا مقصد دوڑتے رہنا بے سود ہے بسا
اوقات میں نے باغوں کے بنچوں پر راتیں
گزاری ہیں۔ میں آپ کے دروازے پر ایک
مفلوک الحال خانہ بدوش، ایک گداگر اور ایک
تہی کیسہ آوارہ گرد کی حالت میں پہنچا ہوں جس
کا اپنے ہی ملک میں، ملک ہی کے جذبۂ
خدمت کے باعث کوئی گھربار نہ رہا ہو، میرا
کوئی حال یا مستقبل نہیں۔ جو بہرحال میرے
ملک کے لیے نہ سہی، میرے خاندان کیلئے
تو ایک بدنما داغ ہے۔ میں ایک جگہ ٹک
کر کام نہیں کر سکتا اور مجھے بار بار کبھی ایک
اڈہ میں اور کبھی دوسری میں، روزگار تبدیل
کرنا پڑتے ہیں۔ اب میرے پاس نہ ہونے
کے برابر مصارف زندگی رہ گئے ہیں اور
آپ جانتے ہیں، خوراک و رہائش کے لیے پیسے
درکار ہیں۔ میں ایک مفرور، کنگال اور بے گھر
انسان ہوں، جس کی مجہول اور آوارہ زندگی
ناامیدیوں سے اٹی پڑی ہے۔ ممکنہ حد تک کم
سے کم وسائل پر گزارہ کرتا ہوں، میری دلگداز
سرگزشت، ایک تھکے ہارے مسافر کی کہانی
کی مانند ہے یا زخم خوردگی کا ایک ایسا
دردناک تجربہ، جسے بیان کرتے ہوئے بھی
درد کی ٹیسیں محسوس کرتا ہوں، بہرحال اپنی
زندگی کو دوبارہ منضبط کرنے اور اپنے لیے
مالی وسائل فراہم کرنے میں ابھی کچھ وقت
لگے گا۔

(گیانی نے اپنی ایک جیب میں سے کچھ رقم
نکالی، اور مزید رقم کے لیے دوسری میں ہاتھ ڈالا،
لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میں مسلسل
بیماری اور مصیبت کا بہانہ کیے ہوئے تھا۔)
میں بیمار ہوں۔ لیکن علاج کے لیے کسی ہسپتال
بھی نہیں جا سکتا۔ بھوک اور فاقہ کشی نے
میرا سایہ تک مجھ سے چھین لیا ہے، پھر
بھی میں زیادہ وقت سفر ہی کرتا ہوں جیسا
کہ آپ خود دیکھ رہے ہیں، اس سے میری
صحت پر اتنا برا اثر پڑا ہے کہ میری کنپٹیاں
سفید ہو گئیں اور سر پر سفید بالوں کی ٹکڑیاں
ظاہر ہونے لگی ہیں گویا میں اپنی عمر کے مقابلہ
میں تیزی سے بوڑھا ہو رہا ہوں۔ میرے
دو بچے ہیں، لیکن اپنے ہمہ وقتی فرار کے
باعث ان کی دیکھ بھال بھی میرے لیے
ممکن نہیں۔ میں نے یہ محسوس کرنا شروع
کر دیا ہے کہ میں اس وسیع دنیا میں یکہ و
تنہا ہوں۔ لیکن ہمیں اپنے ذاتی آرام و آسائش
کو اپنے قومی تقاضوں پر فوقیت نہیں دینی
چاہیئے۔ تمام دیش بھگت ہوشربا سادگی
سے گزارہ کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ غریب
لوگ ہی ہیں جو اس ملک کے تحفظ اور
بقار کی خاطر مشکلات کو برداشت کرتے
ہیں۔ ایک سنہری موقع ہمارے سامنے ہے
اور اسے ضائع نہیں ہونے دیں گے ہم مزید
انتظار کے قائل نہیں، وہ عظیم دن جس کی
ہمیں انتظار ہے، بالکل قریب ہے یہی
وقت ہے، کہ ان برطانوی جارحوں کو ملک
سے نکال باہر پھینکا جائے۔ صورت حال کی
نزاکت میں اضافہ ہو رہا اور آزادی ملک کا
ایک اہم ترین بنیادی مسئلہ آخری اور حتمی
حل کے قریب پہنچ رہا ہے۔ انقلابی تحریک
نے عوام الناس کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔
(میں نے اپنی مشکلات کا ذکر محض اس لیے
کیونکہ میرے بال اسماعیل کی نسبت زیادہ
سفید تھے۔ ظاہر ہے راتوں رات کسی کے بال سفید
نہیں ہو جایا کرتے۔ اسماعیل تو بمشکل ۳۰ سال
کے قریب تھا، اسی وجہ سے میں گیانی کو ذہنی طور
پر تیار کر رہا تھا کہ وہ جب عجائب سنگھ سے ملے
تو اسماعیل کی مذکورہ بالا توضیح و تشریح کی رو سے
یہ ثابت کر سکے کہ اسے ملنے والا شخص حقیقتاً
اسمعیل ہی تھا جس نے اپنی شخصیت کے متعلق
زبانی طور پر مطمئن اور اپنی عمر کو ایک وضع
کردہ توضیح کے بل پر غلط ثابت کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔)

گیانی، جب تم اوپر سے اترے تو کوئی خاص واقعہ
پیش آیا؟

(یہ ایک ایسا سوال تھا، جس سے مجھے محسوس ہوا، کہ میں اپنے منتہائے مقصود کو پہنچ چکا ہوں اس معمولی فقرے میں عجائب سنگھ کے مشن کے متعلق گیانی کی معلومات کی کئی جلدیں مضمر تھیں، درحقیقت وہ ابھی تک میرے اور عجائب سنگھ کے تعلقات اور اس مشن میں میری شرکت کا اندازہ کر رہا تھا حالانکہ ایسا کرنے میں وہ عجائب سنگھ کے ساتھ اپنے تعلقات کو واشگاف کر رہا تھا، میرے نزدیک وہ محتاط انداز میں اقبال جرم کا مرتکب ہو رہا تھا اور میرا کیس اب واضح شکل اختیار کر رہا تھا، گیانی کے اس سوال کا، کہ ہمیں زمین پر اترتے وقت کیا پیش آیا، میں نے یوں جواب دیا۔)

میں: ہاں اس کے پیچھے ایک قابل بیان کہانی ہے ہمیں پو پھٹتے ہی جنگل سے باہر آسام کے ایک گاؤں کے نواح میں اُتارا گیا۔ ہمیں دیکھ کر دیہاتی خوف زدہ ہو گئے اور ادھر اُدھر دوڑنے لگے جب کہ ہم اپنی جگہ پائے جانے کے خوف سے بعجلت گھنے جنگل میں چھپ گئے، وہاں سے ہم ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور پٹنہ تک گاڑی میں سفر کیا۔ ہم شہری گوردوارہ میں آخری بار ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

(جب میں اس واقعہ کی تفصیلات بیان کر رہا تھا، گیانی اس کی صداقت سے اس درجہ مطمئن تھا، کہ اس کا اطمینان اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا، جس سے یہ حقیقت عیاں تھی، کہ اُسے پہلے سے اس تمام معاملے کا کس حد تک علم ہے)

میں: ازراہ کرم، عجائب سنگھ سے میری ملاقات کا اہتمام کریں۔

گیانی: گھبرائیں نہیں، آپ نہائیں، کھانا کھائیں اور آرام کریں۔

(وہ ایک خوش اخلاق خانہ دار آدمی معلوم ہوتا تھا، وہ ایک میزبان کی طرح میرے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور مجھے کھانا کھانے کے لیے کہا، وہ حقیقت میں ایک بے تکلف گھریلو ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن میں نے اپنے چہرے پر علالت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا)

میں: نہیں شکریہ! جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میری طبیعت علیل و ناسازہے اور میں ابھی نہانے یا اپنی پسند کے علاوہ کوئی کھانا کھانے کے قابل نہیں ہوں۔

(میں نے دوائی کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جسے دکھا کر میں اپنی علالت کا ثبوت دینا چاہتا تھا میں ذرا زور سے کھانسا، اور گیانی کو بتایا کہ مسلسل اذیت ناک کھانسی کا شکار ہوں، مزید یہ کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ یہ صرف میں نے اس لیے کہا کہ میں تو اُس کے سامنے رُوپ تبدیل کئے ہوئے تھا، اگرچہ ہمیشہ میرے علم میں ہوتا ہے کہ میرا ریوالور کہاں ہے، تاہم میں کھلی آنکھوں کسی پھندے میں پھنسنے کو تیار نہ تھا، میں ہر وقت قمیص کے نیچے بدن کے ساتھ اپنا ریوالور لٹکائے رکھتا اور اس صورت میں نہانے کے لیے نہ تو میں اپنے کپڑے اُتار سکتا اور نہ اُس کے مکان کے اندر گھس سکتا، مبادا کہ گیانی میرا پستول دیکھ لے یا عجائب سنگھ بذات خود چھپ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کرے۔ سب سے زیادہ خدشہ جو مجھے لاحق تھا، وہ یہ کہ گیانی، عجائب سنگھ کو خفیہ طور پر میرے پہلو میں بٹھا کر مجھ سے گفتگو کرانا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں اسماعیل ہونے کی حیثیت میں میرے پاس ریوالور کا ہونا خالی از علت نہ تھا، کیونکہ جاپانیوں کی طرف سے دیا گیا ریوالور تو جہاز سے اترتے ہی ضائع ہو چکا تھا، میں ایک محتاط اور چوکس ڈرائیور کی مانند تھا، جسے چلنے میں انتہائی احتیاط لازم تھی، اور اُس سے زیادہ ضروری اپنی شخصیت کا اخفاء! اپنے اختیار کردہ رول سے ذرا سا انحراف میرے لیے ناقابل تلافی تکلیف اور نقصان کا باعث ہو سکتا تھا، مجھے خطرہ تھا کہ مبادا کوئی اتفاقی لغزش میری گمراہی کا باعث ہو جائے یا یہ کہ تازہ بہانے وضع کرنے سے پہلے، میرا ذخیرۂ حیلہ سازی ختم ہو جائے، میں اس لیے بھی فکر مند تھا کہ کہیں اس مہم میں میری ناکامی، محکمہ میں میری ساکھ کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو، اور صورت حال جیسی کہ ہے، اس سے بھی ابتر نہ ہو جائے)

گیانی: میں آپ کے لیے، آپ کی پسند اور ذائقہ کے مطابق کھانا تیار کروا سکتا ہوں۔

میں: نہیں، میں انتظار نہیں کر سکتا، مجھے جانا ہے!

گیانی: (ایک میز رکھتے ہوئے مشروبات کی پیش کش کے ساتھ)

بیئر کے ایک آدھ پیگ میں کیا ہرج ہے؟ اس سے آپ کو اک گونہ فرحت حاصل

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب محمود خالد سول جج گجرات

دعویٰ تنسیخ نکاح نمبر ۱ آف ۱۹۷۵ء

مسرت دختر محمد شفیع سکنہ ٹونڈ پور گجرات

(مدعیہ)

بنام: فقیر الدین عرف فقرو ولد ریاقوم جوگی، سکنہ ملت آباد محلہ ملکی نگر بالمقابل ریکس سینما گلی نمبر ۲ للکا موڑ سرگودھا (مدعا علیہ)

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی فقیر الدین مذکور تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے، اس لیے اشتہار ہذا بنام فقیر الدین (مدعا علیہ) مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہ مذکور ۲۹ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء کو مقام گجرات حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آئے گی۔

آج تاریخ ۷ ماہ مارچ ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

مہر عدالت

ہوگی۔

میں: آپ کا بہت بہت شکریہ! نشہ آور چیزوں سے مجھے انتہائی نفرت ہے۔

گیانی: ہاں، میں آپ کی مذہبی مجبوریوں سے آگاہ ہوں، میں نے بھی محض دوا کے طور پر ہی کہا تھا تو پھر آپ ٹرالوز کھالیں!

بعدالت جناب خان محمد ارشد خان سول جج درجہ اول بینیٹ کنٹرولر، فیملی جج سرگودھا۔

مقدمہ ۵۳۲ رجوعہ ۲/۱۱ ۷۴

دعوے دخلیابی بذریعہ حق شفع

(۱) نور محمد ولد خان قوم قاضی بھٹی (۲) نتھا خان (۳) غلام حسین (۴) فضل حسین (۵) محمد حیات پسران بدر دین اقوام ملک۔ منظور حسین ولد غلام نبی قوم نجوا (۷) احمد ولد سردارا قوم سپرا (۸) فیض محمد ولد ... قوم ملک سکنائے مرولیانوالہ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا بنام (۱) خدا بخش ولد زیادہ (۲) غلام مرتضیٰ ولد خدا بخش اقوام ملک۔ (۳) محمد حیات (۴) محمد منظیم پسران یٰسین اقوام سکنائے موضع علیانی تحصیل بھلوال (۵) محمد بشیر (۶) محمد نذیر پسران نبی بخش اقوام رانا (۷) غلام رسول ولد صدر دین قوم کہوٹ سکنہ علیانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔

مقدمہ عنوان بالا نور محمد وغیرہ نے دائر کیا ہوا ہے اور مدعا علیہم ۱تا۶ دانستہ طور پر حاضر ہونے سے گریز کرتے ہیں اور روپوش ہیں، اس لیے ان کے نام اشتہار اخبار جاری کیا جاتا ہے کہ اگر وہ تاریخ پیشی مقررہ ۱۰ اپریل ۷۵ء کو عدالت میں حاضر نہیں ہوں گے۔ تو ان کے خلاف قانونی کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔ ۳/۳/۷۵ ۱۹

دستخط سول جج درجہ اول

(مہر عدالت)

میں: نہیں، مجھے وہ بھی پسند نہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، میری دلیار صحت لڑکھڑا چکی ہے

گیانی: میں آپ کے لیے تمام ترکھانے حاضر کرنے

باقی صفحہ ۳۷ پر

بقیہ: مسجد میں شراب

حرمت و تقدس کو پامال کر کے نہ صرف خود اپنی قبر ہی جہنم کے انگاروں سے نہیں بھری بلکہ پورے پاکستانی معاشرے پر خدا کے غضب کو ٹوٹ پڑنے کی دعوت دی ہے۔ گذشتہ دنوں عدالت میں علماء کو برہنہ کر کے ان کے ساتھ فاحشہ عورتوں کے فوٹو لیے گئے، اور اب براہِ راست 'خانۂ خدا' کو 'شراب خانہ' بنانے کی سازش کی گئی ——

کیا انسانی تاریخ میں اس سے بڑھ کر بیمار ذہنیت کا مظاہرہ کبھی دیکھنے میں آیا ہے —— ؟

(۲) اس افسوسناک واقعہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ تفتیش کا یہ عمل ملک بھر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہوا، اور اخبارات میں بتایا گیا کہ یہ ملک دشمن عناصر کے خلاف مہم کا ایک حصہ ہے۔ ٹھیک اسی تفتیش کے دوران جامع مسجد رشیدیہ سے 'شراب کی بوتل' برآمد کرنے سے کیا عوام کو یہ تاثر نہیں ملے گا کہ ملک بھر کی تعلیم گاہوں سے جو بھاری 'اسلحہ' برآمد کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت بھی مسجد سے شراب برآمد کرنے سے زیادہ نہیں —— ؟

(۳) اس واقعہ سے پولیس کی کارکردگی کا بھرم بھی اچھی طرح کھل جاتا ہے۔ فرضی مقدمات بنانے کے فن میں پولیس پہلے بھی کافی نیک نام ہے۔ لیکن اس تفتیش سے تو پولیس کی نیک نامی میں ایسا اضافہ ہوا، کہ پاکستان کی تاریخ میں ایک الوکھی یادگار حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۴) اس واقعہ سے عوام میں جو خوف و ہراس کی فضا پھیل گئی ہے۔ اس کا اظہار نوک قلم سے ممکن نہیں، ہر شریف شہری احساس عدم تحفظ کا شکار ہے کہ جانے کس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تفتیش کا چکر چل جائے اور اس کے گھر سے نا معلوم کیا کیا نکال لیا جائے؟

(۵) اس واقعہ کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہے کہ گندگی اور تعفن سے انسانیت دم بخود ہے —— خود غرضی اور ابلہ فریبی کا یہ آخری نقطہ ہے۔ اب اس سرزمین کا کوئی ٹکڑا دجل و تلبیس کے شیطانی حربوں سے محفوظ نہیں رہا۔ آج اگر مسجد سے شراب برآمد کی جاسکتی ہے اور تہذیب و شرافت کو دم مارنے کی اجازت نہیں تو کل کلاں اس سے بڑے حادثے کی توقع بے جا نہیں جو لوگ اپنی نجس فطرت کے ذریعہ خدا کے پاک گھر کو شراب سے ملوث کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی شریف انسان کی عزت و ناموس کی کیا لاج ہوگی؟ اور جن افسروں کو قومی خزانے سے موٹی موٹی تنخواہیں صرف اس مقصد کے لیے دی جاتی ہیں کہ وہ انسانیت کے دامن کو غنڈوں کی دستبرد سے بچائیں، جب انہیں کے ہاتھوں سے خدا کے گھر کا دامن تقدس تار تار ہو جائے تو انسانوں کی عزت و ناموس کو ٹکے سیر بیچ دینے کے لیے وہ کیوں تیار نہ ہوں گے —— ؟ جن کو خدا سے شرم نہ آئی وہ انسانوں سے کیوں شرمائیں گے؟

(۶) بہرحال جن لوگوں نے دینی مدارس سے اسلحہ اور مسجدوں سے شراب برآمد کرنے کا گھناؤنا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے عوامی حکومت کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ خدا اور رسولؐ سے غداری ملک و ملت سے بے وفائی اور خود حکومت سے بدی کا ارتکاب کیا ہے۔ شعائر اللہ کی توہین کی ہے، اسلام کا مذاق اڑایا ہے، مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کو پامال کیا ہے ایسے لوگ دنیا و آخرت میں ذلیل ہوں گے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

تحریر: محمد یونس حسنی

اختر شیرانی کا فن

رباعی وقطعہ اور فردیات

اختر نے قطعات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ لیکن ان سے انھیں کچھ زیادہ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ ان کے کلیات میں تقریباً آٹھ رباعیات اور چار قطعے شامل ہیں۔ ساڑھے چھ سو صفحات کے ضخیم کلیات ہیں۔ رباعیات وقطعات کی یہ تعداد ناقابلِ اعتنا ہے۔ رباعیاں تقریباً تمام رندمشربی کے جذبات پر مشتمل ہیں۔ نمونے کے طور پر دو رباعیاں نقل کی جاتی ہیں ؎

رندوں کو بہشت کی خبر دے ساقی
اک جام پلا کے مست کر دے ساقی
پیمانۂ عمر ہے چھلکنے کے قریب
بھر دے ساقی شراب بھر دے ساقی

موسم بھی ہے عمر بھی شباب بھی ہے
پہلو میں وہ رشکِ ماہتاب بھی ہے
دنیا میں اب اور چاہیے کیا مجھ کو
ساقی بھی ہے ساز بھی شراب بھی ہے

اختر کے یہاں فردیات بھی کافی ہیں جو ان کے مجموعے "شہرود" کے آخر میں "نمونۂ ناتمام" کے ذیل میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے فرد کی یہ تعریف کی ہے کہ:

"فرد ایک شعر یا دو مصرعے ہوتے ہیں۔ ان میں قافیہ کی کوئی قید نہیں یہ دونوں مصرعے ہم قافیہ ہو سکتے ہیں یا مختلف القافیہ۔ جب کوئی اچھا کلام سرانجام پا جاتا لیکن اور شعر لکھ کر غزل پوری نہ کی جا سکتی تو ایسا شعر تنہا چھوڑ دیا جاتا۔ ایسے ہی شعر فرد کہلاتے ہیں۔"

اختر سے بھی بعض ایسے اشعار سرزد ہو گئے ہیں جن پر کوئی غزل یا نظم مکمل نہیں ہو سکی۔ ایسے اشعار چونکہ ذہن کی ایک کیفیت کے تحت سرانجام پاتے ہیں اس لیے ان میں اعلیٰ درجے کے اشعار نکل آتے ہیں۔ اختر کے فردیات میں بھی بعض قابلِ قدر اشعار شامل ہیں ؎

سحر کے وقت یہ مژدہ لیے ابرِ بہار آیا
مبارک اے زمیں! پیغمبرِ گردوں وقار آیا

ابرِ بہار جب کبھی آیا رلا گیا
بادِ بہار آگ سی دل میں لگا گئی

میری تنہائی کی توہین نہ ہوتی یارب
کوئی آنسو مری پلکوں کا سہارا ہوتا

نگاہوں میں مستی، لبوں پر تبسم
بہار آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

دنیا کے رنج وعیش ہیں کس اعتبار کے
دو دن خزاں کے ہوتے ہیں دو دن بہار کے

نظم کا تسلسل

اختر کے فن کی ایک خوبی جو تمام خوبیوں میں جزوِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے تسلسلِ خیال ہے تسلسل پسندی غزل اور رباعیئے کے لیے معیوب ہے لیکن نظم میں تسلسل کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اختر بنیادی طور پر نظم نگار شاعر ہیں۔ اس لیے اپنی منظومات میں تسلسلِ خیال کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں ان کی نظموں کے اشعار زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہوتے ہیں۔ وہ جوشؔ کی طرح خیال کے زیاں پر زبان کا سود حاصل نہیں کرتے۔ مستزاد میں ربط کو برقرار رکھنا کسی قدر دشوار کام ہے لیکن اختر نے بڑے گتھے ہوئے شعر کہے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

ننھی ننھی بوندیں گرتی ہیں حجابِ ابر سے — بانقابِ ابر سے
چھن رہا ہے قطرے بن بن کر ستاروں کا ہجوم — ابر پاروں کا ہجوم

پہلے مصرعے کا مستزاد دوسرے مصرعے کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکے گا۔ اور اس طرح دونوں مصرعے باہم اس طرح مربوط ہو گئے ہیں کہ ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم "اُڑتے ہوئے پائیں باغ میں" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ٹیپ اور اس سے قبل کے مصرعے میں جو گہرا ربط قائم ہے اس نے پورے بند کو اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ ایک مصرع بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ؎

ایک دن خوشبو کا طوفاں بن کے آتی تھی صبا
میکدے سے لاتی گھٹا، مستی لٹاتی تھی صبا
بلبلوں کے نغمے سن کر رنگ لاتی تھی صبا
شاخِ گل کے بربطوں پر گنگناتی تھی صبا
طائرانِ تعلمکے اشعار پائیں باغ میں

صرف شعروں میں ہی نہیں ان کے ایک شعر کے دونوں مصرعوں میں غیر معمولی ربط ہوتا ہے۔ دیکھیے مندرجہ ذیل شعر کے پہلے مصرعے کا آخری لفظ "یا" ہے۔ اس کے بعد قاری کا ذہن دوسرے مصرعے کا شدت سے تقاضا کرتا ہے کیونکہ پہلے مصرعے نے اسے تشنگی آشنا کر دیا ہے ؎

ادھر سے ادھر سے بادلوں میں بجلیاں منظر بنیا

تسلسل کچھ ناگنیں نا سوں میں بل کھاتی ہوتی

تسلسل بیان میں یہ عبارت انگریزی ادب کے مطالعے ـ ۶۱۸۷۸۸ کے تصور سے اشپنسری کا واضح نتیجہ ہے ـ

اختر کے فن کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رہنا ہی ہے کہ انہوں نے ہیئت میں جو اجتہادات کے اور جن ہیئتوں سے اردو کو روشناس کرایا وہ محض برائے جدت نہیں تھے ـ مستزادئیت اور ہیئے وغیرہ کو انہوں نے غنائیت، لطافت اور رومانیت کے تقاضوں کے تحت اختیار کیا ـ سانیٹ کو فروغ دینے میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا تھا ورنہ دو مصرعوں پر مشتمل قطعے بھی لکھے جا سکتے تھے اور مختصر منظومات بھی ـ لیکن اختر جن خیالات کا اظہار کر رہے تھے وہ انگریزی میں سانیٹ میں بڑی کامیابی سے ادا کئے جا چکے تھے ـ خیال اپنے اظہار کے لیے خود پیکر خود تراشتا ہے ـ اختر کی استعمال کردہ ہیئتوں میں اسی لیے آورد کے بجائے آمد کا احساس ہوتا ہے ـ

چند خامیاں

اگرچہ اختر کی فنی خامیوں کو ہم ان کی خوبیوں کے ساتھ ہی بیان کر آئے ہیں لیکن یہاں ان کی چند اور خامیوں کی طرف توجہ دلا دینا نامناسب نہ ہوگا ـ اختر اگرچہ نظم نگاری کا ملکہ رکھتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کی منظومات میں آورد کا احساس بڑا شدید ہو جاتا ہے ـ ایسے موقعے پر ان کی شاعری شعرگری بن کر رہ جاتی ہے جس میں الفاظ کے بطلے روح جسم ہوتے ہیں اور قافیہ پیمائی کا مظاہرہ ـ ایک نظم "آنسو" کے چند شعر دیکھیے ـ شعریت کا فقدان اور آورد کی افراط نے نظم کو موزوں اثر سے بے تعلق کر دیا ہے حالانکہ یہ موضوع ایسا نہ تھا ـ

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے تمہارے آنسو
بن گئے شامِ محبت کے ستارے آنسو
دیکھ سکتا ہے بھلا کون یہ پیارے آنسو
میری آنکھوں میں نہ آ جائیں تمہارے آنسو
شمع کا عکس جھلکتا ہے جو ہر آنسو میں
بن گئے بھیگی ہوئی رات کے تارے آنسو
ہیئت کی بوندوں کی طرح ہو گئے سب بے کیوں آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو

اسی طرح "پہلا خط" میں نفسِ خط سے بحث کرنے کے بجائے اس کی توصیف میں بلا وجہ الفاظ ضائع کئے گئے ہیں ـ نظم جذبات کی اس گرمی سے خالی ہے جو اختر کی رومانی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ـ اس میں حزنیہ الفاظ کا مظاہرہ ہے ـ قصیدہ نگاری کی طرح ذہنی بلند پروازی دکھائی گئی ہے اور شعرگری کی نمائش کی گئی ہے ـ ملاحظہ ہو ـ

یہ پھول ہے کہ پھول سے عارض کا عکس ہے
یکسر بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط
حیران ہوں کہ ان میں سے کس پر کروں یقین
یہ بے حجاب طرز یہ بے گانہ وار خط
کس نازنیں کے ہاتھ کا پرتو ہے کیا کہوں؟
یہ خال یہ دلفریب خطا اور عطرِ یار خط
میری نگاہِ شوق سے شرما کے کیوں نہ یہ
اک پردہ دارِ حسن کا ہے پردہ دار خط
ایک ایک حرف دل میں سما جائے ناز سے
پڑھتا ہوں اس لیے میں ترا بار بار خط

بعض اوقات خلافِ محاورہ الفاظ بھی باندھ گئے ہیں ـ مثلاً ؏

مجھ کو کیوں ہو گئی الفت مرے پروردگار اس کی

اس کی الفت ہونا نہیں اس سے الفت ہونا بولتے ہیں ـ کی "ایسے موقع پر بولتے ہیں اس کی الفت میں یہ حال ہوا ـ لیکن چونکہ نظم میں "اس کی" ردیف ہے اس لیے مجبوراً اس طرح باندھ گئے ہیں ـ شکستِ ناروا، تعقیدِ لفظی اور شعرگری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ؎

روحِ انسان تھی ابھی نا محرمِ رازِ الست

ہفت روزہ چٹان لاہور

ہستی شیطاں سراسر قدس اک غساد کقی
یہ شادی وہ ہے جسے والدین کرتے ہیں
ادا سمجھ کے جسے فرض عین کرتے ہیں
محبت دنیا میں کیوں بدنام اس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور وہ کچھ اور مستی ہے
ظلمت بدوش ہے مری دنیائے عاشقی
تاروں کی مشعلیں نہ چرائیں تو کیا کریں

اختر کا نثری اسلوب

نثر میں اختر کے کئی اسالیب ہیں لیکن بنیادی اسلوب وہی ہے جسے ہم "ادب لطیف" کا نام دیتے ہیں۔ اصغر گونڈوی ادب لطیف کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ادب لطیف کا اصل مفہوم اس طرز انشا سے ہے جو وسعت علم اور احساس شعریت وحکیمانہ نزاکت خیال کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔"

وسعت علم، احساس شعریت اور حکیمانہ نزاکت خیال بڑی مجمل تراکیب ہیں اور خود تعبیر و تشریح کی محتاج ہیں۔ دراصل رومانیت کی طرح "ادب لطیف" بھی ایسی ادبی اصطلاح ہے جس کے مفہوم کا احاطہ چند الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبدالودود اپنے تحقیقی مقالے "اردو نثر میں ادب لطیف" میں کہتے ہیں۔

"تخیل کی پرستش، جمالیاتی احساس اور انفرادیت کے حصول کے لیے مروجہ سماجی اقدار سے۔ باغی کی کوشش کے علاوہ پرتکلف اسلوب ادب لطیف کا لازمی عنصر ہے۔"

اس پرتکلف اسلوب کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں:

"رومانی تخیل کی حسن کاری، تراکیب کی شگفتگی، الفاظ کی مینا کاری اور طرز ادا کی لطافت کو بھی ادب لطیف کے عناصر ترکیبی میں شامل کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر عبدالودود کی بیان کردہ خصوصیات کے امتزاج و ترکیب سے جو اسلوب نثر مرتب ہوتا ہے اس کا نام ادب لطیف ہے۔ ادب لطیف میں بھی رومانیت کی طرح تخیل کی حسن آگینی اور الفاظ کی مینا کاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ادب لطیف کی تحریک ابتدائی دور میں بعض ایسے حضرات کے ہاتھوں میں رہی جو عربی فارسی سے زیادہ متاثر تھے اس لیے ان کی عبارت میں فارسی و عربی الفاظ و تراکیب کی بہتات ہے۔ اس اسلوب پر علمی گراں مایگی کا شبہ ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصغر گونڈوی نے وسعت علم کو ادب لطیف کے عناصر ترکیبی میں شمار کیا۔

جہاں تک اختر کا تعلق ہے ان کی نثر میں ادب لطیف کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ رومانی شاعر ہونے کی وجہ سے ان میں وہ انفرادیت و انانیت ہے جو فن کار کو دوسروں کا منت کش ہونے سے باز رکھتی ہے وہ اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اسی لیے اس کا اسلوب اپنے ہم خیال فن کاروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اختر ادب لطیف کے دوسرے فن کاروں سے اسی معنی میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ادب لطیف میں تخیل فکر سے زیادہ جذبے کا پابند ہوتا ہے۔ فکری گراں مایگی سے زیادہ جذباتی وفور پر زور دیا جاتا ہے۔ اختر جذباتی انسان، جذباتی شاعر اور جذباتی انشا پرداز ہیں ان کی نظم کی طرح ان کی ادبی نثر میں بھی جذبات کا سیل رواں، مچلتا اور دھومیں مچاتا نظر آتا ہے۔ الفاظ و تراکیب کی تکرار، ندائیہ و استعجابیہ الفاظ کا بکثرت استعمال، الفاظ کے صیغہ جمع سے کام لینا یہ سب باتیں دراصل تخیل کی بلند پروازی کی تسکین کے لیے ہیں۔

نظم کی طرح نثر میں بھی اختر کا اسلوب بڑی حد تک الفاظ و تراکیب کا مرہون منت ہے۔ وہ شیریں رواں اور سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں، حسین اور دلنواز تراکیب سے نثر میں وہ رعنائی پیدا کرتے ہیں جو اسے نظم کے ہم پلہ کر دے۔ ذیل کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو ادب لطیف کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

"ہوا کی تحریک سے دامن گل برگ پہ رزتے والے قطرۂ شبنم کی طرح سینے میں دل، آنکھوں میں آنسو، دماغ میں تخیل اور ہاتھ میں قلم کانپ رہا ہے۔ تھرتھرا رہا ہے۔ تم سے خطاب کرنا، تمہاری حسین و نازنین اور نازک و رعنا ہستی سے خطاب کرنا اس ویران و بے کیف دنیا میں! اس دنیا کی تلخ و ناگوار بے رنگیوں میں اس سے زیادہ لذیذ اور رنگین و روشن خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ آہ اس کے تو تصور میں مرجانا ہی حسین ترین خوش نصیبی ہے۔ مگر آہ زمانے کی ستم پیشگی کو کس زبان سے بددعا دوں؟ جس نے میرے دل کو زخمی! میرے دماغ کو ماؤف! میرے جذبات کو مجروح اور میرے حسیات کو ذبح کر کے ہلاک کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تم سے اس طرح جو بولا دکھڑا، اور تم مجھ سے اتنی دور۔ اس قدر دور۔ آہ قسمت کی کوتاہیاں ہائے فطرت کی ستم آرائیاں۔

نور کی کچھ ناگنیں ناسوں میں بل کھاتی ہوئی

تسلسل بیان میں یہ عبارت انگریزی ادب کے مطالعے ۱۹۴۸ء کے تصور سے اشپنیری کا واضح نتیجہ ہے۔ اختر کے فن کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رہنا ہے کہ انہوں نے ہیئت میں جو اجتہادات کیے اور جن ہیئتوں سے اردو کو روشناس کیا وہ بت برائے جدت نہیں تھے۔ مستزادئیت اور ہیئے وغیرہ کو انہوں نے غنائیت، رطافت اور رومانیت کے تقاضوں کے تحت اختیار کیا۔ سانیٹ کو فروغ دینے میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا تھا ورنہ دو مصرعوں پر مشتمل قطعے بھی لکھے جا سکتے تھے اور مختصر منظومات بھی۔ لیکن اختر جن خیالات کا اظہار کرتے تھے وہ انگریزی میں سانیٹ میں بڑی کامیابی سے ادا کیے جا چکے تھے۔ خیال اپنے اظہار کے لیے نیا پیکر خود تراشتا ہے۔ اختر کی استعمال کردہ ہیئتوں میں اسی لیے آورد کے بجائے آمد کا احساس ہوتا ہے۔

چند خامیاں

اگرچہ اختر کی فنی خامیوں کو ہم انکی خوبیوں کے ساتھ ہی بیان کر آئے ہیں لیکن یہاں انکی چند اور امیوں کی طرف توجہ دلا دینا نامناسب نہ ہوگا۔ اختر اگرچہ نظم نگاری کا ملکہ ہے لیکن بعض اوقات ان کی منظومات میں آورد کا احساس بڑا شدید ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعے پر انکی شاعری شعرگری بن کر رہ جاتی ہے جس میں الفاظ کے بے روح جسم ہوتے ہیں اور قافیہ پیمائی کا مظاہرہ۔ ایک نظم "آنسو" کے چند شعر دیکھیے۔ شعریت کا فقدان اور آورد کی افراط نے نظم کو موزوں اثر سے بے تعلق کر دیا ہے حالانکہ یہ موضوع ایسا نہ تھا۔

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے تمہارے آنسو
بن گئے شامِ محبت کے ستارے آنسو
دیکھ سکتا ہے بھلا کون یہ پیارے آنسو
میری آنکھوں میں نہ آ جائیں تمہارے آنسو
شمع کا عکس جھلکتا ہے جو ہر آنسو میں

ہفت روزہ چٹان لاہور

بن گئے بھیگی ہوئی رات کے تارے آنسو
مینہ کی بوندوں کی طرح ہو گئے سستے کیوں آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو

اسی طرح "پہلا خط" میں نفسِ خط سے بحث کرنے کے بجائے اس کی توصیف میں بلا وجہ الفاظ ضائع کیے گئے ہیں۔ نظم جذبات کی اس گرمی سے خالی ہے جو اختر کی رومانی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں حرف بیہ الفاظ کا مظاہرہ ہے۔ قصیدہ نگاری کی طرح ذہنی بلند پروازی دکھائی گئی ہے اور شعر گری کی نمائش کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو ـــ

یہ پھول ہے کہ پھول سے عارض کا عکس ہے
یکسر بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط
حیران ہوں کہ ان میں سے کس پر کروں یقیں
یہ بے حجاب طرز یہ بے گانہ وار خط
کس نازنیں کے ہاتھ کا پرتو ہے کیا کہوں؟

یہ خط ہے یہ دل فریب خط اور عطر بار خط
میری نگاہِ شوق سے شرمائے کیوں نہ یہ
اک پردہ دارِ حسن کا ہے پردہ دار خط
ایک ایک حرف دل میں سما جائے ناز سے
پڑھتا ہوں اس لیے میں تو بار بار خط

بعض اوقات خلافِ محاورہ الفاظ بھی باندھ گئے ہیں۔ مثلاً ؎

مجھے کیوں ہو گئی الفت مرے پروردگار اس کی

اس کی الفت ہونا نہیں اس سے الفت ہونا بولتے ہیں۔ "کی" ایسے موقع پر بولتے ہیں اس کی الفت میں یہ حال ہوا۔ لیکن چونکہ نظم میں "اس کی" ردیف ہے اس لیے مجبوراً اس طرح باندھ گئے ہیں۔ شکستِ ناروا، تعقیدِ لفظی اور شتر گربگی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ؎

روحِ انساں تھی ابھی نامحرمِ رازِ الست

ہستی شیطاں سراسر قدس اک فساد تھی
یہ شادی وہ ہے جسے والدین کرتے ہیں
ادا سمجھ کے جسے فرض عین کرتے ہیں
عبث دنیا میں کیوں بدنام اس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور، کچھ اور مستی ہے
ظلمت بدوش ہے مری دنیائے عاشقی
تاروں کی مشعلیں نہ چرائیں تو کیا کریں

اختر کا نثری اسلوب

نثر میں اختر کے کئی اسالیب ہیں لیکن بنیادی اسلوب وہی ہے جسے ہم "ادب لطیف" کا نام دیتے ہیں۔ اصغر گونڈوی ادب لطیف کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ادب لطیف کا اصل مفہوم اس طرز انشا سے ہے جو وسعت علم اور احساس شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔"

وسعت علم، احساس شعریت اور حکیمانہ نزاکت خیال بڑی مجمل تراکیب ہیں اور خود تعبیر و تشریح کی محتاج ہیں۔ دراصل رومانیت کی طرح "ادب لطیف" بھی ایسی ادبی اصطلاح ہے جس کے مفہوم کا احاطہ چند الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبدالودود اپنے تحقیقی مقالے "اردو نثر میں ادب لطیف" میں کہتے ہیں۔

"تخیل کی پرستش، جمالیاتی احساس اور انفرادیت کے حصول کے لیے مروجہ سماجی اقدار سے بغاوت کی کوشش کے علاوہ پرتکلف اسلوب ادب لطیف کا لازمی عنصر ہے۔"

اس پرتکلف اسلوب کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں:

"رومانی تخیل کی حسن کاری، تراکیب کی شگفتگی، الفاظ کی مینا کاری اور طرز ادا کی لطافت کو بھی ادب لطیف کے عناصر ترکیبی میں شامل کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر عبدالودود کی بیان کردہ خصوصیات کے امتزاج و ترکیب سے جو اسلوب نثر مرتب ہوتا ہے اس کا نام ادب لطیف ہے۔ ادب لطیف میں بھی رومانیت کی طرح تخیل کی حسن آگینی اور الفاظ کی مینا کاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ادب لطیف کی تحریک ابتدائی دور میں بعض ایسے حضرات کے ہاتھوں میں رہی جو عربی فارسی سے زیادہ متاثر تھے اس لیے ان کی عبارت میں فارسی و عربی الفاظ و تراکیب کی بہتات ہے۔ اس اسلوب پر علمی گراں مایگی کا شبہ ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصغر گونڈوی نے وسعت علم کو ادب لطیف کے عناصر ترکیبی میں شمار کیا۔

جہاں تک اختر کا تعلق ہے ان کی نثر میں ادب لطیف کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ رومانی شاعر ہونے کی وجہ سے ان میں وہ انفرادیت و انانیت ہے جو فن کار کو دوسروں کا منت کش ہونے سے باز رکھتی ہے وہ اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اسی لیے اس کا اسلوب اپنے ہم خیال فن کاروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اختر ادب لطیف کے دوسرے فن کاروں سے اسی معنی میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ادب لطیف میں تخیل فکر سے زیادہ جذبے کا پابند ہوتا ہے۔ فکری گراں مایگی سے زیادہ جذباتی وفور پر زور دیا جاتا ہے۔ اختر جذباتی انسان، جذباتی شاعر اور جذباتی انشا پرداز ہیں ان کی نظم کی طرح ان کی ادبی نثر میں بھی جذبات کا سیل رواں، چھلکتا اور وحدت میں مچلتا نظر آتا ہے۔ الفاظ و تراکیب کی تکرار، ندائیہ و استفہامیہ الفاظ کا بکثرت استعمال، الفاظ کے صیغہ جمع سے کام لینا یہ سب باتیں دراصل تخیل کی بلند پروازی کی تسکین کے لیے ہیں۔

نظم کی طرح نثر میں بھی اختر کا اسلوب بڑی حد تک الفاظ و تراکیب کا مرہون منت ہے۔ وہ شیریں رواں اور سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں، حسین اور دلنواز تراکیب سے نثر میں وہ رعنائی پیدا کرتے ہیں جو اسے نظم کے ہم پلہ کر دے۔ ذیل کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو ادب لطیف کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

"ہوا کی تحریک سے دامن گل برگ پر رزنے والے قطرۂ شبنم کی طرح سینے میں دل، نہ آنکھوں میں آنسو، دماغ میں تخیل اور ہاتھ میں قلم کانپ رہا ہے۔ تھرتھرا رہا ہے۔ تم سے خطاب کرنا، تمہاری حسین و نازنین اور نازک و رعنا ہستی سے خطاب کرنا اس ویران و بےکیف دنیا میں! اس دنیا کی تلخ و ناگوار ہنگامہ آرائیوں میں اس سے زیادہ لذیذ اور رنگین و روشن خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ آہ اس کے تو تصور میں مرجانا ہی حسین ترین خوش نصیبی ہے۔ مگر آہ زمانے کی ستم پیشگی کو کس زبان سے بد دعا دوں؟ جس نے میرے دل کو زخمی! میرے دماغ کو ماؤف! میرے جذبات کو مجروح اور میرے حسیات کو ذبح کر کے ہلاک کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تم سے اس طرح مجبور یا رنجور اور تم مجھ سے اتنی دور۔ اس قدر دور۔ آہ قسمت کی کوتاہیاں ہائے فطرت کی ستم آرائیاں۔"

محمد یوسف لدھیانوی

سر ظفر اللہ خاں کی اچھوتی منطق

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ ہمارا ضعف ایمان کہیے یا آپ حضرات کی نازبرداری تصور کیجیے، کہ اسلام کی تجویز کردہ اصل سزا سے نہایت کم اور خفیف سلوک آپ لوگوں سے روا رکھا گیا، کہ اسلامی مملکت میں اپنے غیر مسلم ذمی ہونے کی حیثیت تسلیم کرکے عیش و آرام سے رہیے! لیکن اگر آپ اپنی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کریں گے تو ظاہر ہے کہ حکومت اور پبلک کی جانب سے آپ کو تحفظ کا جو وعدہ دیا گیا ہے آپ اس معاہدہ کو توڑنے والے ٹھہریں گے اس کے بعد اگر کوئی نامناسب صورت پیش آئے گی تو اس کی ذمہ داری بھی آپ کے نقض عہد پر ہوگی،

اپنا غیر مسلم ہونا تسلیم کر لیجیے!

پورا پاکستان آپ کے مال و جان کے تحفظ کا ضامن ہے۔

ہشتم: چودہری صاحب نے یہ چیلنج بھی دیا ہے کہ:۔

"آئین کے فقرہ نمبر ۲ کی رُو سے مجھے اپنے دین کے اعلان و اشاعت اور اس پر عمل کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا"

ان کا یہ ارشاد نہایت منصفانہ ہے اور ہمیں اس سے سو فیصد اتفاق ہے۔

بلاشبہ انہیں اپنے دین پر رہنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن اس میں ذرا سی ترمیم ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ان کی آزادی صرف وہاں تک ہے۔ جہاں تک وہ اسلام کے اصول میں مداخلت نہ کریں اور اگر ان کی مذہبی آزادی اسلام کی حدود کو توڑ کر مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بنے تو انہیں اپنی اس بے قیدی پر نظر ثانی کی دعوت دینا پڑے گی۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے، چودہری صاحب کرسی عدالت پر رونق افروز ہیں۔ اور ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں نمبر کوٹھی میرے نام الاٹ کر دی جائے ——— چودہری صاحب فرماتے ہیں کہ بھائی، وہ کوٹھی تو میری ہے اس کے دروازے کے بورڈ پر ———

"چودہری سر محمد ظفر اللہ خان" ——— کا نام کندہ ہے وہ کہتا ہے کہ حضور صحیح فرماتے ہیں مگر کچھ عرصہ سے مجھے الہام ہوا ہے کہ ظلی طور پر سر محمد ظفر اللہ کا نام مجھے حاصل ہو گیا ہے لہٰذا اس کوٹھی کے حقوق اب ظلی طور پر اس خاکسار کو حاصل ہو گئے ہیں۔

کیا یہ دنیا کی کوئی عدالت چودہری محمد ظفر اللہ خاں کی کوٹھی اس ظلی کے نام الاٹ کر دے گی؟ اور کیا چودہری صاحب اس کے اس دعوی کو اپنے حقوق میں ناروا مداخلت تصور نہیں کریں گے؟

ایک اور شخص حاضر ہوا! اور اس نے چودہری صاحب سے استغاثہ کیا کہ

آپ کی جماعت کے امام کی حیثیت مجھے حاصل ہے، لہٰذا میرا حکم مانو، کیونکہ خاکسار کو الہام ہوا ہے تو ظلی طور پر مرزا ناصر ہے، اور میرے صاف و شفاف آئینۂ ظلیت میں ——— "امام جماعت احمدیہ" ——— کے تمام کمالات منعکس ہو گئے ہیں، کیا اس کے دعوی الہام کی تصدیق کرتے ہوئے چودہری صاحب اسے سچ مچ "امام جماعت احمدیہ" کے حقوق عطا کر دیں گے؟ اور اس کی اس ناروا جسارت کو اپنے امام کے حقوق میں بے جا مداخلت تصور نہیں کریں گے؟

اب ایک تیسرا شخص آتا ہے، وہ کہتا ہے کہ الہامی طور پر میرے آئینۂ ظلیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات مع نبوت کے منعکس ہو گئے ہیں، اس لیے مجھے محمد ہی سمجھو، گو ظلی طور پر سہی، مجھ پر ایمان لاؤ، کیونکہ میں خاتم الانبیاءؐ کا بروز ہوں لہٰذا میں بعینہٖ خاتم الانبیاء ہوں۔

کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کی نازیبا جسارت امت محمدیہ برداشت کرے گی؟ اور اس کا یہ دعوی اسلام میں مداخلت متصور نہیں ہوگا؟

اب ایک اور شخص آتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں مثیل مسیح ہوں۔ لہٰذا مجھ ہی کو مسیح موعود مانو، کیونکہ مجھے الہامی طور پر مریم بنایا گیا، پھر مجھے الہامی حمل ہوا، پھر الہامی دردِ زہ ہوا، پھر الہامی عیسی پیدا ہوا، پھر الہامی طور پر وہ نشوونما پاتا رہا، یہاں تک کہ میں سچ مچ عیسیٰ بن گیا ہوں۔ کیا اس کا یہ الہامی دعوی لائق سماعت ہوگا؟ اور اسلام کے اصول میں ناروا مداخلت متصور نہیں ہوگا؟

اگر چودہری صاحب کی زندگی میں "ظلی سر محمد ظفر اللہ خاں" اور امام جماعت احمدیہ کی زندگی میں "ظلی امام جماعت احمدیہ" کے بارے میں عقلاء یہی فیصلہ کریں گے؟ کہ وہ عقل و ہوش سے عاری ہے اور اس کا بہتر مقام "دماغی شفاخانہ" ہی ہو سکتا ہے تو چودہری صاحب انصاف فرمائیں کہ بروزی عیسیٰ صاحب اور ظلی محمد صاحب کے دعاوی امت کیونکر برداشت کرے گی۔ اگر قانون ہر شخص کو مذہبی آزادی دیتا ہے تو ساتھ ہی قانون ہر شخص کو یہ ضمانت بھی دیتا ہے کہ کسی ظلی و بروزی

بعدالت جناب خان محمد ارشد خان سول جج درجہ اوّل، ریذیڈنٹ کنٹرولر فیملی جج سرگودھا

مقدمہ نمبر ۳۱۵ رجوعہ $\frac{17}{7}$ ۶

دعوےٰ دخلیابی بذریعہ حق شفعہ

نور محمد ولد خان، سونا خان۔ غلام حسین منظور حسین محمد حیات پسران بہادر دین اقوام ملک۔ منظور حسین ولد غلام نبی قوم ہنجوار احمد ولد سردار اقوام سپرا۔ فیض محمد ولد عطا محمد قوم ملک سکنائے للیانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا۔

بنام (۱) محمد افضل (۲) محمد اسلم (۳) سکندر حیات پسران غلام علی (۴)۔ الطاف حسین ولد عبدالعلی (۵) محمد حیات ولد شیر علی (۶) سکینہ بیوی زوجہ شیر علی (۷) محمد بخش (۸) محمد اسلم (۹) محمد افضل پسران مالک اقوام شیخ اعوان (۱۰) مسماۃ نسیم اختر زوجہ عبدالقیوم قوم قلسہ (۱۱) محمد نواز ولد محمد شیر (۱۲) محمد یوسف ولد محمد شیر (۱۳) اظہر ایوب ولد محمد ایوب (۱۴) محمد صادق (۱۵) محمد یار پسران قادر بخش اقوام (۱۶) محمد حسین (۱۷) محمد انور پسران صدرالدین اقوام کھوکھر (۱۸) محمد نذیر رحمت خان قوم حبشی (۱۹) دوست محمد ولد تاجہ (۲۰) منظور احمد ولد دوست محمد اقوام پنجوتہ (۲۱) محمد علی (۲۲) غلام علی پسران شیر محمد اقوام پنجوتہ (۲۳) خدا بخش ولد زیادہ (۲۴) غلام مصطفیٰ ولد خدا بخش اقوام ملک (۲۵) احمد دین (۲۶) محمد عظیم پسران یٰسین اقوام ملک سکنائے للیانی تحصیل بھلوال۔ (۲۷) محمد شیر (۲۸) محمد نذیر پسران نبی بخش اقوام سان (۲۹) غلام رسول ولد صدر دین قوم جٹ سکنہ للیانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا

مقدمہ عنوان بالا نور محمد وغیرہ نے دائر کیا ہوا ہے اور مدعا علیہم ۱ تا ۲۹ دانستہ طور پر غیر حاضر ہیں۔ اور روپوش ہیں، اور حاضر ہونے سے دانستہ گریز کرتے ہیں۔ مدعا علیہم کے نام اشتہاری اخبار جاری کیا جاتا ہے کہ اگر وہ تاریخ پیشی ۷ اپریل ۶۵ء کو عدالت ہذا میں حاضر نہیں ہوں گے تو انکے خلاف قانونی کارروائی یک طرفہ عمل میں آویگی۔

آج دستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔ $\frac{3}{5}$ ۱۹۶۵

دستخط: سول جج درجہ اول

(مہر عدالت)

ہے مدعی کو اس کے اہل و عیال اور مال و منال پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

اگر چودہری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب اور مرزا ناصر خلیفہ ربوہ کو یہ ضمانت حاصل ہو سکتی ہے تو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کا کیا قصور کیا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے حقوق ظلی صاحبان کو دیئے جائیں اور اُمت چپ سادھ کر بیٹھی رہے؟

اگر چودہری ظفر اللہ خان کو یہ حق کہ وہ کسی صاحب کو ظلی و بروزی حقوق دے کر نبی اور "مسیح موعود" مانیں تو امت اسلامیہ کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے انبیاء کرام کے دامن تقدس کو ان ظلی مسخروں کی دستبرد سے بہر قیمت بچائیں۔

اگر چودہری صاحب اپنے "ظلی دین" پر بضد ہیں تو ملت اسلامیہ بھی "حقیقی دین" کو کھلونا بنانے کے لیے آمادہ نہیں۔

بقیہ اعتبار جاسوس

کو تیار ہوں، جس میں سے آپ پسندیدگی کے مطابق انتخاب کر لیں۔

میں: آپ کی بہت بہت نوازش، لیکن میں حسب سابق معذرت چاہوں گا۔

گیانی: چائے پی لیجئے۔

میں: (اپنے لیے بچھائی ہوئی میز پر بیٹھ گیا، خود ہی چائے کا ایک پیالہ بنایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا، یہ اپنی قسم کی اچھی چائے تھی)

گیانی: آپ کی تعلیم کیا ہے؟

(میں اس ناگوار استفسار کے متعلق قطعی بے خبر تھا، میں نے اسماعیل کا بیان حرف بحرف پڑھا تھا، لیکن مجھے اس کی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ یاد نہ تھا، میں نے بال سے اعراض کرتے ہوئے چہرے کو ذرا جھکا کر اس پر تبسم کی ایک لہر پیدا کرتے ہوئے ٹھیٹھ پنجابی میں نہایت مکارانہ جواب دیا۔)

"اساں جٹاں دے پتراں نے کیہہ پڑھنا ایں، اٹھ نہ ہویاں تے دس، دس نہ ہویاں تے باراں"۔

(یعنی ہم کسانوں کے بیٹے کیا پڑھیں گے، یہی آٹھ، دس یا زیادہ سے زیادہ بارہ جماعتیں پڑھ لیں گے۔)

گیانی کو یہ جواب بھلا معلوم ہوا، میں نے ہنسی میں اس سوال کو اڑا دیا، دراصل میں نے قصداً مشکوک بات کی، لیکن گیانی کے سوال کو کہ آیا میں آٹھویں، دسویں یا بارہویں تک تعلیم یافتہ ہوں، ایک پُر مسکراہٹ سے ٹال دیا، بعد میں، میں نے اسماعیل سے چیک کیا تو اس نے بتایا کہ وہ دسویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے، حقیقتاً میرے اشائل اور ہنسی نے گیانی کو مطمئن کر کے خاموش کرا دیا، وہ میری وضاحت سے مطمئن دکھائی دیتا تھا، یہ ایک معقول جواب تھا، جس سے صورت حال سنبھل گئی، میں نے محسوس کیا، اس قسم کے نوکیلے استفسار کا اتنا موزوں جواب گھڑنے کے بعد خوبصورتی سے پیش آمدہ صورتحال سے عہدہ برآ ہوا ہوں، جب کہ میں گرفتار پائے جانے کے خطرہ سے دوچار ہو گیا تھا جواب کی شائستگی اور روانی میں ذرا سا نقص مجھے موت و حیات کے دوراہے پر بھی لا کھڑا کر سکتا تھا۔

جلد ۲۸ ـــــ شمارہ ۱۴

۷ اپریل ۱۹۷۵ء

قیمت ـــــ ایک روپیہ

چٹان لاہور
ایڈیٹر
شورش کاشمیری

شاہ فیصل کی شہادت کے مضمرات

لہو پکارے گا آستیں کا

احقر لاہور سے باہر کراچی میں تھا وہاں اس خبر نے حواس معطل کر دیے، دل بیٹھ گیا اور دماغ ٹھہر گیا کہ شاہ فیصل ریاض میں شہید کر دیے گئے ہیں اور قاتل اُن کا بھتیجا ہے، بھائی کا بیٹا ـــــ فیصل بن مساعد بن عبد العزیز۔ اس خبر کو ریڈیو نے نشر کیا، جس نے سنا دل پکڑ کے بیٹھ گیا۔ المختصر غم و اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی حادثے کئی ہوتے ہیں لیکن اس سانحہ سے ساری پاکستانی قوم افسردہ ہو گئی۔ دیاض سے جو خبر آئی وہ ادھوری اور شاید کسی حد تک مصلحتوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اب ایک ہفتہ میں صاف ہوئی ہے۔ پہلے دن یہ بتایا گیا تھا کہ شاہ کا قاتل دماغی اعتبار سے مریض ہے، پھر خبر آئی کہ علاج کے لئے بیروت میں رہا ہے۔ شاہ کی شہادت کے بعد مقورونہ یہی تاثر دیا جاتا رہا، پھر ایکا ایکی خبر پلٹ گئی کہ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد اُس کو صحیح الدماغ قرار دیا ہے۔ اُس کا دماغی توازن مختل نہیں۔ اِدھر ۲۶ مارچ کی صبح کو پاکستانی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ لبنان کا ایک پارلیمانی وفد شاہ فیصل کے جانشین شاہ خالد سے تعزیت کرنے گیا تھا اُس وفد سے شاہ خالد نے بیان کیا کہ شہزادہ فیصل (قاتل) کا دماغی توازن درست نہیں (ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے بہیمانہ عمل کا ارتکاب کرتے ہیں اُن کے دماغی توازن فعلاً درست نہیں ہوتے، چٹان) مزید فرمایا کہ اب وہ تذبذب کی حالت میں مسلسل کہے جاتا ہے کہ میں نے یہ کیا کر دیا۔ میں نے یہ کیا کر دیا۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے" ـــــ عربی اخبارات کے مطابق قاتل کے مقدمہ کی سماعت علماء کی ایک عدالت کرے گی۔ اس کے بعد اسلامی قانون کے مطابق اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ شاہ خالد نے بیروت کے نیم سرکاری ٹیلی ویژن کی روایت کے مطابق ایک بیان میں یہ بھی کہا کہ شاہ فیصل کے قتل میں کسی بیرونی سازش کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ واللہ اعلم بیروت ٹیلی ویژن کے یہ الفاظ کہاں تک درست ہیں؟ یا اُس قاتلانہ سازش ہی کا ایک حصہ ہیں کہ دنیائے اسلام کے صدمہ کا رُخ پھیرنے کے لیے خود ساختہ بیان ٹیلی کاسٹ کیا۔ جس لمحہ یہ خبر معلوم ہوئی پہلا تاثر یہ تھا اور ہے۔ احقر نے اس کا وہیں اظہار کیا کہ شاہ فیصل کا قتل امریکی سیاست کی اسرائیلی خواہش کا نتیجہ ہے اور جس شہزادہ نے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے اُس نے اسلام کے سینہ میں گولیاں پیوست کی ہیں۔ اُس شہزادہ سے بڑھ کر قابل نفرین وجود اس دنیا میں اس وقت کوئی نہیں۔ اُس نے دنیائے اسلام کو غمزدہ کیا اور اسرائیل کو خوشی مہیا کی ہے۔ استعماری ریاست کی اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی تھی۔ یقینی یہی ہے کہ اس شہزادہ کا سر قطع کیا جائے گا۔ عجب نہیں کہ اس افتتاحیہ کی اشاعت تک وہ اپنی سزا پا جائے لیکن اب تک زندہ ہے تو محض تفتیش کے لیے ممکن ہے۔ سعودی حکومت کوئی سازش تلاش کر رہی ہو تا کہ پوری کہانی مل جائے بہر حال اُس کا جرم اتنا گھناؤنا ہے کہ وہ زندہ جلا دینے کے قابل ہے۔ اس کی نعش کو حجاز و نجد کی زمین بھی نہ ملنی چاہیئے۔ اسلام کی سرزمین میں اسے قبر کی جگہ نہ دی جائے۔ یہ کم از کم اُس زمین کے تقدس کا احترام ہو گا۔ اس شہزادے نے اپنے وحشیانہ فعل سے نہ صرف یہ کہ دنیائے اسلام کو شدید سے شدید اور عظیم سے عظیم نقصان پہنچایا اور اِس اندھیری رات میں اسلام کے ایک مقدس وجود کو ہلاک کیا بلکہ خود شاہی خاندان کو سوچنا چاہیئے کہ اُن کے ایک فرد نے کیا طرح ڈالی اور کس بہیمانہ جسارت سے اپنے خاندان کی صولت کو ضعف پہنچایا۔ آج تک شاہی خاندانوں کی اندرونی فضا میں اسی قسم کی جاہلانہ حرکتوں کے نتائج پر تاریخ نے ماتم کیا ہے۔ ہم شاہی خاندان کے اجلال و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی ادب کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ شہزادہ فیصل بن مساعد اپنے چچا ہی کا قاتل نہیں، اُس نے شاہ فیصل ہی کو شہید نہیں کیا۔ اُس کا فعل

تمام دنیائے اسلام کے لئے ناقابل فراموش المیہ ہے اس نے اسلام کے دل میں گولیاں چلائی ہیں اور دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے احیا کو ہلاک کیا ہے۔

شاہ فیصل محمد عربی کی سرزمین سے قرن اول کی روایتوں کا احیا چاہتے تھے۔ وہ فی زمانہ سب سے بڑے اسلامی فرمانروا تھے، جن کا دل صرف اسلام کے لئے دھڑکتا تھا۔ اُن کا دماغ قدرت کا عطیہ تھا انہوں نے اپنے کردار و عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کافرانہ سیاست کے ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں بلکہ اس سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کی عالمی طاقت کو منظم و متحد کرنے کے خواہاں ہیں۔ اور اس طرح دو بڑے بلاکوں کے مقابلہ میں اسلامی ریاستوں کا تیسرا بلاک بنانا چاہتے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے اپنے تمام وسائل اسلام کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ انہوں نے مصر کو استحکام و دفاع کیلئے بطور امداد اربوں ریال دیئے۔ ان کی آمد پر قاہرہ میں استقبالیہ اجتماع کیا گیا۔ صدر انور سادات نے اس اعانت پر مصر کے عوام کی طرف سے اظہار تشکر کے طور پر خوبصورت سے خوبصورت الفاظ استعمال کئے تو شاہ نے جوابی تقریر میں کہا:

"ان الفاظ کی ضرورت نہیں میں نے
جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ میں نے جو
کچھ دیا وہ میری ذاتی ملکیت نہیں،
تمام مسلمانوں کی دولت ہے۔ میں نے
تمہاری ہی چیز تمہیں دی ہے۔ محمد عربی
کی زمین کے خزانے تمام مسلمانوں کی
میراث ہیں"

شاہ فیصل وحدت اسلامی کے لیے شب و روز کوشاں تھے اور اسلام کی دولت اسلام ہی پر صرف کرتے رہے۔ وہ تمام عرب ملکوں میں اتحاد باہمی کے لئے جتن کرتے اور ان کے اختلافات مٹاتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے انہیں ملایا، ان کے نزدیک عرب و عجم میں اسلامی ملکوں کے اختلافات محض شیر و شکر نہ تھے۔ وہ ان سب کو ملاتے اور اُن کے دل جوڑتے تھے۔ انہوں نے عراق و ایران میں صلح کرائی۔ اُن کا یہ کردار یقیناً اپنے قتل کا محرک نہ ہوتا تو آئندہ دو ایک برس میں عرب ممالک کا نقشہ بدل جاتا۔ وہ پوری دنیائے اسلام کے لئے مثبت اسلامی تصور کے تحت اپنے ذہنی خطوط کو اُجال لیے تھے۔ انہوں نے رابطہ اسلامی قائم کر کے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اُدھر مدینہ یونیورسٹی کا وجود ان کی اسلامی فکر کا آئینہ تھا۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کیلئے کئی ایک کانفرنسیں منعقد کیں۔ اور حال ہی میں اسلامی دنیا کے اقتصادی و سائنسی ماہروں کی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ پاکستان سے اُن کے تعلق خاطر کا یہ حال تھا کہ اس سے بے پناہ محبت رکھتے تھے بعض شعبوں کے پاکستانی ماہرین کو اپنے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر رکھا تھا وہ پوری ملت اسلامیہ کو ایک قبیلہ اور ایک ریاست سمجھتے تھے۔ پچھلے سال لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تو شیخ مجیب الرحمن نے آپ سے عشائیہ میں سوال کیا۔ آپ مجھ سے بھی محبت کرتے ہیں یا مسٹر بھٹو ہی سے؟ شاہ خاموش رہے کہ یہ کوئی سوال نہ تھا۔ شیخ مجیب الرحمن نے پھر سوال کیا۔ شاہ پھر طرح دے گئے۔ جب شیخ صاحب کا اصرار بڑھا تو آپ نے جواب دیا۔ میں صرف پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ جناب خلیل حامدی نے اپنے ایک مضمون میں آپ کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ جب تک مجیب بنگلہ دیش کو اسلامی ریاست نہیں بنائے گا میں تسلیم نہیں کروں گا۔ پاکستان کے لئے اُن کے دل میں بلاشبہ محبت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ انہوں نے کئی نازک مرحلوں میں پاکستان کی بے مثال امداد کی۔ پچھلے دنوں سوات میں زلزلہ آیا تو ایک کروڑ ریال کی امداد کا اعلان کیا۔ بلاشبہ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت تھے اور اس دل و دماغ کے انسان شہنشاہوں کی جماعت میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا عہد ایک مثالی عہد تھا۔ انہوں نے عالم اسلام میں ذوقِ حیات کی ایک لہر دوڑا دی۔ وہ مشرق وسطیٰ میں وہ پہلے فرمانروا تھے جنہوں نے عرب قومیت اور لادین اشتراکیت کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے اسرائیلی فتنہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تمام عرب ریاستوں کو اس پر یکجا کیا کہ وہ اپنے تیل کے ذخائر کو امریکہ اور مغربی یورپ کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کریں۔ اس تیر بہدف نسخہ نے امریکہ اور یورپ کے ہوش درست کئے اور وہ اپنے گھمنڈ سے دستبردار ہوتے گئے نتیجۃً انہوں نے عربوں کے مطالبہ پر اپنے طرز عمل کو تبدیل کیا اور بڑی حد تک حمایت کی۔ اُدھر اسرائیل نے بھی مجبوری کے تحت لچک پیدا کی۔ ابھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہ ہوئے تھے اور قتل سے ایک دن پہلے امریکی وزیر خارجہ مسٹر کسنجر ناکام ہو کر لوٹ رہے تھے اور لوٹتے وقت اپنی ناکامی کا اعلان و اعتراف ایک مسکراہٹ میں کیا تھا اور شاید یہی مسکراہٹ اگلے روز شاہ کے قتل میں شامل ہو گئی۔

مولانا مودودی نے لاہور میں شاہ کی قیادت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اخباری روایت کے مطابق دو عظیم شخصیتوں کا قتل سی آئی اے کی لسٹ پر تھا۔ ان دو میں سے شاہ فیصل قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اُدھر ۲۹ مارچ کو بیروت کی اطلاع کے مطابق قاتل شہزادہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کمیونسٹ نظریے کا حامی اور خاندان میں سرخ شہزادہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے حال ہی میں ایک ایسے ملک کا سفر کیا تھا جس کے ساتھ سعودی عربیہ کے سفارتی تعلقات نہ تھے اور وہ ان عرب ملکوں سے رابطہ رکھتا تھا جو سعودی عربیہ سے مخلص نہ تھے۔ ایک دوسرے بیروتی اخبار نے لکھا ہے کہ وہ افراد خاندان کے مانند حکومت سے مالی امداد لیتا تھا۔ اُس نے شاہ فیصل کے خلاف ایک خفیہ ریڈیو سے تعلق پیدا کر رکھا اور اس کے نشریوں میں بڑھ چڑھ کے شامل ہوتا تھا۔ اُدھر روس کے سرکاری ترجمان پراودا اور ازوستیا نے واضح طور پر امریکہ کے ادارے سی آئی اے پر الزام لگایا ہے کہ شاہ کے قتل میں اُس کا ہاتھ ہے کیونکہ وہ

ہفت روزہ چٹان لاہور

۷ اپریل ۱۹۷۵ء

اسرائیل کے مسئلہ میں امریکی نقطۂ نگاہ سے متفق نہ تھے بلکہ اسرائیل کے یروشلم اور دوسرے عرب علاقوں سے کا ملاً انخلا کے زبردست داعی تھے۔

اُدھر مسٹر ہنری کسنجر نے اس الزام کی ایک پریس کانفرنس میں سختی سے تردید کی ہے۔

آج کی دنیا میں کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔

آج سارا ماتم یہ ہے کہ شاہ فیصل دنیائے اسلام کو داغ جدائی دے گئے لیکن چند دنوں بعد (موت کا تعین مشکل ہے لیکن بہت جلد) یہ راز آشکار ہو جائے گا کہ شاہ فیصل کا خون کیا رنگ لاتا ہے اور جس شقی القلب بھتیجے نے انہیں قتل کیا وہ کیا تھا۔

سطور بالا ۳۰ مارچ کو لکھی تھیں ۳۱ مارچ کی صبح کو اخبارات میں سعودی حکومت کا اعلان آ گیا کہ قاتل صحیح الدماغ ہے۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق جس وقت اُس نے ارتکاب جرم کیا اُس کو اپنی دماغی صلاحیتوں پر کاملاً کنٹرول تھا اسی خبر میں ہے کہ وہ اس وقت بھی ہوش و حواس میں تھا جس وقت اُس نے شاہ پر گولی چلائی۔ وہ لندن میں زیر تعلیم رہا لیکن کسی اعتبار سے کبھی نمایاں طالب علم نہ تھا بلکہ بہت ہی گھٹیا درجہ کا طالب علم تھا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک امریکہ میں رہا وہاں منشیات کے کاروبار میں ایک سال قید بھی کاٹی۔ اُس کی دوستی ... سال تک ایک نہایت آوارہ مزاج امریکن لڑکی سے رہی۔ خبر کے آخر میں ہے کہ شرعی عدالت کی سماعت کے بعد اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

یہ گویا آخری تصدیق ہو گئی کہ شاہ فیصل کا قتل ... بھتیجے نے کیا وہ فاترالعقل نہیں تھا بلکہ اُس نے ... کیا بالارادہ کیا اور وہ بالضرور کسی عالمی سازش کا آلۂ کار تھا۔ قاتل کا دماغی توازن مختل ہوتا تو ... کا اس طرح لکھنا پڑھنا اور شاہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ ... سوال یہ تھا کہ شاہ کے محافظ کہاں تھے؟ اور ... وہ شاہ تک کیونکر پہنچا؟ کیا اس کے ساتھ کوئی ... محافظ نہ تھا؟

بہرحال ہم اپنے اس خیال کا پھر سے اعادہ کرتے ... پشیمان ہیں ...

بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس بد بخت شہزادہ کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ نظیر ہو جائے اس کی لاش کے لیے حجاز کی سرزمین میں کوئی بھی قبر نہ ہونی چاہیے۔ اُس کا مصلوب جسد سمندر کی موجوں میں بہا دیا جائے۔

ایڈیٹر

آئندہ شماروں میں

آغا شورش کاشمیری کے قلم سے

آغا شورش کاشمیری ۱۴ مارچ کو حیدرآباد میں سیرۃ النبی کے جلسہ میں خطاب کرنے کے لئے گئے تھے۔ آپ نے چھ روز کراچی میں قیام کیا۔ آئندہ شماروں میں آپ کے قلم سے مندرجہ ذیل مضامین نکل رہے ہیں۔

۱۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی۔ (ایک تاثر، ایک مطالعہ)

۲۔ مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ کی صحبت میں۔

۳۔ حضرت مفتی محمد شفیع سے ایک ملاقات۔

۴۔ سندھ کے سیاسی نشیب و فراز۔

۵۔ میر رسول بخش تالپور۔ (ایک مطالعاتی تصویر)

۶۔ کراچی اُداس ہے۔

۷۔ سردار امیر اعظم (ایک تاریخ)

۸۔ ہفت روزہ سفر کے عمومی تاثرات۔

آزاد کشمیر میں بے دھڑکی سیاست؟

اُردو کی مشہور ضرب المثل ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی اس کا اطلاق ٹھیک ٹھیک ہمارے ملک کی سیاست پر ہوتا ہے۔ اس مختصر بات کی تغلیط و تردید کا حوصلہ کم ہی لوگ کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی جمہوری سیاست اس حد تک معتوب و مجروح ہو چکی ہے کہ پورا ملک اس کا شکار ہے ہم اگر تقریر و تحریر کی آزادی کے ثمرات سے مستفید نہیں ہو سکتے تو قومی آزادی کس بلا کا نام ہے اور سیاسی آزادی کہاں سے پھوٹتی ہے؟ ہم تو سیاست کی افراتفری کا شکار تھے ہی لیکن آزاد کشمیر کی سیاست نے بھی اپنا چہرہ مسخ کرنا شروع کیا ہے؟ ثبوت یہ ایسا رسید کہ ایک ہی جماعت کے راہنما اقتدار کی تلاش یا ہوس میں مسئلہ کشمیر کو پس پشت ڈال کر مستقبل سے غافل ہو گئے ہیں۔

ہم کسی کی حمایت یا کسی کی مخالفت کرنا نہیں چاہتے۔ ہم پر ہر چیز آشکار ہے اور وہ کونسی چیز ہے جو ہم پر واضح نہیں۔ جب نچانے والے طاقتور ہوں تو ناچنے والے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر ہے کیا؟ اس کی آبادی اور علاقہ کتنا ہے کہ اس کے راہنما لنگر لنگوٹ باندھ کر اکھاڑہ میں ڈنڑ پیلنے لگے ہیں۔ کیا اس بحرانی دور میں مسلم کانفرنس کے اکابر اپنا اتحاد برقرار نہیں رکھ سکتے تھے؟ انہیں معلوم ہے کہ ان کے اس انتشار کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اور وہ کونسی طاقت ہے جو فائدہ حاصل کرے گی؟ لازماً وہ ہر چیز سے باخبر ہیں، افسوس یہ ہے کہ جن لوگوں کا طول و عرض انتخابی معرکہ آرائی ہے اور جو نہیں جانتے کہ اس کے علاوہ بھی ملک و قوم کی خدمت کے میدان ہیں۔ وہ اُس کشمیر سے آنکھیں بند کر کے جس کی یاد میں اکثر روتے ہیں، اپنے اقتدار کے لیے اپنے ہی اعتبار کو آگ لگانے پر تل گئے ہیں اور ہم فی الحال اس کے سوا مزید کچھ کہنے کی پوزیشن ہی میں نہیں اور نہ اس کا حوصلہ رکھتے ہیں کہ وقت اتحاد کا تھا۔ لیکن ہم انتشار پیدا کر کے اپنے ہاتھوں کشمیر

کی سیاست کو منقلب کرنا چاہتے ہیں۔

وزیرِ اعظم کی خدمت میں

چونکہ اس وقت ملک غیر یقینی سیاست کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھا رہا ہے اس لئے ہم کسی مسئلہ میں سیدھے قانونگہ چشمی سے کوئی ایسی بات قلم و زبان پر نہیں لانا چاہتے جو پیش آمدہ مسائل میں مزید پریشانی یا اضافہ کا باعث ہو لیکن ایک بات جو ہمارے علم میں آئی ہے اور اس کے راوی بھی ثقہ ہیں، اس کا وزیر اعظم بھٹو کے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق شاہ فیصل کی شہادت پر قادیانی اُمت نے اپنے صدر مقام ربوہ میں از راہ مسرت نہ صرف بر سرِ عام رقص کیا اور بھنگڑہ ڈالا بلکہ اس کے بعد اپنی "مسجد" میں جلسہ کیا جس میں ایک مقرر نے مرزا ناصر احمد کے ایما پر اس قتل کو میرزا غلام احمد کی خانہ ساز نبوت کا معجزہ قرار دیا کہ شاہ فیصل نے قادیانیوں کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ شیر پاؤ کے قتل کو بھی اس معجزہ سے منسلک کیا کہ وہ بھی سرحد کے وزیر داخلہ کی حیثیت میں قادیانی اُمت کے خلاف تھے۔ اسی مقرر نے مسٹر بھٹو کے خلاف بھی اس انداز کی یاوہ گوئی کی۔ اس کی تفصیلات میں ہم جانا نہیں چاہتے لیکن ہم مسٹر بھٹو سے ملتمس ہیں کہ وہ کسی راسخ العقیدہ لیکن اپنے معتمد مسلمان افسر کی معرفت اس کی تحقیقات کرائیں کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے اور جس مقرر سے منسوب مذکورہ الفاظ ہیں وہ کون تھا؟ اس نے کیا کہا؟ اور اس کا حوصلہ کس برتے پر اس نہج کو پہنچا؟ اس کے سوا ہماری اور کوئی خواہش نہیں۔

شیعوں اور سنیوں میں کوئی جھگڑا نہیں

ہم نے ان صفحوں میں ہمیشہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی باہمی نزاع کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ جو لوگ فروعی مسائل پر منافرت کی فضا پیدا کرتے اور جمہور المسلمین کے دستور [illegible] ہونے کا تماشا دیکھتے ہیں وہ پاکستان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیعہ سنی جھگڑا ایک علمی مسئلہ کی حیثیت میں ہمیشہ ہی رہا ہے اور یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس سے ذہنی ذوق بالا ہوتا ہے لیکن قادیانی امت کے اقلیت قرار پانے کے بعد بعض غیر معروف ملاؤں اور ناہموار ذاکروں نے ایک محرم میں اپنی اپنی فکر کو بے لگام چھوڑ دیا جس سے دو چار جگہ خلل پیدا ہوا۔ ادھر پنجاب میں دانشمندی سے کام لے کر حکومت نے قابو پا لیا، ادھر میلاد النبی کی محفلوں کے دوران کراچی کے ایک آدھ حصہ میں اس فتنہ نے سر اٹھانا چاہا لیکن وہاں مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے سر اٹھانے نہ دیا اور بلا ٹل گئی۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس فتنہ کو ذاکر و ملا ہوا دیتے ہیں اور مارے جاتے ہیں غریبوں کے بچے۔ اگر اس ذہن کے ذاکروں اور ملاؤں کے شروع ہی میں کان کھینچ دیئے جائیں تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہو اور نہ حکومت کو طویل دردسری سے گزرنا پڑے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ جو ذاکر مجالس عزا میں عزاداری کے بجائے دل آزاری کا راستہ اختیار کرے خود شیعہ نوجوان اس کا محاسبہ کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ اسی طرح جو ملا مذہب شیعہ کے خلاف طعن و قدح کا الاؤ بھڑکائیں انہیں سنی نوجوان اٹھ کر سر مجلس تنبیہ کریں کہ وہ اپنی مجنونانہ حرکت سے باز رہیں۔ آخر شیعہ و سنی یہ کیوں محسوس نہیں کرتے کہ ان کے خرمن کو میرزا غلام احمد کی امت آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

اگر پولیس اسکی عادی ہو گئی تو

اس ۲۴ مارچ کو ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں لاہور ریلوے اسٹیشن پر وارد ہوئے تو ان کے استقبال کی خاطر ان کے مداحوں کا ایک ہجوم پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ ادھر [illegible] اخباری اطلاع کے مطابق خیر مقدم کے نعرے بلند ہوئے۔ زندہ [illegible] کے مشتاقانہ [illegible] کے مطابق پولیس نے پلیٹ فارم ہی پر لاٹھی چارج کر دیا جس سے بھگدڑ مچ گئی اور وہ مسافر جو ڈبوں سے اتر آئے تھے وہ بھی پلٹ کر ڈبوں میں گھس گئے۔ اس کے بعد [illegible] بھی پولیس نے یہی سلوک کیا۔ لوگ منتشر ہو گئے تو ایئر مارشل اصغر خان نے پولیس والوں سے خطاب کرنا چاہا افسروں نے اُن کو بھی مشق ستم سے بھگا دیا۔ مارشل صاحب قلیوں کی طرف گئے تو وہ بھی لاٹھیوں کی پکڑ میں آ گئے۔ اس کے بعد تحریک کے کارکن ریلوے اسٹیشن کے سامنے جمع ہوئے تو اشک آور گیس نے آ لیا۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پولیس کے لاٹھی چارج سے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ مسٹر منظور موہل ایم پی اے اور تحریک استقلال کے بعض دوسرے کارکن بھی زخمی ہو گئے۔ مس رابعہ قاری کی عیادت کے لیے ہم فوراً گنگا رام ہسپتال میں گئے وہ ۲۹ مارچ کی شام تک زخموں سے کراہ رہی تھیں۔

ابھی ایک سال پہلے وہ پیپلز پارٹی میں تھیں محترمہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدر بھی رہ چکی ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پولیس نے اُن پر لاٹھی اٹھانے کا حوصلہ کیسے کیا؟ آخر کوئی سی چیز ہے تو ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے متفقہ طور پر ایک مذمت قرارداد منظور کی اور ان افسروں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا جو اس کے [illegible] اس خرابی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ شیخ شوکت علی سابق جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے بحیثیت صدر بار ایسوسی ایشن اس سلسلہ میں وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملاقات کی۔ انہوں نے متعلقہ افسروں کی باز پرس کا وعدہ کیا ہے اور اب وعدہ کے ایفا ہونے کا انتظار ہے۔

اگر پولیس کو یہ عادت پڑ گئی تو اس کا مزاج بن کر ملک کی جمہوریت کے لیے مہلک ہو گی؟ آخر پولیس یہ کیوں محسوس نہیں کرتی کہ ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں۔

۴ اپریل ۱۹۷۵ء

جی ایم سید کے نام

بلاشبہ جی ایم سید سندھ کے ایک بزرگ راہنما ہیں ہماری معلومات کے مطابق اُن کے دامن پر کسی ذاتی آلائش کا داغ نہیں۔ ایک زمانہ میں وہ تحریک پاکستان کے سرگرم راہنما تھے اور انہیں لیگ میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ لیکن اب ایک بڑی مدت سے اُن کا ذہن صوبائی عصبیت کی طرف پلٹ چکا ہے اور وہ سندھو دیش کی تحریک کے داعی و ساعی ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں حیدر آباد اور کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو ہم نے ان سے متعلق بہت سی باتیں معلوم کیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے اُن کے دل کو کس سیاسی حادثہ نے متاثر کیا ہے کہ وہ ایک منفی سیاست کے علمبردار ہو رہے ہیں۔ جن مہاجروں نے ان کے صوبہ کو آباد کیا ہے وہ اسرائیل کے یہودی نہیں کہ عربوں کو ان کے گھروں سے بیدخل کر کے خود قابض ہو گئے ہوں وہ پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کر کے آئے ہیں اور قائداعظم کی سیادت میں پاکستان کی تحریک کا ہراول تھے۔ سید صاحب کو ان کا راہنما ہونا چاہئے تھا لیکن سید صاحب اور ان کے نائب راجہ دہر کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا اُن کے سامنے اپنی تاریخ نہیں سادات تو عالم انسانی کے باشندہ ہیں برعظیم میں اسلام کا پہلا قافلہ سندھ میں داخل ہوا تھا اور ہم اس کی فتح مندیوں سے مسلمان ہوئے تھے۔ اب اگر سید صاحب ہمیں راجہ دہر کی باتیں سنائیں۔ اور سندھ کی تہذیب کے نشہ میں اسلام کی تہذیب کو بھول جائیں اور انہیں یاد نہ رہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں تو اس صورتِ واقعہ کے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم تاریخ کے باب عبرت میں داخل ہونے کی حرکت مذبوحی کر رہے ہیں۔

محمد حیات شیرپاؤ کے قاتل

نوجوان شیرپاؤ کے خون کو ہر شخص نے محسوس کیا اور یک جنبش لب بلاتفریق سیاست مطالبہ کیا کہ جن لوگوں نے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہوں اُن کو پکڑ کے اس طرح کی سزا دینی چاہیئے کہ تشدد پسندوں کے لیے نوشتہ عبرت ہو اور وہ اس سے ہمیشہ کے لئے سبق حاصل کریں ہمیں افسوس ہے کہ ابھی تک معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ مقدمہ کس مرحلہ میں ہے؟ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟ اور کارروائی کس مقام پر ہے؟ آخر ہماری پولیس اور اس کے افسر اپنے اس خلاء کے متعلق کیا رائے دیں گے کہ اس نے پہلے دن سے اب تک کسی سیاسی قتل یا دوسرے لفظوں میں کسی سیاسی آدمی کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا؟ اِدھر ہم اپنی معلومات کے ناقص ہونے کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ہمارے لئے یہ امر خاصا تعجب انگیز ہے کہ وہ پولیس جس نے انگریزوں کی ملازمت میں آسمانوں سے سیاسی مجرم اُتار لئے اور پہاڑوں کے سینوں سے قاتل برآمد کئے تھے اُس نے پاکستان بن جانے کے بعد کسی بھی سیاسی قاتل کو نہیں پکڑا؟ کیا اُس کی کارکردگی ناقص ہے؟ اس میں تجربہ کار لوگ نہیں رہے؟ یا قاتل آسمان سے اُترتے اور اپنا کام کرنے کے بعد آسمان کو لوٹ جاتے ہیں؟ یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے؟ حیات محمد شیرپاؤ کا قتل محض قتل نہیں ایک سازش ہے اور ہم پاکستان کے خلاف کوئی سازش برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں خان عبدالقیوم خان صاحب وزیر داخلہ کے اس بیان سے حیرت ہوئی ہے کہ وہ قاتل نوجوان ضمانت پر رہا ہو کر افغانستان بھاگ گئے۔ اب اس بارے میں ہم اور کیا عرض کریں کہ یہ الفاظ حلق سے نیچے نہیں اترتے ہیں۔ اگر وہ نوجوان قتل میں ماخوذ ہوتے تو ضمانت کیونکر ہوئی؟ کس نے لی؟ اور کس دفعہ کے تحت ہوئی؟ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان ملزموں کی سفارش ایک بڑے آدمی نے کی؟ وہ بڑا آدمی کون تھا؟ پھر ان نوجوانوں نے پاکستان کی سرحد سے فرار کس طرح کیا؟

بادشاہ خان سے التماس

لاہور کے دو روزناموں بابت ۳۰ مارچ میں پشاور کے حوالے سے ان کے نامہ نگاروں کی رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ چارسدہ سے آمدہ اطلاعات کے مطابق خان عبدالغفار خان نے اعلان کیا ہے کہ ۱۴ اپریل تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ ۱۱ اپریل کو پشاور کی مسجد مہابت خان میں جمعہ پڑھنے کے بعد پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بادشاہ خان نے مسجد غازی بابا میں ان خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ نیپ کے کارکن گرفتاری کے خوف سے نہیں بلکہ عزت بچانے کے لئے ملک سے فرار ہو رہے ہیں (نوائے وقت ۳۰ مارچ)

اس خبر سے معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ خان کے مطالبات کیا ہیں؟ ایک ہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اور انہیں اس کا موقع نہیں مل رہا؟ اس خدمت کے معانی و حدود کیا ہیں۔ اس خبر سے روشنی نہیں پڑتی؟ بہرحال اُن کا بیان ہے کہ انہیں عوام کی خدمت کا موقع دیا جاتے نہیں تو جیل بھیج دیا جاتے اور یہ نہیں تو ملک سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔

اِدھر آج ہی ۳۱ مارچ کو نوائے وقت کے صفحہ اول پر وزیر داخلہ خان عبدالقیوم کی پشاور میں ایک تقریر چھپی ہے جس میں آپ نے مختلف باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا ہے کہ "کسی نے وطن عزیز کی یکجہتی کے خلاف سازش کی تو بھابڑہ کے واقعات پھر دہرائے جائیں گے" ہم اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں کہ وزیر داخلہ کے متذکرہ الفاظ ہمارے فہم و تجربہ سے بالا ہیں انہوں نے جسٹس شبیر احمد کے روبرو خان عبدالغفار خان کے مقدمہ میں اس واقعہ سے روگردانی کی تو اُس وقت کیا مصلحت تھی؟ وہ بھابڑہ کی فضا پیدا کرنے کے بجائے اپنا مقدمہ عدالت عالیہ میں لائیں اور پاکستان کے دشمنوں کو قرار واقعی سزا دلوائیں۔ بادشاہ خان کے درد کو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا بیٹا ولی خان اور اُن کا پوتا بھی اسفندیار جیل میں ہیں لیکن اب وہ عمر کی اس منزل میں نہیں کہ پاکستان چھوڑ دیں۔ ہم ملتمس ہیں کہ اپنے ملک اور گھر کو چھوڑیں نہیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

انجمن شیدائیانِ رسولؐ حیدرآباد

آغا شورش کاشمیری نے انجمن شیدائیانِ رسولؐ حیدرآباد کی دعوت پر ۲۲ مارچ کو لطیف آباد میں ایک عظیم الشان سیرت کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس یادگار جلسہ عام میں سندھ کے سابق گورنر میر رسول بخش تالپور بھی فروکش تھے۔ آغا صاحب نے انجمن شیدائیانِ رسولؐ کے ولولۂ دینی سے متاثر ہو کر اشعار ذیل فی البدیہہ کہے۔ قارئین چٹان کی معرفت انجمن شیدائیانِ رسولؐ کی نذر کیے جاتے ہیں۔ (مختار الحسن)

دیدنی ہیں سطوتِ اسلام کے لیل و نہار — کم نہیں ہوتا غلامانِ محمدؐ کا وقار

میں نے دیکھا ہے عتیق احمد کے پہلو میں وہ دل — جس کی ہر دھڑکن میں ہے عشقِ محمدؐ کا نکھار

دین کی دولت سے بہرہ مند افضال و جلیل — عشق کا سترِ نہاں عبد الصمد پہ آشکار

ہیں جمیل و ناظم و مقبول سرمستِ الست — اہلِ دل کی محفلوں کے پاسبان و پاسدار

صابر و رحمان سے کہنے لگے عبد الحلیم — ہم مسلمانوں کا ہے دینِ پیمبرؐ پر مدار

معدنِ صدق و صفا ہے طاعتِ میرِ اُممؐ — اس سے واقف ہیں سلیمان و رفیق و شہریار

عیدِ میلاد النبیؐ کی رونقیں دو چند ہوئیں — بڑھ گیا حلقہ بگوشانِ نبیؐ کا اعتبار

جھوم اُٹھے وجد کی تحریک پر عبد الرشید — عرصۂ عشق و ارادت کے پرانے شہسوار

ناز کرتے ہیں خود اپنے عشق پر عبد القدیر — دولتِ اسلام ہے توصیف کے دل کی پکار

ایک جانب ہیں امانت شیروانی نعرہ زن — دوسری جانب ہیں یارانِ سرِ پل بے قرار

حلقۂ احباب کی رونق ہیں اکرام و سلام — ہے عظیم اللہ کے دم خم سے ہر جانب بہار

کشتگانِ خنجرِ تسلیم کو میرا سلام — خواجۂ کونینؐ کی رحمت کے ہیں امیدوار

بخدا اس محفلِ سیرت کے ارکانِ جلیل — سایہ گستر ان پہ ہے لطفِ خدائے کردگار

کر دیا ثابت بلیغ الدین کی تقریر نے — ہر زمانہ کیلئے ذکرِ نبیؐ ہے پائیدار

میر صاحب از رہِ ذرہ نوازی کہہ اُٹھے
دُھل گیا شورش تری تقریر سے گرد و غبار

شورش کاشمیری

۱۔ صدر انجمن ۲۔ سیکرٹری نشر و اشاعت ۳۔ سیکرٹری ۴۔ خازن ۵۔ میر رسول بخش تالپور ...

از ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال پر ایک کتاب

حمید احمد خان کا مجموعۂ مضامین: "اقبال کی شخصیت اور شاعری" میرے سامنے ہے، جو گیارہ مقالات پر مشتمل ہے، ان مقالات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصے میں حضرت علامہ کے ملفوظات اور یادیں ہیں، دوسرا حصہ علامہ کے فکر و فن سے متعلق ہے۔

اس کتاب پر چار زاویوں سے نظر ڈال جا سکتی ہے، اقبال کے ساتھ مصنف کا شخصی رابطہ اقبال کی ملفوظات، اقبال کی شخصیت کے بارے میں مزید معلومات، اقبال کے فکر و فن پر ایک بالغ نظر نقاد کی تنقید، اور ان سب امور کے سلسلے میں خود مصنف کا اسلوب بیان۔ ظاہر ہے کہ اس مجلس میں ان سب عنوانوں پر گفتگو ممکن نہیں، لہٰذا میں ان مضامین کے حوالے سے حمید احمد خان کے فن شخصیت نگاری، ان کی ملفوظات نگاری اور افکار اقبال سے متعلق ان کے تنقیدی خیالات پر کچھ اظہار خیال کروں گا۔

شخصیت نگاری نہایت ہی نازک فن ہے، اس میں بہک جانے کا خدشہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کم درجے کا شخصیت نگار مبالغہ کرے، تو اپنے موضوع کو سیف بن ذی یزن بنا سکتا ہے اور تنزل کی طرف مائل ہو تو بھرپور شخصیت کو کارٹون یا تجریدی تصویر بنا دے۔ پھر لفظی تصویریں بھی تین طرح کی ہوتی ہیں۔ قصہ، تاثر اور تصویر۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ خطوط کی مصوری میں اسکیچ، ڈرائنگ یا آب و رنگ کی تصویر بنائی جاتی ہے۔

حمید احمد خان اپنی لفظی مصوری میں تاثر سے بھی کام لیتے ہیں، مگر ان کا میلان بھرپور تصویر نگاری کی طرف ہے، وہ صرف خاکہ نہیں بناتے، بلکہ اس میں واضح اور لفظی جزئیات کا رنگ بھر کر تصویر کو جیتا جاگتا پیکر بنا دیتے ہیں، اس کے لیے وہ تاثر آفرینی بھی کرتے ہیں، وہ تصویر کے گرد پہلے ایک تخیلی ہالہ بناتے ہیں، جس کے زیر اثر قاری تصویر سے پہلے ہی تصویر کے متعلق سوچنے لگتا ہے، اسے انعطاف توجہ کا فن کہا جا سکتا ہے۔

موجودہ مجموعے کا سب سے دلکش مضمون وہ ہے جس کا عنوان ہے۔ "اقبال کی لفظی تصویر" ——— اس میں مرقع نگار نے اپنی تصویر کا آغاز انعطاف توجہ سے کیا ہے، .... مضمون کا پہلا فقرہ ملاحظہ ہو:

"ہر بڑے آدمی کا نام ایک طلسم ہے جسے
زبان پر لاتے ہی نظر کے سامنے ایک
نیا جہان اُبھر آتا ہے"

پھر بتدریج، طلسم کے دوسرے پرت کھلتے ہیں۔ مصنف آہستہ آہستہ اس نکتۂ خاص تک پہنچ جاتا ہے جس کی طرف وہ متوجہ کرنا چاہتا ہے، اب وہ کہتا ہے:

"اس پیکر کا نام محمد اقبال ہے جو پہلے
طبیعت سے پہلے ایک عام نام تھا مگر صدیوں
کے بعد اسے ایک ایسا پیکر نصیب
ہوا جس نے اسے حیات جاوید کا خلعت
پہنا دیا"

اور یہ فقرے اور ان کے اندر کی لفظیات قاری کو چوکنا کر دیتی ہیں، اور اب قاری اس طلسمی پیکر کو دیکھنے کے لئے سراپا شوق بن جاتا ہے، یہی وہ انعطاف توجہ کا فن ہے، جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد لفظی تصویر آتی ہے اس میں ایک پیغمبر امید، ایک پیغمبر حیات، بیشک مگر ہماری طرح ہنسنے بولنے والا، ہماری طرح کھانے پینے والا ایک انسان نظر آتا ہے........ لفظوں سے بنائی ہوئی یہ تصویر شوخ ہے مگر مرقع نگار نے اس خارجی آب و رنگ کو کافی خیال نہیں کیا، وہ داخلی شخصیت کی طرف بڑھتا ہے......... تصویر کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جو نظر نہیں آ سکتے، مگر یاد دلائے جا سکتے ہیں، سوچے جا سکتے ہیں۔ حمید احمد خان نے قاری کی سوچ اور یاد کو مہمیز کیا ہے، یاد دلانے کی صورت یہ ہے کہ حمید احمد خان تصویر کے ساتھ خود بھی بولتے جاتے ہیں....... یہ حمید احمد خان کے حواشی ہیں جو ترکیبوں اور جملوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں .... ان ترکیبوں اور جملوں کی صورت دیکھیے جو علامہ کی عادتوں اور شخصیت کے غیر مرئی پہلوؤں کو دکھانے کے لئے لائی گئی ہیں، مثلاً بے حد پرسکون اور عزلت پسند اپنے آپ میں سمٹا ہوا انسان........ جس کا تخیل طوفان انگیز .... اور یہ طوفان یم بہ یم، دریا بہ دریا جو بہ جو.............. پھر مرقع نگار ان کی حالت استغراق کو دوسری طرح بیان کرتا ہے

اور کہتا ہے،

"وہ کہتے ہیں ہیں تم نہیں ہیں"

"انکار میں تم مگر کبھی کبھی بھلائی کی صلا"

اس قسم کے جملوں اور فقروں سے ظاہر و باطن کی یہ لفظی تصویر مکمل ہوتی جاتی ہے یہ لفظی تصویر بے آنکوں کا سا تاثر پیدا کرتی ہے۔ جس میں ہیئت نے داخلی کیفیت کی ترجمانی کی ہے۔ اب آپ اسے مجسمہ سازی کہیے یا پیکر تراشی یا تصویر آفرینی مضمون کی ہر ہر سطر یہ محسوس کراتی ہے کہ تصویر بولتی ہے۔ جس کسی نے اقبال کو نہیں دیکھا وہ بھی ان کے گھنے ابروؤں، گہری آنکھوں، خاموش مگر جاندار مونچھوں، ان کے میانہ قامت اور بھرے بھرے باوقار جسم کے ساتھ اس لفظی تصویر کی مدد سے بہ چشم خیال انہیں دیکھ سکتا ہے بلکہ ان کی شبیہ تیار کر سکتا ہے۔

اس مجموعے میں اقبال کی لفظی تصویریں اور بھی ہیں مگر اب میں حمید احمد خان کی ملفوظات نگاری کی طرف آتا ہوں۔ انہوں نے حضرت علامہ سے متعلق اپنی یادوں کی روداد لکھ کر ان کے مبارک ملفوظات کا قیمتی تحفہ ہمیں دیا ہے، ملفوظات نگاری بڑا نازک فن ہے، امیر خسرو نے ملفوظات حضرت نظام الدین اولیا کے سلسلے میں لکھا ہے، ہر چہ فرمودند من بگوش دل شنیدم، اما از گوش تا دل مسافتہاست وازدل تا خامہ منزلہا، ہر چہ ہمت نیست، اگر بیک از ایشان ہر چہ نامقبول از من۔ یہ الفاظ ایک ملفوظات نگار کی مشکلات کو بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اکرمن نے گوئٹے کی بات چیت لکھتے ہوئے کہا تھا "میں کیا کروں میرے سامنے ایک سرسبز پہاڑ ہے جس کا دامن رنگا رنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہے .... میں کس کس کو چنوں، کدھر جاؤں جیسے ہاتھ کوتاہ، دسترس محدود .... میں کہاں جاؤں، کدھر جاؤں، کیا کروں"۔

[illegible] ان الفاظ میں جس اضطراب [illegible]

[illegible]

اور سے کسی اعتنا کا امتزاج ہے اور یہی دراصل ملفوظات نگاری کی مشکلات کی شرح ہے۔ اور ان مشکلات سے حمید احمد خاں بکمال خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں، وہ کبھی مکالماتی انداز سے کہیں بیانیہ صورت میں اور کہیں کتھائی اسلوب میں علامہ کی باتیں سناتے جاتے ہیں، وہ جو بھی سمیٹ سکے ہیں، سمیٹ لائے ہیں۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ ہر پھول حتی الامکان حد تک اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ سامنے آئے۔

ملفوظات نگاری کے ذکر کے بعد میں حمید احمد خاں کے نقادانہ فن کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ زیر نظر مجموعے میں ایک انگریزی مضمون

The universal not in Iqbal's poetry

بڑے معرکے کا مضمون ہے۔ یہ اس لیے بھی زوردار محسوس ہوا کہ اس موضوع پر بہت سے اہل علم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، مگر حمید احمد خان کا مضمون "بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری" کے مصداق ایک جہاں دیگر ہے۔

اس مقالے کی فوقیت یہ ہے کہ اس میں نقاد نے ہمیں آفاقیت کے معیار بتائے ہیں یعنی یہ بتایا ہے کہ کسی شاعر کے افکار میں آفاقی عنصر اگر موجود ہے تو اس کی پہچان کیا ہے۔ پہچان کا ایک معیار یہ بتایا ہے کہ شاعر کا کلام انسانی تقدیر اور مستقبل کے وسیع تر امکانات کی طرف رہبری کرے .... اور دوسری پہچان یہ ہے کہ کسی نے نے خاص کی تعمیم کس طرح کی یعنی خاص اور محدود و مقامی حقائق کو عام اور آفاقی حقیقتوں میں کس طرح تبدیل کیا ہے؟

حمید احمد خاں کی یہ بحث بڑی عالمانہ ہے۔ اور بعض اوقات ان کی عبارتوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا کیمبرج لیکچرز میں انگریزی شاعر پر کوئی بریڈلے یا نیو بولٹ نکتہ طرازی کر رہا ہے۔

حمید احمد خاں نے کم فہموں کے اس اعتراض کو کہ اقبال ہندی ترانہ لکھنے کے بعد اسلامی ترانے پر کیوں آ گئے .... عمدہ طریقے سے رد کیا ہے۔ اس اعتراض کی بھی قلعی کھولی ہے کہ جب اقبال اسلامی تلمیحات و اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں تو آفاقی کیسے ہوتے۔ بہرحال حمید احمد خان نے مدلل اور عالمانہ بحث کر کے ان سب اعتراضات کی بے وقعتی کا پردہ فاش کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر مقامی تخاطب واقعی مانع آفاقیت ہے تو پھر ہومر، دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے وغیرہ کو بھی آفاقیوں کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا بلکہ کسی کو بھی نہیں رکھا جا سکتا۔

اگر کوتاہ بینوں کا اعتراض اس بنا پر ہے کہ اقبال کے فکر کی اساس مذہبی ہے تو حمید احمد خان کی رائے میں یہ بھی غلط ہے، کیونکہ دنیا کا بہترین آرٹ مذہب کا پروردہ اور فیض یافتہ ہے۔ لہٰذا مذہبی عنصر کی بنا پر اقبال کے بلکہ کسی کے افکار کی وقعت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس مجموعے میں ایک مضمون "اقبال پر انگریزی شعراء کے اثر" سے متعلق ہے۔ اس پر میں بجز اس کے کیا تبصرہ کر سکتا ہوں کہ انگریزی ادب کے ایک عالم اور استاد سے بہتر اس موضوع پر کون لکھ سکتا ہے اس لیے حمید احمد خان کا یہ مضمون سخن آشنا کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب میں اس بحث کو چھوڑ کر اقبال و بیدل کی ذہنی دوستی کے موضوع پر آتا ہوں، اس مجموعے میں ایک مضمون "علامہ اقبال کا انتخاب بیدل ہے" ——— حمید احمد خان اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال میرزا عبد القادر بیدل کو بہ حیثیت شاعر بلند مرتبے کا مالک سمجھتے تھے اور اپنے خطوط اور ملاقاتوں میں مطالعہ بیدل کی ترغیب دیتے تھے، اس سلسلے میں اتفاق سے علامہ کا کیا ہوا ایک انتخاب بیدل بھی مل گیا ہے جو ایک [illegible] موجود ہے ——

[illegible]

[illegible] ۱۹۷۰ء

حضورؐ کی سیرت طیبہ ہر زمانے اور ہر معاشرے کیلئے آخری راہنما ہے

اسلام میں راعی و رعایا دونوں اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں

حیدرآباد سندھ میں آغا شورش کاشمیری کی تقریر سیرت



تحریر: مختار الحسن

حیدرآباد میں ۲۲ مارچ کی شب کو دنی روزہ سیرت کانفرنس کا ساتواں اجلاس لطیف آباد کے خوبصورت پنڈال میں منعقد ہوا۔ اکثر و بیشتر علماء کے علاوہ شہر کے متدین اکابر، عبقری نوجوان اور نئی پود کے نونہال شریک اجتماع تھے۔ سندھ کے سابق گورنر میر رسول بخش تالپور آغا شورش کاشمیری کے ساتھ تشریف لائے۔ عوام نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا۔ مقامی روایتوں کے مطابق سیرت کانفرنس کا یہ سب سے بڑا اجتماع تھا جس میں حد نظر تک انسانوں کا ایک جنگل سا کھلا ہوا تھا۔ ــــــ راقم جلسہ گاہ میں پہنچا تو شاہ بلیغ الدین سیرت کے موضوع پر اپنے بلیغ و فصیح لہجہ میں خطاب کر رہے تھے ان کے اسلوب بیان میں علم و توانائی دونوں کی گہرائی و گیرائی تھی اور لوگ ایک تصویر کی طرح ان کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔ شاہ صاحب کے فوراً بعد آغا شورش کاشمیری نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں سیرت النبی پر انتہائی بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا۔ تمام مجمع پورے دو گھنٹے تک داد و تحسین و ستائش و تبریک میں ڈوبا رہا۔ آغا صاحب کا ہر جملہ ایک بزرگ کی روایت کے مطابق سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ابوالکلام آزاد کی منفرد خطابت کے دلآویز تبع کا شہ پارہ تھا۔ آپ نے مولانا ظفر علی خان کا حق تکلم ادا کیا اور روزمرہ و محاورہ کی صحت کے ساتھ علامہ اقبال کے عشق رسالت کی اساس پر سیرت النبی کے اس بنیادی نکتہ پر روشنی ڈالی کہ حضورؐ تمام رسولوں اور نبیوں کے جامع اور ... آخری

کتاب آخری جو تمام صحائف آسمانی کی سچائیوں کا مرقع ہے اور اس کے بعد کوئی شریعت یا کتاب نہیں اور نہ حضورؐ کے بعد کسی کے نبی ہونے کا سوال ہے۔

آغا صاحب نے کہا، سیرت رسولؐ ہر زمانہ کے لیے راہنما ہے اور وہ ہر معاشرے اور ہر زمانے کی ہدایت کے لیے ہوتی ہے۔ یہی حال قرآن پاک کا ہے جو آپ پر نازل ہوا اور تا بہ ابد ایک عالمگیر سچائی ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی صحیفہ آسمانی اپنے پیروؤں کی تحریف سے محفوظ نہیں رہا۔ قرآن و سیرت ازل سے ابد تک ایک محفوظ و معتبر صداقت کا نام ہیں اور یہ دعویٰ محض جذبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ تاریخ انسانی کی کلی صداقتیں اس کی توثیق کرتی ہیں۔ آغا صاحب نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالی کہ مختلف مذاہب کی

سچائیاں ان کے پیروؤں نے کیونکر مسخ کیں اور تاریخ ان کے تذکرے سے کیونکر محروم ہے۔ آپ نے قبل از اسلام کے تمام ادیان کا ذکر کرتے ہوئے عصر حاضر کے موجود مذاہب پر استدلالی روشنی ڈالی اور بتایا کہ جن مذاہب کا قرآن پاک میں ذکر ہے ان مذاہب اور اپنے پیغمبروں سے انہی کی امتوں نے کیا سلوک کیا۔ آپ نے معراج القدس کے حوالے سے امام غزالی کے اس قول کو نقل کیا کہ نبوت انسانیت کے رتبے سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے۔ آپ نے امام علیہ الرحمۃ کے اس قول کی نہایت جامع شرح کی کہ نبوت عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے اور یہ سعی و محنت یا کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں آغا صاحب نے نبوت کے تصور کی تشریح و تعریف کرتے ہوئے حضورؐ کی حیات طیبہ کے دو تو ادوار پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ حضورؐ قبل از نبوت عرب معاشرے میں کیا مقام رکھتے تھے اور جب نبوت کے مقام پر فائز کیے گئے تو آپ کی فتح مندیوں کا سفر کس طرح تکمیل کو پہنچا۔ آغا صاحب نے اس سلسلے میں بتایا کہ یہ شرف تمام نبیوں اور رسولوں میں صرف حضورؐ ہی کو حاصل ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی دعوت کو منشاء ایزدی کے مطابق پروان چڑھایا اور جانثاروں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی کہ تمام صعوبتوں سے گزر کر انہوں نے عالمگیر فتح حاصل کی اور جس ریاست یا معاشرہ کا آغاز حادثات و واقعات کی سنگینیاں گزارنے کے بعد مدینہ کی چند گلیوں سے ہوا تھا وہ ریاست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ثمر آور ہوگئی اور آپ کے صحبت یافتہ چند برسوں میں اللہ کی مرضی ...

عرب ریاست کے حکمران ہوگئے۔

آغا صاحب نے کہا حضورؐ کے فضائل و محامد پر ایسی کئی صحبتوں میں گفتگو کی جائے تو بھی سیرت اقدس کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ جس عظیم انسان کی شخصیت اطہر پر بہ بہ بار قرآن پاک میں گفت گو کرتے ہیں ہم اس سیرت اقدس کو بیان کرنے سے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے اور نہ کسی خطیبانہ کمال کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارا ذکرِ رسول کرنا اور سیرت طیبہ پر بولنا اُن کی عظمت کے لیے نہیں، اپنی شفاعت کے لیے ہے کہ اس طرح ہم اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت فراہم کرتے ہیں ہم انکا ذکر کرتے ہیں تو دل کو راحت ملتی، دماغ کو سکون ملتا اور زبان کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ گویا اُن کا تذکرہ ہمارے لیے سرچشمۂ رحمت ہے۔ اس طرح ہمیں سب سے بڑی عزت ملتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت ہر لحاظ سے اجمل و اکمل و احسن ہے۔

آغا صاحب نے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیرت کا مطالعہ اپنے شب و روز کا لازمہ بنا لو کیونکہ حضورؐ کی سیرت کے سوا اور کوئی سیرت ایسی نہیں جو کائنات انسانی کے لیے ہر دور میں رہنما ہو۔ اس سلسلے میں آپ نے حضورؐ کے اس ناقابلِ تسخیر انقلاب کا ذکر کیا جو آپ نے معاشرہ انسانی میں ہمیشہ کے لیے برپا کیا۔ ان کے بعد یا اُن سے پہلے ایسی کوئی دعوت نتائج و اثمار کے اعتبار سے کرۂ ارضی پر نہیں۔

آغا صاحب کے بنیادی نکات حسب ذیل تھے۔

۱۔ حضورؐ نے تمام انسانوں کو ایک اَن دیکھے خدا کے سامنے جھکا دیا اور اُن تمام انسانی خداؤں کی ہمیشہ کے لیے نفی کر دی جو کرۂ ارضی پر اپنے اقتدار و جبروت کی مختلف شکلیں قائم کئے ہوئے تھے۔

۲۔ آپؐ نے عبادت کا مروجہ تصور بدل ڈالا اور توحید کے اعتقاد پر اس کی عمارت اٹھائی۔

۳۔ آپؐ نے توحید ربانی کے مطابق زندگی کی ایک ایسی شاہراہ تیار کی کہ اس سے پہلے نسلِ آدم میں اس کا تصور ہی نہ تھا۔

۴۔ جزا و سزا کا ربانی تصور پیش کیا۔

۵۔ انسان کی طلاق (؟) انسانی کا سحر پاش پاش کر دیا۔

۶۔ اس عقیدے کی بنا ڈالی کہ انسان کسی انسان کا حکمران نہیں بلکہ خدا کا خلیفہ و نائب ہے۔

۷۔ آخرت کا تصور پیش کیا۔

۸۔ اسلام سے پہلے انسان پر فرمانروائی کی مختلف بشری شکلیں تھیں اور اُن پر استبداد و استیلاء کا غلبہ تھا یہ چیز سب سے پہلے حضورؐ کی معرفت حقیقت کبریٰ کے طور پر سامنے آئی کہ اسلامی معاشرے میں راعی و رعایا خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔

آغا صاحب نے اس سلسلے میں سورہ العصر کی تشریح کرتے ہوئے اشتراکی نوجوانوں کے مرغوب و ماخوذ کا تجزیہ کیا اور اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ اس مختصر سی سورۃ میں انسانی جد و جہد کے تمام خطوط اور اس کے انسان دوست نتائج کا خلاصہ موجود ہے۔ آپ نے بتایا کہ انسان بہرحال انسان ہے اور وہ اپنے دعاوی و مقاصد کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی انسان ہی رہتا ہے جب تک انسان اپنے اقتدار و اختیار کی خواہ وہ شعوری ہو خواہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو، نفی نہیں کرے گا اس وقت تک انسان کو اپنی پیچیدگیوں سے نجات حاصل نہیں ہوگی اور نہ خدا کی مخلوق کسی انسانی وحدت پر جمع ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے فرار عن خدا لطفے پر اپنا نظام قائم کیا اور کسی انسان کی تعلیمات کو لے کر معاشرے کی تشکیل کرنا چاہی۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کسی دائرے میں کسی عنوان کے تحت کچھ اثباتی نتائج پیدا کئے ہوں لیکن کرۂ ارضی کی مخلوق کے اضطراب کو دور کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں اور نہ کوئی انسانی حکمت کسی منزل میں اس کی اہل ہے۔ تمام انسانوں کا اضطراب نظام ربانی ہی سے دور ہو سکتا ہے اور نظام ربانی کی صحیح تصویر قرآن پاک میں ہے اور قرآن پاک کی صحیح تصویر حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔

آغا صاحب نے دو بجے شب اپنی تقریر ختم کی تو لوگوں کے دو جہان دسترس کا ایک عجیب عالم تھا۔ راقم نے صرف ان نکات کو قلمبند کیا ہے جو آغا صاحب کی تقریر کے بنیادی مباحث تھے۔

مولانا محمد یوسف بنوری آیات من اللہ میں سے ہیں

"آپ علم کو شکم کیلئے نہیں علم کے لئے حاصل کرتے ہیں"

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے طلبہ سے آغا شورش کاشمیری کا خطاب

آغا شورش کاشمیری مدیر "چٹان" ۲۰ مارچ کو ساڑھے دس بجے صبح مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری دامت برکاتہم کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں حضرت مولانا مدظلہ کے علاوہ اساتذہ کرام سے تعلیم دین کی تاریخی حقیقتوں پر مبادلہ افکار کیا۔ آغا صاحب مدرسہ عربیہ کی شاندار عمارت بے نظیر دارالاقامہ یادگار کتب خانہ اور دلفریب صفائی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ آپ نے اساتذہ و طلبا سے ان کی تعلیمی ضرورتوں پر گفتگو کی اور یورپ و افریقہ کے چھبیس ملکوں کے طلبا سے بات چیت کے دوران مدرسہ عربیہ کی اہمیت پر ایک ذہنی خاکہ تیار کیا۔ ایک امریکی طالب علم مسٹر انیتی جو اب مسلمان ہو چکے ہیں اور ان کا اسلامی نام یوسف طلال ہے نے قبول اسلام سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے اور مدرسہ عربیہ کو اپنے لئے مشغل حیات قرار دیا۔ مسٹر یوسف طلال سرتاپا اسلامی سانچے میں ڈھلے ہوئے متشرع نوجوان ہیں۔ آغا صاحب نے دو ڈھائی گھنٹے تک مدرسے کا مشاہدہ، معائنہ اور مطالعہ کیا۔ آغا صاحب اس سلسلے میں اپنے تاثرات ایک علیحدہ مضمون میں قلمبند کر رہے ہیں۔ آغا صاحب مدرسہ عربیہ کی عمارات میں قدامت کی علمی وجاہت کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کے دست مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے اظہار امتنان کیا اور ارتجالاً چند شعر کہے۔

وہ تمام طالب علم جو بالائی منزل کے دارالاقامہ [illegible]



تحریر: حافظ محمد ابراہیم بندھانی کراچی

میں رہتے ہیں ایک محتاط روایت کے مطابق ساڑھے چار سو ہیں۔ ان تمام طلبا نے آغا صاحب سے اصرار کیا کہ وہ تقریر کریں۔ آغا صاحب نے ہر چند عذر کیا کہ وہ محض مولانا محمد یوسف سے ملنے اور مدرسہ دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ وقت تقریر کا نہیں۔ لیکن طلبا کے شوق نے آغا صاحب کو آمادہ کر لیا اور وہ مدرسہ کے ہال میں طلبا کے عظیم اجتماع سے خطاب کرنے لگے۔ آغا صاحب نے پینتیس منٹ اپنے تاثرات و جذبات بیان کئے۔ سب سے پہلے شمالی افریقہ کے ایک طالب علم نے تلاوت کلام پاک کی۔ پھر چترال کے ایک نوجوان قاری نے نعت کو ترنم سے پڑھا۔ ان دونوں طلبا نے اس طرح قرآت کی کہ پورا مجمع سرور کیف میں ڈوب گیا اور ماحول کا سکون ان کا ترجمان ہو گیا۔ جب یہ گونڈل کا نوجوان طالب علم قرآت کر رہا تھا تو حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کے دل کا گداز ان کے آنسوؤں کی معرفت چہرے پر منتقل ہو رہا تھا۔ ادھر آغا شورش کاشمیری بھی آبدیدہ تھے۔ غرض غیرت دینی نے حاضرین کے چہروں پر ہالہ باندھ رکھا تھا۔ آغا صاحب نے فرمایا "میں آپ کے پاس کچھ سنانے کے لئے نہیں آپ سے کچھ سننے کے لئے آیا تھا۔ یہ آپ کے اخلاص کی فراوانی اور التفات کی بیکرانی ہے کہ آپ نے یکایک یہ صحبت رچالی میں آپ کو اس تعلیم کے حصول و اکتساب پر اپنے دل کی تمام گہرائیوں اور توانائیوں کے ساتھ مبارکباد دیتا ہوں کہ اس تعلیم کے اقتباس کا آفتاب اس برعظیم میں ۱۸۵۷ء کے انگارڈی بھجپارٹی گہنا گیا تھا اور اس سے کئی صدیاں پہلے اسلامی فکر کے دور انحطاط میں بغداد سے سقوط تک اجتہاد و تفقہ کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ میں علم دین کا طالب علم نہیں رہا لیکن تاریخ دین کا طالب علم ضرور ہوں۔ حضور کی بعثت سے لے کر اس زمانے تک کے اسلام کے نشاۃ ثانیہ کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ جو کچھ علم دین پر گذری اور جس طرح تاریخ دین مرتب ہوئی اس کے تمام گوشے میرے سامنے ہیں۔ آغا صاحب نے اس سلسلے میں بعض تاریخی حالات پر اشاراتی روشنی ڈالتے ہوئے کہا برعظیم میں علم دین کی تاریخ عظیم بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہر حال اس کی عظمت کو علماء و مشائخ کی ایک نامور جمعیت نے قائم رکھا۔ ہم نے تو

۸ اپریل ۱۹۷۵ء

نظام اہل اللہ کی صحیح منزلیں معلوم کر سکتے ہیں اور ان نوان
علما کے تو شمع ہیں جن سے نظر کر سکتے ہیں جو نیشنہ
دور میں نہیں ہیں بلکہ آج تک ہمارے لئے اپنے
صوانح و نشانوں سے روشنی لا رہا ہیں۔ آغا
صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ
اور ان کے نامور فرزندوں کی عظیم الشان خدمات دینی
کا تذکرہ کرتے ہوئے بانیان دیوبند کی عظمت کا ذکر کیا۔
حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت رشید احمد گنگوہی
کے علم و نظر اور اتفاق و ایمان کے احوال بیان کئے
پھر ان کے جانشینوں کے محاسن و کمالات کا ذکر کیا کہ
وہ کس مقام و مرتبہ کے لوگ تھے۔ آغا صاحب نے
حضرت شیخ الہندؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا
اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور
علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے محاسن و کمالات پر نہایت
اختصار کے ساتھ جامع تبصرہ کیا۔ علامہ انور شاہؒ
صاحب کے متعلق آغا صاحب نے کہا کہ وہ علم رسالت
کا چشمہ صافی تھے۔ انہوں نے قادیانی فتنے کے
استیصال کا آغاز کیا۔ سید نا مہر علی شاہؒ کے بعد وہ
سب سے بڑے انسان تھے جنہوں نے مرزائیت
کی سرکوبی کے لیے علم دین کا پرچم اٹھایا اور علامہ
اقبالؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور سید عطاء اللہ شاہ
بخاریؒ کو اس راہ پر لگایا۔ ان تینوں اکابر نے
قادیانی فتنے کی سرکوبی کے لیے جو علمی عوامی اور
سیاسی معرکے برپا کئے وہ تاریخ کے انمٹ نقوش
ہیں اور یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے
کہ ان تینوں بزرگوں نے مرزائیت کو ملت اسلامیہ
کے دماغوں سے خارج کر دیا اور وہ مذہبا ایک
سیاسی اقلیت ہو گئے۔ اس سلسلہ میں کئی تحریکیں
اٹھیں ان کا الاؤ روشن ہوا۔ افسوسناک دور وہ
تھا جب ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی نام نہاد اسلامی حکومت
کے عاقبت فراموش حکمرانوں نے تحریک ختم نبوت
پر گولیاں برسا کر اس کو کچل ڈالا۔ وہ سب رہنما اللہ کو
پیارے ہو گئے تو جبر و استبداد نے کچھ دنوں کے لئے
زبانوں کو مہر بلب کر دیا لیکن عشق ختم نبوت کا چراغ
ہفت روزہ چٹان لاہور

پاکستان میں سلگتا ہی رہا۔

مرزائیوں نے ملک کے ابتر حالات کی بدولت
سہارا لے کر پاکستان پر اپنے غلبے کی راہیں ہموار
کرنی چاہیں لیکن میں اپنے رب ذوالجلال کے کرم بے پایاں
کا شکر گزار ہوں کہ میں نے ۱۹۷۴ء میں قادیانی
امت کا سیاسی محاسبہ شروع کیا جو ساری ملت اسلامیہ
کی آواز بن گیا اور دنیائے اسلام میں بھی مرزائیت
کے خلاف ایک طاقتور ذہن پیدا ہو گیا۔ جب مئی
۱۹۷۴ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبا کو ربوہ کے
ریلوے اسٹیشن پر قادیانی غنڈوں نے وحشیانہ طریق
سے پیٹا تو ایک تحریک پیدا ہو گئی اس تحریک نے
تمام مکاتیب فکر کے مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا۔ خدا کے



فضل و کرم نے ہمارے لئے بدر کا میدان پیدا کیا
محمد عربی ﷺ کی ختم المرسلینی مشعل راہ ہو گئی۔ ان کے
روحانی تصرف نے نوے برس کی جنگ منزل مقصود
تک پہنچا دی۔

اے عزیزان ملت! جس احتسابی تحریک
کا آغاز علامہ انور شاہ صاحب نے کیا تھا۔ اور
اُن کی بصیرت افروز راہنمائی سے اقبال، ظفر علی خان
اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے علم و نظر اور احتساب و فکر
کے چراغ روشن کئے تھے وہ علامہ انور شاہ کے
شاگرد رشید اور اس دینی مدرسے کے بطل جلیل شیخ المحدثین
حضرت علامہ محمد یوسف بنوری کے ہاتھوں اختتام
کو پہنچا۔ ہماری مجلس عمل کے صدر آپ ہی تھے
ہم نے ان کی راہنمائی میں یہ جنگ جیتی۔ میں آپ
کو مبارکباد دیتا ہوں کہ جس عظیم شخصیت نے اس
بے مثال مدرسے کی بنا ڈالی وہ ہماری ناؤ کے
ملاح ہوئے اور ہم ان کی بدولت ساحل مراد
تک پہنچے۔ انہوں نے جس بصیرت و دانائی کے
ساتھ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے اس مسئلے
میں گفت گو کی وہ اُن کے تدبر و تفکر کا شہ پارہ
تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف بنوری کا
وجود آیات من اللہ میں سے ہے۔ میں نے ان
کے قریبی مطالعے سے اپنے اس ذہن کو استوار
کیا ہے کہ وہ صداقت اسلام کی دلیل ہیں —
آغا صاحب نے بالآخر طلبا سے خطاب کرتے ہوئے
کہا کہ آپ کا علم ہی حقیقی علم ہے۔ آپ شکم کے لیے
نہیں علم کے لیے پڑھتے ہیں اور وہ لوگ جو انگریزی
یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں ان کے سامنے بہرحال
معاش و ملازمت کی شاہراہیں ہوتی ہیں۔ آپ
فرش زمین پر بیٹھ کر حصول دین کے لیے اکتساب علم
کرتے ہیں اور یہی آپ کے ایمان کی سب سے بڑی
دولت ہے۔

از فشار قبر یک استخوانم درشکست دایہ بے مہر پر مدد تمی داند کہ چیست

قادیانی اُمت کے استعماری اللّے تللّے

قادیانی محاسبہ کمیٹی کا اجلاس

عبدالسلام ملک

اِس مسئلہ پر ہم نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ وضاحت کی ہے کہ قومی اسمبلی نے جب قادیانی اُمت کو خارج از اسلام قرار دے کر ایک پاکستانی اقلیت کی حیثیت قرار دے دی ہے تو اُس کے بعد سوالات کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ ہم پاکستان کے مسلمان شہری کی حیثیت سے پابند ہیں کہ لا اینڈ آرڈر کو مجروح نہ ہونے دیں اور قادیانی اُمت کے جان و مال کو وہی تحفظ دیں جو اسلامی ریاست میں ذمیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ چٹان کے فائل گواہ ہیں کہ ہم نے ستمبر ۱۹۷۴ء کے بعد قادیانی اُمت سے متعلق اپنے صفحات میں یہی شعار اختیار کئے رکھا۔ دو تین ہفتے پہلے جب روزنامہ "الفضل" ربوہ کے لاہوری ضمیمہ نے اپنے حدود سے تجاوز کیا تو ہم نے اُس کو وارننگ دی کہ اپنے اقوال و افعال پر نظرِ ثانی کرے یہ روش اُن کے لیے مفید نہ ہو گی۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اِس سلسلے میں ہم نے میرزا ناصر احمد کو ایک نوٹس ارسال کیا تھا کہ وہ اپنے اس چیلے کا نوٹس لیں۔

مدت دیگر ...

ہم اگر بات کریں گے تو شکایت ہو گی

ظاہر ہے کہ ہم کسی بھی قادیانی کو مخاطبت کا اہل نہیں سمجھتے۔ لاہور کا قادیانی المعقیدہ جو کچھ لکھتا ہے وہ سب کچھ ربوہ کی خلافت کے ایماء پر تھا اور اس کی امداد و اعانت وہیں سے ہوتی ہے اِس لیے ہم نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ بہر حال یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ ہم اِس پر تسلسل سے وضاحت کرتے۔ ہم نے اُس وقت بھی الفرقان ربوہ کے جواب میں عرض کیا تھا اور اب بھی یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ چٹان کا ایڈیٹر کسی کے پَروں پر پرواز کرنے کا خوگر نہیں وہ اپنے اللہ کا ایک عاجز ترین بندہ ہے اُس کو آقائے نامدار کی غلامی نے جو توں اور جبار توں کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

قادیانی اُمت کے استعماری عقائد کا محاسبہ اُس کا پہلے دن سے مسلکِ دینی ہے وہ انہیں بزرگوں کا خوشہ چین ہے جو مرزا غلام احمد سے لے کر مرزا بشیر الدین محمود کا شرعی و سیاسی اور علمی و دینی محاسبہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ قادیانی بطور اقلیت واضح و آشکار ہو گئے۔ بالفاظ دیگر چٹان کا ایڈیٹر سیدنا مہر علی شاہؒ، علامہ انور شاہ، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے دبستانِ علم و نظر کا طالبِ علم ہے اور اسلام کے اِن شہرہ آفاق فرزندوں ہی کی بدولت ایڈیٹر چٹان کو عشقِ رسالت کی دولتِ گراں مایہ حاصل ہوئی ہے۔ انہیں کے فیض کی بدولت ایڈیٹر چٹان نے قادیانی اُمت کا محاسبہ کیا۔ اور ملتِ اسلامیہ کو بے نظیر کامیابی ہوئی۔ ایڈیٹر چٹان اپنے سمیت ہر اُس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی دعا کرتا ہے جو کسی طاقت کا آلۂ کار بن کر کسی مہم کا داعی ہو یا کسی دینی مسئلے میں بالواسطہ و بلاواسطہ کسی کا مہرہ ہو۔ ایڈیٹر چٹان اکیلا تھا تو اُس نے ایوب خان کے زمانے میں قادیانی اُمت کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا اور اپنے اس ذوق میں کوئی سی کمی پیدا نہ ہونے دی۔ خود مرزائی جانتے ہیں کہ ایڈیٹر چٹان نے اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کی۔ جو لوگ چلے جائیں ہم اُن کے خلاف نہیں لکھا کرتے لیکن اِس امرِ واقعہ کا اظہار غلط نہ ہو گا کہ گورنر موسیٰ خان نے اقتدار کے نشے میں مرزائی اُمت کی پشتپناہی کر کے ایڈیٹر چٹان کو گرفتاری کے بعد مروا دینا چاہا لیکن حضور سرورِ کائناتؐ کی ختم المرسلینی نے دست گیری کی اور وہ ہر ایسی سازش سے بفضلِ ایزدی محفوظ رہا۔ قادیانی اُمت کے بزرجمہر اپنے دماغ سے یہ خیالِ خام نکال دیں کہ ایڈیٹر چٹان کسی طاقتور شخصیت کا آلۂ کار ہو سکتا ہے۔ ماں نے کرۂ ارضی پر وہ انسان ہی پیدا نہیں کیا جو اُس کو کسی حال میں خرید سکے۔ اُس کے خریدنے والے خود بک جائیں تو بک جائیں لیکن اُس کو خریدنے کا نہ حوصلہ کر

۲۲ اپریل ۱۹۸۵ء

ہفت روزہ چٹان لاہور

قادیانی محاسبہ کمیٹی کا اجلاس

قادیانی محاسبہ کمیٹی کی مجلس عاملہ کا خصوصی اجلاس ۷ اپریل کو پانچ بجے شام دفتر چٹان میں منعقد ہو گا۔

عبدالسلام ملک

سکتے ہیں ورنہ یہ ممکن ہے۔ وہ انسان ہے اس کے قلم و زبان سے کوئی سی بات غلط بھی نکل سکتی ہے لیکن وہ جو لکھتا اپنے ایمان کی تحریک سے لکھتا اپنے دل کی طاقت سے لکھتا اور اپنے دماغ کے اقتضاء پر لکھتا ہے۔ یہاں ماضی و حال کے اکثر و بیشتر حکمران ابھی زندہ ہیں، مرزا ناصر احمد کے ان میں سے بعض کے ساتھ مختلف الاصل تعلقات بھی ہیں انہی سے ایڈیٹر چٹان کے متعلق پوچھ لیں کہ سیاست کے روز بازار اور صحافت کی منڈی میں وہ کس تابدار سیرت کے ساتھ اقدارِ ضمیر کا پاسدار رہا ہے اور انشاء اللہ زندگی کے آخری موڑ تک وہ اپنے اللہ سے اس کا عہد باندھ چکا ہے۔

ہم ان الفاظ کو لکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن بقول شاعر ؎

ایسے موقعوں پر عبادت کے برابر ہے غرور

سوال قادیانی امت کے طرزِ عمل کا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ مرزا ناصر احمد کے حسن بن صباحی ٹولے نے قومی اسمبلی کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور وہ دستوری فیصلے کا بدستور استخفاف کر رہے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں حکومت کو صرف توجہ دلا سکتے ہیں اور یہی ہمارا کام ہے ادھر حکومت سیاسی اپوزیشن کو لفٹ نہیں کرتی۔ ہمارے لیے یہ چیز ناقابلِ فہم ہے کہ دینی اپوزیشن کب تک برداشت کی جائے گی؟ ہر سیاسی جماعت کو دستور کی رُو سے کوئی سی مخالفت نہیں۔ لیکن قادیانی امت دستور میں خارج اسلام پا چکی لیکن اس کے باوجود اسلام کے استعمال پر تلی ہوئی ہے اور اس کے لیے کوئی پرسش نہیں ہے۔ سیاست میں اتنی سختی اور دین میں اتنی نرمی ہم سب کے لیے ایک معمہ ہے۔ شاہ فیصل کی شہادت پر ربوہ میں مرزا ناصر احمد کے ایک فرزندِ معنوی نے جو تقریر کی کسی دوسرے شہر میں کسی سیاسی جماعت کے تحت کوئی سیاسی مقرر کرتا تو اب تک اس کا کچومر نکل چکا ہوتا۔ اس بدآہنگ قادیانی مقرر نے نہ صرف شاہ فیصل کی شہادت پر نعرہ ہائے مسرت بلند کیے بلکہ شیر پاؤ کے وحشیانہ قتل پر بھی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کی بے باکی کا یہ حال تھا کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف بھی اس یاوہ گو نے بدزبانی کی۔ ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ ربوہ حسن بن صباح کا حصار ہے کہ وہاں سے کوئی خبر ملک کی حکمران جماعت کو نہیں پہنچتی یا اب بھی انتظامیہ میں اس قسم کے عناصر ہیں کہ وہ حکومت کے مفاد پر ربوہ کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ امر سخت پریشان کن ہے کہ مرزا ناصر احمد اور ان کے فدائی پچھلے تین چار ماہ سے دستور کا احترام نہیں کر رہے اور اپنی پرانی راگنی الاپنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ یہ چیز گل کھلائے بغیر نہیں رہے گی

ہم اب بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری سیاسی نادانیوں کے باعث مرزائی امت کسی بڑی شرارت پر سر اٹھا رہی ہے۔ اس تحریر سے ہمارا مقصد گذارشِ احوالِ واقعی ہے ایسا نہ ہو کہ ہم مرزائی امت کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کرتے رہیں اور یکایک کوئی شگوفہ پھوٹے: سر ظفر اللہ خان ایک طویل عرصے سے لاہور میں مقیم ہیں اور ہم اس خطرناک انسان کے قیام کو خطرناک سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ قادیانی جماعت کی ۵۶ ویں مجلسِ مشاورت نے دو کروڑ چھ لاکھ کا جو بجٹ منظور کیا ہے وہ خالی از علت نہیں۔ اس غرض سے ہم نے ۱۸ اپریل کو لاہور میں آخری لائحہ عمل کے لیے قادیانی محاسبہ کمیٹی کا اجلاس بلا لیا ہے۔

قومی ملکیت

ایک تصوّر —— ایک تحریک —— ایک منصوبہ

الحاج شیخ ضمیر الدین
احمد فوڈ انڈسٹریز کراچی

پٹان کے نمائندہ کی معرفت میرا ایک انٹرویو ۲۸ جنوری ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، بیشتر سوالات ملکی معیشت اور قومی صنعتوں سے متعلق تھے، اسی سلسلہ میں نمائندہ نے پاکستانی صنعتوں کے قومی ملکیت میں لیے جانے سے متعلق بھی کئی سوال کئے۔ میں نے مختصر سا جواب دیکر انٹرویو ختم کر دیا۔

میں نے اپنے جواب میں یہ عرض کیا تھا کہ "قومی ملکیت" کا تصور ہماری قومی تاریخ و تہذیب سے دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ ایک بیرونی تصور ہے جو خواہ مخواہ ہمارے یہاں لایا گیا ہے میرے اس خیال پر متعدد احباب نے سوالات کئے۔ بعض نے اس کو تشنۂ تفصیل قرار دیا بعض نے اس پر تنقید کی، لیکن بعض نے ہٹ دھرمی کا معاملہ کیا۔ بہرحال میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے یہاں اس مسئلہ کے بارے میں خاصی دلچسپی پائی جاتی ہے اور لوگ تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اپنی معلومات کی حد تک میں نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی جو کوشش کی ہے، وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔

قومی ملکیت کا مسئلہ کوئی دلچسپ افسانہ نہیں جسے پڑھ کر کسی بے قرار کو قرار آ جائے یا کسی غمزدہ دل کا غم دُور ہو جائے، نہ یہ کوئی دلکش نغمہ ہے جسے سُن کر لوگ سر دُھننے لگیں اور محفل کو وجد آ جائے بلکہ غور و فکر کرنے والے ذہن بخوبی واقف ہیں کہ آج یہ مسئلہ ایک فیصلہ کُن حقیقت بن گیا ہے اور اس کا صحیح حل دریافت کر لینے ہی پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔

قومی ملکیت کا جو تصور آج سیاسی مسئلہ بنا ہوا ہے، وہ کم و بیش ایک ڈیڑھ صدی پرانا ہے، وہ ایک عالمی تحریک اس کی ترویج و اشاعت کی ذمہ دار ہے۔ نیز اس کا ایک خاص مقصد اور منصوبہ ہے، جس کے کچھ نظری پہلو ہیں اور کچھ عملی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قومی ملکیت کا تصور ایک مثبت نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتا جسے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سوچا گیا ہو۔

نظامِ سرمایہ داری اور اس کی خرابیاں

تاریخ کے صفحات پر نظر ڈال لینے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مشینوں کی ایجاد نے یورپ میں صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی اور اس کے نتیجہ میں صنعتی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ ہر طرف دولت کی ریل پیل ہو گئی، خوشحالی کے اس ماحول سے فائدہ اُٹھا کر وہاں کے بورژوا طبقے نے اجتماعِ سرمایہ فنی قابلیت اور تنظیمی صلاحیت کے اشتراک سے بے قید معیشت کا ایک نیا نظام تیار کیا جو بعد میں "جدید نظامِ سرمایہ داری" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نظام کے وجود میں آ جانے کے بعد بڑے بڑے کارخانے اور کاروباری ادارے قائم ہوئے جن کی موجودگی میں چھوٹے دستکار، کاروباری پیشہ ور اور تاجر رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو کر محنت و مزدوری کرنے کے لیے کارخانوں کے دروازوں پر جمع ہونے لگے، اس طرح دیکھتے دیکھتے پورا معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا، ایک مالدار اور دوسرا نادار۔

جدید نظامِ سرمایہ داری کی دوسری خرابی یہ تھی کہ اس نے بے قید معیشت کے ساتھ ساتھ بے دین اور بے خدا سیاست کو بھی اختیار کیا، جس کے نتیجہ میں عام انسانی اخلاق، مروت، انصاف، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی اور رحم کے اعلیٰ اوصاف کا خاتمہ ہو گیا۔

اب یورپ میں جو معاشرہ وجود میں آیا اس میں انسان خود نوعِ انسانی کا شکاری بن کر اُٹھا، معاشی استحصال، ذخیرہ اندوزی، کثیر منافع خوری حرام و حلال سے بے نیازی اور دولت کو سمیٹ لینے کی ہوس کے علاوہ باقاعدہ انسانوں کی خرید

فروخت عمل میں آنے لگی اور سرمایہ کو عملاً وہ طاقت میسر آ گئی، کہ وہ دستِ دولت آفرین کو جب چاہے اور جہاں چاہے اور جس قیمت پر چاہے خرید سکے دنیا کی ہر منڈی، ہر بازار، ہر دوکان اور ہر کارخانہ بجائے خود اس بات کا کھلا ہوا ثبوت بن گیا کہ حقوق تمام سرمایہ کو حاصل ہیں اور فرائض کا طوق صرف محنت کی گردن کے لیے ہے علاوہ ازیں محنت کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ سرمایہ کی جانب رحم طلب نگاہیں اُٹھا سکے۔

سرمایہ داری کے مفاسد کا ردِّ عمل

اس افراط اور تفریط کا جو لازمی نتیجہ برآمد ہونا چاہیئے تھا، وہ بالآخر ان حالات کے بطن سے نمودار ہو کر رہا۔ بیکاری، بیماری، عریانی جہالت اور افلاس نے خدا کی زمین پر ڈیرے جما دیئے، اور انسانیت کا شگفتہ چہرہ مرجھا کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سخت اور سنگین حالات نے بے تاب جانوں، مقفل زبانوں، کچلی ہوئی روحوں اور درماندہ ذہنوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ہر طرف ضد، غصہ، نفرت اور جھنجلاہٹ کا طوفان اُبلنے لگا، لوگ انفرادیت اور افادیت کے ناموں سے چڑنے لگے اور بے قید معیشت کے خلاف سوچ بچار کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اجتماعی فلاح، عمومی بہبود اور سماجی تحفظ کے فلسفے اور نظریے صفحۂ قرطاس پر نمودار ہونے لگے۔ عام بے چینی اور اضطراب کے ہمہ گیر ماحول سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جرمنی کے ایک یہودی کارل مارکس نے سائینٹفک سوشلزم کے نام سے ایک پورا فلسفۂ حیات پیش کیا۔ وہ لوگ جو مصائب کا شکار ہونے کے علاوہ سخت کیفیت معاشی تکالیف سے بیزار تھے، ہرگز اس پوزیشن میں نہ تھے کہ پورے ذہنی سکون کے ساتھ عقل و حکمت کی کسوٹی پر اس کے فلسفہ کو پرکھتے انہیں تو اپنے دُکھ درد کے لیے کسی فوری اندمال کارل مارکس نے اجتماعی ملکیت کے فلسفہ کی صورت میں پیش کر دیا جو اس کے سائینٹفک سوشلزم کی حقیقی روح تھا، لوگ اس درجہ پریشان اور غضبناک تھے کہ انہوں نے مارکس کے فلسفہ کی اچھائی یا برائی پر مطلق غور نہ کیا، صرف اجتماعی ملکیت کے خوبرو چہرے کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے مارکس جو اس پردے میں یہودیت کے بین الاقوامی مسئلہ کو حل کرنا چاہتا تھا، اور ایک حد تک کامیاب ہو گیا اور اس کے دامِ ہمرنگ زمین میں لاکھوں انسان پھنس کر رہ گئے۔

"اجتماعی ملکیت" کا اصل تصور جو کارل مارکس کے پیش کردہ سائینٹفک سوشلزم یا اشتراکیت کا حقیقی اور لازمی جزو ہے، اپنی فطرت اور پیدائش کے اعتبار سے خالص اشتراکی ہے اور اسے کسی عنوان سے بھی فلسفۂ اشتراکیت سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا، یہ پودا صرف اشتراکی زمین میں پیدا ہوتا ہے اور جو کچھ بھی برگ و بار لاتا ہے، اسی زمین میں رہ کر لاتا ہے، ورنہ اپنی زمین سے علیٰحدہ ہو کر یہ پودا فوراً مرجھا جاتا ہے اس لیے اجتماعی ملکیت کے مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اشتراکیت کو سمجھا جائے ورنہ ہم بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے۔ جس کا شکار مارکس کے اوّلین مخاطب ہو چکے ہیں۔

اشتراکیت کا تعارف

اشتراکیت خود اپنے دعوے کے مطابق ایک مستقل اور مکمل فلسفۂ حیات ہے لیکن اس فلسفہ کی اصل اہمیت اہلِ اشتراکیت کے نزدیک اس سائنٹیفک طریقۂ عمل کے باعث ہے جسے اس فلسفہ کے بانی نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیش کیا ہے اور جس کی بنیادیں محض عقائد و افکار پر نہیں بلکہ خود اسی کے بقول طویل تاریخ انسانیت کے ان اجزاء پر رکھی گئی ہیں، جن کا اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر مطالعہ کر لینے سے ایک جانب تو پورے انسانی کردار کے مادّی محرکات کا پتہ چلتا ہے۔ اور دوسری جانب ہمیشہ کے لئے پوری انسانی زندگی کو مادیت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

اشتراکیت کا بنیادی مسئلہ

فلسفۂ اشتراکیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت کے مادی پروگرام کی تشکیل میں سب سے بڑی دقت خود اس فلسفہ کے بانی کارل مارکس کے سامنے یہ تھی، کہ تاریخ اپنے طویل عرصہ میں کسی وقت بھی مذہب سے بیگانہ نہیں رہی، ہر دَور اور ہر زمانے میں دین و مذہب موجود رہے ہیں اور ان کے ماننے والوں کا کردار بھی اپنے اپنے مذہب کے دیئے ہوئے عقائد اور افکار کے سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے اس طرح پوری تاریخ انسانی ایک حیثیت سے مذاہب اور ادیان کی تاریخ ہے، اس کو صرف مادی تاریخ کہنا پوری تاریخ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے برابر ہو گا۔

لیکن مارکس نے اس کی پروا کئے بغیر اپنے اشتراکیت کے پروگرام کے لیے زمین فراہم کرنے کی خاطر انسانیت کی پوری تاریخ ہی کی ایک مادی تعبیر پیش کر ڈالی اور اس کے دوسرے تمام اسباب اور محرکات کا انکار کر دیا۔ لیکن ان تمام مسترحقات سے انکار اور ان کی مادی تعبیر سے بھی کام نکلتا ہوا نظر نہ آیا تو اس نے تمام مذاہب کو اپنی تاریخ کی نرالی تحقیق اور اس کی انوکھی مادی تعبیر کے شکنجے میں کس ڈالا۔ اس طرح ابتداء ہی سے اشتراکیت اور مذہب ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو گئے۔

مذہب تاریخ کی مادی کسوٹی پر

مارکس، اینگلز، لینن اور دوسرے تمام

بانیانِ اشتراکیت اس بات پر متفق ہیں کہ مذہب کی حقیقت، اس کے مزاج اور اس کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے تاریخ کی مادی کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کردار کا جائزہ لیا جائے جو مذہب نے انسان کی تہذیبی تاریخ میں ادا کیا ہے، اس طرح اُن عقائد و نظریات کی جڑیں آسانی سے کٹ سکیں گی، جنہیں کم و بیش ہر مذہب، اچھے اور بُرے اعمال، حیات بعد موت، جزا و سزا اور ایک غیر مادی خدا کے بارے میں پیش کرتا ہے۔

چنانچہ اشتراکیت کے کم و بیش تمام فکری راہ نماؤں کا رویہ مذہب کے بارے میں یہی رہا ہے کہ انہوں نے اپنے متصورہ تاریخی تحقیق کے اصولوں کے تحت، مذہب کی ابتدا، اس کی حقیقت اور اس کے مقصد کی دریافت کو اصل موضوع پر طبع آزمائی کر ڈالی، لیکن ان تمام مفکرین میں سے کسی کی فکری تحقیق بھی اپنے مفکرِ اول یعنی کارل مارکس کے دیئے ہوئے اس خاکے سے متجاوز نہیں ہو سکی کہ اولاً مذہب کے وجود میں آنے کا اصل سبب تاریخ سے دریافت کیا جائے تاکہ مذہب کے آغاز کا تعین کیا جا سکے، اسطرح جب مذہب کی وجۂ پیدائش معلوم ہو جائے گی تو ثانیاً اس کی اصل حقیقت بھی سمجھ میں آ جائیگی اور ثالثاً وہ مقصد بھی معلوم ہو جائے گا جس کے لیے مذہب کو جنم دیا گیا تھا، اشتراکیوں کے نزدیک تحقیق کا صرف ہی ایک طریقہ سائنٹیفک ہے۔ باقی تمام طریقے غلط اور مہمل ہیں۔

مذہب کی ابتداء کے بارے میں اشتراکیت کے سب سے بڑے ترجمان اینگلز نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب محض ایک واہمہ ہے، جسے مختلف زمانے کے وہمیوں نے اپنے اپنے توہمات کے مطابق گھڑ لیا تھا، پھر جہالت اور مزید توہمات نے اس پہ چند در چند غلاف چڑھا کر ہمہ گیر تفصیلات فراہم کر دیں اور انسان کی آزاد و ذہنی اور عملی سرگرمیوں کو مذہبی زنجیروں میں ... کر دیا اس کا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ:۔

"خدا محض ایک تخیل، روح محض ایک توہم اور آخرت کی زندگی محض ایک افسانہ ہے، حقیقت صرف مادہ ہے اور ماورائے مادہ کچھ نہیں۔"

چنانچہ آغازِ مذہب کے بارے میں وہ اپنی قیاسی تحقیق اس طرح پیش کرتا ہے:۔

"بالکل ابتدائی زمانے میں انسان خود اپنے جسم کی حقیقت سے بھی ناآشنا تھے چنانچہ اس دور میں موہوم خیالوں، بھیانک خوابوں اور بے بنیاد توہمات کے باعث انھوں نے عجیب عجیب قسم کے عقیدے پال لیے تھے، انھیں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ انسان کے خیالات اور احساسات کا تعلق اس کے جسم سے نہیں بلکہ ان کی محرک ایک روح ہے جو اُن کے اپنے جسم کے اندر مکین ہے اور موت کے وقت وہ اس جسم کو خالی چھوڑ کر چلی جاتی ہے، اس عقیدے کی پیدائش کے وقت سے لوگ اس غیر مرئی اور غیر محسوس روح کو توہم میں مبتلا ہو گئے اور اس اندرونی روح اور بیرونی دنیا میں تعلق پیدا کرنے کے وسائل دریافت کرنے میں لگ گئے۔"

"جب وہ اس بات کے معتقد ہو گئے کہ موت کے وقت روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ اور جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے تو پھر آئندہ کسی وقت بھی روح کی موت اور اس کی فنا کے بارے میں وہ کچھ نہ سوچ سکے اس طرح روح کے لافانی ہونے کا نظریہ پیدا ہو گیا لیکن اس وقت معاشرت کے ارتقائی مدارج میں یہ نظریہ محض ذہنی تسکین کے لیے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کو ہر شخص کی قسمت کا نام دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا، کہ قسمت کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔"

"اس طرح جب یہ تخیل جم گیا تو پھر کسی مذہبی ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ عمومی جہالت کی وجہ سے ایک عجیب گو مگو کا عالم پیدا ہو گیا کہ آخر اس روح کے ساتھ جو جسم سے علیحدہ ہو چکی ہے، کیا معاملہ کیا جائے اس طرح جہل اور توہم کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے انسان کا ذہن بالآخر اس مقام تک پہنچ گیا کہ انسان کی شخصیت اور اس کی روح لافانی ہے۔"

خدا کس طرح پیدا ہوا؟

"انسانی روح کے غیر فانی ہونے کا تصور جس طرح پیدا ہوا، بالکل اسی طرح جہل اور توہم کی مشترکہ کوششوں نے ابتداً مظاہرِ فطرت کو بھی شخصیتوں کا روپ عطا کیا اور یوں رفتہ رفتہ خدا اور دیوتا وجود میں آتے چلے گئے۔ پھر مذاہب کے مزید ارتقاء کے دوران ان خداؤں اور دیوتاؤں نے رفتہ رفتہ فطرت سے بہت بعید اور اس مادی عالم سے بالکل ماورا حیثیتیں اور مقامات حاصل کر لیے یہاں تک کہ بالآخر تخیلی اور تجریدی عمل کے ذریعہ سے۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ ایک عمل کشید اور تقطیر کے ذریعہ سے جو فطرتاً انسانی عقل و خرد کے ارتقاء کے دوران پیدا ہوتا رہا، بہت سے خداؤں کو باہم دگر مدغم کر کے رفتہ رفتہ ان کی تعداد بھی کم کی جاتی رہی۔ اس طرح خداؤں کے

اور خاتمہ اور انضمام کا یہ سلسلہ چلتے چلتے انسانی ذہن کو صرف ایک خدا کے تصور تک لے آیا، چنانچہ اس طرح توحید (ایک خدا کے تخیل) کی ابتدا ہوئی اور ایک سب سے بڑا خدا وجود میں آگیا اس کے ساتھ ہی وہ مذاہب بھی وجود میں آگئے جو اپنے آپ کو موحد یا توحید پرست کہتے ہیں۔" "اینگلز"

اشتراکیت کے اس سب سے بڑے شارح اینگلز کی اس وضاحت سے کم و بیش وہ تمام شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں جو بعض کم علم اور کوتاہ اندیش اشتراکیوں کے بیانات سے اس لیے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ وہ جب بھی اشتراکیت کو دلائل کی معرفت منوانے میں کمزور پڑتے ہیں یا مذہب کی جانب سے پیش کردہ دلائل زیادہ قوی ہوتے ہیں تو وہ مصلحت کی خاطر اشتراکیت اور مذہب کو ایک جگہ مجتمع کر دیتے ہیں۔ ماضی قریب میں مسیحی سوشلزم، بدھ سوشلزم، زرتشتی سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے ناموں سے کمزور اور کم علم اشتراکی جماعتوں نے جو نظریاتی ذخیرہ جمع کیا وہ اس بات کی کھلی شہادت پیش کرتا ہے کہ یہ حضرات جب سوشلزم کو خود اس کے پیش کردہ اصولوں کے ذریعے منوانے میں ناکام ہوتے تو انہے چور دروازوں سے دراندازی کی مہم کو آگے بڑھاتے رہے حالانکہ ان کی یہ پالیسی اور عمل اشتراکیت کی حقیقی تعلیم اور اس کے بنیادی تصورات سے متصادم ہوتا ہے۔

(یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ابھی تک کسی اشتراکی جماعت یا راہ نما نے یہودی سوشلزم یا اسرائیلی سوشلزم کے نام سے کوئی نظریہ یا نظام پیش نہیں کیا حالانکہ یہودیت بھی ایک مستقل مذہب ہے اور اس کے ماننے والے بھی اسی دنیا میں بستے ہیں۔)

(باقی آئندہ)

شاہ فیصل مرحوم کی شہادت

چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

سوگوار آج ہے ملک بھر کی فضا   اوڑھلی صبح نے شامِ غم کی رِدا   جس طرف دیکھیے آج اندھیر ہے   یہ بھی تقدیر کا اک الٹ پھیر ہے

ہر بشر کا ہے دل آج ٹوٹا ہوا   جس طرف دیکھیے سوگ چھایا ہوا

چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا   چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

ساری دنیائے اسلام غمگین ہے   آج عنقا مسلماں کی تسکین ہے   آہ وہ سربراہِ عرب اب کہاں   جس کا کرتی تھی دنیا ادب اب کہاں

بجھ گیا کعبۂ جاں کا روشن دیا   چشمِ مومن میں پھرنے لگی کربلا

چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا   چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

یہ مشیت کا کیسا قلم اٹھ گیا   موت کا کس طرف یہ قدم اٹھ گیا   حیرتوں میں ہیں ڈوبے ہوئے بام و در   کر رہے ہیں دلوں سے عزائم سفر

دینِ احمد ہے اور ورطۂ ابتلا   ہر بشر کا ہے ٹوٹا ہوا حوصلا

چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا   چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

اشک آنکھوں میں ہیں لب پہ آہ و فغاں   الحفیظ الحفیظ الاماں الاماں   رات بھر ماہ و پرویں کی لَو کم رہی   خاک کے ذرے ذرے کی ضَو کم رہی

جس طرف دیکھیے بے بسی کی گھٹا   مرگ و ہستی میں کم رہ گیا فاصلا

چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا   چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

خوش نظر خوش تھا خوش سیر خوش قدم　　اعتمادِ عرب آبروئے عجم
آہِ مظلوم سے بڑھ کے ذہن رسا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

صاف گو ہی نہیں صاف باطن تھا وہ　　امنِ اسلام عالم کا ضامن تھا وہ
تھا وہ اک قابلِ قدر مردِ خدا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

اس کی نظروں کی کیا تاب لاتا عدو　　وہ محمدؐ کی اُمت کی تھا آبرو
بڑھ گیا اُس کی جانب بھی دستِ قضا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

وہ سیاسی بصیرت کا انساں گیا　　جس کا دل سوزنے تھا درخشاں گیا
آج خاموش ہے نغمہ زارِ وفا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

تھا وہ ایک پیکرِ اتحاد و عمل　　خیر خواہِ اُمم، جانثارِ ملل
مومن دیں نگر پیکرِ اتقا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

تھا وہ مخلص بھی غمخوار بھی شاہ بھی　　اُس سے بندے بھی خوش تھے اور اللہ بھی
فطرتاً تھا وہ اک عادل و رہنما
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

زندگی میں نشاط و شجاعت ملی　　موت پائی تو اعلیٰ شہادت ملی
سب کے ہونٹوں پہ ہے مغفرت کی دعا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

●

گھر گیا ہے اندھیرے میں ہر اُمتی　　روشنی، روشنی، روشنی
بجھ نہ جائے کہیں اہلِ حق کا دیا
چل بسا پاسبانِ حرم چل بسا

—— حضرت لعمان دانش

انتقادیات

شب جائے کہ من بودم

> مندرجہ ذیل تبصرہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے موقر مجلہ ماہنامہ **معارف** بابت مارچ ۱۹۷۵ء سے ماخوذ ہے۔ غارِ حرا سے متعلق محترم تبصرہ نگار نے جس سہو قلم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آغا صاحب اُس کے لیے مجلۂ مذکور کے شکر گزار ہیں، تبصرہ ملاحظہ ہو۔ (ادارہ)

مرتبہ: جناب شورش کاشمیری

تقطیع متوسط کاغذ عمدہ کتابت وطباعت اچھی

صفحات ۲۱۲۔ مجلد گرد پوش

قیمت مجلد ۱۰ روپیہ

مطبوعات چٹان میکلوڈ روڈ۔ لاہور

پاکستان سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، تو سب سے پہلے وہاں کے ممتاز مصنف، ممتاز شاعر نامور صحافی اور دارالمصنفین کے بڑے قدرداں جناب شورش کاشمیری نے اپنی کتابوں کا سیٹ اور ہفت وار چٹان ارسال کیا، معارف میں تبصرہ کے لیے پہلے ان کی کتابوں میں سے اس کتاب کا انتخاب کیا جا رہا ہے، جس میں ان کے مقدس سفر حج کی روداد ہے۔

شورش صاحب نے ۱۹۶۹ء میں ہوائی جہاز سے حج کا سفر کیا، چودہ دنوں تک سان کو بیت اللہ بارگاہ رسالتؐ اور ارض قرآن میں باریابی کی سعادت میسر آئی، ان کا دل خدا کی عظمت، اسلام کی محبت رسول کی عقیدت اور قوم و ملت کے درد سے سرشار اور طبیعت بڑی حساس اور بے چین ہے اس لیے حرمین اور مقدس مقامات میں حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، جس کی پوری تصویر اس کتاب میں ملتی ہے، ہر مقام پر ان کو قرون اولیٰ کے واقعات یاد آئے ہیں جن کو پُراثر انداز میں لکھ کر عربوں اور مسلمانوں کے موجودہ حالت کا بھی جائزہ لیا ہے، ان کو مکہ میں کھجور اور زمزم اور جدہ میں زبان واذان کے علاوہ ہر طرف یورپ کا مال نظر آیا، وہ یہودیوں کے قبلہ اول کے لے اٹھنے اور نصاریٰ کے امت ہاشمی کا لہو نچوڑنے اور عربوں کے طیش کے ختم ہو جانے کا ذکر کر کے بھی اشکبار ہوتے ہیں۔ آل سعود کی قبروں اور مقدس مقامات کے بارہ میں رویے کا قدرے سخت لہجہ میں ذکر ہے، مگر یہ شکوہ شورش صاحب کی فرطِ عقیدت کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے بعض اوقات شریعت کے معاملات عقیدت و محبت کے جذبات کی تہہ کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں صفحہ ۹۵ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غار حرا میں مسلسل ۴۰ سال تک تشریف لے جانے اور عبادت کرنے کا ذکر ہے، حالانکہ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں وہاں جا کر عبادت کرنا شروع کیا تھا، یہ کتاب شورش صاحب کے مخصوص انشا پرداز انداز بیان کا نمونہ ہے اس کے مطالعہ سے فاضل مرتب کی طرح ناظرین بھی اپنے کو کیفیات اور جذبات سے مخمور اور سرشار پائیں گے، کتاب کے نام میں بھی بڑی دلآویزی ہے، جو داد طلب ہے، شروع میں مقدس مقامات کی تصویریں دی گئی ہیں۔ "ض"

خطبات گارسان دتاسی

صفحات: ۳۲

قیمت: پندرہ روپے

گارسان دتاسی گزشتہ صدی کا مشہور فرانسیسی مستشرق تھا اس نے اردو زبان، ادب، صحافت کی جو خدمت انجام دی، وہ برصغیر کے بہت سے اُردو بہی خواہوں کے حصے میں بھی نہیں آئی، انجمن کی جانب سے مدت ہوئی، اس کے مقالات و خطبات کے مجموعے چھپ چکے تھے اور اب مدت سے نایاب تھے۔ انجمن نے خطبات گارسان دتاسی حصہ دوم کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ یہ صرف پانچ خطبے ہیں، جو دسمبر ۱۸۶۵ء سے دسمبر ۱۸۶۶ء تک ایک سال کی مدت میں دیئے گئے تھے ان پانچ خطبوں میں اس ایک سال کی پوری علمی، ادبی تعلیمی، تہذیبی تاریخ سمٹ آئی ہے، اگرچہ اس کی ترتیب وہ نہیں ہے جو علمی و تہذیبی تاریخ کی ہوتی ہے یا ہونی چاہیئے۔

تذکرہ قطعہ منتخب

مصنف: عبدالغفور نساخ

صفحات: ۸۲

قیمت : ۱۰ روپے

قطعہ منتخب عبدالغفور نساخ کا مشہور تذکرہ ہے جو اس سے پہلے نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور اب ایک مدت سے نہ صرف کم یاب بلکہ نایاب تھا۔ اب اسے اردو کے نامور ادیب اور نقاد محمد انصار اللہ نظر نے مرتب کر دیا ہے۔ فاضل مرتب نے اس کے شروع میں مقدمہ اور ہر صفحے پر بہت سے مفید حواشی تحریر فرمائے ہیں، جس سے تذکرہ کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ اُردو ٹائپ میں چھپا ہے۔ کاغذ سفید استعمال کیا گیا ہے۔

تذکرہ آزردہ

مؤلف : مفتی صدرالدین آزردہ

صفحات : ۱۲۱

قیمت : ۵ روپے

مفتی صدرالدین آزردہ مسلم ہندوستان کے دَورِ آخر میں دلی کی ایک علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیت تھے۔ ان کے فضل و کمال کے تذکرے سے نہ صرف علمی، تعلیمی اور تاریخی تذکرے بھری ہیں، بلکہ ۱۸۵۷ء میں جو حالات پیش آئے تھے، ان کی بنا پر وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی بھی ایک اہم شخصیت بن گئے۔ اسی طرح ان کے ادبی محاسن اور شاعرانہ کمال کے بیان میں ادبی مورخ اور تذکرہ نگار رطب اللسان ہیں، مفتی صاحب نے اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا، لیکن حُسنِ اتفاق سے اس کے کچھ صفحات الٰہ آباد کے ایک کالج کے کتب خانے میں پہنچ گئے، اور دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہو گئے۔

اردو کے مشہور مصنف اور محقق ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یہ صفحات وہاں سے حاصل کر کے مرتب کر دیئے ہیں۔ اور ایک مقدمہ کے اضافے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو نے اسے پہلی بار شائع کر دیا ہے، اگرچہ یہ تذکرہ مکمل نہیں ق تک کے (ق کا صرف ایک شاعر ہے) ۱۰۶ شاعروں کا تذکرہ ہے، لیکن تذکرہ نگاری اور ادب و تنقید کی تاریخ میں اس کا ایک خاص مقام ہے، اگرچہ فاضل مرتب کی نظر بعض اہم اور معروف کتب و رسائل تک نہیں پہنچ سکی۔ لیکن تذکرے کی اہمیت اس سے کم نہیں ہو گئی۔ یہ تذکرہ سفید کاغذ پر آفسٹ میں شائع ہوا ہے۔

طنزیات و مقالات

(سید محفوظ علی بدایونی)

مرتب : محمد محی الدین بدایونی

صفحات : ۶۰۰

قیمت : ۲۰ روپے

محفوظ علی بدایونی علیگڑھ کالج کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ وہ ایک جامع کمال بزرگ تھے اگرچہ انہوں نے کوئی مستقل تصنیف تو اپنی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے دستِ راست کی حیثیت سے ہمدرد میں جو علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی، سیاسی مضامین لکھے، ان میں سے بعض چیزیں اپنی ایک مستقل ادبی اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان کا مطالعہ ایک دَور کے علمی، ادبی، سیاسی، تہذیبی رجحانات و تحریکات کے مطالعے کے لیے نہایت ضروری ہے، ان مضامین کو محمد محی الدین بدایونی نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد مرتب کر دیا اور ان کی اشاعت کے لیے انجمن کو وسائل بھی مہیا کر دیئے۔ ان کی اس محنت اور ایثار و خدمت کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

یہ چاروں کتابیں انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کی ہیں اور پیپر بیک میں شائع ہوئی ہیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

تحریر: رحمت علی

افراطِ زر

موجودہ تہذیب کے لئے شدید خطرہ

انگلستان کی طرح یورپ کے دیگر اقوام بھی معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔ اٹلی کی حکومت قومی دیوالیہ کا اعلان کر چکی ہے۔ اس ملک میں بھی حالات کو خراب کرنے میں مزدور انجمنوں نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ مسلسل ہڑتال کے باوجود حکومت کو اجرت میں ۱۹،۱ فیصدی اضافہ کے مطالبہ کو ماننا پڑا۔ جرمنی میں حالات نسبتاً بہتر ہیں لیکن مختلف شعبوں میں ٹھہراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۴ء کے پہلے چار مہینوں میں یورپ سے تجارت میں اس ملک کا توازنِ تجارت موافق تھا۔ جرمنی کی زیادہ تر برآمدات اٹلی، فرانس، جاپان اور انگلستان کو بھیجی گئی تھیں۔ ان ملکوں کے افراطِ زر کے اثرات جرمن معیشت پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ فرانس کے توازنِ ادائیگی کے بگڑنے سے اس ملک کی معیشت کو سخت دھکا پہنچا ہے۔

امریکہ کی معاشی حالت کے بارے میں صدر فورڈ چاہے جتنے پُر امید ہوں حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں افراطِ زر ۱۴ فیصدی مرکب شرح سے بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۷۴ء کے پہلے تین مہینوں میں افراطِ زر کی یہ رفتار کسی بھی مغربی ملک کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی۔ امریکہ میں مصنوعات اور خدمات کی پیداوار میں ۷،۵ فیصدی کی شرح سے کمی ہو رہی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں تجارتی خسارہ ۱۸ بلین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ حالات کی خرابی کا زیادہ اثر ملک کی سیاہ آبادی پر پڑ رہا ہے۔ ان لوگوں میں بے روزگاری کا فیصد ۹،۹ ہے۔ یہ فیصد ملک کی عام بے روزگاری کے اعداد کے مقابلے میں دوگنا ہے۔ صدر فورڈ کا خیال ہے کہ ۱۹۷۵ء کے اختتام تک شرحِ پیداوار میں اضافہ ہوگا اور افراطِ زر کو قابو کیا جا سکے گا۔ ہو سکتا ہے

ہے کہ بے روزگاری کی شرح میں کسی قدر اضافہ ہو جائے۔

مغربی یورپ اور امریکہ کے موجودہ معاشی بحران اور بڑھتے ہوئے افراطِ زر کی ذمہ داری تیل کی قیمت میں اضافے اور تیل برآمد کرنے والے ملکوں پر عائد کی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ تیل برآمد کرنے والوں نے تیل کی قیمت میں اضافہ کر کے مغربی دنیا کے توازنِ ادائیگی کے حلقہ کو بہت ہی سنگین بنا دیا ہے۔ اس اضافہ کی وجہ سے عرب ملکوں کی آمدنی میں ۶۰ بلین ڈالر سالانہ کا اضافہ ہوگا۔ جس سے دنیا میں جنگ کا افراطِ زر بڑھے گا اور تیل خریدنے والے ملکوں کے لیے لازمی ہو جائے گا کہ اپنے توازنِ ادائیگی کے حسابات میں ۶۰ بلین ڈالر سالانہ کی کمی کر دیں۔

تیل کے بحران کے نتیجہ میں اٹلی کو تیل کی خریداری کے لیے ۱۰،۱ بلین ڈالر کا قرض حاصل کرنا پڑا۔ یہ رقم ملک کے ۱۱ بنکوں سے حاصل کی گئی تھی۔ اندازہ ہے کہ آئندہ آٹھ سال میں اٹلی کو اس مقصد کے لیے ۸۰ بلین ڈالر حاصل کرنے ہوں گے جس کا سالانہ سود ۴ بلین ڈالر ہوگا۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے نے دنیا کی موٹر کار کی صنعت پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ انگلستان، اٹلی، جرمنی اور امریکہ کی کاروں کی پیداوار گھٹ گئی۔ اٹلی کی فیٹ کار کی مانگ میں ۳۰ فیصد کاروں کی کمی ہو گئی۔ امریکہ کی کرائسلر کمپنی نے اپنے چھ پلانٹس میں سے ۵ کو بند کر دیا۔ اس کا اثر صنعت کی دوسری شاخوں کی بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ انگلستان میں کاروں کی اندرونِ ملک فروخت ۳۰ فیصدی کی حد تک کم ہو گئی۔ ایسی ہی کمی ۶ فیصد مغربی جرمنی میں ہے۔ پان امریکن اور ٹی ڈبلیو اے کی ہوائی کمپنیوں نے آپسی مسابقت کو ختم کر کے اپنے اپنے راستے مختص کر لیے ہیں۔

توازنِ ادائیگی کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ تیل برآمد کرنے والے ملک اتنی ہی مالیت کا سامان درآمد نہیں کر سکتے کیونکہ ان ممالک کی معیشت اتنی درآمدات کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ان ملکوں کی آبادی بہت ہی کم ہے۔ اس طرح ان ملکوں کا توازنِ ادائیگی بہت موافق ہوگا اور ڈالر اور دیگر مغربی ملکوں کی کرنسی ان ملکوں کے نام بین الاقوامی بنکوں میں جمع رہے گی۔ اس رقم کو طویل مدتی سرمایہ کاری کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ممالک اس رقم کو قلیل مدتی امانتوں کی شکل میں رکھتے ہیں اور اس کو جلد جلد نکالتے رہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تیل پیدا کرنے والے ممالک امریکہ اور یورپی کرنسی کی امانتوں سے سالانہ ۷ بلین ڈالر نکالتے رہتے ہیں۔

تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت کے سلسلے میں یہ بات بھی بہت ہی اہم ہے کہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں کام کرنے والے مغربی ملک کے کارپوریشنوں نے اپنے منافع کے فیصد کو بہت بڑھا دیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی فیصلوں نے یہ صورتِ حال پیدا کی ہے اور سیاسی فیصلوں کے ذریعہ ہی حالات کو بدلا جا سکتا ہے۔ تیل کی قیمت کو کم کرنے کے سلسلے میں خریدنے اور بیچنے والے ملکوں کے درمیان گفت و شنید مسلسل جاری ہے۔ اس میں خیر سگالی: دورے، مصالحتی کوششیں اور قوت کے

باقی صـ۴۷ پر

فرمودات اقبالؒ

محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اُٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لیے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ملت کی حالت

اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے۔ ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں، علماء میں مداہنت آگئی ہے یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے، صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تعریف میں ہیں اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں، اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں، عوام میں جذبہ موجود ہے، کو ئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودہری نیاز علی خان کے نام خط ۱۹۳۷ء)

کڑا وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی، مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں، نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کئے

بنام (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۹ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

لیڈروں کا فقدان

اس وقت مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی رُوح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں، اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو، ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں، لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے، اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحاد و عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

وحدت انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو، قابل احترام ہے۔ (دیباچہ پیام مشرق)

وطنیت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لیے کہ اس میں منکر خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لیے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کے لئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

قائد اعظم کے نام خط ۱۹۳۷ء

لیگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لیے وقف ہیں۔ اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔

باقی صفحہ ۳۸ پر [?]

بقیہ:- افراطِ زر

ستیاں کی دھمکیاں سب ہی شامل ہیں۔ یہ ممکن ہے
تیل کی قیمت میں کسی قدر کمی کر دی جائے اور آئندہ
افزائش کرنے کی ضمانت بھی دی جائے، لیکن حالات
خرابی کو بالکلیہ طور پر تیل کی قیمت میں اضافہ پر
ڈال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء
سے پہلے تیل بہت ہی معمولی قیمت پر فروخت ہوتا تھا،
جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے وسط سے
قیمتوں میں اضافہ کا رجحان پایا جاتا تھا اور ایک
بار بڑھی ہوئی قیمتیں پھر کسی حالت میں کم نہیں ہو رہی
ہیں۔

موجودہ معاشی بحران اور افراطِ زر کے مسائل
حل کرنے کے سلسلے میں یورپ میں ایک عام رجحان
پایا جاتا ہے کہ معاشی معاملات میں حکومتی مداخلت
کی جائے۔ ٹیکس اور حکومتی اخراجات کو گھٹا کر نجی
سرمایہ کاری کے لیے ترغیب فراہم کی جائے۔ سرمایہ دارانہ
نظام کو تباہی سے بچانے کا یہی راستہ ہے تاریخی پس منظر
میں کی معاشیات کا ذکر کرتے ہوئے ہم مضمون کے
ابتدائی صفحات میں اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ معاشی معاملات
میں حکومتی مداخلت، ٹیکس اور حکومتی اخراجات نے ۱۹۳۰ء
کے عشرے میں معیشت کو عظیم کساد بازاری سے نکالا تھا۔
پچیس سال کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ عظیم کساد بازاری
روکنے کے لیے اٹھائے ہوئے مؤثر اقدامات
آج کے حالات میں نا موزوں ہیں۔ ٹیکس اور حکومتی اخراجات
کے سلسلے میں امریکہ کے مشہور عالمِ معاشیات کولن کلارک
عرصہ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ قومی آمدنی کا اگر ۲۵
فیصدی حصہ ٹیکس کی شکل میں وصول کر لیا جائے تو معیشت
افراطِ زر کے چکر میں پھنس جاتی ہے۔ حقیقی آمدنی کو
متوازن سطح پر قائم رکھنے کے لئے ٹیکس میں کمی ناگزیر
ہو جاتی ہے اس کا لازمی مطلب اجرت کو بالکلیہ طور
پر روکنا نہیں بلکہ اجرت کو قیمتوں کی سطح اور پیداآوری
شرحوں کو قریب تر کرنا ہے۔ اس کے لیے ضروری
ہے کہ تنقید کے باوجود ملک کے مرکزی بینک کو

سخت زر کی پالیسی پر کاربند رہنا ہوگا۔ امریکہ کا مرکزی
بینک (فیڈرل ریزرو سسٹم) مختلف گوشوں سے مسلسل
نکتہ چینی کے باوجود آسان زر کی پالیسی اختیار کرنے
کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے خیال میں اب تک کی
فراہم کردہ آسانی بہت کافی ہے اور مزید آسانی حالات
کو ابتر کر دے گی۔ پچھلے پانچ برسوں میں اعداد و شمار
کے مطابق حکومتی اخراجات میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا
اور مالیات کا خسارہ ۸۰ بلین ڈالر تک پہنچ چکا ہے
امریکی حکومت نے اپنے بہت سے ملازمین کے الاؤنس
اضافہ تدریجی کو ایک خاص مدت تک کے لیے روک
دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بقیہ:- فرمودات اقبال

پیٹ کا مسئلہ دن بدن عقدہ لاینحل بنتا جا رہا ہے
مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ
وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا
ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان کے افلاس کا مسئلہ
کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ
کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل
سے قاصر رہی، تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس
سے دُور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل
اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے
بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین
کو کماحقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک
کا حقِ معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے موجودہ زمانے
کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں
مسلمانوں کے لیے زیادہ آسان ہے۔

(قائداعظم کے نام خط ۱۹۳۷ء)

تاریک ترین دَور

اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے
جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے
اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور ان نقابوں کے
نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرف
انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم
کا کوئی تاریک سے تاریک پہلو بھی اس کی مثال
پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

الٰہیہ کی اتباع

جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند
نہ ہو، امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ
ضرور دیں۔

بعدالت جناب خان عبدالکریم خان کنڈی ڈسٹرکٹ جج
بنوں۔

اپیل دیوانی ۱۲/۲۳ ۱۹۷۴ء

حبیب اللہ خان ولد بیگو خان قوم پشتون سکنہ
عالمشہ خیل تحصیل مروت ضلع بنوں (اپیلانٹ)

بنام موسم خان وغیرہ ریسپانڈنٹان

اپیل بنارا ضگی ڈگری و حکم مورخہ ۱۵ اجلاس
سول جج لکی مروت

اشتہار بنام (۵) عمر خان ولد موسم خان پشتون سکنہ
عالمشہ خیل داخلی بیگو خیل تحصیل لکی مروت ضلع
بنوں۔ ریسپانڈنٹ

اپیل بالا میں ریسپانڈنٹ ۵ کی تعمیل معمولی طریقہ
سے ہونی مشکل ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا آپ کو مطلع
کیا جاتا ہے کہ اپیل ہذا میں پکی تاریخ پیشی مورخہ
۱۶ اپریل ۷۵ء مقرر ہو چکی ہے بہ لئے جواب دہی اپیل
اصالتاً و وکالتاً مختیارتاً حاضر آویں، بصورت دیگر حسب
ضابطہ کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۷ ماہ مارچ ۱۹۷۵ء بہ ثبت دستخط
میرے و مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط ڈسٹرکٹ جج

مہر عدالت

بقیہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

حمید احمد خان کا پُرمغز مقالہ اسی پر ہے، اس ضمن میں قابلِ توجہ نکتہ حمید احمد خان نے یہ بیان کیا ہے کہ :۔ بیدل سے علامہ کی دلچسپی کی بنیاد ایک

عمیق روحانی ہم آہنگی پر قائم تھی۔

حمید احمد خان کہتے ہیں کہ علامہ با مقصد شعراء کو ان شعراء پر ترجیح دیا کرتے تھے جو محض فنکار شاعر تھے اور ان کی نظر میں بیدل بھی با مقصد شاعر تھے۔ مذکورہ ہم آہنگی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اقبال کے یہاں حرکت و قوت کا جو تصور ہے وہ بیدل کے ہاں بھی ہے۔

حمید احمد خان کہتے ہیں، علامہ کے جس انتخاب بیدل کا ذکر آیا ہے، وہ نکات و رقعات میں سے ہے، اس میں سب سے زیادہ زور جس قدر پر دیا گیا ہے وہ آزادی و وارستگی ہے جو غیوری کا ایک رنگ ہے اور سب کو معلوم ہے کہ غیوری علامہ کے مردِ مومن کی ایک صفتِ خاص ہے۔

بیدل سے متعلق حمید احمد خان کا مضمون، اہلِ فکر و تحقیق کے لیے دعوتِ مطالعہ ہے کیونکہ بیدل کا صحیح مطالعہ ابھی نہیں ہوا، بہتر ہوگا

کہ کوئی آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آئے

اور اس ادبی و فکری طریقت کی شرح لکھے جس کی نمائندگی بیدل نے کی ہے۔ اس قسم کے توسیعی مطالعہ سے یہ راز بھی شاید کھل جائے کہ بیدل سے اقبال کی دلچسپی، غالب کی دلچسپی سے زیادہ گہری اور مختلف نوعیت کی ہے۔۔۔۔۔۔

غالب کو تو رنگ بہار ایجادی بیدل کا شوق تھا، مگر اقبال کی نظر ان افکار و حقائق پر ہے جو بیدل کے عام کلام میں عموماً اور ان کی مثنوی عرفان میں خصوصاً تہ بہ تہ موجود ہیں۔

بیدل کا تصورِ آگہی جو شعورِ خودی کے اضطرابِ مسلسل کا ثمر ہے، بیدل کا تصورِ شکست جو جہادِ حیات کی ایک ناگزیر منزل ہے۔ بیدل کا تصورِ ظہور

فن، ان کا تصورِ کائنات جو سیاسیات لسبتوں پر قائم ہے۔ بیدل کا تصورِ جلال کہ جمال کا دوسرا نام ہے بیدل کا تصورِ حقیقت الانسانیہ کہ وہی خلاصۂ کائنات ہے اور پھر ان کا تصورِ حقیقتِ محمدیہ کہ ترجمانِ معنی لولاک ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس قسم کے بہت سے مباحث ایسے ہیں، جن کو پڑھتے وقت اقبال خود یاد آتے ہیں۔ لہٰذا بیدل کا مطالعہ نہ صرف اقبال کے توسیعی مطالعے کے لیے بدرجہ غایت مفید ہوگا بلکہ اس روایت کی تفہیم کے لیے ممد و معاون ہوگا جو ابن العربی کی فکر اور اشراقیوں کی معرفت کے امتزاج کی صورت میں ملا باقر داماد اور ملا صدرا تک پہنچی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ہندوستان میں اسے حضرت مجدد کے عقیدہ وحدتِ شہود سے متصادم ہونا پڑا۔ اس تصادم کے آثار فکر بیدل میں جابجا موجود ہیں۔ حمید احمد خان نے نہیں بتایا ہے کہ بیدل اپنے زمانے میں جس آویزشِ فکری میں مصروف رہے، اپنے زمانے میں علامہ اقبال بھی اسی محاربۂ فکری میں سرگرمِ جہاد نظر آتے ہیں، لہٰذا مطالعہ اقبال کے لیے مطالعہ بیدل ضروری ہے۔

حمید احمد خان کی یہ کتاب مختصر ہے مگر پُرگہر ہے، میری حسرت یہ کہتی ہے، کاش حمید احمد خان کچھ زیادہ لکھتے تاکہ زمانہ ان کے نکتہ طراز قلم کے فیوض سے زیادہ بہرہ مند و فیضیاب ہوتا۔۔۔۔،

اور ہاں۔ ایک گلہ ذاتی میرے ذوق کو بھی ہے اور وہ یہ کہ میرے محبوب مصنف نے ایک جگہ بڑے شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے، میرے محبوب اور عظیم شاعر میر تقی میر کے معاملے میں ایک گونہ تغافل استعمال کیا ہے، جو ہم میریوں کو مضطرب کر گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ مگر معاملہ محبت کا ہے۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو بے مزہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ صبح علوم کیا گل کتر گئی ہے، اور اس مجموعۂ فکر و ذوق کے ذریعے حمید احمد خان ہمارے دامن کو کن کن موتیوں سے بھر گئے ہیں۔

۔۔۔۔۔۔۔ البتہ غم یہ ہے کہ محفل اگرچہ باقی ہے، مگر وہ شمع خاموش ہے، جس کی تقریر و تحریر کی ضیا سے ہمارے یہ در و دیوار منور رہا کرتے تھے اب ان کی یادگار ان کی کتابیں ہیں، عرب شاعر نے کہہ گیا ہے

یلوح الخط فی القرطاس دہراً

و کاتبہ رمیم فی التراب

بعدالت جناب خان عبدالکریم خان کنڈی ڈسٹرکٹ جج بنوں۔

اپیل نمبر $\frac{121}{14}$ ۱۹۷۴ء

غلام اکبر خان ولد سید اکبر خان قوم پشتون سکنہ حیات خیل مروت (اپیلانٹ)

بنام غفار خان وغیرہ ریسپانڈنٹان

و اپیل دیوانی $\frac{124}{14}$ ۱۹۷۴ء

شیر علی خان ولد ولاسہ خان قوم پشتون سکنہ دانشہ بنوچی مروت اپیلانٹ

اپیل بنا راضگی ڈگری و حکم مورخہ $\frac{9}{4}$ ۷۴ء اجلاس جناب سول جج لکی مروت

اشتہار بنام: (۱) غفار خان ولد صالح خان قوم پشتون سکنہ حیات خیل مروت ریسپانڈنٹ

ریسپانڈنٹ ملا بالا کی تعمیل معمولی طریقہ سے ہونی مشکل ہے، لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اپیل ملا بالا کی پکی تاریخ پیشی مورخہ ۱۲/اپریل ۷۵ء مقرر ہو چکی ہے لہٰذا آپ اصالتاً وکالتاً مختیارتاً تاریخ مقررہ کو حاضر آوے بصورت دیگر حسب ضابطہ کاروائی یک طرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۹ ماہ مارچ ۷۵ء ۱۹ء بہ ثبت دستخط میرے و مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط: ڈسٹرکٹ جج

(مہر عدالت)

ہفت روزہ چٹان لاہور

ترجمہ

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیار جاسوس

بعض اوقات حالات، الفاظ کو ایسے مطالب بخش دیتے ہیں، جو کسی لغات میں نہیں ملتے گیانی کے ساتھ اس مسابقہ سے پہلے میں نے کبھی مسکراہٹ گفت گو اور خاموشی میں اتنا نازک اور لطیف فرق محسوس نہیں کیا تھا، کسی تفتیش کنندہ افسر کے سوالات کا جواب ایک ملزم کے لیے خاموشی سے بہتر شاید اور کوئی نہ ہو، لیکن سب سے بہتر شخص کے لیے جو ایک جاسوس کے پناہ دھندہ کو یہ یقین دلا رہا ہو کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کے متوسل کا ہمراز اور ساتھی ہے، زور دار گفت گو کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، خاموشی بلاشبہ دانشمندی کی سنہری علامت ہے لیکن میں اس مقابلہ میں خاموشی اختیار کر لے اور دانشمندی کے سونے کا پیچھا کرنے کی صورت میں انتہائی احمق ثابت ہوتا، ایک جاسوس کو چھپانے والے شخص سے زبانی مسابقہ کی صورت میں خاموشی کا نتیجہ میرے بہروپ کا افشا اور میرے مشن کی ہمیشہ کے لیے ناکامی بھی ہو سکتا تھا، خاموشی کی درج ذیل صورتوں میں کئی متضاد توجیہات ہو سکتی ہیں، مثلاً خوف و ہراس، لاعلمی، عدم فیصلہ [illegible]، انحراف، اقرار، تعاون، عدم تعاون پھر بھی نہ! دوسری جانب مسکراہٹ صرف دوستی اور [illegible] ظاہر کرتی ہے، دوست شناسائی دوستوں سے ہی پیار کرتے ہیں، خاموشی اشتعال [illegible]

کی انگیخت کا باعث ہوتی ہے، جب کہ ہنسی ایک خوبصورت پردہ ہے، کڑوی سے کڑوی گولی کے لیے شکر کی ایک میٹھی تہ ہے ایک دلآویز جواب ہے، ایک تقریر بے تقریر ہے استعارۃً ہنسی بھی خاموشی کی طرح ایک سونا ہے یہ تقریر سے کم بیانیہ نہیں، اس کے باوجود یہ نہ تقریر ہے نہ محض خاموشی! خاموشی کے برعکس اس میں کچھ کہا جاتا ہے، لیکن تقریر کی طرح کوئی واضح اقرار یا انکار بھی نہیں کیا جاتا۔ یہ نہ تو تقریر ہے نہ سکوت، بلکہ ایک ایسا ذریعہ اظہار جو اپنے مخصوص فوائد تو رکھتا ہے لیکن بہت کم نقصانات اس میں متوقع ہیں، میری مسکراہٹ نے میری بہت مدد کی اور صورت حال کو مکمل خاموشی یا عیارانہ جواب دہی سے کہیں بہتر طور پر سنبھالا۔

میری تعلیم سے متعلق گیانی کے استفسار نے مجھے محتاط کر دیا، اور میں نے دوران گفت گو ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے ساتھ ساتھ چند ایک لطائف بھی بیان کیے، جس سے میرا مقصود گیانی کو یہ تاثر دینا تھا کہ میرا ذخیرہ الفاظ بڑا محدود ہے لیکن میں گیانی سے اس معاملہ میں زیادہ پیچھے نہیں ہوں،

صلاح الدین ایوبی

جہاں تک گیانی کا تعلق ہے۔ وہ بالومارک انگریزی جو ہر قسم کی گرامر سے آزاد تھی، روانی سے بول رہا تھا۔

(ہماری گفت گو مختلف موضوعات سے متعلق خاصی وسیع ہو گئی، لیکن میں نے اب اسے تیزی کے ساتھ مختصر کر دینا چاہا۔)

میں: گیانی جی! مجھے عجائب سنگھ سے ملاقات کی توقع کب رکھنی چاہیئے۔ آج یا کل از راہ مہربانی اُسے میری طرف سے کہہ دیجئے کہ وہ مجھے فوراً ملے۔

گیانی: میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اور عجائب سنگھ کی ملاقات آج شام ۶ بجے اپنے گھر پر ہی کرا دوں۔

میں نے بڑی لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے ماحول کا فوری جائزہ لے لیا، کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ میں میرے لیے دیکھنے کی بہت سی چیزیں تھیں، مزید یہ کہ موسم گرما اور جون کے مہینے میں ۶ بجے شام کا مطلب دن کی طرح واضح روشنی تھا اور مجھے بوجوہ عجائب سنگھ کو دن کے وقت ملانا چاہیئے تھا، دن کے وقت اس کے ساتھ ملاقات میں یہ امکان موجود تھا کہ وہ مجھے دور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار اور درختوں میں چھپ کر پہچان لے اور میرے ملنے سے پہلے ہی میری جاسوسی کر لے، اور دوسرے لمحے وہ غائب ہو جائے۔ میں اس قسم کا کوئی چانس لینا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ اس نے پہلے ہی کافی دیر تک پولیس کو اس کی سراغرسانی کی کوششوں میں ناکام بنا دیا تھا، ایک دوسری وجہ بھی مجوزہ وقت کے خلاف تھی، اس وقت چار بجے تھے اور میں مقامی پولیس سے رابطہ قائم کر کے اُس پر چھاپہ کا انتظام بھی کرنا چاہتا تھا۔

میں: گیانی جی! میں آپ کی مبارک ملاقات کے لیے انتہائی شکرگزار ہوں، لیکن جیسا کہ آپ میرے مشن کی نوعیت کو جانتے ہیں اس کے پیش نظر میں نہیں چاہتا کہ عجائب سنگھ کے ساتھ آپ کی جگہ پر دن کے وقت ملاقات کر کے آپ کی پوزیشن کو کسی خطرے میں ڈالوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اُسے آج رات کسی وقت ملا جا سکے۔

گیانی: ٹھیک ہے، رات نو بجے کا وقت رکھ لیجئے۔ کیا یہ آپ کے لیے موزوں رہے گا؟

میں: (میں نے چیر مضمر خطرات کا جائزہ لیا میں نے سوچا کہ اگرچہ اس وقت اندھیرا ہوگا، لیکن گیانی نے ایک خطرناک قسم کا پہریدار کتا پال رکھا ہے جو رات کے وقت کھلا ہوتا ہے اور اپنے سیاہ فام مالک سے کچھ درجے زیادہ ہی کالا ہے۔ میں اس کی ناک سے بڑا خائف تھا اور وہ ہمہ وقت میرے اردگرد گھوم کر سونگھتا رہا، یہ ایک عجیب و غریب قسم کا کتا تھا، جس کے چلنے اور بھونکنے کے انداز کو دیکھ کر شدید گرمی میں بھی انسان کا خون جم جائے (جاری ہے)

بعدالت جناب سائیں محمد ظفر بھٹی پی سی ایس سول جج چکوال۔

درخواست نمبر سال ۱۹۷۵ء

درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی

فاطمہ بی وغیرہ بنام عوام الناس

ہرگاہ مقدمہ عنوان بالا میں سائلان فاطمہ بی وغیرہ سکنائے پادشاہان تحصیل چکوال نے ایک درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی نسبت ترکہ خان جلال متوفی عدالت ہذا میں گزاری ہے، لہذا بذریعہ اخبار ہذا ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی عذر نسبت سرٹیفکیٹ جاری کرنے میں ہو تو تقرر ۱۰ اپریل ۷۵ء حاضر عدالت ہذا آکر اصالتاً یا وکالتاً پیش کریں، ورنہ کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ مارچ ۷۵ء کو ہمارے دستخط و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

عجیب و غریب

مذہبی پابندی کی بنا پر خودکشی

بمبئی کے ایک بڑے ڈاکٹر مسٹر کانت سودھا اور ایک لیڈی ڈاکٹر مس ہیرا موہن لال جھبیر نے ایک اعلیٰ ہوٹل میں زہر اور خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی، ڈاکٹر سودھا ایک میرنٹی ہوم کے مالک تھے، اور مس جھبیر اس اسپتال میں کام کرتی تھیں جہاں وہ اعزازی سرجن تھیں، دونوں میں عشق تھا لیکن ڈاکٹر سودھا شادی شدہ تھے اور دو بچوں کے باپ بھی۔ ہندو ہونے کی وجہ سے وہ دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے اور طلاق حاصل کرنے کے لیے قانونی شرائط پوری نہیں کر سکتے تھے۔ دونوں نے ایک خط چھوڑا ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

ہم تنگ آ گئے ہیں، زندگی سے۔ اور زندگی زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے

انہوں نے درخواست کی ہے کہ

لاش کو ایک ہی چتا پر جلایا جائے۔

بمبئی اور سرینگر کے طوائف خانے

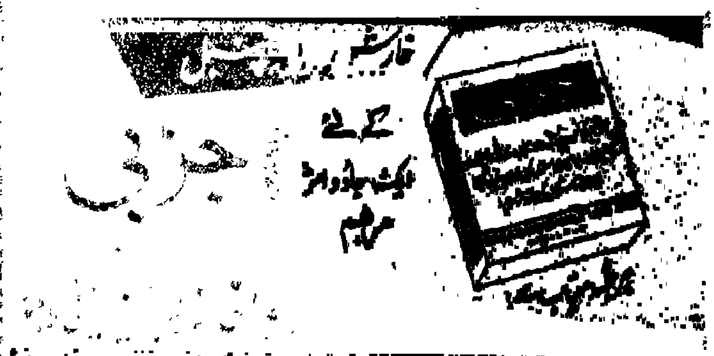
پچھلے دنوں پولیس نے بمبئی کے بازار حسن پر چھاپہ مارا تھا، حسن کی اس منڈی میں رنگین پردوں کے پیچھے جگمگاتی روشنیوں کے نیچے کچے جسموں کے سودے ہوتے ہیں، لگتا ہے کہ اس بازار میں طوائفیں نہیں، بیچارے سبھی ایک جنس کی طرح بکتے ہیں اس بازار کے متعلق کہیں ریسٹورنٹ، کلب، ناچ گھر تو چھپے ہیں، کئی پولیس آفیسروں کی بالا بالا آمدنی چلتی ہے، اور آج سب سے زیادہ برکت بالا آمدنی کے پیچھے میں سے چند روز ... مال کمائی ... کر کی شریف آدمی ... حکمت نہیں ... کلب کا ... منشیات اور کلب کی مورتی مالکن پولیس کو دیکھ کر حیرت میں آ گئے، حیرت اس لیے کہ وہ باقاعدہ بھتہ ادا کر رہے تھے لیکن یہ تو ایک خاص چھاپہ تھا، پولیس جب ان نابالغ طوائفوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے، تو کسی ایک نے دودھ پیتے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا، یہ وہ بچے تھے جن کے باپ کا علم ان کی ماؤں کو بھی نہ تھا، ان طوائفوں کی زندگی کس قدر الم ناک ہے، طوائف کی زندگی ایک شمع کی طرح ہے جو دونو سروں سے جلتی ہے، طوائف کا شباب بہت جلد رخصت ہو جاتا ہے اور پھر وہ پاگل کتے کی موت مر جاتی ہے اور جوانی میں حسن و شباب دونوں ہاتھوں سے لٹاتی ہیں، بمبئی کے وزیر اعلیٰ سے لے کر ایک غریب مزدور تک کو علم ہے اسی طرح یہاں سرینگر میں بھی ایک طوائف خانہ بنایا گیا جو ان لڑکیوں کو پروگرام میں شامل کرنے کا لالچ دے کر بداخلاقی کے لیے اکسایا جاتا ہے، لیکن بہاننت اب ایک آزاد ملک ہے، شاید یہاں سب سے زیادہ آزادی سیکس (جنس) کے میدان میں ہے۔ (ملاپ)

شوہروں کی قاتلہ ـــ میری الزبتھ

... نوع انسانی کو کسی ... میں گرفتار ... سے ... ہے کہ حال ہی میں بوڈاپسٹ (ہنگری) کی پولیس نے ایک ایسی عورت کو گرفتار کیا جس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ اُسے شوہروں کے قتل کرنے کا شوق ہے، اس عورت کا نام "میری الزبتھ" ہے اس وقت اس نے جتنے بھی مردوں سے شادیاں کی ہیں، وہ سب کے سب پُراسرار حالات میں شادی کے چند روز بعد مردہ پائے گئے، عام خیال یہ ہے کہ یہ عورت نئے نئے شوہروں کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے انہیں قتل کرتی رہی ہے، گزشتہ دس سال کے اندر یہ سات آٹھ مردوں سے شادیاں کر چکی ہے جو سب کے سب ہلاک ہو گئے ہیں، پچھلے ۴ سال کے اندر اس کے چودہ شوہر ہلاک ہوئے ہیں، ان کی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس نے قبروں سے نکال لیا ہے۔ تاکہ ان کی اچانک موت کا راز معلوم کیا جا سکے، اس واقعے سے اندازہ لگایا گیا کہ اس مہذب دنیا میں کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔

فیشن انسانی صحت کیلئے مضر ہے

امریکی سائنسدانوں کے ایک گروپ نے یہاں انکشاف کیا ہے کہ گالی معدے کے کینسر کے لیے بہت بڑا سبب ہے کافی کے کثرت استعمال سے ... ہے



تحریر: ممتاز یونس حسنی

اختر شیرانی کا فن

اختر جب حسن و عشق یا جنسی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو عبارت کی معنویت اور بلاغت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ بامعنی اور برمحل ہوتا ہے۔ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ کام لینے میں ان کی مہارت کا اظہار ایسے ہی موقعوں پر ہوتا ہے۔ ایک ایکٹریس اپنی زندگی کے متعلق اعترافات کر رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی جنسی لغزشوں پر شرمندہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے جرأت فراہم کرتی ہے اور دوسری نیک قسم کی اداکاراؤں کا مذاق اڑاتی ہے۔ اس موقع پر اختر اس کے جذبات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"میرے نزدیک اس قسم کی اخلاقی اور نیک عورتوں کو کسی فلم کمپنی میں داخل نہیں ہونا چاہیئے! شیشہ و سنگ میں یوں بھی نہیں بنتی۔ پھر ان پتھروں کا تو علاج ہی نہیں جو ہر حال میں گرنے کے عادی ہیں۔ میرا خیال ہے صرف شیشوں کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیئے"

یہی ایکٹریس اپنے جنسی تجربات بیان کرتی ہے، اپنی لغزشوں پر فخر کرتی ہے:

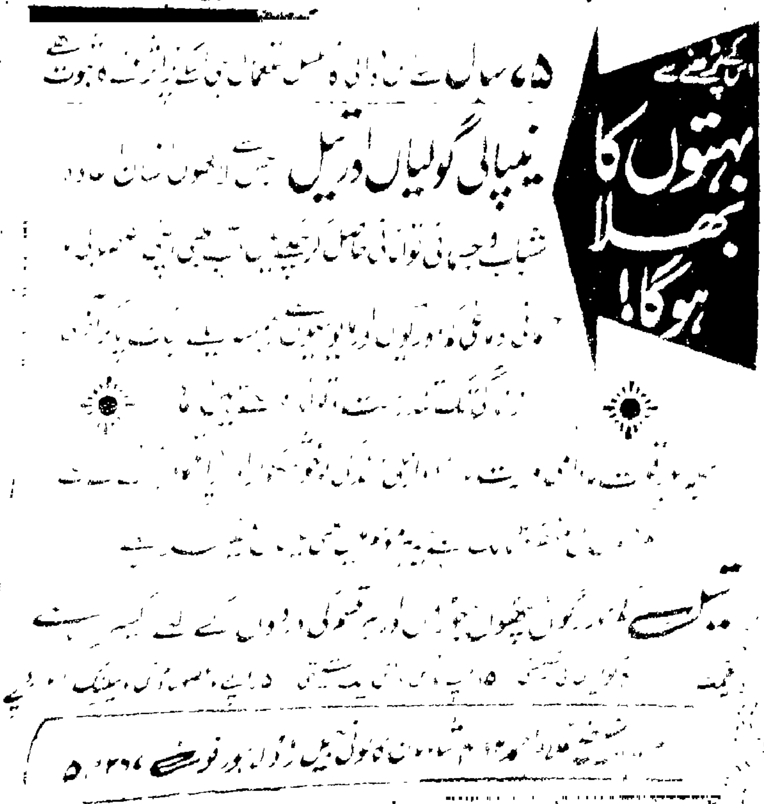
"میری رات میں کوئی ندرت نہ تھی۔ البتہ خود یہ رات میرے لیے ایک ندرت تھی مگر وہ بھی کہنہ ہونے کے لیے پارینہ بننے کے لیے! تواتر و تسلسل کے دش دائرہ کی صورت میں۔ میری آنے والی راتوں کو منور کرنے کے لیے۔ وہ کسی دلچسپ کتاب کے پہلے صفحہ کی طرح تھی۔ اور ایک کتاب میں ہزاروں ہی صفحات ہوتے ہیں۔ ورق پر ورق الٹتے جائیے اور مطالب و معنویت سے لطف اٹھاتے رہیئے۔ یہاں تک کہ کتاب ختم ہو جائے!"

ان نثر پاروں میں شیرینی و لطافت الفاظ کی معنویت نے پیدا کی ہے۔ لیکن عام طور پر اختر کا یہ کام حسن تراکیب سے لیتے ہیں۔ ان کی نثر میں اس قسم کی ترکیبیں ملتی ہیں:

"نکہت رمیدہ، نقش آوارہ، آوارہ خیاباں، جراحت ساماںیاں وحشت نگاہیاں، گوہر شب چراغ، گل کدہ حیات، باہزاراں ہزار رعنائی، مسحور افکار، پرشتندہ، اشعار، نہاں خانہ افکار، ظلمت خانہ یاس کفران محبت، حرام نگاہیاں، میخانہ چلائی میخانہ ہائے حسن و شباب، گوارہ شیانی صنعت کدانہ صنم سازیاں، شکرستانِ لب، بہیمیت شباب، حریم ادب، رسوا جبائیاں، تماسخت تماشا رنگینیاں، فطرت سرائیاں، نشاط رقصاں، نکہت خراماں، فرشتہ ارضی، حمد و ضیا، برق جمال، پیکر شعاع، مجسمہ نور، منو گگہ شعر و ادب" وغیرہ

نقش آوارہ، مسحور افکار، نکہت خراماں وغیرہ چند ایسی تراکیب ہیں، جو انہوں نے نظم میں بھی استعمال کی ہیں اور نثر میں بھی۔ ان تراکیب کے حسن استعمال سے ان کا جو مخصوص اسلوب بنا ہے، جس پر ان کی نظم کے گہرے اثرات ہیں اور

باقی صفحہ پر



بقیہ: عجیب و غریب

اب تک بے شمار امریکیوں کو کینسر کا مرض ہو چکا ہے اس زمانے میں اکثر فیشنوں اور عادتوں کا یہی حال ہے پہلے اس کی زبردست پبلسٹی ہوتی ہے، جب لوگ اس چیز کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے نقصانات گنائے جاتے ہیں۔ سگریٹ، کوکا کولا، نائیلون، پالیسٹر کے کپڑے خاص طور پر عورتوں کے آرائشی سامان مثلاً لپ اسٹک وغیرہ کے ساتھ یہی لعنت ہے اب تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ فیشن کی یہ ساری چیزیں انسانی صحت کے لیے بے حد خطرناک ہیں مگر یہ بات سامنے تب آتی ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ اب امریکی سائنسدانوں نے کافی کے اندر کینسر کے جراثیم کی تحقیقات کی ہے۔

بقیہ: اختر شیرانی

جو بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔

ترکیب سازی میں کبھی کبھی ان سے لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں اور وہ بڑی ثقیل اور سمع خراش تراکیب بنا لیتے ہیں۔ جیسے قوائے آغوزہ، خصوصیت موضوع اور ہدف اظہار۔ لیکن جس شخص نے بے شمار حسین و لطیف تراکیب استعمال کی ہوں، اس کے یہاں گنتی کی ثقیل تراکیب کا پایا جانا تقاضائے بشریت ہے، جسے بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے

اختر کے اس خصوصی اسلوب کے علاوہ ایک اور اسلوب بھی ہے، جسے ان کا رقیق طرز نگارش کہا جا سکتا ہے۔ ادبی موضوعات پر لکھتے وقت کبھی کبھی وہ اس طرز تحریر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں

ختم شد



ٹنڈر نوٹس

محکمہ تعمیرات عامہ کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جن کے ناموں کی تجدید ہو گئی ہے۔ مندرجہ ذیل کاموں کے لیے سربمہر آئٹم / پرسنٹیج ریٹس ٹینڈر مطلوب ہیں ٹینڈر اسی دن اور تاریخ۔ وقت حاضر ٹھیکیداران یا ان کے نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ جن ٹھیکیداروں کے پاس ڈیپازٹ ایٹ کال زر ضمانت کے مطابق ہوگی، ان کو خالی ٹینڈر فارم اور زائد شرائط ایک دن پیشتر صرف دفتری اوقات میں دیئے جائیں گے کوئی ٹینڈر بغیر زر ضمانت (بصورت ڈیپازٹ ایٹ کال) خفیہ، تار یا ڈاک سے موصول شدہ یا نامکمل، مشروط ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ کام کے متعلق تفصیلات دفتر ہذا سے دفتری اوقات کار میں معلوم کی جا سکتی ہیں، ٹینڈر کسی فرم یا کمپنی سے صرف ایسی صورت میں قبول کئے جائیں گے۔ جب کہ اس کا صحیح حصہ نامہ ٹینڈر کے ہمراہ منسلک ہوگا۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ کام	زر ضمانت	میعاد	ٹنڈر موصول ہونے کی تاریخ
۱۔	سپیشل ریپئر گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول ملتان روڈ۔ لاہور (بلاک کے چھت کا بدلنا)	۷۵,۹۰۰/-	۱,۵۱۸/-	۲ ماہ	۸ ۴/۷۵
۲۔	سپیشل ریپئر ملی دارالاطفال گرلز ہائی سکول راج گڑھ۔ لاہور (چھت کا بدلنا)	۲۵,۰۰۰/-	۵۰۰/-	۲ ماہ	۸ ۴/۷۵
۳۔	سپیشل ریپئر جونیئر ماڈل سکول ریلوے روڈ۔ لاہور (مشرقی بلاک کے چھتوں کی تبدیلی)	۴۸,۰۰۰/-	۹۶۰/-	۲ ماہ	۸ ۴/۷۵
۴۔	سپیشل ریپئر ماڈل گرلز ہائی سکول ماڈل ٹاؤن۔ لاہور (دیوار کی خصوصی مرمت)	۲۰,۶۰۰/-	۴۱۲/-	۲ ماہ	۸ ۴/۷۵
۵۔	لوئر مال لاہور کے سنٹرل ماڈل ہائی سکول کیلئے ہوسٹل کی تعمیر	۲۰,۰۰,۰۰۰/-	۴۶,۰۰۰/-	ایک سال	۱۰ ۴/۷۵
۶۔	گورنمنٹ جونیئر ماڈل سکول شیرانوالہ گیٹ۔ لاہور کی عمارت کی دوبارہ تعمیر	۴,۷۵,۰۰۰/-	۹,۵۰۰/-	چھ ماہ	۹ ۴/۷۵

ایگزیکٹو انجینئر تھرڈ پراونشل بلڈنگز ڈویژن۔ لاہور

IPL - 934

ہفت روزہ چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۵
۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء
قیمت — ایک روپیہ

اپنے ہی لیڈر سے خیانت مجرمانہ

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت میں لاہور ڈویژن کا دورہ کر کے ۹ اپریل کو دارالحکومت واپس تشریف لے گئے۔ آپ نے سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور لاہور میں نہایت بھرپور دن گزارے ... چہل پہل رہی۔ وزیراعظم بلاشبہ ہر چیز کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی سی چیز ڈھکی چھپی نہ رہی ہوگی اور نہ رہنی چاہیئے۔ ایک سیاسی راہنما کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ وہ حقیقتوں کو بھانپ جاتا ہے۔ جو اوپر ہو وہ نہیں دیکھتا جو تہ میں ہو اس کو بھانپ لیتا ہے۔ ... انداز تو یہ ہے کہ ہم فن خوشامد کے چراغ روشن کریں اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کہیں، جیسا کہ مخصوص طبیعتوں کا شیوہ خاص رہا ہے۔ دوسری ... یہ ہے کہ خواہشوں کو حقائق کا درجہ دے کر اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ ہمارے نزدیک یہ اخلاص نہیں، احترام نہیں، دیانت نہیں، صداقت نہیں ... تحسین نہیں۔ جب کسی مرض کی پڑتال کرو تو ایک فزیشن کی طرح۔ اپریشن کرو تو سرجن کی طرح تاکہ جو چیز مرض ہے معلوم ہو اور دور ہو۔ یعنی جو ... ہے چلی جائے۔ اور کوئی سا خلل نہ رہے۔ ایک صحیح تجزیہ ہی صحیح ... تک لے جاتا ہے۔

اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ مسٹر بھٹو پچھلے تمام حکمرانوں میں عوام سے ... کرنے کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں اور وہ ایک برق رواں کی طرح ... کے عوام میں گھومتے پھرتے۔ ان کی سنتے اور اپنی سناتے ہیں ان کے ... اس ٹھاٹھ اور شکوہ سے ہوتے ہیں کہ اب تک کسی حکمران اور سیاستدان نے یہ چیز پیدا نہیں کی۔ ہم نے لاہور ڈویژن کے دورے کا بالاستیعاب ... کیا۔ اپنے ادارہ کے ایسے نوجوان ان جلسوں کے عمیق مشاہدہ پر مقرر ... تھے جو بھٹو صاحب سے ایک اخلاص رکھتے ہیں اور صورت حال ... نبض شناس ہو سکتے تھے۔ اگر ہم سب اچھا کا لہجہ اپنائیں تو تعریف و ستائش کے ڈونگرے برسائیں اور بزعم خویش اس خوش فہمی کا شکار ہوں کہ ہم نے قلم کی جوت جگا کر اپنا فرض بطریق احسن پورا کر دیا ہے۔ صحیح اخلاص یہ ہے کہ خود احتسابی ... کی عادت ڈالی جائے تاکہ جو غلطیاں ہیں اُن کی اصلاح ہو سکے اور جو خوبیاں ہیں وہ ابھریں۔

ایک چیز جس کی افادیت کا اندازہ کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ وہ ہر ضلع کے دورے میں مختلف سرکاری اداروں اور ضلعی اداروں کی طرف سے "اهلاً وسهلاً" کے اشتہارات ہیں۔ یہ اشتہارات ایک حکم سے دلوائے جاتے ہیں۔ بعض اپنی روایتی چاپلوسی کو پروان چڑھانے کے لیے فیاضی کرتے اور پھر کسی وجہ سے خوشنودی کا اظہار کرتے ہیں۔ آخر ڈسٹرکٹ بورڈ، ٹاؤن کمیٹیاں، میونسپلٹیاں اور اسی طرز کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے حکومتی ادارے اپنے کس کارنامہ پر یہ اشتہار دیتے اور عوامی روپیہ کو اس طرح صرف کرتے ہیں؟ کیا اخبار اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے یا وہ ادارے اس کے بغیر زندہ نہیں رہتے یا اس کے مضمرات میں عوام کے لیے کوئی کشش ہے؟

دوسری چیز جو ان جلسوں سے محسوس ہوئی ان کا انتظام و انصرام تھا۔ ہم یہ تو صحیح سمجھتے ہیں کہ پولیس وزیراعظم کے سلسلہ میں اپنے فرائض پورا کرے اور یہ ہمیشہ کی ایک انتظامی خصوصیت ہے۔ کیونکہ انتظام کی یہ شکل نہ ہو تو عوام عادتاً بھگدڑ مچا دیتے ہیں اور نظم و ترتیب نہیں رہتی۔ لیکن سیاسی جلسہ کا مہتمم و منتظم پولیس یا انتظامیہ کو بنانا اور سیاسی جماعت کا غائب غلہ ہوتا یا محض حاشیہ کے طور پر وقت کے دامن پر رہنا ایک غلط در غلط چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس نے ہاتھ میں لے کر بدگمانی پیدا کی ہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام جلسہ گاہوں اور لاہور میں ہم نے خود دیکھا کہ جو لوگ روبرو بیٹھے تھے وہ اس شہر کے لوگ نہ تھے بلکہ مضافات و قصبات و دیہات کے لوگ تھے اور اُن کا اجتماعی مزاج

پبلک جلسوں کا نقشہ تھا اور شہر کے لوگ حاشیوں پر کھڑے تھے جن کے گرد وپیش پولیس دو دہر کی طرح سوار تھی۔ اُن لوگوں کے لیے کوئی سی رونق پیدا نہ ہو سکی جو قومی زندگی کے مختلف دوائر میں سیاسی خو بو رکھتے اور یہیں ولیار کو متاثر کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے تقریر سُنی نہیں، تقریر پڑھی ہے۔

وزیر اعظم عوام سے باخبر رہنے کے لیے ہر شہر میں کچہریاں منعقد کرتے اور ان کے جذبات سے آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کچہریوں کی حقیقت کو گوجرانوالہ میں خود وزیر اعظم نے واضح کر دیا کہ ساختہ پرداختہ ہیں۔ یعنی عمّہ

یہ خود آتے نہیں لائے گئے ہیں

وزیر اعظم اس غرض سے اپنا ایک عملہ رکھ سکتے ہیں جو عوام کی شکایات و جذبات معلوم کرتا رہے۔ اس طرح کچہریاں لگانے سے انہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ کچہریاں نہیں ہوتیں کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہے کہ بعض نزدیکان سبے بصر کو بلوا کر انہیں تیار کیا جاتا اور وہ طے شدہ سوالات لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً اس قسم کے مجموں میں کچھ شوخ زبانیں بھی چلی جاتی ہیں۔ بہر حال ان میں عوام نہیں ہوتے، جو لوگ حاضر ہوتے وہ لائے جاتے ہیں۔ نتیجۃً مختلف گروہوں کی اندرونی آویزش ایک ہی سیاسی جماعت کے ارکان میں ایک دوسرے پر خشت زنی کرتی ہے جو کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں۔ عوام بیچارے پہنچ ہی نہیں پاتے نہ حوصلہ کرتے اور نہ پولیس انہیں اجازت دیتی ہے۔ لیکن ارکان جماعتی لیبل لگا کر حاضر ہوتے اور آپس میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔

ہم پیپلز پارٹی کے اعضاء و ارکان سے کچھ کہنے کا استحقاق نہیں رکھتے۔ لیکن اتنی بات لاہور اور گوجرانوالہ کی "پتنگ بازی" دیکھ کر مزید عرض کریں گے کہ اگر اپنی قوم، اپنے ملک، اپنی سیاست اور اپنی جماعت سے انصاف نہیں کر سکتے جو تو از راہ کرم اپنے عظیم راہنما سے مزید انصاف کرو کہ تمہاری زبانوں کو اس نے شعلہ گفتار دیا اور تمہارا سیاسی وجود صرف اور صرف اسی کی شخصیت کا مرہون ہے۔ بالآخر یہ کہ عمّہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے کسی دل میں مری بات

گرانی یا قیامت

ہم اس پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ حکومت نے جن بنیادوں پر گھی، چینی اور آٹا کی قیمتیں بڑھائی ہیں اس کا جواز استدلالی اعتبار سے درست ہے یا عذر گناہ بدتر از گناہ ہے؟ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی حکومت بھی عوام میں اپنے خلاف بے چینی پیدا ہونے کی خواہاں نہیں ہوتی۔ حکومت نے جو کیا وہ اس کے نزدیک درست ہی ہوگا۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک قیامت ہے۔ ایک ایسی ضرب ہے جس سے ملک کے عوام کی کمر بہت ٹوٹتی ہے۔ اور صرف وہ لوگ حوصلہ مند ہو سکتے ہیں جنہیں مختلف دوائر میں اندھا دھند پیسہ کمانے کی دھن ہے کوئی دلیل یا جواز بھی عوام کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ایک دن پہلے وزیر اعظم صاحب نے شیخوپورہ میں فرمایا کہ دو سال کے اندر قیمتوں کو معمول پر لے آئیں گے اور گرانی کا چکر ختم ہو جائے گا، قیمتیں گریں گی لیکن ایک روز بعد وزیر اعظم کا دورہ ختم ہوتے ہی دانشوران حکومت نے عوام کی بنیادی ضروریات کی ایکا ایکی مہنگائی کا اعلان فرما دیا۔ اور حکم صادر کیا کہ سرکاری ملازموں کے علاوہ صنعتی و تجارتی ادارے بھی ۲۵ روپے فی ملازم بڑھا دیں۔ مگر حکومت کے پاس وہ کونسا آلہ ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ صنعت کار یا تجارتی ادارے اس طرح اضافہ کر دینے کے اہل ہو جاتے ہیں؟ کیا یہی چیز ثابت نہیں کرتی کہ بہت سی چیزوں کیلئے مہنگائی کا جواز قائم ہو گیا ہے۔

ہم بحث میں پڑے بغیر حکومت سے عرض کریں گے کہ اس نے بنیادی ضرورتوں کے معاملہ میں اپنے مشیروں کے غلط مشوروں پر انحصار کر رکھا ہے۔ عوام پر وہ بوجھ نہ لادیئے کہ ذہنی اعتبار سے نزع میں گرفتار ہو جائیں۔ آخر حکومت اپنے اخراجات کم کیوں نہیں کرتی؟

کمالیہ کا مظاہرہ حمیت

کمالیہ میں دو طالبات اسکول جا رہی تھیں کہ جاگیرداروں کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہیں زبردستی موٹر میں ڈال کر اغوا کر لیا گیا ہیڈ مسٹریس نے سنتے ہی پولیس کو اطلاع دی

ضروری التماس

قارئین چٹان متوجہ ہوں

تمام عرب ریاستوں اور تمام عرب امارتوں کو قادیانی محاسبہ کمیٹی کی معرفت ان ریاستوں اور امارتوں میں نیم سرکاری اور غیر سرکاری قادیانیوں کے نام اور پتے سے آگاہ کرنے کے لیے قارئین چٹان سے التماس ہے کہ وہ خاکسار کے نام تمام اضلاع و قصبات کے ایسے قادیانیوں کی تفصیلات سے مطلع کریں یہ ایک دینی فریضہ ہے۔ اور اس کیلئے میں تمام مسلمانوں سے اس اعلان کے ذریعے درخواست کرتا ہوں۔

شورش کاشمیری

لیکن پولیس اپنے ضابطوں کے چکر میں رہی یہ
خبر شہر میں پھیل گئی کہ نانا کا روبار بند ہو گیا۔ تعلیمی
ادارے موقوف ہو گئے۔ عوام نے احتجاجی جلوس
نکالا اور پولیس کو نوٹس دیا کہ وہ تین گھنٹے کے
اندر اندر طالبات کو برآمد کرے۔ لیکن پولیس
ناکام رہی یا اس نے فرض شناسی سے غفلت
کی تو ہجوم بے قابو ہو گیا اس نے ملزمان کی
کوٹھیوں سے ان کے اہل و عیال کو باہر نکال کر
آگ لگا دی۔ ان کا سینما نذر آتش کر دیا۔ ایک
کار جلا ڈالی اور ان کے پٹرول پمپ کو پھونک
دیا۔ پولیس نے پُرحمیت ہجوم کو جو غصہ میں
تھا اپنے زبردست لاٹھی چارج سے منتشر
کیا۔ مظاہرین میں سے پانچ افراد گرفتار کئے گئے۔
ملزم ابھی تک نہیں پکڑے گئے لیکن لڑکیاں برآمد
کر لی گئی ہیں۔

انتظامیہ کو سوچنا چاہیئے یہ کیوں ہوا؟ یہ مظاہرہ
اُس بہیمانہ فعل کا جواب تھا جو ملزموں نے اپنی
دولت کے نشہ میں کیا۔ ہمارے نزدیک کمالیہ کے
لوگوں نے متعدد بچیوں کے سلسلہ میں اگرچہ اپنے
انتہائی غم و غصہ کا مظاہرہ کیا لیکن پولیس عقلمند
ہوتی تو یہ کبھی نہ ہوتا۔ بہرحال اس طرح ہی کے
احتجاج کو مظاہرۂ حمیت کہا جاتا ہے ہم ملزموں
کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہ ذمہ داری قانون
کی ہے کہ انہیں سخت سے سخت سزا دلائے
لیکن اہل کمالیہ کو ان کے مظاہرۂ حمیت پر
مبارکباد دیتے ہیں۔

لاہور کیلئے ایک کروڑ روپیہ

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور کے
عظیم الشان جلسہ میں اس بات کا اعلان کیا ہے
کہ لاہور کو خوبصورت شہر بنانے کے لیے مرکزی
حکومت کی طرف سے وہ میونسپل کارپوریشن کو ایک
کروڑ روپیہ دیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لاہور
ایک عظیم شہر بن جائے اور ایشیائی شہروں میں
ہفت روزہ [illegible]

اس کا حسن و جمال بحال ہو۔ ہم وزیر اعظم کے
اس خوشگوار اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان
کالموں میں ہم نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ لاہور
کی خوبصورتی و دلآویزی میں اضافہ کرنے کے لیے
معروضات پیش کی ہیں بلکہ ایک دفعہ خود بھی
وزیر اعظم کی خدمت میں بالمشافہ عرض کیا تھا کہ
لاہور پاکستان کے بڑے شہروں میں سب سے
گندہ شہر ہو گیا ہے۔ اس کا وہ حسن ہی نہیں
رہا جو آزادی سے پہلے تھا اور اس عوامی دور
میں اس کا حسن بہمہ وجوہ کچھ اور میلا ہو گیا ہے۔
یہ حقیقت ہے کہ لاہور کی آبادی میں جس سرعت
سے اضافہ ہوا ہے اس نسبت سے لاہور تعفن
کی طرف لوٹ گیا ہے اور ایک دو جگہوں کو
چھوڑ کر باقی لاہور کی سڑکیں، گلیاں حتیٰ کہ
مال روڈ کے بعض حصے اور میکلوڈ روڈ کے
کھلے بازار بھی اس کے چہرے پر چیچک کے
داغ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریان لاہور
کو شہریت کا شعور ہی نہیں اور اکثر جگہ کے لوگ
کارپوریشن کے ضابطوں سے تعاون نہیں
کرتے رہ گئے کارپوریشن کے اہل کار تو ان
کی بہت بڑی اکثریت فرائض سے غافل ہے
اس کے مختلف الاصل کارکنوں نے اپنے
لئے آمدنی کے ذرائع پیدا کر رکھے ہیں جن
سے ضابطوں کی مٹی پلید ہوتی، ان کی جیبیں پُررونق
ہوتیں اور لاہور داغدار رہتا ہے۔ ہم
وزیر اعظم بھٹو سے درخواست کریں گے کہ
وہ لاہور کارپوریشن کی سکریننگ کرائیں اور اس
مقصد کے لیے ایک معتمد، ایماندار اور قابل
عملے کا تقرر کیا جائے۔ ہم کسی فرد کے خلاف کچھ
نہیں جانتے اور نہ شخصی طور پر کسی اہل کار پر
کوئی اعتراض ہے لیکن ہماری وہ فکر راسخ ہے
کہ کارپوریشن کا موجودہ عملہ لاہور کو خوبصورت
بنانے کی اہلیت سے محروم ہے۔ اگر اس

عملہ کے سپرد ایک کروڑ روپیہ کیا گیا اور
اس کو فراہمیٔ زر کے مزید اختیارات دیئے
گئے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ چند
مخصوص شہرت کے مالک ٹھیکیداروں اور
کئی ایک افسروں کو اپنے لیے مزید بنگلے
بنانے یا بنک بیلنس بڑھانے کا تحفہ مل
جائے گا اور لاہور کا چہرہ ایک عارضی غازے
کے بعد پھر اسی طرح برص آلود نظر آئے گا
جس طرح آج ہے۔ وزیر اعظم نے فرمایا کہ کراچی
میں ایک ترقیاتی ادارہ بھی ہے جو اس کی خوبصورتی
کا ضامن ہے۔ کیا لاہور کے لیے اس طرز کے
ادارے کا قیام ممکن نہیں؟ یہ لاہور امپروومنٹ
ٹرسٹ کس مرض کی دوا ہے؟ کیا کارپوریشن
اور ٹرسٹ کو یکجا کر کے ایک اعلیٰ کارپوریشن قائم
نہیں کی جا سکتی؟

خود شہریان لاہور کا فرض ہے کہ وقت
کے سیاسی بکھیڑوں سے الگ لاہور کی بہتری
اور خوبصورتی کے لیے ایک غیر سرکاری تنظیم
قائم کریں جو اس سلسلہ میں حکومت کو مشورہ دیتی
رہے۔ آزادی سے پہلے ہندوؤں نے اس قسم
کی دو انجمنیں قائم کر رکھی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ
ان کے علاقے خوبصورت تھے۔

شاہی قلعہ سے فرار

لاہور کا شاہی قلعہ سیاسی قیدیوں کے لیے
انگریزوں کے دور سے اب تک سب سے بڑا
قصاب خانہ رہا ہے اور اس میں تفتیش کے
لیے جو افسر مقرر کئے جاتے رہے ان کی زبردست
اکثریت ہمیشہ انسانیت کی ابتدائی اقدار سے
محروم رہی ہے۔ پچھلے دنوں ہم ایک انگریز
پولیس افسر کی یادداشتوں کا مجموعہ دیکھ رہے

تھے۔ وہ پنجاب میں سی آئی ڈی کا ڈپٹی انسپکٹر
جنرل رہا اور آئی جی پولیس کے عہدے سے
ریٹائر ہوا تھا اُس نے لکھا ہے کہ لاہور کا
شاہی قلعہ انسانی شرف و مجد کی قتل گاہ تھا۔
اس میں ہندوستان کے سیاسی لیکن نراجی قیدیوں
کو استفسارات کی غرض سے لایا جاتا اور جو
افسر اس قلعہ میں مامور ہوتے وہ تمام ہندوستانی
ہوتے۔ مسلمان افسر کچھ زیادہ ہی معتمد تھے۔
ان قیدیوں سے استفسارات کے دوران جو
سلوک کیا جاتا اگر یورپ کے کسی ملک یا خود برطانیہ
میں کسی سیاسی قیدی سے وہ سلوک کیا جاتا تو
اس ملک میں حکومت کے خلاف طوفان برپا
ہو جاتا لیکن لاہور کا قلعہ بہرحال ایک بوچڑ خانہ
تھا، جس کے خلاف نہ افسروں کا ہندوستانی ضمیر
سرزنش کرتا تھا اور نہ کسی سیاسی دائرے میں
کوئی احتجاج تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد
بھی اس قلعہ میں یہی ذوق شوق رہا۔ نتیجۃً کئی
ایک نوجوان تشدد کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے
نوائے وقت ۷ر اپریل میں ایک خبر ہے کہ
شاہی قلعہ سے دو ملزم پُراسرار طور پر غائب
ہو گئے ہیں۔ ایک کا نام بسم اللہ ہے اور
دوسرے کا نام اشوک ہے۔ یہ قلعہ کی تاریخ
کا پہلا واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے جو ناممکن تھا
کیونکر ممکن ہوا؟ کوئی ذمہ دار بیان دے تو
ہم منتظر ہیں۔ کیا پولیس اتنی کمزور پڑ گئی ہے
کہ قلعہ لاہور کی "حوالات" اس کے بس سے
باہر ہو گئی ہے یا اس کے پس منظر میں کوئی دوسری
چیز ہے؟ اس سوال کا جواب اس لیے بھی
ضروری ہے کہ پولیس نے سیاسی فضا میں اس
قسم کے اثرات پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ ڈنڈا اٹھاتے
وقت قانون کا احترام بھی نہیں کرتی؟ اُدھر آجکل
لاہور کے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے گیسو دراز
نوجوانوں کو پکڑ کے بالوں پر قینچی پھیر دینے کا مشغلہ
اختیار کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید اس طرح
لا اینڈ آرڈر کی خدمت کر رہا ہے۔ اب تک اُس
نے کسی بڑے آدمی کے بیٹے پر ہاتھ نہیں
ڈالا۔ جس دن اُس نے یہ خدمت انجام دی،
اُس دن اُس کو ہائی کورٹ میں آکر معلوم ہو گا کہ
وہ کس قانون کی خدمت کر رہا ہے۔ تب
خدایانِ ربوہ اُس کی پشت پناہی کرنے سے
قاصر ہوں گے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

جنرل چیانگ کائی شیک کا انتقال

جنرل چیانگ کائی شیک، جو عظیم انقلابی چین
سے فرار کر کے فارموسا کے جزیرے میں حکمران تھے
اور ان کا پشت پناہ امریکا کا سامراج تھا اس
۵ر اپریل کے اخبارات کی خبر کے مطابق انتقال کر گئے
ایک زمانہ میں ان کا بڑا نام تھا لیکن جب چین میں
عوامی جدوجہد کا آغاز ہوا، اور ماؤزے تنگ عوامی
انقلاب کے ہیرو بن کر چین کی انقلابی اسٹیج پر نمودار
ہوئے اور چینی عوام نے انہیں اپنا عظیم قائد بنا کر
زندگی کے نئے بال و پر حاصل کئے تو جنرل چیانگ
کائی شیک کا شعلہ اقتدار کجلا گیا اور وہ امریکی قوت
کے بل بوتے فارموسا کے مختصر جزیرے میں چلے گئے
جنرل چیانگ کائی شیک کا ہندوستان کی غلامی کے
زمانہ میں بڑا چرچا تھا اور شاید اس کی واحد وجہ
یہ تھی کہ برعظیم کی آزادی کے لیے انہوں نے برطانوی
حکومت پر کئی دفعہ زور دیا اور دوسری جنگ کے دوران
وہ حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے دہلی آئے، یہ
فروری ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ چیانگ، چینی کے سوا
اور کوئی زبان نہ جانتے تھے، ان کی بیوی اُردو
انگریزی سے واقف تھیں۔ اسی کی ترجمانی سے
لارڈ ویول، پنڈت جواہر لال اور مولانا آزادؒ سے
باہمی گفتگو ہوئی، عوام سے فرار اور انقلاب سے
اجتناب ہی کا نتیجہ ہے کہ چیانگ کائی شیک کی وفات
رسمی ہو گئی۔



ایک سفر

حیدرآباد۔ تا کراچی

ایڈیٹر

ہم پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کر کے آئے ہیں

سندھ کے مہاجر

یہ شکایت نہیں لیکن حکایت ضرور ہے

عمر اس نہج پر آ چکی ہے کہ اب سفر نہیں ہوتا بلکہ گھر سے نکل کر دفتر تک حاضر ہونا بھی دوبھر معلوم ہوتا ہے پچھلے دس ماہ بیمار رہا خدا نے فضل کیا تو گھومنے پھرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ۔ اس دوران میں ایک دو فو لائل پور گیا راولپنڈی کا سفر کیا ۔ لیکن ہمت ندتو نہیں عموماً خانہ نشین رہا ۔ اس مارچ کے پہلے ہفتے میں حیدرآباد سندھ سے بعض دوست اس اصرار کے ساتھ تشریف لائے کہ میں ان کی ہفت روزہ سیرت کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کروں۔ انہوں نے میرے عذر کو تسلیم نہ کیا میں نے ۲۲ مارچ تاریخ دے دی اور ۱۲ کی سہ پہر کو تیز گام کے ذریعے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مختار الحسن کے ہمراہ حیدرآباد چلا گیا وہاں انڈس ہوٹل میں ٹھہرا اسی شب کانفرنس میں تقریر کی اور اگلی صبح دوست کی موٹر میں کراچی چلا گیا۔

سیرت کانفرنس

سیرت کانفرنس کے ہفت روزہ اجلاس لطیف آباد میں منعقد ہوئے جن اجلاس سے میں نے اور شاہ بلیغ الدین نے خطاب کیا وہ انجمن شیدائیان رسولؐ کی روایت کے مطابق اس کانفرنس کا سب سے بڑا اجلاس تھا ۔ میری تقریر پونے بارہ بجے شروع ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ت رفتہ رفتہ پٹھان رہو۔۔

ہو کر پونے دو بجے شب ختم ہوئی ۔ حاضرین کے عشق رسالت کا یہ حال تھا کہ وہ آخر تک تصویر کے خطوط اور رنگوں کی طرح جم کے بیٹھے رہے ۔ یا پھر مختلف جملوں پر ان کے نعرہ ہائے تکبیر اور نعرہ ہائے رسالت فضا میں گونج پیدا کر دیتے ۔ میری تقریر گزشتہ شمارے میں چھپ چکی ہے ۔ شاہ بلیغ الدین کی تقریر سننے کا مجھے پہلی دفعہ اتفاق ہوا ان کا لب و لہجہ دکن کے شرفاء کا ہے نہایت اعتماد سے بولتے اور پوری توانائی سے خطاب کرتے ہیں۔ انہوں نے سیرت اقدس کے علاوہ قرآن پاک کی عظمت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں جو کچھ کہا وہ تمام مرواریدکی لڑیاں تھیں اس اجلاس میں بوڑھوں ،

نوجوانوں اور لڑکوں کے علاوہ بہنیں اور بیٹیاں بھی تھیں خوشی کا پہلو یہ تھا کہ سامعین زبان و محاورہ کی نوک پلک کے اداشناس تھے ۔ مجھے رہ رہ کر دہلی مرحوم اور لکھنؤ خلد آشیانی کے یاران سخن یاد آتے رہے جو الفاظ کی خوبصورتی پر جان دیتے اور مطالب کی برجستگی پر جھوم اٹھتے تھے۔

میر رسول بخش تالپور

میر رسول بخش تالپور اور ان کے بھائی میر علی احمد تالپور ماضی بعید کے گم شدہ اسلامی عہد کی حجازی شرافت

کے مظہر ہیں ۔ میر علی احمد تالپور تو ملک سے باہر روم میں تھے لیکن میر رسول بخش تالپور ہوٹل میں تشریف لائے اور گلہ کیا کہ میں حیدرآباد میں آ کر ان کے دولت خانے میں ٹھہرنے کی بجائے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں ۔ میر صاحب نے دو گھنٹے تک اپنے گورنری عہد کی حکایت سنائی اس کے بعد روزہ مرہ کے اتار چڑھاؤ کی کتاب کھولی تو واقعات کا ایک ڈھیر لگا دیا حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب شرافت و نجابت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں ۔ ان کے دل میں ان تمام لوگوں کے لئے بہت بڑی جگہ ہے جو برطانوی استعمار سے لڑتے رہے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں ۔ اپنے خون سے آزادی کا چراغ روشن کیا ۔ اس کا واحد سبب شاید یہ ہے کہ رسول بخش اور علی احمد ان میران سندھ کے وارث ہیں جو انگریزوں کے مقابلے میں ہار گئے ان کی بدعہدیوں کا مزا چکھا مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کی دوسری جلد میں ایفائے عہد کے تذکرے میں انہیں کے خاندان کا ذکر کیا ہے ۔ میر صاحب کے اخلاص و محبت کا یہ حال تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی کانفرنس کے اجلاس میں تشریف لے گئے اور دو بجے رات تک شریک اجلاس رہے مجھے ان کی جس چیز نے خاندانی شرافت کے علاوہ سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی سیاسی نگاہ اور

اپنی زبان ہے میر صاحب کو تیر و نشتر کے اشعار اس طرح یاد ہیں جس طرح کم بخت جواتی جینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے۔ میر صاحب اگرچہ گورنری سے سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن ان کی زبان سے میں نے کسی کے خلاف کوئی آزردہ فقرہ نہیں سنا جس روز کراچی روانہ ہونا تھا ہم میر صاحب کے دولت کدے پر گئے گھنٹہ بھر نشست جمائی ان کے مختلف نوادرات دیکھے سب سے بڑھ کر خوشی یہ ہوئی کہ ان کے پاس اُس دور کے کلام پاک موجود ہیں۔ جب مسلمانوں کا پہلا لشکر سندھ میں داخل ہوا تھا اور نامور خوش نویس کلام اللہ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر بڑے بڑے خاندانوں کی نذر کرتے تھے اور ان خاندانوں کے سربراہ گراں قدر ہدیہ دے کر وہ نسخے حاصل کر لیتے تھے۔

میر صاحب کے پاس قرآن پاک کا جو نسخہ ہے وہ سونے چاندی اور سیاہی کا لکھا ہوا ہے اس کے رنگا رنگ نقوش انتہائی دلفریب ہیں۔ میر صاحب نے مجھ پر ایک دوستانہ احسان کیا کہ سندھ کی ایک انتہائی خوبصورت تلائی تحفۃً دی اور میری مصوّر بیٹی کے لیے کپڑے کی ایک عمدہ تصویر عنایت فرمائی۔

ولولے جیت اور حوصلے پست

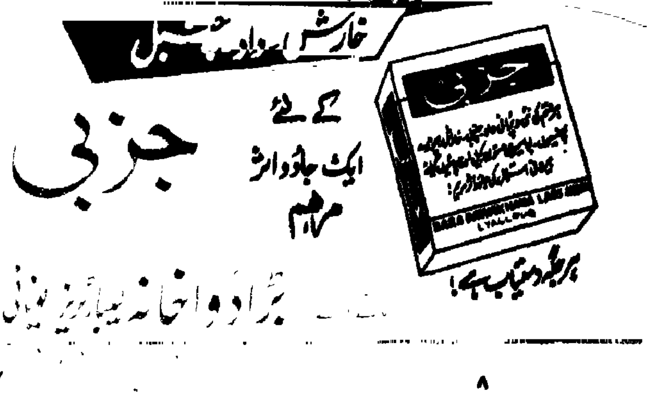
حیدر آباد فی الحقیقت مہاجروں کا شہر ہے۔ اس کی آبادی میں غالباً اسّی فیصد وہ لوگ بستے ہیں جو ہندوستان سے پاکستان کے جرم عشق میں نکالے گئے اور انہوں نے حیدر آباد آ کر شب و روز کی محنت سے اپنے سفر زندگی کا آغاز کیا میں نے اس چیز کو انتہائی دکھ کے ساتھ محسوس کیا کہ سندھ کی عوامی وزارت ان سے ناخوش ہے اور ان کا واحد قصور صرف یہ ہے کہ انہیں پیپلز پارٹی کی سیاست سے اتفاق نہیں۔ بظاہر یہ کوئی جرم نہیں لیکن یہی ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ ان لوگوں کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہم پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کر کے آئے ہیں۔ ان کے لیے علاقائی قومیت اور ملکی اشتراکیت ناقابل فہم اور ناقابل التفات ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم نے اسلام کے لیے ہندوستان چھوڑا اب کسی ازم کے لیے پاکستان چھوڑ دیں تو ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں جس طرح ایک معصوم بچہ ماں کی گود سے محبت کرتا ہے اسی طرح انہیں پاکستان کے ذرّے ذرّے سے محبت ہے۔ ایک چیز جو اس ذہنی رنگا رنگی میں محسوس ہوئی وہ ان کا کھلا پن ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کو بلا شبہ ووٹ نہیں دیتے اور مقابلہ ہو تو انہیں کا امیدوار جیت جاتا ہے لیکن ان کے دل میں کسی شخصیت کے لیے کوئی غبار نہیں اور زبان پر کسی رہنما کے خلاف کوئی بول نہیں۔ گو صوبے میں سندھو دیش کی تحریک موجود ہے اور بعض انتہا پسند سندھی طلبہ اردو بولنے پر قدغن لگاتے ہوئے ہیں لیکن ان مضطرب الحال مہاجروں کی ۵۰ فیصد آبادی کئی خطرات کے باوجود حزبِ اقتدار کے صوبائی رہنماؤں کا احترام کرتی ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو کریدا۔ مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی کے متعلق ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ بالطبع ایک شریف النفس انسان ہیں انہیں اپنے وطن سے محبت بھی ہے اور وہ علاقائی جانبداری سے ملوث نہیں ہونا چاہتے۔ لیکن حالات کی سنگینی نے مہاجروں کے لیے بہت سے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان کے لیے نہ تو صوبائی ملازمتوں میں کوئی جگہ ہے اور نہ بہمہ وجوہ ان کا حوصلہ بحال ہوتا ہے یہ چیز خود میرے لئے پریشان کن تھی کہ حیدر آباد جیسا خوبصورت شہر صوبائی وزارت کے چیک و بکس ڈیپارٹمنٹ کی نگہ التفات سے محروم ہے پہلے تمام سندھ یا اور اس کے بعض شہر محروم التفات تھے۔ اب وہ سب ایک دوشیزہ کی طرح جوان ہو رہے ہیں لیکن حیدر آباد کا حسن غذا و دوا کی محرومی کے باعث لاغر ہو رہا ہے۔ سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لطیف آباد جو بالکل نئی آبادی ہے اور لاہور کے گلبرگ کی طرح نو ساختہ ہے۔ ایک ایسے تغافل کا شکار ہے جیسے اسے کوئی سزا دی جا رہی ہو

وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے درخواست

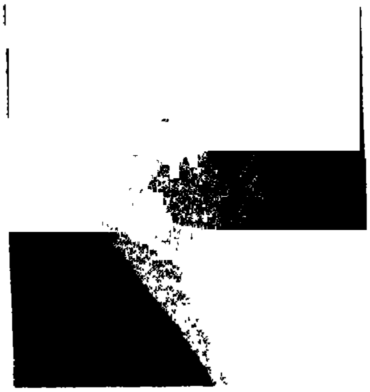
یہ امر واقعہ خوشی کا باعث ہے کہ مہاجر مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی سے بدظن نہیں ان کا احترام کرتے ہیں۔ اب یہ ان کا فرض ہے کہ وہ صوبائی سیاست کے جانبدارانہ طرز عمل سے ہاتھ اٹھا کر مہاجروں کی حقیقی شکایات کا ازالہ کریں۔ ان کا دل مٹھی میں لیں۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو خصوصی غور و فکر فرمائیں قرآن کی شاہراہ سیاست کے بہت سے کانٹے صاف ہو سکتے ہیں۔

کراچی کو روانگی

حیدر آباد اُداس کیوں ہے؟ یہ تاثر لے کر ہم کراچی کی طرف چلے تو راستے میں سید اقبال زیدی اور دوایک دوسرے دوستوں کی سخن آرائی سے خوب خوب متمتع ہوتے رہے تقریباً چار بجے شام ہم کراچی پہنچ گئے۔ جس ہوٹل میں قیام کیا اور دوستوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ (باقی آئندہ)



از:- ڈاکٹر سید عبداللہ



کلامِ اقبال بہ ترنم

مجھے دو تین ایسی محفلوں میں حاضر ہونے کا
ملا، جن کا مقصد کلامِ اقبال کو پڑھ کر سنانا تھا
طرح پڑھنے کو انگریزی میں "ریسی ٹیشن" کہتے ہیں،
جالس کو دیکھ کر اور سن کر کچھ خیالات میرے
میں پیدا ہوئے ہیں۔ جو قارئین کی خدمت میں
ہیں۔

کلامِ اقبال کی خواندگی کے دو مقصد ہو سکتے ہیں
فوریہ کہ عام سامعین اقبال کے عمدہ کلام سے
اس ہوں، دوسرا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے
عمدہ کلام کو سن کر اس کے محاسن ظاہری
بھی باخبر ہو جائیں۔ ایک لحاظ سے یہ باخبری
معانی تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ اس کا ایک
محض تبرک اور حصول سعادت و اظہار عقیدت
سکتا ہے۔ مگر یہ ثانوی ہے، اصل یہی ہے کہ
اقبال کے محاسن ظاہری کے توسط سے حقائق
کا بہتر ادراک ہو جائے۔

یہ غایت بڑی حد تک پڑھنے کے انداز سے
ہو گی، بعض لوگ ترنم سے پڑھتے ہیں بعض
اللفظ اور بعض طریق ادا (اداکاری سے)۔

اس میں شبہ نہیں کہ سب سے سادہ طریقہ
اللفظ ہے اور سب سے مؤثر "بہ ترنم" ہے۔
--- اداکاری درمیان میں ہے، لیکن ظاہر
کہ ان میں سے ہر ایک کے آداب ہیں، اور
ب ہر شاعر کے مضامین کی نوعیت سے متعین
ہیں، ان طریقوں سے ہر شاعر کے مضامین
یت سے متعین ہوتے ہیں، ان طریقوں سے
اقبال کو پیش کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ

پڑھتے وقت شاعر کے رتبے اور مضامین کی فکری خصوصیات کا خاص خیال رکھے۔ اس کے علاوہ وہ اس پیغام اور عقائد کو بھی در نظر رکھے جو شاعر کے معتقدات میں اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں کلامِ اقبال کو بہ ترنم پڑھنے کے تقاضوں پر کچھ گفتگو مناسب ہو گی۔

یہ تو معلوم ہے کہ ہر شاعری اپنی داخلی تاثیر بھی رکھتی ہے، یعنی اگر اسے نغمے میں نہ بھی ڈھالا جائے تب بھی اس کی تاثیر بے پناہ ہوتی ہے، خاموشی سے زیر لب پڑھنے والے کا بھی وہی ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ جو بلند آواز سے یا گا کر پڑھنے والے کا ہوتا ہے کیونکہ وہ معنی کے اثرات سے اثر قبول کر رہا ہوتا ہے۔ مگر ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ شاعری (بلکہ ادبی نثر بھی) اپنا ایک آہنگ، اپنی ایک موسیقی رکھتی ہے یہ موسیقی معنی کو سمجھے بغیر، محض آہنگ سے بھی مرتب ہو جاتی ہے اور خاموش پڑھنے والا بھی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ .... اگر معنی کو ساتھ سمجھ رہا ہو تو سبحان اللہ و ماشاء اللہ۔

اسی لیے اہل نقد و نظر نے کہا ہے کہ
اچھی پوئم گانے کی حاجت مند نہیں
ہوتی .... شاعری گانے کے
بغیر بھی ایک گانا ہے

میرا خیال ہے کہ جو لوگ کلامِ اقبال کو ترنم سے پیش کرتے ہیں۔ اگر مضمون کو اچھی طرح سمجھ کر گائیں تو ان کا ترنم سب کے لیے روحانی خوشی اور سننے والے کے لیے جادو بن سکتا ہے۔ لیکن محض گا کر پڑھنا ولولہ تو پیدا کر سکتا ہے، ادراک معانی کا وسیلہ نہیں بن پاتا۔

مضمون کو سمجھنے اور موقعہ کے مطابق مناسب انتخاب کلام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اقبال جیسے مفکر شاعر ملت سے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے افکار کو بھی سمجھا جائے، اس کے پیغام کا بھی احاطہ کیا جائے، لذّتِ آہنگ کی خوبی اپنی جگہ۔ لیکن اصل مقصد معانی تک رسائی ہے، اقبال نے بلبل کی زبان سے خود ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

میں جن محفلوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان میں میں نے یہ محسوس کیا کہ اکثر گانے والوں اور سننے والوں کو محض موسیقی کی طلب گاری تھی، فکرِ اقبال یا منصبِ اقبال کا انہیں شعور تھا نہ طلب ....

اقبال کو محض موسیقی کا مشغلہ بنا دینا کسی طور سے مستحسن نہیں، نہ انتخاب ٹھیک، نہ تلفظ درست نہ وزن شعر کا خیال، اچھی آواز سے مجلس کو ہمخیال بنا لینا موسیقی کی خدمت ہو سکتی ہے لیکن اقبال کی کوئی خدمت نہیں .... اور یہ نیا میلان بھی دراصل اقبال سے محبت کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ کالجوں اور سکولوں میں گانے بجانے کی رسم کو عام کرنے کے لیے ہے۔

اور وہ لوگ تو غضب ڈھاتے ہیں جو اپنے ساتھ سازندے بھی لے جاتے ہیں، اور طبلہ و سارنگی کا عمل بھی رفیق ہوتا ہے .... یہ بطور محفل

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

عرب بائیکاٹ

ایک قانونی اور دفاعی قدم

کوئی بھی شخص کبھی اپنے اجل سے مصالحت نہیں کرتا۔ اس بات سے عرب بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ان سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ جب کہ ایک کمپنی یا ایک بینک اسرائیل کو ہتھیار، فوجی ساز و سامان یا اس کے لیے مالی امداد فراہم کر رہا ہو تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔ لیکن جب معاملہ عربوں کا ہوتا ہے، تو اس پر ادھر ادھر کے کچھ حلقے اپنی ناراضگی اور تشویش ظاہر کرتے ہیں حتیٰ کہ امریکی صدر کو بھی اظہارِ خیال کرنا پڑا، حالانکہ خود کیوبا کے خلاف امریکہ زبردست بائیکاٹ رکھے ہوئے ہے۔ جبکہ امریکہ کو کیوبا سے اپنی بقا کے لیے ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں ہے۔

عربوں کے لیے اقتصادی بائیکاٹ اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ میدان میں ہتھیار اور گولہ بارود۔ ایک دفاعی قدم ہے، جو کہ صریحاً قانونی اور اخلاقی ہے، کیونکہ اقتصادی بائیکاٹ کا واحد مقصد، عالمی رائے عامہ، اقوام متحدہ کے منشور اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قراردادوں کے مطابق کھوئے ہوئے حقوق کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔

بنیادی طور پر عرب اقتصادی بائیکاٹ کسی یہودی یا یہودی کمپنی کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان افراد، کمپنیوں اور بینکوں کے خلاف ہے جو کہ اسرائیل کی فوجی تیاری میں امداد کر رہے ہیں، کوئی فرد یا کمپنی بلیک لسٹ میں محض اس بنا پر شامل نہیں کی گئی ہے کہ وہ یہودی ہے۔ یا یہودیوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں، لیکن جب معاملہ اسرائیل کو ہتھیار مہیا کرنے یا فوجی اہمیت کے ساز و سامان خریدنے کے لیے یا مالی سہولتیں بہم پہنچانے کا آتا ہے۔ تو عربوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لین دین ان سے منقطع کر لیں۔

جدید دور میں اقتصادی اقدام اس معنی میں حق بجانب ہیں، چونکہ ایک مشہور فرانسیسی مینا کل مورخ کے قول کے مطابق:

"جدید طرزِ جنگ میں قوم کے تمام وسائل کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جس کا مقصد آزادی اور اتحاد کے اصولوں کا دفاع کرنا ہوتا ہے"

بین الاقوامی قانون کے تحت عرب بائیکاٹ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر قانونی ہے:۔

"کوئی فرد، بینک، کمپنی یا کارپوریشن اس وقت بلیک لسٹ میں شامل نہیں کی گئی جب تک کہ اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہوتے کہ اس نے پبلک بین الاقوامی قانون کے خلاف ورزی کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اسرائیلی فوجی تیاری میں امداد دی ہے، جس کا واحد مقصد مقبوضہ عرب علاقوں پر جابرانہ قبضہ قائم رکھنا ہے۔

بلیک لسٹ میں شامل کرنے سے پہلے متعلقہ فرد یا کمپنی سے معلوم کیا جاتا ہے کہ کہ اس کے پاس اپنے غیر قانونی افعال کے لیے کیا وجہ جواز ہے۔

اگر وہ فرد یا کمپنی یا کارپوریشن کوئی قابلِ قبول عذر پیش کرتی ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے غیر قانونی رویے کو ترک کر دے گی تو اس صورت میں اس کا نام فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

یہ قطعی واضح ہے کہ کسی خاص نام کو فہرست میں شامل کرنا ایک قانون ضابطہ کا جزو ہے، جس کی شروعات تکلیف رفع کرنے کے مطالبہ سے ہوتی ہے اور جو مطالبہ کی تعمیل نہ ہونے پر اختیار کیا جاتا ہے۔

عرب اقتصادی بائیکاٹ بین الاقوامی قانون کے ضابطہ جو کہ اقوام متحدہ کے آرٹیکل ۴۲ ۴۹ میں درج ہے کے تحت بخوبی شامل کیا جاتا ہے۔

نورمبرگ اور ٹوکیو ٹربیونل نے اس نظریہ کی تصدیق کی ہے کہ جارحیت کی جنگ غیر قانونی ہے۔ اس اساس کے پیش نظر تمام متعلقہ ایکٹ غیر قانونی ہیں چونکہ اسرائیلی فوج کا رویہ اقوام متحدہ کے آرٹیکل نمبر ۲ کی بنا پر بین الاقوامی قانون کی صریحاً خلاف ورزی کرتا ہے، اس لیے یہ غیر قانونی ہے، اس لیے اس رویہ کی کوئی بھی امداد غیر قانونی ہے۔

عرب اقتصادی بائیکاٹ کے تمام تر طریقہ کار میں افسران اپنی پوری توجہ دشمنانہ کردار کے مہیا ہونے پر مرکوز کرتے ہیں، تاکہ بائیکاٹ کی فہرست کو باقاعدہ معیار کے مطابق رکھا جا سکے۔

وہ امریکی جو کہ اب عرب اقتصادی بائیکاٹ پر آسمان سر پہ اٹھا رہے ہیں، ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ امریکی اقتصادی بائیکاٹ کی ابتدا ۱۹۱۷ء سے ہوتی ہے، جب کہ اس وقت کسی بھی امریکی علاقے

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

فلائٹ لیفٹیننٹ حسیبؔ شہید

(۱)

بہت سے آنسو مچل رہے ہیں، مگر کوئی آستیں نہیں ہے
میں اس چمن میں کچھ اس طرح ہوں نہ ہمنوا ہے نہ ہمنشیں ہے
خلا سا محسوس ہو رہا ہے، وہی فلک ہے وہی زمیں ہے
وہ بالیقیں اٹھ گیا ہے لیکن مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ دل لگاتار رو رہا ہے
کوئی تو ہم سے خطا ہوئی ہے حسیبؔ ہم سے جدا ہوا ہے
میں اسکی رحلت پہ سوچتا ہوں یہ کیا ستم ہے یہ کیا بلا ہے
میں کس سے پوچھوں کوئی بتائے حیات کیا ہے ممات کیا ہے؟

(۲)

میں سوچتا ہوں حکیمِ مشرق کا ایک شاہیں کہاں گیا ہے
تمام محفل ہے سُونی سُونی کہ ایک معجز بیاں گیا ہے
ابھی تو پرواز کر رہا تھا، یہ کیا ہوا، ناگہاں گیا ہے
قضا نے اسکو اٹھا لیا ہے، ارے غضب نوجواں گیا ہے
میں گاہے گاہے جو اس کی تربت پہ فاتحہ کیلئے گیا ہوں
ہمیشہ اسکی لحد پہ شورشؔ خدا کی رحمت کو دیکھتا ہوں
کبھی کبھی مرگِ ناگہاں کی ستیزہ کاری پہ سوچتا ہوں
وہ بزمِ ہستی سے جا چکا ہے میں اسکی فرقت میں بجھ گیا ہوں

خدا کی رحمت سے بہرہ ور تھا یہ کیا ہوا ناگہاں گیا ہے
ابھی تو کل تک یہیں کہیں تھا، کدھر گیا ہے کہاں گیا ہے

شورشؔ کاشمیری



فلائنگ لیفٹیننٹ عبدالمجیب شہید
جو بائیس سال کی عمر میں لڑاکا طیارے کی پرواز میں شہید ہو گئے

اسرار بصری

• طبیب • ادیب • شاعر

نیّر واسطی

قدرت نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے
جس میں اس قسم کے لوگ ڈھلا کرتے تھے

حکیم نیّر واسطی عمرِ عزیز کے ۸۰ ویں پیٹے میں ہیں، آپ ایک نابغۂ روزگار طبیب ہی نہیں ایک شہرۂ آفاق ادیب اور نغز گو شاعر بھی ہیں اپنی زندگی کے نصفِ ثانی سے ہفت زبان عبقری ہیں، اردو اُن کی خانہ زاد ہے، فارسی ہاتھ کی چھڑی ہے اور عربی جیب کی گھڑی ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد آپ نے ترکی زبان میں کمال حاصل کیا۔ انگریزی میں دیکھتے دیکھتے آنکھوں اُتار رو ہو گئے اور اب فرانسیسی کے علاوہ جرمنی زبان سے بھی لسانی لگاؤ رکھتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو گوناگوں خوبیوں سے نوازا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برِعظیم کی یادگار محفلوں میں اس مقام و مرتبہ کے انسان گِنے چُنے ہی رہ گئے ہیں۔ حکیم صاحب اپنے علم و نظر کی مجلس کے سرِ فہرست انسان ہیں۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کے خداداد محاسن کی تصویر کھینچتے وقت الفاظ بے بضاعت محسوس ہوتے ہیں۔ نیّر واسطی بلاشبہ جامع الصفات شخصیت ہیں۔ اپنے فن کے اعتبار سے ایک طبیب ہیں اور اس وادی میں پچاس برس سے سرگرم ہیں۔ اپنی ذہانت و حذاقت سے طبِ اسلامی کا بول بالا کیا اور اُس کے مرحوم ماضی کو ایک درخشاں زندگی ودیعت کی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس تمام عرصے میں آپ نے کسی [illegible] صحت ہوئی۔ آپ کا آفتاب نصف النہار پر آگیا حکیم صاحب مریض سے روداد معلوم کیے بغیر نبض پر ہاتھ رکھتے ہی پورا مرض بیان کر دیتے اور علاج کی داغ بیل ڈال لیتے ہیں۔ پاکستان بنا تو ایڈیٹر چٹان کی پہلی اولاد ایک بیٹی تھی۔ چھ ماہ کی عمر ہوگی مغربی طب کامیاب نہ ہوئی اور بیٹی ہوا کی طرح اڑتی ہوئی محسوس ہوئی تو ایڈیٹر چٹان نے حکیم صاحب سے رجوع کیا۔ ایک ہی نگاہ میں آپ مرض کی تہہ تک پہنچ گئے۔ اپنی خاص دوائیاں دیں اور فرمایا اس وقت تک بچی کی جو نازک حالت ہے وہ کل شام تک اور بگڑے گی گھبرانے کی ضرورت نہیں شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے بارگاہِ ایزدی میں اُمید ہے کہ اِن دواؤں سے اسے فائدہ ہوگا اور کل شام اس کی تندرستی کے نمایاں برگ و بار پیدا ہو جائیں گے۔ خدا کے فضل و کرم سے یہی ہوا۔ اُس دن سے نیّر واسطی مرجعِ ارادت ہو گئے۔ ایک مختصر سی مدت میں دوستی پروان چڑھتی گئی اور روابط کا سلسلہ دراز ہو گیا۔

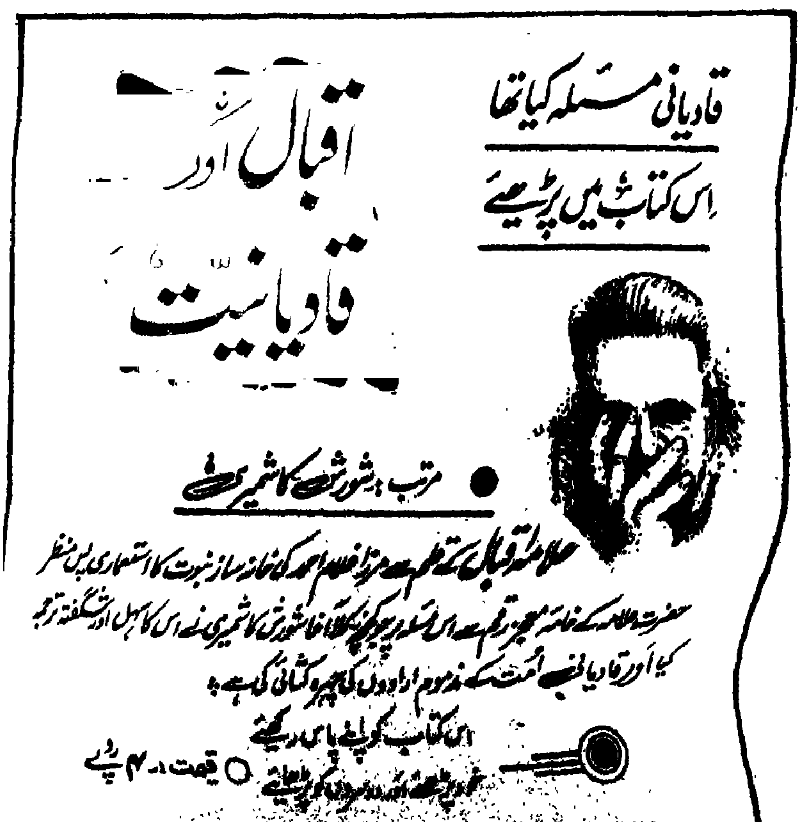
حکیم صاحب کو نبض دیکھنے میں جو عدیم المثال خصوصیت حاصل ہے اُس کی رعایت سے آپ کو نباض الملک کہا گیا اور اب تک طبی دنیا اِس خطاب ہی سے آپ کا احترام کرتی ہے۔ جوش کا مشہور شعر ہے کہ

بڑا ہی خوش ہوا کل جوش سے اے ہم نشیں مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

مصرعِ ثانی حکیم صاحب کی سیرت کا ہو بہو عکس ہے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی اعلیٰ و ادنیٰ شاعر، فنکار، صحافی، ادیب یا قومی، سیاسی اور مجلسی کارکن سے تشخیص و ادویات کا ایک پیسہ نہیں لیا معائنہ کیا تو مفت اور جب تک وہ یا اُن کا خاندان مریض رہا تمام ادویات بلاقیمت مہیا کیں۔ حکیم صاحب کی ادویات قیمتی ہوتی ہیں اور وہ اپنے حقوق کو اپنے فرائض کی طرح پہچانتے ہیں لیکن اُن کا دل شرفاء و غرباء کے لیے دھڑکتا اور پھڑکتا ہے۔ ایک دفعہ ایک بوڑھا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری اولاد صرف ایک جوان بیٹی ہے۔ میں آج تک اپنی بے مائیگی کے باعث اُس کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکا۔ آجکل وہ سخت بیمار ہے میں نے اُس کی ادویات کے لیے جوڑ بٹور کر ایک رقم جمع کی ہے از راہِ کرم میرے غریب خانے کو اپنے قدوم سے مشرف فرمائیے اور میری بیٹی پر ایک نگاہ ڈال دیجیے۔ وہ شخص آبدیدہ تھا۔ حکیم صاحب نے لحظہ بھر سوچا پھر اپنے ساتھ موٹر میں بٹھایا اُس کے گھر پہنچے، دیکھا تو وہ جوان بیٹی گرمی میں ایک کمبل لیے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر چت پڑی تھی۔ آپ نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ بچی کے بدن پر قمیض تک نہیں اور جو قمیض اُس نے پہن رکھی ہے وہ بنین (کاغذ) کی بنی ہوئی ہے۔ آپ فوراً اُس بوڑھے کو ساتھ لے کر چلے آئے۔ بازار سے زنانہ جوڑے کا کپڑا خریدا۔ مطب سے دوائیاں دیں اور بوڑھے سے کہا فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ بچی کو شفا دیں گے یہ دو

وہ پورا ہو گیا تو آپ نے تسلی دے کر روانہ کیا۔ حکیم صاحب کی دینی نفیلتوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ رحمت سے قریب کر رکھا ہے۔ آپ کا مطب صبح سے شام تک جاری رہتا اور ہر روز سینکڑوں مریض فیض یاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسی فضل و کرم ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی تمام بیٹیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور دونوں بیٹے بڑی بڑی ڈگریاں لے چکے ہیں۔ ایک فرزند ایم اے کرنے کے بعد آپ ہی کے ساتھ طبابت کرتا ہے۔ آپ نے تاریخ طب کے سلسلے میں نہایت ضخیم کام کئے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے "طب العرب" کے نام سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی جس پر آپ کو ترکی سے پروفیسر آف میڈیسن کا اعزاز دیا گیا۔ آپ نے ترکی زبان میں طب اسلامی کے سلسلے میں نہایت معیاری مضامین تحریر کئے اور کئی دفعہ اس سلسلے میں انقرہ یونیورسٹی نے آپ کو مدعو کیا۔ جہاں آپ نے ترکی زبان ہی میں تقاریر کیں۔ آپ کی شہرت قائم ہو گئی۔ ابھی حال ہی میں آپ نے ایران و پاکستان کے میڈیکل روابط پر ایک نہایت جامع تاریخ لکھی ہے جو حضرت حکیم الامت علامہ اقبال کے نام منسوب ہے۔ اس تاریخ پر اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں تہران یونیورسٹی کے چانسلر کا خط آغاز کتاب میں مرتسم ہے۔ تمام کتاب جیبی فارسی کا عالمانہ مرقع ہے اور طباعت کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے ملک میں اس گوہر نایاب کی ابھی تک وہ قدر نہیں ہوئی جس کے مستحق ہیں۔ پاکستان کو فخر کرنا چاہیئے کہ نیّر واسطی اس کے ایک فرزند عظیم ہیں۔ آپ کے ذہن رسا، دستِ شفا اور ملک و ملت کی خدمت سے ایک دنیا مستفید ہو رہی ہے۔

میں دراز ہوتے تو شاعروں کا نشست ذوق آپ کے ہمراہ تھا۔ نام علی احمد، ذات سید، شہرت واسطی، وطن اصلی امبیرپال، تخلص نیّر۔ راقم الحروف میں تھا تو آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ "مطالعہ" کے سلسلہ میں پھر اختر شیرانی کے رومان میں آپ کی نظمیں اور غزلیں نظر سے گذرتی رہیں۔ پاکستان میں اب سے بیس برس پہلے آپ نے شعر و حکمت کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا۔ اس کے بعد شاید آپ شاعری سے دستبردار ہو گئے لیکن ان مجموعوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نسخوں کی طرح شاعری کے اجزاء پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں اور شعر و سخن کے لیے جن راستوں کا سفر ضروری ہوتا ہے اُن سے ضرور گذر ہے ہیں۔ اختر شیرانی مرحوم آپ کے جگری دوست تھے انہوں نے آپ ہی کے مکان پر انتقال کیا اور آپ ہی نے ان کی تجہیز و تکفین کی۔ اس دور کے تقریباً تمام بڑے شاعروں سے آپ کے تعلقات رہے۔ مولانا ظفر علی خان کے دل میں آپ کے لیے بڑی قدر تھی وہ آپ کے ذوقِ سخن پر اعتماد کرتے اور کبھی آپ سے ملاقات ہوتی تو زور دیتے حکیم صاحب شعر کہا کرو، آپ کی طبیعت ہی نہیں آپ کا قلم بھی باغ و بہار ہے۔ علامہ اقبالؒ سے بھی آپ کو نیاز حاصل تھا۔ جگر مرادآبادی سے بھی تعلقِ خاطر رہا۔ احسان دانش سے بھی ادبی صحبتیں رچا ئیں۔ اب حکیم صاحب عمر کے اعتبار سے بوڑھے ہو چکے اور بال بھی سفید ہیں، لیکن دل جوان ہے۔ آواز پہلے دن کی طرح پاٹ دار ہے۔ ان کے قہقہے بدستور چرخ ہفتمیں کی خبر لاتے ہیں۔ آپ کو اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت سے بے حد لگاؤ ہے۔ محمد حسن قریشی کی رحلت کے بعد نیّر واسطی تنہا وجود ہیں جنہیں مل کر یہ احساس قوی ہوتا ہے کہ قدرتِ کاملہ نے ان لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں اس قسم کے انسان ڈھلا کرتے تھے۔



حکیم صاحب آج سے پچاس سال پہلے لاہور
مسئول پبلشر — آغا شورش کاشمیری
مطبع — چٹان پرنٹنگ پریس

مولانا ابوالکلام آزاد

ملک عنایت اللہ نسیم سوہدروی (علیگ)

"میں مسلمان ہوں اور فخر سے اعلان کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں"

ایک مقامی ہفت روزہ کی ایک گذشتہ اشاعت کے اداریے میں شیخ عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کو جن الفاظ سے نوازا گیا، وہ انتہائی تکلیف دہ اور غیر ذمہ دارانہ اور دور از حقیقت ہیں۔ اس کے فاضل ایڈیٹر جو مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اس ناگفتہ بہ انداز میں کر رہے ہیں۔ اس وقت عالم کتم سے عالم وجود میں بھی نہ آئے تھے، جب مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس بت کدے میں نعرۂ حق و صداقت بلند کیا اور یہ وہ وقت تھا، جب اچھوں اچھوں کی زبانیں بھی ذکر حق کے نام سے گنگ ہو جاتی تھیں۔ اگر مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی کانگرس میں شرکت جرم عظیم ہے تو کون سا ایسا راہنما تھا جو کانگرس میں شریک نہ ہوا، یہ درست ہے کہ بعض راہنما ہندو کی روش سے بددل ہو کر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے، اور مولانا علیہ الرحمۃ وابستہ رہے، مولانا کا یہ جرم قابل معافی ہے یا نہیں اور ان کا یہ خیال کہ ہندو کی عصبیت و زہریلی ذہنیت کا کانگرس میں رہ کر بھی مقابلہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ الگ بحث ہے۔ مگر کیا اس وقت دو قومی نظریہ ختم ہو گیا تھا، جب قائداعظمؒ علی برادرانؒ، مولانا حسرت موہانیؒ اور مولانا ظفر علی خان کانگریس میں شامل تھے۔

جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے مولانا آزاد علیہ الرحمۃ نے کبھی اس سے انکار نہیں کیا، البتہ مولاناؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ برعظیم کی مختلف اقوام کو متحد ہو کر بحیثیت ہندوستانی انگریزی سامراج کا مقابلہ کرنا چاہیے، جیساکہ آجکل پاکستان میں دو قومی نظریے کے دعویدار ہندو، عیسائی، قادیانی اور مسلمانوں کو ملا کر پاکستانی قومیت کے دعویدار ہیں، مولانا آزادؒ کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے۔ راقم خود ان میں شامل ہے، جن کو مولاناؒ کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف تھا، مگر انہیں سیاسی سے کٹا ہوا یا ہندو کا زرخرید غلام قرار دینا انتہائی اخلاق و شرافت سے گری ہوئی بات ہے، بلاشبہ مولاناؒ نے تحریک پاکستان سے اختلاف کیا اور مولانا کا یہ خیال تھا کہ تقسیم ملک مسلمانوں میں صوبائی عصبیت و تعصب کو فروغ دیکر اسلامی اخوت کا خاتمہ کرے گی جو ہندو کے نامعقول و نامناسب رویے کی وجہ سے قائم ہے اور ہندو ذہنیت کا اصل جواب یہ ہے کہ مرکز کو کمزور کر کے صوبائی آزادی اس حد تک قائم رکھی جائے، کہ مسلمان گیارہ صوبوں میں سے پانچ صوبوں میں کو لیں اور اسی غرض کے لیے ہی مولاناؒ نے کرپس اسکیم کے لیے راہ صاف کی۔ جسے مسلم لیگ نے بھی تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد خود مولاناؒ تقسیم کی ساری ذمہ داری نہرو اور اس کے ساتھیوں پر ڈالتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب قائداعظم اور مسلم لیگ ۱۶ مئی اسکیم کے حق میں تھے اور مولانا اس کے مؤید تھے۔ پنڈت نہرو اور گاندھی کے ساتھی اس کے مخالف تھے تو پھر کیا مولانا کو ہندو کانگرس کا حاشیہ بردار قرار دیا جا سکتا ہے اور سیاسی سے کٹا ہوا کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ مولانا آزادؒ نے ہی بھارت میں بچے کھچے مسلمانوں کا دفاع کیا اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو بچایا (جو مولاناؒ کی کی زندگی تک ہندو عزائم سے محفوظ رہی) پھر مشرقی و مغربی پاکستان کے ہر مسلمان کو تلقین کی:

"اب جبکہ پاکستان قائم ہو چکا ہے اس کی حفاظت و استقلال کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے جو اس خطے میں رہتے ہو۔"

مولانا نے ہندوستان کے قابل راہنما مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ:

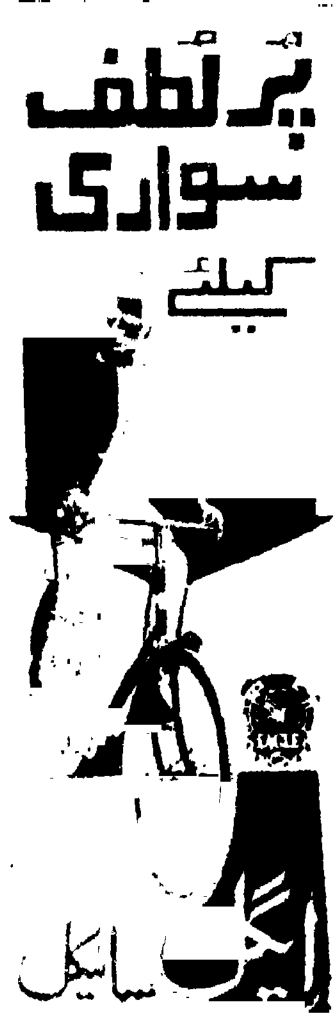
"وہ پاکستان جا کر اس کو مضبوط بنانے کی پوری کوشش کریں اور ہندوستانی حکومت کو پاکستانی حکومت سے بہتر تعلقات پر زور دیا۔"

یہاں تک کہ جب مولاناؒ مشرق وسطی کے دورے پر گئے تو واپسی پر کراچی آئے، اور قائداعظمؒ کے مزار پر پھول چڑھائے اور فاتحہ خوانی کی، مولاناؒ اکثر فرماتے کہ پاکستان کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے۔

پھر یہ مولانا آزادؒ ہی تھے، جنہوں نے ہمیشہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کیا اور انگریزی حکومت کے سامنے بیان دیتے ہوئے صاف صاف کہا کہ:

"میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں ظالم حکومت کی مخالفت کروں اور

یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے
اسلام، اور غلامی دو متضاد چیزیں
ہیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں"۔
دنیا میں حق گوئی و بے باکی کی ایسی مثالیں
بہت کم ملتی ہیں کہ جابر حکومت کی عدالت کے
سامنے ایسا بیان دیا جائے، پھر مولانا نے رام گڑھ
کانگریس کے خطبہ صدارت میں صاف صاف
کہا۔
"میں مسلمان ہوں اور فخر سے اعلان
کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی
تیرہ سو سالہ روایتیں میرے حصہ میں
آئی ہیں، میں یہ نہیں کر سکتا کہ اس
کا چھوٹا سے چھوٹا حصہ ضائع کر دوں
اور اسلام کی تاریخ، اسلام کی تعلیم اسلام
کی دولت، اسلام کے جملہ اصول،
اسلام کی تہذیب میری دولت ہے،
اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کی
حفاظت کروں، مذہبی، ثقافتی دائرے
میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں
میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں
کوئی کسی قسم کی مداخلت کرے"۔
دہلی میں کانگریس کے خاص اجلاس سے خطاب
کرتے ہوئے فرمایا۔
"میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام لوگوں کے خلاف
اپنی صدا بلند کروں جو ہندو اور سنگھٹن تحریک کے علمبردار
ہیں آج کسی سنگھٹن کی ضرورت نہیں جو ہندوانہ تحریک کی
تائید کرتے ہیں مجھے ان کی حیثیت سے قطعی انکار ہے"۔
شدھی کے متعلق فرمایا۔
"اگر ہندوستان میں اسی قسم کی صدائیں اٹھتی رہیں تو
کامیابی قطعی محال ہے"۔
جمعیت علماء ہند کے خطبہ صدارت میں فرمایا۔
"حضرات میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول
کراؤں گا جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس
راہ میں شرط کامیابی یہ ہے کہ ہمارا طرز عمل خالصۃً
بوجہ اللہ ہوتے سے طریق صواب پر مبنی ہو۔ آگے چل
کر فرمایا۔
"میں اپنے سینے میں وہ دل رکھتا ہوں جس کیلئے
ہر بیت کی کوئی شفا میں نہیں جو فاطر السمٰوٰت نے
نہ بھیجی ہو۔ پھر فرمایا اگر اسلام دین کامل ہے تو ضروری
ہے اس نے اپنے پیروں کو تمام انفرادی و اجتماعی
مدنی ضروریات کے لیے کامل و اتم تعلیم دی ہے
اگر دین آخری ہے تو لازمی ہے اس کی تعلیم اور
تناسل کی عملی صورت سنت ہر عہد ہر زمانے ہر حالت
ہر مشکل کے لیے راہنما ہو ہمارا یہ ایمان حقیقت پر
مبنی ہے کہ اسلام نے ہماری اجتماعی و قومی برکات کا
سامان پیدا کر دیا ہے۔
اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا



اسلام کے متعلق کیا نظریہ تھا کیا تصورات رکھتے تھے
اور اس طرح کانگریس کے بھرے اجلاسوں میں
بحیثیت صدر انہوں نے اپنے اسلام کا واضح اعلان
کیا یا نہیں۔ انہوں نے کبھی مسلمانی سے عار محسوس نہ
کیا یا کبھی اسلامی روایات کو قربان کرنے پر تیار ہوئے
کیا انہوں نے ساری عمر مسلمانوں کو یہی تلقین نہیں کی کہ
ان کی نجات رسول اللہ کے اسوہ حسنہ میں ہے اور
پوری ملت کو اجتماعیت کا درس دیتے رہے۔
کیا ایسا شخص جو رسول اللہ کے اسوہ حسنہ میں اپنی
نجات اور اسلام کو دین کامل مانتا ہو اس لائق ہے کہ
اس کا مذاق اڑایا جائے۔ سیاسی معاملات میں مولانا کی
رائے غلط ہو سکتی ہے اور اختلاف بھی ممکن ہے
کیا ایسا اختلاف کچھ لوگ قائداعظمؒ کے متعلق نہیں کرتے
کہ انہیں تقسیم پنجاب نہیں قبول کرنی چاہیئے تھی یا انہیں
ریڈکلف ایوارڈ غیر مشروط نہیں قبول کرنا چاہیئے تھا
اور اگر قائداعظمؒ کی یہ غلطی تسلیم کر لی جائے تو کیا قائداعظمؒ
کے خلوص اور دیانت پر حرف آ سکتا ہے؟
جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے فاضل
ایڈیٹر کو علم ہونا چاہیئے مولانا آزادؒ نے کبھی اس سے
انکار نہیں کیا مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ہمیشہ ایک ملت
سمجھا مولانا آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کے متعلق یہ پراپیگنڈہ
وطنیت کو ملت پر مقدم سمجھتے تھے ہر لحاظ سے غلط ہے۔
پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب جو تحریک پاکستان
کے سرگرم کارکن تھے اور اللہ کے فضل سے بقید حیات
ہیں خوب جانتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ
کے متعلق جو غلط فہمی ہوئی وہ رفع ہو گئی تھی بلاشبہ
مولانا مدنی کانگریس میں رہے مگر انہوں نے یہ نہیں
کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں انہوں نے بھی مسلمانوں کو
ایک ملت قرار دیا جو مشرق سے مغرب تک پھیلی
ہوئی ہے۔
البتہ تحریک آزادی میں دونوں قوموں کے اشتراک
کے قائل تھے جس کے لئے قائداعظمؒ نے بھی کوشش
کی مگر ہندو تعصب کی وجہ سے ناکام رہے اور آخر فیصلہ
(باقی صفحہ پر)

نالۂ بے اختیار

فلائیٹ لیفٹیننٹ عبدالحسیب شہید
کی پہلی برسی کے موقع پر

حسیب جواں مرد، ابن حمید — فدا کارِ دین و وطن وہ شہید
شریف و کریم و نجیب و وجیہہ — کہ تھا والدِ محترم کی شبیہہ
خلوص و محبت کا رُخ پُر جمال — وہی بُردباری وہی چال ڈھال
وہی مُسکراہٹ میں قدسی خلوص — یگانہ تھا ایثار میں بالخصوص
عزیزوں کا پیارا محبوں کی جان — مجالس کی رونق جوانوں کی آن
جہاں بھی رہا مسکراتا رہا — دِلوں کو ہنساتا ، لُبھاتا رہا
جہاں بھی گیا مسکراتا گیا — تبسم کی دولت لُٹاتا گیا
وہ پیکر خودی کا خدا کا مطیع — وہ علم و عمل میں وسیع و رفیع
محبت کا زم زم بہاتا ہوا — مروّت کی خوشبو اُڑاتا ہوا
شجاعت کی راہیں دکھاتا ہوا — حوادث سے آنکھیں لڑاتا ہوا
عزیزوں کی یاروں کی پیاروں کی جان — وہ تھا زندگی کی بہاروں کی جان
صداقت کی تو تیر اس کا وجود — تہوّر کی شمشیر اس کا وجود
وہ کبر و خودی میں خطِ امتیاز — جلالت کے سینے کا رنگین راز
وہ ایمان و اسلام کا جاں نثار — وہ ایقان کا شعلۂ بے قرار
جواں زندگی کا مسلسل عمل — وہ صدق و صفا کی مرصّع غزل
وہ فکر و نظر کا حسیں آبشار — وہ کردار کا جلوۂ بے قرار
وہ شیروں کے دل کی مقدّس امنگ — عزیمت کے لشکر کا سالار جنگ
شہادت کی زُلفوں کا مردِ اسیر — جوانی کا گلدستۂ بے نظیر
وہ عشق و وفا کا دوامی شرار — وہ میدانِ صبر و رضا کا سوار
سعادت کی روح رواں چل بسا — جوانی میں مردِ جواں چل بسا
محبت کی تسبیح پھیرے گا کون — فضاؤں میں نغمے بکھیرے گا کون
کہاں سے ملے گا انھیں دل کا چین — سنائیں کسے حالِ دل والدین
حسیب جواں سال و مردِ عظیم — کہاں پائیں اب تجھ کو تیرے یتیم
ترے بعد راحت کا عالم کہاں — دلِ زخم خوردہ کا مرہم کہاں
لٹا یوں تری اہلیہ کا سہاگ — خزاں نے لگا دی بہاروں کو آگ
ترا باپ ہے صبر کا وہ پہاڑ — بظاہر نہیں جس میں کوئی دراڑ
مگر میں نے محسوس ایسا کیا — ترے غم میں کوہِ گراں ہل گیا
اٹھاتے تھے جو سارے عالم کا بار — قدم لڑکھڑاتے ہیں بے اختیار

اُٹھا ہے وہ طوفان رنج و محن — ہیں چپ چاپ سے تیرے بھائی بہن
نہیں بھائیوں کو میسّر سکوں — بہن شدّتِ غم سے ہے سرنگوں
تری والدہ، تیرے غم کی امیں — خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتی ہے کہیں
گھرانے میں خوشیاں کہاں ہیں یہاں — بہاریں بھی وقفِ خزاں ہیں یہاں
ترے دم سے تھی زندگی پُر بہار — ترے دم سے تھا زندگی کا وقار
تری زیست گو نقش بر آب تھی — عزیمت تری ایک سیلاب تھی
طبیعت رکاوٹ کی قائل نہ تھی — کوئی شے تری رہ میں حائل نہ تھی
الم کے جہنم بجھاتا رہا — مسرّت کی جنت بساتا رہا
خلائیں تری عظمتوں کی گواہ — فضائیں تری جرأتوں کی گواہ
عزیمت کا شہکار تیرا جمال — مروّت کی تلوار تیرا جلال
خدائے جہاں کی رضا تیرا فخر — شہادت کی خونیں قبا تیرا فخر
گیا اس طرح دہر کو چھوڑ کر — نہ دیکھا کبھی تو نے منہ موڑ کر
عجب ڈھنگ ہے اور عجب حال ہے — ترے غم میں ہر شخص پامال ہے
مگر اے شہیدِ رہِ کبریا — ترے واسطے ہے ہماری دُعا
خدا کا رہے تجھ پہ فضل و کرم — ہو خُلدِ رضا تیرے زیرِ قدم
جو بیٹھے تو غلماں رہیں باریاب — چلے تو فرشتے چلیں ہم رکاب
شہیدوں کی روحیں ہنسائیں تجھے — بہشتوں کی حوریں سلائیں تجھے

رہیں تجھ سے راضی خُدا و رسول
برستے ہیں تجھ پہ رحمت کے پھُول

خداوندِ کونین ربِّ مجیب — اچانک ترے پاس پہنچا حبیب
اسے اپنے دامانِ رحمت میں رکھ — ظلالِ عطوفت عنایت میں رکھ
خفا ہو نہ دیکھ اس کی نیّت کو دیکھ — پئے دیں حمیّت کو غیرت کو دیکھ
تری راہ میں خالقِ ذوالمنن — ہے پہنا شہادت کا رنگیں کفن
ترے واسطے سب سے منہ موڑ کر — گیا دامنِ زندگی چھوڑ کر
یہاں تیرے لطف و کرم کے طفیل — نہ آنے دیا تھا کبھی دل میں میل

وہاں بھی خصوصی کرم سے نواز
رہیں اُس پہ در ہائے فردوس باز

کمال سالارپوری

-۱۹۷

• حجاز • عراق • شام

• لبنان • مصر • ایران

اور ترکی میں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نام، کام اور احترام

انقرہ سے الطاف سید کا مکتوب

۱۴ر مارچ ۱۹۷۵ء

آغا صاحب مکرم!

سلام نیاز۔ میں آٹھ دس ماہ سے آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ معافی چاہتا ہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہی کہ میں اپنی طویل سیاحت کے مطالعہ میں کچھ اس طرح گھرا رہا کہ آپ ایسے دوستوں کو خط لکھنے سے غافل ہو گیا۔ بہر حال میں نے اپنے مطالعے کے بہت سے نوٹ مرتب کئے ہیں یا تو لندن پہنچ کر چٹان کے لیے قسط وار کچھ لکھوں گا یا پھر کوئی دوسری فرصت نکال کر اپنے تاثرات مرتب کروں گا۔ تمام تفصیلات اور اُن کی جزئیات الگ ہوں گی۔ جب میں ایران پہنچا تو میرے سامنے تصورات کا ایک پورا نقشہ تھا میں نے امام موسیٰ رضا کا روضۂ اقدس دیکھنے کے لیے مشہد کا عزم کیا وہاں دو دن رہا پھر فردوسی کا مقبرہ دیکھنے طوس چلا گیا پھر نیشاپور میں عمر خیام کے مزار پر چلا گیا۔ طوس اور نیشاپور میں مجھے دو پاکستانی دوست ملے جو کراچی کے باشندے تھے اُن کے ذوقِ سلیم نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اُن کی معرفت ایران کے دو دانشوروں سے ملاقات ہوئی ایک غالباً تہران کی دانش گاہ میں استاد ہیں دوسرے ایک اشاعتی ادارے سے وابستہ ہیں پہلے تو گلگشت معلیٰ اور اِدب اکنایا دکی باتیں ہوتی رہیں پھر اسلام کی فکری تحریکوں کے باعث مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر چھڑ گیا۔ ہر دو نوجوانوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار سے متعلق بہت سی باتیں معلوم کیں، گو اُن کے عقائد کا ایک خاص رنگ تھا لیکن اُن کے دِل کی فراخی اور دل کی وسعت میں علم و نظر کے بہت سے حاشیے محسوس ہوئے انہیں افسوس تھا اور وہ اس تشنگی کو محسوس کرتے تھے کہ مولانا سے متعلق اُن کی ... میں کوئی لٹریچر نہیں اور مولانا کی ... ں نے بڑی حد ... ل و کتب سے ... ایسے ذہن

رکھتے تھے کہ علامہ اقبالؒ کی بابت پاکستان سے ہماری زبان میں کوئی مبسوط کتاب نہیں جس سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ اُن کے ذہن میں اسلامی فکر کی وراثت کا نقشہ کیا تھا؟ انہیں تعجب تھا کہ پاکستان کے بعض دانشور اقبالؒ کو یورپی فلسفہ کا خوشہ چین اور اشتراکی نظریہ کا ہم نوا کہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ایک ایسا شخص کیونکر حکیم الامت ہو سکتا ہے۔

آغا صاحب پاکستان میں ایرانیوں کے ساتھ نشست و برخاست نے مجھ میں جدید فارسی بولنے کا جو ملکہ پیدا کیا وہ میرے کام آیا میں نے اسلامی فکر سے متعلق علامہ اقبال کے اشعار کی تشریح و توضیح کی تو وہ بے حد مسرور و محظوظ ہوئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے متعلق میں نے انہیں بنیادی معلومات مہیا کیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ یہی تذکرہ رہا وہ دماغی اعتبار سے معترف ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ فارسی زبان میں اُن کی تحریک کے تعارف پر کوئی کتاب نہیں اگر یہ تمام چیزیں ایران کی نئی نسلوں کو معلوم ہوں تو بقول اقبالؒ تہران عربی و عجم کی نشاۃ ثانیہ کا شہر آغاز ہو سکتا ہے۔ ایک ہفتہ ایران میں رہ کر میں عراق چلا گیا۔ پہلے بصرہ دیکھا اس کا ایک دوسرا نام عشار ہے جو اصل بصرہ سے چند میل دور ہے۔ میں نے مقام علیؓ سے قریب جامع مسجد میں جمعہ پڑھا۔ اس مسجد کو مسجد امیر المومنینؓ بھی کہتے ہیں۔ یہاں بھی پاکستانی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ اشرف نے مجھے دو جدید عراقی نوجوانوں سے ملایا اُن سے کئی مسائل پر گفتگو ہوئی وہ پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اور تحریک سے متعلق سوالات کرتے رہے میں انہیں جواب دیتا رہا۔ اُن میں سے ایک نوجوان ہلال نے مجھ سے کہا کہ مولانا کے لٹریچر سے متعلق جو کچھ پڑھا ہے اس سے ہم نے یہ اندازہ ضرور کیا ہے کہ مولانا یورپ کی علمی قیادت سے مرعوب نہیں ہیں انہیں سے معلوم ہوا اور بغداد جا کر مجھے یقین ہو گیا کہ عراق کے علمی حلقوں میں مولانا کا ذکر و تذکرہ موجود

راہ میں شرطہ

ہفت روزہ چٹان لاہور

ہے۔ میں بصرہ سے حضرت طلحہؓ کے مزار پر گیا وہاں سے حضرت زبیرؓ کے مزار پر پہنچا۔ حضرت حسن بصریؒ کا مزار دیکھا پھر نجف اشرف پہنچا۔ کوفہ دیکھنے کا تاریخی اعتبار سے بہت شوق تھا۔ کوفہ دیکھا اور خوب دیکھا۔ اس شہر کی تاریخی شہرت تمام دنیا میں ہے مجھے یہاں کے لوگ بڑے مخلص نظر آئے نہ جانے ہمارے ہاں لاہور میں شقی القلب لوگوں کے لیے کوفی کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟

جب کربلا پہنچا تو حضرت امام حسینؓ کا مزار دیکھا۔ میرا دل بھر آیا۔ اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آپ کی ایک نظم کے مطابق ہم اسی قوم کے فرزند ہیں جس نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا تھا۔ کاظمین (بغداد) پہنچ کر میں نے امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ دیر تک ادب سے کھڑا رہا اور سوچتا رہا، عراق کا چپہ چپہ تاریخ اسلام کے لو بعد سکتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت امام غزالیؒ کے مزار پر گیا۔ بغداد میں ایک ہفتہ رہا خوب محفلیں رہیں۔ اشتراکی اُتنے ہی ہیں جتنے لاہور میں۔ لیکن انہیں پروپیگنڈہ کا فن خوب آتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک و دعوت کا بغداد کے اسلامی حلقوں میں خوب خوب چرچا ہے اور بعض کمیونسٹ نوجوان بھی اُن کی تحریک سے متعلق استفسارات کرتے ہیں میں نے عمان پہنچ کر اس قسم کی صحبتوں میں شرکت کی جہاں اکثر و بیشتر علمی مذاکرات ہوتے ہیں اور جب پاکستان کا ذکر آتا ہے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے متعلق کئی سوال کیے جاتے ہیں۔ عمان کے ایک کالج "الکلیتہ العلمیہ الاسلامیہ" میں مولانا کی تحریک کو اخوان المسلمین کی تحریک سے نسبت دی جاتی ہے میں سعودی عربیہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے مدینہ طیبہ میں حاضر ہو کر کانپتے کانپتے بارگاہ رسالت میں پہنچا۔ شورش بھائی خدا گواہ حضورؐ کے سامنے کھڑا ہونے کا حوصلہ نہ تھا کتنے روسیاہ ہیں ہم؟

یہ کیفیت پھر لکھوں گا۔ دو گھنٹے طواف کرتا رہا پھر اپنے میزبان کے ہاں پہنچا۔ تیسرے دن ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مدینہ یونیورسٹی گیا۔ پاکستانی، ہندوستانی اور عربی طلباء سے ملاقاتیں کیں ان نوجوانوں کے ذہن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک نقش ہو چکی ہے اور وہ اس سلسلے میں بے پناہ علمی انہماک رکھتے ہیں۔ اکثر طلباء عرب دنیا کے ساتھیوں کو مولانا کے رسائل و کتب کا عربی ترجمہ سناتے اور اُن کی شخصیت کے تبحر و کمال سے آگاہ کرتے ہیں میں نے خانہ کعبہ میں کئی کئی گھنٹے کئی ملکوں کے دانشوروں سے مولانا کے متعلق گفت گو کی اور یہ بات کامل وثوق لیکن انتہائی مسرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ سعودی عربیہ میں جہاں جہاں گیا میں نے مولانا کے احترام و ذکر کو موجود پایا۔ اُن کی بعض عربی کتابوں کے تراجم دیکھے اور اس احساس کو مختلف محفلوں میں مطالعاتی اعتبار سے دیکھا کہ مولانا کا تذکرہ اسلام کی ایک فکری شخصیت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ میں نے پندرہ روز حرمین شریفین میں قیام کیا۔ ایک دن طائف میں ٹھہرا، ایک دن کے لیے ریاض گیا پھر دمشق (شام) چلا گیا۔ مزار بلالؓ پر حاضری بھری۔ حضرت یحییٰؑ کے مزار کو سلام کیا۔ حیرت و مسرت ہوئی کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک و دعوت پر شام کے سیاسی و علمی حلقے گفتگو کرتے ہیں اور مولانا شام میں ذہنی طور پر موجود ہیں۔ لبنان پہنچ کر مجھے ایک بے نظیر علمی حلقہ مل گیا۔ بیروت عرب دنیا کا مخلوط شہر ہے یہاں کے لوگ انگریزی نہیں جانتے فرانسیسی جانتے ہیں۔ میں نے امریکی یونیورسٹی کے جدید نوجوانوں سے بہت سی ملاقاتیں کیں وہ ایشیائی اور یورپی تحریکوں سے انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمارے نوجوانوں سے کہیں زیادہ ماضی و حال کے علم و تاریخ سے آگاہ ہیں۔ بلاشبہ بیروت عالمی طاقتوں کا سازشی خانہ ہے اور اس خوبصورت شہر کی معرفت ایشیا و افریقہ

میں سیاسی انقلاب لانے کے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں ایک چیز جو میں نے یہاں بڑی طرح محسوس کی وہ یہودیوں اور قادیانیوں کا وجود ہے۔ یہودی تعداد میں زیادہ ہیں قادیانی تھوڑے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ دونوں میں ہم نشینی و ہم کلامی کے نہایت گہرے رابطے ہیں۔ میں نے کسی عرب ملک میں کسی پاکستانی کو مولانا مودودی کی فکر کا نکتہ چیں نہیں پایا ممکن ہے ایسے لوگ ہوں لیکن بیروت کے ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور رقص گاہوں میں جب کئی ایک مسلمانوں کو مولانا مودودی کا بدترین نکتہ چیں دیکھا اور ان کے ساتھ یہودی دانشوروں کو موجود پایا تو مجھے حیرانی و پریشانی ہوئی لیکن دو تین روز ہی میں یہ عقدہ کھلا کہ میں جنہیں مسلمان سمجھ رہا ہوں وہ مسلمان نہیں قادیانی ہیں اور ان کے اسرائیلیوں کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات ہیں۔ آج تک کہ میں اس وقت انقرہ میں ہوں میرے لئے ایک یہودی اُستاد کا یہ سوال کئی سوالات کا محرک و ماخذ رہا ہے۔ کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں غلبہ اسلام کے نام پر جو مظاہرہ کیا تھا اس کا اثباتی مقصد کیا تھا؟ اور اسے اشتراکیوں نے کس طرح تہ و بالا کیا؟ میں بیروت میں دو ہفتے ٹھہر کر اسکندریہ پہنچا۔ ایک دن وہاں رہا پھر قاہرہ چلا گیا۔ جناب احمد سعید کرمانی سفیر پاکستان سے ملنے کا شوق تھا لیکن ان سے مل نہ سکا۔ معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ قاہرہ میں شارع عماد الدین میں ٹھہرا اور ہفتہ بھر پورے شہر کا علمی سفر کیا۔ الازہر گیا اس کے بعض اساتذہ سے دوستی پیدا کی انہیں کی معرفت بہت سے دانشوروں سے رابطہ پیدا کیا۔ بعض حلقوں سے اخوان المسلمین سے متعلق خاصا مواد حاصل کیا۔ قاہرہ عالم عرب کی بہت سی خصوصیتوں کا شہر ہے۔ یورپی تہذیب نے اس شہر کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اشتراکی نظریہ کو بھی ایک بڑے کیمپ کے ذہنوں میں جگہ حاصل ہو چکی ہے۔ بعض گوشوں میں لاہور کی طرح مذہب سے فراری آوازیں بھی سنی جاتی ہیں لیکن مصر میں اب بھی اسلام کی روح باقی ہے اور اسلام کا معروف کے رنگ و ریشہ سے خارج کئے جانا ناممکن ہے۔

اخوان المسلمین پر جو قیامت گذری ہے وہ تمام مصر کی زبان پر ہے۔ اخوان کے جن عظیم الشان راہنماؤں کو ناصر مرحوم کے اقتدار نے شہید کیا اُن کا احترام لوگوں کے دلوں میں جوں کا توں ہے جن بے شمار مصریوں کو اسلام سے والہانہ عقیدت ہے وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اسلام کا فرزند جلیل گردانتے اور انہیں اسلامی معاشرے کے احیاء کا داعیٔ اعظم کہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مولانا مودودی دینی فضا میں اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا نام ہے۔ میں جب ملک سے روانہ ہوا تو مسقط میں مولانا کا ذکر سنا، دوبئی میں بھی ایک دن ٹھہرا تو حلقۂ احباب میں اُن کی شخصیت کو موجود پایا، قطر میں بھی اُن کا لٹریچر دیکھا۔ بحرین میں ایک شیخ مجھ سے مولانا سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ کویت میں مولانا کی تصنیفات بہت سے دوستوں کے ہاں دیکھیں۔ قطر اور کویت دونوں جگہ بہت سے دوست قادیانیت سے متعلق آپ کی تحریک کا ذکر کرتے رہے میں وہیں تھا جب تو آپ کا خط ایک دوست کے نام پہنچا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے جو پچاس ہزار ریال جمع کئے ہیں وہ کسی اور دینی کام میں صرف کریں میری مطلوبہ رقم ایک لاکھ روپیہ پاکستانی دوستوں نے دو ہفتے میں جمع کر دی ہے۔ مزید رقم کی ضرورت نہیں ہے۔

شورش صاحب باور کیجئے میں نے کسی سے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ کے ساتھ میرے تعلقات کس قدر ہیں لیکن اس بات سے مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ آپ کا ان تمام علاقوں میں نام کام اور احترام موجود ہے۔

آجکل انقرہ میں ہوں۔ ترکوں کا دل اسلام کی محبت سے لبریز ہے وہ تاریخ کے طویل تجربوں سے سبق لے کر یا فائدہ اٹھا کر محض جذباتی انسان نہیں رہے بلکہ انہیں حالات کے گوناگوں تجربوں نے مصائب سے کھیل جانے والا سنجیدہ انسان بنا دیا ہے۔ میں نے یہاں کئی صحافیوں، دانشوروں، پروفیسروں اور سیاست کاروں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ انہیں پاکستان سے فی الواقع بڑی محبت ہے وہ ایک پاکستانی سے مل کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کے برگ و بار یہاں پہنچ چکے ہیں۔ اخباروں میں عالم اسلام کی فکری تحریکوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو مولانا مودودی کے فکر و نظر سے خالی نہیں ہوتا ابھی پچھلے ماہ مولانا سے متعلق ایک طویل مقالہ شائع ہوا میں ترکی نہیں جانتا لیکن ایک دوست نے مجھے وہ رسالہ دیا ہے وہ رسالہ ضروری نشانات کے ساتھ آپ کو رجسٹرڈ پیکٹ کے ذریعے بھیج رہا ہوں۔

ایک چیز جو میں نے تہران سے انقرہ تک محسوس کی ہے وہ اسلام کے بارے میں نئی نسلوں کی ذہنی فضا میں اس امر کا ظہور ہے کہ عالمی طاقتوں میں ایک تیسری طاقت دنیائے اسلام کی ہوگی لیکن جو لوگ اسلامی ریاستوں میں حکمران ہیں اُن میں بطور مسلمان عالمی شخصیت بننے کے جوہر نہیں۔ اور اگر کسی میں وہ جوہر ہے تو اس کے راستے میں بے شمار اٹکاؤ ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو عالم اسلام کے علمی و دینی حلقے ایک عظیم مفکر مانتے ہیں لیکن ان کے پاس چونکہ سیاسی طاقت نہیں اس لئے ان لوگوں کی پیشانی پر کئی شکنیں سوال بن کر ابھر آئی ہیں۔ خط لمبا ہو گیا، معافی چاہتا ہوں۔ ہفتہ بعد لندن چلا جاؤں گا اور وہاں سے دوسرا خط لکھوں گا۔

آپ کا بھائی

الطاف

> خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (سرکولیشن منیجر)

پاکستان جمہوری پارٹی کا کنونشن



مسٹر حمزہ ایم اے صدر پنجاب پاکستان جمہوری پارٹی

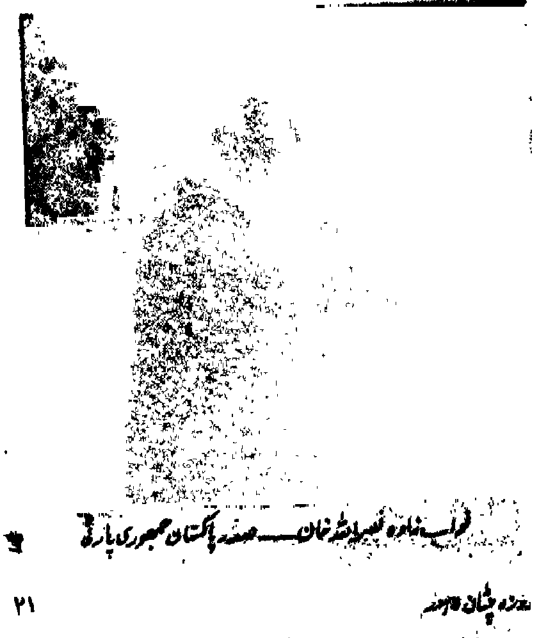
نوابزادہ نصراللہ خان صدر پاکستان جمہوری پارٹی



رانا ظفراللہ خان ــــ سیکرٹری جنرل پاکستان جمہوری پارٹی



مولانا سید الدین شیر کوٹی پشاور ــ نائب صدر پاکستان جمہوری پارٹی



نوابزادہ نصراللہ خان ــــ صدر پاکستان جمہوری پارٹی



رانا نذر الرحمٰن

فلسطینی جانبازوں کا ولولہ انگیز حملہ

جب تک گولیاں ختم نہ ہوگئیں وہ برابر مقابلہ کرتے رہے... اس کے بعد انہوں نے وہ بم داغ دیئے جو ان کے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ بموں کے دھماکے کے ساتھ ہی ان کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے اور وہ اس عظیم مقصد پر قربان ہوگئے جس کی انجام دہی کے لیے غازیوں کا عزم اور شہیدوں کا حوصلہ لے کر وہ اپنے لیڈر سے روانہ ہوئے تھے ان کے نام دلاوروں کی اس فہرست میں شامل ہوگئے جن کے ایثار و قربانی نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔"

یہ الفاظ بھی ان فلسطینی جانبازوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کافی نہیں جنہوں نے تل ابیب کے ہوٹل سیوائے پر حملہ میں اپنی جانیں دے دیں۔ یہ ۵ / ۶ مارچ کی درمیانی شب کا واقعہ ہے۔

بیروت میں الفتح کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ چھاپہ العاصفہ کے بہادروں کا کارنامہ ہے۔ العاصفہ الفتح کا فوجی شعبہ ہے۔ اعلان میں کہا گیا ہے کہ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ یہ عظیم چہار منزلہ ہوٹل ملبہ کا ڈھیر بن گیا اور ہر طرف اس کی تباہی کا گرد و غبار پھیل گیا۔

فلسطینی جانبازوں کی تعداد ایک درجن بھی نہ تھی ایک اطلاع میں ان کی تعداد سات اور دوسری خبر میں آٹھ بتائی گئی ہے۔ العاصفہ کے ہیڈکوارٹر نے ان کی تعداد ۸ بتائی ہے۔ لیکن انہوں نے بارہ گھنٹے تک اسرائیلی طوفانی دستوں کا مقابلہ کیا اور بار بار ان کا منہ پھیر دیا۔ لیکن جب گولیاں ختم ہوگئیں تو وہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے وہ عظیم قربانی پیش کر دی جس سے بڑی قربانی انسانی طاقت سے باہر ہے۔

موقع پر موجود نامہ نگاروں کا بیان ہے کہ گنتی کے ان جانبازوں کے حملہ سے بڑی دہشت پیدا ہوگئی۔ اسرائیلی وزیر اعظم رابن وزیر دفاع شمعون پریس اور بری افواج کے سربراہ (چیف آف اسٹاف) مردیکائی گور جائے واردات پر پہنچے اور خاص اپنی نگرانی میں اور خاص اپنی ہدایت میں فلسطینی جانبازوں کو محاصرہ میں لینے اور ان کو گرفتار کرنے کے لیے فوجی کارروائی کرائی۔

الفتح کے دفتر میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس حملہ کا مقصد یروشلم کے اسقف اعلیٰ ملہ ریوں کپوجی کو اسرائیلی قید سے رہا کرانا تھا۔

یاد رہے کہ فلسطینی قوم پروروں کی مدد کرنے اور ان کو ہتھیار سپلائی کرنے کے جرم میں ان کو اسرائیلی عدالت نے بارہ سال قید سخت کی سزا دی ہے۔

جانباز فلسطینی سمندر میں ۱۲۰ کلومیٹر کا سفر کر کے تل ابیب پہنچے تھے۔ یہ سارا سفر انہوں نے ربڑ کی کشتیوں میں کیا۔ ساحل پر اترنے کے جلد ہی انہوں نے ہوٹل سیوائے کا رُخ کیا۔ دائیں بائیں بم پھینکتے اور فائرنگ کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچ گئے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تمام لوگوں کو یرغمال بنا کر بالائی منزل میں اکٹھا کر دیا اور بندوقیں لے کر مورچوں پر ڈٹ گئے۔

اسرائیلی ترجمان کے بیان کے مطابق جانبازوں نے کم از کم دو ہزار گولیاں چلائیں ان سے کافی جانی نقصان ہوا۔ جس کو اسرائیلی فوجی کمان نے پوشیدہ رکھا ہے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی اصل تعداد کیا ہے یہ سوال چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل اور امریکہ دونوں کو احساس ہوگیا کہ عرب علاقوں کے انخلا میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اگرچہ یہ فلسطینی جانباز اسقف اعلیٰ کو رہا نہ کرا سکے لیکن انہوں نے امریکہ اور اسرائیل دونوں کو احساس دلا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ چنانچہ لندن میں ڈاکٹر کسنجر نے اعتراف کیا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرق اوسط میں جلد از جلد امن قائم کرنا کتنا ضروری ہے۔ اسرائیلی کابینہ کو بھی ایک بیان میں کہنا پڑا کہ ہم مذاکرات کے ذریعہ سیاسی تصفیہ کے لیے کوشش جاری رکھیں گے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

پروازِ شاہین

فلائٹ لیفٹننٹ عبدالحسیب کی پہلی برسی کے موقع پر

یہ سال بھی گزر گیا، وقت کے لمحات پَر لگا کر اُڑتے گئے، اور پل پل دنوں اور مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ ـــــ حتیٰ کہ ایک سال بیت گیا ـــــ سال! پُورا سال ـــــ کیسے ـــــ کیوں کر بیتا ـــــ حسیب کے بغیر جو چند دن نہ گزار سکتے تھے، اُنہوں نے اس کے بغیر سال کیسے گزار دیا۔

سال کیا، صدیاں بیت جاتی ہیں، وقت کسی کے روکے کب رُکتا ہے، اور انسان کسی کے ساتھ کب جہان سے گزرا ہے۔ جس کی آئی اسے کوئی روک نہ سکا اور جانے والے کے ساتھ جانے کی خواہش کے باوجود جا نہ سکا۔ اپنے پیاروں کے بغیر روز جیتا ہے۔ کوئی اپنوں کو یاد کرکے گھٹ گھٹ کے روتا ہے۔ کوئی دل ہی دل میں رنج و غم گھولتا ہے، کوئی الفاظ کے جامے پہنا کر صفحۂ قرطاس پر اپنا غم بکھیرتا ہے، کوئی اس دُکھ کو اشعار کی لڑیوں میں پرو دیتا ہے یہ جدائی کے آلام، ہر انسان بلکہ ہر ذی روح کے لیے اذیت دہ ہیں، لیکن وقت کا مرہم ان دکھوں اور زخموں کو بتدریج کم کرتا جاتا ہے۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے اگر قدرت ان زخموں کا اندمال نہ کرے تو شاید "ماتم خانۂ برنا و پیر" آہوں، آنسوؤں کے دھوئیں میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

جواں مرگ عبدالحسیب نے تو موت کو تسخیر کر کے حیات جاوداں حاصل کی تھی، اُس کے غم فراق میں تو ایک فخر اور امتیاز بھی شامل تھا، اُس کی شہادت نے تو خاندانی وقار کے پرچم کو کچھ اور بلند کر دیا تھا۔ اُس کی جدائی کے زخم تو رِسنے سے قاصر تھے وہ کھل رہے تھے شگوفوں کی شکل میں، چٹک رہے تھے، غنچوں کی صورت میں۔ یہ کِھلنا اور چٹکنا کتنا ہی تکلیف دہ سہی ایک آن بان کا حامل تھا۔ حسیب کی زندگی بھی خاندان کے لیے قابلِ فخر تھی اور شہادت بھی فخر و وقار کی حامل بن گئی، اُس نے والدین کا دامن زندگی میں مسرتوں سے بھر دیا تھا، شہادت کے بعد سعادتوں کے خزانے کا منہ ان کے لیے کھول دیا

بلاشبہ وہ مومن والدین کا مومن بیٹا تھا، اس نے دَورِ تیز گام میں اپنا ہر کام تیز روی سے کیا۔ سختیٔ رہ گزر نے اُسے کبھی ہراساں نہ کیا تھا، اس کے بچپن کے ساتھی، اُس کے اعزہ و اقربا، اُس کے اساتذہ، اُس کے دوست احباب اس کے رفقائے کار، اُس کے افسران بالا سے لے کر معمولی خدمت پر متعین عملہ تک سب اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، صرف ۲۴ سال اس دنیا میں گزارنے والا یہ نوجوان کتنی قوتِ تسخیر لے کر آیا تھا جو آج بھی دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے ـــــ،

کہتے ہیں، پُوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں، وہ بچپن ہی سے ہونہار اور ذہین تھا، ننھے سے ذہن میں ہی ذمہ داری کا احساس اور اصول پر ڈٹے رہنے کا خیال سمایا ہوا تھا، بچپن کی شرارتوں تک کو بڑے آدمی کے دماغ سے پرکھتا تھا کہ کس حد تک مناسب ہے۔

چھوٹا سا تھا، موسم گرما میں سحر ہوتے گھر میں کوئی پاگل گھس آیا، نوکروں نے "چور چور" کا غل مچا دیا، ننھے حسیب کی بھی آنکھ کُھل گئی، اُس نے پاس سوئے ہوئے ننھے بھائی کو وہاں غیر محفوظ سمجھ کر اُسے کسی نہ کسی طرح بازوؤں میں سمیٹا اور جھاڑیوں میں چُھپ کر خاموشی سے بیٹھ رہا، تاکہ یہ متاعِ عزیز کوئی اڑا نہ لے جائے۔

بہن کی پیدائش پر یہ ننھا لڑکا گھر سے غائب ہو گیا ـــــ ماں ہسپتال سے بہن کو پہلی بار گھر لا رہی ہے، یہ احساس کہ بچی کے لیے گھر میں کھلونے ہونے چاہئیں، اُسے بازار لے جاتا ہے اور وہ کھلونوں سے لدا پھندا گھر پہنچتا ہے، کہ اچھے بھائی بہنوں کو ہمیشہ کچھ دے کر ہی خوش ہوتے ہیں۔

سیکنڈ سٹینڈرڈ میں پڑھنے والے بچے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ وہ کلاس کا پریفیکٹ چُن لیا گیا لیکن ایک اور بچے کی ذہنی آسودگی کے لیے وہ اپنے اس اعزاز سے دست بردار ہو گیا۔ وہ ذمہ داری اور حق پسندی کے مسئلے میں لڑکپن میں بھی کثرت سے نہ گھبرایا۔ ایک بار اُس نے دیکھا، اس کی منہ بولی بہن کو چند لڑکوں نے گھیر لیا اور نفرت سے کس رہے ہیں، ـــــ اپنے ایک ساتھی کے روکنے

کے باوجود وُہ تنہا ان سے جا لپٹا، کیونکہ منہ بولی بہن کی عزت اسے خطرے میں نظر آ رہی تھی۔

آٹھویں جماعت میں تھا، اور اس لیے معتوب تھا، کہ "بائبل" کیطرف توجہ نہ دیتا تھا، اُسے کلاس سے نکال دیا جاتا، کہ وہ "بائبل" پڑھنے سے انکار کر دیتا تھا۔ ایک ہم جماعت نے کہا، یار روز روز کلاس سے باہر نکلنے پر شرم آتی ہے۔

حبیب نے جواب دیا، اس میں شرم کی کیا بات ہے، ہم مسلمان ہیں، قرآن مجید پڑھنا ہمارا کام ہے، بائبل نہ پڑھنے سے توخوش ہونا چاہیئے! ہمیں یہ کیوں زبردستی پڑھانا چاہتے ہیں۔

آٹھویں کلاس میں ہی ایک لڑکی ٹرانسسٹر لے آئی اور سنتی رہی۔ ٹیچر نے کلاس سے پوچھا، کہ ٹرانسسٹر کس کے پاس ہے، کلاس خاموش رہی، ٹیچر نے تلاشی لینی شروع کر دی، ٹرانسسٹر لڑکے اور لڑکیوں میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ حبیب کے پاس آگیا، حبیب نے ٹرانسسٹر آگے منتقل کرنے کی بجائے نکال کر اپنی ڈیسک پر رکھ دیا۔ اُس لڑکی نے اور تمام لڑکوں نے کہا کہ یہ ٹرانسسٹر حبیب کا نہیں ہے، لیکن حبیب نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا، پرنسپل تک اُس کی پیشی ہوئی، لیکن وہ خاموش رہا۔ ٹیچر جو بائبل نہ پڑھنے پر غصہ کھائے بیٹھے تھے، معافی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن وہ چٹان کی طرح کھڑا تھا، جب اُس کا کوئی قصور نہیں تو وہ معافی کیوں مانگے اس نے اس واقعہ کے بعد سکول چھوڑ دیا، اور اگلے سال ہی پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا، جس میں اعلیٰ فسٹ ڈویژن حاصل کی۔ یہ قدرت کی طرف سے اس کی جرأت اور اصول پسندی کا انعام تھا، کہ اس نے پورا ایک سال بچا کر امتیاز کے ساتھ امتحان پاس کیا۔ چیلنج قبول کرنا، خطرات سے نہ گھبرانا اُس کی فطرت میں شامل تھا۔

حق و استقامت کے یہ انداز اُسے ورثے میں ملے تھے، اس کے نانا میاں عبدالباری کی قائدؒ

ہفت روزہ چٹان لاہور

صلاحیتیں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اپنے نانا چوہدری عبدالحمید کی طرح اپنے موقف کو تسلیم کرا لینا، حق کے لیے ذاتی نقصان کی پروا نہ کرنا اس کے خمیر میں تھا۔

اُس کے سینے میں قدرت نے نہایت ہمدرد دل رکھا تھا جو ہر ایک کے دُکھ کو بانٹ لینے پر ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔ گھر کے ملازمین اس کی عنایات کو فراموش نہیں کر پاتے، اس کی اُستانی نے بتایا، کہ حبیب کو معلوم ہوا کہ میں بیوہ اور دو بچوں کی ماں ہوں تو وہ اکثر میرے گھر بن کہے ہی ضرورت کی اشیاء دے جاتا اور میں گھر پر نہ ہوتی تو کبھی اندر نہ جاتا۔ باہر سے ہی سامان پکڑوا دیتا۔

اُس کا ایک دوست پنجاب یونیورسٹی یونین کے انتخابات کے سلسلے میں گرفتار ہو گیا اور ملتان بھیج دیا گیا۔ حبیب اپنی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود پشاور سے ملتان جا کر اُس سے ملتا رہا۔ وہ اپنے دوستوں میں ریڈ کراس کہلاتا تھا۔

ابھی وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا کہ اس نے ایئر فورس میں جانے کی خواہش کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ تصاویر اکٹھی کرنی مختلف مجلہ جات لے آنے اور قومی خدمت کرتے ہوئے جان دینے کی آرزو کا اظہار کیا ____ وہ اقبال کا شاہین بن جانے کے لیے بیقرار تھا، آخر اُس نے پی اے ایف کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے خود کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

تربیت کے دوران ہی اُس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا اور بہت سے اعزازات حاصل کر لیے تھے۔ پہلے وہ لیڈنگ فلائٹ لیفٹننٹ بنا، پھر جلد ہی کیڈٹ کارپورل بنا دیا گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ سارجنٹ کے عہدے پر فائز ہو گیا، جو اکیڈیمی میں بڑا عہدہ تھا۔ دوران تربیت جو عزیز بھی اس کے اساتذہ سے اس کے بارے میں استفسار کرتا، جواب یہی ملتا ____ "اُس کے بیٹے فکر کی ضرورت نہیں اُس پر تو فخر کیجیے"۔

اور حبیب نے جلد ہی خود کو قابل فخر ثابت کر دیا۔ اپنی مختصر سی ملازمت کی مدت میں بھی اُس نے اپنی صلاحیتوں کا اظہار برملا کیا، حاضر دماغی اور فنی قابلیت سے اُس نے نہایت مشکل وقت میں خود کو بارہا "شاہین" ثابت کیا ____ لپکنا، جھپٹنا اُس کی خطر پسند طبیعت کو راس آگیا تھا۔

ایک بار وہ بموں سے لدا ہوا تیل کی ٹنکیوں سے بھرپور طیارہ اُڑا رہا تھا کہ جہاز کے پہیئے جام ہو گئے، نیچے سے اُسے حکم ملا کہ فوراً جہاز سے کود جائے، لیکن حبیب نے جان پر کھیل کر کودنے سے انکار کر دیا اور پرواز جاری رکھی، حتیٰ کہ تیل ختم ہونے لگا تو اس نے اس وقت نہایت اعتماد و حفاظت سے طیارہ اُتار لیا۔ افسران نے پیار سے اُسے ڈانٹ پلائی، کہ اس قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا، حبیب نے جواب دیا،

"میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر
بہت سی جانوں کو اتلاف سے بچا لیا،
اگر طیارہ کسی آبادی پر جا گرتا تو ہم کتنی
قیامت ڈھاتے اور طیارہ بھی ضائع ہوتا"

ماہرین کی رائے میں حبیب نے اس خطرناک حالت میں طیارے کو بحفاظت اتارنے کے ۱۰۰ فیصد امکانات کا نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ میں وہ سیکشن لیڈر کی حیثیت سے پرواز کر رہا تھا، تیل ختم ہو رہا تھا اس لیے اصولاً اُسے کسی جگہ اُتر جانا چاہیئے تھا، اچانک اسے بتایا گیا کہ دو بھارتی "ہنٹر" اُس کے قریب ہیں، حبیب "سیبر" میں تھا، "ہنٹر" ہر لحاظ سے "سیبر" سے طاقتور ہے، لیکن اُسے راڈار سے پیغام ملا کہ انہیں روک کے کا خطرہ مول لے سکتے ہو؟ حبیب اور اُس کا ایک بہادر ساتھی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر چشم زدن میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ دو "ہنٹر" اسلحہ پھینک کر بھاگ نکلے، لیکن موت اب بھی جا رہے

باقی صفحہ ۳۳ پر

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل

جناب ڈاکٹر سیّد عبد المنان

تعلیم اور اجتہادِ فکر نشاۃ ثانیہ کیلئے ضروری

ہمارے ملک کے بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی تقسیم اور دستور کی ترتیب کے بعد مسلمانوں کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا لیکن مسلمانوں کا مسئلہ نہ صرف ہندوستان میں موجود ہے بلکہ فوری توجہ کا محتاج ہے، اس مطالعے کے دو حصے ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کے بعد کیا تبدیلیاں ہوئیں، کون سی مشکلات ہوئیں۔ جنہوں نے ان کے ذہن کو الجھن میں ڈال رکھا ہے اور مستقبل کی طرف سے فکرمند کر رکھا ہے۔

ان کے موجودہ حالات کو بہتر بنانے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی مناسب اور قابلِ عمل صورت کیا ہے۔ آئندہ کے لیے انہیں فکر و عمل کی کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے جو خود ان کی روحانی اور مادی ترقی میں اور انہیں ہندوستان کی قوم کا صالح اور لازمی جزو اور انسانی برادری کا مفید رکن بننے میں مدد دے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ سیاسی حالات اور مذہبی رجحانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فکر و عمل پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے، جمود کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ملک کا سیاسی نظام بدل گیا اور معاشی نظام آہستہ آہستہ مگر محسوس طور پر بدل گیا ہے لیکن مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے اندازِ فکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور ان میں آج بھی وہی رجحانات پائے جاتے ہیں، جو تقسیمِ ہند سے قبل تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے کسی رجحان میں اتنی قوت اور اتنی خود اعتمادی موجود نہیں کہ ایک پرزور تحریک کی صورت میں آگے بڑھے

مسلمانوں کے ذہنی اور تہذیبی انحطاط کا ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بڑا سبب یہی تھا کہ وہ ایک بڑی عالمی تہذیب کے وارث ہونے کے احساس میں عالمی نئی تہذیب کو ایک مدت تک کم تر سمجھتے رہے اور یہ کوشش نہیں کی، کہ اس کا مطالعہ کریں اور اس سے علمی تحقیق، صنعتی تکنیک اور سیاسی تنظیم کے نئے گر سیکھ کر اپنی زندگی میں تازگی اور روانی پیدا کریں۔ بعض ملکوں نے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، مسلمانوں کے اونچے طبقوں نے اس غفلت کی تلافی کے طور پر جدید علوم سے واقفیت حاصل کی اور اس کے ساتھ ساتھ عالمی تہذیب کے خوبصورت مظاہر مثلاً وضع لباس، رہن سہن، کھانے پینے کے طریقوں کو اختیار کیا، مگر اس کی بعض اہم ترین اقدار کو سراسر یا بڑی حد تک نظر انداز کیا۔ کہیں یہ بھی ہوا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید کے جوش میں خود اپنی تہذیب کی قدروں کو کمزور بنا دیا اور مغربی تہذیب کے طفیلی بن گئے، ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ بنیادی سوال ہے جو فوری توجہ کا محتاج ہے کہ وہ اپنی تہذیبی زندگی کے سرچشمہ کو انسانی زندگی کے بڑے دریا سے جدید تہذیب کہلاتا ہے، کاٹ دینا چاہتے ہیں یا اس سے اس طرح مربوط رکھنا چاہتے ہیں، کہ ان کی تہذیب اپنی اصل کو قائم رکھتے ہوئے آج کی عالمی تہذیب سے جتنا کچھ لے سکتی ہے، لیتی رہے اور جتنا کچھ دے سکتی ہے، دیتی رہے۔ اس طرح اس بنیادی سوال کا جس کا ہندوستانی مسلمانوں کو جواب دینا ہے یہ صورت ہے کہ وہ اس مشترک سیکولر زندگی سے جس

کا نقشہ ہندوستان کے آئین میں پیش کیا گیا ہے بالکل الگ رہنا چاہتے ہیں، یا اپنے آپ کو اس کے اندر ضم کر دینا چاہتے ہیں۔ یا اپنے تہذیبی خصوصیات کو جو براہ راست مذہب سے وابستہ ہیں قائم رکھتے ہوئے اس کا ایک لازمی جزو بننا چاہتے ہیں، چونکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کی دوسری مذہبی جماعتوں کی طرح مسلمان ہی اپنے جداگانہ مذہبی اور تہذیبی وجود کو ایک رنگ سیکولر قومیت میں ضم کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے ان کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک انہیں اختیار کرنی ہے یا تو اپنا جداگانہ مذہبی اور تہذیبی وجود قائم رکھتے ہوئے سیکولر قومیت کا

ایک جزو

لازم بن کر رہنا یا ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہنا جو مروجہ سیاسی اور سماجی نظام کو قبول نہیں کرتی، مگر اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہے

ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ علمی اندازِ نظر انداز کے فقدان کی وجہ سے وہ اس عام سوجھ بوجھ سے محروم رہے، جس کے بغیر افراد اور جماعتیں زندگی کے سمندر میں بغیر پتوار کی کشتیوں کی طرح بہتی چلی جاتی ہیں، یہ سوجھ بوجھ ایک طرح کی عوامی حکمت عملی ہے جو ہر عہد اور ہر ملک میں علم و حکمت کی سطح سے منتقل ہو کر عام لوگوں کی سطح تک پہنچتی ہے، ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں علمی زندگی اور اس کے مسائل کا مطالعہ جذبات، تعصبات اور اوہام سے الگ ہو کر تنقیدی علمی نظر سے کرتے ہیں، عام لوگوں میں بھی ذہنی عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حالات و واقعات کو ان کے

اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کریں وہ کہ اس رنگ میں جس میں وہ خود انہیں دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی ذہنی تربیت، روحانی عقائد اور اوہام و خرافات اور شاعرانہ مبالغے اور مناظرے کی فضا وجہ ہوتی ہے جو عام سوجھ بوجھ کی نشوونما کے لیے قطعاً ناسازگار تھی، ظاہر ہے کہ جو لوگ صرف مذہب میں نہیں، علوم میں بھی روحانی عقیدے کے عادی ہوں، نجوم، جادو یا اسی سے ملتی جلتی خلاف عقل چیزوں کے قائل ہوں، وہم کو علم اور افسانوی روایات کو تاریخ کا درجہ دیتے ہوں، ان کے لیے عملی زندگی کی سطح پر واقعات کو جانچ کر اور پرکھ کر اندازہ کرنا ممکن نہ تھا آجکل کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیئے کہ نہ وہ شر محض ہیں نہ خیر مطلق، نہ سراپا کفر نہ مجسم اسلام بلکہ معمولی انسان اور بیسویں صدی کے مسلمان، وہ ایک عظیم مذہب کے پیرو اور ایک عظیم تہذیب کے وارث ہیں، جس نے اپنی روحانی نجات کی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ مادی فلاح کا طریقہ بھی سکھایا تھا، یہ مشتمل تھا، یہ کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نظر پر جو اس زمانے میں سب سے زیادہ واقعیت پسندانہ اور ترقی پسندانہ تھا جس کی بدولت پانچسو سال تک علم و تہذیب، قوت و خوشحالی میں دنیا کی سب قوموں سے آگے رہے، لیکن اس کے بعد انتشار کا دور آیا، جس میں مسلمان قوموں میں بٹ گئے، اور نہ صرف عالمی زندگی کے دھارے سے بلکہ ایک دوسرے سے ہی کٹ کر ساکن و جامد زندگی گزارنے لگے، دنیا کا ذہنی نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ ہو گیا، جسے جدید علمی انداز نظر کہتے ہیں، مسلمانوں میں عام تعلیم کا معیار گھٹنے لگا اور جہالت بڑھنے لگی، اس سے دنیا اور زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، مگر ان کی ساری ذہنی اور اخلاقی قوت ان کا فہم و ادراک، ان کا عزم و ارادہ ابھی مردہ نہیں ہوا ہے صرف معطل ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے ذہنی نقطۂ نظر کو درست کر لیں اور بیسویں صدی کے علوم کو سمجھنے کی ساری قوت عمل اور جوش و خروش سے کام لیں۔ جو دسویں صدی کے علوم حاصل کرنے میں کرتے تھے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آج بھی انسانیت کی فلاح و تربیت میں دوسروں کے برابر اور شاید بعض باتوں میں سبقت لے سکیں، قوم اور وطن کی محبت کو ایک فطری جذبہ کی حیثیت سے دنیا کے سب انسانوں کی طرح ہندی مسلمان بھی اچھا اور ضروری سمجھتے ہیں، لیکن جب قوم پروری اور وطن پرستی کے الفاظ سیاسی اصطلاحوں کے طور پر استعمال ہوتے ہوں۔ اور ان سے مراد ہو قوم اور وطن سے وفاداری کو سماجی تعلقات میں سب سے اونچی جگہ دینا تو ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے بارے میں اپنے رویّہ کے متعین کرنے میں احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ قوم پروری اور وطن پروری ایک مظہر پرستانہ مسلک ہے، جس میں قوم اور وطن کے خیالی پیکروں سے ایک طرح کی مذہبی عقیدت ہوتی ہے اور ان میں دیویوں کی پرستش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آبائی مذہبی عقیدہ کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ ساتھ نئے عقیدہ کو اختیار کرے۔ اور اس سے نہ صرف فلاح دنیوی بلکہ نجات آخرت کا وسیلہ جانیں۔

یہ مسلک ہندوستان کے بعض انقلاب پسندوں بلکہ ایک حد تک جرمنی کے نازیوں کا بھی تھا ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان جب تک وہ مسلمان ہے اس تصور کو قبول نہیں کر سکتا، وہ مادر وطن کو حقیقی ماں کا درجہ جو سماجی تعلقات میں سب سے اونچا ہے، دینے کو تیار ہے گا، مگر عبادت کا تعلق جو اس کے نزدیک سارے دنیاوی معاملات سے بالا ہے، وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں رکھ سکتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قوم پروری اور وطن پروری کا صالح تصور یہ ہے کہ ان کی سیاسی وفاداری اور محبت کا تمام تر اپنی قومی ریاست اور جمہوری آئین سے ہو، اس کی سلامتی اور ترقی کے لیے وہ ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، سوائے اپنے مذہب اور اپنی مخصوص تہذیب کے۔ مگر اپنے ملک و قوم کی محبت کا پیمانہ انہیں دوسرے ملکوں اور قوموں سے نفرت کو نہیں بنانا چاہیے۔ اس لیے کہ اس سے وہ جنگجویانہ وطن پرستی پیدا ہوتی ہے، جو قوموں کو انسانیت کی سطح سے گرا کر بہیمیت کی سطح پر پہنچا دیتی ہے۔

مذہبی زندگی اور مذہبی تعلیم

یوں تو ہر تہذیب میں ایک خاص تصور زندگی اور تصورِ کائنات کہ جسے ہم مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں، عکس نظر آتا ہے مگر مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں یہ بات خاص طور پر نمایاں رہی ہے، کہ اس کا مرکزی نقطۂ نظر مذہب ہے ہر مذہب کے دو پہلو رہتے ہیں، جنہیں انفرادی اور اجتماعی یا شخصی یا سماجی کہتے ہیں، فرد کے لیے معرفت حق، تہذیب نفس اور حصول نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف سماجی زندگی کا راہ نما اصول اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مذہب کے انفرادی اور سماجی پہلو کی طرف یکساں توجہ کی۔

ایک طرف اس نے اس بات پر زور دیا کہ فرد خدائے واحد پر عقیدہ رکھے، اس کی عبادت کرے اور کلام الٰہی کی روشنی میں، اپنے تہذیب نفس کی بھی حسب استعداد اپنے اندر وہ اخلاقی اقدار پیدا کرے جس کے کامل نمونوں کا تصور وہ صفات ایزدی یا اخلاق اللہ کی صورت میں کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی بھی تاکید کی کہ سماج میں اپنی ساری زندگی کو انہی اقدار عالیہ میں ڈھال سکے ہر چند کہ اسلام نے دونوں پہلوؤں پر زور دیا مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس نے اصل مذہب فرد کے ذاتی عقیدے یا ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا اس لیے کہ یہی سرچشمہ ہے نیکی، محبت اور صداقت کی اس روح کا جو اجتماعی زندگی میں سرایت کر کے ایک صالح سماج یا صالح ریاست کی تعمیر

ہفت روزہ چٹان لاہور

کرتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مذہبی شعور کے لحاظ سے اونچے اور متوسط قسم کے مسلمان دو موٹی قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے جدید طرز کی اور دوسرے جنہوں نے قدیم طرز کی تعلیم حاصل کی۔ اول الذکر مذہب کے بنیادی عقائد کے بارے میں بے یقین یا کم یقین ہیں۔ اس سے لازمی طور پر اخلاقی عمل میں بھی مذہب سے ہدایت حاصل نہیں کرتے۔ ان میں سے بہتوں نے سرے سے کسی قسم کی مذہبی تعلیم ہی نہیں حاصل کی اور ان کے مذہبی تصورات سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ انہیں اسلام سے محبت اور وفاداری کا دعویٰ تو ہے مگر ان کا اسلام محض ایک سیاسی تصور ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ تہذیبی سماجی گروہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، ہندوستان میں سلامتی اور عزت کی زندگی بسر کرے اور ملک کی معاشی دولت اور سیاسی قوت میں معقول حصہ پائے۔ ایک خاص سیاسی نصب العین ہے جو کسی لا مذہب یا بد اخلاق جماعت کا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے خدائے واحد اور اس کی صفات حسنہ پر ہی عقیدہ کر لیتے ہوں، اسلام کے اخلاقی اقدار کے حامل ہوں اور اپنے ملک اور قوم اور پورے عالم انسانیت میں اخلاقی زندگی کی عام سطح کو بلند کرنے میں حصہ لیں۔

معاشی زندگی اور دنیوی تعلیم

وہ انداز نظر جو کچھ دن سے مغرب میں عام ہو گیا ہے کہ فرد اور جماعت کی خوشحالی اور ترقی کو ناپنے کا اصل پیمانہ مادی دولت و راحت ہے اسلام کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کے سراسر منافی ہے اور مسلمان بحیثیت مسلمان کے معیار معیشت کو معیار زندگی کے طور پر کسی طرح قبول نہیں کر سکتے۔ اسلام کی وہ خصوصیت جو اس کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نے "معاش" اور "معاد" یعنی عارضی مادی زندگی اور ابدی روحانی زندگی دونوں کو اہمیت دی ہے لیکن اس نے صراحت اور وضاحت کے ساتھ اول الذکر کو وسیلہ اور آخر الذکر کو مقصد قرار دیا ہے ظاہر ہے کہ وسیلہ مقصد سے زمانے کے لحاظ سے مقدم ہے مگر اہمیت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ہرگز نہیں۔ مغربی ملکوں میں بہت سے ارباب نظر جو روحانی قدروں کے پرستار ہیں مادیت کی اس رَو سے جو صنعتی نظام کے ساتھ ساتھ اس سے سخت بیزار ہیں اور دل و جان سے ان کے تباہ کن اثرات کی مزاحمت کر رہے ہیں اور ہندوستان میں ایسے ارباب فکر کی بڑی اکثریت یہی نقطہ نظر رکھتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی صف میں شریک ہو کر ان کو تقویت پہنچانی چاہیئے تاکہ متحدہ قوت سے مادیت کے آنے والے طوفان کا مقابلہ کر سکیں مگر انہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مادی دولت راحت کی تحقیر کا جو سبق عام طور پر کم علم مذہبی معلم اور واعظ مسلمانوں کو پڑھاتے ہیں وہ بھی غلط ہے اور اسلامی نقطہ نظر کی غلط تعبیر پر مبنی ہے۔ یہ حضرات افلاس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور بزرگان دین کی عسرت کی زندگی کی مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ناداری خدا کی رحمت ہے، نہ صرف اس کو شکر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے بلکہ اس پر شکر و فخر کرنا چاہیئے مگر اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ جبری افلاس اور اختیاری افلاس میں فرق ہے۔ جبری افلاس جس میں ہمارے ملک میں عوام کا بڑا طبقہ مبتلا ہے سماج کی نالائقی یا بے اتفاقی کی علامت ہے اور اس پر قناعت کرنا یا دوسروں کو تلقین کرنا مذہبی اور اخلاقی جرم ہے۔ اب رہا اختیاری افلاس تو اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کی محرک کاہلی اور بے حسی ہے دوسری وہ جس کا محرک زہد و ایثار ہے۔ ظاہر ہے ایسی ناداری جو کاہلی کا نتیجہ ہے قابل شرم چیز ہے اور اخلاقی روگ ہے۔ کاہل، مفلس عام طور پر پست ہمت بے غیرت، حاسد اور حریص ہوتے ہیں۔ البتہ وہ فقیرانہ زندگی جو خدا کے خاص بندے زہد و ایثار کی نیت سے اختیار کرتے ہیں تعریف و توصیف اور عقیدت و احترام کی مستحق ہے اور اس کی تقلید ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیئے لیکن جو لوگ اس زندگی کو اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو جاننا چاہیئے کہ زہد و ایثار کی یہ راہ کٹھن اور دشوار گذار ہوتی ہے اس پر وہی شخص پامردی سے قدم رکھ سکتا ہے جس کے دل میں کسی بڑے مقصد کی سچی اور گہری لگن ہو کہ وہ اسے دنیا کی راحتوں اور لذتوں سے بے نیاز کر دے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم ہے جس کے لیے زیادہ محنت اور مستعدی کی ضرورت ہے مسلمان نوجوان گھبراتے ہیں۔ نچلے متوسط طبقہ کے لوگ عام طور پر ہاتھ کے کام کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کا کچھ بد شوقی اور کچھ وسائل کی کمی کی وجہ سے ابتدائی اور اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم سے دُور رہنا ان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت بُرا ہے کیونکہ آنے والے صنعتی نظام کے دور میں روزگار کے کئی مواقع جن میدانوں میں کثرت سے نکلے ہیں وہ ٹیکنیکل تعلیم کے ہیں۔ اب اعلیٰ تعلیم کی کمی جو ایک حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں تقسیم ہند سے پہلے تھی اب اور افسوسناک حالت اختیار کر چکی ہے اس پر بھی نہ صرف ان کے معاشی اور سماجی انحطاط کا بلکہ تہذیبی، اخلاقی اور روحانی تباہی کا بھی خطرہ ہے۔ اس بحرانی دور میں جب مسلمان کا ذہن تہذیب اور اخلاق کی متضاد قدروں سماجی اور سیاسی تنظیم کے متصادم نظریوں کی بھول بھلیوں میں پریشان و حیران ہے اس کے لئے اعلیٰ تعلیم کا حاصل کرنا شدید ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس میں نہ وہ تنقیدی بصیرت پیدا ہو سکتی ہے جو پرانی اور نئی تہذیب میں حق کی چنگاری کو دیکھ سکے اور نہ وہ اخلاقی جرأت کہ اپنے نفس گرم سے پھونک پھونک کر دھویں کو ہٹا دے اور دبی آگ کو روشن کرے۔ بغیر اعلیٰ تعلیم کے ہندوستانی مسلمان اس مشکل مہم کو جو ان کی ترقی بلکہ بقائے محض کے لیے ناگزیر ہے سر نہیں کر سکتے کہ اجتہاد و فکر سے کام لے کر پرانی ابدی قدروں کو نئے بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کر سکیں۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ فکر و عمل کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ مصمم ارادہ کر لیں کہ ایک مدت تک ان

کی ساری کارستیں تعلیمی اصلاحات کی بھرمار کرے

اب ہندوستان ایک آزاد جمہوری ملک ہے جس میں حکومت عوام کی منتخب شدہ ہوتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک عوام چاہتے ہیں اور جب وہ ان کا اعتماد کھو دیتی ہے اسے ہٹ جانا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی پالیسیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں اس لئے ہندوستانی مسلمان اپنے مسائل کے مستقل حل کے لیے حکومت سے نہیں بلکہ عوام سے خاص کر ہندوؤں سے جو اکثریت کی حیثیت سے حکومت کی پالیسی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں، تعلقات خوشگوار بنائیں۔ حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات اپنی جگہ اہم ہیں مگر اس سے زیادہ کہیں اہم یہ ہے کہ مسلمان اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ معاملہ ٹھیک کریں اس لیے کہ حکومت ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔

بقیہ :- عرب لیگ

پر کوئی غیر ملکی طاقت قابض نہیں تھی۔ اسی سال امریکن کانگریس "TRADING WITHTHE ENEMYACT" پاس کیا تھا جس کی رُو سے کوئی بھی ایسی کارپوریشن دشمنانہ کردار کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ جس کی شمولیت ایک دشمنی ملک میں ہو یا اس کی شمولیت امریکہ کے علاوہ اور کسی ملک میں ہو اور وہ کسی دشمن ملک میں تجارت کر رہی ہو، دوسری جنگ عظیم میں امریکی عدالتوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ:

"وہ کارپوریشن کے ایک چوتھائی حصے دار ایک دشمنی قومیت کے ہوں گے انکو دشمن سمجھا جائے گا۔"

اس کے باوجود امریکی اس بات پر تشویش ظاہر کرتے ہیں، بلاشبہ اس قانون عرب قوم کہ عرب صیہونی فرموں کا کاروبار بالکل ٹھپ کرنا چاہتے ہیں کے خلاف جو جنگی آمیز شور مچایا جا رہا ہے وہ حق بجانب

عجیب ہے۔

یورپ میں اہم کمپنیوں، حصے داروں اور تجارتی طبقے نے صیہونی فرموں کے بائیکاٹ کے عرب مطالبہ کو پورا کرنے کی کھلے بندوں خواہش ظاہر کی ہے۔

حالیہ اخباری رپورٹوں میں (مثال کے طور پر، نیوز ویک بتاریخ ۲۴ فروری) یہ انکشاف ہوا ہے، کہ

اسرائیل کے یورپی ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور یورپی حکومتوں کی اسرائیل کے تئیں رویہ میں حیرت انگیز حد تک سرد مہری آگئی ہے، یورپ میں ہر جگہ، صیہونی یہودیوں کو ایسے عہدوں پر بھیجا رہا ہے جہاں کہ وہ ترقی پذیر اور عرب ملکوں سے تعلقات پر کم سے کم اثر انداز ہو سکیں۔ مثال کے طور پر فرانس میں صیہونی یہودیوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ پرائیویٹ یا سرکاری بینک میں کسی اہم عہدے پر فائز ہوں۔"

مغربی جرمنی کے اخباروں میں یہ بات چھپی ہے کہ، "جرمن افسران اسرائیلی ڈپلومیسی سے غیر مطمئن ہیں، جس کو وہ "جیحجارحانہ" کہتے ہیں۔"

جب اسرائیل نے اکتوبر ۷۳ء کی جنگ کے دوران امریکی فوجی، بحری اڈہ واقعہ بر جمیر حادین میں اسرائیلی جھنڈے لگے ہوتے ہیں۔ کئی جہاز بھیجے تو جرمنی کے ذمہ داران نے اسرائیل پر یہ الزام لگایا کہ وہ جرمنی اور عربوں کے تعلقات کو خراب کرنے کے در پے ہے۔

اٹلی میں بھی اسرائیل کے ساتھ رویہ میں سرد مہری آگئی ہے، وہاں پر کرسچین ڈیموکریٹ، مرکزی اور سرکاری عرب نواز ہوگئے ہیں۔

اسرائیل کو اقوام متحدہ اور یونیسکو میں مات کھانی پڑی، کہ اسے افریقہ سے نکالا گیا اور ایشیا میں بھی ذلت اٹھانی پڑی، کیونکہ ہندوستان نے فلسطینی تنظیم آزادی کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور اسرائیلی ٹیم کو جو کہ بین الاقوامی ٹیبل ٹینس چیمپین شپ میں شرکت کے لیے آنا چاہتی تھی، داخلہ کے لیے ویزے نہیں دیئے گئے اور اسے صدر کو اپنا نیپال کا دورہ منسوخ کرنا پڑا،

یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں، کہ غیر یہودی دنیا کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات اب ختم ہو رہے ہیں۔

بقیہ :- ڈاکٹر سید عبداللہ

موسیقی تو ٹھیک ہے۔ لیکن عقیدت اقبال کا کوئی اچھا اظہار نہیں۔

بعض حضرات گانے کے ساتھ یا گانے کے بغیر اداکاری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ اچھی خاصی مسخرگی ہو رہی ہے۔

ایسے ہی مواقع کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اقبال جیسا سنجیدہ مضمون عالمی فکر شاعر بھانڈوں کا تختۂ مشق بنتا جا رہا ہے، نہ سلیقہ شعر کا، نہ ذوق حقیقی موسیقی کا، نہ شوق نکتہ رسی کا.......اقبال ہے کہ ہر نااہل اس پر گلا بگاڑ رہا ہے۔ اور اس کے اشعار آبدار کی مٹی پلید کر رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ سکولوں اور کالجوں میں یہ اقبال شناسی کا پروگرام ہے، لیکن دراصل یہ اس عظمتِ رفتہ کے ساتھ جس کا نام اقبال ہے، محض مذاق ہے۔

اقبال کو بہ ترنم پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس کے کچھ آداب ہیں، ایسی محفلوں میں مسخرگی اور بھانڈ پن کی صورتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

اور سچ پوچھیے تو سکولوں اور کالجوں کی حد تک تحت اللفظ ہی کو رواج دینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے سمجھ کر انتخاب کریں، اور سمجھ کر پڑھیں، اور سننے والے محض پڑھنے کے وسیلے سے شعر کی جان تک پہنچ جائیں اور معانی کے ادراک سے بہرہ ور ہوں۔

میرا تو یہی خیال ہے، آگے معلوم نہیں ہماری قوم کی طبع تماشا دوست کو کیا منظور ہے!

تحریر: شیخ محبوب علی اسسٹنٹ چیف انجنیئر
ٹیلیفون اسلام آباد

ہندوستان میں اسیری کے شب و روز

جولائی ۱۹۷۱ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے، میں ہری پور ہزارہ کے مقام پر محکمہ ٹیلیفون میں ایس ڈی او کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں تبادلے کے احکام ملے، اس زمانے میں مشرقی پاکستان کی مثال اس آتش فشاں کی سی تھی، جو بھرپور قسم کی آتش فشانی کے بعد کروٹ بدل کر سو گیا ہو، مگر جس کی بیداری کے امکانات روشن ہوں، ۲۵ جون کو میری اہلیہ ایک بچی کو جنم دے کر سخت تشویشناک حالت میں پڑی تھی۔ لیکن میں نے حالات کی تمام تر نزاکت کے باوجود مشرقی پاکستان جانے کا عزم کر لیا اور ۲۰ جولائی کی صبح کو راولپنڈی سے بذریعہ طیارہ اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر میرے والدین اور سسرال والوں کے علاوہ متعدد اعزہ بھی موجود تھے۔ مشرقی پاکستان کی حالت کے پیش نظر سب کے دل بوجھل چہرے اترے ہوئے تھے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں چنداں فکرمند نہ تھا اس لیے کہ نفع نقصان خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس لیے بھی کہ وطن عزیز کا وہ حصہ میرے لیے اجنبی نہ تھا فیلڈ ٹریننگ کے سلسلے میں بھی وہاں کئی ماہ تک مقیم رہا تھا، جب کہ دوسری مرتبہ تبلیغ دین کے لیے میں چار ماہ تک وہاں کے متعدد شہروں اور قصبوں میں گشت کرتا رہا تھا، وہاں کے لوگ دین سے جو گہری محبت رکھتے تھے اور جس خلوص کے ساتھ وہ مغربی بھائیوں سے پیش آتے تھے اُس کی موجودگی میں وہاں خطرے کی کوئی بات نہ تھی یہ صحیح ہے کہ مارچ سے جون ۱۹۷۱ء تک وہاں غیر بنگالیوں سے خاصی زیادتیاں ہوئی تھیں مگر اِن حرکتوں کے ذمہ دار یا ہندو تھے یا قبل سے تخریب پسند، عام مسلمان اس ڈھب کے نہ تھے

۱۸ ستمبر کو میری اہلیہ بھی میرے اصرار پر، بچی کو لے کر راولپنڈی سے ڈھاکہ آ گئی، یہ وہ ایام تھے جب مشرقی پاکستان میں آگ اور خون کا تماشا اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ فضا دھماکوں سے لرز لرز جاتی، اور ہر وقت خوف و ہراس کی کیفیت طاری رہتی، دفتر سے بتائے بغیر آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جاتا تو گھر میں قیامت برپا ہو جاتی، چونکہ دہشت پسند حکومت کی مشینری کو مفلوج کرنا چاہتے تھے، اس لیے اُن کے شکار خصوصاً حکومت کے اعوان و انصار ہوتے، اس میں بنگالی و غیر بنگالی کی تخصیص نہ تھی، بہت سے ایسے واقعات ہوئے کہ سرکاری گاڑیوں میں بم رکھ دیئے گئے یا انہیں نشانہ بنایا گیا، ہمارے پاس بھی چونکہ محکمے کی گاڑی تھی اس لیے اس پر سفر کرتے ہوئے دل گھبراتا تھا۔

ملٹری ایکشن کے وقت لوگ ڈھاکہ چھوڑ کر دیہی آبادیوں میں چلے گئے تھے مگر بعد میں وہاں اپنے آپ کو محفوظ نہ پا کر شہر کا رُخ کرنے لگے خصوصاً دین سے تعلق رکھنے والوں کا دیہات میں رہنا دوبھر ہو گیا، تقریباً تمام دیہاتی آبادی میں موجود دینی مدارس معطل ہو گئے اور علمائے کرام جان بچانے کی غرض سے ڈھاکہ شہر میں منتقل ہو گئے۔ ان ایام میں سینکڑوں علماء قتل ہوئے، جید عالم دین مولانا مصطفیٰ مدنی کو بھرے جلسے میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، اس قیامت کے ہنگامے میں بھی تبلیغ والے اپنے کام میں جُتے رہتے، خدا کا فضل ہے، تخریب پسند تبلیغی جماعتوں پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرماتے تھے چنانچہ سینکڑوں جماعتیں اس پُر آشوب دور میں گاؤں گاؤں، شہر شہر پھرتی رہیں اور لوگوں کو دین کی طرف بلاتی رہیں، کاکریل (ڈھاکہ) میں دس روزہ اجتماع بھی ہوا، جس میں پورے ملک سے لوگ آئے، باتیں ہوئیں اور دعائیں ہوئیں، اور ایک گونا سکون نصیب ہوا

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات ابتر ہوتے چلے گئے۔ سرحدوں پر ہندوستان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، جب کہ آبادیوں میں مکتی باہنی والے قیامت برپا کئے ہوئے تھے۔ اب دن دہاڑے دھماکے ہونے لگے تھے، حبیب بنک اور سٹیٹ بنک میں بم پھٹے۔ ٹیلیویژن سٹیشن بھی ان کی زد میں آیا، بیت المکرم مارکیٹ اور سدھر گنج پاور سٹیشن میں بھی دھماکوں سے بڑی تباہی ہوئی، سیاسی پارٹیوں کے دفاتر، بچوں کے سکول، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے گھر، پٹرول پمپ اور تجارتی مراکز تو بموں کا خاص نشانہ بنتے ۔۔۔،

۳ دسمبر کی شام کو ریڈیو کی خبروں سے پتہ چل گیا، کہ مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھرپور جنگ شروع ہو گئی ہے، جس میں ہوائی فوج نے بھی حصہ لیا ہے، صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ رات ڈھاکہ کے لیے بہت خطرناک ہو گی۔ چنانچہ یہی ہوا، وہ رات قیامت خیز تھی۔ انڈین بمباروں نے ایئرپورٹ پر حملہ کیا، اور طیارہ شکن توپوں نے وہ گولہ باری کی کہ خدا کی پناہ ۔۔۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، بڑی دیر تک یہ خوفناک کھیل جاری رہا

تاہم ہمارے ہوائی اڈے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔
۴ دسمبر کو صبح سے شام تک بھارتی لڑاکا طیارے نیچی پرواز کرتے ہوئے ایئرپورٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے رہے، دشمن کے تیرہ یا چودہ جہاز گرا لیے گئے۔ اڈہ آج بھی خدا کے فضل سے سلامت رہا۔ لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے رات ۱۲ بجے کے بعد پھر ہندوستانی جہازوں سے مسلسل حملے ہوتے رہے۔
۵ دسمبر کو دن بھر انڈین طیاروں کی کوئی پرواز نہ آئی۔
۶ دسمبر کو انڈین طیارے آئے لیکن نیچی پرواز کا طریقہ چھوڑ کر بلندی سے بمباری کرتے رہے ۷ دسمبر صبح ۹ بجے کے قریب ہمارے تین سیبر جیٹ اڑتے ہوئے مشرقی جانب گئے، یہ ان کی آخری پرواز تھی، اس کے بعد ان کو اڑتے ہوئے نہ دیکھا، غالباً اسی روز اڈہ کو بری طرح تباہ کر دیا گیا۔

پاک فضائیہ کی پروازیں بند ہوئیں تو ہر طرف مایوسی چھانے لگی۔ اب انڈین بمبار آتے اور آزادی سے مختلف مقامات کو نشانہ بناتے، جیل خانہ میں رضاکار فورسز کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ یونیورسٹی بلڈنگز، عظیم آباد کالونی، نارائن گنج میں تیل کے ذخائر پر، حتیٰ کہ گورنر ہاؤس پر بھی بمباری ہوتی اور راکٹ برسائے جاتے۔ آخر میں تو کم رفتار والے بمبار بھی آنے لگے، طیارہ شکن توپیں اپنی توفیق کے مطابق جو مدافعت کرتیں مگر فضائی توپ کے مکمل فقدان نے ان کو بے اثر بنا دیا تھا۔ ۱۰ دسمبر تک مشرقی پاکستان کی پوری سول انتظامیہ ختم ہو چکی تھی، مگر ہمارا محکمہ ۱۶ دسمبر کی صبح تک کام کرتا رہا۔ ڈھاکہ پورے صوبے میں پھیلے ہوئے ٹیلی مواصلات کا مرکز تھا، چٹاگانگ، سلہٹ، بوگرہ، میمن سنگھ، رنگ پور، کومیلا، چاند پور، کنڈی کی لائنیں ایک ایک کر کے کٹتی رہیں البتہ کھلنا سے آخر دم تک رابطہ قائم رہا۔
۱۵ دسمبر کو بھی وہاں بات ہوئی تھی، سرکاری احکام کے مطابق ہم ۲۴ گھنٹے ڈیوٹی کے لیے تیار رہے، بعض ساتھیوں نے دفتر ہی میں رہنا شروع کر دیا تھا ان ایام میں پاکستان ریڈیو کی خبریں امید کا پہلو لیے ہوتے تھیں، مگر بی بی سی اور دوسرے ذرائع سے سخت مایوس کن اطلاعات آ رہی تھیں

(باقی صہ ۳۲ پر)

اختر شیرانی کا فن

تحریر: محمد یونس حسنی

(آخری قسط)

اس قسم کی عبارت آرائی انہوں نے بہت کم روا رکھی ہے اور جب بھی اسطرف توجہ دی ہے، ان کے بیان میں الجھاؤ، ثقالت اور بے نمکی پیدا ہوئی ہے، طویل جملے عربی و فارسی الفاظ اور نامانوس تراکیب کا استعمال عبارت کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔

یہ نثر اختر نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں لکھی تھی، اس زمانے میں ادب لطیف کی تحریک پر نیاز فتح پوری اور خلیقی دہلوی کے گہرے اثرات تھے، اختر نے انہی کا اتباع کیا، لیکن دھیرے دھیرے وہ اس سے نجات حاصل کر کے شیریں اسلوب بن گیا، جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

نثر میں اختر کا تیسرا اسلوب وہ عام فہم سادہ اور علمی اسلوب ہے، جس میں عبارت آرائی اور رنگین بیانی کو دخل نہیں، اس قسم کی عبارت وہ علمی، معلوماتی اور عام دلچسپی کے مضامین میں استعمال کرتے ہیں



ٹنڈر نوٹس

(۱) محکمہ تعمیرات (شعبہ عمارات) کے منظور شدہ ٹھیکیداران جنہوں نے فیس ٹھیکیداری بابت سال ۷۵-۱۹۷۵ء جمع کرا دی ہے، ان سے مندرجہ ذیل کاموں کیلئے پرسنٹیج ریٹ/آئیٹم ریٹ ٹنڈر بمطابق کمپوزٹ شیڈول آف ریٹ ۱۹۷۴ء اور نان شیڈول آف ریٹ ۱۹۶۲ء مطلوب ہیں۔ (۲) ٹنڈر زیر دستخطی کے دفتر میں ۱۵ اپریل ۱۹۷۵ء بوقت ساڑھے گیارہ بجے وصول کئے جائیں گے اور اسی روز وقت مقررہ پر ٹھیکیداران یا ان کے مقرر کردہ ایجنٹوں کی موجودگی میں جو بھی وہاں موجود ہوں گے کھولے جائیں گے ہر خواہشمند ٹھیکیداران یا کمپنی یا ان کے مقرر کردہ نمائندوں کی ذاتی طور پر ٹنڈر فارم معہ اصل و نقل شدہ سند مختار خاص ہونے کی جمع کرانی ہوگی (۳) ٹنڈر فارم مقررہ قیمت کے عوض ۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء کو زیر دستخطی کے ہیڈ کلرک سے حاصل کئے جا سکتے ہیں (۴) ٹنڈر کھولنے کے دن کوئی ٹنڈر فارم جاری نہیں کیا جائیگا (۵) زرضمانت جو کہ کام کے سامنے درج ہے، بذریعہ ڈیپازٹ ایٹ کال یا ٹریژری چالان کیصورت میں ٹنڈر کے ساتھ منسلک ہونی چاہیئے، داخلہ بینڈ فارم جاری و شامل مقابلہ نہ کیا جائیگا (۶) زیر دستخطی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک یا تمام ٹنڈروں کو بغیر وجہ بتائے مسترد کر دے (۷) متعلقہ کام کی جو تفصیل جو کہ تعمیر کرتی ہے دفتر زیر دستخطی سے اوقات کار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

نمبر شمار	تفصیل کام	تخمینہ	زرضمانت	میعاد
۱۔	لاہور جنرل ہسپتال کے سٹاف کیلئے رہائش گاہوں کی تعمیر	۸,۵۰,۰۰۰/-	۱۷,۰۰۰/-	۵ ماہ
۲۔	البرٹ وکٹر ہسپتال میو ہسپتال میں ۴ سی ایم ای فلو تھرمو ایکوڈ چلر کی تبدیلی کے ساتھ H.P ۶۰ موٹر کمپریشر کا لگانا	۱۱,۰۰۰/-	۲۲۰/-	۱ ماہ
۳۔	اسٹیبلشمنٹ پوسٹ گریجویٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ گنگا رام ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور منظور شدہ ڈیزائن کے مطابق کرسیاں مہیا کرنا۔	۱۵,۰۰۰/-	۳۰۰/-	۱ ماہ
۴۔	جنرل ہسپتال لاہور میں مائنر ورکس	۱۱,۰۰۰/-	۲۲۰/-	۱ ماہ

منجانب اعجاز احمد چودھری ایگزیکٹو انجینئر فرسٹ میڈیکل بلڈنگ لاہور

۱۶/۱۰-۱۴۷

اشتہار اخبار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی بعدالت جناب رائے محمد ظفر جٹی پی سی ایس سول جج چکوال۔

غلام قادر بنام عبدالرشید وغیرہ
دعویٰ استقرار حق

نمبر ۶۰۳ سال ۱۹۷۴ء

بنام عبدالرشید، محمد یٰسین پسران مخدوم بخش قوم آوان ساکن چکملک تحصیل چکوال (مدعاعلیہم) ہرگاہ مقدمہ عنوان بالا میں مدعاعلیہم مذکوران تعمیل سے انکاری ہیں اور روپوش ہیں، لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار ہذا مدعاعلیہم مذکوران کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بتقرر ۱۹ اپریل ۷۵ء بوقت ۸ بجے صبح عدالت ہذا میں حاضر نہ آئیں گے۔ بصورت دیگر کاروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ یکم اپریل ۷۵ء کو ہمارے دستخط و مہر عدالت سے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

بقیہ: مولانا ابوالکلام آزاد

کرتا ہے جو کہ دونوں قوموں کا تقسیم ملک ہے مگر اس کے باوجود ۱۶ مئی کی اسکیم منظور کر کے اس امر کی راہ بھی پیدا کی کہ شاید دونوں قومیں باہمی اشتراک سے رہ سکیں مگر ہندو اس پر تیار نہ ہوئے مگر تقسیم پر بضد تھے اس لئے مان لیا کہ شاید اس سے ایسا پاکستان جو نصف پنجاب اور نصف بنگال پر مشتمل ہوگا کلیۃً نہ ہو سکے گا مگر مولانا آزاد تو صوبوں کی تقسیم کے قطعی مخالف تھے ہندو کے عزائم کے قطعی خلاف تھے اس لیے بلاشبہ انہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے مسئلہ کی مخالفت کریں جس کا انہیں پورا حق ہے مگر مولانا کو سچائی کا دشمن اور ملت کا غیر وفادار ثابت کرنا درست نہیں اور بہت سی باتیں کہی جا سکتی تھیں، مگر یہ موقع اس بحث کا نہیں اس لئے بہتر ہے کہ ہم پاکستان کے تحفظ و بقا کے لیے کوشش وقف کریں جو مصائب و آلام ہیں گھبرا جانے سے گڑے ہوئے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تقسیم کے بعد اگر کسی حلقے سے پاکستان کی مخالفت ہو رہی ہے تو اپنی پوری توجہ ادھر صرف کریں اور بتائیں کیا کسی ایسے عالم دین نے بھی جو کانگریس یا مولانا آزاد سے وابستہ رہا ہے تقسیم کے بعد پاکستان کی مخالفت کی ہے؟ پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہنچایا جو پاکستان کی تحریک میں اعلیٰ مناصب رکھتے تھے یعنی اقتدار کی جنگ نے اس حال پر ملک کو پہنچایا اور اب تو ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر اس خطہ ارضی کو بچانے کیلئے اپنی مساعی وقف کر دیں۔ وقت اور حالات کا یہی تقاضا ہے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اب یہاں عملاً اس نظام کو نافذ کیا جائے جس کے لیے پاکستان بنا۔

افسوس اٹھائیس سال گزر جانے پر بھی ہم اپنے اس وعدہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان دین سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ آج غیر اسلامی نظریوں کا پرچار اس ملک میں کیا جا رہا ہے جو بنا ہی اسلامی نظریہ پر تھا۔ جس قوم نے شہید گنج کے سلسلے میں سینوں پہ گولیاں کھائیں آج اس کی حالت یہ ہے کہ بیت اللہ کے انہدام پر بھی جان قربان کرنے والے چند دیوانے ہی ہوں گے کیا اس سے قبل ملت اسلامیہ کبھی ان قبائلی، لسانی تعصبات کا شکار رہی تھی جیسی آج ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل دین و محبان وطن ہم وطنان اسلام اپنی مساعی ادھر صرف کریں تاکہ ہم منزل مقصود پر پہنچ سکیں اور پاکستان مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

۱۴ اپریل ۷۵ء

بقیہ۔ پرواز شاہین

شاہینوں کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ تیل ختم ہونے کی وجہ سے مجبوراً انہیں گلائیڈ کرنا پڑا، جو خطرات سے پُر تھا، حبیب نے اپنے ساتھی کو واپس کود جانے کا حکم دیا اور خود خطرے سے نبرد آزما ہو کر ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی سے ایک معمولی ہوائی اڈے پر طیارہ نہایت کامیابی سے اُتار لیا۔

یہ ایک فقید المثال کارنامہ تھا جو عبدالحبیب کی انتہائی خود اعتمادی اور بہادری کا مظہر ہے

۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پاکستان ایئر فورس کو جدید بنیادوں پر اُستوار کیا گیا اور فضائیہ کی ایک بہت بڑی مشقی پرواز ہوئی، جس میں طیاروں کی گنز کی جگہ کیمرے کی آنکھ نے کام کیا ——

چیف آف سٹاف نے اس مشقی پرواز کی فلم دیکھی، تو حبیب کی پیٹھ تھپتھپا کر شاباش دی کہ اُس مشق میں جتنے طیارے کیمرے کی آنکھ سے گزارے گئے ان میں حبیب کے شکار زیادہ تھے یہ فنی مہارت اور جذبۂ عمل چیف آف سٹاف کو اتنا پسند آیا، کہ وہ بہت دیر تک حیرت سے دیکھتے رہے اور اس متین نوجوان کو نظروں میں تولتے رہے، شاید وہ بھی یہی سوچ رہے ہوں، کہ خدا اس کی عمر دراز کرے، نظرِ بد سے بچائے۔

میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تو میں بھی اسے بار بار نظروں میں تولتا تھا اور سوچتا تھا کہ خدا کرے یہ بچا جیتا رہے، ہمایوں کر میں اپنے بزرگ محترم میاں عبدالباری سے ملنے گیا تو حبیب بھی اپنے نانا کے پاس آ نکلا، میاں صاحب نے بتایا یہ میرا نواسہ عبدالحبیب ہے، بہت ذہین اور متین ہے اور اسی لیے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ ذہانت واقعی اُس کی آنکھوں میں اور متانت اُس کے چہرے پر اتنی واضح تھی، کہ پہلی نظر میں اُس کے ذہین و فطین ہونے کا احساس ہوتا تھا، پھر بھی میں نے اس دس سالہ بچے سے، بچوں کی سی ہی باتیں چھیڑ دیں، جن کا وہ بڑوں کے سے انداز میں جواب دیتا رہا، کتابوں اور جلسے جلوسوں کے ماحول میں پروان چڑھنے والا یہ بچہ عمر سے پہلے ہی پختہ کار ہو گیا تھا اُس کی ذہنی بلوغت مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہی ——

مکتبہ کارواں اور چوہدری عبدالحمید نے اپنے بیٹے کو بہت کچھ دیا تھا۔

وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا، پھر تبادلہ کرا کر گورنمنٹ کالج لائلپور چلا گیا۔ وہاں بھی اُس نے محدود وقت میں اپنی قابلیت اور خوش اطواری سے اپنی ہر دل عزیزی میں اضافہ کیا، وہ بہت اچھا مقرر تھا اور اُردو انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا۔ مباحثوں میں اپنے مخالفین کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔ سنجیدہ ظرافت سے پھڑکتے ہوئے جواب اُس کے مدِ مقابل کا منہ بند کر دیتے تھے، اُس کے پرنسپل سید کرامت حسین جعفری صاحب کی تربیت نے اُس کے ذہن پر اور بھی جِلا کر دی۔

وُہ چھ سال کی عمر میں اچھا شہسوار اور نوعمری میں بھی پولو کا بہت اچھا کھلاڑی تھا اچھا کرکٹر اور سپورٹس مین تھا۔ دبی دبی سی معصوم مسکراہٹ اور ادب و شائستگی کے لیے اپنے خاندان میں مشہور تھا ——

اُس کا انداز ملاقات والدہ کے لیے بچپن سے یکساں رہا —— دُور سے جھپٹ کر آنا اور ماں کی آغوش میں چھُپ جانا۔ آخری ملاقات میں بھی وہ اچانک آیا تو دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا، سر پر اور پیشانی پر ماں سے پیار وصول کئے۔ نہ جانے اُسے کس نے آگاہ کر دیا تھا کہ ؎

اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

وہ اپنے والد کے پاس جا کر سر جھکائے کھڑا رہا کہ وہ بھی اُسے جی بھر کر پیار کر لیں، وہ پریس جا کر اپنے بھائی سے ملا، اور اپنے دوستوں عزیزوں اور ملازمین تک سے ملتا رہا، لائلپور گیا۔ تو وہاں بھی تمام اقربا سے ملا، اپنے نومولود بچے کو پیار کیا۔

اپنی مکمل شخصیت منوا کر اور اپنا مکمل خاندان بنا کر یہ تیز رو مسافر راہیٔ ملک عدم ہوا، جتنی تیزی سے اُس نے زندگی کی تمام منازل طے کی تھیں اتنی ہی تیزی سے موت کے سمندر کو پھلانگ کر حیاتِ جاوداں حاصل کر لی، وہ طیارہ جس میں وہ اپنے ساتھی کو لیے رسالپور جا رہا تھا، ہوائی اڈے سے بلند ہوا ہی تھا کہ کسی نامعلوم نقص کی بنا پر اُس کا انجن فیل ہو گیا اور وہ ایک آدھ دھماکے کے ساتھ زمین پہ آ رہا۔ اور دو معصوم جوانیوں کو خاک و خون میں لوٹا گیا ملک کے دو مایۂ ناز ماہر پرواز ملک سے چھن گئے والدین کا سکھ چین، نوجوان بیوی کی خوشیاں، جواں سال بھائیوں کا اعتماد، نوعمر بہن کا مان اور ننھے منے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ ختم ہو گیا یوں کہنے کو سب صبر و استقامت سے اس سدمۂ جانکاہ کو جھیل گئے ہیں، لیکن جو خلا عبدالحبیب کے جانے سے پیدا ہو گیا ہے، وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔

روزنامہ چٹان لاہور

بعدالت جناب آفتاب سرور کاشمیری صاحب سول جج درجہ اول جج فیملی کورٹ ورینٹ کنٹرولر سرگودھا۔

درخواست سرٹیفکیٹ جانشینی نمبر ۲۴ ۲۰۲م محمد اشرف ولد سمی محمد میکسی سکنہ چک نمبر ۶۶ سج تحصیل بھلوال۔

بنام عوام الناس

سائل نے عدالت ہذا میں درخواست بابت حصول ترکہ سمی محمد متوفی مبلغ -/۸۰۰۰ روپے گذاری ہے، لہٰذا اشتہار بنام عوام الناس جاری کیا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی عذر ہو تو مورخہ ۱۹ اپریل ۷۵ء کو پیش کرے بصورت دیگر کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جاوے گی

بثبت دستخط ہمارے مہر عدالت کے جاری ہوا۔ ۲۹-۳-۷۵

دستخط، سول جج درجہ اول

مہر عدالت

۱۴ اپریل ۷۵ء

بقیہ: اسیری کے شب و روز

یہ بھی خدا کا احسان ہے کہ میں پاکستان ریڈیو کے سوا کوئی خبر نہ سنتا تھا، اس لیے گھبراہٹ کی وہ کیفیت نہ تھی، جو دوسرے احباب کی تھی، اگر کوئی بڑی خبر سنتا بھی تو اسے افواہ قرار دے کر قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا، مگر عام رفقاء کی حالت سخت خراب تھی ہر چہرے پر گھبراہٹ اور مایوسی کا قبضہ تھا۔ زبانی طور پر اور ٹیلیفون پر ایک ہی کلمہ بار بار دہرایا جاتا:

"...اب کیا ہوگا، پاکستان کے ساتھ کیا بیتے گی، ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا"

ایک روز انجینئر رفیق صاحب گلوگیر آواز میں کہنے لگے:

"محبوب ... جب میری کوئی حسرت زندہ رہنے کی نہیں، سوائے اس کے کہ کاش میں ... والدہ کی خدمت کر لیتا"

دوسرے روز شام کو کہہ رہے تھے:

"کیا خدا مجھ جیسے گنہگار کو بخش دیگا؟"

پتہ چلا کہ رفیق صاحب نے آج سے داڑھی رکھنے اور دینی زندگی اختیار کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ میں رفیق صاحب کو خوب جانتا تھا، ان سے متعدد بحثوں اور گفتگوؤں میں بھی مایوس ہو چکا تھا اس لیے اس انکشاف سے جہاں خوشی ہوئی، وہاں حیرت بھی ہوئی۔

اُمید و بیم کے عجیب سے احساس کے ساتھ وقت آگے کی طرف رینگتا رہا، انڈین بمبار طلوع سحر سے غروب آفتاب تک لگاتار بمباری کرتے رہتے یوں لگتا جیسے وہ ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ دن کو بھی صبر کر کے ہراس نکال لیتے تھے، اسی لیے اب رات کو حملوں سے گریز کرتے۔

۱۶ دسمبر کی حزنیں صبح طلوع ہوئی، ناشتہ کیا تھا کہ سائرن سنائی دیا۔ انڈین طیارے آئے ــــ ایئر پورٹ کا چکر لگایا، اور واپس چلے گئے ہماری توپیں بالکل خاموش رہیں، بڑی حیرت ہوئی، باہر نکلے تو لوگوں کو کہتے سنا کہ ــــ سرنڈر ــــ ہو گیا ہے، خبر کا ذریعہ وائس آف امریکہ بتایا گیا۔ ہم نے اس کو افواہ قرار دیا، بازار جانا ہوا تو وہاں بھی اسی اطلاع کو گردش کرتے ہوئے پایا۔ جی اس منحوس خبر کو ماننے پر تیار نہ تھا۔ کل ہی تو جنرل نیازی نے کہا تھا:

"دشمن کو ڈھاکہ تک پہنچنے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا"

مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ معتمد ذرائع سے تصدیق ہو گئی۔ کہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور تاریخ نے ہمیں بالآخر اس منزل پر پہنچا دیا ہے، جس کی جانب ہم سالہا سال سے چل رہے تھے ــــ مشرقی پاکستان پر ہمارے ازلی دشمن بھارت کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اور اب ہم ہندوؤں کے غلام ہیں ــــ اس احساس نے کچھ دیر کے لیے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں منجمد کر دیں، مسٹر رفیق کا رادہ ہم مکان یونس صاحب نے رائے دی، کہ محمد پور چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہیے۔ مگر میرا مشورہ تھا کہ ہمیں کسی طریقہ سے چھاؤنی میں منتقل ہو جانا چاہیے، کہ میر پور اور محمد پور کا قیام ہر اعتبار سے خطرناک ہوگا۔ یہ آبادیاں علیحدگی پسند بنگالیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں اور اب وہ انتقام لیے بغیر نہیں رہیں گے ــــ ہم گوں مگو اور کشمکش و پیچ کے عالم میں تھے۔ اَن گنت سوالوں نے دل و دماغ پر بُری طرح یورش کر رکھی تھی، کہ ہمارے ایک ساتھی عاشق حسین صاحب کا ٹیلیفون آیا، وہ کہہ رہے تھے:

"آرمی سگنل والوں نے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ٹی اینڈ ٹی سٹاف (ٹیلیفون اینڈ ٹیلی گراف سٹاف) کو کہا ہے کہ وہ چھاؤنی پہنچنے کی کوشش کریں"

ہم نے جلدی جلدی ضروری سامان باندھا، رفیق صاحب کو فون کیا وہ گلے کی وین لے کر آ گئے اور ہم بڑی عجلت کے ساتھ چھاؤنی کی طرف چل دیئے۔ فارم گیٹ کے قریب پہنچے تو بہت سے لوگ جمع تھے اور جائے بنگلہ کے نعرے لگا رہے تھے، ایئر پورٹ پر ایک ٹرک سے مکتی باہنی کے رضا کار اُتر رہے تھے، ہمیں دیکھ کر انہوں نے باآواز بلند مغلظات بکیں۔ پی آئی اے اڈے کے قریب ہم نے پہلی مرتبہ بھارتی فوج کے سپاہی دیکھے گہری سبز وردی تھی، سکھ سپاہی تو دُور سے پہچانے گئے، دل میں خوف نے انگڑائی لی۔ مگر ہم اللہ کا ذکر کرتے، دعائیں مانگتے، آگے بڑھتے گئے۔ چھاؤنی کے گیٹ میں داخل ہوئے تو کچھ اطمینان آیا

(باقی آئندہ)

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب آفتاب سرور کاشمیری صاحب سول جج درجہ اول، جج فیملی کورٹ ورینٹ کنٹرولر سرگودھا

دعویٰ یا اپیل دیوانی نمبر ۱۷۰ ۷۴

منظور احمد بنام رسولاں

دعویٰ حقوق زن شوئی

بنام: رسولاں دختر ممند زوجہ منظور احمد قوم موچی۔ سکنہ لوے تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسماۃ مدعا علیہا مذکورہ تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتی ہے اور روپوش ہے، اس لیے اشتہار ہذا بنام مدعا علیہا مذکورہ جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہا مذکورہ تاریخ ۲۸ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء کو مقام سرگودھا حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگی، تو اس کی نسبت کاروائی یک طرفہ عمل میں لائی آوے گی۔

آج بتاریخ ۲۹ ماہ مارچ ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج درجہ اول

(مہر عدالت)

ہفت روزہ
چٹان
لاہور
ایڈیٹر
شورش کاشمیری

جلد ۲۸ —— شمارہ ۱۶
۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء
قیمت —— ایک روپیہ

اقبال کی فکری ذہانت کے سیاسی مجاور

روح اقبال سے غداریوں کی روداد

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۲۵ برس کے لگ بھگ انگلستان میں رہ کر ابھی حال ہی میں واپس آئے ہیں۔ چونکہ آپ کو مسلم لیگ کی تنظیم کے پہلے دور میں علامہ اقبال سے نیاز حاصل رہا اس لیے آپ لیگ کی حد تک بعض تاریخی نوعیت کے واقعات سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ آپ نے انگلستان کے فاضل اجل پروفیسر آربری سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس خیال کے تھے کہ "پاکستان سے اقبال کو حذف کر دیں تو اس کی حیثیت ایک صحرا کی ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے فکر و نظر کی معراج اقبال ہے۔" اس اقبال کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا؟ اقبال ہی کا ایک مصرع شاید اس صورت حال کے لیے موزوں ہے کہ:

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اقبال کو پاکستان میں عوامی تحریک بنانے کی حد تک فی الواقعہ مرکزی مجلس اقبال نے ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک اپنے بے پناہ جذبہ و ارادت کا ثبوت دیا ہے اور بلاشبہ اقبال کی گونج آج ہر ذہن میں موجود ہے۔ اقبال سے متعلق بزم اقبال لاہور نے دوست پیعدی کی رو میں مفید لٹریچر کم ہی شائع کیا ہے لیکن اقبال سے نسبت ضرور قائم رکھی ہے۔ اقبال اکیڈیمی کراچی نے لاہور کی بزم اقبال کے مقابلہ میں علمی یا سوانحی سطح پر اچھا کام کیا ہے۔ لیکن ہم ان دونوں اداروں سے اقبال کو ایک تحریک بنانے کی توقع کریں تو یہ ہمارا سوء ذہن ہوگا۔ سرکاری ادارے تحریکوں کے لیے نہیں بلکہ اس سے مختلف مقاصد کے تحت کام کرتے ہیں۔ مارشل لا کے آخری ایام تک مرکزی حکومتوں نے یوم اقبال کی قومی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بعض حکمران اقبال سے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ خواجہ شہاب الدین جن دنوں بزمانہ لیاقت علی وزیر داخلہ تھے تو یوم اقبال کی چھٹی کے سوال پر فرمایا تھا کہ مشکل ہے۔ کیونکہ کل کلاں جگر مراد آبادی یا نذر الاسلام کی چھٹی کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اُن کا یہ مفروضہ غلط تھا بلکہ طفلانہ۔ جگر مراد آبادی پاکستان کے شہری نہ تھے اور اقبال سے انہیں وہی نسبت تھی جو خود خواجہ صاحب کو قائد اعظم سے تھی۔ رہ گئے نذر الاسلام تو وہ کبھی ملّی شاعر نہ تھے۔ جوش ملیح آبادی کی طرح کے ایک شاعر تھے، لیکن پاکستان میں نہیں رہے۔ آخر تک کلکتہ ہی میں قیام کیا۔ گویا یوم اقبال کے سلسلے میں حکمرانوں نے یحییٰ خاں کے دور تک یہی روش اختیار کئے رکھی کہ اس کا چرچا کرو۔ لیکن اس نے جو کہا تھا اس سے غافل رہو۔ اور عوام کو غافل رکھو۔ اب یہ پہلا موقعہ ہے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے یوم اقبال کی تعطیل کا اعلان کیا ہے۔ حکومت پنجاب نے تو چھٹی گزٹ کر دی ہے۔ لیکن باقی صوبوں یا مرکز کی طرف سے ابھی اعلان نہیں ہوا۔ وزیر اعظم بھٹو نے اقبال کا جشن صد سالہ منانے کے لیے ایک کمیٹی بھی قائم کر لی ہے جو ۱۹۷۷ء میں اقبال کے سو سال منائے گی اور اس سلسلہ میں اُمید کی جاتی ہے، بہت کچھ ہوگا۔ ہماری اطلاع یہ بھی ہے کہ وزیر اعظم بھٹو یوم اقبال کے سلسلہ میں لاہور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بہرحال اقبالؒ سے متعلق بعض سرکاری دانشوروں کی ذہنی آلائشوں کے باوجود ایک تحریک پیدا ہو چکی ہے۔ نقص یہ ہے کہ پیشہ ور اہل قلم تو سرکاری تقریبوں سے مستفید ہونے کے لیے بے تاب ہیں لیکن جو لوگ اقبال کے متعلق کوئی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں یا جنہیں اقبال کی اسلامی فکر سے کوئی لگاؤ ہے اور فی الحقیقت وہ تعلیمات اقبال سے متعلق قوم کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ اُن کے لیے بعض دوائر کی فضا کچھ زیادہ خوشگوار نہیں۔

اقبال کو سب سے زیادہ نقصان اُن سیاسی کوتاہ فکروں نے پہنچایا ہے جو اقبال کو ایک حزبی شاعر گردان کر اُس سے متعلق رطب و یابس لکھتے اور اس کی شاعری کے آفاقی پیغام کو اپنی سیاسی مصلحتوں کی نذر کرتے ہیں۔ گو اس قسم کے لوگ زیادہ نہیں ہیں اور نہ ان کی آواز میں کوئی توانائی

ہے ۔ تاریخ ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہے ۔ اپنے ذہنی انحطاط کو اقبال سے منسوب کر کے اس طرز کے لوگ بالا بلند نہیں ہو سکتے ۔ اس مرفوع القلم کیمپ کا نظر انداز کیا جانا ہی بہتر ہے ۔ اصل سوال یہ ہے کہ اقبال نے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جن بنیادوں کو مدار بنایا اور جس لہجہ میں خطاب کیا ، ہم اس سے کہاں تک مخلص ہیں ۔ ہماری سب سے بڑی ویرانی یہ ہے کہ ہم نے اقبال کے سوانح و افکار میں اخلاص نہیں برتا ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے گوشے ادھورے ہیں اور افکار اقبال سے متعلق کئی ایک تشنگیاں ہیں ۔ جو لوگ اقبال کے نام پر اپنے کیسہ ہائے زر بھر رہے یا اپنے شکم مبارک کے لیے سرکاری مطبخوں سے سامان خورد و نوش حاصل کرتے ہیں ۔ وہ اپنے ضمیر کی سچائی سے کام لیں اور بتائیں کہ اُن کی مطبوعات میں اقبال سے متعلق کونسی کتاب معیاری ہے ؟ اور اقبال کے بنیادی موضوعات میں وہ کونسا موضوع ہے یا اُن کی تعلیمات کا وہ کونسا حصہ ہے ؟ جس سے متعلق اُن کے ہاں سے فلاں کتاب آئی ہے ۔ ایک دو کتابوں کی بنیادی اہمیت کا ہم اعتراف کرتے ہیں لیکن اقبال کے پاکستان میں اقبال سے متعلق کوئی نمائندہ کتاب نہیں ۔ ان کی فکر سے اغماض کیا گیا یا اُن کی تعلیم سے بہ مصلحت روگردانی کی گئی ہے کہ اقبال مسلمانوں کے اذہان میں بار پا کر روایتی دانشوروں کے سیاسی فکر کی موت کا باعث نہ ہو ۔ اس سے بڑھ کر اقبال کے خلاف ہذیان گوئی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ یورپ کے فلاں فلاں حکماء سے متاثر تھا ، وہ اشتراکیت کا حامی ہو گیا تھا اور مغرب پر اُس کی تنقید ضیا کا اُبال ہے ۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی کتابیں سرکاری ذہانت کے نگار خانوں سے نکلی ہیں ۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ڈاکٹر یوسف حسین کی روح اقبال ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نقوش اقبال مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل اس معیار کی تصنیفات ہیں کہ ہم ابھی ان کی قامت کے نصف کو بھی نہیں پہنچ سکے ہیں ۔ ان بزرگوں کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور اور بعض دوسرے فضلا نے اقبال کی فکر و سیرت پر جو مقالے لکھے ہیں وہ اقبال سے متعلق گنج شائگاں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اقبال سے اپنے ذہن کے مطابق سیاسی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اُن کے فکری خزانوں کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے ۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

پنجاب یونیورسٹی ۔ نئی پود کی دشمن

ہم پنجاب یونیورسٹی کی افسوسناک بدعنوانیوں اور تبدیل شدہ ایجوکیشن سیکرٹری کے عہد کی بعض طرح داراداؤں سے متعلق ایک سلسلۂ مضمون شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ چھیڑ چھاڑ ہم اس لیے نہیں کرتے کہ اس سے مسئلہ حدود میں نہیں رہتا بلکہ زیر و زبر ہو کر ذاتی دشمنی ہو جاتا ہے ۔ ہمارے نزدیک محکمۂ تعلیم نے بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ بعض نامور اساتذہ کو صرف اس جرم میں اِدھر اُدھر کر دیا ہے کہ انہیں سیاسی طور پر سزا دینا مقصود تھا اُسی کا نتیجہ ہے کہ تعلیم کا معیار فروتر سے فروتر ہوتا جا رہا ہے اور طلبا تعلیم سے کہیں زیادہ سیاست کے رسیا ہیں ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکنڈری بورڈ سے لے کر یونیورسٹی تک کے جملہ امتحانات نئی نسلوں کے لیے قتل عمد کا باعث ہو رہے ہیں ۔ اس سال بی اے کا نتیجہ ۲۵ فیصد رہا ، ۷۵ فیصد طلبا ناکام ہوئے ۔ اوّل تو بی اے کے امتحانات ہی چار ماہ تاخیر سے ہوئے تھے ۔ پھر نتیجہ ۶ ماہ بعد سامنے آیا گویا ایک سال نئی نسلوں کا اس طرح ضائع ہو گیا ۔ اب ذرا غور کیجئے کہ جو ۷۵ فیصد طلبا ناکام ہوئے ہیں اُن کے دلوں پر کیا گزر رہے گی ؟ اُن کا مستقبل کیا ہو گا ؟ اُن کے والدین کس پریشانی کا شکار ہوں گے ۔ اس ملک میں عام آدمی کی عمر کیا ہے ۔ نوکری کس عمر سے ملتی اور کس عمر تک جاتی ہے ۔ پھر جو طلبا فیل ہوئے ہیں کیا انہیں حکومت کے خلاف سیاسی طور پر بدگمان کرنے کی سازش نہیں ۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جس پر ہم اصرار کرتے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پنجاب یونیورسٹی اس کے کار پرداز اور اُس کے ممتحن نئی پود کو اپنی عقل کی کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں ۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں در پردہ حقائق کا ایک انبار ہے ۔ ہم اس پر غور کر رہے ہیں ۔ ہمارے ذہن نے اتفاق کیا تو ہم کسی رو رعایت کے بغیر حقائق کی چہرہ کشائی کریں گے لیکن ایک سوال ہمارے لیے پہلی سے کم نہیں کہ جن لوگوں کو بی اے کے طلبا کا ممتحن مقرر کیا گیا کیا وہ امتحانی قواعد کے مطابق اس کے اہل تھے ؟ یا طلبا کے پرچے بے معیار ممتحنوں پر دوست نوازی کے تحت تقسیم کیے جاتے اور نااہلوں کو اس طرح سامان خورد و نوش مہیا کیا جاتا ہے ۔

نفع خوروں کا استحصالی فرض

گزشتہ سے پیوستہ ہفتے حکومت نے آٹا پیسی اور گھی کے نرخوں میں اضافہ کر کے عوامی اعتبار سے سیاسی میدان میں ایک ہلچل پیدا کر دی ۔ اب تصویر کے دونوں رُخ سامنے آ چکے ہیں ۔ حکومت کہتی ہے کہ اُس کو ملکی دفاع کے لیے زیادہ سے زیادہ روپے کی ضرورت ہے ۔ عوام اپنے دفاع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن بے زری کے ہاتھوں مجبور ہیں ۔ اُن میں یہ مقدرت ہی نہیں کہ گرانی سے نپٹ سکیں ۔ گرانی بہر حال گرانی ہے عوام میں گرانی کے دن اور گرانی کی راتیں گزارنے کی ہمت نہیں اور ہمت کیونکر پیدا ہو جب کہ قوت خرید انتہائی ضعیف اور انتہائی کا خرچ ہے ۔ ہم نے پچھلے دنوں

میں بھی لکھا تھا اور اب پھر عرض کرتے ہیں کہ انسان کی غذائی ضرورتوں کے متعلق بالائی طبقے کے ذہن سے سوچنا غلط ہے۔ عوام کے ذہن سے سوچیے کہ اُن پر کیا گزر رہی ہے۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی عوام دوستی پہ ناز ہے اور وہ اپنے اس فقرے کو بارہا دوہرا چکے ہیں کہ وہ عوام میں سے ہیں اور عوام کے لیے ہیں۔ اپنے حالیہ دورے میں بھی انہوں نے کما حقہ دیکھا ہے کہ عوام اُن کے لیے کیونکر آتے اور لائے جاتے ہیں۔ انہیں عوام کی اس تڑپ کا اندازہ کرنا چاہیئے کہ عوام کی اس بے چینی کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑی خرابی اُن تاجروں اور دوکانداروں کی ہے جو عوام کے احتجاج سے بے پرواہ اور خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اندھا دھند نفع کمانے کی دوڑ میں ہر چیز کی گرانی اپنا استحصالی فرض سمجھتے ہیں۔ اگر زراندوزی کی دوڑ کچھ عرصہ کے لیے ختم کر دی جائے اور لوٹ کھسوٹ رُک جائے تو عوام کی پریشانی کا وہ سیلاب ٹھہر سکتا ہے جس سے اس وقت پورا ملک دوچار ہے۔ حکومت نے اس سلسلے میں دو آرڈی نینس نافذ کئے ہیں جس سے گراں فروشی کا تدارک مقصود ہے۔ اس سلسلے میں قیمتوں میں ناجائز اضافہ ناقابلِ ضمانت جرم قرار دیا اور گراں فروشوں کے خلاف موقع ہی پر سماعت و سزا کے مجسٹریٹوں کو اختیار دے دیئے گئے ہیں۔ اگر ہم میں خدا کا خوف ہوتا تو اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ لیکن ایک طرف ہم بھائی بھائی ہیں اور دوسری طرف اپنے بھائیوں کا خود ہی گلا کاٹتے ہیں۔

سیاست کا غازہ

نیپ کا مقدمہ سپریم کورٹ میں باقاعدہ شروع ہو گیا ہے۔ ۱۲ اپریل کو فل کورٹ نے باقاعدہ سماعت کے لیے ۲ جون کی تاریخ مقرر کی ہے۔ اس سلسلے میں فاضل چیف جسٹس نے ملک بھر کے اخبارات اور ریفرنس کے فریقین کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں نہ رائے زنی کریں اور نہ کوئی بیان جاری کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدمہ ملک کی سب سے بڑی عدالت میں جا چکا ہے اور پوری قوم کو ذہنی طور پر اس کا انتظار ہے۔ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے بارے میں کچھ کہنا خارج از بحث ہے، عدالت ہی میں معلوم ہوگا کہ اس کا رویّہ کیا ہے۔ اس کے رہنماؤں میں سے کوئی شخص باہر نہیں تمام جیل خانوں میں ہیں۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو افغانستان سے متعلق جو خط لکھا ہے اس میں یہ بات بالتصریح موجود ہے کہ نیپ سے متعلق سپریم کورٹ جو فیصلہ کرے گی اُسے قبول کیا جائے گا۔ اتنی بات تو ریفرنس کی ہے اُدھر بلوچستان کے وزیر اعلیٰ غلام قادر لسبیلا نے ایک بیان میں ان خبروں کی تصدیق کی ہے کہ اُن کی نیپ کے رہنماؤں سے بات چیت ہوئی ہے اور اُن کے تعلقات کالعدم نیپ کے ارکانِ اسمبلی سے نہایت دوستانہ ہیں۔ جام صاحب کے الفاظ ہیں کہ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور ہمارا تعلق بھی ایک ہی صوبے سے ہے۔ اُدھر سپریم کورٹ میں مسٹر یحییٰ بختیار اٹارنی جنرل نے بتایا کہ کالعدم نیپ کے منجمد فنڈ واگزار کر دیئے جائیں گے۔ وزیر اعلیٰ بلوچستان اور اٹارنی جنرل کے بیانات سے ایک چیز ضرور مترشح ہوتی ہے کہ اُن کے ذہنوں پر خان عبدالقیوم خاں کے افکار کا سایہ نہیں بہرحال سوال سپریم کورٹ کے فیصلے کا ہے اور وہ فیصلہ ملک کے آئینی ضمیر کو ہر لحاظ سے قبول ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ استدعا رکھنے میں ہم کہاں تک حق بجانب ہیں۔ بہرحال سپریم کورٹ میں خان عبدالقیوم خاں کا پیش ہونا یا طلب کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔

لمحۂ فکریہ

سرکاری ملازم سیاسی کارکنوں کا بدل نہیں

○ —— غلط تجربے غلط نتائج پیدا کرتے ہیں

ہم نہایت شرح صدر کے ساتھ اپنے اس تاثر یا اپنے اس احساس کو قلم کی نوک پہ لا رہے ہیں کہ اس عوامی دور کی بعض چیزیں ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار کے پہلے ہی دن جس اعتماد کے ساتھ بعض بڑی بڑی توپوں کو سبکدوش کیا اُس کے بعد افسروں کی ایک بہت بڑی کھیپ نکالی پھر صوبائی حکومتوں نے جھاڑ دپیری تو ہم نے اُس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اُس سیاسی لہر میں بعض سچے لوگ بھی سبکدوش ہو گئے لیکن اس اقدام میں بیوروکریسی کے لیے ایک انتباہ تھا کہ تم نے سیاسی زندگی کو جس بری طرح گدلا کیا تھا یہ اُس کا ردِ عمل ہے، تمہیں محسوس کرنا چاہیئے کہ سیاست حکام کی داشتہ نہیں عوام کا مہر ہے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ایک واقفِ حال کی حیثیت سے ہم قلم اُٹھانے کا ارادہ رکھتے تھے چونکہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر قومی نہ تھا اس لیے ہم نے اس کو زیادہ اہم نہ سمجھا لیکن افسر شاہی کی اس بھرپور چھانٹی کے بعد سرکاری ملازمت بسنت کی پتنگ ہو کر رہ گئی کیونکہ ایک بڑے سے بڑے تھل کو دو پیسے کی گڈی کاٹ سکتی اور نامور سے نامور کھلاڑی منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ انتظامیہ کے تمام شعبوں کو اپنے وجود پر اعتبار نہیں رہا اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازم اس تصور سے خوفزدہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی بینی دوگوش نکالا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں ہمارے سامنے ہیں لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر

کیونکہ ہمیں کسی فرد سے کوئی شخصی دلچسپی نہیں سرکاری ملازمت میں تذبذب کی اس حالت نے دو چیزیں پیدا کی ہیں ایک یہ کہ تمام افسر اور تمام ملازم حکمران جماعت کے اشارۂ ابرو پر رقص کرتے ہیں دوسری یہ کہ بعض شعبوں کے اہل کار دونوں ہاتھوں سے مال لوٹنے میں جتے ہوئے ہیں ایک افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ جن شعبوں میں کبھی سیاسی مداخلت کا تصور ہی نہیں تھا اُن سے بھی سیاسی شطرنج پر نردوں کا سلوک ہو رہا ہے مثلاً تعلیم اور صحت کے محکمے ہیں ان میں ایک وحشیانہ قسم کی بدنظمی پیدا ہو چکی اور سیاسی اعتبار سے چوگان بازی ہو رہی ہے چٹان کی یہ خصوصیت ہے کہ ضلعی انتظامیہ کے عزل و تقرر پر کبھی رائے زنی نہیں کرتا۔ یہ چیزیں حکومت کی اپنی ہوتی ہیں اور وہ ان کے مضمرات کو سمجھتی ہے لیکن ہم سیاسی طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ حکمران جماعت اپنی عوامی سرگرمیوں کو انتظامیہ کے ہاتھ میں دے کر ایک بہت بڑی سیاسی غلطی کی راہ پر چل نکلی ہے کیا ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اُس کے سامنے بیوروکریسی کی تاریخ نہیں؟ اُس کا مزاج نہیں اُس کی فطرت نہیں، جس کھیپ کو ایک سیاسی جماعت نے اُتھل پتھل کیا اور اُس کو اپنی ملازمت پر بھروسہ نہیں رہا اُس کھیپ سے سیاسی کام لینا انسانی ذہانت کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظامیہ بالخصوص پولیس حکمران سیاسی جماعت کے خلاف رائے عامہ کو مشتعل و منظم کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ تماشا یہ ہے کہ غلطی یا بغیر غلطی۔ جس

تیزی سے ضلعی افسر تبدیل کیے جاتے ہیں اُن کے دل میں غبار پیدا ہوتا اور وہ اُن کے حلقۂ احباب سے نکل کر عوام کے ذہنوں میں قصے بن جاتا ہے مثلاً پچھلے آٹھ دس ماہ سے لاہور میں پولیس کے بہت سے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خان محمد اصغر خاں سے پہلے لاہور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لائل پور رخصت کیا گیا تو وہ بجا جواز تھا۔ پھر خان محمد اصغر خاں آئے اُن سے بدقماش عناصر کے حوصلے ٹوٹ گئے لیکن اندرخانہ کی چپقلش نے گُل کھلایا اور وہ برلئے وزن بیت ڈی۔ آئی۔ جی ہو کر کوئٹہ بھیج دیئے گئے اُن کے ساتھ ہی سردار وکیل خاں کو لاہور ڈویژن کی ڈی، آئی جی شپ سے ہٹا کر انٹیلی جنس بیورو کے مرکزی دفتر اسلام آباد میں بھیج دیا گیا۔ ان کی روانگی کے ساتھ ہی پولیس کا انتظامی چولا بدلا اور ضلع لاہور ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اُن کے ہمراہ پانچ سپرنٹنڈنٹ پولیس کر دیئے گئے، ایک عیسائی نوجوان مسٹر دلشاد نجم الدین کو لاہور کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس بنایا گیا لیکن ابھی دو ماہ گزرے ہوں گے کہ انہیں بھی تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان کی جگہ آغا رضا علی وارد ہوئے ہیں نجانے کب تک رہیں؟ عمر اُن کی اکسٹھ برس ہے ریٹائرمنٹ سے قریب ہیں۔ ممکن ہے کوئی کارنامہ دکھا دیں تو ملازمت میں توسیع ہو جائے۔ خدا گواہ ہمیں کسی سے کوئی مثبت یا منفی دلچسپی نہیں لیکن اس طرز کے تبادلے کوئی خوشگوار اثر قائم نہیں کرتے بلکہ کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبانوں کو افسانہ آرائی کا مواد مہیا کرتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں آدمی کو فلاں جگہ لگا دیا فلاں آدمی کو فلاں جگہ سے ہٹا دو۔ ہم جانتے ہیں اس کا الٹا اثر ہوتا ہے اور بعض اوقات اُن لوگوں کو تقویت پہنچتی ہے جن کے متعلق منفی رائے دی جاتی اور اُن لوگوں کا تنزل ہوتا ہے جن کی تائید کی جاتی ہے۔ ہمارا

باقی صفحہ ۳۳ پر

از ڈاکٹر سید عبداللہ

چند مشورے

قومی اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کی خدمت میں

مرکزی حکومت کی قائم کردہ اقبال کمیٹی کا ایک اجلاس ... ۷۵ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے زیر صدارت گورنر ہاؤس لاہور میں ہوا، اس میں ذیلی کمیٹیوں کی منظور کردہ تجاویز پر غور رہا، اور بہت سے فیصلے ہوئے۔

یہ مقام مسرت ہے کہ اقبال کمیٹی نے علامہ کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں سرگرمی اور مستعدی کا اظہار کیا ہے یہ امر بھی لائق اطمینان ہے، کہ ... کو شایان شان منانے کے لیے جو خاکہ مرتب ہے، وہ کافی وسیع الاطراف ہے، امید کی جاسکتی ہے کہ اگر اس ڈھانچے میں مناسب رنگ بھر دیا گیا اور اس سارے پروگرام کی روح درست رہی تو ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت علامہ کی صد سالہ تقریب شایان شان ... ہوگی۔

پروگرام میں تصنیف و تالیف، اشاعت ... کے ... کی تقریبات، فلمیں اور تمثیلات ... کانگرس، مقابلے، انعامات و اعزازات ... اقبال اور اقبال اکیڈمی کا مسئلہ شامل ہے اور ... سے اتفاق کیا جائے گا کہ ۱۹۷۷ء میں ایک ... شایان شان تقریب کا اہتمام ہو رہا ...

... یہ ... ہے کہ تقریب اقبال ...

اس کی غایتوں کے بارے میں کامل تیقن اور یک جہتی ہو، ورنہ عین ممکن ہے، کہ سارا پروگرام اپنے تقاضا غایتوں کے بارے میں بے یقینی اور عقائد اساسی کے سلسلے میں ضعیف الاعتقادی کے باعث خود اپنی داخلی کمزوریوں کی بدولت بے اثر کھوکھلا اور بے مقصد ہو کر رہ جائے۔

اصولی طور سے جو تجویزیں اقبال کمیٹی کے اجلاس میں منظور ہوئیں، ان پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اصولی تجویزوں کی تفصیلی نوعیت پر مزید گفت گو کی ضرورت اب بھی ہے اس لیے مناسب ہوگا، کہ کچھ گزارشات اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کے غور کے لیے پیش کر دی جائیں۔ تاکہ پروگرام مکمل اور اصولاً درست ہو جائے۔

غرض و غایت

سب سے پہلے ان اغراض و مقاصد کا معاملہ سامنے آتا ہے، جن کے لیے، پروگرام تجویز ہوا ہے۔ یہ پروگرام کمیٹی کے سامنے تقریباً اس انداز کے طور پر مطبوعہ صورت میں پیش ہوا تھا اور اس میں مقاصد اور اساسیات کا ذکر کہیں جگہ آیا ہے۔

صفحہ ۵ پر درج ہے کہ ادبی پروگراموں کا مقصد یہ ہونا چاہیے، کہ اقبال کو انسانیت نواز (...) آفاقی ... پسند ... اور مسلم شاعر کے طور ...

اسی صفحے پر اقبال پر مزید ریسرچ کے ... کچھ موضوعات تجویز کیے گئے ہیں، وہ ... لغات اقبال، مشرق و مغرب کے معاصرین اقبال کی نظر میں، اقبال اور پاکستان، اقبال اور اسلام، اقبال اور قومی دعوت، جاوید نامہ کا تجزیہ ... کی سرگذشت فلاسفی اقبال کے سیاسی نظریات ... قرطبہ کا تجزیہ۔

صفحہ ۶ پر بچوں کے پروگرام میں جن ... پر زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں، محنت کی برکت ... محنت کی عظمت، مسلم اتحاد پر زور اور ...

صفحہ ۰ پر تقریب کے موقع پر ... کی ... کے سلسلے میں جو موضوعات تجویز کیے گئے ہیں ... ہیں ——— اقبال مصور پاکستان، ... کا علمبردار اقبال، اقبال ایک عملی مفکر ... اور اشتراکیت کا علمبردار تھا، اقبال ... تیسری دنیا کی تحریک کا اولین داعی۔

صد سالہ تقریب کے سلسلے میں ... پر زور دیا گیا ہے اور یہ مقصد بھی ... مناسب ہیں، لیکن اقبال کے کلام ... سے آگاہ ہر شخص اتفاق کرے گا کہ ... تو مکمل ہیں، وہ اقبال کے سوا ... میں نے آئینہ رسالے میں کلام اقبال ... اس نقطہ نظر سے کیا تھا کہ کلام اقبال ... کی تقابلی نسبت کیا ہے، اس نتیجہ پر ... اگر کلام کو ایک ... فرض کر لیا جائے تو ... اسلام ... اس کی ...

[illegible] اصطلاحات انسانیت پسند وغیرہ وغیرہ سے
[illegible] اگر اس میں قرآن مجید کے حوالوں کے مطابق
[illegible] لکھ لیے جائیں تو ۰۰ فیصد ہو جاتے ہیں اور
[illegible] مصطفیٰ کے عدد ملا کر تحریرات اقبال (اردو
فارسی، انگریزی) میں ۸۰ فیصد اسلام ہی اسلام ہے
اس صورت میں صد سالہ تقریبات اقبال کے
خاکے سے اسی لفظ کا غائب ہونا جو یقیناً نادانستہ
ہے، ناانصافی بھی ہے اور روحِ اقبال (اور روح
تاشقند) کے ساتھ زیادتی بھی۔
میں کہ اس عوامی آ ناکہ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ
ناقابلِ فہم ہیں [illegible] کے معتقد یا شارح تھے
کے پہلے پیغامِ اسلام کو انسانیت کے لیے
[illegible] امید سمجھتے تھے یا اقبال عاشقِ رسولؐ تھے
یا اقبال کی نظر میں اسلام کا نظریہ عدل و مساوات
سب سے اعلیٰ ہے، تو ایسے اقرار و اعلان و تبلیغ
میں قباحت کیا ہے؟
اگر ان تجاویز میں کہیں کہیں لفظ مسلم موجود
نہ ہوتا تو کچھ ایسا گمان ہوتا کہ ہم عاشقِ رسولؐ و
اسلام اقبال کی صد سالہ تقریب نہیں منا رہے
کسی رابرٹ اوون یا پرودھون کی منا رہے ہیں،
اقبال کے اصل پیغام پر پردہ ڈالنے سے آخر فائدہ
کیا ہوگا؟
اسی طرح اقبال سے بڑھ کر تمدنِ مغرب کا
دشمن اس صدی نے کوئی پیدا نہیں کیا، اقبال
مغربی استعمار کے بھی دشمن تھے اور مغربی معاشرت
کے بھی۔ تعجب یہ ہے کہ یہ پہلو بالکل غائب
ہو گیا ہے۔
بعض لوگ اقبال کو ہیومنسٹ (انسانیت نواز)
کے روپ میں دیکھ کر شاید خوش ہو رہے ہیں،
لیکن مقامِ افسوس یہ ہے کہ ہم مغربی اصطلاحات
کی معنویت سے آشنا نہیں، ہم ان کے کسی
خوبصورت رخ کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں، ہیومنزم

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہیومنزم اپنی
ابتدا میں ایک معصوم سا مسلک تھا جو انسان
سے ہمدردی اور اس کے معاملات سے
دلچسپی پر یقین رکھتا تھا۔ لیکن بے خدا نہ تھا لیکن
رفتہ رفتہ یورپ میں مادیت کی ترقی کے باعث
اس کے معنی اب یہ ہیں۔ کہ انسان ہی انسان کی
مدد کر سکتا ہے۔ خدا انسانیت کے لیے کچھ نہ
کر سکا، بلکہ یوں کہیے کہ جب خدا موجود ہی نہیں
تو مدد کیا کرے گا۔ اسی طرح اس مسلک کی
آخری صورت میں خود مذاہب اور انبیائے کرام
کا بھی کوئی مقام نہیں۔ جدید ہیومنزم کی اساس
کاملاً مادہ پرستی پر ہے، پس ایسے خطرناک
یا کم از کم مبہم اور ذو معنی لفظ کو اقبال پر چسپاں کرنا
مناسب معلوم نہیں ہوتا۔
اسی طرح یونیورسلسٹ (آفاقیت پسند)
کی اصطلاح ہے، یہ بھی بظاہر بے ضرر
ہے، لیکن مبہم ہے، آفاقیت پسندی ایک نقطۂ نظر
ہے، جس کے معنی یہ بھی ہیں، کہ کوئی شخص ساری
دنیا کے انسانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھتا
اور انہیں برابر ہمدردی کا مستحق سمجھتا ہے۔۔
۔۔۔۔۔۔ یہ اس کے اچھے معنی ہیں لیکن
آفاقیت پسندی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مذہب و
ملت کی قید سے بے نیاز، ہندو مسلم یہودی عیسائی
سکھ پارسی، بلکہ مسلم غیر مسلم سب کو (ہر ملک
ہر خطے کے مسلموں غیر مسلموں کو) ایک نظر سے
دیکھتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس کی یہ دوسری صورت قبول
نہیں کی جا سکتی، یہاں پھر تعجب کا اظہار کرنا پڑتا
ہے کہ اسلام کی آفاقیت کا بھلا اظہار کیوں مناسب
نہیں کیا جاتا۔
اس وقت آفاقیت کے علمبردار تین نظام
ہیں۔ (۱) اسلام (۲) عیسائیت اور (۳) اشتراکیت
ان تینوں نظاموں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے

یقیناً اسلام کا نظام مکمل قابلِ عمل اور درست ہے
لیکن محض تیسرے نظام کی اصطلاح کو منتخب کر کے
اسے اقبال پر چسپاں کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا
۔۔۔۔۔۔
میری درخواست ہے کہ اقبال کو انسانی اخوت
کا علمبردار کہا جائے، مگر ان معنوں میں جن میں اسلام
نے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ محض یونیورسلسٹ
کہنے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اقبال کسی مغربی چھاپ
کے آفاقی ہیں، اسلام کا واضح طور سے حوالہ لانے
میں کوئی قباحت نہ تھی۔
اسی طرح کہا گیا ہے کہ تقریبات میں اقبال کو
ایک مسلم شاعر کے طور پر پیش کیا جائے۔ بظاہر اس
میں بھی کوئی قباحت نہیں، کیونکہ اقبال افضل المسلمین
تھے، لیکن ابہام اور ذو معنی ہونے کا پہلو یہاں بھی
موجود ہے۔ مسلم شاعر اور اسلام کا شاعر دو ترکیبیں اگر
ہمارے سامنے رکھی جائیں۔ تو بڑی آسانی سے دونوں
کا فرق نظر آ جاتا ہے۔ مسلم شاعر وہ بھی ہو سکتا ہے
جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم
نام رکھتا ہے اور مسلمانوں کے رجسٹر میں اس کا نام
درج ہے خواہ وہ اپنی شاعری میں اسلام کی کامل
تخریب ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ اسلام کے شاعر سے
لازماً مراد یہ ہے کہ یہ شاعر اسلامی اقدار و عقائد
پر زور دیتا ہے۔ اقبال مسلم شاعر بھی تھے اور
اسلام کے شاعر بھی ۔۔۔۔۔۔ لیکن ہر مسلم
شاعر ضروری نہیں، کہ اسلام کا شاعر بھی ہو، جس
طرح اسلامی کلچر اور مسلم کلچر میں فرق ہے اسی
طرح مسلم شاعر اور اسلام کے شاعر میں فرق ہے
میرا خیال ہے کہ یہ بھی نادانستہ ہوا ہے
ورنہ مراد اسلام کا شاعر ہی ہے ۔۔۔۔۔۔ لیکن
اگر اسلامی اقدار کا شاعر لکھ دیا جاتا یا اب بھی لکھ
دیا جائے تو اس سے وضاحت ہو جائے گی۔
اور ہم اس بدگمانی سے بچ جائیں گے کہ ہم نے

باقی صفحہ ۲۹ پر

سہیلی بوجھ پہیلی

○ ———— ڈکٹیٹر کون ہوتا ہے

○ ———— اکی سولہ بنیادی خصوصیتیں

○ ———— ادب، صحافت، تاریخ کا چہرہ نما

اس سال کے آغاز یعنی جنوری میں مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور نے ایوب خانی دور کے آخری وزیر قانون جناب سید محمد ظفر کی ایک کتاب "ڈکٹیٹر کون" شائع کی ہے۔ سید صاحب ایک نامور قانون دان اور ایک سنجیدہ سیاستدان ہیں۔ زیر نظر کتاب آپ کے کتابی اور تجرباتی مطالعہ کا نتیجہ ہے اس سے قطع نظر کہ سید صاحب جو وضاحت سے لکھ سکتے تھے انہوں نے پہلو دار کنایوں میں بیان کی ہے یا انہوں نے انشاء کی نزاکت پر اپنی قانونی ذہانت کو غالب رکھا ہے تاہم اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چودہ عنوانوں میں نفسِ مضمون کی تشریحات ہیں۔ یوسف لودھی کے قلم سے پورے پورے صفحے کے چھ کارٹون ہیں جس میں ڈکٹیٹر کا خاکہ غالب کے اس شعر سے پُر لطف بنایا ہے ؎

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

پروپیگنڈہ کے باب میں فاضل مصنف نے بعض مشہور ڈکٹیٹروں کے ۱۶ اقوال نقل کئے اور وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سیاسی واقعات کی گفتار کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بالکل واضح ہو جائے گا کہ سیاسیات کی بنیاد صرف پراپیگنڈے پر ہے۔ (ہٹلر)

۲۔ چونکہ پروپیگنڈہ صرف حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کا اندازہ ہمیشہ ان مقاصد [illegible] کی روشنی میں کرنا چاہیئے جن کے حصول کیلئے یہ ذریعہ اختیار کیا جائے۔ (ہٹلر)

۳۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عوام ہی کی رائے پر حکومت کریں گے وہ اپنی بنیاد ملال پر قائم کرتے ہیں۔ (میکاولی)

۴۔ حکومت کو پورا اختیار ہے کہ عوام کی رائے خود قائم کرے اور اُن کے اذہان پر پورے طور پر قابو پائے۔ (چانکیا، ہٹلر، مسولینی)

۵۔ عوام کا اپنا کوئی ذہن نہیں ہوتا لہٰذا جو واقفیت انہیں بہم پہنچائی جائے وہ اسی پر اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ (ہٹلر)

۶۔ عوام کی رائے ہموار کرنے کے لیے انہیں خوبصورت نعرے مہیا کرتے چاہئیں جو پُرکشش ہوں اور آسانی سے انہیں دہرایا جا سکے۔ (مسولینی)

۷۔ اخبارات اور ذرائع ابلاغ کو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ حکومت کے عوام سے گفت و شنید کا ذریعہ ہیں۔ (کاسترو)

۸۔ پراپیگنڈے کا روئے سخن ہمیشہ عوام الناس کی کثرت کی جانب سے ہونا چاہیئے۔ ذہین طبقے یا جنہیں ان دنوں ذہین طبقہ کہا جاتا ہے پراپیگنڈے کے محتاج نہیں۔ (ہٹلر)

۹۔ پراپیگنڈے کا مطلب تعلیم دینا نہیں بلکہ تائید حاصل کرنا ہے۔ پراپیگنڈے کا فن یہ ہے کہ ایک مسئلہ عوام کے سامنے وضاحت اور شدت کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اکثریت کو اس کے واقعہ ہونے کا یقین آجائے۔ (ہٹلر)

۱۰۔ پراپیگنڈہ اس طرح کیا جائے کہ جھوٹ بھی سچ سمجھا جانے لگے۔ (ہٹلر، میکاولی)

۱۱۔ پراپیگنڈے کے لیے اگر جھوٹ بولنا پڑے تو ہمیشہ بہت بڑا جھوٹ بولنا چاہیئے (ہر ڈکٹیٹر نے اس پر عمل کیا)

۱۲۔ اکثریت ایک بھیڑ کی طرح ہے جس طرف اسے چلانا ہو چلایا جا سکتا ہے بشرطیکہ پراپیگنڈے کی صحیح تکنیک کے ذریعے بر وقت اس کے راستے کی نشاندہی کر دی جائے۔ (نطشے، ہٹلر)

۱۳۔ اکثریت کو خوش کرنے کے لیے ہر کام عوام کے نام پر کرنا چاہیئے حتیٰ کہ ملک کے قوانین بھی عوام ہی کے نام سے منسوب کر دینے چاہئیں (ورڈس ورتھ)

۱۴۔ ڈکٹیٹر کو ہمیشہ یہ کہتے رہنا چاہیئے کہ وہ عوام میں سے ہے اس سے عوام کی بڑی تسلی ہوتی ہے۔ (مسولینی)

۱۵۔ پراپیگنڈے کا وہ حصہ جو دشمن کے خلاف ہو نہایت احتیاط سے تیار کرنا چاہیئے اور اس میں کسی قسم کی کمزوری کا شائبہ پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ (ہٹلر)

اور ایسی کسی چیز کی اس کے بعد سیاسی قتل بھی کر سکتے ہیں تو یہ ڈکٹیٹر کی خوش قسمتی ہے۔

(مسولینی)

آج سے پینتالیس برس پہلے مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" میں حقیقت و افسانہ کے تحت پراپگنڈہ کے معانی و مطالب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ انگریزی زبان کا یہ لفظ اردو زبان میں کوئی ہم معنی لفظ نہیں رکھتا اس لفظ کے ساتھ برائی یا اچھائی کا تصور ہی نہیں۔ یہ لفظ یورپی سیاست کے بطن سے پیدا ہوا اور اس کے آب و گل میں اپنی مخالف طاقتوں کو (خواہ وہ حق پر ہوں) رسوا و پسپا کرنے کے تمام عناصر ہیں۔ پراپگنڈہ کے لفظ میں نہ حسن ہے نہ قبح نہ خیر ہے نہ شر۔ اس کا وجود پالٹیکس کا مرہون ہے یا بالفاظ دیگر یہ ایک زبان ہے جو کسی مقصد کا چرچا کرتی ہے اور سیاسی لغت میں مقصد کسی حق و صداقت کا نام نہیں بلکہ طاقت کے بل پر اپنی جماعتی یا شخصی اغراض کو پروان چڑھانے کا نام ہے جتنا نقصان سیاسی طاقت کے بل پر نوع انسانی

تمام جنگوں میں قتل انسانی سے نہیں ہوا جتنا جنگ میں انسان حربی سامان سے موت کا شکار ہوتے ہیں اور بلاشبہ جنگ کی بربادیاں عظیم سے عظیم ہوتی ہیں لیکن پراپگنڈہ ایک ایسی تلوار ہے جو انسان کے ذہنوں کو اجتماعی طور پر قتل کرتی اور غور و فکر کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیتی ہے۔

اس زمانے میں ادب جذبات کا نگار خانہ ہے، صحافت پراپگنڈے کا بادہ خانہ، جہاں صداقت کی پگڑی اچھلتی اور جھوٹ کی کلغی بالا ہوتی ہے۔ اصل چیز تاریخ ہے جو انسان کی اجتماعی سرگزشت کے حقائق کی معرفت استدلال سے مواد حاصل کرتی ہے۔ ہمارے ملک کا ادب بیمار ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ادب کو سب سے بڑا ضعف ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے پہنچایا جس پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں ہمارے یہاں کوئی بڑا شاعر نہیں رہا اور نہ کوئی بڑا ادیب نظر آ رہا ہے بلاشبہ بعض نغز گو شاعر ہیں اور کئی اچھے ادیب بھی ہیں لیکن اس دور میں کوئی ادیب و شاعر ایسا نہیں جو غالب و اقبال کی طرح

شاعر ہو وقت پڑنے پر جنگ کے پرچم لہرایا ... سرکاری دولت مندوں کے دسترخوان نعمت پر ڈالے جا رہے ہیں اور جو لوگ اپنے کو اسلامی شاعر کہتے ہیں یا جنہیں اسلامی ادیب ہونے پر ناز ہے ان کی حیثیت عمر کی لنگی کے باعث متروکات سخن کی ہو چکی ہے۔

پاکستان میں جس چیز نے جھونپڑوں سے نکل کر محلوں کی بود و باش اختیار کی وہ صحافت ہے لیکن صحافت ایک دو آوازوں کے سوا اب عقیدہ و عبادت نہیں رہی بلکہ صنعت و تجارت ہو چکی ہے۔

تیسری چیز تاریخ ہے نہ جانے اس باب میں خلا کے وجوہ کیا ہیں۔ ہم ہزار کوشش کے باوجود ان وجوہ کا سراغ لگانے سے قاصر ہیں۔ کچھ حقیقتیں ہمارے سامنے ہیں ہم انہیں قلم کی نوک پر نہیں لا سکتے اور نہ ہم میں وہ ہمت رہی ہے کہ بعض اسرارِ ناگفتنی کی چہرہ کشائی کر سکیں۔ قائد اعظم کے تمام رفقاء ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے جو لوگ اُن کے ساتھ کسی حیثیت میں رہے یا جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے سر پر قائد اعظم کا ہاتھ تھا وہ ستائیس برس سے سیاست کے رنڈی بازار میں گلم گلی ڈنڈا کھیل رہے اور ہمیشہ ہر دور کی حکومت کے آلہ کار رہے ہیں۔ قوم اُن سے مطالبہ نہیں کرتی اور اُن کے ضمیر کو خلش نہیں ہوتی کہ وہ قائد اعظم کے سوانح و افکار لکھیں۔ پاکستان کی تاریخ مرتب کریں اور ملت کے اُس ذہنی سفر نامے پر قلم اٹھائیں جس کا نتیجہ پاکستان تھا جو قوم اپنی تاریخ سے ناواقف ہو گی اپنے محسنوں کو نہ پہچانے گی اور اپنے عقائد میں پختگی نہ دکھائے گی اُس کا مقدر ڈکٹیٹروں ہی کے ہاتھ میں رہے گا اور پہلے سے بدتر لوگ اُن پر حکمرانی کریں گے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی علمی یادگار

دارالمصنفین اعظم گڑھ

بعض پاکستانی ناشروں کی چوری اور سینہ زوری

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ایڈیٹر چٹان کے نام عطوفت نامہ

اعظم گڑھ

۲۰ مارچ ۱۹۷۵ء

مکرمی و معظمی شورش صاحب

سلام مسنون ۔ آپ کا رجسٹرڈ عنایت نامہ موصول ہوا۔ اس سے پہلے آپ کی تصانیف کا پارسل بھی ملا تھا۔ جس میں حسب ذیل کتابیں تھا۔ (۱) موت سے واپسی (۲) پس دیوار زنداں (۳) تمغۂ خدمت (۴) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۵) شب جائے کہ من بودم۔

مارچ کے معارف میں آخری کتاب پر ریویو بھی ہوا ہے جو اب ملک نظر سے گزر چکا ہوگا۔

آپ کے قلم کی ساحقر پاشی پر رشک آتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے امیر خسرو کی قصیدہ نگاری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قصیدہ و اسی طرح قلمبند کرتے تھے جس طرح کہ آجکل کے اخبار نویس اپنا اداریہ لکھتے ہیں ۔ یہی بات آپ کی نظموں کے متعلق کہی جاسکتی ہے ۔ آپ نے مولانا ظفر علی خاں کی روایت تازہ کردی ہے پھر آپ کو نثر نگاری میں وہی قدرت ہے۔ تحریریں آپ کے قلم سے فوارے کی طرح ابلتی دکھائی دیتی ہیں۔ قلم کو اپنی خواہش کے مطابق موڑنے میں آپ کیسی مہارت اور قدرت رکھتے ہیں ۔

ہندوستان اور پاکستان کی ڈاک کھلی تو آپ نے اپنا ہفتہ وار اخبار اور اپنی تصانیف بھیجنے میں جو عجلت کی اس سے دارالمصنفین سے آپ کے قلبی لگاؤ کا اندازہ ہوا ۔ اس احسان شناسی کے جذبے میں دارالمصنفین کی بھی کچھ مطبوعات آپ کی خدمت میں ارسال کرنے کے لیے ڈاکخانہ بھیجیں تو معلوم ہوا کہ ۶۳ روپے میں یہ پارسل آپ کے پاس جاسکے گا۔ گویا کتاب کی قیمت سے زیادہ ڈاک خرچ آئیگا مزید تحقیقات کے بعد ۲۱ روپے میں جانا طے ہوا جواب بھیجا جارہا ہے ۔ یہ ڈاک خرچ دونوں ملکوں کے نئے سمجھوتے کے بعد کا ہے۔ پہلے اتنا کثیر خرچ نہ ہوتا تھا۔ ایک پیکٹ ساڑھے چھ روپے میں چلا جاتا تھا۔ رسالہ معارف اب ۸۰ پیسے میں جایا کرے گا۔ پہلے چند پیسوں میں جایا کرتا تھا پاکستان میں معارف کے طلب گار بہت زیادہ ہیں۔ مگر معلوم نہیں اس ڈاک خرچ پر اب منگوانا پسند کریں گے کہ نہیں کتابوں اور رسالوں پر اتنے زیادہ ڈاک محصول کے بعد اب دونوں ملکوں کے علمی روابط پیدا ہونے میں کمی آجائے گی ۔ اب کتابوں کی فروخت اور تجارت ممنوع ہے اور رشوت ہی کی طرح ہوتی نظر آتی ہے؟

دارالمصنفین سے آپ کو جو محبت ہے اس بنا پر یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ گذشتہ دس سال سے پاکستان میں ہماری مطبوعات کے جانے میں ہر قسم کی مشکلات بڑھتی جارہی ہیں۔ حالانکہ وہاں ان کی بڑی مانگ ہے کبھی تو وہاں کے لین دین ہی پر پابندی عائد ہوجاتی ہے اور جب کچھ سہولتیں فراہم ہوتی ہیں تو ریل اور ڈاک کی مشکلات اتنی ہوتی ہیں کہ ان کو دور کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس سے ہمارے ادارہ کو گزشتہ دس برسوں میں بہت ہی صبر آزما سالانہ مالی خسارہ ہوتا رہا ہے۔ یہ شروع سے حکومت کی کوئی مستقل سالانہ امداد قبول کرنے سے گریز کرتا رہا ہے بلکہ خود کفیل رہا ہے۔ اس کے خدمت گزار یہاں پیسے کمانے کے بجائے صرف علم و فن کی خدمت کے جذبے سے آئے۔ اور اپنی پوری زندگی قوت لایموت پر گزار دی۔ ان کو نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلہ کی پروا رہی۔ انہوں نے گزشتہ ساٹھ سال کے اندر جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ ادارہ اپنی شاندار علمی روایات پر فخر کرسکتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اس کا خاص مارکٹ پاکستان ہوگیا تھا ۔ وہاں سے کافی آمدنی

باقی ص ۲۹ پر

(ہفت روزہ چٹان لاہور)

ہندی مسلمانوں کی نفسیات

آزادی کے بعد ہی ملت کے رہنماؤں نے مسلمانانِ ہند سے خطاب کرنا شروع کر دیا تھا اور آج بھی تخاطب کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے بعض راہ نما مسلمانوں کو خوب پہچانتے اور ان کی نفسیات کے قریب پہنچ جاتے ہیں، مگر ایسے باخبر قائدین کی تعداد بہت کم ہے اور وہ عموماً خاموشی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ خود مسلمان بھی ایسے راہ نماؤں کو شناخت نہیں کرتے، کیونکہ وہ ان کی راہنمائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، دوسرے راہ نما جن کو مسلمانوں میں کام کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے وہ دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو مسلمانوں کی طرف سے مایوسی کا اظہار کرتا رہتا ہے ان سے اگر معمولی غلطی بھی ہوتی ہے تو وہ اسے کھینچ تان کر قنوطیت کی طرف لے جاتے ہیں ان کے نکالے ہوئے نتائج سے مسلمانوں کا مستقبل بھی مخدوش اور غیر یقینی ہو جاتا ہے، ایسے راہ نما مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کا جائزہ نہیں لیتے۔ وہ مقامیات میں پھنسے رہتے ہیں اور ان ہی کے احوال و ظروف سے غلط اور بے بنیاد نتائج نکالتے ہیں۔

دراصل بات یہ نہیں ہے کہ کروڑوں کا گروہ مایوسی کے سیلاب میں بہتا رہے اور اسے اپنی بقا کی کوئی فکر نہ ہو — ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد اتنی بڑی ہے، جتنی مشرق وسطیٰ میں — اتنی بڑی آبادی مایوس کن زندگی اختیار نہیں کر سکتی۔ ہمیں ایک طرح سے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اپنے احوال اور تعلیمی ماحول کے مطابق مسلمانوں کے حالات بھی مختلف ہیں لیکن اتنے مایوس کن نہیں ہیں، کہ کام کرنے والوں کا دل ٹوٹ جائے —،

مسلم راہ نماؤں کا دوسرا حصہ وہ ہے، جو ہندوستانی مسلمانوں میں کسی قسم کی مایوسی نہیں دیکھتا، حتیٰ کہ ان میں اضمحلال بھی نہیں، مسلمان عیش کر رہے ہیں، خوشی اور غمی کی تقریبات میں بھرپور خرچ کرتے ہیں، سینما بینی میں بھی سب سے آگے رہتے ہیں، ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جانا چاہتے ہیں، تجارت میں بھی ان کا حصہ خاصا ہے، گھریلو صنعتوں میں آج بھی امامت کا درجہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کو شکایت ہے تو اس بات کی کہ سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ برائے نام ہے اور یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ پولیس میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ کلیدی اور غیر کلیدی شعبوں سے انہیں دور رکھا گیا ہے، یہ لوگ جو سرکار کے گرامو فون ہیں اقلیت کش فسادات کا ذکر تک نہیں کرتے پولیس کی زیادتیوں سے انہیں کوئی گلہ نہیں، دہلی کش گنج اور صدر بازار کے بعد حال ہی میں جامع مسجد کے اطراف میں پولیس نے جو دل اودا کیا ہے اس کے لیے ان کے پاس کوئی صدائے احتجاج نہیں ان لوگوں میں ایسے ڈھیٹ قسم کے پرچہ دہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر خیالات میں افراط و تفریط کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو قنوطیت کا مرض لاحق نہیں ہے اسے اگر سرکاری ملازمتوں میں خصوصاً پولیس میں جگہ نہیں ملتی یا نہیں

باقی صفحہ ۲۶

پروفیسر عبدالباری عباسی

عبدالرحمٰن اوّل کا اندلس میں کھجور کا پہلا درخت لگانا

انیسویں صدی نے مسلمانانِ ہند و پاک بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے جہاں بہت کچھ چھین لیا۔ انہیں صدیوں سے قائم شدہ حکمرانی سے محروم کر دیا۔ سیاسی معاشی، معاشرتی ہر لحاظ سے گرا دیا۔ وہاں کچھ دیا بھی ہے۔ اگر صدیوں کا محفوظ خزانہ چھینا ہے تو کچھ چمکدار موتی عطا بھی کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک دُرِ شاہوار علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ہیں۔

اقبال کو اپنی وفات کے بعد سے آج تک نہ معلوم کن کن نظریات سے متہم کیا جاتا رہا ہے۔ کچھ لوگ انہیں ہندی شاعر مانتے ہیں۔ کچھ ہند و پاک کے مسلمانوں کا نمائندہ۔ کچھ سوشلسٹ اور بعض تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اقبال محض ایک "کروٹی" شاعر تھا جو ایک سمجھدار فنکار کی طرح زمانہ کی پسند کے مطابق شاعری کی ڈھولکی بجاتا رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ کروٹیں بدلتا رہا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ اول و آخر شاعر ہی تھا اور بس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اقبال عالمگیر اسلامی شاعر سب سے پہلے تھا بعد میں کچھ اور۔ وہ عالمِ بالا سے اس قومی ابتلا کے زمانے میں ایک فکری تحفہ لے کر آیا جب کہ ہمارے دلوں سے احساسِ زیاں تک جاتا رہا تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن تعلیم اور انگریز آقاؤں سے ہم اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ ہمیں اپنی ہر ایک چیز میں کیڑے نکالنا اور دوسروں کی ہر چیز کو اپنانا۔ فخریہ کارنامہ محسوس ہوتا تھا۔ وہ تحفہ غیبی نظریۂ خودی تھا۔ اقبال خلوصِ دل سے جذبۂ خودی کو امتِ اسلامیہ کے مرض کہن کا علاج خیال کرتے تھے۔ اور زندگی بھر یہی چاہتے رہے کہ پوری مسلمان قوم اس جذبے سے سرشار ہو جائے۔ چونکہ مسلمان قوم کی برق رفتار ترقی کی ضامن عشق یقین محکم اور عملِ پیہم کی صفات تھیں۔ جن پر جذبۂ خودی کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی لیے ابتدائے اسلام کے زمانے کے مسلمانوں کو اقبال مردانِ خود آگاہ کے معزز خطاب سے یاد کرتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے اوراق میں جہاں کہیں اُن مردانِ غازی کا معمولی سا کام بھی نظر آ جاتا ہے۔ اقبال کی نگاہِ عقیدت کیش اس کو موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔ اسلامی فاتح عبدالرحمٰن اول کا اندلس کی سرزمین پر کھجور کا درخت لگانا بظاہر ایک معمولی سا کام ہے۔ ہمارے ہاں ہر سال رسمی اہتمام کے ساتھ۔ بڑے سے بڑے لیڈروں کے ہاتھوں کتنے ہی ننھے پودے لگائے جاتے ہیں مگر اخبارات میں فوٹو چھپنے کے باوجود اس کام کو لائقِ توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اقبال اس معمولی عمل میں بھی اسلامی روایات کا پرتو اور جذبۂ خودی کی جھلک دیکھتے ہیں اور اسے نگینہ بندی یا نظم نگاری کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

یہ نظم عبدالرحمٰن اول کے اپنے عربی اشعار کا اُردو ترجمہ ہے جو تاریخ المقری میں درج ہیں۔ اس نظم میں صرف دو بند ہیں۔ پہلے بند میں عرب فاتح کے جذباتِ محبت کی عکاسی کی گئی ہے۔ مگر دوسرا بند سرتاسر نظریاتی ہے۔ اصلی اشعار چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہیں اس لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ نظم میں مذکور تمام جذبات عبدالرحمٰن اوّل ہی کے ہیں یا اقبال کی اپنی جذباتی آرزو مندی نے ان میں حنابندی کی ہے۔ تاہم قرینِ قیاس یہی ہے کہ پہلے بند میں جو جذبات ہیں وہ تمام و کمال اصل مصنف کے دل کا عکس ہوں گے مگر دوسرا بند اقبال کی اپنی جودتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اقبال کا یہ منظوم ترجمہ شاید ان کی شاعری کے آخری دور کی یادگار ہے جب کہ وہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی بجائے "مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا" کا ترانہ سنانے لگے تھے۔

اس نظم کو پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن کے پردے پر وہ تمام جذبات و خیالات تصویروں کی طرح منعکس ہونے لگتے ہیں۔ جو فاتح پُرجوش عربوں کے دل و دماغ پر اُس وقت طاری ہوئے ہوں گے جب وہ سرزمین اندلس پر تازہ وارد ہوں گے۔ جب عرب نوجوان فاتحین وہاں نئے نئے پہنچے ہوں گے تو انہوں نے اپنے تئیں کس طرح اجنبی سا محسوس کیا ہوگا۔ وہاں کی زمین آسمان، ہوائیں، فضائیں، بہاریں، ندی نالے، پہاڑ، غار، چشمے، پھول غرضیکہ قدرت کی تمام نیرنگیاں انہیں کیسی عجیب عجیب سی محسوس ہوتی ہوں گی کس طرح وہ نئے ماحول میں بہت کچھ پا کر بھی کبھی کبھی کچھ کھو جانے کے خیال میں کھو جاتے ہوں گے۔ جب وہ اپنے ان نخلستانوں سے بچھڑ کر رہ گئے ہوں گے جن میں پروان چڑھے تھے، جوان ہوئے تھے اور جن میں سلماؤں اور لیلاؤں کے انتظار میں کتنی ہی گھڑیاں گزاری تھیں۔ تو بعض اوقات کس طرح وہ آپ اپنے گلے میں باہیں ڈال کر رہ جاتے ہوں گے اور جب کبھی انہیں کوئی ایسی چیز نظر آ جاتی ہوگی جس کو ان کے آبائی وطن ان کے

دیس سے نسبت خاص ہو تو کس طرح ان کے چہرے
کھل جاتے ہوں گے ۔ ان کے دل کیسی پاکیزہ اور
سچی خوشی سے جھوم اٹھتے ہوں گے ۔ ان تمام کیفیات
اور واردات قلبی کا انعکاس اس نظم کے قاری کے دل
پر بھی ہونے لگتا ہے ۔ اور وہ تھوڑی دیر کے لیے
اپنے آپ کو بھی انہیں عرب جوانوں کے جذبات محبت
میں شریک محسوس کرنے لگتا ہے ۔

کھجور کا درخت صحرائے عرب سے ایک خاص
تعلق رکھتا ہے ۔ ایک عرب کی حیثیت سے جب
عبدالرحمٰن اوّل اسے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ
یہ پیڑ بھی ریگستانی آب و ہوا کا اسی طرح عادی
ہے جس طرح خود میں ہوں ۔ اندلس کی سرزمین
اس کے لیے بھی اسی طرح نئی ہے ۔ یہ بھی دیارِ غیر
میں اسی طرح اجنبی ہے جس طرح خود عرب لوگ ۔
تو اس کے دل میں کھجور کے پودے کے لیے شیفتگی
دو چند سہ چند ہو جاتی ہے ۔ وہ ایک خاص طرح
کی اپنائیت اپنے اور اس پودے کے درمیان
محسوس کرتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دور دراز
مقام پر ایک ہی وطن کے دو دوست اچانک مل
جائیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے سینے میں
الفت و رافت ۔ کا چشمہ ابلتا ہوا محسوس کرنے
لگے ۔ ایک عام قاری ہو سکتا تھا کہ جذبات کی اس
گہرائی تک نہ پہنچ پاتا لیکن اقبال ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ اپنے تخیل کے پروں پر اڑ کر عین اسی ملک ، ماحول
اور زمانے میں پہنچ گئے ہیں اور بالکل وہی کیفیت
اپنے اوپر طاری کر لی ہے جو عبدالرحمٰن اوّل کے دل
پر گذری ہوگی ۔ اقبال اچھی طرح جانتے ہیں کہ
عربوں کا تخیل کس طرح نخلستانوں میں پرورش پاتا
اور ریگستانوں کی طرح پھیلتا اور بڑھتا ہے ۔ وہ
عبدالرحمٰن کی زبان سے جذباتِ محبت میں ڈوبے
ہوئے جملے ادا کراتے ہیں جن میں تازگی بھی ہے
اور تاثیر کا طلسم بھی ۔ فاتح عرب حکمران کھجور کے پودے
سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے ؎

میری آنکھوں کا نور ہے تو میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں میرے لیے نخل طور ہے تو

کھجور کے درخت کے لیے آنکھوں کا نور ،
دل کا سرور ، اور پھر نخلِ طور کے الفاظ استعمال کرنا صرف
ظاہر کرتا ہے کہ ایک عرب کے دل میں کھجور کے درخت
کی کتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ اسے کیا
والہانہ پیار کرتا ہے تصنع سے پاک جذبات محبت
جب انتہائی سادہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں تو محبت کا
جادو جگانے لگتے ہیں ۔ عبدالرحمٰن اول کہتا ہے ؎

مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا
صحرائے عرب کی حور ہے تو

اس بند کے آخری شعروں میں تو یہ تاثیر انتہائی
بلندیوں پر پہنچی معلوم ہوتی ہے جب وہ پیار میں ڈوب
کر کہتا ہے ؎

پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو

اس کی تیسرے لہجہ میں یہ دعا قاری کے بھی دل کی
آواز بن جاتی ہے ؎

غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی ترا نم سحر ہو

انسان دوسروں کی وارداتِ قلبی کو اپنے ہی
دل پر قیاس کرتا ہے ۔ نظم کے اس بند میں اقبال

باقی ص۲۳ پر

ہفت روزہ چٹان لاہور

GOVERNMENT OF EAST PAKISTA
(IN EXILE)
TEL. 01.802 1689/01.387 7949/ 01.607 0583
30, DALEVIEW RO
LONDON.N15 6PJ

ہم اس پاکستان کے ساتھ ہیں جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے قائم کیا تھا

- جب تک ہم مغربی پاکستان کے ساتھ رہے ایک بنگالی بھی فاقہ سے نہیں مرا لیکن آج بے شمار فاقے سے مرچکے ہیں
- ہم مشرقی پاکستان کے باشندے ہونے کے باوجود بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتے

ایڈیٹر چٹان کے نام مشرقی پاکستان کی جلاوطن حکومت کا خط

مندرجہ ذیل خط آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کے نام مشرقی پاکستان کی جلاوطن حکومت کے سربراہ علی محمد عباس بار ایٹ لاء کے دست راست مسٹر خورشید عالم نے تحریر کیا ہے، یہ خط ہوائی ڈاک سے ۳۰ مارچ کو پوسٹ کیا گیا اور ۱۵ اپریل کی سہ پہر کو رجسٹرڈ ڈاک سے ملا، معلوم ہوتا ہے سولہ دن یہ خط یاران سر پل کے مجلہ سراغرسانی میں رہا ہم اس خط کو جوں کا توں شائع کر رہے ہیں۔ ہم نے اس میں قواعد زبان اور آداب انشاء کی رعایت سے کوئی تبدیلی نہیں کی، جناب خورشید عالم بار ایٹ لاء کے جذبات کو انہی الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ اس کا مطالعہ اس طرح کیجیے، کہ مشرقی پاکستان کا ایک مخلص نوجوان ہم سے جدا ہونے کے بعد کیونکر سوچتا ہے اور اس کے بے پایاں جذبات کا نمونہ کیا ہے۔ (ادارہ)

لندن ——— مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء

مکرم و محترم جناب آغا شورش کاشمیری صاحب السلام علیکم رحمۃ و برکاتہ۔ اس سے پہلے کہ خط لکھوں اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں، میرا نام محمد خورشید عالم ہے، میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں اور قیام پاکستان سے قبل کلکتہ میں تھا، حضرت علامہ راغب احسن میرے بزرگ اور چچا جان تھے ہیں، میں نے ایم اے الف سی کالج پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور یہاں بیرسٹری کرنے کے بعد لندن ہی میں عزت مآب جناب علی محمد عباس بیرسٹر وزیر اعلیٰ جلاوطن حکومت مشرقی پاکستان کیساتھ کام کر رہا ہوں، علامہ راغب احسن چچا اور مرحوم شہید صاحب (حسین شہید سہروردی) سے آپ کی بہت تعریف سنی ہے اور میں نے خود بھی آپ کی تحریروں اور تقریروں کا مطالعہ کیا ہے، ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک میں لاہور میں پڑھ رہا تھا، تو آپ کی ہر تقریر موچی دروازہ اور دوسری جگہ ہم لوگ سننے آیا کرتے تھے، آپ کی تقاریر جہاں کہیں بھی ہوتیں، میں ضرور حاضر ہوتا، ویسے آپ سے ملاقات بھی ہوئی ہے، لیکن آپ کے ذہن میں نہ ہوگا، ایک مرتبہ شہید صاحب کو چھوڑنے ہم لوگ لاہور ایئرپورٹ گئے تھے، جس میں خواجہ رفیق مرحوم، خان لودھی خود، نوابزادہ ولایت علیخان اور آپ بھی شامل تھے، ملاقات اسی وقت ہوئی تھی، اور صغیر الدین ہاشمی صدر انجمن مہاجرین مشرقی پاکستان بھی اس زمانے میں آتے تھے اور وہ بھی ایئرپورٹ پر موجود تھے، آج تک ہم نے بہت سے لیڈروں کی تقریریں سنی ہیں، لیکن آپکی تقریروں نے مجھ پر گہرا اثر کیا ہے۔ آپ کی تقریروں سے دل و دماغ کو صحیح تقویت پہنچی تھی،

وقتاً فوقتاً آپ کے بیانات اور تصاویر یہاں کے روزنامہ اخبارات جنگ انٹرنیشنل اور ملت میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور جب میں دیکھتا ہوں تو لاہور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور آپ کی دل ہلا دینے والی تقریریں سامنے آجاتی ہیں —

آپ جیسی عظیم ہستی پر مسلمانان پاکستان ہی کو نہیں بلکہ برعظیم کے مسلمانوں کو فخر ہونا چاہیئے جو خدمات آپ نے پاکستان کے لیے انجام دی ہیں ملت اسلامیہ ان کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی

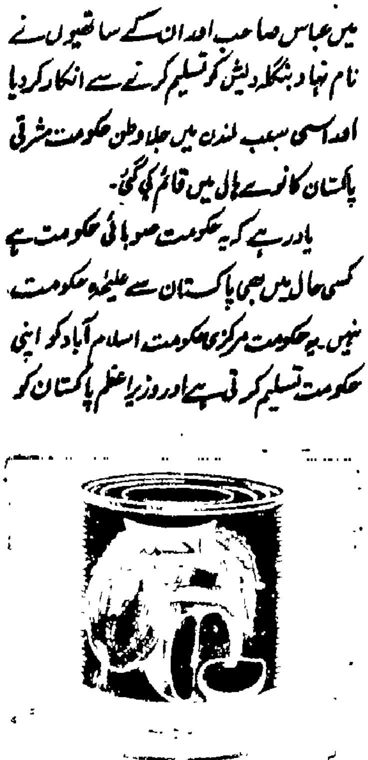
آپ جیسی عظیم ہستی کو شاعر مشرق، مفکر اسلام، حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے فیضان حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ غالباً آپ کو تو اس بات کا علم اخبارات کے ذریعہ ہو چکا ہوگا، یہاں کے مقیم بنگالیوں نے جو کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، جلاوطن حکومت مشرقی پاکستان قائم کر رکھی ہے، ان محب وطن پاکستانیوں نے کبھی بھی نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا، یہاں تک کہ جب نام نہاد بنگلہ دیش کی تحریک لندن میں زور شور سے چل رہی تھی، چند بنگلہ بولنے والے مشرقی پاکستانی ہمیشہ اس کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، جو لوگ شروع سے متحدہ پاکستان کے حامی رہے ہیں، ان میں بیرسٹر علی محمد عباس اور ان کے ساتھیوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے اور بیرسٹر علی محمد عباس اس ملک میں ۱۹۴۵ء سے ہیں، اس زمانے میں یہاں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے، ۱۹۴۵ء میں انہوں نے اپنے گھر کا نام پاکستان ہاؤس رکھا تھا، یعنی قیام پاکستان سے ۲ سال قبل ان کے گھر میں مرحوم چودھری رحمت علی وغیرہ بھی آ چکے ہیں۔ عباس صاحب لندن برانچ مسلم لیگ (اسٹوڈنٹس) کے سیکرٹری بھی تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد انہوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی، اور اپنی پریکٹس میں لگ گئے، آپ بنگالی ہیں اور ضلع پٹنہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہیں، غالباً ان کی طرح کے کٹر پاکستانی بہت کم ہوں گے جب نام نہاد بنگلہ دیش کی تحریک اس ملک میں زور شور سے چل رہی تھی، عباس صاحب اور ان کے ساتھی چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور تمام اپوزیشن کا مقابلہ کرتے رہے اگرچہ ان کو اپنی پریکٹس میں دو سال تک کافی نقصان اٹھانا پڑا، اگرچہ عام بنگالیوں نے ان کو غدار کہا اور ہر طرح کے طعنے دیتے رہے، لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ نا اہل بنگالی ہندوؤں کے چکر میں آ کر ملک و ملت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑے گا ــــ مشرقی پاکستان کے موجودہ حالات ان کی پیش گوئی کے عین مطابق ہیں۔

جب وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صدر کی حیثیت سے یہاں آئے تھے تو عباس صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ان سے ہوٹل میں کہا تھا کہ

وہ نام نہاد بنگلہ دیش کو کبھی بھی تسلیم نہ کریں۔

لیکن بعد میں اس کو تسلیم کر لیا گیا، وجوہات کیا تھے، اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگرچہ نام نہاد بنگلہ دیش کو ہماری مرکزی حکومت نے تسلیم کر لیا، اور مجیب کو ایک نئی زندگی مل گئی، لیکن اس ملک میں عباس صاحب اور ان کے ساتھیوں نے نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اسی سبب لندن میں جلاوطن حکومت مشرقی پاکستان کانوے ہال میں قائم کی گئی۔

یاد رہے کہ یہ حکومت صوبائی حکومت ہے کسی حال میں بھی پاکستان سے علیحدہ حکومت نہیں۔ یہ حکومت مرکزی حکومت اسلام آباد کو اپنی حکومت تسلیم کرتی ہے اور وزیر اعظم پاکستان کو



اپنا وزیر اعظم مانتی ہے، اسی واسطے اس حکومت میں وزیر خارجہ کا کوئی عہدہ نہیں ہے چونکہ یہ ایک مرکزی حکومت کا عہدہ ہوتا ہے، یہ جلاوطن حکومت اپنی وفاداری بحیثیت صوبائی حکومت وزیر اعظم پاکستان کو سونپتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرکزی حکومت نے نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو پھر ہم کیوں نہیں کرتے۔ جواب یہ ہے کہ ایک پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا جمہوری حق ہوتا ہے کہ ہم اپنی رائے کے مطابق اپنے حق میں اور ملک کی سالمیت کے لیے فیصلہ کریں ــــ عباس صاحب اور ان کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی بے انتہا قربانیوں کے بعد وجود میں آیا اور مسلمانان ہندوستان کا اس میں بہت ہی زیادہ حصہ ہے۔ ان کو اس بات کا علم تھا کہ ان کا علاقہ کبھی بھی پاکستان میں نہیں آئے گا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا تھا اور ہر قسم کی قربانیاں دی تھیں۔ پاکستان برصغیر کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کا ذمہ دار ہے۔ پھر اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو فراموش کر دیں ہم وہی پاکستان چاہتے ہیں جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا۔ ہم ہرگز ہرگز قیامت تک نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔

ہمارے واسطے پاکستان ۳ حصوں پر مشتمل ہے مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان اور پورا کشمیر، بغیر ان تینوں کے پاکستان نامکمل ہے۔ اب ہمارے دشمن ہندو، یہودی اور عیسائی ہر ممکن طریقے سے پاکستان کو ختم کرنے کی سازش کر رہے ہیں اللہ ہی ہمارا نگہبان ہے، یہ حکومت جلاوطن اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ متحدہ پاکستان کے واسطے آواز بلند کریں، عباس صاحب کے مطابق اور یہ نکل

باقی ص۳۱ پر

قسط (۲)

قومی ملکیت

ایک تصور —— ایک تحریک —— ایک منصوبہ

اشتراکیت کے استحکام کا نظریہ

اینگلز اشتراکیت کے استحکام کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے پہلے تمام مذاہب اور مذہبی عقائد سے انکار کیا جائے اور ذہنوں کو اس طرح دھو دیا جائے کہ ان عقائد کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی باقی نہ رہے اور اس کے برعکس مذہب کے خلاف ذہن میں شدید نفرت کو جگہ دی جائے۔ چنانچہ اسی نفرت کو زیادہ مضبوط کرنے کی خاطر اس نے مذہب کی ابتداء کا نظریہ پیش کیا ہے اور بلا کم و کاست ہر مذہب کو جہالت اور توہم قرار دیا ہے۔ مذاہب میں چونکہ مادیت کے مقابلے میں روحانیت کی فضیلت پیش کی جاتی ہے اس لئے اس نے روح کا بھی سرے سے انکار کر دیا ہے تاکہ ایسا کوئی اصول یا عقیدہ قائم ہی نہ ہو سکے جس کا تعلق روح سے ہو۔ اسی طرح کوئی مذہب چونکہ خدا کے تصور سے خالی نہیں ہے اس لیے اس نے خدا کے وجود کو بھی محض جہالت اور واہمے کی صورت گری قرار دے کر اشتراکی حدود سے خارج کر دیا ہے۔ اور اشتراکیت کو خالص اور غیر مشتبہ الحاد کا نظریہ بنا دیا ہے۔

مذہب کا ارتقاء اور اس کا پہلا دور

مذہب کے بارے میں اس ہمہ جہتی انکار کی فضا قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی بات جو اینگلز نے پیش کی ہے وہ مذہبی تصورات میں ارتقا کا اہتمام ہے۔ یہ اہتمام اصل میں کارل مارکس ہی کے خیالات سے مستخرج ہے لیکن یہ ایک دوسرے مقصد کے لیے کیا گیا ہے۔ خلاصہ اس ارتقا کا یہ ہے کہ اوّلاً عالمِ فطرت کی بے پناہ قوتوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کیا چنانچہ ان قوتوں سے خوفزدہ ہو کر یا اپنی زندگی کی منفعتوں کو ان سے متعلق پا کر لوگ انھیں اپنا آقا، داتا یا خدا سمجھنے لگے۔ ان کی قہرمانیوں سے بچنے کے لیے ان کے آگے جھکنے لگے اور ان سے التجائیں اور درخواستیں کرنے لگے۔ اس طرح حیرت، خوف اور لالچ نے مظاہرِ فطرت کو خدائی کا درجہ عطا کر دیا اور مذہب وجود میں آ گیا۔

ارتقاء کا دوسرا دور

مذہبی خیالات کے بارے میں ارتقاء کی دوسری منزل اینگلز کے نزدیک یہ ہے کہ لوگوں نے جب فطرت کی قوتوں کو خدا مان لیا تو زلزلوں، بجلیوں، سیلابوں اور دوسرے حوادث کو وہ خدائی اعمال سمجھنے لگے۔ چنانچہ اپنے خداؤں کے ایسے خطرناک اعمال کی روک تھام اور ان سے بچاؤ کی تدابیر بھی سوچی گئیں۔ یہ مختلف قسم کی عبادتیں، قربانیاں، بھینٹ اور نذر و نیاز وغیرہ ان ہی تدابیر میں سے تھیں جو ان آسمانی خداؤں کے اعمال پر موثر کنٹرول قائم کرنے کے لیے کی جاتی رہیں۔ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بکثرت خداؤں کی پرستش یا اصنام پرستی کا بنیادی سبب یہی تھا کہ فطرت کی قوتوں میں سے ہر قوت کو ایک خدا مان لیا گیا تھا اور اس کی پرستش ہونے لگی تھی۔

اینگلز کا خیال ہے کہ فطرت کی قوتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش کرنے کا دستور صرف زمانۂ قدیم تک قائم رہا۔ اس وقت جب بھی کوئی فطری حادثہ رونما ہوتا یا عناصر کی قوتوں کی معرفت کوئی عظیم تباہی پھیلتی تو لوگ خوفزدہ ہو کر مختلف عناصر اور آثارِ فطرت کے روبرو سربسجود ہو جاتے۔ ان کے سامنے اظہارِ بندگی کرتے اور نتیجۃً ان کے قہر و عتاب سے پناہ حاصل کر لیتے۔ اس طرح ابتدائی زمانوں میں مذہب کی بنیاد صرف فطرت کے آثار اور اعمال پر قائم رہی جن سے انسان ڈرتا تھا اور ان کو حدود میں رکھنے کی سعی کرتا تھا۔ ساتھ ہی ان سے فوائد حاصل کرنے کی تمنا رکھتا تھا اس لیے انھیں راضی اور خوش رکھنے کی بھی فکر کرتا تھا۔ ان حالات میں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کی تنظیم جن اصولوں کے مطابق کی گئی وہ سب مذہبی ارتقاء کے دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ارتقاء کا تیسرا دور

مذہبی ارتقاء کا تیسرا دور اینگلز کے نزدیک

اُس وقت ظہور میں آیا جب انسانی معاشرہ اپنے معاشی ارتقا کے اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں نجی املاک کا نظام قائم ہوا اور لوگ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت کے مالک سمجھے جانے لگے۔ اس زمانے میں جب آہستہ آہستہ نجی ملکیت کی جڑیں کافی مضبوط ہوگئیں تو پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ آثار فطرت یا عناصر کی قوتوں کے ہی اتفاقی شکار نہیں ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے لیے بربادی کا سامان فراہم کرتی رہتی ہیں بلکہ وہ اپنے ہی سماج کی پیدا کردہ معاشی قوتوں کے بھی مستقل شکار ہیں جو ہر وقت اور ہر آن انھیں زندگی کی بنیادی ضروریات ہی سے محروم رکھتی ہیں۔ یہ قوتیں درحقیقت ان کے لیے ایک مستقل تباہی کا سبب ہیں۔ چنانچہ لوگوں کو جلد ہی بہت بڑے پیمانے پر اس بات کا شعور حاصل ہوگیا کہ یہ معاشی قوتیں جو نجی املاک کی بنیاد پر پیدا اور فراہم کرتی ہیں۔ اتنی شدید اور بے پناہ ہیں کہ تمام لوگ ان کو سمجھنے اور ان پر قابو پانے سے یکسر قاصر ہیں۔

حقیقت میں یہی وہ مقام ہے جہاں اینگلز کا مافی الضمیر فاش ہوگیا ہے۔ وہ اصلاً نجی املاک کے نظام اور اس سے پیدا شدہ قوتوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس حملے کے لیے اس نے انتہائی پیچیدہ راستہ اختیار کیا۔ پہلے مذہب کے آغاز کا ایک فرضی نظریہ فراہم کیا جو عناصر کی قوتوں کے خوف پر مبنی تھا پھر اس کے ارتقائی ادوار کا ایک خیالی خاکہ مرتب کیا۔ اس کے بعد کھینچ تان کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نجی املاک کے سہارے جو معاشی قوتیں پیدا ہوتی ہیں وہ لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات سے محروم رکھتی ہیں لہٰذا وہ فطرت اور عناصر کی قوتوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ مذہب کا کردار یہ ہے کہ وہ ہر خوف کو خدا اور ہر خطرے کو مالک اور آقا بنا دیتا ہے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان فرضی خداؤں اور آقاؤں کے سامنے جھکے رہیں۔ اس لیے اگر مذہب کی جڑ کاٹ دی جائے اور خالص الحاد کا پرچار کیا جائے تو لوگ نجی املاک کے نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے اور اس کی جگہ اجتماعی ملکیت کے طوق کو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن میں ڈال لیں گے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

دوسری ستم ظریفی اس نے یہ کی کہ اپنے اس تمام طبعزاد افسانے کو تاریخ کے ساتھ منسوب کر دیا اور یہ کہہ کر لوگوں کو مرعوب کیا کہ وہ جو کچھ بھی مذہب اور نجی ملکیت کے بارے میں پیش کر رہا ہے وہ سب تاریخی تحقیق ہے جو سائنٹفک طریقہ پر کی گئی ہے۔ فریب دہی کا یہ ایک انوکھا طریقہ ہے جسے مارکس اور اینگلز جیسے اکابرین اشتراکیت نے اختیار کیا حالانکہ تاریخ سے اس تمام خرافات کا کوئی ادنیٰ سا ثبوت بھی فراہم نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ کے نام پر شاید اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔

معاشی بنیادوں پر قائم ہونے والا معاشرہ

مذہب کے ارتقا کے تین ابتدائی فرضی ادوار مقرر کر چکنے کے بعد اینگلز ان پر ایک نیا یہ رکھتا ہے کہ تاریخ میں یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک نیا معاشرہ نمودار ہوا۔ ایسا معاشرہ جس کی پوری تنظیم معاشی پیداوار کے اصولوں کے تحت کی گئی تھی۔ نجی ملکیت کے نظام کے باعث معاشرے میں استحصال کی بنیاد پڑی اور پھر اس استحصال کو باقی اور برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوا کہ اس نوعیت کی ریاست بھی قائم کی جائے جو نجی املاک رکھنے والوں کی محافظ اور پشت پناہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے معاشرے کا پورا تانا بانا ہی بدل ڈالا گیا۔ اس عظیم تبدیلی میں جہاں معاشرے کی ہر چیز بدل گئی، مذہب کو بھی اس طور پر تبدیل کیا گیا کہ اس کے ذریعے سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو سکے۔ یہاں جس نئے معاشرے کا تصور اینگلز پیش کر رہا ہے اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے نہ خود اس نے یہ زحمت گوارا کی کہ کسی تاریخ کا حوالہ دے دیتا۔

جدید مذہب کس طرح وجود میں آیا

ایک نامعلوم زمانے میں نجی ملکیت کے اصول کو معاشی اور معاشرتی زندگی کی بنیاد فرض کر لینے کے بعد اینگلز یہ نرالا مفروضہ پیش کرتا ہے کہ "اس غیر معلوم وقت کے بعد سے عالم انسانیت پر جتنی بھی مصیبتیں اور تباہیاں نازل ہوئیں وہ سب ہی معاشی نوعیت رکھنے والی تھیں۔ انسان کے اچھے یا بُرے خیالات مروّت و اخلاق یا محبت و نفرت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

اینگلز کے اس بیان سے صاف طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف پوری انسانی تاریخ کو جھوٹا قرار دینے پر تل گیا ہے بلکہ ان تمام اسباب و محرکات کا بھی انکار کرنے پر اتر آیا ہے جن کی بدولت تاریخی واقعات کا صدور عمل میں آتا ہے۔ نیز عالم انسانیت پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ بھی تمام کی تمام معاشی ہرگز نہیں ہوتیں لیکن اینگلز اس قدر تنگ ذہنی میں مبتلا ہوگیا ہے کہ وہ ان تمام کو صرف معاشی قرار دینے پر مُصر ہے۔

اس کے بعد وہ تمام مذاہب کی تاریخ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے خود تاریخ کے منہ میں اپنی من گھڑت کہانی اس طرح ڈالتا ہے کہ "جس طرح زمانۂ قدیم کے لوگوں نے فطرت کی قوتوں کے پیدا کردہ حوادث اور مصائب کی روک تھام کیلئے مذاہب گھڑ لیے تھے بالکل اسی طرح اس مرحلے پر بھی لوگ مذہب کی طرف رجوع ہوئے تاکہ معاشی استحصال کی قوتوں سے جو ان کی زندگی کے رگ و ریشے میں داخل ہوگئی تھیں کچھ بچاؤ حاصل کر سکیں۔ اب لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مذہب کو اس طرز پر مرتب کیا جائے کہ وہ معاشی قوتوں کی فراہم کردہ منظم تکالیف اور مصائب سے لوگوں کی حفاظت کر سکے یا ان کو کچھ کم کر سکے۔ اس طرح ارتقا کے اس تیسرے دور میں جدید مذہب کی شکل اور اس کے مقصد دونوں ہی کو معاشی طور پر پیدا ...

۲۱ اپریل ۱۹۹۰ء

نے متعین کیا۔"

اینگلز کے وہم کے سوا ایسے کسی جدید مذہب کا سراغ تاریخ میں تو ملتا نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس دنیا نے کم و بیش یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال سے دنیا میں کوئی نیا مذہب پیدا ہی نہیں ہوا۔ متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ اسلام دنیا کا آخری دین ہے پھر اینگلز بار بار دین میں جس ترمیم و تنسیخ کا ذکر کرتا ہے اور ہر مرحلے پر اس کی ایک نئی ترتیب و تدوین سامنے لاتا ہے اس کا بھی تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دین تو کہتے ہی اس کو ہیں جو پائیدار اور ناقابلِ ترمیم بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس کی بھی سب سے بہتر مثال اسلام ہی نے قائم کی ہے۔

لیکن دنیا کے تمام مسلّمہ حقائق اور محکم تاریخی شواہد کو جھٹلاتے ہوئے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اینگلز اس ہٹ دھرمی پر قائم ہے کہ "زمانۂ قدیم میں جب سے نجی ملکیت کا طریقہ رائج ہوا تھا اس وقت سے لے کر آج تک مذہب کی تشکیل اور اس کی تنظیم معاشی بنیادوں پر ہوتی چلی آ رہی ہے یہ سمجھنا کہ اس کائنات کا فی الحقیقت کوئی خالق ہے اور اس نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ سے دنیا میں مذہب کو بھیجا ہے (معاذ اللہ) بالکل مہمل اور جاہلانہ توہم پرستی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

اینگلز خود اپنے الفاظ میں مذاہب کی حقیقت اس طرح بیان کرتا ہے،

"تمام مذاہب انسانی توہمات کے پیدا کردہ مہمل اور بے اصل گھروندے ہیں۔ ایسے توہمات کے جو مختلف زمانوں میں لوگوں کے ذہنوں میں اُن قوتوں کے خوف اور دہشت سے پیدا ہوتے رہے ہیں جو قوتیں خارج سے انسانی زندگی پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔۔۔ ان قوتوں میں ایک جانب فطرت کی قوتیں ہیں اور دوسری جانب سماجی قوتیں ہیں جو یکساں طور پر انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہیں۔۔۔ ابتداءً ان میں سے ہر قوت کو ایک خدا سمجھا گیا۔ اس طرح کثرت پرستی وجود میں آئی لیکن رفتہ رفتہ اتنا ارتقاء ہوا کہ ان سب نے مل کر ایک قادرِ مطلق خدا کی حیثیت اختیار کر لی۔" (اینگلز)

جدید مذہب کا اصل کردار

مذہب کے روشن چہرے کو مقدور بھر کالا کر چکنے کے بعد اینگلز بزعمِ خود اپنے مفروضہ جدید مذہب کا کردار بھی خود ہی متعین کرتا ہے۔ اور پھر اس کو بھی تاریخ کے چوکھٹے میں اس طرح جمانے کی کوشش کرتا ہے کہ جب سے نجی ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ اس وقت سے مذہب کا اہم ترین فریضہ یہ ہو گیا کہ معاشی قوتوں کی جانب سے عام لوگوں پر جتنی بھی مصیبتیں اور تباہیاں مسلط ہوتی ہیں ان کی تاویلات کرے یا اگر ممکن ہو تو مصیبت زدہ عوام کو اپنے تحفظ کا یقین دلا سکے۔ مذہب کا یہ کردار زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک بہر حال قائم ہے۔

اس تصور میں لینن یہ اضافہ کرتا ہے کہ معاشی قوتوں کے ذریعہ سے جو تباہیاں انسان پر مسلط ہوتی ہیں وہ اُن تباہیوں سے زیادہ سخت اور شدید ہوتی ہیں جنہیں فطری قوتیں فراہم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں مذہب کی بنیادیں اور اس کا کردار زیادہ معاشی ہو گیا ہے اپنے خیال کی وضاحت وہ اس طرح کرتا ہے۔

"جدید سرمایہ دار ممالک میں مذاہب کی بنیاد اصلاً سماجی ہے۔

(جدید سرمایہ دار (تمام غیر اشتراکی ممالک مراد ہیں) ممالک میں مذاہب کی بنیاد اصلاً سماجی ہے۔ (روحانی یا اخلاقی نہیں) ان جدید مذاہب کی جڑیں محنت کش عوام پر ظلم و ستم ڈھانے کے طریقوں میں مضبوطی کے ساتھ پیوست ہیں۔ انھیں کے بل پر سرمایہ داری کی اندھی قوتیں انھیں قطعی طور پر بےبس و لاچار بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ سرمایہ داری کی یہ اندھی قوتیں ہر روز ہر گھڑی اور ہر وقت ایک ادنیٰ درجے کے محنت کار پر اُس سے ہزار گنا زیادہ مصائب کے پہاڑ توڑتی اور عذاب ڈھاتی رہتی ہیں جتنا عذاب یا مصیبت کبھی اتفاقی طور پر کسی جنگ یا زلزلے وغیرہ سے نازل ہوتی ہے۔"

"خوف نے خداؤں کو جنم دیا ہے۔ اُس خوف نے جو سرمایہ کی اندھی قوت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اندھی اس لیے کہلاتی ہے کہ عوام اس کے کسی اقدام کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ قوت زندگی میں ہر ہر قدم پر محنت کش اور چھوٹے کاروباریوں کو ایسی اچانک غیر متوقع اور ناگہانی تباہیوں اور بربادیوں کے خطرات سے خوفزدہ رکھتی ہے جن کے جلو میں گداگری، افلاس، ناداری، عصمت فروشی اور فاقہ کشی کی موت جیسے بھیانک انجام ہوتے ہیں۔ یہ ہے موجودہ مذہب کی حقیقی جڑ جسے ہر مادہ پرست کو۔ اگر وہ ہمیشہ کے لیے مادہ پرستی کی پہلی منزل ہی میں رہنا نہیں چاہتا تو۔ سب سے مقدم اور سب سے بالا طور پر اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

"لینن"

لینن نے دراصل اینگلز کے حقیقی مدعا کو زیادہ واضح کر دیا ہے اور اس راز کو بالکل کھول دیا ہے کہ مذہب کی حقیقت کچھ نہیں یہ صرف خوف کا ایک نفسیاتی ردِ عمل ہے۔ جس کا اظہار وہمی اور کمزور انسان ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔ ابتداءً وہ فطرت کی قوتوں سے ڈرتے تھے اس لیے انہوں نے اس وقت اپنے دل کی تسلی کے لیے جن توہمات کو جنم دیا ان کا نام مذہب رکھ لیا تھا۔ اب موجودہ زمانے میں ان کا سامنا معاشی نظام کی خفیہ اور پُراسرار قوتوں سے ہے چنانچہ جب تک ان قوتوں کے اقدامات غیر واضح اور غیر متوقع رہیں

سکتے اس وقت تک مذہب ان کی کسی نہ کسی طور پر تاویل یا توجیہہ کرتا رہے گا جس کے سہارے سے وہ معاشی استحصال کے دکھ درد خاموشی اور صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہیں۔ لیکن یہاں لینن کے لیے بھی وہی مشکل درپیش ہے کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جب سرمایہ کے خوف کا ردِعمل کسی نئے مذہب کی ابتداء کا موجب ہوا ہو۔ رہا جدید مذہب کا معاملہ جس کا لینن بھی بار بار اعادہ کرتا ہے بجز افسانہ و افسوں کے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ واقعاتی طور پر جدید دور میں کہیں بھی کوئی نیا مذہب پیدا نہیں ہوا۔ مگر طرفہ تماشا اس کے ساتھ بھی وہی ہے کہ مذہب کے ساتھ بغض و نفرت کا سارا ابھار اس نے تاریخ کا نام لے کر ہی اتارا ہے۔

مذہب کے قیام اور بقا کے بارے میں اینگلز یہ رائے رکھتا ہے کہ در اصل معاشی نظام کی خرابیاں ہی مذہب کے لیے سامانِ بقا فراہم کرتی ہیں چنانچہ جب تک یہ خرابیاں ختم نہیں ہوں گی مذہب بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے گا اور ہر نقصان اور تباہی کے موقع پر لوگوں کو یہ فریب دیتا رہے گا کہ "انسان ارادہ کرتا ہے لیکن خدا اُسے تکمیل تک پہنچاتا ہے" خدا کا یہ تخیل ہی در اصل سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی اساسی قوت ہے۔

انسان نے جس طرح موت کے لازمی خطرے کے ڈر سے امان حاصل کرنے کے لیے روح کے لافانی ہونے کے تصور کو جنم دیا تھا بالکل اسی طرح معاشی غلامی کی درندگی اور مکمل مایوسی کے خطرات سے امان حاصل کرنے کے لیے اس نے مذہبی تصورات کو بھی جنم دے دیا۔ اس طرح نئے مذاہب وجود میں آتے رہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ مذہب اس اس مقصد کو حاصل کرنے میں کس طرح عمل کرتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر اسی وقت واضح ہوتی ہے جب ایک شخص مذہب کی فطرت اور اس کے مقصد کا اشتراکی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔

لیڈروں اور ایڈیٹروں کیلئے مجرب نسخہ

سردار دیوان سنگھ مفتون

چند برس ہوئے پنجاب کے وزیر سردار گیان سنگھ راڑے والا دفتر ریاست میں تشریف لائے آپ کے آنے کا مقصد یہ مشورہ کرنا تھا کہ آپ اپنے روزنامہ اردو اخبار کا ایڈیٹر کسے مقرر کریں، جو پٹیالہ سے جاری کرنا چاہتے ہیں، میں نے پوچھا آپ اس اخبار کے لیے کتنا روپیہ صرف کریں گے تو آپ نے بتایا کہ دس ہزار روپیہ کا انتظام کیا ہے میں نے ان سے تمام حالات سننے کے بعد کہا کہ نہ صرف دس ہزار کے سرمایہ سے ایک روزانہ اخبار جاری کرنا سخت غلطی ہوگی، بلکہ کسی بھی لیڈر کا اپنا اخبار جاری کرنا ایک غلط ترین قدم ہے، جس کی دو وجوہ ہیں۔

ایک تو یہ کہ اپنا اخبار جاری کرنے کی صورت میں دوسرے تمام اخبارات تجارتی رقابت کے باعث اس لیڈر کے دشمن ہو جاتے ہیں، دوسرے جب لوگوں کا پراپیگنڈہ کرنے کے باعث یہ علم ہوتا ہے کہ پراپیگنڈہ کرنے والا اخبار اس لیڈر کی ملکیت میں ہے تو اس اخبار کے پراپیگنڈا کا پبلک پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور پبلک محسوس کرتی ہے کہ یہ اخبار اپنے مالک کی قصیدہ خوانی کرتا ہے۔

میرے اس جواب پر سردار گیان سنگھ نے سوال کیا کہ پھر اپنے حق میں پبلک رائے پیدا [illegible] کرنے کے لیے لیڈروں کو کیا کرنا چاہیے تو میں نے بتایا کہ دوسرے اخبارات کے ایڈیٹروں اور مالکان سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے جائیں اور چھوٹے اخبارات کو نقد روپیہ بطور امداد دیا جائے اور جن بڑے اخبارات کا ضمیر کم روپیہ سے نہیں خریدا جا سکتا، ان کے ایڈیٹروں اور مالکان کی دعوتیں کی جائیں، چنانچہ میں لیڈروں اور ایڈیٹروں کی کامیابی کے لیے چند مجرب نسخے لکھتا ہوں اور بلاشبہ مفید ہیں۔

لیڈروں کے لیے

(۱) اپنا ذاتی اخبار کبھی جاری نہ کریں، کیوں کہ اپنا ذاتی اخبار جاری کرنے کی صورت میں تجارتی رقابت کے باعث دوسرے تمام اخبار اس لیڈر کے خلاف ہو جائیں گے اور قدم قدم اس کی مخالفت کریں گے۔

(۲) اپنا اخبار جاری نہ کرنے کی صورت میں لیڈر کو چاہیے کہ وہ فاقہ کش اور مالی مشکلات میں مبتلا چھوٹے اخبارات کا ضمیر خریدنے کے لیے ان اخبارات کو کبھی کبھی مالی امداد دیا کرے تاکہ یہ اخبارات اس لیڈر کے بیانات اور تصویریں شائع کریں اور اس کے حق میں ایڈیٹوریل لکھیں۔

(۳) اگر لیڈر منسٹر ہو یا گورنمنٹ پر اس کا اثر ہو تو لیڈر اپنے اثرات استعمال کرتے ہوئے ان اخبارات کے لیے سرکاری اشتہارات کا انتظام کرے یہ اخبارات سو دو سو کی تعداد میں ہی کیوں نہ چھپتے ہوں۔

(۴) اگر اخبار زیادہ اشاعت رکھتا ہو اور تجارتی اعتبار سے کامیاب ہو تو اس اخبار کے مالکان کو نقد روپیہ کبھی پیش نہ کیا جائے کیونکہ چند سو یا ایک یا دو ہزار روپیہ دینا اخبار کے مالک کے لیے باعث کشش نہ ہوگا، اس اخبار کے مالک و ایڈیٹر کو اپنے ہاں آنے کی دعوتیں دی جائیں اور ان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کی جائیں اور کبھی کبھی کوئی قیمتی شے، مثلاً ریشمی ساڑھی کوئی جڑاؤ نیکلس، بڑا ڈائمنڈ رنگ یا موسمی پھل آم وغیرہ بھیجے جائیں۔

(۵) کامیاب اخبارات کے سب ایڈیٹروں کو کبھی کبھی نقد روپیہ، وہسکی کی چند بوتلیں یا کپڑے کے تھان بھیجے جائیں تاکہ ان لوگوں کی بھی ہمدردی حاصل کی جائے اور یہ لوگ خبریں ترتیب دیتے وقت اس لیڈر کے حق میں عنوانات قائم کریں۔

(۶) لیڈر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے ووٹروں کے حلقے میں کسی ایک فرد کو بھی بددل یا ناراض ہونے کا موقع نہ دے۔ چاہے اسے لوگوں سے جھوٹے وعدے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں۔ کیونکہ ووٹر اگر بددل ہوں گے تو اس لیڈر کے حق میں ووٹ نہ دیں گے اور الیکشن میں ناکامی ہوگی۔

(۷) لیڈر تقریر ضرور کر سکتا ہو اور اگر تقریر نہ کر سکتا ہو تو یہ تقریر کرنے کی مشق کر لے اس کی تقریر میں جوش ہونا چاہیئے لوگوں کو بیوقوف بنانے پر قادر ہو ورنہ اچھی تقریر نہ کرنے کی صورت میں لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

(۸) لیڈر کو چاہیئے۔ الیکشن کا زمانہ قریب ہو، تو اپنے حلقہ کے لوگوں سے زیادہ اخلاص اور محبت کا اظہار کرے کوئی با اثر ووٹر بیمار ہو تو اظہار ہمدردی کے خیال سے اس ووٹر کے گھر چلا جائے۔ اور ادنیٰ لوگوں سے بھی مسکرا مسکرا کر اور ہاتھ باندھ کر ملے۔

(۹) الیکشن کے زمانے میں لیڈر کو چاہیئے کہ وہ کوشش کرکے افتتاحی تقریبوں میں حصہ لے یہ رسم افتتاح چاہے کسی ہوٹل، دواخانہ یا جوتوں کی دوکان کے سلسلہ میں کیوں نہ ہو، تاکہ ایسے مواقع پر اپنے ووٹروں سے میل جول پیدا کر سکے۔

(۱۰) لیڈر کو چاہیئے، کہ وہ کچھ غنڈوں کو بھی اپنے ہاتھوں میں رکھے تاکہ اس کے طلب کئے گئے جلسوں میں یہ غنڈے زندہ باد کے نعرے بلند کریں۔ اور اگر کوئی شخص جلسہ میں مخالفت کرے تو اُن کو آواز پیدا کرنے سے روک سکیں۔

(۱۱) لیڈر کا فرض ہے کہ وہ مقامی حکام مثلاً مجسٹریٹ اور پولیس افسروں سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھے تاکہ اگر کوئی ووٹر جرم کرے تو لیڈر اس کی سفارش اور امداد کر سکے۔

(۱۲) لیڈر کو چاہیئے کہ اگر کوئی پبلک کی طرف سے اُسے کوئی تھیلی پیش کرے تو وہ یہ روپیہ کسی مقامی سکول، کالج یا انسٹی ٹیوٹ کو دے تاکہ لوگوں پر اس کے ایثار و قربانی کا اثر ہو

(۱۳) لیڈر کے لیے مناسب ہے کہ وہ خود روپیہ پرمٹوں کے ذریعے پیدا کرے اور پرمٹ اپنے کسی دوست کے نام سے لے کر اس میں اپنا حصہ مقرر کرے تاکہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ مل سکے۔

(۱۴) لیڈر کے لیے مناسب ہے کہ وہ کبھی اپنے نام جائداد نہ خریدے اور نقد روپیہ اپنے اپنے قابل اعتماد دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس بطور امانت رکھے تاکہ ضرورت کے وقت ان سے لے سکے اور روپیہ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ ہو۔

(۱۵) لیڈر کے لیے مناسب ہے کہ وہ کسی بینک یا ساہوکار کا تھوڑا بہت قرضہ بھی اپنے نام رکھے، تاکہ لوگ اس کو مقروض اور دیانتدار سمجھیں۔

اخبارات کے ایڈیٹروں کے لیے

(۱) ایک کامیاب ایڈیٹر کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کرسی پر سریش قسم کی کوئی شے لگی ہو، تاکہ وہ اس پر جم کر بیٹھا رہے اور زیادہ سے زیادہ کام کر سکے۔

(۲) ایڈیٹر کو کسی بھی پارٹی یا جلسہ میں نہ جانا چاہیئے تاکہ لوگ اس کے سوشل تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پالیسی میں مداخلت نہ کریں۔

(۳) اخبار کے ایڈیٹر کو شادی بھی نہ کرنا چاہیئے۔

باقی صہ ۳ پر

بقیہ: کھجور کا پہلا درخت

نے ایک عرب مجاہد اور عرب کے ایک درخت کے درمیان تقابل کے لیے ایک قدرِ مشترک تلاش کر لی ہے جو یہ ہے کہ وہ دونوں ہی اپنے اپنے وطن سے دور ہیں اور جس طرح عرب مجاہد اپنی وادی سے دور ہونے کی وجہ سے بیقرار و ناصبور ہے اسی طرح کھجور کے درخت کو بیقرار اور اداس تصور کرتا ہے اور اس سے اپنائیت کے لہجہ میں کہتا ہے کہ میری طرح شاید تو بھی دیس چھٹنے پر بے چین و ناصبور ہے۔

اس جگہ اقبال کا سادہ لہجہ ان کے اعلیٰ تخیل اور دلفریب اندازِ بیان کا آئینہ دار ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں عبدالرحمٰن کی زبان سے کھجور کے درخت کے لیے پرخلوص جذباتی انداز میں دعائیہ کلمہ سن کر ہمیں اقبال کی وہ دعا یاد آنے لگتی ہے جو انہوں نے اپنی والدہ مرحومہ کو یاد کرتے ہوئے دی تھی کہ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اپنی والدہ کے مرثیہ میں جو کام "سبزۂ نورستہ" سے لیا ہے وہی کام یہاں "نمِ سحر" کر رہا ہے۔ زندگی کی رعایت سے "نمِ سحر" کو کھجور کے درخت کے حق میں ساقی کا خطاب دے کر اس شعر میں ایسی کیفیت سمو دی گئی ہے جو بیان کرنے سے زیادہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔

نظم کے دوسرے بند میں اقبال کا وہ نقطۂ نگاہ واضح ہو جاتا ہے جس نے اقبال سے عربی اشعار کا ترجمہ کروایا ہے۔ یہ بند اقبال کی اپنی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کو عرب مجاہدین کی یہ خطر پسندی بہت بھاتی ہے کہ وہ اپنے وطن کی جاں بخش فضاؤں اور محبوب نخلستانوں کو خیر باد کہہ کر ہر طرح کے خطرات مول لیتے ہیں اور سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے اندلس کی سرزمین پر فاتحانہ داخل ہو سکتے ہیں۔ اقبال کو ان کے اس سرفروشانہ اندازِ زندگی میں خودی کا پرتو نظر آتا ہے اور وہ ان کی جدوجہد پر بے ساختہ اور والہانہ داد دیتا ہے ؎

ہمت کو شناوری مبارک
پیدا نہیں بحر کا کنارہ

اقبال ہر بڑے اور پُرخطر کام کا محرک جذبۂ عشق کو قرار دیتا ہے جو خودی کی اساس ہے۔ وہ باعمل زندگی کو ایسی مقدس آگ سمجھتا ہے جس سے فتح و کامرانی کے شرارے اُٹھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بے عمل اور مرعوب لوگ محض راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتے ہیں۔ اسی خیال کی وضاحت میں کہتا ہے ؎

ہے سوزِ دروں سے زندگانی
اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ

اس بند کے آخری شعر میں ایک اور نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کو اقبال نے اپنے کلام میں مختلف طریقوں سے جگہ جگہ بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کے وطن کی کوئی جغرافیائی حدبندی نہیں کی جا سکتی۔ اسے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ ؎

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اقبال خود اپنے متعلق بھی کہتا ہے کہ ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

اقبال کے نزدیک ملت کے سامنے وطنیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس طرح اس نظم کو ختم کرنے پر ہمارے دلوں پہ یہ تاثر نقش ہو جاتا ہے کہ فطری حب الوطنی کے باوجود مسلمان اپنے عمل کی بے پناہ قوت سے ہر ماحول پر چھا سکتا ہے ہر جگہ رس بس سکتا ہے اور ہر ملک کو اپنا وطن بنا سکتا ہے۔

فنی طور پر بھی یہ نظم اقبال کے آرٹ کے بہترین نمونوں میں سے ایک ہے اور اقبال کی چھوٹی نظموں میں سب سے اچھی نظم ہے۔ اقبال نے عربی اشعار کے مصنف کی سادگی، بیان کی بے ساختگی اور جذبات کی Directness

کے پیشِ نظر اس نظم کی بحر بھی آسان اور سادہ منتخب کی ہے اور یہی خیال بندشِ الفاظ اور تراکیب میں ملحوظ رکھی ہے۔ نظم کا پہلا ہی شعر ہے

میری آنکھوں کا نور ہے تو
میرے دل کا سرور ہے تو

اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جس دل کی یہ آواز ہے اسے تصنع چھو تک نہیں گیا ہے۔ آگے چل کر طرزِ بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ خود اقبال کے فن کی پرکاری بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ عبدالرحمٰن اول اور کھجور کے درخت یعنی محب اور محبوب کے جذبات میں تواتر کے ساتھ مماثلت دکھائی گئی ہے۔ دونوں کے اپنی وادی سے دور ہونے، اپنی بچھوڑی ہوئی منزل کو یاد کرنے اور نا صبور ہونے کی وجہ



سے نظم میں ایک دلکش ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔
نظم کا دوسرا بند فنی نقطۂ نظر سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہم بھی ہے اور شاندار بھی۔ اقبال کی شاعری کا کمال اس کی رمزیت میں بھی پوشیدہ ہے جیسا کہ خود کہتا ہے ؂

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است

وہ اس صنعت کو ایسی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ کلام حسن و رعنائی کا پیکر بن جاتا ہے اور اشکال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ رمزیت کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کم الفاظ میں بہت بڑی باتوں کی طرف اشارہ کر جاتا ہے۔ اقبال نے اس بند میں ایسے رموز کنایے برتے ہیں جن سے پڑھنے والے کو مسلمان قوم کی پچھلی تاریخ یاد آ جاتی ہے۔ وہ اقبال کے تخیل کے پروں پر اڑتا ہوا تصورات کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسپین کو عربوں کے ہاتھوں فتح ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ ساحلِ سمندر پر طارق کا کشتیوں کو جلا دینا۔ مسلمانوں کی محیر اسرار مخلوق کی مانند پیش قدمی اور پھر ؂

دونیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

وہ ساری باتیں اس بند کے اشعار میں مستعمل چند کنایوں کی بدولت قاری کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں مثلاً ؂

ہمت کو شناوری مبارک

میں ہمت سے مراد عربوں کی شجاعت اور خطر پسندی ہے اور شناوری کا اشارہ بحرِ روم میں عربوں کی فاتحانہ شناوری کی طرف ہے۔
اقبال بقول یوسف حسین خان تشبیہوں کے بادشاہ ہیں اور ان کو برمحل استعمال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس نظم میں صحرائے عرب کی حور اور نخلِ طور وغیرہ تشبیہات کے علاوہ اقبال نے ایہام سے بھی کام لیا ہے مثلاً ؂

صبحِ غربت میں اور چمکا
ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

اس شعر میں شام کے دو معنی ہیں ایک قریب دوسرے بعید اور اہلِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال کا اشارہ کس طرف ہے۔
مجموعی طور پر یہ نظم پیکرِ عمل، خودآگاہ مردِ مومن عرب مجاہد عبدالرحمٰن اوّل اور دوسرے خطر پسند مجاہدینِ اسلام کے لیے اقبال کی طرف سے ہدیۂ تبریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں نظریہ خودی کی تبلیغ بھی کر دی ہے مگر اس طرح کہ اندازِ بیاں ہر جگہ شاعرانہ ہی رہا ہے واعظانہ کہیں نہیں ہوا۔

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی
بعدالت جناب فخر حیات سول جج رینٹ کنٹرولر، بااختیارات جج فیملی کورٹ لاہور

دعویٰ دیوانی 75 - F.C/86

خلیل اختر ولد غلام علی قوم ہاشمی قریشی ساکن مکان الف ۲۲۹۵ - اڈا تیلیاں چونہ منڈی - لاہور (مدعی)
بنام مسمات نرگس (مدعا علیہ)
بادعویٰ اعادہ حقوق زن شوئی
مسمات نرگس بانو زوجہ خلیل اختر دختر فضل محمد قوم راجپوت معرفت فضل محمد چار شاپ ملحقہ ملک ریڈیو سروس، اکبر روڈ۔ اڈہ ہرتیاں اوکاڑہ ضلع ساہیوال۔

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی مدعا علیہا مذکورہ تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے اس لیے اشتہار ہذا بنام نرگس بانو مدعا علیہا مذکورہ جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہا مذکورہ تاریخ ۳ مئی ۱۹۷۵ء بوقت ۹ بجے کو حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آئے گی۔
آج بتاریخ ۲ اپریل ۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج
مہر عدالت

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیّار جاسوس

تحریر: چوہدری محمد حسین ریٹائرڈ [illegible]

اگرچہ میں

بڑے سکون سے بیٹھا رہا، گویا کتوں کے معاملہ میں بڑا بہادر تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ریڈنگ پارٹی کے پاؤں کی معمولی سی آہٹ بھی رات کی خاموشی میں اُسے ہوشیار کر دینے کے لیے کافی ہو گی، اور اگر ہم اُسے تکلیف دہ پاکر بھاگنے کی کوشش کریں گے، تو ممکن ہے وہ ہمیں کاٹ لے، ایسے موقع پر کتے کا محض بھونکنا بھی اس کے کاٹ کھانے سے کہیں زیادہ خطرات کا حامل تھا۔)

میں: آپ کا کتا کیسا ہے، مجھے تو بڑا ظالم دکھائی دیتا ہے۔

گیانی: نہیں، یہ تو بڑا پیار کرنے والا ہے، اُس کی موجودگی محسوس نہ کریں۔ وہ محض کھیل رہا ہے، آپ کو اس سے ذرہ بھر بھی پرخاش نہ رکھنی چاہیئے۔

میں: مجھے تو اس نے کاٹ کر خوش آمدید کہا تھا

گیانی: یہ بالخصوص ہر اجنبی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تاآنکہ نئے آنے والے سے اس کی پوری طور پر واقفیت نہ ہو جائے، مجھے اس کے کاٹنے کا افسوس ہے، لیکن یہ بیمار یا زہریلا نہیں ہے؟ اس کا مجھے یقین ہے،

(گیانی صاحب کی وضاحت اگرچہ خاصی اطمینان بخش تھی، تاہم یہ ایک اور خطرے کو ٹالنے کے قابل نہ تھی، یہ بات بالکل تاروں بھری تھی، گیانی کا گھر اگرچہ بڑی سڑک کے قریب تھا لیکن دو اطراف سے انتہائی پُر سکون سبزہ زاروں سے گھرا ہوا تھا۔ اس کی تیسری جانب چھوٹے چھوٹے مکانات اور جھونپڑیاں جھاڑیوں سے اٹی ہوئی، پھیلی ہوئی تھیں، یہ دیکھ کر مجھے ڈر لگا کہ کہیں ریڈنگ پارٹی راستوں کی یکسانیت میں اپنی راہ نہ بھول جائے یا کہ عجائب سنگھ رات کی وقت اسی ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم سے کھو نہ جائے۔

مزید براں یہ مکان دیہات کی روایتی خاموشی کے ساتھ قدآدم فصلوں اور گھنے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی تقریباً آدھ درجن کھڑکیاں فصلوں کی جانب کھلتی تھیں، اس کے سامنے ایک نہایت منضبط باغیچہ تھا، جو گملے میں لگے ہوئے پودوں سے بھرا ہوا تھا، جہاں آدمی آسانی سے دبک کر بیٹھ یا چھپ سکتا تھا۔ عقبی صحن بھی پھلدار درختوں سے اٹا پڑا تھا اور نیلے آسمان کے نیچے سبزے کا خیمہ محسوس ہوتا تھا۔

ایسے پُر اسرار گھر کا پہرہ دار کتا بنے بنائے کھیل کی تباہی کا باعث ہو سکتا تھا، وہ ہم پر بھونک کر سب کو ہوشیار کر سکتا تھا، عجائب سنگھ کو بھی یہ شک گزر سکتا تھا کہ اسماعیل کے ساتھ آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد ممکن نہیں۔ لہذا وہ بھی پچھلے دروازے سے باآسانی کھسک کر پھر کسی چوبے کے بل کے راستے ہماری دسترس سے پرے کھیات کی تاریکی میں سائے کی طرح گم ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ڈرے ہوئے ہرن کی طرح وہ چھت پر سے چھلانگ سکتا یا ہمارے پاس سے اندھیرے میں بغیر پتہ چلے بھاگ سکتا تھا، اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا، اگر ایسا ہو جاتا تو پھر مستقبل میں کبھی بھی اُسے ڈھونڈھ نکالنا ممکن نہ تھا۔ اُس کے ایک دفعہ صاف بچ نکلنے کی صورت میں اُسے دوبارہ پالینا قطعی ناممکن تھا، غرضیکہ میں نے محسوس کر لیا کہ گیانی کے مکان کے محل وقوع اور گرد و پیش کے اشجار و سبزہ زاروں کے پیش نظر ہر لحظ کسی بڑی لغزش کے امکانات موجود ہیں۔)

میں: گیانی صاحب، آپ کتنے بامروّت ہیں؟ آپ

باقی صفحہ ۲۲۴ پر

بقیہ: مسلمانوں کی نفسیات

جوآمدی لائسنس نہیں ملتے یا ان کو کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنے کیلئے کوئی موخر امداد نہیں دی جاتی یا تجارتی میدان میں ان کے قدم آگے نہیں بڑھتے یا سرکاری طور پر ان کے مسائل پر توجہ نہیں دی جاتی، تو مسلمان اپنے طور پر عدم تشدد اور آئینی طریقوں سے اپنی جد وجہد آزادی کی رفتار تیز کر سکتے ہیں، بلکہ ہر مشکل کو انگیز کر کے اپنے لیے کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر سکتے ہیں۔ صرف ایک شرط ہے کہ اقلیت کش فسادات کا سلسلہ بند ہو، اور پولیس کی زیادتیوں کا خاتمہ ہو جائے اور ان کا جان و مال محفوظ رہے تو ان کی مایوسیوں کے بادل آسانی سے چھٹ سکتے ہیں، اور ان کا یہ خیال پختہ ہو سکتا ہے کہ انہیں سرکاری ملازمتیں نہ ملیں، مسلم یونیورسٹی کا تعلیمی کردار مجروح ہوتا رہے۔ اُردو زبان کو اس کا جائز حق کچھ عرصہ تک اور نہ ملے مگر ان کے خلاف فسادات کا طویل ترین سلسلہ بند ہو جائے اور حکومت ان کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لے تو وہ اپنا مستقبل آپ بنا سکتے ہیں،

یوں سمجھیے، کہ مسلمان مایوس نہیں ہیں مگر جان و مال کی طرف سے مطمئن بھی نہیں ہیں — بڑی مصیبت یہی ہے کہ پولیس مقابلے پر



کسی خاص جذبے کا اظہار کرتی ہے اور حیرت اس پر ہے کہ — اس کی زیادہ تر پارلیمنٹ میں پردہ ڈالنے کے لیے خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے —،

بلاشبہ حکومت اقلیت کش فسادات کی تلافی کے لیے عازمین حج کو سہولتیں دیتی ہے، محرم میں تعزیے بھی نکلوانی ہے اور ان سے فوڈ مسلم ممالک کو مہیا کرتی ہے، مزارات پر عُرس بھی دھوم دھام سے ہوتے ہیں اور ان کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ کم از کم حکومت ایسی تقریبات میں مداخلت نہیں کرتی بلکہ ان کو شہرت دیتی ہے اور اس تدبیر سے آٹھ نو ہزار فسادات کی تلافی ہو جاتی ہے۔

ہمارے راہ نما ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات کا پورا جائزہ نہیں لیتے۔ ایک راہ نما کو مسلمان مجسم مایوس نظر آئیں گے، دوسرے راہ نما کو یہ بھی نظر نہ آئے گا، کہ مسلمانوں کی مشکلات کیا ہیں اور ان کی راہ میں کون سی چٹان اڑی ہوئی ہے، اصل حقیقت واضح ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان کی مشکلات پر حکومت ہی قابو پا سکتی ہے، سوا انہیں دُور رکھنے کا راستہ یہی ہے کہ آئین کے اندر رہتے ہوئے پورے عزم و یقین کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا جائے اور اپنے کسی ادنیٰ مطالبہ پر بھی نرمی اختیار نہ کی جائے، عزم و ہمت ایک بڑی طاقت ہے۔ گرے ہوئے حالات میں یہی طاقت کام دے سکتی ہے اور ابھی اسی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔

بقیہ: دارالمصنفین

ہوتی رہی مگر دونوں ملکوں کے تعلقات کے نشیب و فراز کی وجہ سے اس کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ پاکستان کے ناشروں اور تاجروں سے بھی برابر امید رہی کہ اگر وہ اس ادارہ کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم ان سے نقصان نہ ہو مگر آپ کو بھی علم ہو گا کہ ہمارے ادارہ کی بہت سی کتابیں وہاں چھپنے لگی ہیں۔ جناب افضل اقبال صاحب ہندوستان میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے تو انہوں نے از راہ نوازش پاکستان کی حکومت کی طرف سے ایک ایسا آرڈیننس جاری کرایا تھا۔ جس سے ہمارے ادارہ کی کتابوں کے چھاپنے میں وہاں پابندی عائد ہو گئی تھی۔ میں خود ۱۹۶۹ء میں پاکستان گیا تھا تو جناب ممتاز حسن صاحب سابق سیکریٹری محکمہ خزانہ حکومت پاکستان (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) جناب پیر حسام الدین راشدی، جناب جمیل عالی اور جناب ابن الحسن وغیرہ نے ایک باضابطہ سوسائٹی اور کمیٹی بنائی۔ جس کے ذریعہ وہ ہمارے ادارہ کی مطبوعات کے حقوق کے قانونی محافظ قرار دیئے گئے۔ مگر اس کے بعد ہی دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ جب ڈاک کھلی تو معلوم ہوا کہ ہماری مطبوعات وہاں بکثرت چھاپ لی گئی ہیں۔

اب اگر دونوں ملکوں میں تجارت شروع ہو گی تو ہماری کتابیں وہاں کون منگائے گا۔ اور اس خون کا خون بہا کون ادا کرے گا۔ کیا آپ یا پاکستان کے لوگ پسند کریں گے کہ ہمارا یہ ادارہ مالی دشواریوں میں مبتلا ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ اگر یہ ختم ہو گیا تو نہ صرف آپ بلکہ پاکستان کے لوگ بھی اس علمی عزنا کے لیے خون کے آنسو روئیں گے۔ کیا پاکستان کے لوگ اس منحوس وقت کے آنے سے پہلے ہماری مدد کر سکتے ہیں؟ ہماری سب سے بڑی مدد یہی ہے کہ ہماری مطبوعات پاکستان میں نہ طبع ہوا کریں بلکہ وہاں کے ناشر اور تاجر ہم سے براہ راست منگوائیں۔

خدا کرے آپ کا مزاج گرامی ہر طرح بخیر ہو۔ بے شک یہ خط آپ چٹان میں شائع کر دیں۔

والسلام

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ناظم دارالمصنفین

اعظم گڑھ

۱۲/اپریل ۱۹۷۵ء

مسلمانوں کو پرسکون قیادت کی ضرورت ہے

مضطرب اور مشتعل رکھنے والی قیادت کو مسلمان نہیں چاہتے۔

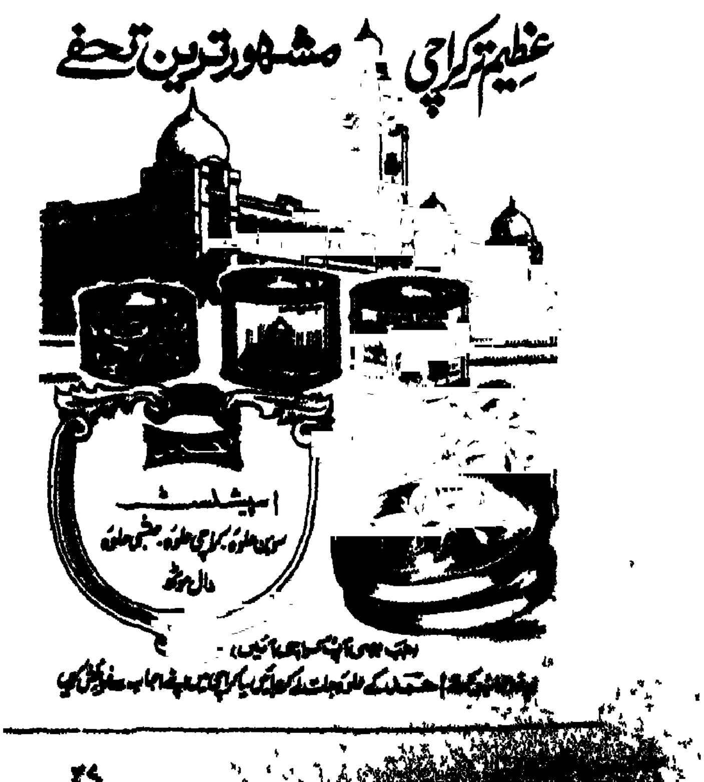
آزادی کے بعد مسلمانوں کی قیادت کا سوال اکثر موضوع بحث بنا رہا ہے۔ عموماً لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟

آزادی سے پہلے کوئی یہ سوال نہیں کرتا تھا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ تاریخ کے اثرات اور جداگانہ نیابت کے اصول نے ہندوستان کے اندر مسلمانوں کو ایک الگ سیاسی اکائی بنا رکھا تھا اس اکائی کا قائد قدرتاً ہمیشہ مسلمان ہوتا تھا خواہ وہ کسی نقطۂ خیال کا ہو۔ یہ تو کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کو صحیح قیادت میسر نہیں، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا تھا کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے۔

دور خلافت کے بعد مسلمانوں کی سیاسی علیحدگی قائم نہ رکھ سکی، یہی عمل دوسرے مذہبی گروہوں پر بھی ہوا، اور وہ زمانہ آیا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاریؒ، حکیم اجمل خانؒ، سی آر داس تک۔ آصف علی، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم وغیرہ ہندو مسلمان سب کے لیڈر کہے جانے لگے بلاشبہ اس زمانے میں بھی ڈاکٹر مونجے، سری ساورکر اور بھائی پرمانند، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خانؒ اور لیاقت علی جیسے لیڈر موجود تھے جو اپنے فرقہ کے راہنما سمجھتے تھے لیکن مختلف مذہبی گروہوں کی علیحدگی تدریج ختم ہو رہی تھی۔ ہندوستانی باشندے ایک قوم بن رہے تھے اور مشترکہ قیادت ابھر رہی تھی، پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس، حافظ ابراہیم رفیع احمد قدوائی اور شیخ محمد عبداللہ وغیرہ سامنے آ رہے تھے۔

کانگریس تو خیر مشترکہ جماعت تھی، لیکن مسلمانوں میں جمعیۃ علماء کے اکابر نے سب سے پہلے اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمان یا کوئی دوسرا مذہبی گروہ جداگانہ سیاسی اکائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ریشمی رومال سازش کے دوران ہی اکابر علماء نے مشترکہ سیاسی جدوجہد کا نظریہ قوم کے سامنے رکھا اور اسے پروان چڑھایا، بعد میں خلافت کی تحریک میں خاص طور سے مسلمان اہل فکر اور علماء کرام نے مہاتما گاندھی کو قومی لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرایا اور خلافت تحریک کو ایک قومی تحریک بنا دیا زمانہ قبل آزادی میں جداگانہ نیابت کے اصول کی وجہ سے جمعیۃ علماء کے مخاطب اگرچہ مسلمان رہے لیکن اس نے کسی وقت بھی یہ نظریہ قبول نہیں کیا کہ ہندو مسلمان الگ الگ اکائی ہیں،

اس سے پہلے جب مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل میں ہندوستان کی پہلی آزاد حکومت قائم کی تو اس کا صدر بھی ایک ہندو راجہ مہندر پرتاپ کو



[illegible] مسلمانوں کی
علیحدہ سیاسی اکائیوں کے تصور پر ضرب لگائی، اور مشترکہ قومیت کے رجحان کو فروغ دیا اور نئے ہندوستان میں ایک ایسے ہندوستان کی تشکیل میں جس میں تمام شہریوں کو بلا اختلاف مذہب، رنگ و نسل اور زبان مساوی حقوق حاصل ہوں، علماء کرام کا اتنا عظیم حصہ ہے کہ اسے تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

یہ عمل اب بھی بند نہیں ہوا ہے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور قومی سطح کے مسلمان لیڈروں میں شیخ عبداللہ کے علاوہ فخرالدین علی احمد (حال صدر جمہوریہ ہند) جنرل شاہنواز، مولانا اسعد مدنی، زیڈ احمد مرحوم، کامریڈ مقیم الدین فاروقی (کمیونسٹ پارٹی) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ہم نے جن ممتاز مسلمان وغیرہ کے نام لیے ان میں سے بعض حکومت میں شریک ہیں، مثلاً: مسٹر فخرالدین علی احمد اور شیخ عبداللہ اور بعض حزب اختلاف اور حزب اقتدار میں نمایاں اور کلیدی حیثیت کے حامل ہیں، مثلاً کامریڈ مقیم الدین فاروقی وغیرہ۔

قومی زندگی کے شعبوں میں بھی مسلمان اسی طرح ممتاز حیثیتوں پر فائز ہیں۔ اور اپنے فرقہ کی ہی نہیں بلکہ دوسرے مذہبی گروہوں کی قیادت بھی انہیں حاصل ہے، اس لیے اس دعوے کی کوئی بنیاد نہیں رہ جاتی، کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے تاہم یہ دعویٰ کیا جاتا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟

یہ دعویٰ وہ لوگ بالعموم کرتے ہیں جن کی خواہش ہے کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت جداگانہ سیاسی اکائی بن کر رہے، یہ لوگ محسوس نہیں کرتے کہ جدید طرز کی سیکولر اسٹیٹ میں مذہبی یا نسلی گروہوں کا الگ سیاسی اکائی بن کر رہنا ممکن نہیں، اس کا اطلاق صرف ہندوستان پر نہیں بلکہ دوسری تمام ریاستوں اور مملکتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ ترکی میں یہودی کردار یا یورپین نسلوں کے لوگ یا یونانی کلیسا کے پیرو عیسائی علیحدہ سیاسی

اکائیاں تسلیم نہیں کیے جاتے [illegible]
کو بھی الگ سیاسی اکائی نہیں مانا جا سکتا۔
زمانہ کی اس عام روش کے برعکس بعض لوگ آج بھی مسلمانانِ ہند کو ایک جداگانہ سیاسی اکائی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کا الگ سیاسی لیڈر ہو۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا ذہن ایک خاص سانچہ میں پختہ ہو گیا ہے، اس لیے یہ کسی مشترکہ لیڈر مثلاً فخرالدین علی احمد یا جنرل شاہنواز کو مسلمانوں کا بھی راہنما ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ان کا ذہن اس بات کو قبول ہی نہیں کرتا کہ فخرالدین علی احمد

بعدالت جناب ملک مشتاق احمد سول جج درجہ اوّل مظفرگڑھ

نمبر مقدمہ ۲۴/۲ ۱۹۷۴ء

شیخ عبدالرحمٰن ولد محمد عبداللہ ذات قریشی ہاندو ساکنہ قصبہ لیہ حال ایل ایف سی دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب مظفرگڑھ ...... سائل (مدعی)

بنام عوام الناس وغیرہ

(مسئول علیہم)

درخواست حصول سرٹیفکیٹ جانشینی

بنام (۱) عوام الناس

ہرگاہ سائل مدعی نے درخواست بابت حصول سرٹیفکیٹ جانشینی عدالت ہذا میں گزاری ہے لہٰذا ہر خاص و عام کو بذریعہ اشتہار اخبار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کو عذر نسبت درخواست مذکورہ ہو تو وہ اصالتاً یا وکالتاً بتقرر ۳۔ مئی ۱۹۷۵ء کو بوقت ½۹ بجے صبح بمقام مظفرگڑھ حاضر عدالت ہذا ہو کر پیروی و جوابدہی درخواست کریں، ورنہ بعد میں کوئی عذر قابل سماعت نہ ہو گا۔

آج بتاریخ ۲۔ اپریل ۷۵ء کو بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج درجہ اول

(مہر عدالت)

ہیں اور شری جگ جیون رام اور مسز اندرا گاندھی مسلمانوں کی بھی قائد ہیں۔ مزید یہ کہ ہندو مسلم اتحاد کی دلی خواہش اور مسلمانوں کو حکومت یا فوج کے مقابل محاذ آرائی دیکھنے کی آرزو اور آزادی سے پہلے کے ہندو مسلم محاذ آرائی کے دور کو لوٹا دینے کی تمنا جوان کے تحت الشعور میں بسی ہوئی ہے، ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مشترکہ قائدین کو ماننے سے انکار کریں، کیونکہ مشترکہ قائد کو ماننے کا مطلب ہے، فرقہ وارانہ منافرت تیز، فرقہ وارانہ محاذ آرائی کا لازمی خاتمہ۔

ان لوگوں کے ذہن کے مطابق قائد و قیادت وہ ہے جو خم ٹھونک کر اور نتائج سے بے پروا ہو کر حکومت و اکثریت کی مخالفت کرے، ان سے ٹکرائے اور برابر ٹکراتی رہے۔

بعدالت جناب سول جج صاحب جج فیملی کورٹ سمندری۔

مقدمہ نمبر ۳۱۵ ۱۹۷۴ء

بابت تنسیخ نکاح

مسماۃ زہراں بنام نصیر

بنام: نصیر ولد اللہ داد قوم ماچھی ساکن چک ۴۸۷۔ گ ب تحصیل سمندری ضلع لائلپور

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی نصیر احمد ولد اللہ داد تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار مسمی نصیر احمد کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ مورخہ ۲۸۔ اپریل ۱۹۷۵ء کو بوقت ½۸ بجے صبح اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت آوے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ ۸۔ اپریل ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط، سول جج

(مہر عدالت)

[illegible] حالات پہ ہی چھوڑ دیتا [illegible] ہے، یہ لوگ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے وہ خود ہی انہیں صاف کر دے گا۔ لیکن ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ اپنے منفی تنقیدوں اور اشتعال انگیزیوں سے ان مسلمانوں کے ذہن کو اکثر مسموم کر دیا کرتے ہیں، جنہیں حالات کو ٹھیک سے سمجھنے کا وقت نہیں ملتا۔

ان لوگوں کے تحت الشعور سے کھرچ کھرچ کر بھی نہیں نکالی جا سکتی، کہ حکومت وقت انگریزی حکومت کی مانند اجنبی غیر ملکی اور بدخواہ ہے۔ ان کی نظر میں حکومت خواہ وہ کانگرس کی ہو یا کسی دوسری پارٹی کی مسلمانوں سے بالکل لاتعلق اور مسلمان حکومت سے بالکل الگ اور علیحدہ ہیں۔ حکومت کے کام میں انہیں کیڑے نظر آتے ہیں، حکومت یہ کرے تو غلط اور وہ کرے تو بھی غلط۔ اگر فلم، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اقلیتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق امور کو نمایاں کیا جائے تو ان کے نزدیک حکومت کی نیت مشتبہ اور اس کا مقصد رائے عامہ کو گمراہ کرنا اور اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا۔ اگر اقلیت کی مظلومی کے مناظر یا ان کا بیان ان ذرائع ابلاغ پر ہو تو کہا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے جان و مال کا نقصان دکھا کر خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔

یہ بیمار ذہن قوم کی صحت مندی کے لیے یقیناً مضر ہے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اب پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ یعنی کیا ہندوستانی مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے؟ میں اس سے اتفاق نہیں [illegible] حالات اور اتفاقات [illegible] قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صاحب امتیاز مسلمان منصب راہ نمائی پر فائز دیکھے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کو ٹھنڈی اور پُر سکون قیادت کی ضرورت ہے، ایسے لوگ جو صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ پوری قوم کی راہ نمائی کر سکیں، خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کو ایسی قیادت حاصل ہے۔

مضطرب اور مشتعل رکھنے والی اور بے اعتمادی پیدا کرنے والی قیادت کو مسلمان نہیں چاہتے، جو مسلمانوں کو قیادت نصیب نہیں کا نعرہ لگا کر آگے بڑھتی ہے جو قیادت حکومت میں شامل یا سیاسی اقتدار میں شریک مسلمانوں کو حسب موقع اور حسب ضرورت حکومت کا پٹھو، کانگرس کا چمچہ، کمیونسٹوں کا خیمہ بردار وغیرہ القاب سے نوازتی ہے اور اپنی منفی پالیسی و بیمار تنقید سے مسلمانوں کو ہمیشہ مضطرب و مشتعل رکھتی ہے، انہیں غیر ضروری تصادم و ٹکراؤ پر ابھارتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ ہے، جان و مال کی بربادی یہ قیادت مسلمان کو صبر و سکون کے ساتھ اپنے مسائل پر غور کرنے سے روکتی ہے۔ یہ قیادت فضاؤں میں بے اعتمادی کا زہر بکھیرتی ہے۔ حکومت دھوکہ باز اکثریت بے ایمان، لیڈر پیسہ پیسہ پر بکنے والے۔ جس قوم کے حلق سے یہ زہر ہر ساعت اور ہر لمحہ اتارا جائیگا اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ یہ باتیں پوری قوم کے لیے بے اعتمادی جال بن کر اس کو دیوانہ نہ بنائیں گی تو کیا کریں گی۔

ہندوستان میں دوسرے مذہبی گروہوں مثلاً [illegible] اور [illegible] مسائل ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے، کہ ان فرقوں کو ان کی قیادت ان مشکلات و مسائل پر قابو پانے کا اہل بناتی ہے اور مسلمانوں کی یہ قیادت جس کا ذکر اوپر ہوا۔ حکومت کو کوسنے کے سوا کچھ نہیں کرتی، یہ مسلمانوں کو کوئی تعمیری راستہ نہیں دکھاتی، اس کے پاس خدمات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے "مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے" ——— کا نعرہ لگاتی ہے، سیدھے سادھے اور جذباتی مسلمان جو موجودہ سیاست کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھتے، اس شور و غل سے مسحور ہو جاتے ہیں، لیکن پہلی ہی آزمائش میں ان کو اپنے انتخاب کی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگتے ہیں۔

نا بابا ہمیں ایسی قیادت نہیں چاہیئے۔

بقیہ :- ڈاکٹر سید عبداللہ

اپنی تجاویز میں لفظ اسلام کو باہر رکھنے کا خاص اہتمام کیا ہے، حالانکہ یہ مفسد کسی کا نہیں۔

تقریبات اقبال کی رُوح اور اغراض و مقاصد کی بحث ابھی ختم نہیں ہوئی۔ آئندہ کی اشاعتوں میں اس مبحث پر اور پروگرام کے دوسرے حصوں پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ اور مقصد اس کا فقط یہ ہوگا، کہ قومی اقبال کمیٹی جس محنت اور محبت سے تقریبات اقبال کو کامیاب بنانے میں منہمک ہے، ہمارے ان مشوروں سے اسکے پروگرام کی نوک پلک درست ہو جائے گی اور ساری قوم دلجمعی اور بھرپور اطمینان کے ساتھ ان تقریبات میں حصہ لے گی۔

ہمیں اس پروگرام کی کامیابی کا پورا یقین ہے اور جناب پیرزادہ صاحب اور مولانا کوثر نیازی اور ملک معراج خالد بڑی محنت اور انہماک سے اسے کامیاب بنانے میں لگے ہوئے ہیں، لہٰذا التماس ہے کہ پیش کردہ مشوروں پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔

گیارہ گنا سے

۴۹ فیصد سے زائد بلا ٹیکس منافع

نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

بونس ڈپازٹ اکاؤنٹ

■ ملاحظہ کیجئے آپ کا ۱۰۰ روپیہ کس رفتار سے بڑھتا ہے

۱۲ سال میں ۱۱۳۹ روپیہ	۴۹٫۶۵	فیصد کی شرح سے
۴ سال میں ۵۰۶ روپیہ	۲۹	فیصد کی شرح سے
۷ سال میں ۲۲۵ روپیہ	۱۸	فیصد کی شرح سے
۶ سال میں ۲۰۰ روپیہ	۱۶٫۶	فیصد کی شرح سے

■ پورے منافع پر ٹیکس معاف

■ آپ اپنی رقم تین ماہ کے بعد جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں۔

■ ایک سال کے بعد روپیہ واپس لینے پر بھی آپ ۸ - ۱۵ فیصد منافع حاصل کر سکتے ہیں

قومی بچت کے مرکز۔ ڈاک خانے یا بینک میں تشریف لائیے۔

بقیہ: مجرب نسخہ

تاکہ وہ بیوی بچوں کی فکر سے قطعی آزاد ہے۔

(۴) اخبار کے ایڈیٹر کو چاہیئے کہ وہ کسی بھی لیڈر سے دوستانہ تعلقات نہ رکھے، کیونکہ نہ معلوم کب اس لیڈر کی مخالفت کرنی پڑ جائے۔ اور لیڈر کی دوستی اس کی راہ میں مخل ہو۔

(۵) اخبار کا ایڈیٹر جب بھی کوئی مضمون لکھے، تو وہ لکھنے کے بعد یہ دیکھ لے کہ اگر اس مضمون پر مقدمہ چلا تو عدالت میں اس مضمون کے متعلق کیا ڈیفنس ہوگا۔

(۶) اخبار کے ایڈیٹر کو چاہیئے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی اظہار محبت کا کبھی خط نہ لکھے، کیونکہ اگر یہ خط کسی مخالف کے ہاتھوں میں پڑ گیا تو اس خط کو کسی دوسری عورت سے منسوب کر کے اس کو رسوا کر دیا جائے گا۔

(۷) جو اخبارات چھوٹی حیثیت کے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی اشاعت کبھی نہ بتائیں، تاکہ مشتہرین کو تاریکی میں رکھتے ہوئے اشتہار حاصل کر سکیں

(۸) بڑے اخبارات کو اے بی سی کا سرٹیفکیٹ ضرور لینا چاہیئے تاکہ وہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے اشتہارات کے اچھے اور بڑے پروگرام حاصل کر سکیں۔

(۹) جو اخبارات سرکاری اشتہارات لینا چاہیں ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ پبلک کے احساس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صوبے کے وزراء کی پورے زور شور سے حمایت اور تعریف کریں اور ان وزراء کے مخالفین کی مخالفت کرتے رہیں۔

(۱۰) چھوٹے اخبارات ناظرین میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے دس یا پندرہ برس پہلے کے مضامین اور افسانے پھر چھاپ سکتے ہیں کیونکہ ان کے پڑھنے والوں کو کچھ یاد نہیں رہتا کہ یہ وہ مضمون پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔

(۱۱) ایڈیٹروں کو چاہیئے کہ وہ اگر لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اپنے اندر نکتہ چینی برداشت کرنے کی قوت بھی پیدا کریں۔ ہاں اگر کوئی دوسرا اپنی ذاتی اغراض کے باعث ذاتی حملہ کرے، تو اُسے کبھی معاف نہ کریں اور اسے جیل ضرور بھجوائیں تاکہ دوسرے شخص کو ہمت نہ ہو۔

(۱۲) چھوٹا اخبار ہو یا بڑا، اسے چاہیئے کہ فلم ایکٹریسوں کی نیم عریاں تصویریں ضرور شائع کرے کیونکہ ان تصاویر کے ذریعے یہ اخبار اپنے پڑھنے والوں کی جنسی خدمت انجام دیگا۔

(۱۳) اخبار کو خالص تجارتی ادارہ سمجھتے ہوئے اس کے لیے وہ سب کچھ کیا جائے جو اس کے لیے روپیہ لانے کا باعث ہو۔ تاکہ ایڈیٹر صاحب کو محلے کے لوگوں، رشتہ داروں اور دوستوں میں صاحب حیثیت قرار دیا جائے اور سمجھدار پبلک اس کو ناکام جرائم پیشہ لوگوں میں شمار نہ کرے۔

بقیہ: جلاوطن حکومت

صحیح ہے کہ مغربی پاکستان پر ہندو کبھی بھی قبضہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ مسلمانان پنجاب ایک مارشل قوم ہیں اور ہم برصغیر کے مسلمانوں کو فخر ہے کہ ہمارے اندر بھی بہادر بھائی موجود ہیں، ۲۵ سال تک جب ہم پاکستان کے ساتھ رہے کبھی بھی مشرقی پاکستان کا ایک شخص بھوکا نہیں مرا، لیکن آج وہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ مر رہے ہیں۔ ہماری راہ نجات صرف پاکستان میں ہے۔ مغربی پاکستان کی بہادر افواج مشرقی پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کر سکتی ہیں، جیسا کہ وہ ۲۵ سال تک اپنا خون دے کر بھی کر رہے ہیں۔

غالباً آپ کو اس بات کا بھی علم ہوگا، کہ جب ہمارے وزیراعظم پاکستان ۲۵ جون ۷۴ء کو ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے تو لاکھوں کی تعداد میں مشرقی پاکستان کے مسلمان انکے استقبال کے لیے آئے تھے۔ اگرچہ ایک ہفتہ قبل، پاکستانی فوج کے خلاف زہر اگلا جا رہا تھا۔ دراصل اکثریت مشرقی پاکستان کی کبھی بھی نام نہاد بنگلہ دیش نہیں چاہتی تھی۔ عباس صاحب اور ان کے ساتھی کہتے ہیں، کہ ہمارا پرچم وہی ہے جو کہ قائداعظم نے ہمکو دیا تھا، ہمارا مذہب ایک، ہمارا پرچم ایک ہمارا رسولؐ ایک، ہمارا خدا ایک، ہماری کتاب ایک، ہمارا ملک ایک متحدہ پاکستان۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دوبارہ ایک نہیں ہو سکتے۔

میں نے ذاتی طور پر یہاں کی جلاوطن حکومت کے وزیران اور عباس صاحب اور مقامی بنگالیوں سے آپ کی خدمات کے بارے میں تفصیل سے

مناسب ہے اور یہ خط اسی لیے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ اس نیک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اور متحدہ پاکستان کا نعرہ بلند کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریروں اور تقریروں میں حیرت انگیز صفات بخشی ہیں، جو کہ بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہیں، بحیثیت مسلمان ہونے کے جو خدمات آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کے واسطے انجام دی ہیں، اور آج بھی انجام دے رہے ہیں،

امید قوی ہے اس جلاوطن حکومت کو پورا یقین ہے کہ آپ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے متحدہ پاکستان کے حق میں آواز بلند کریں گے، اور ایک بار پھر کربستہ ہو کر ملت اسلامیہ اخوت اسلام کے لیے کوشاں ہوں گے۔ ہم سب کو آپ جیسی عظیم ہستی پر فخر ہے اور ہم تمام آپ کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ کے سرنگوں ہو کر دعا کرتے ہیں، اللہ اپنے حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور صدقے میں ملت اسلامیہ اور متحدہ پاکستان کو دوبارہ قائم کرنے میں آپ کی مدد کرے۔ آمین۔ ہماری نگاہیں آپ کی طرف اٹھ رہی ہیں اور ہم لوگوں کو امید ہے کہ آپ ضرور بالضرور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اس جلاوطن حکومت کی مدد کریں گے تاکہ ہم جلد از جلد ایک ہو جائیں، آپ کو اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جلاوطن حکومت اس لیے قائم کی گئی، کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے بھائی بے بس اور نہتے ہیں، ان کے جذبات و خواہشات کا گلا گھونٹ رہی ہے اور وہ کھلے عام کوئی سیاسی کام کرنے کے قابل نہیں اس لیے عباس صاحب اور ان کے ساتھیوں نے یہ جلاوطن حکومت لندن میں قائم کی ہے، یہ حکومت ان مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی خواہشات اور جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے، "عباس صاحب اور ان کے ساتھیوں کو کسی ذاتی مفادات سے واسطہ نہیں اور جیسے ہی ملک آزاد ہوگا اور وہاں صوبائی حکومت مشرقی پاکستان کے لوگ بنائیں گے، اسی دن اس جلاوطن حکومت کو ختم کر دیا جائے گا، لیکن اگر لوگوں نے حکومت کی باگ ڈور اس جلاوطن حکومت کو دینے کی خواہش کی تو پھر عباس صاحب اور ان کے ساتھی ڈھاکہ میں موجود ہوں گے اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لیے تیار ہوں گے۔

ممکن ہے کہ یہ تحریک متحدہ پاکستان کے واسطے بیرسٹر عباس صاحب نے شروع کی ہے، بھارت کی تباہی و بربادی کا سبب بنے

شاعر مشرق، مفکر اسلام، حکیم الامت علامہ اقبال نے ۱۹۳۷ء میں جس کا آپ کو اچھی طرح علم ——— ایک خط علامہ راغب احسن کو کلکتہ میں لکھا تھا، اور اس میں انہوں نے اس تحریک کی حوصلہ افزائی کی تھی، جو کہ علامہ راغب نے ۱۹۳۱ء میں قائم کی تھی، جس کا نام آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ تھا اور بعد میں اس کو تبدیل کر کے کلکتہ مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں رکھی، ہم جب ایک سال قبل ڈھاکہ گئے تھے تو راغب احسن کو بیرسٹر عباس صاحب کے اوصاف بتائے تھے اور ان کی بے لوث خدمات جو ملت اسلامیہ کے لیے کر رہے ہیں، وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں، انہوں نے اپنی ایک کتاب The Light Comes from the East بطور تحفہ مجھے دی تھی، کہ میں اس کو لندن لے جا کر عباس صاحب کے حوالے کر دوں، انہوں نے یہ جملے استعمال کیے تھے:

"عباس صاحب پاکستان ہی میں نہیں
بلکہ پورے ہندوستان و پاکستان کے
لیے جہاد کر رہے ہیں"

اور دعا کی تھی، کہ اللہ ان کو نیک کام میں کامیاب و کامران کرے۔ یہ پرچم توحید جو عباس صاحب نے اٹھایا ہے، انشاءاللہ یہ صرف متحدہ پاکستان تک ہی نہ رہے گا بلکہ اس کے نتائج دور دراز تک پہنچیں گے۔ انہوں نے بھارت کے ۸ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ اور پاسبانی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مبارک منزل کی طرف لے جائے۔ اور کامیاب و کامران کرے

آج ہمارا ملک بہت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے، پختونستان وغیرہ کے نعرے بلند کیے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو دشمنانِ پاکستان سے بچائے جو ہمیں برباد کرنے کے درپے ہیں، انشاءاللہ مشرقی پاکستان دوبارہ زندہ ہوگا، جس کا ہمیں پورا یقین ہے اور ہم دونوں ایک بھائی ہوں گے۔ پھر دنیا کی طاقت ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

ایک گزارش آپ سے یہ ہے کہ اگر آپ ایک پیغام اس جلاوطن حکومت کے نام بھیج دیں اور اگر ممکن ہو سکے تو پاکستانی پریس سے ہماری حکومت سے تعاون کرنے کے واسطے بھی بیان دیں، معاف کیجیے، کافی وقت ہم نے کا ضائع کیا، آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ لکھنے کے بجائے ہم نے داستان امیر حمزہ لکھ ڈالی۔ لیکن کیا کیا جائے ہمارے پاکستان کا ایک بازو ہندوؤں کے قبضے میں ہے بھائی قیامت خیز بحران سے دوچار ہو رہے ہیں، ملت اسلامیہ کا تقاضہ ہے کہ ہم کر لیں دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کریں اور اپنے کی مدد کریں۔ یہ قافلہ جو بیرسٹر علی محمد عباس نے میں اپنی منزل کی راہ پر چل پڑا ہے انشاءاللہ مقصود پر پہنچے گا ——— ہم نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، نہ کسی جماعت سے ہمارا ہمارا نصب العین صرف متحدہ پاکستان ہے مقصد صرف ایک ہے، اتحاد پاکستان۔

فقط والسلام

محمد خورشید عالم

۳۰ ڈیلیو روڈ۔ لندن این

انگلینڈ

۱۴ اپریل

اپنے لختِ جگر کو

دینی تعلیم و تربیت [illegible] اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان کے افکار [illegible] اور تحلیل ہوتی چلی جا رہی [illegible] اور اجتماعی زندگی میں [illegible] لوگوں کو متوجہ کر رہے ہیں جو رب ذوالجلال کے حضور [illegible] سے عہدہ برآ ہونے کیلئے [illegible] دینی تعلیم و تربیت ہو اور [illegible] اگرچہ اپنے ماحول [illegible] موجود نہ ہو تو

جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائل پور اس خدمت کیلئے حاضر ہے

[illegible] کی ابتدائی کلاس [illegible] ربیع الثانی [illegible] اپریل [illegible] سے شروع ہو رہی ہے

[illegible] توجہ فرمائیں

[illegible]

اہم خصوصیات

[illegible]

[illegible] اشرف جامعہ تعلیم اسلامیہ

[illegible] لائل پور

بقیہ: لمحہ فکریہ

عمر بھر کا سیاسی تجربہ بھی ہے لیکن ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ انتظامی تجربے نہ کیجئے جب ایک آدمی کو انتخاب کر کے کسی مقام یا محکمے میں اُس کا تقرر کرتے ہو تو اُس کو تقرر کی روایتی میعاد تک کام کرنے دیجئے۔ اس طرح کی عاجلانہ تبدیلیوں سے عوام کا نقصان نہیں ہوتا لیکن حکومت کی ساکھ مزید کمزور ہوتی ہے۔ ہم نے پچھلے ہی دنوں ایک ذمہ دار شخصیت سے عرض کیا تھا اور اخبار میں بھی لکھا کہ جب ایک رہنما سیاست کے محاذ پر ہوتا ہے تو اُس کی بولی میں تضاد کے علاوہ للکار ہوتی ہے جب حکومت کے سنگھاسن پر بیٹھتا ہے تو اُس کے مجلہ گفتار میں مصلحتوں کی تصویریں ٹنگ جاتی ہیں۔ ہمیں وہ دن یاد ہیں جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایوب شاہی کے خلاف عوام کے جذبہ و شعور کی راہنمائی کر رہے تھے تو سرکاری اہل کاروں کا عالم کیا تھا اور آج جب اُن کا زمانۂ اقتدار ہے تو اُس دور کے سرکاری اہل کار کن اداؤں کے ساتھ اُن سے قریب ہو کر اعتماد حاصل کر رہے ہیں۔ چونکہ ہم کسی فرد کے خلاف اپنے قلم کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے لیکن اپنے اس درد کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ اُن لوگوں کو سبکدوشی کی عمر کے بعد اپنے اعتماد کی سند نہ دو جن کے دامن پر عرصہ دراز سے عوامی آرزوؤں کا خون ہے اور جن کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ حلال و حرام پر یکساں انداز میں اپنے خنجر خونخوار سے طبع آزمائی کر سکتے ہیں اس شخص کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے جو نوکری کے لیے نیکی کو ذبح کر سکتا اور پیٹ کی دھن میں حرم و بتکدہ دونوں کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔ اس قسم کے ملازم ہمارے نزدیک سیاسی غیرت کے رخسار پر سنگین طمانچہ ہیں۔

بقیہ: انتہائی عیار جاسوس

سے ہماری ملاقات کے لیے اپنا مکان پیش کیا ہے جس کے لیے میں شکرگزار ہوں مجھے اعتراف ہے کہ آپ کا گھر اس مقصد کے لیے موزوں ترین جگہ ہے، لیکن کسی اور خیال کے تحت میں اسے زیر زمین کارکنوں کی ملاقات کے لیے مناسب خیال نہیں کرتا۔ آپ صدقہ خلیق اور ملنسار ہیں، اتنے شریف کہ میرے دل کی آواز! آپ میرا کوئی راز آپ سے پوشیدہ نہیں، آپ اتنے شفیق اور بلند انسان ہیں کہ میں عجائب سنگھ کو آپ ایسا با اعتماد دوست مخلص معاون اور حقیقی محب وطن پا لینے پر مبارکباد پیش کروں گا۔ آپ واحد آدمی ہیں، جن پر میں اعتماد کرتا ہوں، لہٰذا میں آپ کو کسی ایسے معاملے میں ملوث کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اندریں حالات میں آپ سے درخواست کروں گا، کہ آپ آج رات عجائب سنگھ سے ترنتارن میں میری ملاقات کا اہتمام کرا دیں۔

(میں بعجلت حتمی کامیابی کا خواہاں تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسی موزوں جگہ ہو، جہاں پولیس ریڈ کا خفیہ طور پر بندوبست ممکن ہو سکے گیانی نے جواب دیا۔)

گیانی: اہتمام ملاقات تو ایک طرف، میں تو ترنتارن میں ایسی کسی جگہ کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔

(ہم نے پانچ منٹ تک کسی موزوں جگہ کے انتخاب پر غور و فکر کیا، انتہائی دوستانہ ماحول میں مختلف جگہیں تجویز ہوئیں اور مختلف وجوہ کی بنا پر نامنظور ہوئیں۔)

میں: گیانی صاحب، آپ مقامی طور پر زیادہ واقف ہیں، میں یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ کوئی سی جگہ منتخب کر لیں۔

گیانی: میری ایک تجویز ہے، ترنتارن ریلوے سٹیشن کے مسافر خانہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

میں: بالکل ٹھیک ہے! اور وقت؟

گیانی: سوا نو بجے ٹھیک رہیگا۔

میں: ہاں۔ یہی مناسب ہے۔

چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۷
۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء
قیمت — ایک روپیہ

پہلے ملک پھر کچھ اور

حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے جمہوری فرائض

ہم کئی دفعہ انہی صفحات میں عرض کر چکے ہیں کہ آمریت کی ایک طویل رات گزارنے کے بعد پاکستان میں دستور کے نفاذ اور جمہوریت کے آغاز کا دور چلا ہے۔ تو اس کے تحفظات کی خاطر سیاسی فضا کو اس طرح رہنا چاہیئے کہ عوام کو اپنی آزادی کا احساس ہو اور ایسی کوئی حرکت نہ ہو، جو قومی آئین کی ویرانی کا سبب ہو کر پھر کسی طالع آزما کے سیاسی تجربے یا آئینی تماشے کا باعث ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو اب سیاسی تجربوں اور آئینی تماشوں کی ضرورت نہیں۔ پاکستان کو اپنے استحکام اور اپنی یک جہتی کے لیے اتحادِ عمل کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ملک کے دفاع سے غافل ہو کر سیاسی کھلنڈرا پن میں لگ جائیں تو فی الجملہ یہ چیز ہمارے لئے مستحسن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم مسلمہ جمہوری روایتوں سے آنکھیں بند کر کے نمازی کی سی حالت پیدا کر لیں کہ پیچھے اس امام کے، جو نیت امام کی وہ ہماری! اس طرح ہم صرف بارگاہِ ایزدی ہی میں حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہم ملک و قوم کی سیاسی زندگی بسر کرتے ہیں تو ہمارا شعار دوسرا ہوتا ہے۔ ایک قومی راہنما کی ہمنوائی و ہمقدمی عوام کا خاصہ ہے۔ لیکن اس ہمنوائی کے لیے اور ہمقدمی میں پاؤں کی چاپ جمہوری ہو تو کارواں منزلِ مقصود کی طرف قدم اٹھاتا ہے ورنہ اس زمانہ میں انسانی معاشرہ کسی حالت میں بھی یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ کسی حزبی یا فردی مطلق العنانیت کا شکار ہو کر رہے یا اس پر جمہوری آمریت کے خطرناک تجربے کئے جائیں۔ ایوب خان اپنی آمریت کا تجربہ نہ کرتے تو ممکن تھا کہ عوامی سیلاب کے بعد یحییٰ خان جیسا شرابی حکمران نہ ملتا اور ہم سیاست کے بازار میں رسوا نہ ہوتے۔ بہرحال وہ دور گزر گیا اب اس مضراب کے تاروں پہ انگلیاں رکھنا اس اعتبار سے بے محل ہے کہ ہم بے بس ہیں اور جن کے اختیار میں کچھ ہے، انہوں نے المیہ مشرقی پاکستان کے مجرموں کو سزا نہیں دی۔ اگر یحییٰ خان کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کی روشنی میں ملک ہی سے نکال دیا جاتا تو ایک نظیر ہوتا کہ غداروں کے لئے ملک کی فضا میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن اب مسئلہ جمہوریت کے تقاضوں کا ہے کہ ہم ان کا احترام کریں اور ان کے مطابق کام کریں۔ بلاشبہ حکومتی پارٹی سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور اب بھی کسی نہ کسی خانے پر انگلی رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اقتدار کا جو حق اس نے جنرل انتخابات میں عوام سے حاصل کیا ہے، ہم اس کو نئے انتخابات تک جھٹلا نہیں سکتے۔ ہمیں یہ خواہش ضرور کرنی چاہیئے کہ انتخابات وقت پر ہوں، آزاد ہوں اور منصفانہ ہوں۔ لیکن اپوزیشن کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اتھل پتھل کی فضا پیدا کریں اور حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہوں کہ تو تکار سے بڑھتے بڑھتے حدود جمہوریت ہی کو پھاند جائیں، اس وقت حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف جس جس انداز پر متصادم ہے وہ خوشگوار نہیں، ہم جہاں حزبِ اقتدار کے اس حق کی حمایت کرتے ہیں کہ اس کو مقررہ انتخابی مدت تک حکمرانی کا حق حاصل ہے وہاں شہری آزادیوں کے سلب کئے جانے اور عوام پر پولیس کے مشق ناز کرنے کی ایک لمحہ کے لیے بھی حمایت نہیں کر سکتے کہ اس سے عوام کا ردِ عمل مشتعل ہوتا ہے اور لوگ درشت الفاظ میں اپنی زبانوں کو واشگاف کرتے ہیں۔ حزبِ اقتدار کا جمہوری فرض ہے کہ حزبِ اختلاف کا احترام کرے اور اس کو بیجا شکایت کا موقع نہ دے۔ اسی طرح حزبِ اختلاف پر لازم ہے کہ وہ عوام کی زبانوں کو آلودۂ دشنام نہ ہونے دے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ آمادۂ پیکار رہے ہیں، لیکن جب سیاسی زندگی سب و شتم سے گدلا جائے تو صحت مند سیاست باقی نہیں رہتی۔ بہرحال برسرِ اقتدار جماعت کا فرض ہے اور ہم یہ گذارش اس لئے کر رہے ہیں کہ ملک کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ انہوں نے ایوب خان کی آمریت کے زمانہ میں اپوزیشن کا کار عاشقی دور بسر کیا ہے۔ پھر یحییٰ خان کے ملتے جلتے بھی ہیں کہ

باقی صفحہ ۲ پر

اسرار بخاری

پولیس ، ڈنڈے ، عوام ، خشت باری

۱۸ اپریل جمعہ کے روز متحدہ محاذ کی مقامی شاخ کے عہدے داروں نے نیلا گنبد لاہور کی تاریخی مسجد سے بعد از نماز مہنگائی کے خلاف جلوس نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں لاہور کی دیواروں پر مطبوعہ پوسٹر چسپاں کئے گئے لیکن اس جلوس پر جو بیتی ـــــ صحیح تر یہ کہ پولیس اور عوام کے درمیان جو مشاعرہ ہوا اُس کی روداد تو نوائے وقت نے نہایت سچے تلے الفاظ میں شائع کی۔ لیکن دوسرے نامور اخباروں میں سے کسی نے اس خبر کو شائع نہ کیا۔ اخباروں کی مجبوری ڈھکی چھپی نہیں۔ جب اُن پر ایوب خان کے زمانے سے سرکاری تصرف ہے تو اُس تصرف کی شکلیں بہرحال بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ ہم نہیں جانتے یہ رائے کیونکر قائم ہوئی ہے کہ اخباروں میں اپوزیشن کی ہر قومی خبریں چھپنے سے عوام میں کوئی منفی میلان یا رجحان پیدا ہوتا ہے لیکن ہم دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں کہ اخباروں نے قومی سیاست کے سلسلے میں جو شعار اختیار کر رکھا ہے وہ کسی لحاظ سے بھی ملک و قوم کے لیے مفید نہیں اور نہ حکمران جماعت کی سیاسی ساکھ کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز عمل سے بالکل وہی حالت پیدا ہوتی ہے جو مرض کی ابتدائی کیفیت کو نظر انداز کرنے سے مرض کے مہلک ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

اس مظاہرہ کو ہم نے ایک غیر جانبدار سیاسی ناظر کی حیثیت سے خود دیکھا ہے اور ہم پوری صداقت کو ملحوظ رکھنا نہیں چاہتے بلکہ ملک کے وزیر اعظم [illegible] کے ساتھ پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں یہی چیز ہم صوبے کے وزیر اعلیٰ جناب حنیف رامے کے نوٹس میں لانا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم بھٹو ایک جہاندیدہ سیاست دان ہیں اور اُن پر وہ تمام واردات گزر چکے ہیں جو آج پولیس کے ہاتھوں اپوزیشن پر گزر رہے ہیں۔ صوبائی وزیر اعلیٰ ایک علم دوست اور قلم دوست نوجوان ہیں۔ وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ اقتدار کی سرشت ہزار شیوہ نازنین کی سی ہے۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح اسے کبھی قرار و قیام نہیں ہوا۔ کبھی غزل کے محبوب کی طرح زید کے پہلو میں اور کبھی اُچھال چھکا کی طرح پھدک کر بکر کے دامن میں چلی جاتی ہے۔ ہم جناب حنیف رامے سے یہ عرض کریں گے کہ وہ اقتدار پر ضرور سواری کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ادب و صحافت کے قبیلے کا ایک نوجوان اس اشہب پر سوار ہے۔ انہیں یہ ضرور محسوس کرنا چاہیئے کہ اُن کی اصل طاقت جسے ہمیشہ رہنا ہے ایک ادیب و صحافی ہی کی ہے اور وہ اُن سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ لیکن وزارت بہرحال طلوع و غروب کی چیز ہے۔ آج یہ قلوپطرہ اُن کی ہے کل کہیں اور جا سکتی ہے انہیں اپنے اقتدار کے دامن پر کوئی ایسا داغ نہ آنے دینا چاہیئے جو کل کلاں اُن کی پبلک لائف کے لیے انگشت نمائی کا موجب ہو۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض چیزیں ایسی ضرور ہی ہیں جو اس مرحلے میں نہ ہونی چاہئیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ دفعہ ۱۴۴ کی عمر کتنی ہے؟ ہم انگریزوں کے غلام تھے اُن کے زمانے میں ملک گیر تحریکیں چلیں لیکن دفعہ ۱۴۴ [illegible]

کے بعد ایوب خان کے زمانے تک عوام کی منشا کے خلاف کئی حادثے اور کئی سانحے رونما ہوئے لیکن دفعہ ۱۴۴ کی عمر نے اس قدر طول نہ کھینچا۔ لیکن آج یہ چیز شہری آزادیوں کے لیے پریشان کن ہے کہ دفعہ ۱۴۴ شبِ ہجر کی طرح غیر مختتم ہو چکی ہے۔ آخر پیپلز پارٹی اپنے سیاسی حریفوں کا مقابلہ کرنے کیلئے وہی طرز عمل اختیار کیوں نہیں کرتی جو شہری آزادیوں کا سولہ سنگھار ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ نیلا گنبد کی مسجد سے باہر متوقع مظاہرے کے پیش نظر جو کچھ ہوا اور پولیس نے اپنے اجتماعی رویے سے جو فضا پیدا کی وہ وزیر اعظم کے علم میں تو یقیناً نہیں۔ وزیر اعلیٰ بھی اس سے بے خبر ہی ہوں گے۔ کیونکہ پولیس کے جن دو سپرنٹنڈنٹوں نے مصرع طرح اٹھایا اُن میں ایک نوجوان تو مرفوع القلم ہے۔ دوسرا وہی سپرنٹنڈنٹ ہے جو ایوب خان کے زمانے میں عوامی تحریک کے مظاہروں پر ظلم ڈھاتا رہا ہے اور جس نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے اُس جلسے میں بجلی کی لہریں دوڑائی تھیں جو گول باغ میں منعقد ہوا تھا۔ غالباً اس فنی مہارت ہی کے باعث موجودہ حکومت بھی اُس کی ملازمت میں توسیع دے کر اُس سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ ہم وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کی خدمت میں نہایت دُکھی دل کے ساتھ یہ عرض کرنا اپنے ضمیر زندہ کا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک سیاہ فطرت پولیس افسر کو یہ اجازت دینا کہ وہ سیاسی جیالوں پہ بے روک ٹوک ہاتھ اٹھائے اور گندی زبان استعمال کرے نہ صرف سیاسی روایت کی اہانت ہے بلکہ قومی شرافت کے سینے میں خنجر بھونکنے کے مترادف

باقی صفحہ [illegible] پر

"حضرت علامہؒ کے فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے"

- "اگر نظریہ پاکستان کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہوتی تو آج ہمیں یہ دن ہرگز نہ دیکھنے پڑتے"
- "علامہ اقبال کے یہاں وطن کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے"

مرکزیہ مجلس اقبال کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبال کے موقع پر آنریبل چیف جسٹس سردار محمد اقبال کا ایمان افروز خطبۂ صدارت

مسیکریٹ یہ بات آج انتہائی مسرت و سعادت کا باعث ہے کہ مجھے شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد منانے کی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

مسلمانان ہندوستان اور مجاہدین تحریک پاکستان کی تاریخ میں حضرت علامہ کی شخصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے وہ اگر ایک طرف اسلام کے نامور مفکر ہیں تو دوسری طرف مسلمانانِ ہند کے عظیم محسن بھی ہیں۔

یہ سوال کہ حضرت علامہ اقبال ایک فلسفی تھے کہ شاعر بیکار محض ہے، ان کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ شعر کو فلسفہ بنا دینا کچھ مشکل نہیں مگر فلسفہ کو شعر کے قالب میں سمو دینا بہت بڑا کام ہے اور اس میں حضرت علامہ نے جو نام پایا ہے وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔

اگرچہ ہندوستان کے مسلمان برطانوی استعمار سے شکست کھا کر اقتدار سے محروم ہو گئے، تاہم بحیثیت ایک مسلمان قوم کے اپنے وجود کو محفوظ کرنے اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے میں برابر لگا رہے۔ اور یہ فیضان تھا ہمارے بزرگوں کی رہنمائی کا جس میں اپنے زمانے کے لحاظ سے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے ایمان کے پورے جوش اور شدت کے ساتھ یہ نعرۂ مجاہدانہ بلند کیا اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر اپنا مخاطب بنایا ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حضرت علامہ نے اپنے شاعرانہ کمال اور حکیمانہ انداز سے مسلمانوں میں اجتماعی شعور پیدا کیا، جس طرح مولانا حالی مسلمانوں کے حال کے شاعر تھے اسی طرح حضرت علامہ اقبال مسلمانوں کے مستقبل کے شاعر کہلائے، انہوں نے مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ یاد دلائی، اپنے وجود کی حفاظت کرنے اور ماضی کی عظمت کے شایان شان مستقبل کو شاندار بنانے کا جذبہ پیدا کیا۔

سب سے پہلا یوم اقبال جس میں خود حضرت علامہ اقبال بھی شریک ہوئے ۱۹۳۰ء میں منایا گیا اس موقع پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا، ان سے حضرت علامہ کے مشن کا ایک اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا:

"میں کوئی سخنور نہیں ہاں سخن فہم ضرور ہوں، حکمت [illegible] کتاب [illegible] چاہتا ہوں کہ اپنے ملک کے پڑھے لکھے لوگوں پر دین کے اسرار کھول دوں، تاکہ وہ دین اسلام کے قریب آجائیں"

دین سے وہ دوری اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناآشنائی جس کی طرف حضرت علامہ نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش کے باعث پیدا ہوئی اور وہ اس شخص کی مانند ہو گئے جو کسی حادثے میں اپنے حافظے کی قوت کھو دیتا ہے پھر اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا، مگر یہ سازش کیوں ہوئی، اس کے اسباب کیا تھے یہ بیان ذرا تفصیل چاہتا ہے۔

حضرات! ہندوستان کی سرزمین قدیم زمانے ہی سے بیرونی حملوں کی آماجگاہ رہی ہے مختلف آریہ قومیں اِدھر کا رُخ کرتیں، یہاں کے مقامی باشندوں کو مغلوب کر کے ملک کے وسیع و عریض خطوں پر آباد ہو جاتیں [illegible]

[illegible]

[illegible] باب

ہندو آریوں کا مرز بجل جب افسانیت سے گر گیا تو ہندومت کی اصلاح کے لیے بدھ مت وجود میں آگیا۔ جاپان، چین، انڈونیشیا اور ہند چینی سے لے کر وسط ایشیا تک اس کا اثر پھیل گیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمان ایک تاجرانہ حیثیت سے جنوبی ہند اور فاتحانہ شان سے شمالی ہندوستان میں نہایت پُر امن طریقے سے داخل ہوئے، اس وقت تمام ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، تمام ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور وہ آئے دن ایک دوسرے سے برسرِ جنگ رہتی تھیں، مختصراً یہ کہ اس عہد امن و امان اور سکون و اطمینان کو خلقِ خدا مدت ہا مدت سے ترس رہی تھی۔ توہمات اور بے ہندو رسمات عام تھی، ہندو نام مذہب تھا، جس نے انتہائی ڈراؤنی اور جابر نظاروں نے شکلیں اختیار کر رکھی تھیں، بُت پرستی دیوتاؤں کی مورتیں سے آسمان تک ہر شے کو خدا کہا جب خاند، قصہ بات ہے کہ ان توہمات خیالات ہے تو اس تصرفات کا لوگوں کی عام زندگی پر کافی اثر تھا، ہیں۔ ہندوستان کا معاشرہ ذات پات کی تقسیم سے بُری طرح مجروح ہو رہا تھا، وہ اجتماعی اخلاقی اور روحانی قدریں بھی مٹتی جا رہی تھیں، جن سے ایک صحت مند معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے جس قدر غیر مسلم قومیں ہندوستان میں داخل ہوئیں، وہ ہر لحاظ سے مقامی باشندوں سے بہت پیچھے تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے رسم و رواج، طور طریقے بالکل مٹ گئے، اور انہوں نے وہی رسم و رواج اختیار کر لیا، وہی طور طریقے اپنا لیے اور اسی تہذیب و تمدن کو قبول کر لیا جو یہاں کے مقامی باشندوں کا تھا۔ اس کے برعکس جب ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان یہاں آئے تو وہ دوسری قوموں کی طرح ہندوؤں میں جذب نہ ہو سکے، انہوں نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا، کیونکہ وہ ایک ایسے سبقت دین کے نگہبان تھے

دینِ اسلام کے نام لیوا تھے، جو بدھ مت اور عیسائیت کی طرح تبلیغی مذہب ہے اور دنیا کے ترقی یافتہ مذاہب میں یہودیت اور عیسائیت کو ہر محاذ پر شکست دے چکا ہے، اسلام اور ہندومت کے درمیان تصادم کا یہی وہ پہلا سبب ہے، جس نے آگے چل کر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر بحیثیت ایک مسلمان قوم کے انہیں دنیا میں زندہ رہنا ہے تو انہیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا ہو گا۔

اس سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا، کہ ایک قوم جو باہر سے آئی اور یہاں آ کر آباد ہو گئی، وہ اپنی تہذیب، تمدن، سیاست، ثقافت غرض ہر شے سے بیگانہ ہو کر ہندوستان ہی کی ایک قوم بن گئی، پھر اس کا اپنے ماضی سے کوئی علاقہ نہ رہا، بخلاف اس کے مسلمان جس تہذیب و تمدن کے وارث علم و حکمت کے امین اور دین کے نام لیوا تھے، اس نے مقامی اثرات سے انہیں بالکل محفوظ رکھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان علم و حکمت، مذہب و سیاست خاص کر فنونِ جنگ میں مقامی باشندوں کے مقابلے میں بہت آگے اور ترقی یافتہ تھے ہندوستان میں جب اکبرِ اعظم نے ہندوؤں کے اثر سے یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر یہ چاہا کہ مسلمان قوم اپنی انفرادیت سے الگ ہو کر ایک سیاسی وحدت اختیار کرے۔ اس کے اور ہندو قوم کے درمیان مذہب کی بنیاد پر ایک الگ قوم ہونے کا تصور باقی نہ رہے تو اس نازک ترین موقع پر جس عظیم شخصیت نے ہندوستان کے شہنشاہ جلال الدین اکبر سے ٹکر لی، اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور انفرادیت کو باقی رکھنے کا مجاہدانہ کردار انجام دیا وہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی تھے — شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال نے ان کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے بعد ان کے کام کو پہلے سر سید احمد خان اور پھر علامہ اقبال نے اور آگے بڑھایا حتیٰ کہ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر ایک جداگانہ مملکت خداداد پاکستان کا تصور مسلمان قوم کو پیش کر دیا۔

اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں تمام ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر حصے پر مسلمانوں کی ہمہ جہتی سیاسی برتری قائم تھی، لیکن ۱۷۰۷ء میں جونہی اورنگزیب عالمگیر کا انتقال ہوا، ۵۰ برس کی مدت میں باہمی جنگ و جدل اور نا اتفاقی کے باعث تمام ہندوستان مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اورنگزیب عالمگیر کے دادا نور الدین جہانگیر کے زمانے میں جو انگریز تجارت کے لیے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، رفتہ رفتہ انہوں نے کلکتہ کے شمال کی طرف اپنے سیاسی اقتدار کے لیے پیش قدمی شروع کر دی، بالآخر اسی کے نتیجہ میں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جس کی قیادت نواب سراج الدولہ کر رہے تھے، ۱۷۵۷ء میں ایک جنگ ہوئی، جس میں انگریز غالب آئے اور مسلمان مغلوب ہوئے، یہ جنگ کہ —— پلاسی —— کے مقام پر واقع ہونے کی نسبت سے جنگِ پلاسی کہلاتی ہے۔ اس لیے ناکام ہوئی کہ ہندوؤں نے اسلام اور مسلمان دشمنی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ دلبھ رام، امی چند، سروپ چند اور مہتاب رائے وغیرہ ان کے نمائندے تھے مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدل اور دنیا طلبی نے غیروں کو اس کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے برطانوی اقتدار قائم کریں۔ مسلمانوں میں سے جس شخص نے لالچ میں پڑ کر مسلمانوں سے غداری کی، وہ بنگال کا میر جعفر تھا۔ علامہ اقبال نے اس کے خلاف ننگِ آدم ننگِ دیں

-۱۹۸۸ [illegible]

اور جنگ وطن کہہ کر اپنے غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ غرض یہ کہ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے بہار اور بنگال میں اپنے قدم جما لیے، اور یہ شکست مسلمانوں کے اقتدار کے مکمل خاتمے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد خیبر سے لے کر راس کماری تک بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، خدا کی شان جو لوگ تجارت کا لباس پہن کر آئے تھے وہ اپنے قدم بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک پہنچ گئے کہ اپنی پیشانی پر تمام ہندوستان کی حکومت کا تاج سجا کر بیٹھ گئے۔

انگریز اپنے ساتھ ایک نئی تہذیب اور ایک مخصوص نظام حکومت لے کر آئے تھے۔ رعیت کو حکومت کے نظام میں شریک کرنا، ساتھ لے کر چلنا اس کا بنیادی اصول تھا، چنانچہ کمالِ دانائی اور ہشیاری کے ساتھ انہوں نے اس نظام کے ذریعے ہندوؤں کو مسلمانوں سے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ نامزدگی اور انتخاب اس کا ذریعہ تھا اگرچہ اس ذریعے سے مسلمانوں کو بھی شرکت کا موقع ملا تاہم اتنا کہ مسلمانوں کو تاکہ وہ حرف زنی سے محفوظ رہیں۔

اب ایک طرف اگر انگریزوں کا نظام حکومت اپنی خصوصیت کی بنا پر ان کے اقتدار کی مضبوطی کے لیے کام کر رہا تھا تو دوسری طرف ان کا رائج کردہ نظام تعلیم تھا، جس کے زیر اثر اسکولوں اور کالجوں میں وہ سامان ہو رہے تھے جن سے برطانوی اقتدار کو تقویت اور استحکام مل سکے۔

انگریزوں کے نظام حکومت اور نظام تعلیم نے ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا جو ایک نیا طبقہ پیدا کیا۔ ان میں غالب اکثریت ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی تھی، یہ لوگ جو انگریزی ادب اور انگریزی سیاست سے متأثر ہو رہے تھے، فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن کی حکومت میں انگریزوں سے اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ مانگنے لگے، حتیٰ کہ ان کا مطالبہ روز بروز شدت پکڑ گیا اب صورت حال یہ تھی کہ اگر ہندوستان میں نمائندہ اداروں کا یہ عمل تیز کیا جاتا تو اس کے معنی لازماً یہ ہوتے کہ برطانوی استعمار کے زیر اثر ہندوستان پر عملاً ہندوؤں کی حکومت ہو جاتی، جو انگریزی حکومت سے بالکل مختلف ہوتی، یہاں تک کہ ہندوؤں کی زبان، ان کی تاریخ اور مذہبی روایات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر چھا جاتیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب سے ہندوستان میں نمائندہ حکومتی اداروں کی داغ بیل پڑی اور انہیں زیادہ سے زیادہ وسیع اور با اختیار بنانے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ تب سے مسلمانوں کو بھی یہ سوچنا پڑا کہ ان کے سیاسی حقوق کے تحفظ اور ملی وجود کو باقی رکھنے کے لیے کیا راستہ اختیار کیا جائے۔ مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندوؤں کی نام نہاد تحریک قومی جو بظاہر انگریز دشمنی کا دعویٰ رکھتی ہے، مگر مسلمانوں کے خلاف در پردہ سازشیں کر رہی ہے وہ اسلام اور مسلم دشمنی کے جذبے سے ان کے وجود کو مٹا ڈالنے کی فکر میں ہے، انہوں نے ہندوستان میں نمائندہ حکومتی اداروں کے قیام کی بھرپور مخالفت کر دی، سر سید احمد خان اس وقت ان کے قائد تھے، انہوں نے برطانوی حکومت سے یہ بات صاف صاف کہہ ڈالی کہ،

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مسلمان اور ہندو، یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی، ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا، جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، یہ مخالفت اور عداوت (جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے) ان ہندوؤں کے سبب ابھرتی جائے گی جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔"

ہر چند مسلمانوں نے حکومت کے نمائندہ اداروں کے قیام کی بھرپور مخالفت کی، تاہم ان میں ایک ایسا گروہ بھی تھا، جس نے ہندوؤں کی نیت پر شک نہ کرتے ہوئے مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز سے بے پروا ہو کر کانگریس میں شمولیت کر لی اور نمائندہ حکومتی اداروں کے قیام اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ وسیع اختیار اور اقتدار کے حصول کی کوشش کرنے لگا۔ مسلمانوں کے اس گروہ میں جو بہت مختصر سا تھا محمد علی جناح کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔

لیکن اسی دوران مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جو تعداد میں بھی زیادہ تھا اور اپنے اثر و رسوخ میں بھی کافی نمایاں، گروہ انگریزوں کے یکسر خلاف تھا اور کانگریس یا ہندوؤں کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھا، وہ مسلمانان ہندوستان کو دنیائے اسلام کا ایک لازمی حصہ سمجھتا تھا، مگر ۱۹۲۰ء میں جب تحریک خلافت قائم ہوئی اور تحریک موالات کا آغاز ہوا، تو برطانوی ہند کے خاتمے کو اپنا مقصد بنا کر خلوص نیت کے ساتھ کانگریس میں شامل ہو گیا اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر بڑی بے جگری سے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد جب ہندوؤں کے عزائم کھل کے سامنے آ گئے، اور ان کا اصلی چہرہ بے نقاب ہو گیا تو وہ کانگریس سے بیزار ہو کر اس سے نکل آئے، اس گروہ کے قائد مولانا محمد علی جوہر علیہ الرحمۃ تھے، جن کی تعلیم و تربیت سر سید ہی کے علیگڑھ مسلم کالج میں ہوئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب مسلمانوں کی مثال ایک ایسے قافلے کی تھی، جو ایک لق و دق صحرا میں چلتے چلتے اپنا راستہ بھول جائے اس پر ستم یہ کہ اسے کوئی راستہ بتانے والا بھی نہ ملے۔ محمد علی جناح بھی جنہیں آگے چل کر قدرت الٰہی مسلمانان ہند کی قیادت عظمیٰ کا منصب سونپنے والی تھی، حالات سے دل برداشتہ ہو کر ملک چھوڑنے کی فکر میں تھے

[illegible]
گیا تھا۔ جتنا کانگریس میں رہ گئی تھی، کانگریس سے علیحدہ ہو کر ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ عین اس وقت ۱۹۳۰ء کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد کا سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال ایک راہ نما کی صورت میں قوم کے سامنے آئے اور انھوں نے اس موقع پر جو ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، وہی آگے چل کر جداگانہ قومیت کی بنیاد پر ایک جداگانہ مملکت خداداد پاکستان کے تصور کی اساس بنا۔

حضرت علامہ کے خطبہ الہ آباد نے صرف یہی نہیں کہ برصغیر ہند بلکہ پورے ایشیا کی تاریخ کا رُخ بدل ڈالا۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے جو بنیادی سوالات تھے وہ یہ تھے۔

۱۔ برصغیر ہند سے انگریزوں کی حکومت ختم ہو اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں اور ان کے بااثر راہ نماؤں نے کاسہ لیسی کی جو پالیسی اختیار کی ہوئی ہے، اس کے خلاف بغاوت کی جائے اور انگریزوں سے لڑا جائے۔

۲۔ ہندو اکثریت میں مسلمان ضم نہ ہونے پائیں ان کی سیاسی، ثقافتی، تاریخی اور اجتماعی انفرادیت کو استحکام ملے، وہ اس برصغیر میں اپنا الگ وجود قائم رکھ سکیں۔

۳۔ باہر کی اسلامی دنیا سے ان کا رشتہ نہ ٹوٹے اور ان کا شمار بطور ایک از اقوام عالم اسلام کے طور پر ہو۔

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے خطبہ میں انہی بنیادی سوالات کا نہایت عمدہ اور جامع حل پیش کیا۔ جس طرح دنیا کے دوسرے حصوں کے لوگوں میں آزادی کے تند و تیز جذبات پرورش پا رہے تھے، اسی طرح برصغیر ہند کے ان علاقوں کے مسلمانوں میں بھی اس سے جہاں ان کی اکثریت تھی، ایک آزاد، خود مختار اور جداگانہ اسلامی مملکت قائم کرنے سے آزادی کے جذبات کی تسکین ہو سکتی

تھی مسلمانوں کا کوئی منفرد قومی وجود بھی قائم رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ محمد بن قاسم علیہ الرحمۃ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے باعث جو تاریخی عمل شروع ہوا تھا، ہندو اکثریت کے ہاتھوں اس کے مٹنے کے امکانات بھی ختم ہو سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ برصغیر ہند میں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت قائم کر کے دنیائے اسلام کے درمیان جو اتحاد پیدا کرنے کی مسلمانوں کے دلوں میں آرزو چٹکیاں لے رہی تھی، وہ بھی اس سے پوری ہو سکتی تھی۔

چنانچہ مسلمانانِ ہندوستان کی یہ عین خوش قسمتی تھی، کہ حضرت علامہ اقبال نے یہ تمام باتیں بروقت سوچ لیں، مسلمانانِ ہندوستان اس وقت جن سنگین مسائل سے دوچار تھے ان کا حل پیش کیا۔ اللہ تعالٰی نے انہیں ذہن رسا عطا کیا، جو حقائق کی تہ تک جا پہنچتا وہ نابغۂ روزگار تھے مشرقی اور مغربی علوم کا نہایت گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم اور رسول کریمؐ کے عشق میں سرشار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مسائل کا دینی بصیرت کے ساتھ جو حل پیش کیا تھا، وہ اس کی کامیابی کا سو فیصد اسی بنیاد پر یقین کامل رکھتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ مسلمان اگر اسی طرح اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے تو وہ ایک دن اپنی منزل مقصود ضرور پا لیں گے۔

دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد میں حضرت علامہ نے برصغیر ہند میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کی پیش گوئی فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کریں، میں ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ ہندوستان، اور

مسلمانوں کی ... [illegible] رہا ہوں، اس سے ہندوستان میں توازنِ قوت کے باعث امن و امان پیدا ہو سکے گا۔ اور اس امر سے مسلمانوں کو بھی اس وجود کو توڑ ڈالنے کا موقع ملے گا جو صدیوں سے ان کی تہذیب و تمدن اور تعلیم و شریعت پر طاری ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

اپنے اس تاریخی خطبہ کے آخر میں حضرت علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"ایک سبق جو میں نے اسلام کی تاریخ سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ آڑے وقت میں ہمیشہ اسلام ہی نے مسلمانوں کے وجود کو قائم رکھا اگر آج مسلمان اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخشنے والے تخیل کا اثر قبول کر لیں تو ان کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور ان کا وجود تباہی و بربادی سے یقیناً محفوظ ہو جائے گا۔"

پھر علامہ نے ارشاد فرمایا:

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہمیں تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس

بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوتے،
ایک نفس واحد کی طرح زندہ ہیں۔

یہ تھا وہ تصور جو حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں برصغیر کے اندر ایک آزاد مملکت کا پیش کیا، جسے پورے دس برس کی سخت جدوجہد کے بعد حضرت قائداعظم کی ذہنی فراست اور ولولہ انگیز قیادت سے ۱۹۴۷ء میں عملی صورت حاصل ہوئی۔ اور اس طرح مملکت خداداد پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک عظیم اسلامی مملکت کے طور پر ابھر آئی۔

تصور پاکستان کے خالق حضرت علامہ اقبال کے بارے میں اسلامیان ہندوستان کے عظیم قائد محمد علی جناح نے جن خیالات کا اظہار فرمایا اور جس محبت اور حسن عقیدت کے ساتھ انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ حضرت علامہ کی عظمت پر شاہد ناطق ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

میرے لیے اقبال ایک دوست، رہنما
اور فلسفی تھے، ان تاریک لمحات میں
جن سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ
ایک چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک
لمحے کے لیے بھی ان پر گھبراہٹ کے
آثار کبھی پیدا نہیں ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کی کامیابی کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلہ میں وہ لاہور تشریف لائے، حضرت علامہ ان دنوں بستر علالت پر تھے قائداعظم ان سے ملنے ان کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے ان سے مدد چاہی، یہ وہ زمانہ تھا، جب نہ صرف پنجاب کے تمام مسلمان بلکہ برسراقتدار طبقہ بھی قائداعظم کی مخالفت پہ کربستہ تھا، حضرت علامہ نے ایسے پرآشوب زمانے میں حضرت قائداعظم کی دعوت قبول کر لی، اور باوجود بستر علالت پر ہونے کے قائداعظم کی استدعا پر پنجاب مسلم لیگ کا صدر بننا منظور فرما لیا۔

یہ بھی انہی دنوں کی بات ہے، کہ پنڈت نہرو نے اپنے ایک اخباری بیان میں حضرت قائداعظم پر شدید نکتہ چینی کی اور کہا کہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت
ان کا علیحدہ وجود الگ ہستی محض ایک
مضحکہ خیز دعویٰ ہے۔

پنڈت جی کے اس بیان پر حضرت علامہ نے فوراً ایک جوابی بیان جاری کیا، جس میں قائداعظم کا ان لفظوں میں ذکر کیا:

"مسٹر جناح، آج مسلمانوں کے سب سے
زیادہ قابل اعتماد راہ نما ہیں، انھوں نے
اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے وہ کسی
راہ نما کی خدمات سے کم نہیں مسلمانوں
کی طرف سے اب اگر کسی شخص کو کوئی
بات کرنے کا حق ہے تو وہ مسٹر جناح ہیں"

اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ یہ صرف حضرت علامہ اقبال ہی کی ذات گرامی تھی، جس نے بڑی وضاحت کے ساتھ برصغیر ہند میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا تصور پیش کیا، اور ان کے بعد مسلم لیگ نے اس تصور کو اپنی جماعت کی بنیاد اور نصب العین بنایا۔ ۱۹۳۶ء میں جب علامہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر ہوئے تو وہ آخری دم تک مقصد کے حصول کے لیے قائداعظم کے ایک رازدار کی حیثیت سے ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں برابر ان کے دست و بازو بنے رہے، اور انہیں صحیح معنوں میں اپنا اور تمام مسلمانان ہند کا قائد تسلیم کیا، مختصراً یہ کہ پاکستان کی صورت میں قدرت الٰہی کی طرف سے جو معجزہ رونما ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اقبال کے فکر اور جناح کے عمل ہی کا نتیجہ ہے۔

میں یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ الٰہ آباد کے صدارتی خطبہ میں علامہ اقبال نے اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس کی حیثیت فقط ایک شاعرانہ امنگ یا ایک فلسفی کے خواب کی نہیں، بلکہ یہ خیالات حضرت علامہ کے عمر بھر کے غور و فکر کا حاصل تھے۔ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر حضرت علامہ نے جداگانہ مملکت کا جو تصور پیش کیا، اس کا پہلو صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی اور معاشرتی بھی ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کم و بیش ایک ہزار سال تک قائم رہی، اس طویل مدت غیر مسلموں میں خاص کر ہندوؤں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا گیا، رواداری برتی گئی، فاتح اور حاکم قوموں کی تاریخ میں اس کی ڈھونڈنے سے کہیں مثال نہیں مل سکتی، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے یہاں کے علوم و فنون کی ہمیشہ سرپرستی کی، ہندو عالموں اور پنڈتوں کو اپنے درباروں میں عزت کا مقام بخشا، کچھ ایسی ہی فیاضانہ سلوک کشمیر کے بادشاہ زین العابدین نے ہندو عالموں اور پنڈتوں کے ساتھ کیا تھا جس طرح کہ مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے ہندو عالموں اور پنڈتوں کو علم کی ارفع و اعلیٰ مسند پہ بٹھایا اور ان سے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کروائے اسی طرح اکبر اعظم سے کہیں پہلے سلطان زین العابدین نے بھی ہندو عالموں اور پنڈتوں کی بے حد قدر افزائی کی اور ان سے بہت مفید علمی کام لیا، دکن کے مشہور بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے تو سارا کارِ حکومت کی دل جوئی کے لیے ہندوؤں کے حوالے کر دیا حتیٰ کہ فارسی زبان بھی جو مدتوں سے ہندوستان کی سرکاری زبان چلی آتی تھی۔ بیک قلم موقوف کر کے اس کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان قرار دیدیا۔

مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کو ہندو عالموں اور سنیاسیوں سے ملنے کا جس قدر شوق تھا، کہ دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں کے راستے جہاں ہندوؤں کے بڑے بڑے پنڈت اور سنیاسی رہا کرتے تھے، جہانگیر ملاقات کے اشتیاق میں، پاپیادہ چل کر ان کے پاس جایا کرتا تھا اور پہروں ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ حالانکہ نورالدین جہانگیر نے اپنے باپ جلال الدین اکبر اعظم کی طرح مذہب میں کمزور اور عقیدے میں

شکست نہیں تھا بلکہ پکا مسلمان تھا اور ہندوؤں سے اگر مباحثے کیا کرتا تھا وہ اپنی تزک میں نہایت فخر کے ساتھ یہ لکھتا ہے، کہ آخر ہندو اس کی باتوں سے لاجواب اور ساکت ہو گئے اور بہا سکے ہو سبب کا راجا اس کے دلائل سے قائل ہو کر اس کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا ——————۔

اورنگزیب عالمگیر جسے ہندوؤں نے خاص کر اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے، رواداری اور حسن سلوک کے باب میں اپنے بزرگوں سے بھی کہیں بڑھ کر نکلا، اس کے عہد حکومت میں ہندوؤں کو معقول نوکریاں دی گئیں، مغلوں کے زمانے میں وتنی شاید ہی کسی اور بادشاہ نے ہندی ہوں، مگر اس قدر مروّت، محبت، رواداری اور مساوات کے باوجود جو مسلمان بادشاہوں نے ان کے ساتھ روا رکھی، ہندوؤں کے دلوں سے نہ کبھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت گئی نہ عداوت!

حد یہ ہے کہ مسلمان جو ایک ہزار برس تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے، ہندیوں نے صدیوں تک ان کی محکومیت میں اپنی زندگی بسر کی، وہ محکوم ہونے کے باوجود ایک حاکم قوم کے افراد یعنی مسلمانوں کو ملیچھ اور ناپاک خیال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ہندو قوم کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ کا فرد بھی مسلمانوں کے ساتھ میل جول بڑھانا اور تعلقات پیدا کرنا پسند نہیں کرتا تھا نفرت اور حقارت کا عالم یہ تھا کہ ایک ہندو چاہے وہ ادنیٰ یا اعلیٰ ہندوؤں کے کسی طبقہ سے ہو، کسی مسلمان کو اپنا کتنا ہی عزیز دوست کہتا ہو وہ نہ کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا اور نہ کبھی اُسے پاس بٹھا کر کھانا کھلا سکتا تھا —— ہندوؤں کے محکوم ہونے کے باوجود مسلمانوں کے وجود کو کسی طرح برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ اگر خدا نخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو ہندو اکثریت کے باعث ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے سے اسلام اور مسلمانوں [illegible]

کا ہندوستان میں کیا حشر ہوتا؟ یہ تھے وہ سیاسی اور سماجی ناساعد حالات جن سے مجبور ہو کر مسلمان بحیثیت ایک الگ قوم ہونے کے اپنے وجود کی حفاظت، اس کی بقاء کے لیے یہ سوچنے پر مجبور ہوتے اور یہ تھا وہ ایک جداگانہ اور ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصور جسے علامہ اقبال نے مسلمان قوم کے وجود کی حفاظت، اس کی بقا و ارتقاء کے درد اور اسلام کی خدمت کے طور پر پیش کیا تھا۔

یہ زمانہ جس میں حضرت علامہ اقبالؒ نے دنیائے اسلام کو بالعموم اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بالخصوص اپنا مخاطب بنایا، دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے نکبت و اِدبار کا زمانہ تھا۔ تباہی و بربادی کے سیاہ بادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے، ہر طرف ذلت اور خواری مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھی، تاہم حضرت علامہ بارگاہ الٰہی سے مایوس نہیں ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو جب شکست ہو گئی تو ان کی خلافت کے صدر مقام استنبول پر برطانوی فوجیں قابض ہو گئیں، اس کے علاوہ دنیائے اسلام کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر دوسروں کا قبضہ نہ ہو گیا ہو۔ (باقی آئندہ)

بعدالت جناب خان ارشد خان صاحب ایڈیشنل سول جج صاحب سرگودھا

درخواست سرٹیفکیٹ جانشینی —

نمبر ۲۰ بابت سال ۱۹۷۵ء

بعنوان مقدمہ آغا حیدر شاہ

بنام عوام الناس وغیرہ

بنام (۱) عوام الناس (۲) غلام زہرا دختر ممتاز حسین شاہ سکنہ منڈی شاہ جیون تحصیل و ضلع جھنگ

(۳) مریم زہرا بیوہ ممتاز حسین سکنہ منڈی شاہ جیون تحصیل و ضلع جھنگ۔

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں سائل آغا حیدر شاہ ولد ممتاز حسین شاہ سکنہ چک نمبر ۳۳، جنوبی تحصیل و ضلع سرگودھا نے عدالت ہذا میں درخواست سرٹیفکیٹ جانشینی نسبت ترکہ ممتاز حسین شاہ متوفی بابت رقم مبلغ -/۸۳۶۸ روپے حبیب بنک لمیٹڈ مدینہ گجرات اکاؤنٹ نمبر ۱۱۹ گزاری ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ نسبت درخواست کسی کو کسی قسم کا کوئی عذر ہو تو مورخہ ۱۰ مئی ۷۵ء کو حاضر عدالت ہذا آکر پیش کریں بصورت دیگر کارروائی یک طرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج مورخہ ۱۵ اپریل کو بدستخط میرے مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط ایڈیشنل سول جج

(مہر عدالت)

بعدالت جناب شیخ عبدالرزاق سول جج درجہ اوّل۔ وزیرآباد۔

شفع اراضی

فیض محمد ولد غلام رسول جٹ چیمہ سکنہ عادل گڑھ تحصیل وزیرآباد۔ بنام محمد صادق

بنام محمد صادق ولد خوشی محمد قوم جٹ چیمہ سکنہ عادل گڑھ تحصیل وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ۔

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعاعلیہ کی تعمیل بطریق عام ہونی مشکل ہے لہٰذا مدعاعلیہ کے خلاف اشتہار اخبار زیر آرڈر ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ مورخہ ۲۹ اپریل ۷۵ء کو بمقام وزیرآباد بوقت ۸ بجے حاضر عدالت ہذا ہو کر جوابدہی دعویٰ کریں بصورت دیگر آپ کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے و مہر عدالت کے جاری کیا گیا۔

دستخط سول جج درجہ اوّل

(مہر عدالت)

سال اقبال کے ۴۰ مقالات
۲۴واں مقالہ

از ڈاکٹر سید عبداللہ

چند مشورے قومی اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کی خدمت میں

گذشتہ سے پیوستہ

گزشتہ شذرہ میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ قومی اقبال کمیٹی، جناب وزیر اعظم صاحب اور حکومت پاکستان کی فرض شناسی اور تدبر کی علامت ہے ——— راقم الحروف نے اس ضمن میں ان تجاویز کو بھی علی العموم سراہا تھا جو کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۷ اپریل میں پیش ہوئی تھیں۔

تاہم ان تجاویز کو زیادہ قابل قبول اور بہتر بنانے کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ مجوزہ صد سالہ تقریب کی معنویت کو اقبال کے اصل پیغام سے ہم آہنگ بنانا بے حد ضروری ہے، کیا یہ عجیب بات نہ ہو گی، کہ اقبال پر کتابیں لکھی جائیں مذاکرے ہوں، تقریریں ہوں، بچوں کے پروگرام ہوں اور ان میں کسی جگہ اسلام کا تذکرہ نہ آنے پائے۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ کلام اقبال میں ۶۵ فیصد اشعار اسلام کی برکات و فضائل کے متعلق ہیں، باقی ۳۵ فیصد میں سے تیس فیصد فرنگی تمدن اور تہذیب کے خلاف ہیں۔ ۵ فی صد باقی مضامین ہیں، ان حالات میں ذکر و فکر اقبال سے اسلام کا حوالہ بالکل غائب کر دینا یا اسے محض ضمنی شے بنا دینا، صد سالہ تقریب کی اصل روح کی ضد ہو گا۔

لہذا میری عاجزانہ تجویز ہے کہ تجاویز کے اس حصے کی جس میں اغراض و مقاصد کا تذکرہ ہے، ترمیم و اصلاح اس طرح کی جائے کہ پیغام اقبال کی اسلامی روح کا واضح اعلان و اثبات ہو۔

اب دوسری بات یہ ہے کہ صد سالہ تقریب سے متعلق تجاویز میں بار بار "تیسری دنیا" کی دانشورانہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے، یوں معنوی طور سے اس پر کوئی خاص اعتراض تو نہیں، لیکن یہ دراصل ایک خاص سیاسی نظریاتی معنویت کی آئینہ دار ہے۔ اور "مسلم بلاک" کی اصطلاح سے بچنے کیلئے استعمال کی گئی ہے، اس لیے مسلم بلاک کے الفاظ بھی ساتھ شامل کئے جائیں تاکہ صحیح مطلب ادا ہو، دانشورانہ اصطلاحات کے بے ضرورت استعمال سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ صد سالہ تقریب پر محض ایک گروہ کا غلبہ بلکہ اجارہ داری ہے۔

اب میں تجاویز کے چند دیگر پہلوؤں پر مختصر سی بحث کرتا ہوں۔

مجھے سب سے زیادہ تعجب ان دلائل پر ہوا ہے جو علامہ اقبال کے یوم وفات کو ملک گیر چھٹی کا دن قرار نہ دینے کے سلسلے میں پیش کی گئی ہیں۔

فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ اگر اقبال کے یوم وفات پر چھٹی ملک گیر پیمانے پر دے دی گئی تو کل کلاں لوگ خلفائے راشدینؓ کے یوم وصال کے لیے بھی ملک گیر تعطیلات کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔

دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ اقبال کے سلسلے میں عام تعطیل کی گئی تو لوگ رحمان بابا، خوشحال خان خٹک اور حضرت بھٹائی کے سلسلے میں بھی تعطیل عام کا مطالبہ کریں گے

افسوس ہے کہ یہ دونوں دلیلیں اطمینان بخش نہیں۔۔۔۔۔۔ خلفائے راشدینؓ کا مسئلہ ایک دوسری نوعیت کا مسئلہ ہے، یوں اس کے حق میں بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں، کیونکہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ جس ملک میں چھوٹی سے چھوٹی باتوں پر اتنی ملک گیر چھٹیاں ہو جاتی ہیں جو بالکل عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں اگر اسلام کے ان برگزیدہ نفوس پاک کی سرکاری سطح پر یادیں منائی جائیں تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ تاہم یہ مسئلہ خالص دینی نوعیت کا ہے اور عالمگیر بھی ہے اس لیے میں یہاں صرف یہ کہوں گا، کہ خلفائے راشدینؓ کا نام سے کر ان کے تقدس کی آڑ میں، یوم وفات اقبال کی تعطیل کو غائب کر دینا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا، میری تجویز ہے کہ آپ ملک گیر تعطیل کریں یا نہ کریں، لیکن خلفائے راشدینؓ کے حوالے پر مبنی دلیل کو اپنے کاغذات سے حذف کر دیں، اس میں بے ادبی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ ہم خلفائے راشدینؓ کو بھی یہ حق نہیں دیتے اور اقبال کو بھی نہیں دیتے۔۔۔۔۔۔

میری پُرزور سفارش ہے کہ کاغذات سے یہ جملے حذف کر دیئے جائیں تاکہ حکومت پاکستان کی وہ شاندار خدمات جو وہ صد سالہ تقریب اقبال میں انجام دے رہی ہے، داغدار نہ ہو جائیں

اب رہا یہ سوال، کہ یوم اقبال کی تعطیل سے، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کے یوم وفات پر بھی تعطیل عام کا مطالبہ ہو گا یہ اس لیے بے دلیل معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ممتاز

باقی ص۲۶ پر

سردار عبدالقیوم کی صدارت سے سبکدوشی

مسئلہ کشمیر کا حل نہیں

سردار عبدالقیوم صدر آزاد کشمیر کے خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ جس ڈرامائی انداز میں آزاد کشمیر کی اسمبلی نے کیا ہے وہ واقعات اندرونِ خانہ کے لیے غیر متوقع نہیں لیکن عبرت انگیز ضرور ہے۔ جو کچھ آزاد کشمیر کے سیاسی حلقوں میں ہوتا رہا ہم سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ہمارے سامنے اس کے جسدِ مستعار کا ایک ایک ناکہ بول رہا ہے۔ اس مرحلے میں ہم اُن حقائق کے سربستہ چہرے سے نقاب نہیں اُٹھانا چاہتے جو اس سیاسی ناٹک کی ہدایت کاری کا باعث ہوئے ہیں۔ ہمیں نہ تو سردار عبدالقیوم کی حمایت کا شرف حاصل ہے اور نہ اُن کے روایتی مخالفوں سے کوئی شخصی اختلاف ہے۔ وہ اپنے سیاسی خد و خال کو ہم سے کہیں بڑھ کر جانتے ہیں اس مرحلے میں قراردادِ عدم اعتماد کے متعلق ہم اپنے اس تاثر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آزاد کشمیر اسمبلی کے جن محترم ارکان نے قراردادِ عدم اعتماد کا ناٹک کھیلا ہے۔ انہوں نے ممکن ہے اپنے سیاسی ڈائریکٹر کی خوشنودی حاصل کر لی ہو اور سردار عبدالقیوم کو شکست دے کر انہیں کوئی سی خوشی حاصل ہوئی ہو لیکن ہمارے ان دوستوں نے اس مرحلے اور موقع پر مسئلہ کشمیر کی ذرہ برابر خدمت نہیں کی بلکہ معنوی اعتبار سے نقصان پہنچایا ہے۔ ہم یہ بات بھی اپنے دل میں چھپا کر نہیں رکھنا چاہیے کہ ہمارے ان بھائیوں میں استقامت و ایثار کے اعتبار سے کوئی شخص ایسا نہیں جو سردار عبدالقیوم کا ہم پلہ ہو۔ اگر وہ عدمِ اعتماد کی اس فتح یابی کے بعد اپنی دستار میں کسی طُرّے کو بالا ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ تو ہم نہایت عجز سے یہ عرض کریں گے کہ اُن کی شخصی حیثیت ضرور بڑھ گئی ہے لیکن قومی اعتبار سے انہوں نے مسئلہ کشمیر کے حلیف کو ناموافق حالات کے شعلوں میں پھینک دیا ہے۔ ہم آزاد کشمیر کی لیڈرشپ کے احوال و وقائع سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنے قد و قامت کے متعلق فخر و شرف کے بہت سے الفاظ جمع کر سکتے ہیں لیکن فہم و فراست کے اعتبار سے اُن میں کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔ اگر کوئی شخص پاکستان میں جہادِ کشمیر کی خصوصیات کا مظہر تھا تو وہ چوہدری غلام عباس یا اُن کے ایک دو ساتھی تھے جنہیں موت نے قبل از وقت اُٹھا لیا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ چوہدری غلام عباس کی پیٹھ میں کون لوگ خنجر گھونپتے رہے اور اب وہ کس کے برسرِ پیکار ہیں، سامنے آ رہے ہیں۔ سردار عبدالقیوم جہادِ کشمیر کا ایک اہم رکن تھے۔ انہوں نے ایک خاص دور میں اپنوں کے مظالم بھی سہے ہیں۔ اگر وہ آزاد کشمیر کے صدر ہوئے تو اُن پر کوئی احسان نہ تھا بلکہ انتخاب کی بازی میں انہوں نے اپنا حق قائم کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بحیثیت صدر اُن سے کوئی سیاسی یا شخصی غلطی سرزد ہوئی ہو لیکن ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آزاد کشمیر کی پہلو دار سیاست میں اس قدر اُجلے دامن کے لوگ کتنے ہیں؟ آخر آزاد کشمیر میں اس طرز کا ناٹک کھیلنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا سردار صاحب آزادیٔ کشمیر کے راستے میں مزاحم تھے یا اُن کی مسند دوستی یا مسند نشینی اس قدر مصلحت پسند ہو گئی تھی کہ آزادیٔ کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا یا پھر وہ کونسا لائحہ عمل تھا جس کو عدمِ اعتماد کے محرکین اختیار کر کے آزادیٔ کشمیر سے قریب ہونا چاہتے تھے اور سردار صاحب اُن کی راہ میں مزاحم تھے۔ ہم ایک خلوتی راز کی حیثیت میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس طاقت کے اشارے پر آزاد کشمیر اسمبلی کے ارکان نے کبڈی کھیلی ہے اُس طاقت نے اپنی سوچ کے خطوط پر بھروسہ کر کے کسی عمدگی کا ثبوت نہیں دیا اور جن ارکان اسمبلی نے اس کھیل میں اداکار کی حیثیت سے کام کیا ہے انہوں نے مسئلہ کشمیر سے انصاف نہیں کیا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی عرض کر سکتے ہیں کہ آزاد کشمیر کی سیاست مغلیہ دور کے اُن آخری شہزادوں کی سی ہے جو قلعۂ معلی میں آداب بجا لاتے خود پناہ ڈھونڈتے اور مصاحبوں میں جہاں پناہ کہلاتے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے اس نازک دور میں جب کہ سرحدوں سے ملحقہ ممالک ہم سے مخلص نہیں۔ اس طرز کے ڈرامے کیوں رچائے جا رہے ہیں اور اس کا حاصل کیا ہوگا؟ بہرحال جو لوگ آزاد کشمیر کی موجودہ سیاست میں نمایاں ہونا چاہتے ہیں اور اُن کے نہاں خانۂ دل میں اقتدار کی خواہش کروٹیں لے رہی ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے وہ قابلِ قدر وجود کہلا سکتے ہیں لیکن قومی اعتبار سے اُن کی شخصیت ابھی مرتب نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں نہ تو ایثار و استقامت کوئی معیار ہے اور نہ آزمائش و ابتلا میں ثابت قدم رہنا کسی شخصیت کی اساس سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ فنِ خوشامد میں یکتا ہوں اور ذاتی اغراض کے لیے قومی مفاد کا ڈھونگ رچا سکیں انہیں عوامی ارادت حاصل

باقی ص ۲۷ پر

ہفت روزہ چٹان لاہور

از ڈاکٹر سید عبداللہ

سرگذشت مولانا داؤد غزنوی

تصنیف سید ابوبکر غزنوی پر تبصرہ

سوانح عمریاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں، لیکن بعض سوانح عمریاں اپنے خصائص فائقہ کی وجہ سے، امتیاز کی مالک ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی لکھی ہوئی سرگذشت مولانا داؤد غزنویؒ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

اس سرگذشت کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ ایک فرزند کے تاثرات پر مشتمل ہے اور اس کی یہی نوعیت ایسی ہے جو سوانح نگار پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد کر دیتی ہے جس سے سوانح عمری کی مشکلات میں بے انداز اضافہ ہو جاتا ہے۔

یوں تو ایک فرزند ...... بلکہ ہر کوئی کسی بھی شخص کے بارے میں جو کچھ چاہے لکھ سکتا ہے، لیکن معیاری سوانح عمریاں تبھی وجود میں آ سکتی ہیں۔ جب لکھنے والا سوانح نگاری کے تقاضوں کو پورا کرے۔ ان اصولوں کا پابند ہو جو ایک اصولی اور فنی سوانح عمری کے لیے ضروری ہیں۔ اور ان قاعدوں اور ضابطوں کا خیال رکھے جن کے بغیر سوانح عمری محض واقعات کا ذخیرہ بن کے رہ جاتی ہے۔

ایک فرزند جب اپنے نامور والد کے حالات زندگی مرتب کرتا ہے تو اسے ایک بہت بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے۔ کہ عقیدت و محبت کا فرد اس کے قلب و دماغ پر غالب ہوتا ہے، اس کی نظر میں، انسان عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے......، وہ ایک کشمکش میں ہوتا ہے، اس کی محبت بسا اوقات اس کی غیر جانبداری پر غالب آ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں، اس لیے اسے ہر شے کو بنظر محبت دیکھنا پڑتا ہے۔

ایک فرزند کے لیے اپنے بزرگوار کی لائف لکھنا امتحان سے کم نہیں، میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ سید ابوبکر غزنوی اس مشکل سے کس طرح بچ نکلے لیکن یہ بہ وثوق کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سوانح نگار نے عقیدت والفت کے باوجود اپنے نامور والد کی جو تصویر پیش کی ہے، اس کا ہر ہر لفظ سچ ہے، اس کا عنصر بیان امر واقعہ اور صحیح صورت پر مبنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بہت کچھ نہ لکھا ہو، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے ہر ضروری بات لکھ دی ہے، اور جس طرح لکھی اور جتنی لکھی، اس میں صداقت ہی صداقت ہے ——

میں نے یہ سب باتیں، جدید مغربی ذوق سوانح نگاری کے زیر اثر لکھی ہیں، ورنہ حق یہ ہے کہ سوانح عمری کے بارے میں مسلمانوں کا اپنا ایک خاص تصور ہے جو مغربی تصورات کی ضد نہ بھی ہو تب بھی اس سے بہت مختلف ہے۔

خوش قسمتی سے سید ابوبکر غزنوی نے اپنے تصور سوانح نگاری کا کتاب کے حرف آغاز میں خود ذکر کر دیا ہے، بالکل توقع کے مطابق انہوں نے اس معاملے میں قرآن مجید ہی سے مشورہ لیا ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ دنیا کی عظیم (خصوصاً دینی) شخصیتوں کے ذکر کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان کے واقعات زندگی کو نمونہ بنایا جائے، ان کے ذکر اذکار سرگذشت سے بصیرت بھی حاصل کی جائے اور عبرت بھی۔ ہمارے سوانح نگار نے اس واضح مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ عظیم قرآنی شخصیتوں کا ذکر بار بار تذکیر و موعظت کی غرض سے آیا ہے۔ تاکہ انسانیت پر یہ واضح کیا جا سکے کہ انسان غیر معصوم ہوتے ہوئے بھی قرب و ولایت کی بلندیوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ پس بزرگوں کے حالات زندگی محفوظ کرنا اور انہیں بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرنا عین منشائے الٰہی اور کتاب اللہ کی اقتدا ہے اور یہ نقطہ بھی بہرحال قابل غور ہے کہ

"کسی انسان کی سیرت کے بارے میں اس کے گھر کے افراد کی گواہی بہت بڑی گواہی ہے۔"

محبت کی آزمائش کے باوجود سوانح عمری کا یہ بہت زریں اصول ہے، جس طرح صاحب البیت ادری بما فیہ تاریخ و سیرت کی ایک اہم اساس ہے اسی طرح گھر والوں پر گھر والے کی گواہی بھی ایک سند ناطق ہوتی ہے۔

آج کے لوگ مسلم شائستگی اور مسلم آداب کی گہری حکمتوں اور پاکیزہ شرافتوں کے بارے میں کور ذوق ہوتے جاتے ہیں، ورنہ ان پر یہ عیاں ہو جاتا کہ مسلم معاشرہ شرف انسانی کا پاسدار تھا وہ اس امر پر زور دیتا تھا کہ عظیم انسانوں کی عظمتوں کو سامنے لایا جائے تاکہ ان کے بنی نوع بھی شرف و کمال کے ان مراتب تک پہنچ سکیں جو ریاضت محنت، جستجو اور مجاہدۂ روحانی کی بدولت خالق کائنات کسی بشر پر ارزانی کرتا ہے، سوانح نگاری کا مقصد مغرب والوں کے نزدیک بے نقاب کرنا ہے، مسلم تصور کے مطابق سوانح عمری انسان کے کسب کمال کی چہرہ کشائی کرتی ہے۔ یعنی انسان

نے وہ جیسا کچھ بھی ہے، اپنی بشریتوں اور فطری کمزوریوں کے باوجود کمال تک پہنچنے کے لیے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، کتنی فریاد کی، کتنی کوہکنی کی، تب جا کر عظمت حاصل کی۔ سید ابوبکر کی مرتب کردہ سوانح عمری اسی کوہکنی کی داستان ہے یہ سرگذشت دراصل چند سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بیشتر مضامین حضرت مولانا داؤد غزنویؒ کے احباب اور عقیدت مندوں کے رقم کردہ ہیں ہر ایک نے حضرت مولانا پر اپنے اپنے زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے روابط کے اعتبار سے معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لحاظ سے اسے سوانح عمری تو نہیں کہا جا سکتا، محض سوانحی تاثرات ہی کہا جا سکتا ہے۔

باایں ہمہ دوسرے حضرات کے مضامین کے بعد، سید ابوبکر غزنوی کے قلم سے جو سرگذشت اس میں شامل ہے، اس سے کتاب میں سوانحیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

اس حصے کا سرنامہ سیدی وابی ہے، اور ان دو لفظوں میں ان معانی کی روح سمٹ کر جلوہ گر ہو گئی ہے جو اس روداد میں نور و نکہت کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیدی میں وہ عقیدتیں پنہاں ہیں جو ایک مرشد کے لیے ہوتی ہیں، اور ابی میں وہ جذبات موجزن ہیں جو ایک فرزند کے اپنے پدر بزرگوار کے لیے ہوتے ہیں۔ ان عناصر کے امتزاج سے یہ شیریں کتاب ظہور میں آئی ہے۔

سیدی وابی میں ایک طرف مولانا داؤد غزنوی کے وہ واقعات درج ہیں، جن سے ان کی شب و روز کی زندگی عبارت تھی، خاندانی حالات، بزرگوں کی غزنی سے آمد، تعلیم و تربیت، سیاسی زندگی اور آخر میں دینی رشد و ہدایت کے طریقے اور فیوض ہیں اور جب مصنف نے یہ کہا تو سچ کہا کہ "جب والد علیہ الرحمۃ پر لکھے ہوئے تمام مضامین پڑھے تو محسوس کیا کہ یہ تو چند یادیں ہیں۔ چند تاثرات ہیں چند نقوش ہیں، ان کو مرتب سوانح حیات تو نہیں ہے، میں نے محسوس کیا کہ کتاب ناقص اور ادھوری رہ جائے گی، اگر والد علیہ الرحمۃ کے حالات بطنا مرتب نہ کیے گئے اور ان کے دینی اور علمی رجحانات کی وضاحت نہ کی گئی"۔

اور اس میں کیا شک ہے کہ سید ابوبکر غزنوی اپنے والد محترم کے خاص حالات اور ان کے معارف و فیوض پر نہ لکھتے تو یہ کتاب ناقص بھی ہوتی اور بے مزہ بھی، موجودہ صورت میں یہ کتاب مانع تو نہیں مگر جامع تصور اور تصویر دے رہی ہے، اور تصویر بھی ایسی کہ اسے رنگین کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ یہاں رنگین سے میری مراد انداز بیان کے لحاظ سے رنگین ہے، اور سب جانتے ہیں کہ سید ابوبکر غزنوی کا اسلوب خطابت اور اسلوب تحریر اس دلکش اور دلآویز طرز بیان کا عکس ہے، جسے پہلے شبلی نعمانیؒ نے اور پھر مولانا ابوالکلامؒ نے اس ملک میں رائج کیا۔

سیدی وابی والا حصہ بالکل شبلیؒ و ابوالکلامؒ کے انداز میں شعر سے شروع ہوتا ہے، جس میں فارسی غزل کی استعاریت اور رومانیت موجود ہے ------ اس کے بعد یہ استعارہ تدریجاً تصویر میں ڈھلتا جا رہا ہے، لفظوں کی شیرینی، ترکیبوں کی خوش ادائی، ادب کی رعنائی، پیرائے کی زیبائی اور عبارتوں کا حسن اپنی پوری شان سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزنوی خاندان کی داستان دعوت و عزیمت بجائے خود ولولہ انگیز اور عبرت آموز ہے مگر اس مختصر تبصرے میں اس کی تفصیل کی کوشش ممکن نہیں، اگر چند باتیں، حضرت مولانا داؤد غزنوی کے فقہی اور صوفیانہ مسلک کے بارے میں ہی بیان کر دی جائیں تو موجودہ مقصد کے لیے کافی ہوگی۔

یہ تو معلوم ہے کہ غزنوی خاندان مسلک کے اعتبار سے حنبلیؒ عقائد کے قریب اور امام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کے طریق کا پیرو تھا، لہٰذا قدرتی طور سے مولانا داؤدؒ بھی اسی زاویہ نظر پر قائم تھے لیکن سیدی وابی کے مصنف نے ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے والد کے معتقدات میں جہاں ایک طرف استقامت تھی وہاں اعتدال بھی تھا۔

احناف اور اہل حدیث دونوں گروہوں میں جب شدید کشمکش پیدا ہوئی، تو دونوں طرف غلو اور انتہا پسندی نے غلبہ پایا، چنانچہ بعض متشدد اہل حدیث نے آئمہ کبار کے بارے میں بے ادبی کے کلمات کہے اور غالی احناف، اہل حدیث کے اسلام ہی کے منکر ہو گئے۔

لیکن طبع سلیم رکھنے والے لوگ دونوں گروہوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں ------، چنانچہ خود مولانا داؤد ان بزرگوں میں سے تھے جو مابہ الاختلاف کے باوجود مابہ الاشتراک کے اصول پر مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی پر زور دیتے اور عمر بھر اختلاف کے دائرے کو کم کرتے رہے۔

میرا یہ بیان سادہ سا ہے، اس کی رنگین تفصیل و تشریح سیدی وابی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اہلحدیث کا گروہ، تصوف کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا لیکن یہ خیال حقائق کے خلاف ہے، جسے اس حقیقت کا بچشم خود مشاہدہ کرنا ہو، اسے علامہ ابن قیمؒ کی کتاب اغاثۃ اللہفان کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں مجاہدات و فیوض قلب کا مشرح بیان موجود ہے۔

سیدی وابی میں سید ابوبکر نے حضرت مولانا داؤد کی کتاب "معارف اللطائف" سے اور خود اپنے

باقی صفحہ ۲۲ پر

۲۰ اپریل کو یوم اقبال کی دو تقریبیں

رپورٹ :- عبد السلام ملک

ڈاکٹر عبد الخالق صوبائی وزیر تعلیم نے دانشوروں پر ذہنی فتح حاصل کی

اسلامی جمعیۃ طلبا لاہور نے تحریک ختم نبوت کے دشمن کی صدارت میں یوم اقبال منایا

اس دفعہ یوم اقبالؒ نہایت سج دھج سے منایا گیا۔ ۲۰ اپریل کو اتوار تھا ، ۲۱ کو پیر ، دونوں روز یوم اقبالؒ کی تقریبات منعقد ہوئیں ۔ عجیب بات ہے کہ اپوزیشن کے کسی راہنما نے یوم اقبالؒ پر بیان نہیں دیا۔ غالباً وہ بھول گئے لیکن ۲۱ اپریل کی صبح کو وزیر اعظم بھٹو کا بیان اشتراکی مزاج رکھنے والے اخباروں کے سوا ہر اخبار نے شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس بیان کا یہ فقرہ فکر اقبالؒ کا نچوڑ تھا کہ "عوام عصر حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کلام اقبال سے ولولہ تازہ حاصل کریں ۔ یہی وہ لافانی کلام ہے جس نے مسلمانوں میں اپنا مقدر آپ سنوارنے کی تڑپ پیدا کی ۔" دوسرا بیان چوہدری فضل الٰہی صدر پاکستان کا تھا جس میں انہوں نے اس امر کی تلقین کی "کہ کلام اقبالؒ کو گھر گھر پہنچا دیا جائے کیونکہ اسی کلام نے مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں امید اور ایقان کی قندیلیں روشن کی تھیں ۔"

یوم اقبالؒ کی صبح کو لاہور میں ٹرسٹ کے دو اخباروں نے اپنے مخصوص اشتراکی فلسفے کو ایک دو مقالوں کے ذریعے اقبالؒ کے منہ میں ڈالنا چاہا وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ تو ان کے قارئین ہی کر سکتے ہیں لیکن انہیں اپنی ذہنی نامردی پر ضرور سوچنا چاہیے کہ جو فلسفہ ان کے دماغ میں سمایا ہوا ہے وہ مسلمان قوم کا فلسفہ نہیں ہے ۔ اس فلسفہ کو اٹھانے کے لیے وہ عظیم اسلامی شخصیتوں ہی کا سہارا لیتے ہیں ۔ آخر اقبالؒ کے نام پر وہ مارکس کا فلسفہ کیوں پیش کرتے ہیں ۔ مارکس ہی کے نام پر مارکس کا فلسفہ پیش کریں ۔ بہرحال یہ ایک نظری بحث ہے ۔ ہم کتنی ہی کوشش کریں لیکن اقبالؒ کو کسی یورپی مفکر کا جامہ نہیں پہنا سکتے ۔

بشکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور

---

۲۰ اپریل کو یوم اقبالؒ کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنی تقریب کے انعقاد کا اعلان پروگریسو فرنٹ نے کیا ۔ اس تقریب کی صدارت ملک معراج خالد مرکزی وزیر قانون کو کرنا تھی لیکن وہ اسی روز صبح سویرے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے پیغام پر اسلام آباد چلے گئے ۔ ان کی جگہ ڈاکٹر عبد الخالق وزیر تعلیم پنجاب نے صدارت کے فرائض انجام دیئے ۔ یہ ایک بھرپور اجلاس تھا جس میں دانشوران اقبالؒ ، مختلف کالجوں کے اساتذہ اور اکثر معروف ادیب و شاعر شریک تھے ۔ لا کالج لاہور اور اورینٹل کالج لاہور کے دو نوجوان پروفیسروں نے کلام اقبالؒ پر نہایت فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ۔ (راقم ہر دو پروفیسروں کا نام اپنی یادداشت میں محفوظ نہ رکھ سکا ۔ اس فروگذاشت کے لیے قلم شرمندہ ہے) پروفیسر سرور حسین نے علامہ اقبالؒ کے تصور اسلامی پر نہایت شستہ اور رفتہ اسلوب میں اظہار خیال کیا ۔ آخری مقرر آغا شورش کاشمیری تھے ۔ اپنے مخصوص ادبی انداز میں آپ نے اقبال کی سرگزشت ذہنی بیان کی اور ان کتابوں پر نہایت سنے تلے الفاظ میں تبصرہ کیا جو حکیم مشرق کے سوانح و افکار سے متعلق برعظیم کے نامور اہل قلم نے تحریر کی ہیں ۔ آغا صاحب کی تقریر پچاس منٹ جاری رہی جس کے سحر سے تمام حاضرین متاثر تھے ۔ آپ کے بعد حکومت سعودی عربیہ کے فاضل کونسلر جناب خالد ہمدان نے اقبالؒ کے تصور اتحاد اسلامی کی روشنی میں شاہ فیصل کے کردار پر نہایت پر معنی خیالات کا اظہار کیا ۔ آخر میں ڈاکٹر عبد الخالق وزیر تعلیم نے گھنٹہ بھر فکر اقبالؒ سے متعلق بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ۔ آغا شورش کاشمیری اس توجہ سے بہت کم تقریریں سنتے ہیں لیکن آپ نے وزیر تعلیم کی تقریر کے بعد اپنے فاضل احباب کی صحبت میں جو تبصرہ کیا وہ حسب ذیل تھا ۔

آغا صاحب نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے وزیروں سے متعلق اس خیال کو وسعت دی جاتی ہے کہ ان میں وفاقی یا مرکزی طور پر ایک بڑی اکثریت ان وزرا کی ہے جو علم و خطابت سے آشنا نہیں ۔ وزراء کا انتخاب وزیر اعظم کی ذہنی سخاوت سے ہوتا ہے ۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ادیب بھی ہیں اور خطیب بھی اور یہ بات کسی عنوان سے بھی اختلافی نہیں لیکن دوسرے وزیروں کے بارے میں ایسا کوئی تصور یا تصور علم و خطابت کے حلقوں میں نہیں ۔ ڈاکٹر عبد الخالق کی تقریر سن کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ نہایت اعتماد سے رواں دواں بولتے ہیں اور جس طرح بولتے ہیں اس سے تقریر کے لوازم کا حسن جھلکتا ہے ۔ فن خطابت کی روایت کے مطابق تقریر کے بنیادی اجزا بارہ ۱۲ ہیں ۔ ان میں شاید سب سے مشکل فقروں کا ربط اور تلفظ کی برجستگی ہے ڈاکٹر

صاحب نے انگریزی زبان سے پرخلوص اور مختصر عملی گفتگو میں منکسر نہیں کھائی۔ انہوں نے فی البدیہہ تقریر کی لیکن مضمون میں آخر تک تسلسل قائم رکھا اور الفاظ کو اس خوبی سے ادا کیا کہ طبیعت تحسین پر آمادہ ہوتی رہی۔ ایک شخص جو سیاست و وزارت میں قدم رکھنے سے پہلے عمومی روایت کے مطابق امراض قلب کا ڈاکٹر تھا۔ اس کی تقریر نے یہ تاثر پیدا کرنے میں پوری پوری معاونت کی کہ اسے زبانِ اردو پر قابو حاصل ہے۔ فارسی لب و لہجہ پر قدرت ہے اور عربی زبان میں خصوصی مہارت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جناب خالد محمد ان کو کئی دفعہ مخاطب کر کے عربی زبان میں بعض طویل فقرے ادا کئے اور یہ بات سامعین کے لیے باعثِ مسرت تھا کہ صوبائی وزیر تعلیم عربی زبان میں اس طرح خطاب کرتے ہیں جس طرح عرب شاعر اپنی محبوبہ سے کلام کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر عربی، اردو اور انگریزی کے مختلف شہ پاروں کا مجموعہ تھی۔ آغا صاحب نے تاریخ کے مختلف مطالب پر تشریحی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس تصور میں تھے کہ وزیر اعظم بھٹو صوبائی وزراء کی حد تک علمی صلاحیت اور ذہنی قابلیت کے لوگ نامزد نہیں کرتے بلکہ اپنی جماعت اور اپنی ذات سے وفادار افراد کا چناؤ کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالخالق نے اس خیال کو رد کر دیا۔ فی الحقیقت وہ جس عہدے پر فائز ہیں اس کے لیے اوپرے نہیں ان میں ذہنی قابلیت بدرجہ اتم ہے اور اسلامی فکر پر نہایت شگفتہ الفاظ میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ آغا صاحب نے کہا ہم پیپلز پارٹی سے سیاست میں بلاشبہ ایک فاصلہ پر ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالخالق کے متعلق یہ بات ایک تاثر کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک کسی جماعت، کسی آمر اور کسی وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ نے صوبائی وزارت کی حد تک ڈاکٹر صاحب ایسا علمی ذوق کا صوبائی وزیر تعلیم مقرر

نہیں کیا۔ البتہ بعض قابل قدر پروفیسروں اور پرنسپلوں کو ان سے یہ شکایت ضرور ہے کہ ان کے تبادلے سیاسی وجوہ کی بنا پر کئے جاتے ہیں اور پنجاب یونیورسٹی کی فضا چند مخصوص مزاج کی لیڈرشپ کی کے روایتی ڈائریکٹروں کی سی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم کو اس امر کا ضرور پتہ لگانا چاہیئے کہ امتحانات میں فیل ہونے والوں کی تعداد کن عنوانوں کے تحت یا کن رجحانوں کے پس منظر میں خوفناک حد تک بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

---

۲۰ اپریل کو ٹھیک اسی وقت بسلسلہ یوم اقبالؒ اسلامی جمعیت طلبہ لاہور نے بھی وائی ایم سی اے ہال میں ایک دوسرے جلسے کا اعلان کر دیا۔ اس اجلاس کے صدر ایک ایسے صاحب بنائے گئے جو مرزائیت کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے خیالات سے مطلقاً اتفاق نہیں کرتے بلکہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے کے فیصلے پر انتہائی بے چین ہیں، اس کو غلط قرار دیتے۔ چوہدری سرظفر اللہ خاں کی حاضری بھرتے۔ ربوہ کے بائی کمان سے تعلق خاطر رکھتے اور اس سلسلے میں پچھلے سال کئی ایک مشہور اشتراکی دوستوں کی چوکھٹ پر حاضری

باقی صفحہ ۲۲ پر

ٹینڈر نوٹس

پیپلز ورکس پروگرام کے درج ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹینڈر مورخہ ۲۸/۴ صبح گیارہ بجے تک دفتر اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ میں مطلوب ہیں۔ ٹینڈر صرف پیپلز ورکس پروگرام کے منظور شدہ ٹھیکیداروں کو جاری کئے جاویں گے۔ جنہوں نے سالِ رواں کی تجدیدی فیس اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ کے دفتر میں جمع کرا دی ہے۔ ٹینڈر ٹھیکیداروں یا ان کے نمائندوں کی موجودگی میں وقت مقررہ پر کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر زیر دستخطی دفتر ہذا سے کسی بھی کام کے دن قیمتاً مل سکتے ہیں۔ تخمینہ اور ڈیزائن وغیرہ کی تفصیلات اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ کے دفتر میں کسی بھی کام کے دن دفتری اوقات میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ زرضمانت ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں قبول کی جائے گی جو اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ کے حق میں ہونی چاہیئے۔ اگر تخمینہ جات میں کوئی تبدیلی جو ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے منظوری دیتے وقت کریں گے۔ ٹھیکیداران پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ ٹینڈروں کی قطعی منظوری تابع احکام جناب ڈپٹی کمشنر صاحب گوجرانوالہ ہوگی جو کہ کسی ٹینڈر کو بغیر وجہ بتائے مسترد کرنے کے مجاز ہوں گے۔

مشروط:۔ مشکوک اور بذریعہ تار ٹینڈر قابل قبول نہ ہوں گے۔

نمبر شمار	تفصیل	رقم تخمینہ	زرضمانت	میعاد
۱	پختہ سڑک فیروزوالا منڈیالہ تیگہ (لمبائی دو میل)	۴،۱۶،۰۰۰/-	۸۳۰۰/۰	۳ ماہ
۲	پختہ سڑک نوشہرہ کڑیال (لمبائی ۴½ میل)	۵،۰۰،۰۰۰/-	۱۰۰۰۰/۰	۴ ماہ
۳	پختہ سڑک حافظ آباد قادر آباد (لمبائی ۴½ میل)	۴،۰۰،۰۰۰/-	۸۰۰۰/۰	۴ ماہ
۴	امپرومنٹ آف کوٹ اسحاق لنک روڈ	۷۰،۰۰۰/-	۱۴۰۰/۰	۱½ ماہ
۵	تعمیر پلیاں وسولنگ			
	واہنڈ سوہاوا روڈ (لمبائی ایک میل)	۱،۳۲،۰۰۰/-	۲۶۰۰/۰	۲ ماہ

پراجیکٹ ڈائریکٹر / ڈپٹی کمشنر

پیپلز ورکس پروگرام گوجرانوالہ

IPL 1161



میاں امیرالدین صدر مرکزیہ مجلس اقبال ، جسٹس جاوید اقبال



جناب بشیر ناظم
کلام اقبال پیش کر رہے ہیں



کرنل شہباز خان ، عالیجناب جسٹس محمد افضل چیمہ
ڈاکٹر عبدالحمید خان ، ڈاکٹر امیرالدین
[illegible]



آغا شورش کاشمیری نے شاہ فیصل کی شہادت اور خواجہ عبدالرحیم بارایٹ لاء کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کی ۔



آغا شورش کاشمیری جنرل سیکرٹری ، آنریبل چیف جسٹس۔

تقریبات



یونیورسٹی ہال میں شیدا



سردار محمد اقبال، میاں امیرالدین صدر مرکزیہ مجلس اقبال

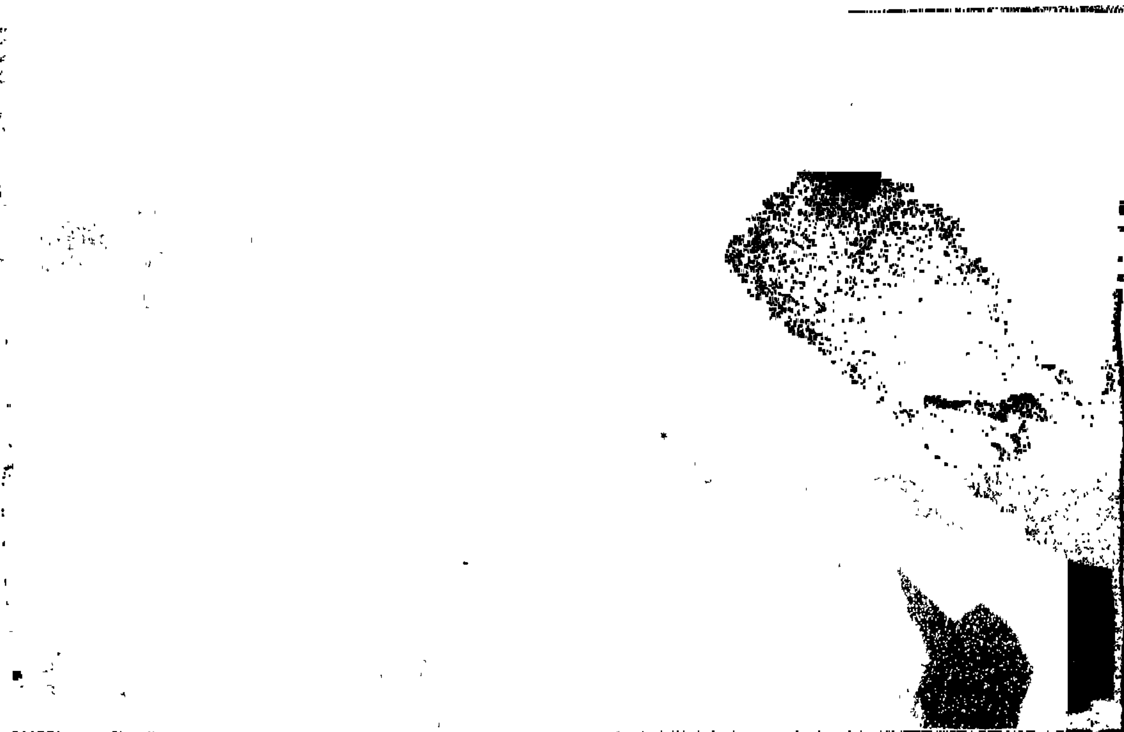


سید ابوبکر غزنوی کلام اقبال پر اپنے
بصیرت افروز خیالات کا اظہار کر رہے ہیں

یوم اقبال



اہل اقبال کا اجتماع عظیم   تصاویر: صلاح الدین خودہرے



مسٹر حامد مجید، مسٹر مشتاق احمد جائنٹ سیکرٹری، میاں صلاح الدین احمد اور میاں زاہد سرفراز



ملک عبدالسلام، پروفیسر سرور حسین، مختار الحسن، آغا شورش کاشمیری، علامہ عزیز انصاری

قسط (۲)

تحریر: شیخ محبوب علی اسسٹنٹ چیف انجنیئر
ٹیلیفون اسلام آباد

ہندوستان میں اسیری کے شب و روز

رفیق صاحب نے سگنل والوں کا ہیڈ کوارٹر دیکھا ہوا تھا، اس لیے بعافیت وہاں پہنچ گئے۔ میجر منیر صاحب، میجر عارف ضیاء صاحب اور میجر اکرم صاحب (سگنل) سے ہمارا پہلے سے تعارف تھا، ان حضرات نے ہمیں تین کمروں کا ایک کوارٹر دے دیا اور ہماری ہر سہولت کا خیال رکھا، اس کوارٹر کے ایک کمرے میں یونس صاحب دوسرے میں ہم اور تیسرے میں رفیق صاحب اور عبدالصبور صاحب سما گئے۔ شام تک ہمارے محکمے کے تقریباً سبھی حضرات چھاؤنی میں آگئے، انہیں سگنل کے ساتھ والی بیرک میں ٹھہرایا گیا

چھاؤنی میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہر شعبہ زندگی کے لوگ جمع ہو رہے تھے سول آفیسر، تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ، پولیس اور فوج کے سپاہی، مشرقی پاکستان میں رہنے والے غیر بنگالی اس پر مستزاد تھے، عجب عبرت در قیامت کا سماں تھا، کروڑ پتی قطاروں میں کھڑے ہو کر لنگر سے کھانا حاصل کرتے تو دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہوتا۔ مختلف خبریں گشت کرتیں۔ کبھی سنتے، کہ ہمیں یہاں سے سیدھا مغربی پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ کبھی پتہ چلتا جس کے پاس کرایہ ہو گا، اُسے ہوائی جہاز کے ذریعے بھیجا جائے گا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے روپے کا بندوبست بھی کرنا شروع کیا، شہر سے ہولناک خبریں آتیں، اندرون شہر محمد پور، میرپور اور بازار کی آبادی جو مہاجرین پر مشتمل تھی، اُسے مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ تاہم محمد پور اور میرپور کے بارے میں ابھی کوئی ایسی خبر نہیں آئی تھی۔ چھاؤنی کے قریب ریلوے لائن گزرتی تھی، جب بھی ریل آتی، اس پر بیٹھے ہوئے لوگ جے بنگلہ کے نعروں سے زمین آسمان ایک کر دیتے ــــ مغلظات کا استعمال بھی بے دریغ ہوتا، بسا اوقات ٹرین سے ہماری طرف پتھروں کی بارش بھی ہوتی تھی ــــ،

[بشکریہ] ہفت روزہ چٹان لاہور۔

۲۰ دسمبر کو ہندوستانی فوج نے پاکستانی فوج سے ہتھیار واپس لے لیے، اس موقع پر چشم فلک نے جو منظر دیکھا، اُسے دہرانے کی تاب نہیں، اہل وطن اس کی تفصیلات سے آگاہ ہو چکے ہیں بلکہ سنا ہے انہوں نے اسے ٹی وی پر دیکھا بھی تھا، ــــ

۱۴ جنوری ۱۹۷۲، بروز جمعہ ہم چھاؤنی سے کرمی ٹولا (ائر فورس کالونی) چلے گئے، دس روز وہاں قیام رہا۔ پاکستانی فوج ہندوستان کے مختلف کیمپوں میں منتقل ہو رہی تھی؛ ۲۳ جنوری کو ہمیں بھی حکم ملا، کہ ہندوستان جانے کے لیے تیار رہیں، چنانچہ ۲۴ جنوری کو بذریعہ ریل نارائن گنج پہنچے۔ وہاں سٹیمر کے ذریعے کھلنا، وہاں سے شام کو گاڑی روانہ ہوئی، جس نے ہمیں پہلے جیسور اور وہاں سے کلکتہ کے ریلوے سٹیشن ڈم ڈم پر پہنچا دیا۔ کچھ علم نہیں تھا، ہماری منزل کہاں ہے؟ مگر آہ! ہماری منزل تو مدت ہوئی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی ورنہ یہ حشر کیوں ہوتا، ہم اپنے ہی ملک کے ایک حصے سے ذلیل و خوار کر کے نکالے جا رہے تھے۔ اور اب انجانی منزلوں کی طرف رواں دواں تھے، ۲۷ جنوری کو بقر عید تھی۔ مگر سارا دن سفر میں کٹا، ریلوے لائن کے نزدیک ایک مقام پر مسلمانوں کو عید کی نماز پڑھتے دیکھا تو آنکھیں امڈ آئیں، اپنی بے بسی نے تڑپا تڑپا دیا ؎

دیکھ فانی وہ تیری تدبیر کی میت نہ ہو
ایک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

ڈم ڈم سے گاڑی نے رُخ بدلا، رات بھی سفر میں کٹی، راستے میں گیا ریلوے سٹیشن پر گاڑی کافی دیر رُکی رہی۔ اور پھر سر اٹھائے مغل سرائے ہوتی ہوئی ۲۹ جنوری کی صبح لکھنؤ پہنچ گئی، وسط ہند کی اسلامی تہذیب کے مرکز کے حوالے سے اس شہر کی تاریخ فلم کی طرح ذہن میں آتی چلی گئی۔ مسلم عروج و زوال کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ سرد آہوں کا سلسلہ جاری ہو گیا جو گاڑی چلنے کے ساتھ تیز ہوتا گیا، صبح کے نو بجے ملیح آباد کا سٹیشن گزرا، بریلی ایک بجے پہنچے۔ سید احمد شہیدؒ کی یاد نے اور بھی غمگین بنا دیا۔ سید ابوالحسن علی ندوی بھی بہت یاد آئے، نواب رام پور سے پونے ۴ بجے گزرے، مراد آباد ساڑھے چار بجے پہنچے، شہر سے کچھ فاصلے پر ایک عظیم الشان مسجد کے مینار نظر آتے، ساتھ ہی ایک بڑا مندر سر اٹھائے کھڑا تھا، امروہہ ۶ بجے گزر گیا۔

۳۰ جنوری صبح پانچ بجے سہارنپور پہنچے، بڑا پُر شکوہ سٹیشن تھا، مدرسہ مظاہر العلوم، دارالعلوم دیوبند اور جلیل القدر علماء کی نسبت سے سر عقیدت و احترام سے جھک گیا، شیخ الحدیث مولانا ذکریا صاحب بہت یاد آئے، ان کی مرتب کردہ فضائل کی کتابوں نے لاکھوں دلوں

جو مسلمہ روایت کی قبرپائیدہ رحمت کی ہے —

۳۰ جنوری ہی کو ۹ بجے صبح کاڑی ڈنڈھیرہ چھاؤنی پہنچ گئی۔ معلوم ہوا یہی ہماری منزل ہے شام کو چار بجے جب کہ بارشس ہو رہی تھی ہمیں چھاؤنی میں لے جایا گیا۔ ایک بیرک میں بمشکل ساٹھ (۶۰) آدمیوں کی گنجائش تھی مگر ۱۲۰ کی نفری کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔

۹ فروری تک یعنی پورے دس روز اسی ڈربے میں گزر گئے۔ بالآخر بھارتی نگرانوں کو یاد آیا کہ قیدیوں میں تقریباً ۶۰ درجہ اوّل کے سرکاری ملازم بھی ہیں، چنانچہ ہمارے ساتھ خصوصی امتیاز یہ ہوا، کہ ایک بیرک جو جونیئر کمیشنڈ افسروں کے لیے ساتھی ہمیں دے دی گئی۔ یونس صاحب بٹ صاحب اور میں اپنے بچوں کے ہمراہ ایک کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔

ضلع سہارنپور جس میں ہمارا کیمپ واقع تھا، دو چیزوں کے لیے مشہور ہے، انجینئر اور علماء — روڑکی مشہور انجینئرنگ یونیورسٹی ڈنڈھیرہ چھاؤنی سے چند میل کے فاصلے پر ہے دیوبند کا عالمی شہرت رکھنے والا ادارۂ دینیہ یہاں سے سولہویں میل پر ہے۔ سہارنپور کا فاصلہ ۲۰ میل اور کلیر شریف کا محض ۴ میل ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا تھانہ بھون، مولانا رشید احمد گنگوہی کا گنگوہ، نانوتہ اور نگینہ اور امبیٹھہ جیسے مقامات اسی ضلع میں ہیں، غرض پورا علاقہ علم و دین اور تصوف کے درخشندہ ستاروں سے منور ہے، بڑی خواہش تھی، کہ کبھی ان مقدس مقامات کی زیارت سے دل و دماغ کو معطر کروں گا، مگر نیرنگیٔ زمانہ مجھے ان کے قریب اس حالت میں لائی ہے، کہ درمیانی فاصلہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے ؎

ہائے رے انسان کی مجبوریاں
پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں

ہمارے کیمپ کے قرب و جوار میں بھی مسلمانوں

کی آبادی خاصی نظر آتی ہے، مسجدوں کے مینار بھی دکھائی دیتے تھے اور اذانوں کی آواز بھی آتی ہے، ہماری بیرک کا نگران سپاہی جے رام ہے، خدا کا کرم ہے کہ یہ شخص خاصے انسانی اوصاف رکھتا ہے۔ اور عام ہندوؤں کے برعکس بڑی خوش خلقی سے پیش آتا تھا، اسی کی وساطت سے ہم نے ڈنڈھیرہ جامع مسجد کے امام صاحب سے نماز قصر کا مسئلہ دریافت کرایا، امام صاحب نے جو تحریری جواب دیا، وہ یہ ہے :-

برادران اسلام السلام علیکم و رحمۃ اللہ
چونکہ آپ لوگ بحیثیت مجبوری مسافر ہیں، اس لیے آپ لوگ نماز قصر ہی ادا کریں گے، یعنی نماز ظہر و عصر اور عشاء کی نماز میں بجائے چار فرض کے دو فرض ادا کریں گے، باقی نماز مقیم کی نماز کی طرح ادا کریں گے۔

فقط والسلام

احقر سعید احمد بقلم خود امام مسجد
ڈنڈھیرہ ضلع سہارنپور

بقیہ: یوم اقبال کی تقریبیں

بھرتے رہے ہیں کہ وہ علماء کی اس تحریک کے خلاف ایک مشترکہ بیان جاری کریں۔ ہم نہیں جانتے اسلامی جمعیت طلباء لاہور نے کس پس منظر میں اس صدر کو تلاش کیا اور اس کے ذہن میں کیا تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی جمعیت طلباء نے اپنی اس تقریب کا سوانگ رچا کر تحریک ختم نبوت کی روح کو صدمہ پہنچایا ہے اور اگر اس کے ذہن میں یہ نقشہ ہے کہ اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری تحریک کو اس طرح کوئی تقویت پہنچائی ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ اسلامی جمعیت طلباء لاہور بہر حال اپنی رائے کے معاملے میں خود مختار ہے۔ ہم اس کے بارے میں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اپنے اس تاثر کو چھپانا ہمارے بس میں نہیں جس کا اظہار ہم نے الفاظ بالا میں کیا ہے۔

یوگنڈا، عراق اور اومان

یوگنڈا

ملک کا نام — یوگنڈا جمہوریہ
دارالحکومت — کمپالا
سربراہ مملکت — جنرل عیدی امین
سرکاری زبان — انگریزی
رقبہ — ۹۱۶۷، مربع میل
خاص برآمدات — کپاس، ہاتھی دانت، تمباکو، کافی
آبادی — ۸۴۳۰،۰۰۰ نفوس
یوم آزادی — ۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء
مسلم ۲۵ فیصد ۲۱،۷۵،۰۰۰ مسلمان
سکے — ۱۰۰ سینٹ = ایک شلنگ

پندرہویں صدی عیسوی میں سوڈان اور مصر کی طرف سے مسلمان قبائل، بیما اور سیما، یوگنڈا میں داخل ہوئے اور انہوں نے مقامی بنتو قبائل پر اپنی برتری قائم کرلی۔

۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ایک عرب تجارتی قافلہ اس طرف سے گزرا، اور یہاں کے بادشاہ موتیسا کے دربار میں پہنچا جو ان کے عقائد اسلامی سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے، اس سے ۵۰ سال قبل سے ہی کباکا (بادشاہ) یوگنڈا اور سنجبار کے سلطان سید عبدالماجد کے درمیان مخالفت کا تبادلہ جاری تھا کباکا کے مسلمان ہونے کے بعد یہاں اسلام کا فروغ ہوا۔

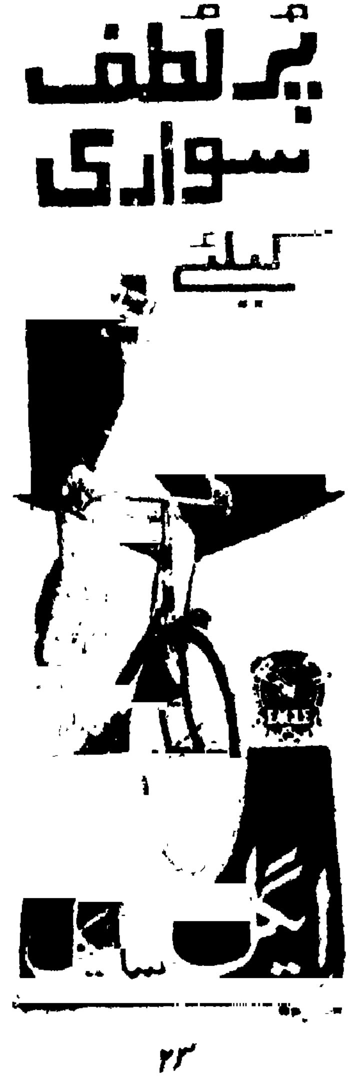
۱۹ جون ۱۸۹۴ء کو برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا، جس کے ذریعہ عیسائی پادریوں نے حالات سازگار بنا رکھے تھے۔ برطانوی استعمار کے خلاف آزادی پسند تحریکوں نے ۱۹۴۲ء میں یہاں عدم تشدد کی تحریک شروع کی، جس کے نتیجہ میں ۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو اسے نجات ملی اور الوٹے کباکا یوگنڈا کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے جنرل عیدی امین برسر اقتدار آ گئے۔

عراق

دریائے فرات اور دجلہ کے درمیانی علاقہ میں ۱۷۵۵۴، مربع میل پر مشتمل عراق کی آزاد اور خود مختار ریاست واقع ہے۔

عراق کا شمار مشرق اوسط کے تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے، سالانہ تقریباً ۳۵ ہزار بیرل تیل پیدا ہوتا ہے، اس کی سرحد میں ترکی، ایران اور اردن سے ملتی ہیں، ۸۵ لاکھ کی آبادی میں تقریباً ایک لاکھ کرد باشندے ۵۵ سال سے آزادی کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ مشرق اوسط کے اس خطہ میں بارشیں بہت ہی کم تقریباً ۱۵ انچ سالانہ پہاڑی علاقوں میں ۲۰ فیصد ہوتی ہے۔

۱۲۸۵ء میں منگولوں نے بغداد پر حملہ کرکے عباسی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرکے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۱۲ء میں ترکوں اور ایرانیوں میں اقتدار کی خاطر متعدد جنگیں ہوئیں اور آخر کار ۱۶۳۸ء میں عراق پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ جنگ عظیم میں مکہ کی ایک معروف شخصیت شریف حسین نے سرہنری میکموہن (برطانوی ہائی کمشنر، متعینہ مصر) کے ساتھ خفیہ مذاکرات کرکے عراق میں ترکوں کو شکست دلوائی، برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں پہلے بغداد پر اور پھر ۱۹۱۸ء میں موصل پر قبضہ کرکے عراق کی فتح کو مکمل کر لیا۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں سیکرٹری فار کالونیز، ونسٹن چرچل نے قاہرہ پر اپنی فوجی اور سیاسی ماہرین سے مشرق اوسط خاص طور پر عراق کی صورت حال پر مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ فیصل ابن شریف حسین لارنس آف عربیا کا دست راست کو عراق کا تخت دے دیا جائے۔ پروگرام کے مطابق فیصل ۲۳ جون ۱۹۲۱ء کو عراق آیا۔ ۱۱ جولائی کو کونسل کے سامنے برطانوی نمائندہ نے فیصل کا مسئلہ پیش کیا، کونسل نے اس شرط پر کہ اگر ملک میں دستوری حکومت اور نمائندہ حکومت قائم کی جائے تو فیصل کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہے۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو فیصل کو بادشاہ بنایا گیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو فیصل نے ملک میں پہلا دستور نافذ کیا، یہ دستور برطانوی طرز کا تھا اس میں اگرچہ اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا، لیکن اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہی تھے، ۲۲ء تک مسلسل ترکی اور ایران کی سرحدوں پر کرد آبادی بغاوت پر رہی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کردستان کا الگ صوبہ قائم کیا جائے ۱۹۳۲ء میں



عراق لیگ آف نیشنز کا ممبر بنا اور اگلے سال برطانوی اقتدار ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں فیصل اول کا انتقال ہو گیا، اس کی جگہ غازی احمد کا بیٹا بادشاہ بنا۔ ۱۹۳۴ء میں عراق میں کمیونسٹ پارٹی ترتیب دی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں مصری جنگ عظیم کے دوران غازی احمد کار کے حادثہ میں جاں بحق ہوا۔ ۱۹۵۳ء تک اختیارات ایجنسی کونسل کے سپرد رہے۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس جنگ عظیم شروع ہوئی، تو اس خوفناک جنگ کے شعلے عراق تک بھی پہنچ گئے۔ جنگ کے ابتدائی سالوں میں عراق نے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کی، لیکن ۱۹۴۳ء میں برطانیہ کے دباؤ پر عراق نے جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حالانکہ لوگوں کی ہمدردیاں اٹلی اور جرمنی کے ساتھ تھیں۔ جنگ کے بعد عرب لیگ اور یو این او کا ممبر بنا۔

۱۹۳۵ء میں ایجنسی کونسل ختم کر کے اختیارات فیصل دوم کے سپرد کر دیے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ وزیراعظم عمر نے استعفیٰ دیدیا اس کی جگہ نوری السعید نے وزارت اس شرط پر قبول کر لی، کہ انتخابات کو کالعدم قرار دیا جائے۔ دوبارہ انتخابات میں نوری السعید واضح اکثریت سے قبول ہوا، نوری نے وزیراعظم بنتے ہی اپوزیشن کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ تحریر و تقریر پر بے شمار پابندیاں لگا دیں۔ کمیونسٹوں اور اسلام پسندوں کو تشدد کا نشانہ بننا پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی جماعتیں تقریباً ختم ہوئیں، کمیونسٹ زیر زمین چلے گئے۔

۲۴ فروری ۱۹۵۵ء کو عراق بغداد پیکٹ میں شامل ہوا، عرب ممالک نے ردعمل کے طور پر عراق کا بائیکاٹ کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں جنگ سویز شروع ہوئی، عراق نے اپنی فوجیں اردن کی مدد کے لیے بھیج دیں، نومبر ۱۹۵۶ء میں فرانس نے تعلقات ختم کر لیے اور بغداد پیکٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا، ۱۹۵۸ء میں فیصل نے امریکہ کا دورہ کیا فروری

ہفت روزہ پیمان لاہور

۱۹۵۸ء میں عراق اردن وفاق میں شامل ہو گئے جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیئر جنرل کریم قاسم نے انقلاب برپا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ انہی دنوں نوری، فیصل اور فواد کو قتل کیا گیا۔ انقلاب کے دو ہفتہ بعد قاسم نے ملک میں عارضی دستور نافذ کیا، ستمبر میں زرعی زمین کی حد ۲۵۰ ایکڑ سے ۵۰۰ ایکڑ تک مقرر کی گئی ۳۰ ستمبر ۱۹۵۸ء کو قاسم نے اپنے دست راست عبدالسلام عارف کو وزیر داخلہ اور ڈپٹی وزیر اعظم کے عہدوں سے فارغ کر کے جرمنی میں سفیر مقرر کر دیا، ۸ مارچ ۱۹۵۹ء میں موصل میں کرنل عبدالوہاب شواف نے بغاوت کر دی۔ قاسم نے کمیونسٹوں کی مدد سے بغاوت پر قابو پا لیا اس بغاوت میں دو ہزار افراد مارے گئے۔ ۵ ہزار گرفتار ہوئے، اس کے علاوہ قاسم نے نوری کے زمانہ کے ملک بدر کمیونسٹ اور ملک میں آنے کی اجازت دے دی۔

جولائی ۱۹۵۹ء میں قاسم نے ۲۵ ہزار کمیونسٹ سولین ملیشیا کے فوج کے حوالے کر دیا تاکہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے، انہی دنوں کردوں نے بغاوت کر دی، اس بغاوت میں کمیونسٹ بھی شریک تھے۔ چنانچہ قاسم نے براہ راست اس کی ذمہ داری کمیونسٹوں پر ڈالی۔ ۱۹۶۰ء میں قاسم نے کردش ڈیموکریٹک پارٹی جس پر ۱۹۵۴ء میں پابندی لگی تھی، کام کرنے کی اجازت دیدی، ۱۹۶۰ء میں ملک میں جمہوریت کا سورج طلوع ہونے لگا۔ ۱۹۶۳ء میں عبدالکریم قاسم کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی جگہ عبدالسلام عارف نے لے لی۔

۱۹۶۵ء میں عبدالسلام عارف ہوائی حادثے کا شکار ہوئے۔ اور ملک کا نیا صدر عبدالرحمن عارف کو بنایا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ شروع ہوئی، عراق نے اپنی فوجیں اردن اور شام کی مدد کے لیے بھیجیں، جنگ کے ایک سال بعد عبدالرحمن عارف کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس کی جگہ حسن البکر کے زمانہ میں کردوں نے متعدد بغاوتیں کیں، حکومت

ان پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ میں عراق نے پہلے کی طرح اپنی فوجیں شام وغیرہ میں مدد کے لیے روانہ کیں جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کے جن ممالک نے امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے ممالک کا تیل کے سلسلہ میں بائیکاٹ کیا تھا۔ عراق بھی ان ممالک میں شامل تھا امریکہ، مصر مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر جب مصر نے تیل پر پابندی ختم کی تو لیبیا کی طرح عراق نے بھی پابندی ختم کرنے پر احتجاج کیا۔

آجکل عراق میں کردوں نے بغاوت کر رکھی ہے۔ کردوں کی قیادت ملا مصطفیٰ برزانی کے ہاتھ میں ہے، اس بغاوت میں عراق کی فضائیہ اور پیدل فوج حصہ لے رہی ہے۔ جب کہ کرد عراق کے متعدد طیارے گرا چکے ہیں۔

اومان

محل وقوع: خلیج فارس پر حضرموت کے مشرق میں مملکت اومان واقع ہے، اس کے شمال میں خلیج اومان، مغرب میں سعودی عرب کا صحرا ربع الخالی اور عدن واقع ہے۔

رقبہ: ۸۲۰۰۰ مربع میل

آبادی: اس کی آبادی تقریباً ۷ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

دارالحکومت: مسقط اور دیگر اہم شہر مطرہ

زبان: عربی ملک کی سرکاری زبان ہے۔ عربی کے علاوہ اردو، بلوچی، ہندی اور دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں۔

مذہب: اسلام

معدنی پیداوار: یہاں صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مختصر تاریخ: سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ ۱۶۵۰ میں مقامی لوگوں نے پرتگالیوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء

دنماں بعد ، اونیں صدی کے آخری عشرے میں البوسعید نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۸۴ء تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ اس دوران اہل اومان نے جبار لیجہ پلشر، بحانہ، زنجبار اور مشرقی افریقہ پر پرتگالی مقبوضات فتح کئے۔ ۱۷۸۴ء میں ساحل بلوچستان پر واقع بندرگاہ گوادر کو خان قلات ان کے حوالے کر دیا، اسے ستمبر ۱۹۵۸ء میں ۸۱۴ ملین ڈالر کے عوض خرید لیا

بقیہ: مولانا داؤد غزنوی

شاہدات و مسموعات کی بنا پر یہ واضح کیا ہے کہ حضرت مرحوم و مغفور ذوقیات تصوف سے نہ صرف شناسا تھے بلکہ ان میں ڈوبے ہوئے تھے، البتہ یہ درست ہے کہ وہ تصوف کے ان مشاغل کے حق میں نہ تھے جو قرآن و حدیث کے خلاف اور مسلک قوم سے متصادم تھے۔

تصوف کے سلسلے میں ان کے خیالات پر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے خیالات کا پرتو ہے لیکن یہ تبصرہ تفصیل کا متحمل نہیں، جیسا کہ بیان ہوا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں، ایک وہ جو دوسرے حضرات کا رقم کردہ ہے، اس میں حضرت مرحوم و مغفور کی سیاسی زندگی کی تفصیل زیادہ ہے، دوسرا حصہ سیدی والی گھر کے ایک فرد کا مشاہدہ و تاثر ہے جسے اپنے بزرگوار کو قریب سے دیکھنے کا قدرتاً بھرپور موقع ملا ہے: اسے ہم مولانا داؤد کے خصائل و شمائل و فضائل کا صحیح آئینہ کہہ سکتے ہیں۔ جس میں مرحوم و مغفور، اپنی وجاہت و زیبائی ——— اپنی نفاست و خوش پوشی اور اپنی بلاغت و فصاحت، اپنی خطابت اور طلاقت لسانی کے ساتھ، اپنی پوری شبیہ اور پورے پیکر میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب خصوصاً اس کا باب (سیدی ابی) موجودہ دور کی سوانحی ادبی تحریروں میں خاص خوشبو، خاص رنگ اور خاص نقش کا حامل ہے، مجھے یقین ہے، ہر پڑھنے والا اسے ایک سوغات خاص خیال کرے گا اور اپنے خاص مطالعات کے ہمیشہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔

بقیہ: سردار عبدالقیوم

کرنے میں کوئی سی دقت نہیں ہوتی۔ ہم نے اس تلخی کو کئی دفعہ محسوس کیا ہے کہ ہر پھر کر وہی لوگ قوم کے سر پر سوار ہوتے ہیں جن کا ماضی ہر نوعیت کی ایثار آشنا جدوجہد سے محروم ہے اور جن لوگوں نے قومی آزادی اور ملکی استقلال کے لیے قید و بند کی مصیبتیں سہیں، مال و جان کی بازی لگائی اور آل و اولاد کے مستقبل کو خطرے میں ڈالا۔ اُن کے لیے ہمارے ملک کی سیاسی فضا میں کوئی احترام نہیں بلکہ آوارۂ قلم اور آوارۂ زبان لوگ اُن کے خلاف ہذیان بکنا اپنی حب الوطنی کا وثیقہ سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کوئی حکم لگانے سے قاصر ہیں لیکن درد کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سردار عبدالقیوم پر روشن ہو چکا ہوگا کہ اقتدار کے ساتھی کیونکر دغا کرتے ہیں اور مصیبت کے ساتھی کیا ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے اُن سے دغا کی اور پھر کر سامنے آگئے وہ اُن کی سیاسی سرشت کا حصہ ہیں انہیں ہر حال میں اقتدار کا ساتھ دینا ہے خواہ وہ زید کے پاس ہو خواہ عمرو کے پاس سردار صاحب نے بقولِ نوائے وقت محسوس کر لیا ہوگا کہ ؎

بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

اب مسئلہ کشمیر یک جماعتی مسئلہ نہیں رہا اور نہ کسی ایک شخصیت کے بل پر اس اشہب کی سواری ممکن ہے۔ اب یہ مسئلہ پوری قوم ہی لیڈر کی یک جہتی کے ساتھ حل کر سکتی ہے۔ اگر سردار صاحب نے اپنی جماعت کی معرفت اس مسئلہ پر کوئی تیز روی کی تو جو لوگ اُن کے مدمقابل ہیں وہ نہ صرف یہ کہ مزاحم ہوں گے بلکہ اگر مگر کا انبار لگا دیں گے۔ اُن کا مقطع ہوگا کہ سردار صاحب مسئلہ کشمیر کو خراب کر رہے ہیں۔ ان حالات میں ہم سردار صاحب سے جہاں یہ گذارش کریں گے کہ وہ اپنے مشن کو زیادہ سے زیادہ اخلاص اور زیادہ سے زیادہ تندہی سے جاری رکھیں وہاں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ملک کی ذہنی فضا میں مسئلہ کشمیر ہی نہیں دینِ اسلام بھی کمنہ دروں کی معرفت مظلوم ہو چکا ہے سردار صاحب اسلام کے علمبردار و جانثار کی حیثیت سے عامۃ المسلمین کی ذہنی آبیاری میں حصہ لیں اور اس ملک میں اسلام کو ایک ایسی طاقت بنا دیں کہ جو لوگ شبخون مار کر اسلام کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں وہ اس ملک کی ذہنی فضا سے اس طرح نکل جائیں جس طرح سورج طلوع ہوتے ہی شب دیجور کی سیاہیاں اُڑنچھو ہو جاتی ہیں۔

بقیہ: اقبال کمیٹی

شخصیتیں انتہائی محترم ہونے کے باوجود صوبائی اور علاقائی ہی ہیں، اور انہیں متعلقہ صوبوں اور علاقوں کے لوگوں نے خود ہی صوبائی بنا کر محدود کیا ہوا ہے ورنہ ہم قران کی عظمتوں کو بھی شایانِ شان اعتراف کا مستحق سمجھتے ہیں۔ بہرحال فی الحال وہ صوبائی حدود میں ان کے علاقائی معتقدوں کی وجہ سے ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا ان کا معاملہ اقبالؒ کے معاملے سے جُدا ہے۔

ہمیں دُکھ اس بات کا ہے کہ اقبالؒ کی شخصیت کو پنجاب (یا شاید لاہور) تک محدود کر دیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ حضرت عثمانیؒ اور دوسرے بزرگوں کو وسیع تر ملک گیر حیثیت دے کر انہیں بھی قومی شخصیتوں میں شامل کرایا جاتا الٹا اقبال ہی کو ان کی آڑ میں محدود اور مقامی بنا دیا گیا ہے۔

یہ کوتاہ نظری ہی نہیں بے خبری، جہالت اور بے بصری بھی ہے کہ اقبال جیسی عالمگیر شخصیت اور بین الاقوامی عظمت کو ایک داخلی تنگ خیالی کی بنا پر اتنا پست قامت بنا دیا گیا ہے کہ صد سالہ تقریب کا سارا لطف جاتا رہا۔

اقبال صرف پنجاب کے کیسے ہو سکتے ہیں؟ انہوں نے تو پنجاب کے لیے کم سے کم لکھا ہے بلکہ یوں کہیے کہ لکھا ہی نہیں اور وہ کیوں لکھتے جبکہ ان کی ساری تعلیم قید مقام سے آزاد ہے۔ ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست

وہ تو شرقی ہیں، نہ غربی، نہ ہندی ہیں نہ رومی ایران و توران و عرب ان کی نظر میں ایک ہے، وہ تو بندہ مومن ہیں۔۔۔۔۔۔ اور بندہ مومن آفاقی ہوتا ہے۔

میں پُرزور سفارش کرتا ہوں، کہ یوم وفات اقبال پر پاکستان گیر سطح پر تعطیل کی جاتے۔۔۔۔۔۔ فی الحال کم سے کم یہ گذارش ہے کہ صد سالہ تقریب کے کاغذات سے یہ افسوسناک حصہ حذف کر دیا جائے اس سے اقبال کی توہین و تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی حد تک علامہ اقبال کی حیثیت مصورِ پاکستان کی ہے، جہاں قائداعظم پاکستان کی عملی جدوجہد کے راہ نما تھے وہاں علامہ اقبال پاکستان کے تخیل کو وجود میں لانے والے تھے، اقبال نے نقشے کا تصور دیا۔ اس کے لیے فکری مواد بہم پہنچایا اور تاریخ کے حوالے سے اس کی ناگزیر اہمیت کو واضح کیا۔۔۔۔۔۔

قائداعظم نے اس نقشے پر عمارت تعمیر کی اس کی نوک پلک درست کی، اس کی تشکیل و تعمیر کے لیے طویل لڑائی لڑی۔

اس لحاظ سے علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں لازم و ملزوم ہیں پاکستان کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں، دونوں کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔

بنابریں یوم اقبال پر تعطیل کا مطالبہ پاکستان کی بنیاد کے حوالے سے اسی طرح جواز رکھتا ہے جس طرح قائداعظم کے یوم وفات کے سلسلے میں جائز ہے۔

سفارش ہے کہ پاکستان کے ان دو بنیادی شخصیتوں کو یکساں عظمت کا مستحق سمجھا جائے اور جس طرح قائداعظم کے یوم وفات پر عام تعطیل ہوتی ہے علامہ اقبال کے یوم وفات پر بھی ملک گیر تعطیل کی جائے۔

محمد یوسف لدھیانوی

انگریز نوازی ——— حماقت یا بد دیانتی؟

ہفت روزہ "پیغام صلح لاہور" نے ۱۲ مارچ ۷۵ء کی اشاعت میں "گوہر یکدانہ کی بے قدری" کے زیر عنوان ایک طویل اداریہ سپرد قلم کیا ہے جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کو اسلام کا عظیم الشان ہیرو قرار دیتے ابنائے زمانہ کا شکوہ کیا گیا ہے کہ افسوس لوگوں نے اس دُرِّ یکتا کی قدر نہیں پہچانی۔

پیغام صلح کے موجودہ عملے کا تعلق قادیانی اُمت کی تیسری اور چوتھی نسل سے ہے، جس کے سامنے نہ تو مرزا غلام احمد کی تحریک کا حقیقی پس منظر ہے۔ نہ وہ مرزا صاحب کے دعوتی لٹریچر کی روح سے آشنا ہے، نہ اسے مرزا قادیانی کی "پچاس الماریوں" کے ناقدانہ تجزیہ کا موقع میسر آیا ہے۔ قادیانی امت کے سامنے "مسیح مرگیا" اور "مسیح آگیا" کا صور کچھ ایسی بلند آہنگی سے پھونکا گیا کہ ان کے آلاتِ شعور مبہوت ہو کر رہ گئے۔ انہیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق ہی نہ ہوئی کہ "مسیح" (علیہ السلام) تو تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے نزدیک "زندہ" تھا وہ یکایک کیسے مرگیا۔ اور یہ فرضی "مسیح" جو دجال کی حکومت کو سایۂ رحمت کہتا ہے اور یاجوج ماجوج کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کرتا ہے وہ آخر کس آسمان سے مسیح بن کر نازل ہوا، اور کس مقصد کے لیے نازل ہوا؟

مرزا غلام احمد کی تحریک کی اصل غرض و غایت سے بے خبری کا نتیجہ ہے کہ آج مرزائی اکابر کے قلم سے نہ صرف گذشتہ دَور کی تاریخ مسخ ہو رہی ہے بلکہ ان کے ریمارکس سے مرزا غلام احمد کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ اس کی ایک مثال پیغام صلح کا متذکرہ بالا اداریہ ہے۔ جس میں فاضل مدیر نے مرزا غلام احمد کی کتابوں، تقریروں اور مناظروں کا (جو پادریوں اور آریوں وغیرہ کے مقابلہ میں ہوتے) حوالہ دے کر کہا ہے کہ:

"ایسے حالات میں آپ (مرزا) کو دنیا دار اور انگریز نواز ٹھہرانا حماقت یا بد دیانتی ہے۔"

اللہ اکبر! آج لاہوری مرزائیوں کا آرگن، کس جرأت و شوخی سے "حضرت مسیح موعود" کی انگریز نوازی کو حماقت یا بد دیانتی قرار دیتا ہے، اگر یہی خطاب مرزا غلام احمد کی زندگی میں کسی مرزائی نے انہیں دیا ہوتا تو اس کا حشر بھی ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب سے مختلف نہ ہوتا۔ اور اگر لاہور والوں کے نزدیک "حماقت اور بد دیانتی" بھی کوئی لائق فخر خطاب ہے تو ہم ان کو اور ان کے بڑے بھائیوں ربوہ والوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ یہ مقدس اعزاز ہمیشہ سے ان کے "مسیح موعود" کا طغرۂ امتیاز اور طرۂ افتخار رہا ہے۔ مرزا صاحب نے تریاق القلوب کے آخر میں جو "اشتہار واجب الاظہار اپنی جماعت کے لیے اور گورنمنٹ عالیہ کی توجہ کے لیے" دیا ہے اسے پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ احمدیہ بنانے کا مقصد کیا تھا؟ مختصراً ذیل کے اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"یاد رہے کہ مسلمانوں کے فرقوں میں یہ فرقہ جس کا خدا نے مجھے امام اور پیشوا اور رہبر مقرر فرمایا ہے ایک بڑا امتیازی نشان اپنے ساتھ رکھتا ہے، اور وہ یہ کہ اس فرقہ میں تلوار کا جہاد بالکل نہیں، بلکہ یہ مبارک فرقہ نہ ظاہر طور پر اور نہ پوشیدہ طور پر جہاد کی تعلیم کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا اور قطعاً اس بات کو حرام جانتا ہے۔" (صفحہ ۳۲۲)

یہ تھا مرزا غلام احمد کے مبارک فرقہ کا امتیازی نشان! یعنی انگریز کے خلاف دینی جہاد کو ناجائز، حرام اور قطعاً حرام سمجھنا۔ یہ تو مرزائی فرقہ کا امتیازی نشان تھا، خود مرزا صاحب کی بعثت کس مقصد کے لیے ہوئی؟ مرزا صاحب نے اس کی بھی تشریح کر دی ہے، برطانیہ کی صلیب پرست اور خنزیر خور

ملکہ کے نام مرزا جی نے جو خوشامدانہ خطوط لکھے ہیں ان میں تصریح ہے کہ ان کے مسیح موعود ہونے کا سبب اور ان کے وجود کی علت "ملکہ کا راج" ہے، اور ان کی بعثت کی غرض اور علت غائیہ حکومت برطانیہ کے اغراض و مقاصد کی تکمیل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"اے ملکہ معظمہ! تیرے وہ پاک ارادے ہیں جو آسمانی مدد کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور تیری نیک نیتی کی کشش ہے جس سے آسمان رحمت کے ساتھ زمین کی طرف جھکتا جاتا ہے۔ اس لئے تیرے عہد سلطنت کے سوا اور کوئی بھی عہد سلطنت ایسا نہیں ہے جو مسیح موعود کے ظہور کے لیے موزوں ہو۔ سو خدا نے تیرے نورانی عہد میں آسمان سے ایک نور (مرزا) نازل کیا، کیونکہ نور نور کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور تاریکی تاریکی کو کھینچتی ہے۔"

(ستارۂ قیصریہ ص۹)

عدل اور امن اور آسودگی عامۂ خلائق اور رفع فساد اور تہذیب اخلاق اور وحشیانہ حالتوں کا دور کرنا ہے۔ اس کے مبارک عہد میں اپنی طرف سے اور غیب سے اور آسمان سے کوئی روحانی انتظام قائم کرے جو حضور ملکہ معظمہ کے دلی اغراض کو مدد دے۔ سو اس نے آسمان سے مجھے بھیجا ہے تا میں حضور ملکہ معظمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول ہوں۔"

(ستارۂ قیصریہ ص۸)

اے ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند! خدا تجھے اقبال اور خوشی کے ساتھ عمر میں برکت دے، تیرا عہد حکومت کیا ہی مبارک ہے کہ آسمان سے خدا کا ہاتھ تیرے مقاصد کی تائید کر رہا ہے، تیری ہمدردی رعایا اور نیک نیتی کی راہوں کو فرشتے صاف کر رہے ہیں۔" (ایضاً ص۸)

"سو یہ مسیح موعود (غلام احمد) جو دنیا میں آیا ہے تیرے ہی وجود کی برکت اور دلی نیک نیتی اور سچی ہمدردی کا ایک نتیجہ ہے۔ خدا نے تیرے عہد سلطنت میں دنیا کے دردمندوں کو یاد کیا اور آسمان سے اپنے مسیح (غلام احمد) کو بھیجا اور وہ تیرے ہی ملک میں اور تیری ہی حدود میں پیدا ہوا، تا دنیا کے لیے یہ ایک گواہی ہو کہ تیری زمین کے سلسلۂ عدل نے آسمان کے سلسلۂ عدل کو اپنی طرف کھینچا ہے اور تیرے رحم کے سلسلہ نے آسمان پر ایک رحم کا سلسلہ بپا کیا ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۸)

ایک طرف اس بلندی کی داد دیجئے کہ قادیان کا خدا، قادیان کے فرشتے، قادیان کا مسیح اور اس کے حواری سب کے سب بس ایک کام معروف نظر آتے ہیں۔ یعنی ملکہ برطانیہ کے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور دوسری طرف "پیغام صلح" کی اس گزارش



گویا ملکہ معظمہ کے نور سے قادیانی مسیح کا نور ظہور پذیر ہوا۔ اور برطانوی نور نے قادیانی نور کی تخلیق کی ہے۔

اپنی بعثت کے اغراض و مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"اور میں اپنی عالی شان جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی عالی خدمت میں اس خوشخبری پہنچانے کے لیے بھی مامور ہوں کہ جیسا کہ زمین پر اور زمین کے اسباب سے خدا تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت اور کمال مصلحت سے ہماری قیصرۂ ہند دام اقبالہا کی سلطنت کو اس ملک اور دیگر ممالک میں قائم کیا ہے تاکہ زمین کو عدل اور امن سے بھر دے ایسا ہی اس نے آسمان سے ارادہ فرمایا ہے کہ شہنشاہ مبارکہ قیصرۂ ہند کے دلی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جو

کو دیکھئے کہ مسیح قادیان کی انگریز نوازی کو "حماقت یا بددیانتی" کا خطاب دیا جاتا ہے۔

"جناب عالی! التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے، اس خود کاشتہ پودا کی نسبت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو بھی اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔" (تبلیغ رسالت ص۱۹)

کہاں اس "خود کاشتہ پودا" کی وفاداری، جانثاری اور اخلاص، اور کہاں اس پر "پیغام صلح" کا "حماقت و بددیانتی" کا فتویٰ؟ مرزا غلام احمد ملکہ برطانیہ کو ایسے عاشق و محب تھے کہ انہیں ملکہ کے وجود با جود پر فخر تھا، لکھتے ہیں:

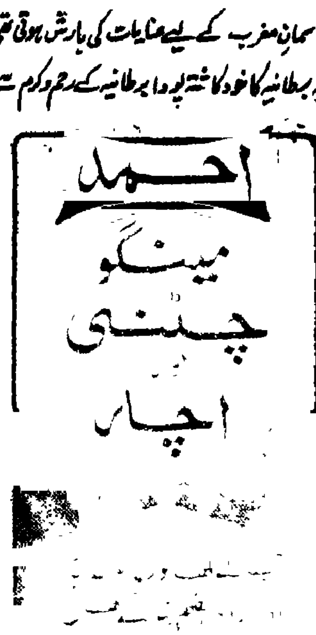
"یہ دعا گو وجود دنیا میں عیسیٰ مسیح کے نام سے آیا ہے، اسی طرح وجود ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند اور اس کے زمانے سے فخر کرتا ہے جیسا کہ سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشیروان عادل کے زمانہ سے فخر کیا تھا۔" (مرزا صاحب کا یہ قول محض کذب و افترا اور جاہلوں کی گپ ہے۔ دیکھئے موضوعات کبیر مؤلفہ ملا علی قاری)

"حرف وادٔ میرے لئے خدا نے پسند کیا کہ میں آسمانی کارروائی کے لیے ملکہ معظمہ کی پُرامن حکومت کی پناہ لوں ..... اس کا شکر کرنا میرے پر سب سے زیادہ واجب ہے۔" (تحفۂ قیصریہ ص۱)

"چونکہ یہ مسئلہ تحقیق شدہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتا ہے اس لیے مجھے ضرورت نہیں کہ میں اس بات کو زبان کی لفاظی سے اس بات کو ظاہر کروں کہ میں آپ سے دل محبت رکھتا ہوں، اور میرے دل میں خاص طور پر آپ کی محبت اور عظمت ہے، ہماری دن رات کی دعائیں آپ کے لیے آب رواں کی طرح جاری ہیں۔ اور ہم نہ سیاست قہری کے نیچے ہو کر آپ کے مطیع ہیں بلکہ آپ کی انواع و اقسام کی خوبیوں نے ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں جس پر تیری نگاہیں ہیں۔ خدا کی رحمت کا ہاتھ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔"

مرزا صاحب کا عظیم الشان مشن

آج مرزائی امت کو یہ بات "حماقت یا بددیانتی" نظر آتے تو اسے گردش دوراں اور انقلاب زمانہ سمجھنا چاہیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت و مسیحیت محض انگریز کی پیداوار تھی، اسی کے اغراض و مقاصد کی آلۂ کار تھی۔ اس کی نشوونما کے لیے آسمان مغرب کے لیے عنایات کی بارش ہوتی تھی۔ یہ برطانیہ کا خود کاشتہ پودا برطانیہ کے رحم و کرم سے



پروان چڑھ رہا تھا، اس کے شجرۂ طیبہ پر ملکۂ برطانیہ کے نور کی تجلی ضیا پاشی کر رہی تھی، جس سے قادیانی نبوت و مسیحیت "نورٌ علیٰ نورٍ" ہو رہی تھی۔

برسبیل تذکرہ ان "خدمات خاصہ" کا جائزہ لینا بھی مناسب ہوگا۔ جن کے لیے برطانیہ کے زمینی نور سے غلام احمد قادیانی کے آسمانی نور کو کھینچا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا "مقدس مشن" (خدمت برطانیہ) چند شعبوں پر مشتمل تھا۔ جن پر مرزا صاحب اور ان کے حواری بلا تکان مصروف کار تھے۔

اوّل: گورنمنٹ برطانیہ کو انسانیت کا محسن اعظم خدا کا نور، عدل و احسان کا مجسمہ اور سایۂ رحمت الٰہی باور کرانا۔ اس کی فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کے لیے دعائیں کرانا، اسے مسلمانوں کا اولوالامر ثابت کرنے کے لیے "وحی الٰہی" کی سند مہیا کرنا۔ مرزا صاحب ازالہ اوہام میں بڑے طمطراق سے لکھتے ہیں:

"چونکہ ان دونوں قوموں (یاجوج و ماجوج) سے مراد انگریز اور روسی ہیں۔ اس لئے ہر ایک سعادت مند کو دعا کرنی چاہیئے کہ اس وقت انگریزوں کی فتح ہو کیونکہ یہ لوگ ہمارے محسن ہیں، سلطنت برطانیہ کے ہمارے سر پر بہت احسان ہیں۔" (صفحہ ۲۱ طبع پنجم)

ضمناً یہ لطیفہ بھی ذہن میں رہے کہ مرزا غلام احمد کے نزدیک انگریز دجال بھی ہیں اور یاجوج ماجوج بھی۔ مگر قادیان کا مسیح ان کو ہلاک کرنے یا ان کے لیے ہلاکت کی دعا کرنے کے بجائے الٹا ان کا ممنون احسان ہے۔ اور ان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کراتا ہے۔ کیا پیغام صلح اس پر بھی مرزا صاحب کو حماقت یا بددیانتی کا تمغہ تو پیش نہیں کرے گا؟ خصوصاً جبکہ دجال کا مسیح کے ہاتھوں ہلاک ہونا اور یاجوج ماجوج کا مسیح علیہ السلام کی بددعا سے مرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ (مشکوٰۃ ص۴۷۴)

دوم: حرمت جہاد کا الہامی فتویٰ

مرزا غلام احمد کے سپرد ایک اہم ترین خدمت یہ تھی کہ اسلام میں مسئلہ جہاد کو خوب بدنام کیا جائے اور انگریز کے خلاف جہاد کی قطعی حرمت کا فتویٰ "مامور من اللہ" کی حیثیت سے دیا جائے۔ مرزا صاحب نے یہ "مفوضہ خدمت" جس تندہی سے کی تفصیل کے لیے ایک دفتر بھی ناکافی ہے، البتہ اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے ستارہ قیصرہ میں "نورانی ملکہ معظمہ" کو مرزا صاحب بتاتے ہیں کہ:

"مسلمانوں میں یہ دو مسئلے نہایت خطرناک اور سراسر غلط ہیں کہ وہ دین کے لیے تلوار کے جہاد کو اپنے مذہب کا ایک رکن سمجھتے ہیں اور اس جنون سے ایک بے گناہ کو قتل کرنا ثواب کا کام خیال کرتے ہیں۔ افسوس کہ یہ عیب غلط کار مسلمانوں میں اب تک موجود ہے۔ جن کی اصلاح کے لیے میں نے پچاس ہزار سے کچھ زیادہ اپنے رسالے اور مبسوط کتابیں اور اشتہارات اس ملک اور غیر ملکوں میں شائع کیے ہیں اور امید رکھتا ہوں کہ جلد تر ایک زمانہ آنے والا ہے کہ اس عیب سے مسلمانوں کا دامن پاک ہو جائے گا۔ دوسرا عیب ہماری قوم مسلمانوں میں یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسے خونی مسیح اور خونی مہدی کے منتظر ہیں جو ان کے زعم میں دنیا کو خون سے بھر دے گا۔" (صفحہ ۹-۱۰)

ایک دوسری جگہ اپنی اس خدمت جلیلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے گورنمنٹ کو بتاتے ہیں:

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں، میں نے ایسی کتابوں کو تمام عرب ممالک اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیرخواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔"

(تریاق القلوب ص ۲۹/۱۵)

مرزا صاحب کی اس تصریح سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی ساری تبلیغی مہم کا محور ان کی مسیحیت و مہدویت اصل مرکز اور ان کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا مشن انگریز نوازی تھا۔ وہ گورنمنٹ برطانیہ کے ایک گماشتہ کی حیثیت میں کام کر رہے تھے انگریز کی اطاعت و غلامی کی دعوت دینے کے لیے وہ کتابیں لکھ لکھ کر عالم اسلام میں پھیلا رہے ہیں، مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد ختم کرنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

ان کی عبارت کے دوسرے پیراگراف کو ایک بانگہری نظر سے پھر پڑھیے تو آپ کو مرزا صاحب کے دعویٰ مہدویت و مسیحیت کے اصل منبع کا سراغ مل جائے گا۔ اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ مسلمانوں کی سرشت میں جہاد و قتال کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ہر مومن کی آخری تمنا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دے دینا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق جہاد کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے تک بدستور جاری رہے گا حدیث

بعدالت جناب زبدۃ الحسین سول جج / جج فیملی کورٹ صاحب سمندری

مقدمہ نمبر ۲۵ ۱۹۷۵ء

منظور بنام مختاراں بیگم

بنام مختاراں بیگم زوجہ منظور دختر محمد شفیع قوم دھوبی ساکن بنگلہ ستیانہ تحصیل جڑانوالہ ضلع فیصل آباد (لائلپور)

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مساۃ مختاراں بیگم زوجہ منظور دختر محمد شفیع تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتی ہے اور روپوش ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار مساۃ مختاراں بیگم مذکورہ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ تاریخ مقررہ ۶ مئی تک اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت آوے ورنہ کارروائی یکطرفہ اس کے خلاف عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

بعدالت جناب زبدۃ الحسین سول جج / جج فیملی کورٹ سمندری۔

مقدمہ نمبر ۲۷ ۱۹۷۵ء

دلا پانے خرچہ نان و نفقہ

مساۃ رشیداں بی بی بنام احمد دین

بنام: احمد دین ولد قطب دین قوم آرائیں ساکن چک ... قصبہ تاندلیانوالہ سمندری ضلع لائلپور

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمی احمد دین ولد قطب دین قوم آرائیں تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے، لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار مسمی احمد دین مذکور کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ بتاریخ ۶ مئی ۷۵ء بوقت پہلے پہر اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت آوے ورنہ اس کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

۳۰

حقائق واحد

میں ہے:

"میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور وہ قیامت تک غالب رہیں گے، پس عیسیٰ بن مریمؑ نازل ہوں گے تو ان مجاہدین کا امیر (حضرت مہدی علیہ السلام) ان سے درخواست کرے گا کہ تشریف لائیے، ہمیں نماز پڑھائیے۔ حضرت عیسیٰ فرمائیں گے کہ نہیں تم ہی پڑھاؤ۔ بات یہ ہے کہ تم میں سے بعض، بعض پر امیر ہیں، (اور اس وقت میری آمد بھی امت محمدیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہے، لہٰذا اس کی عملی تصدیق کے لیے میں بھی تمہاری اقتدا میں نماز پڑھوں گا) اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ اعزاز بخشا ہے۔"

(مشکوٰۃ شریف ص۴۸)

ایک اور حدیث میں ہے:

"میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر لڑتا رہے گا۔ یہ لوگ اپنے دشمنوں پر غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اس امت کا آخری حصہ (جس سے حضرت مہدی، حضرت عیسیٰ اور ان کے اتباع مراد ہیں مرقات) مسیح دجال سے جنگ و قتال کرے گا۔"

(مشکوٰۃ شریف ص۳۳)

انگریز مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے پریشان تھا۔ اسے کسی ایسے غدار کی ضرورت تھی جو جہاد کو منسوخ کرنے کے لیے "الہامی سند" مہیا کرے، تلاش بسیار کے بعد قرعۂ فال جناب مرزا غلام احمد قادیانی کے نام

نکلا۔ مسیحیت سے الہامی بنیاد پر تجدید اسلام کا غلغلہ بلند کیا۔ تجدید کی سیڑھی سے مسیحیت و نبوت تک پہنچے اور اعلان کر دیا کہ چونکہ مسیح آچکا ہے اس لیے آئندہ جہاد کا دروازہ بند کیا جاتا ہے۔ اب قرآن مجید کی وہ تمام آیات منسوخ ہیں جن میں مسلمانوں پر کافروں کے مقابلہ میں قتال و جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے یہ اعلان کم و بیش اپنی ہر کتاب میں فرمایا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۳۹)

حرمت جہاد پر مرزا صاحب کی یہ طویل نظم جس کے چار ابتدائی شعر یہاں نقل کئے گئے ہیں۔ قابل دید ہے اور اس کا عنوان مرزا صاحب نے یہ تجویز کیا ہے "دینی جہاد کی ممانعت کا فتویٰ مسیح موعود کی طرف سے"

مرزا غلام احمد قادیانی ایک طرف "مسیح مر گیا" اور "مسیح آگیا" کا شور مچا کر سادہ لوح مسلمانوں کے عقائد کو ڈائنامیٹ لگا رہے، علماء کی توجہ گورنمنٹ کی مکارانہ پالیسیوں سے اپنے لایعنی گورکھ دھندے میں الجھا رہے تھے۔ قوم مسلم کو انگریز کے جور و استبداد سے بے خبر رکھنے کے لئے "شب اچھا" کی الہامی رٹ لگا رہے تھے اور دوسری طرف حکمران قوم کو اطمینان دلا رہے تھے کہ ذرا مابدولت کی مسیحیت کا سکہ چل جائے تو میں سمجھ کر جہاد منسوخ ہو گیا۔ سنئے:

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔"

(تبلیغ رسالت ص۱۷ ج۷)

مرزا صاحب کی ان تصریحات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مسیحیت اور مہدویت کا دعویٰ ہی صرف مسئلہ جہاد کی روح کو ختم کرنے کے لیے کیا تھا۔ اور اس وقت انگریز کی عظیم الشان خدمت یہی ہو سکتی تھی۔ جس کے لیے مرزا صاحب نے "مامور من اللہ" کی حیثیت سے "الہامی روپ" دھارا تھا۔ آج اگر مرزا صاحب کے نام لیوا "مسیح موعود" کی انگریز نوازی کو حماقت یا بددیانتی کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ چودھویں صدی میں انگریز نوازی سے بڑھ کر حماقت اور بددیانتی جو بھی کیا سکتی تھی، مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سوغات جناب مرزا غلام احمد، ان کے خاندان اور ان کی جماعت کے گھر سے برآمد ہو رہی ہے۔

مرزا غلام احمد کی انگریز نوازی کوئی نیا انکشاف نہیں، بلکہ ایک کھلی کتاب ہے، ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا انگریز پرستی تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے یہی وظیفہ رٹتے تھے کہ میرے باپ کو فلاں دربار میں کرسی ملتی تھی اور میری فلاں دربار میں پذیرائی ہوتی ہے۔ ان کی مسیحیت کا سارا کرشمہ انگریزی امن و عافیت کا ساختہ پرداختہ تھا۔ (جہاد ص۵)



اپنے لخت جگر کو

[illegible] ... خلاقی تربیت اور تعلیم و تربیت کا ... [illegible]

[illegible] ... اجتماعی زندگی میں ... [illegible]

[illegible]

جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائل پور

[illegible]

[illegible]

[illegible] اشرف جامعہ تعلیم اسلامیہ

[illegible]

میں ہے :

"میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور وہ قیامت تک غالب رہیں گے، پس عیسیٰ بن مریمؑ نازل ہوں گے تو ان مجاہدین کا امیر (حضرت مہدی علیہ السلام) ان سے درخواست کرے گا کہ تشریف لائیے، ہمیں نماز پڑھائیے۔ حضرت عیسیٰ فرمائیں گے کہ نہیں تم ہی پڑھاؤ۔ بات یہ ہے کہ تم میں سے بعض، بعض پر امیر ہیں، (اور اس وقت میری آمد بھی امت محمدیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہے، لہٰذا اس کی عملی تصدیق کے لیے میں بھی تمہاری اقتدا میں نماز پڑھوں گا) اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ اعزاز بخشا ہے۔"

(مشکوٰۃ شریف ص۴۸)

ایک اور حدیث میں ہے :

"میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر لڑتا رہے گا۔ یہ لوگ اپنے دشمنوں پر غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اس امت کا آخری حصہ (جس سے حضرت مہدی، حضرت عیسیٰ اور ان کے اتباع مراد ہیں مرقاۃ) مسیح دجال سے جنگ و قتال کرے گا۔"

(مشکوٰۃ شریف ص۳۳۲)

انگریز مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے پریشان تھا۔ اسے کسی ایسے غدار کی ضرورت تھی جو جہاد کو منسوخ کرنے کے لیے "الہامی سند" مہیا کرے، تلاش بسیار کے بعد قرعۂ انتخاب مرزا غلام احمد قادیانی کے نام نکلا۔ موصوف نے الہامی بنیاد پر تجدید اسلام کا غلغلہ بلند کیا۔ تجدید کی سیڑھی سے مسیحیت و نبوت تک پہنچے اور اعلان کر دیا کہ چونکہ مسیح آچکا ہے اس لیے آئندہ جہاد کا دروازہ بند کیا جاتا ہے۔ اب قرآن مجید کی وہ تمام آیات منسوخ ہیں جن میں مسلمانوں کو کافروں کے مقابلہ میں قتال و جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے یہ اعلان کم و بیش اپنی ہر کتاب میں فرمایا، ایک جگہ فرماتے ہیں :

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۲۹)

حرمت جہاد پر مرزا صاحب کی یہ طویل نظم جس کے چار ابتدائی شعر یہاں نقل کئے گئے ہیں۔ قابل دید ہے اور اس کا عنوان مرزا صاحب نے یہ تجویز کیا ہے "دینی جہاد کی ممانعت کا فتویٰ مسیح موعود کی طرف سے"

مرزا غلام احمد قادیانی ایک طرف "مسیح مر گیا" اور "مسیح آگیا" کا شور مچا کر سادہ لوح مسلمانوں کے عقائد کو ڈائنا میٹ لگا رہے تھے، تاکہ ان کی توجہ گورنمنٹ کی مکارانہ پالیسیوں سے ہٹ کر لایعنی بحثوں میں الجھا رہے۔ قوم مسلم کو انگریز کے جبر و استبداد سے بے خبر رکھنے کے لئے "تب اجہاد" کی الہامی رٹ لگا رہے تھے اور دوسری طرف حکمران ٹولے کو اطمینان دلا رہے تھے کہ ذرا یہ دولت کی سیکیٹ کا سکہ چل جائے تو ہمیں سمجھئے کہ جہاد منسوخ ہو گیا، سنئے :

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔"

(تبلیغ رسالت ص۱۷/۲۹)

مرزا صاحب کی ان تصریحات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مسیحیت اور مہدویت کا دعویٰ ہی صرف مسئلہ جہاد کی روح کو ختم کرنے کے لیے کیا تھا۔ اور اس وقت انگریز کی عظیم الشان خدمت یہی ہو سکتی تھی۔ جس کے لیے مرزا صاحب نے "مامور من اللہ" کی حیثیت سے الہامی روپ دھارا تھا۔ آج اگر مرزا صاحب کے نام لیوا "مسیح موعود" کی انگریز نوازی کو حماقت یا بددیانتی کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ چودھویں صدی میں انگریز نوازی سے بڑھ کر حماقت اور بددیانتی ہو بھی کیا سکتی تھی، مگر افسوس ہے کہ یہ سوغات جناب مرزا غلام احمد، ان کے خاندان اور ان کی جماعت کے گھر سے برآمد ہو رہی ہے۔

مرزا غلام احمد کی انگریز نوازی کوئی نیا انکشاف نہیں، بلکہ ایک کھلی کتاب ہے، ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا انگریز پرستی تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی وظیفہ رٹتے تھے کہ میرے باپ کو فلاں دربار میں کرسی ملتی تھی اور میری فلاں دربار میں پذیرائی ہوتی ہے۔ ان کی مسیحیت کا سارا کرشمہ انگریزی امن و عافیت کا ساختہ پرداختہ تھا۔ (جہاد کا ص۵)



اپنے لختِ جگر کو

[illegible]

جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائل پور

[illegible]

[illegible]

[illegible] اشرف جامعہ تعلیم اسلامیہ

[illegible]

بقیہ: آنکھوں دیکھا حال

جب مسٹر احسان وائیں ایڈووکیٹ جیسے نوجوان جو عوامی تحریک کے دنوں میں جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چل رہا تھا۔ اپنی خوبصورت تقریروں میں ایوب خان پر شدید تنقید کرتے اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے گن گاتے تھے۔ اب اگر گرانی کے سلسلے میں وہ کسی مظاہرے کے ساتھی تھے تو ان کو ایوب خانی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا یہ روایت کچوکے لگانا انتہائی افسوسناک فعل ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے ضلعی انتظامیہ نے کس بنیاد پر اس جلوس کی راہ میں دیوار بننے کا فیصلہ کیا اول تو حاضرین مسجد کچھ زیادہ نہ تھے پھر جلوس کی شکل اس طرح کی بنائی گئی تھی کہ دو دو آدمی فاصلہ بنا کر چلتے اگر یہ مظاہرہ ہوتا تو ہمارے اندازے کے مطابق دو تین سو سے زائد لوگ نہ ہوتے۔

نورے حلق سے نکلتے، ہوا میں تحلیل ہو جاتے اور کوئی شکایت یا حکایت پیدا نہ ہوتی۔ لیکن یہ بات گواہ ہے کہ پولیس کے اس سپرنٹنڈنٹ کی وردی کے گھمنڈ نے اور دماغ کی حماقت نے ایک ایسی فضا پیدا کی کہ عصر کی نماز تک نعرہ بازی کا ہنگامہ رہا۔ پولیس نے ڈنڈے اٹھائے، عوام میں سے کچھ نوجوانوں نے خشت باری کی۔ پولیس کے ڈنڈے ہوں گوارہ تھے کہ پولیس کی تربیت ہی اس اخلاق کے تابع ہوتی ہے عوام نے خشت باری کی تو یہ کوئی عمدہ چیز نہیں۔ سیاست وہی کامیاب ہوتی ہے جس کی لگام عدم تشدد کے ہاتھ میں ہو۔ کسی حال میں بھی عوام کو تشدد زیب نہیں دیتا۔ اس میں نہ ان کا فائدہ ہے نہ قوم و ملک کا اور نہ اقتدار و قیادت کا۔ یہ افسوسناک پہلو ہے کہ ہمارے راہنماؤں نے عوام کو احتجاج کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا۔ اور بات فوری اشتعال کے تحت بگڑ جاتی ہے اگر پولیس کے سپرنٹنڈنٹ

موقف پر حکام ہیں تو ملک اور قوم کے دوستی میں کام کیا جائے ... قومی سیاست نے ہمارا ... پولیس کے ڈنڈے اٹھے عوام کی ... لاٹھی کا تشدد ... ہے کہ دونوں طرف سیاسی ... سیاسی ... بنتے ہیں یعنی تشدد پیدا ہوتا ہے اگر کسی ... سیاسی کارکنوں کو پیٹتے ہیں اور جو سیاسی کارکن پولیس والوں کو سب کرتی ہے وہ ... اور اشتعال سیاسی لیڈروں کو گالی دیتے ہیں گویا اس ... ڈنڈا اٹھانے والے تماشائی ہی رہتے ہیں اور ان کے لیے کوئی سی بات پرشن نہیں۔

بالآخر انتہائی ادب کے ساتھ ہم وزیراعظم پاکستان سے گزارش کریں گے کہ سیاست کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ اندھیری رات سب کے لیے خطرناک ہوگی۔ اور مسٹر حنیف رامے وزیراعلیٰ سے یہ کہنا بھی ہمارا دوستانہ فرض ہے کہ وہ پولیس کو اتنا بے لگام نہ ہونے دیں۔

بقیہ: اداریہ

ایک طرف وہ امن سے ملتا اور سان کی نمائندگی کا دم بھرتا اور سماجوں کہتا تھا دوسری طرف خان عبدالقیوم خان کو پیپلز پارٹی کی سرکوبی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اب اگر ان کے عہد میں اپوزیشن کے لیے وہی فضا ہو تو اس پہ کوئی ہوشمند دماغ صاد نہیں کر سکتا۔ بھٹو صاحب کا حق ہے کہ اطمینان سے ملک پر حکومت کریں۔ لیکن تحریر و تقریر کی آزادی بحال ہونی چاہیے۔ ہم نے اس لیے ان سے کچھ عرض کیا ہے کہ ... [illegible]

ہفت روزہ چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ــــ شمارہ ۱۸
۵ مئی ۱۹۷۵ء
قیمت ــــ ایک روپیہ

اس مایوسی کا علاج کیا

لوگ سخت مایوس ہیں

اس سوال پر ہم نے کئی دفعہ سوچا ہے کہ لوگ مایوس ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ آخر وہ کونسی چیز ہے جو ملک کی داخلی و خارجی سیاست سے متعلق ان کے دماغ کو مختلف سوالوں کا گہوارہ بناتے ہوتے ہے۔ کسی محفل میں شریک ہوں، کسی مجلس میں جائیں ان کی نوعیت سے قطع نظر ملک کے بارے میں گفت گو ضرور ہوتی ہے اور اس گفت گو کا ۹۰ فیصد مایوسانہ جذبات اور منفی خیالات سے مملو ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہمیں بہاول پور اور خیر پور ٹامے والی میں تقریب شادی جانے کا اتفاق ہوا تو غور و فکر کے بہت سے دماغوں سے ملاقات رہی۔ ہر کسی سے گفت گو ہوئی۔ یہی نہیں کہ ان میں اپوزیشن سے منسلک لوگ تھے ان میں غیر جانبدار قسم کے لوگ بھی تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پیپلز پارٹی کے ہم خیال ہیں۔ لیکن سب ملک کے حالات کی رنگا رنگی سے حیران تھے۔ ان کے سوالات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ ہمارا داخلی سکون کیوں عنقا ہے؟ ہمارے اضطرابات کا پس منظر کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ سرحد و بلوچستان کا پالیٹکس ڈانواں ڈول ہے۔ اور وہاں پیپلز پارٹی براہ راست انتخاب سے نہیں بلکہ تشنگانِ اقتدار کی معرفت پیدا کی جا رہی یا کی گئی ہے۔ اب آزاد کشمیر بھی اس نہج پر آگیا ہے۔ پنجاب میں کیا ہو رہا ہے؟ اور سندھ کے سیاسی صبح و شام کیا ہیں؟ بہاول پور کے سینکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ انہیں اپنے خطے کے حالات سے پریشانی تھی کہ ان کے حقوق معرض التوا میں ہیں۔ ہم ان سوالات کی منفی و مثبت صورت کے بارے میں بہ تفصیل کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں۔ جو چیز ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں اور جو چیز محض گفت گو ہے وہ اداریہ کا موضوع نہیں۔ ایک چیز ہم نے بہاول پور کے سفر میں نمایاں طور پر دیکھی کہ باوردی پولیس اور سپیشل پولیس کے اہل کار بکثرت کی طرح حاضر تھے۔ ایڈیٹر چٹان شیخ العصر حضرت مولانا عبدالہادی کی خدمت میں دین پور شریف حاضر ہوا۔ مقصود ان کی عیادت تھا یا ان سے اپنی صحت کے لئے دعا کرانا مطلوب تھا۔ لیکن علاقہ کا تھانیدار اور سی آئی ڈی کا انسپکٹر خانقاہ میں حاضر رہا۔ مدفوا ایڈیٹر چٹان کے ساتھ قبروں کے اس احاطہ میں بھی ساتھ گئے جہاں حضرت قبلہ غلام محمد نور اللہ مرقدہ ابد کی نیند سو رہے ہیں مولانا عبیداللہ سندھیؒ آسودۂ خاک ہیں اور مولانا لال حسین اخترؒ دفن ہیں۔ خیر پور ٹامیوالی میں ایک دوست کی شادی تھی۔ وہاں بھی پولیس کو یہی اضطراب رہا۔ بہاول پور میں بھی کچھ ایسا ہی نقشہ تھا۔ خیر یہ بات وہاں اس حد تک جا پہنچی تھی کہ ایڈیٹر چٹان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مجلس عمل کے مخلص ارکان نے جامع مسجد میں جلسہ رچا لیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ پولیس اتنی "ذکی الحس" کیوں ہے۔ اس کو حکمران جماعت کے علاوہ ہر شخص سیاسی مشتبہ نظر آتا ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا ملک میں سب اچھا ہے؟ کیا عوام الناس کی مایوسی کا علاج ہے؟ اور کیا اس لاقانونی کا تدارک ہے؟ جو ملک کے طول و عرض میں اوباش انسانوں کی جماعت نے پیدا کر رکھی ہے؟ مسئلہ اب یہ نہیں رہا کہ ہر قسم کے لہجہ میں حکومت پر نکتہ چینی کرتے رہو۔ بلاشبہ حکومت پر انتقاد عوام کا جمہوری حق ہے۔ لیکن کچھ فرائض اپوزیشن کے بھی ہیں۔ ہم متحدہ محاذ کے وجود کو اس گئے گزرے دور میں غنیمت سمجھتے اور اس کی مساعی سے کماحقہ باخبر ہیں۔ خلاصہ ہمیں معلوم ہے کہ متحدہ محاذ میں ہمدلی نہیں ہم زبانی ہے کہ

ہمدلی از ہمزبانی بہتر است

ہمارے نزدیک یہ اپوزیشن نہیں کہ نشستند گفتند و برخاستند کا عمل تیار کیا جائے اور اس میں مقتدر زیرپا افراد کی اکثریت ہو۔ جو چیزیں ملک کے لئے حقیقی خطرہ ہیں۔ ان سے آنکھیں بند رکھی جائیں اور خود ذہنی لڑائی باندھ لی جائے۔ یہ

چیز کسی بھی سیاسی تدبیر کا حصہ نہیں اور نہ قانونِ اصلاحات کا جزو ہے کہ عوام سے کٹے چھوڑ دیئے جائیں اور خود ارباب اختیار کناروں میں تماشا دیکھا جائے۔ حکمران جماعت نے دستور بناتے وقت تمام پارٹیوں کی تائید حاصل کی اور متحدہ محاذ کی جماعتوں کے پارلیمانی افراد نے اس پر صاد کیا۔ پھر قادیانی مسئلہ پر نیشنل اسمبلی میں اتفاق رائے ہو گیا ــــــ کیا سرحد و بلوچستان کی سیاست کے مسئلہ میں اتفاق رائے نہیں ہو سکتا؟ لیا پولیس کے چال چلن کو نظم و نسق کے اخلاق کا پابند نہیں کیا جا سکتا؟ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لیے فضا پیدا کی جائے اور مبارزت کے بجائے مفاہمت کی راہ سے ہو۔ ہم مسٹر بھٹو سے یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے ملک کا تمام بوجھ خود اٹھا رکھا ہے۔ آخر ان کی جماعت کس مرض کی دوا ہے؟ اس میں کوئی دوسرا شخص ان کی دوسری کاربن کاپی بھی نہیں۔ وہ اپنی جد و جہد کے ماضی کو محسوس کریں اور ملک کی سیاست پولیس کے تصرف و اختیار میں نہ دیں۔ ہمارے ملک میں پولیس نے حکمرانوں کے لیے کبھی خوشگوار فضا پیدا نہیں کی۔ آج سب سے بڑا مسئلہ عوام کی مایوسی کا ہے۔ اس کا علاج ڈھونڈئیے کہ لوگ سیاسی طور پر بے چین و مضطرب ہیں۔ وہ ملک کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ آواز میں سچائی اور اخلاص ہو۔

رقص و موسیقی کا پروگرام

پنجاب آرٹ کونسل فری میسن روڈ شاہراہ قائداعظم لاہور کی طرف سے عنوان بالا کے تحت مقامی جرائد میں ایک اشتہار دیا جا رہا ہے۔ یہ پروگرام یکم مئی سے تین مئی تک ایشیائی سال سیاحت کے سلسلہ میں منعقد ہوگا۔ اس غرض سے ۷ عورتوں اور ۱۸ مردوں کے نام دیئے جا رہے ہیں جو رقص و موسیقی کے باب میں معروف و مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ پنجاب آرٹس کونسل کا ثقافتی طائفہ بھی شامل ہوگا ــــــ ہمیں اس پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں نہ اس کے خلاف ہیں نہ حق میں۔ آرٹس کونسل سرکاری ادارہ ہے اور اپنے فرائض کو بخوبی سمجھتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اس ملک میں اس قسم کے لوگ پیش پیش ہیں جو بہ قول غالب ہوس کی نشاط کار کے لیے کوئی نہ کوئی اچھوتا عنوان ڈھونڈھ لاتے ہیں۔ اگر اس کا نام ایشیائی سیاحت کا سال ہے تو پھر رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کا محاورہ غلط نہیں بہرحال جسمانی لذت کے لیے اس قسم کی تقریبات کا انعقاد شیدائیان فن کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ المختصر سیاسی راہنماؤں اور سیاسی کارکنوں سے رقص و سرود کا طائفہ کہیں اچھا ہے کہ اپنے فن کی نمائش کے لیے اسے آزادی حاصل ہے۔ دانشوران فن کا یہ حوصلہ قابل داد ہے کہ وہ سیاسی ابتلا کے زمانہ میں رقص و سرود سے نئی پود کا خمیر تیار کر رہے ہیں۔ اب اس پر لکھیں تو کیا لکھیں اور کہیں تو کیا کہیں ــــــ ان لوگوں کو ملک کی گرانی سے کیا جو تین روپے اور دس روپے کے ٹکٹ سے لہو و لعب کے اس اکھاڑے میں شریک ہو کر نفس و نگاہ کی خوراک سے شادکام ہوں گے۔ زندہ باد

شریعت اسلامی کے نفاذ کی مہم

جمعیت اتحاد العلماء پاکستان، جماعت اسلامی سے منسلک ایک تنظیم ہے۔ اس کے ناظم اعلیٰ مولانا گلزار احمد مظاہری ہیں۔ مولانا نے ایک بیان میں بتایا ہے کہ وہ یکم مئی سے ۳۰ جون تک ملک بھر میں نفاذ شریعت کے لیے دستخطوں کی ایک مہم کا اجرا کر رہے ہیں۔ اس مہم کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ پاکستان میں فی الفور اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔

۲۔ قادیانیوں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔

۳۔ ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔

۴۔ قادیانیوں کو اسلامی اصطلاحیں استعمال کرنے سے روکا جائے۔

مولانا مظاہری نے اس سلسلہ میں پندرہ رکنی ایک کمیٹی قائم کی ہے اس میں جماعت اسلامی سے متفق پندرہ علما لیے گئے ہیں۔ ان سب کے مخلص و متدین ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن اس حلقہ سے باہر کے علما اس میں شریک نہیں کیے گئے۔ اس کے متعلق ہم کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ جہاں تک قانون کے اسلامی بنانے کا سوال ہے ہر مسلمان کی یہی آرزو ہے اور قادیانیوں کے متعلق تمام کلمہ گو متفق الرائے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات ضرور عرض کریں گے کہ نظری تحریکیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اصل چیز عملی اقدام کا ہے کہ آپ اس سلسلہ میں اپنے افکار و اعمال کے جیب و داماں میں کیا رکھتے ہیں؟ اسلام کو محدود کرنے سے اسلام وسیع نہیں ہوتا۔ آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نئی پود کے ذہنی اضطراب اور دماغی تشویش کا علاج کیا ہے؟

مفتی محمود پر قاتلانہ حملہ

گذشتہ ہفتہ اس خبر نے سیاسی اور دینی حلقوں کو چونکا دیا کہ مفتی محمود سجاول کی طرف کار میں جا رہے تھے کہ بعض نامعلوم الاسم افراد نے کلہاڑیوں سے ان کی موٹر کو ضربیں لگائیں اور پستولوں سے فائر کرتے ہوئے او جھل ہو گئے۔ مفتی صاحب نے ایک بیان میں کہا کہ حملہ آوروں کو نشاندہی کے باوجود گرفتار نہیں کیا گیا۔ لیکن دوسرے تیسرے روز خبر آگئی کہ ملزموں کو پکڑ لیا گیا ہے۔ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس خبر کو ہمارے ملک کی نیوز ایجنسی نے قابل التفات نہ سمجھا۔ دوسرے روز آل انڈیا ریڈیو نے خبر نشر کی تو آزاد اخبارون میں نامہ نگاروں کی روایت سے خبر چھپ گئی۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ فی الواقعہ ملزم پکڑے گئے ہیں اور فرض شناس پولیس افسر تفتیش کر رہے ہیں تو ہر چیز صاف ہو جائے گی۔ البتہ یہ چیز بد اندیش افراد کے گوش گذار کرنا ہمارا فرض ہے کہ وہ سیاسی افراد پر اس قسم کے تجربے نہ کریں۔ مفتی محمود کسی بزدل گروپ کے راہنما نہیں کہ انہیں آسانی سے قتل کیا جا سکتا ہے۔ خدانخواستہ وہ قتل ہو جاتے تو ہمارے ملک میں ایک ایسی بنا پڑ جاتی کہ سلسلہ زلف یار کی طرح دراز ہو جاتا اور خون کا چسکہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ اس قسم کی تحریکوں کو سختی سے دبا دینا ہی بہتر ہے۔ کیا اس سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ محمد رفیق، مولوی شمس الدین، سردار عبدالصمد اچکزئی، نواب محمد احمد اور حیات محمد شیر پاؤ وغیرہم کا خون کافی نہیں ہے۔

جنگ کیا ہے اجل کی ژالہ باری

ہند چینی کی جنگ میں نسلِ انسانی پر جو بیتی اس سے کئی چیزیں آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ عالمی طاقتیں جب کسی چھوٹے ملک یا چھوٹی قوم کو اپنی جنگی مشقوں اور استعماری اغراض کے لیے منتخب کرتی ہیں تو عالم انسانی پر کیا بیتتی ہے۔

۲۔ آج انسان، تہذیب و علم کی ترقی کے باعث اقبال کی طرف جا رہا ہے یا زوال کے پاتال میں گر رہا ہے؟

۳۔ مذہب کی "چیرہ دستیوں" کا مفروضہ قائم کرکے اپنے مادی فلسفہ کی خلد آفرینیوں کا ذکر کرنے والے اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ کیا نسلِ انسانی کسی ایک مذہبی جنگ میں یا تمام مذہبی جنگوں کو یکجا کیا جائے تو مجموعی طور پر اُن سب میں اس قدر ہلاکت و تباہی کا شکار ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں!

برطانیہ کے معروف و ممتاز اخبار ٹائمز نے اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار دیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جنوری ۱۹۶۱ء سے جنوری ۱۹۷۵ء تک یعنی چودہ سال میں امریکیوں سے قطع نظر جو لوگ ہلاک و مجروح ہوئے وہ شمالی و جنوبی ویت نام، کمبوڈیا اور لاؤس کی کل آبادی کا دس فیصد سے زائد تھے یعنی ۵۰ لاکھ ۳ ہزار ایک سو نوے افراد۔

۲۔ اس عرصہ میں ۱۲ لاکھ ۲۲ ہزار ۲ سو ۴۴ افراد لقمہ اجل ہوئے۔ ان میں امریکہ کے ۵۶ ہزار ۲ سو ۱۳ فوجی بھی شامل ہیں۔

۳۔ اس کے برعکس دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کے ۳ لاکھ ۵ ہزار ۷۷ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

۴۔ ہند چینی کی اس طویل جنگ میں شہری اور فوجی ہلاک شدگان کی تعداد کم سے کم ۳۶ لاکھ ۶۴ ہزار افراد ہے۔

۵۔ جنوبی ویت نام میں جنگ کی تباہ کاریوں سے جسمانی طور پر ۱۵ لاکھ اور ۶۰ ہزار شہری معذور و متاثر ہیں۔ ان میں ۲ لاکھ اور ۴۰ ہزار کی موت ہو چکی ہے۔

۶۔ جنوبی ویت نام میں کل آبادی کا ۵۵ فیصد یعنی ایک کروڑ افراد پناہ گزین ہیں۔ یتیم بچوں کی تعداد ۹ لاکھ ہے۔

۷۔ امریکی فضائیہ (ایئر فورس) نے اس خوفناک جنگ کے دوران ۱۸ لاکھ ۹۹ ہزار ۶ سو ۶۸ حملے کئے اور ۶۷ لاکھ ۲۷ ہزار ۸۴ ٹن بم گرائے۔

۸۔ اس کے برعکس دوسری جنگ عظیم میں برطانوی اور امریکی فضائیہ نے مشترکہ طور پر جرمنی پر ۲۷ لاکھ ٹن وزنی بم گرائے تھے۔

۹۔ امریکی فضائیہ نے جنوبی ویت نام پر نباتات کو تباہ کرنے کے لیے ایک کروڑ ۹ لاکھ گیلن کا تباہ کن مادہ چھینکا اور ۳۵ لاکھ ایکڑ رقبہ پر اس کا سپرے کیا گیا جو پورے شمالی آئرلینڈ کے رقبہ کے برابر ہے۔ ان زہریلی ادویات کا اثر ایک سو برس تک رہیگا۔

۱۰۔ امریکی سینیٹ کے تعلقات خارجہ کی ایک سب کمیٹی کے مطابق ہند چینی میں موسم تبدیل کرنے کے لیے ۴۷ ہزار ۴۸۹ کنستر کیمیاوی مادہ گرایا گیا۔

۱۱۔ امریکہ نے ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ویت نام کی جنگ میں ایک کھرب ۴۱ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر صرف کئے اور ۲۸ ارب ۲۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر امداد کے نام پر صرف کئے۔

کیا فرماتے ہیں اپنی تہذیب کا افسانہ سنانے والے! جو لوگ جنگ کی باتیں کرتے اور قوموں کی تقدیر کو اپنے اقتدار کیلئے (خواہ قومی ہو خواہ حزبی خواہ فردی) استعمال کرتے ہیں۔ وہ نہ جانے نسل انسانی کے اس خوفناک قتل پر کیا سوچتے ہیں؟ ضمیر ان کے اپنے ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی کوئی شے ہے اور خدا کا خوف ان کے لیے ایک بول سے زیادہ کوئی سی خصوصیت نہیں رکھتا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مولانا احتشام الحق تھانوی سے ایک سوال یا کئی سوال

مولانا احتشام الحق تھانوی ایک تاریخی ذہنیت کے انسان ہیں۔ وہ کوئی بڑے عالم دین نہیں، لیکن ایک خوش گلو واعظ ضرور ہیں۔ بعض اخباروں نے اپنی ضرورتوں کے باعث انہیں پاکستان میں شہرت دے رکھی ہے۔ ہمارے دل میں اُن کے لیے عزت کے جذبات ہیں۔ اس لیے ہم اُن سے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ سے اپنی نسبت کو اپنے اعمال و افکار کی بوقلمونیوں سے پامال نہیں کیا۔ بلکہ نئی پود کو یہ سوچنے پر آمادہ کیا ہے کہ اتنی بڑی نسبت انحطاط کے اِس عالم میں کیوں ہے؟ بہرحال ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ممکن ہے اپنی عاقبت کے لیے وہ بہتر سروسامان کرتے ہوں کہ انہیں ہم سے کہیں بڑھ کر اپنی آخرت کی فکر ہوگی۔ ہمارا ان سے دوستانہ سطح پر سوال ہے کہ انہوں نے سندھ گورنمنٹ کے ضابطہ اخلاق کی کمیٹی میں نصیر اجتہادی کے ساتھ کس ضابطہ اخلاق کی رو سے شرکت کی ہے۔ کیا انہیں یاد نہیں رہا کہ نصیر اجتہادی نے ٹیلی ویژن پر کیا گل کھلایا تھا۔ ہم اتحاد بین المسلمین کے سلسلہ میں حکومت سے بہر لحاظ متفق ہیں۔ لیکن حکومت یہ محسوس کیوں نہیں کرتی کہ فسادی عوام نہیں بلکہ وہ "علما" ہیں جن کا ضمیر باطل ہے۔ نصیر اجتہادی نے اپنے جرم کی معافی کیوں نہیں مانگی؟

شیخ منظر مسعود صدر آزاد کشمیر کی خدمت میں

شیخ منظر مسعود صاحب صدر آزاد کشمیر نے چند دن پہلے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسی لاہور میں سیاسی طور پر جوان ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ سُن کر افسوس ہوا کہ انہوں نے پہلے دن دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں "کارکنوں" کو خطاب کیا تو ان کے پہلو میں شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس فروکش تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ بہرحال اپنے مقام و مرتبہ کو وہ جانتے ہیں۔ ہم اُن سے گزارش کریں گے کہ شیخ صاحب آزاد کشمیر کی سیاست آپ کے بس کی نہیں۔ سردار عبدالقیوم کے ساتھ اس مرحلہ میں جو ہوا غلط ہوا، اور آپ کی اسمبلی کے ارکان نے مسئلہ کشمیر کی خدمت نہیں کی۔ اب بہتر ہے کہ آپس میں اختلافات کو ہوا نہ دیں۔ آپ کا مستقبل ابھی معلق ہے اور یہ ہم سب کے لیے شرمناک ہے کہ جلوس نکال کر آپس میں لڑیں۔ کیا میرپور کے جلوس کے تصادم میں فخر و شرف کی کوئی چیز ہے؟ آپ اس طرح کیا حاصل کر پائیں گے۔ اصل چیز افراد کا مستقبل نہیں کشمیر کا مستقبل ہے۔

گولڑہ شریف کا عرس

اس دفعہ یہ امر دینی حلقوں کے لئے حیرت کا باعث ہوا ہے کہ حضرت قبلہ پیر مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ کے سالانہ عرس پر راولپنڈی کے ضلع میں حسب معمول تعطیل نہیں کی گئی اور نہ سپیشل گاڑیاں چلائی گئی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے اس کا سبب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی لادینی دانشور کا کرشمہ ہو یا کسی میرزائی کی اندرخانہ شرارت! ہم وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو اس طرف متوجہ کرتے اور آئندہ کے لیے احتیاط و تلافی کے خواہاں ہیں۔ گولڑہ شریف کے سالانہ عرس کی چھٹی انگریزوں کے وقت سے ہوتی ہے۔ اور پارسال تک یہی معمول رہا۔ نہ جانے اس دفعہ تغافل تھا یا تامل یا تجاہل؟ یا پھر کسی بے دین کی حرکتِ طفلانہ۔ امید ہے مولانا کوثر نیازی وزیر مذہبی امور وزیر اعظم کی خدمت میں ان جذبات کو پہنچا کر تلافی کی صورت کر دیں گے۔

"حضرت علامہ کے فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے"

- "اگر نظریہ پاکستان کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہوتی تو آج ہمیں یہ دن ہرگز نہ دیکھنے پڑتے"
- "علامہ اقبال کے یہاں وطن کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے"

مرکزیہ مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام منعقدہ یوم اقبال کے موقع پر آنریبل چیف جسٹس سردار محمد اقبال کا ایمان افروز خطبۂ صدارت

یوں دکھائی دیتا تھا کہ اب اسلام کے فرزندانِ توحید ہمیشہ کے لیے تثلیث پرست یورپ کی غلامی میں چلے گئے۔ لیکن حضرت علامہ نے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی اسلام کی شمع امید روشن کئے رکھی۔ انہوں نے اپنی دو نظموں ۔۔ 'خضر راہ' اور 'طلوع اسلام' میں مسلمانوں کو ایک روشن اور بہتر مستقبل کی نوید سنائی۔

حضرت علامہ کو اسلام اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کی سربلندی اور سرفرازی کا جو اس قدر یقین تھا، تو اس کی وجہ دین اسلام اور ملت اسلام کے بارے میں وہ اعلیٰ وارفع تصور تھا جسے وہ اپنے کلام کے ذریعے مختلف پیرایوں میں پیش کرتے رہے۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ نے اجمالی طور سے اسلام کے معاشی نظام کی قدرے تفصیل بھی دی ہے، فرماتے ہیں،

قرآن کی منزل مقصود اور ہے، اور
مسلمان کی رسم و آئین اور مسلمان کے
دل میں جلا دینے والی آگ نہیں رہی
اس کے سینے میں عشق مصطفیٰ موجزن
نہیں۔ قرآن کیا ہے؟ سرمایہ داروں
کے لیے موت کا پیغام ہے۔ قرآن
بندۂ بے ساز و برگ کا دست گیر ہے

دولت کے لالچی سے کبھی کسی اور بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"تم اللہ کی راہ میں خرچ کئے بغیر کوئی کوئی نیکی حاصل نہیں کر سکتے۔"

"سود سے فتنے بڑھتے ہیں، قرض حسنہ میں بڑی لذت ہے۔"

"زمین سے رزق حاصل کرنا جائز ہے زمین انسان کی متاع ہے لیکن اس کا مالک اللہ ہے۔ انسان کی حیثیت صرف ایک امین کی ہے۔"

حضرت علامہ نے روسی قوم کو بھی علامہ جمال الدین افغانیؒ کی زبان سے غور و فکر کی دعوت دی ہے اور فرمایا ہے کہ

بے شک تم نے زندگی کی ایک نئی طرح
ڈالی ہے اور ہم مسلمانوں کی طرح قیصریت
کے بتوں کو پاش پاش کیا ہے تاہم
تمہارا یہ اقدام اس وقت تک نامکمل
رہے گا کہ جب تک لا سے الّا کی
طرف نہیں آتے اور اب تمہارا حال
یہ ہے کہ تم صرف لا تک محدود رہ
گئے ہو۔

بلاشبہ حضرت علامہ اقبال نے اپنے کلام بلاغت نظام کے ذریعے جو کچھ مسلمانوں کو پیش کیا، اُسے انہوں نے کلام الٰہی قرآن حکیم، حدیث اور سنت رسول کریمؐ ہی سے اخذ کیا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت علامہ کے فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے نہ یہ کہ ان افکار و خیالات کی اساس مغربی مفکرین کے نظریات و تصورات پر ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں، یہ درست ہے کہ حضرت علامہ نے فلشے، نٹشے، کانٹ، برگساں اور ہیگل وغیرہ کے حوالے دیئے ہیں مگر یہ حوالے اپنے مقصود کی صحت کو باور کرانے کے لیے ان لوگوں کی خاطر دیئے ہیں جو مغرب کے افکار سے مرعوب تھے۔

حضرت علامہ نے مغربی اور مشرقی دونوں علوم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا۔ مگر انہوں نے جتنا اصطلاحات، تلمیحات، شخصیات اور مقامات کو اسلام کی تاریخ

صوفیائے کرام کی تصانیف، قرآن حکیم اور حدیث رسول کریمؐ ہی سے لیا ہے وہی ان کے فکر کا سرچشمہ ہے۔

کلام اقبال شعر و حکمت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ان کے یہاں شاعرانہ افکار بھی ہیں، اور حکیمانہ افکار بھی اس اعتبار سے حضرت علامہ ایک شاعر بھی ہیں، اور ایک مفکر بھی ــــ وہ لوگ جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں کلام اقبال سے وہ بھی اتنے ہی متاثر ہو سکتے ہیں کہ جتنے علم و حکمت اور فلسفے سے نسبت رکھنے والے حضرات۔

حضرت علامہ کا اپنے کلام کے ذریعے جو مقصد وحید تھا، وہ یہ تھا کہ ملت اسلامیہ بالخصوص ملت اسلامیہ ہند کی سیرت و کردار تعمیر کی جائے۔ ان میں اعلاا خلاق اور عمدہ صفات پیدا کر کے انہیں اس مقام و منصب پر فائز کیا جائے جو بحیثیت مسلمان کے ان کا حق ہے۔ حضرت علامہ نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کو خودی کا درس دیا، ان کے نزدیک خودی کو اپنے فلسفے کا اصولی تصور بنانا، دراصل ایسے فلسفے کے نقصانات سے بچانا تھا، جس سے معفصریت اور یاس پیدا ہوتی ہے۔ کلام اقبال میں شعور ذات خود اعتمادی احساس انفرادیت معرفت نفس اور خود شناسی کے لیے 'خودی' کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خودی کا فلسفہ، خود حضرت علامہ اقبال کی ذات کے انفرادی مطالعے کا اثر تھا جس نے پھیل کر اجتماعیت کی صورت اختیار کر لی۔ جب حضرت علامہ نے مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے اسلام کی تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب جب مسلمانوں کی بے عملی کو دور کرنے، جمود کو توڑنے اور عزم و ہمت کو بیدار کرنے میں نہایت مؤثر ثابت ہوگا۔ حضرت علامہ کے اس فکر و خیال کے صحیح ہونے کی شہادت یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی تخلیق کا جو خواب دیکھا تھا، وہ حقیقت بن کر آج دنیا کے سامنے آ چکا ہے۔

علامہ اقبال نے سیاسیات، اقتصادیات اور اجتماعیت پر جن خیالات و تصورات کا اظہار فرمایا ہے وہ ان کے جامع و مربوط فلسفے کے لازمی اجزاء ہیں،

حضرت علامہ نے پوری زندگی اور ساری کائنات کو اسی فلسفے کی روشنی میں دیکھا اور ایک فرد کی خودی سے لے کر ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کو پہچاننے تک جتنے مرحلے آئے، ان کے رازہائے سربستہ کو وا شگاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت علامہ چاہتے تھے کہ جمود ٹوٹے، بے علمی ختم، ذہنی تعطل اور دماغی تعیش کا خاتمہ ہو جائے۔ علامہ سمجھتے تھے کہ خودی انسان کا کوئی مادی پہلو نہیں، بلکہ ایک روحانی شئے ہے، زندگی کی کشمکش اور اپنے وجود کو باقی رکھنے کی جنگ میں 'خودی' کو ایک اہم اور مرکزی مقام حاصل ہے،

حضرات! مسلمانوں کی قومیت اسلام ہے، مسلمانوں کا وطن اسلام ہے۔ ۱۹۳۰ء میں جب حضرت علامہ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی تو انہوں نے اپنے پیغام میں اس متحدہ ہندوستانی قومیت کی جس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود پر قائم ہے،

نہایت واضح الفاظ میں تردید کی اور کہا کہ ہم ایک قوم ہیں تو صرف اسلام کی بنیاد پر اس کے سوا ہماری قومیت کی اور کوئی بنیاد نہیں یہی وہ نقطہ نظر تھا، جسے حضرت علامہ کے بعد قائداعظم نے مشعل راہ بنایا۔ انہوں نے فرمایا:

پاکستان کا مطلب یہ نہیں کہ ہم غیرملکیوں (انگریزوں) کی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، بلکہ اس سے ہماری حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے، جس کی حفاظت کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے، ہمیں صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنا، بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بھی بنانا ہے کہ اس کی ہم نہ صرف یہ کہ حفاظت کر سکیں بلکہ اسلامی تصورات و اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں

ایک موقع پر حضرت قائد اعظم نے یوں ارشاد فرمایا:-

"ہم مسلمان اور ہندو دونوں میں صرف مذہب ہی کا فرق نہیں بلکہ معاشرت اور کلچر بھی ہے جو ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہے، ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اسی ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور میں قائداعظم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ دونوں مذہب نہیں ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی

نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفہ رکھتے ہیں، دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیاد متضادات تصور پر مبنی ہے دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یک جا کر دینا باہمی جنگ و جدل اور مناقشت کو بڑھائے اور آخر کار اس نظام کو توڑ دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لیے بنایا گیا ہے۔"

مختصر یہ کہ ہم نے حضرت علامہ اقبال کی مومنانہ اور قائدِ اعظم کی معجزانہ قیادت کی بدولت مملکت خداداد پاکستان کو اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اگر پاکستان قائم ہوتے ہی پاکستان کے نظریے کی اشاعت کی جاتی، نئی نسل کو جو قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئی - پاکستان کے قیام کے اسباب اور اس کے نظریے کی غرض و غایت بتائی جاتی ہندو کی مسلم دشمنی، پراگندہ ذہنیت اور اس کے انسانیت کش طرزِ عمل سے آگاہ کیا جاتا تو انہیں اس بات کا احساس ہوتا کہ پاکستان ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بڑی نعمت ہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو مسلمان دشمن ہندوؤں کے ہاتھوں ان کی زندگی کس حال کو پہنچتی، اسلام اور مسلمانوں کا ہندوستان میں کیا حشر ہوتا، اگر نظریۂ پاکستان کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہوتی تو آج ہمیں یہ دن ہرگز نہ دیکھنے پڑتے یقین جانیں وہ لوگ جو آج نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کا سہارا لے کر پنجابی، سندھی، بلوچی، اور سرحدی وغیرہ چار قومیتوں کا نعرہ بلند کر رہے ہیں جنہوں نے کل بھی اسی بنیاد پر بنگالی قومیت کا نعرہ بلند کر کے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔

بنگلہ دیش کے قیام سے جو لوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ ختم ہو گیا ہے وہ میرے نزدیک سراسر غلطی پر ہیں۔ بنگلہ دیش کا ایک علیحدہ ریاست کے طور پر وجود میں آنا اور بھارت میں مدغم نہ ہونا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگرچہ پاکستان کے دشمنوں نے اس کے خلاف سازش کر کے اس کے مشرقی حصّے کو جارحیت سے الگ کر دیا ہے۔ تاہم دو قومی نظریہ آج بھی زندہ

ہے ۔

پاکستان کہ اسلام کے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے جن شدید خارجی اور داخلی خطرات سے دوچار ہے۔ اُن کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کے نظریئے کی، جسے حضرت علامہ نے بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ نئی نسل تک پہنچایا جائے اور حضرت علامہ کا یہ پیغام انہیں دیا جائے، کہ ۔۔

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

کلام اقبال کی روشنی میں نئی نسل پر یہ بات واضح کی جائے، کہ قومیت کے لحاظ سے اور وطنیت کے اعتبار سے پنجابی، سندھی، بلوچی اور سرحدی نہیں صرف مسلمان ہیں اور ایک قوم ہیں۔

اسلام کی تعلیمات کے مطابق علامہ اقبالؒ کے یہاں وطن کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، وطن سے محبت کرنا ہر انسان کی فطرت ہے، حضرت علامہ اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ ایک طبعی وصف ہے اور انسان کی خانگی زندگی میں اس کے لیے پوری جگہ ہے۔ مگر آج ہمارے زمانے کی سیاسی اصطلاح میں وطن کا مفہوم جغرافیائی نہیں بلکہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول بن گیا ہے اور اس لحاظ سے جب اسے ایک جغرافیائی طور پر ہٹ کر سیاسی تصور کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ تو نسل انسانی کا آپس میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضرت علامہ وطنیت کے سیاسی نظریئے کے سخت مخالف۔ انہوں نے فرمایا ۔۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

گفتار سیاست میں اللہ تعالیٰ کے بجائے وطن معبود ہے اور انسان اس کے پجاری ہیں اور ارشاد نبوت میں وطن کی بجائے اللہ تعالےٰ ہی معبود حقیقی ہے اور انسان اس کے بندے ہونے کی حیثیت میں وطن پسور ہیں۔

حضرات اگر ہمیں مملکت خداداد پاکستان کی سالمیت درکار ہے۔ ایک آزاد اور حاکم قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنا ہے تو ہمیں نسلی لسانی اور صوبائی عصبیت سے نکل کر فرزندان توحید کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینا چاہیئے، اور ایک اچھے اور سچے مسلمان کے طور پر اپنے کردار کا اعلیٰ اور سیرت کا نہایت نمونہ پیش کرنا چاہیئے، تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر جس سے آج ہم دوچار ہیں، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے اس پیغام پر عمل کرنا چاہیئے جو انہوں نے گویا آج ہی کے دن کیلئے ہمیں دیا ہے، فرماتے ہیں ۔۔۔

اے مسلمان ع

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کا پورا فکر ہمارا ایک ایسا ثقافتی ورثہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنی حیات اجتماعی میں پھر وہی جذبہ پیدا کر سکتے ہیں، جس کے لیے انہوں نے شاعری کو اپنے خیالات و افکار کا ذریعہ بنایا۔

ان گزارشات کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایک اور نیک بنا دے، اور ہم سب مل کر پاکستان کی ترقی، خوشحالی، اس کی سالمیت، اس کے استحکام اور اس کی بقا کے لیے کوشش کریں کہ علامہ اقبال کی یاد منانے، ان کے احسان کا اعتراف کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کا شکریہ ادا کرنے کا یہی ایک صحیح طریقہ اور بہترین ذریعہ ہے

پاکستان زندہ و پائندہ باد

از ڈاکٹر سید عبداللہ



نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح

علامہ اقبال نے ہمیں ایک اہم نظریہ دیا ہے ---- یعنی نظریۂ خودی۔ اس نظریے یا خیال کی تشریح ان کی اکثر کتابوں میں ہے۔ مگر فارسی کی مثنوی "اسرارِ خودی" میں انہوں نے اس کے ضروری مسئلوں پر خاص طور سے بحث کی ہے۔

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے۔ لغات میں اس کے معنے تکبر، غرور وغیرہ بھی بتائے گئے ہیں، مگر علامہ اقبال کے کلام میں اس کے معنی اور ہیں آسان لفظوں میں اس کے معنے ہیں، خود کا یعنی اپنی ذات، اپنی ہستی یا اپنے وجود کا احساس یا اپنی صلاحیتوں کا خود کو علم وغیرہ وغیرہ۔ اسکے معنے اپنے آپ کو پہچاننا بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص یہ جان لے کہ وہ کس کا بیٹا پوتا ہے اور کس شہر کا رہنے والا ہے یہاں مطلب یہ ہے کہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اسے خدا نے کیا کیا قابلیتیں عطا کی ہیں، اور وہ ان سے کیا کام لے سکتا ہے اور ان کی مدد سے اپنی اور اپنی قوم کی بلکہ سارے انسانوں کی ترقی اور راحت کے لیے کیا کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

یہ سب کچھ تبھی ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنی پہچان ہو، یعنی اپنے اوپر بھروسہ ہو ......

اسی کو علامہ اقبال خودی کہہ رہے ہیں، یہ اس لفظ کی آسان تشریح ہے، ورنہ اس کی علمی بحث خاصی مشکل ہے۔ جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔

ہفت روزہ جہان لاہور

غرض یہ کہ خودی کے معنے ہیں، خود کو پہچاننا اور پہچان کو عمل اور محنت کے ذریعے بڑے مقاصد کی تکمیل۔ یہ مقاصد ذاتی بھی ہو سکتے ہیں، مگر چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور مسلمان کو تو اشرف ہی نہیں، اشرف ترین ہونا چاہیے، اشرف الانسان اپنی ذات سے زیادہ اپنی قوم کے لیے اور ساری انسانی برادری کے لیے سوچتا ہے، اس لیے اقبال کے نزدیک بڑے مقاصد وہی ہوں گے۔ پس خودی اس خود شناسی کا نام ہے۔ جو مقاصد کی لگن میں عمل پر ابھارے اور یہ عمل ایسا ہو جو ذات کے ساتھ ساتھ ملت کی ترقی اور سربلندی میں امداد دے۔

اس سے واضح ہو گیا ہو گا، کہ علامہ اقبال کے کلام میں خودی کے خاص معنے ہیں۔ علامہ اقبال سے پہلے صوفی شاعروں نے بھی خود کو پہچاننے پر زور دیا ہے، چنانچہ مشہور مقولہ ہے:۔

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے گویا خدا کو پہچان لیا......"

مگر صوفیوں کا مطلب جدا ہے وہ یہ چاہتے ہیں، کہ انسان یہ سمجھ کر انسان اپنی اصل میں خدا سے جدا نہیں، انسان کی روح، خدا کی مقدس ذات (روح کل) سے ملی ہوئی ہے۔ گویا خدا کا ذات اور انسان اصل میں ایک ہیں، ان کو ہم ایک دوسرے سے جدا سمجھ نہیں سکتے۔ مگر اقبال یوں نہیں سوچتے اقبال یہ کہتے ہیں کہ انسان جو کچھ بھی ہے اپنے موجودہ حالات میں خدا سے الگ وجود رکھتا ہے اس کی ترقی (یعنی خدا، خدائی صفات، بلندی، غلبہ، عدل وغیرہ) کا ظہور اس پر منحصر ہے کہ وہ کوشش کرے اور دوسرے انسانوں کے تعاون سے اونچے درجے حاصل کرتا جائے۔

صوفی نفس (خود) مار کر پھر اپنی اصل (خدا) تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اقبال خود کو تسلیم کر کے خود کی اندرونی قابلیتوں کو بڑھانا چاہتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اقبال کی خودی اور صوفیوں کی خود شناسی میں بڑا فرق ہے۔

علامہ اقبال نے خودی کے مسائل کا مربوط طریقے سے بیان سب سے پہلے اپنی فارسی مثنوی اسرار خودی میں کیا ہے۔ یہ مثنوی تقریباً ۱۹۱۲ء میں لکھنی شروع کی گئی تھی اور ۱۹۱۵ء میں پہلی بار چھپی چونکہ خودی کا اصل تخیل اسی کتاب میں ہے اس لیے اس کے مطالب کا خلاصہ بہت سے ایسے لوگوں کے لیے مفید رہے گا جو اقبال کے خیالات سے اچھی طرح آگاہ نہیں۔

شروع میں اقبال نے اپنی شاعری کی خاص نوعیت کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ میں مولانا رومؒ کے کلام سے متاثر ہوا ہوں، مولانا رومؒ نے ہی مجھے سمجھایا ہے کہ نئی طرح کی شاعری کی ضرورت ہے، یعنی ایسی شاعری جو قوموں کو زندہ کر دے ~

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

(ترجمہ) اپنی شاعری (فریاد) سے نیا
انداز پیدا کرو اور جام کو قلب کو
جوش انگیز کلام سے گرما دے۔

اقبالؔ فرماتے ہیں کہ اس شاعری سے میرا مقصد وہ شاعری نہیں جو عام طور سے مروّج ہے بلکہ میں تو اس کے ذریعے خودی کے راز ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ نظام عالم خودی کی وجہ سے ہے، اور زندگی اور وجود کا تسلسل خودی کے استحکام پر منحصر ہے ؎

چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است

(ترجمہ) چونکہ دنیا کا وجود خودی کی بدولت ہے، اس لیے زندگی کی قوت اور بقا استواری اور پختگی کی نسبت سے ہوگی۔

خودی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خود کو ظاہر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ خود ایک خاموش قوت ہے، مگر عمل کے لیے بے تاب ہے ؎

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی است

(ترجمہ) خود کو ظاہر کرنا خودی کی عادت ہے، خودی کی قوت ہر ذرے کے اندر چھپی ہوتی ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ خودی، مقاصد کے ہونے اور پیدا کرنے پر موقوف ہے، یعنی خودی کے احساس و قوت کے لیے بڑے بڑے مقاصد کو ہونا ضروری ہے ؎

زندگی را بقا از مدعا ست
کاروانش را درا از مدعا ست

(ترجمہ) زندگی مدعا اور مقصد سے قائم ہے، زندگی کے قافلے کو جگانے والے اور چونکانے والی چیز منزل اور مقصد کا خیال ہے، جس طرح درا کی آواز قافلوں کو جگاتی اور بڑھنے کا پیغام دیتی ہے، اسی طرح مقصد و مدعا زندگی کو بڑھنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ مقصد و مدعا کیا ہے؟ آرزو کی وہ آخری منزل جسے انسان اپنے لیے ضروری اور باعث مسرت خیال کرتا ہے۔ یہ آرزو انسان کو جستجو پہ آمادہ کرتی ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

(ترجمہ) زندگی کا راز جستجو میں ہے اور جستجو، آرزو کے اندر جنم لیتی ہے



اقبالؔ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی آرزوؤں کی بدولت زندہ ہیں، آرزوؤں کے پیدا ہونے اور ان کے لیے سرگرم عمل ہونے ہی میں زندگی ہے۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

اس کے بعد علامہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے، یہاں علامہ خودی کو ایک "نقطہ نور" قرار دیتے ہیں جو ہمارے اس خاکی وجود میں زندگی کی چنگاری سلگاتے رکھتا ہے اس نقطہ نور کی یہ خاصیت ہے کہ عشق و محبت سے اس کی گرمی، چمک اور قوت اور زیادہ ہوتی ہے۔ یہ محبت بڑی وسیع چیز ہے، انسان سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا تک اور عام لگن سے لے کر بڑے بڑے مقاصد کے عشق تک محبت کی دنیا پھیلی ہوتی ہے۔۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو عشق مصطفیٰؐ سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوگی، اور عشق مصطفیٰؐ کی کی لازمی شرط تقلید مصطفیٰؐ (آنحضرتؐ کی پیروی) ہے

اقبال فرماتے ہیں:
اگر تم سچ مچ عاشق مصطفیٰ ہو تو آپ کی تقلید کرو، تاکہ تمہاری کمند یزدان تک کو شکار کر سکے۔

عاشقی محکم شو از تقلید یار
تا کمند تو شود یزداں شکار

خودی کا وصف خاص یہ ہے کہ یہ خود پر بھروسہ کرتی ہے اور دوسروں سے مانگنے اور سوال کرنے سے اسے نفرت ہے، سوال سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے۔

جب خودی عشق و محبت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظام عالم کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

یہ مضمون ابھی جاری ہے، باقی مباحث آئندہ اشاعت میں آرہے ہیں۔

۵ مئی ۱۹۵۵ء

ہفت روزہ چٹان لاہور

روزنامچہ

حضرت دین پوری مدظلہ کی خدمت میں

خیرپور اور بہاولپور کی علمی صحبتیں

پچھلے چار برس سے اپنی کم آمیزی کے باوجود میرے دل و دماغ میں یہ لہریں اٹھ رہی تھیں کہ حضرت قبلہ مولانا عبدالہادی مدظلہ العالی کے نیاز حاصل کروں، اور دین پور شریف جا کر ان کے آستانہ اقدس سے علم و نگاہ کی رونقیں پاؤں، لیکن ایک لحظہ کے لیے بھی حالات نے اتفاق نہ کیا، سنہ ۱۹۷۰ء میں انتخابات کے ہنگامے رہے، ان کی بدمزگی نے طبیعت پر ایک ایسا بوجھ ڈالا کہ دو سال اضطراب و شوق میں گزر گئے۔ ۱۹۷۲ء کے آغاز میں مولانا تاج محمود کی معیت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، لیکن حکومت نے نظربند کر کے میانوالی بھیج دیا، پھر بیمار ہو کر لاہور میں میو ہسپتال میں آ گیا، اواخر ۱۹۷۳ء میں رہا ہوا، بیماری نے سفر و سیاحت سے محروم کر دیا، جون ۱۹۷۴ء میں قادیانی مسئلہ چھڑ گیا، اس میں اپنے ذوق کے مطابق بھرپور حصہ لینا پڑا، جولائی میں حکومت نے نظربند کر دیا تو میں اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں تھا، ایک ماہ بعد رہائی ہو گئی، لیکن بیماری کی خطرناکیوں نے پیچھا نہ چھوڑا، زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا تھا، عام خیال یہ تھا کہ صبح گیا یا شام گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں رحمت سے نوازا، اور حضورؐ کی رحمت اللعالمینی کے صدقے میں صحت یاب ہو گیا، اب ضعف و توانائی باقی ہے، اگر گھومنے پھرنے کی توانائی پیدا نہیں ہوئی، لیکن بفضل ایزدی صحت سے ہم آغوش ہو چکا ہوں، حسن اتفاق سے محب عزیز سید عبدالستار شاہ ہمدانی ایڈووکیٹ کی شادی ان کے گاؤں خیرپور ٹامیوالی میں ۲۷ اپریل کو ہو رہی تھی، میں نے یہ موقع سعادت و مسرت کا باعث سمجھا، ہمدانی سلسلہ کا مخلصانہ اصرار تھا کہ ۲۵ اپریل کی شب کو کراچی ایکسپریس میں سوار ہو کر ۲۶ اپریل کی صبح کو خانپور پہنچ گیا، اور وہاں سے صاحبزادگان بلند اقبال کی معیت میں دین پور شریف گیا، حضرت قبلہ میاں صاحب کے نیاز حاصل کیے، باقی تفصیلات میرے پرسنل سیکرٹری مسٹر مختار الحسن نے سپرد قلم کی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔



مختار الحسن

دین پور شریف میں

ہم ۲۵ اپریل کی صبح کو خانپور پہنچے سیدی عبدالہادی مدظلہ العالی کے عزیزان بلند اقبال اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے، آغا صاحب سے نہایت تپاک کے ساتھ معانقہ فرمایا، پھر ایک جیپ میں سوار ہو کر ڈھائی میل کے فاصلے پر دین پور شریف چلے گئے، حضرت میاں صاحب مدظلہ کے متعلق معلوم تھا کہ وہ پچھلے دو سال سے صاحب فراش ہیں، ان میں اٹھنے پھرنے کی طاقت نہیں ہم پہنچے تو حضرت قبلہ چارپائی پر فروکش تھے، نہایت خندہ روئی سے خوش آمدید کہا، آغا صاحب نے آگے بڑھ کر آپ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور چند کلمات میں اس عقیدت و احترام کا اظہار کیا جو آغا صاحب کے دل میں آپ کے لیے ہیں، آغا صاحب کی آمد کے ساتھ ہی سی آئی ڈی کا ایک انسپکٹر اور علاقے کا تھانیدار بھی دو چار سپاہیوں سمیت آ گیا۔ میاں صاحب قبلہ کی راستباز زبان سے کلماتِ حق نکلتے رہے ایک مختصر سی صحبت کے بعد ہم مہمان خانے میں چلے گئے، چائے وغیرہ نوش کی پھر ان بزرگان علم و نگاہ کے مزار پر گئے جو ایک مختصر احاطے میں مدفون ہیں، ان کی قبریں عہد اسلاف کی روایت کے مطابق کچی مٹی کا ڈھیر ہیں، کوئی پختہ اینٹ یا سنگی کتبہ نہیں، آغا صاحب اور ان کے ساتھیوں نے سب سے پہلے سیدنا غلام محمد دین پوریؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی، پھر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی لحد پر حاضری دی، اس سے آگے اسی صف کی آخری قبر مولانا لال حسین اختر مجاہد ختم نبوت کی ہے، وہاں فاتحہ پڑھ کے احاطہ کی تمام قبروں پر ایک نگاہ ڈالی، آغا صاحب کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں کہ دین و سیاست کی ملی تاریخ کے عظیم الشان انسان صبح قیامت تک محو خواب ہیں، واپس آ کر کچھ دیر آرام کیا، اس کے بعد محترم میاں خلیل احمد



نے حضرت قبلہ غلام محمد دین پوری کی سوانح عمری کے بعض حصے سنائے، آغا صاحب نے ان پر زور دیا کہ اس سوانح عمری کو جلد سے جلد مکمل کریں اس تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شگفتہ الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمو دیئے ہیں، اور اس کا اسلوب نگارش تحریر حاضر کے اسلوب نگارش کے مطابق ہے، آغا صاحب نے میاں صاحب کو ان کی خوبی تحریر پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے یہ کتاب اسی انداز میں مکمل کی تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہو گی، اور ہم اپنے اس بے مثال ماضی کی تاریخ سے محروم نہ رہیں گے، جس میں اس پایہ کے متقی اور جری انسان ہو چکے ہیں۔

جمعہ کی نماز اسی تاریخی مسجد میں ادا کی، جس کا سنگ بنیاد حضرت دین پوری نور اللہ مرقدہ نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا، جہاں وقت کے بڑے بڑے علماء اور شیوخ نے اپنی جبینیں تسلسل کے ساتھ اللہ کے حضور میں جھکائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریشمی رومال کی تحریک کا مرکز رہا۔ اس مسجد کے بالائی گنبد کا وہ حصہ بھی دیکھا، جہاں حضرت قبلہ تاج محمد امروٹی اور حضرت دین پوری انگریزوں کی سلطنت کو ختم کرنے کے لیے سوچا کرتے تھے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کابل جانے سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کی زیر ہدایت یہاں اپنے منصوبے کی مختلف شاخیں تیار کی تھیں، اسی مسجد ہی کے نیچے وہ تہ خانہ تھا جو شاید اب بھی ہے، جہاں جماعت مجاہدین کے لیے اسلحہ تیار کیا جاتا، اور مختلف راستوں سے سرحدی علاقوں میں بھیجا جاتا تھا، میاں خلیل احمد اور میاں ریاض احمد سے مل کر نہایت عمدہ تاریخی معلومات حاصل ہوئیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ بیرچگارا شریف سے متعلق ان باتوں کا علم ہوا جو اب تک قرطاس و قلم کے حوالے نہیں کی گئیں اور زمانہ کی کورچشمی نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے، پیر پگارا شریف کی تاریخ فی الواقعہ ایک عظیم تاریخ ہے۔ آغا صاحب مسجد کی آخری صف میں جمعہ پڑھنے کے لیے بیٹھے تھے، حضرت قبلہ عبد الہادی مدظلہ چارپائی پر تشریف لائے، اگلی صف میں ان کی نشست تھی، آپ نے آغا صاحب کو فوراً یاد کیا، اپنے ساتھ جگہ دی اور نماز پڑھی گئی، آغا صاحب کا بیان ہے کہ "حضرت میاں صاحب قبلہ کے شانہ بہ شانہ نماز ادا کرنے سے مجھے ایک ایسا کیف اور سرور حاصل ہوا کہ اس کی لذت بیان کرنا الفاظ کی فراوانی کے باوجود سہل نہیں، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں شیخ العصر کے پہلو میں بحالت سجدہ اپنے رب سے ہم کلام ہوں۔"

آغا صاحب نے حضرت دین پوری نور اللہ مرقدہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا لال حسین اختر سے تصور میں ہمکلام ہو کر فی البدیہہ تین نظمیں کہیں جو اس دفعہ یا اگلی اشاعت میں نذر قارئین کی جا رہی ہیں۔ آغا صاحب نماز کے بعد حضرت میاں صاحب کے حسب ہدایت ان کی نشست گاہ میں حاضر ہوئے، تو ملک کی اسلامی جدوجہد پر گفت گو ہوتی رہی حضرت صاحب قبلہ کا آغا صاحب پر التفات نہایت قیمتی سرمایہ تھا، کئی امور پر باتیں ہوئیں، جنہیں آغا صاحب شاید علیحدہ قلم بند کریں۔ آغا صاحب کہتے ہیں، کہ میرے لیے دین پور شریف میں ایک رات اور ایک دن کا قیام زندگی کے حاصل لمحات میں سے تھا، اگلے روز صبح کی نماز کے بعد ہم حضرت میاں صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے آغا صاحب سے کہا کہ "شورش تم ختم نبوت کے سپاہی ہو، میں نے کسی دور میں بھی تمہارے لیے دعاؤں کو ترک نہیں کیا، اپنی زندگی

ہفت روزہ چٹان لاہور

اس کے لیے وقف کردو، اور مرزائی فتنے کی جو شاخیں باقی رہ گئی ہیں، ان کا ایمان کی پوری توانائی کے ساتھ احتساب کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور یہ جلد سے جلد سننا چاہتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کے جسم کا یہ ناسور کٹ چکا ہے اور اس کے سیاسی اغراض موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں، دیکھو اس میں غفلت نہ کرنا، میں خود تمہارے ساتھ قید و بند کی آواز کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہوں، حضورؐ کی محبت ہی اصل دین ہے۔"

حضرت میاں صاحب قبلہ نے آغا صاحب کو ایک نہایت خوبصورت قالینی مصلیٰ اور اوڑھنے کے لیے چھپی ہوئی چادر عنایت فرمائی، راقم کو بھی ایک مصلیٰ سے نوازا، ہم نے آپ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا، اور دعاؤں سے اپنے دامن کو بھرتے ہوئے بہاولپور کے لیے روانہ ہوتے، اس عظیم اور مختصر صحبت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے قریب ہو کر دیکھا اللہ والے کیا ہوتے ہیں اور جو لوگ ان سے قریب نہیں ہوتے وہ قلبی اعتبار سے ویرانے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

خیرپور ٹامیوالی

ہم بہاولپور سے موٹر میں خیرپور ٹامیوالی پہنچے، اس چالیس میل کے سفر میں بہاولپور کی زمینوں کو دیکھا، افسوس بھی ہوا، اور خوشی بھی۔ آخر ہمارے حکمران بہاولپور سے انصاف کیوں نہیں کرتے، ہمارا ملک فی الواقع ایک عظیم ملک ہے لیکن ہم اس سے مخلص نہیں، ورنہ اس کے دامن میں ہمارے لیے سب کچھ ہے محب گرامی سید عبدالستار شاہ ہمدانی کی شادی میں شریک ہو کر ہم نے انتہائی خوشی محسوس کی — خیرپور ایک راسخ العقیدہ اور دین کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک صاف ستھرا قصبہ ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اسلام سے بے پناہ شیفتگی رکھتے ہیں، ہم نے طاہر گیلانی کے ڈیرے میں قیام کیا۔ طاہر صاحب نے فارسی میں ایم اے کیا اور پنجاب بھر میں اول آئے۔ اب لاء میں داخلہ لیا ہے، نہایت خوش اخلاق نوجوان ہیں۔ کئی ایک مخلص و مستعد نوجوانوں سے ملاقات ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ ان سب کا جذبہ مخلصانہ اور صادقانہ تھا، ایک کاغذ پر ان سب کے اسمائے گرامی نوٹ کئے تھے۔ وہ کاغذ بے احتیاطی سے کہیں کھو گیا، بہرحال ان نوجوانوں کی یاد اور ان کے چہرے آغا صاحب کے دل و دماغ میں محفوظ ہیں، ان نوجوانوں کے اخلاص کا یہ حال تھا کہ آغا صاحب کی تقریر سننے کے لیے بہاولپور پہنچ گئے۔

آغا صاحب نے اگلے روز محب گرامی سید ہمدانی کے ڈیرے پر احباب کے زبردست اصرار پر ایک دوستانہ مجلس کو خطاب کیا، تقریباً ایک ہزار احباب جمع تھے، آغا صاحب نے بعض تاریخی، علمی، ادبی اور سیاسی نکات پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی۔ محترم سید عبدالستار ہمدانی نے سپاسنامہ پیش کیا، اس قصبہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ۲۵ ہزار کے لگ بھگ آبادی ہے لیکن ہر جماعت کے ارکان آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں، اس شادی میں کالعدم نیشنل عوامی پارٹی، پیپلز پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں کے سبھی عہدیدار شریک تھے اور سب ایک کنبے کے افراد کی طرح بے تکلف، یہی ایک علاقہ ہے، جہاں سیاسی وابستگیوں کے باعث کوئی باہمی خلش یا باہمی آویزش نہیں ہے۔

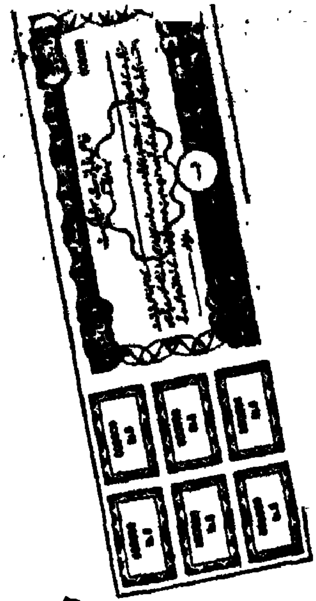
بہاولپور میں

محب گرامی سید عبدالستار شاہ ہمدانی کے اخلاص کا یہ حال تھا کہ وہ شادی کے باوجود آغا صاحب کے ساتھ بہاولپور تک آئے اور انہیں گاڑی پر سوار کرا کے ۲ بجے شب واپس آ گئے

ہم نے بہاولپور میں سردار محمد اسلم ایڈووکیٹ کے ہاں قیام کیا، انہوں نے کئی ایک علماء اور وکلاء کو مدعو کیا جن سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ آغا صاحب نے اپنی دیرینہ دوستی کے باعث علامہ ارشد اور میاں نظام الدین حیدر سے ملنا چاہا، معلوم ہوا کہ وہ لاہور میں ہیں، جن احباب سے ملاقات ہوئی ان میں علماء بھی تھے، وکلاء بھی، ادباء بھی، شعراء بھی، صحافی بھی۔ روزنامہ سیادت کے نوجوان ایڈیٹر سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی، محترم محمد حسین چغتائی اور کئی ایک دوستوں نے آغا صاحب کی آمد کا پتہ لگا کر جامع مسجد میں ان کی تقریر کا اعلان کر دیا۔

آغا صاحب نے عذر و انکار کیا، کہ میں پانچ چھ گھنٹے کے لیے بہاولپور آیا ہوں، اور رات گیارہ بجے مجھے گاڑی پر سوار ہو کر لاہور جانا ہے تقریر کب ہو اور کیونکر ہو؟ لیکن تمام دوستوں نے اصرار کیا کہ ٹھیک نو بجے تقریر شروع کیجیے اور ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ختم کر ڈالیے یہی کافی ہے، لوگ آپ کو دیکھنے کے مشتاق ہیں، کیونکہ آپ بیس بائیس برس پہلے حسین شہید سہروردی کے ساتھ آئے تھے، اب پرانے لوگ آپ کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا ظفر علی خان کی یادگار سمجھ کر ایک نظر دیکھ لینے کی بے تابانہ خواہش رکھتے ہیں، آغا صاحب جمعیۃ علماء اسلام کے مقامی صدر کی دعوت عشائیہ سے فارغ ہو کر ٹھیک ۹ بجے جامع مسجد پہنچے تو اس وقت کل پانچسو آدمی تھے، پھر دس منٹ میں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو حد نگاہ تک انسانوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا — آغا صاحب نے بیماری کے باعث کرسی پر بیٹھ کر پچانوے منٹ تقریر کی، آپ نے ملکی سیاست اور بین الاقوامی حالات پر معنی خیز تبصرہ کیا بالآخر قادیانی امت کو مشورہ دیا کہ وہ نیشنل اسمبلی کے فیصلے کو قبول کریں، یہ فیصلہ کسی ایک جماعت نے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)



کم مدّت میں زیادہ منافع کے لئے

خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

خاص ڈپازٹ اکاؤنٹ

صرف ۶ ماہ کے لئے جمع کی ہوئی رقم پر بھی

فیصد سالانہ

بلا ٹیکس منافع لیجئے

ہر شخص پچھتّر ہزار روپے تک لگا سکتا ہے

تحریر ———— الحاج شیخ منیر الدین
احمد فوڈ انڈسٹریز کراچی

قومی ملکیت

قسط (۳)

○ ایک تصور ○ ایک تحریک ○ ایک منصوبہ

مذہب کی حقیقت اور اس کا مقصد

مذہب کے مقصد کے بارے میں اشتراکیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام مذاہب جو دنیا میں وجود پذیر ہوئے ان سب کا کم و بیش ایک ہی مقصد ہے اور جیسے ہی وہ مقصد سمجھ میں آتا ہے مذہب کی حقیقت بھی ذہن پر روشن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ خود کارل مارکس مذہب کا اصل مقصد یہ بتاتا ہے کہ لوگ مذہب اس لئے گھڑتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے انسان کے احساس اور شعور کو بالکل شل اور بیکار کر دیا جائے تاکہ وہ زندگی کی تمام ذہنی اور جسمانی تکالیف کو برداشت کر سکے اور اس دھوکے میں مبتلا رہے کہ اسے ان تمام تکالیف اور مصائب کے بدلے میں آخرت کی زندگی میں بڑی لذتیں اور راحتیں میسر آ جائیں گی۔

مذہب ایک پینک اور ایک افیون ہے

معاشرے میں مخالف طبقات کے درمیان جو اضطراب اور بے چینی فطرتاً پائی جاتی ہے۔ مذہب اس آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ غریبوں کو غضبناک ہونے کی بجائے یہ سمجھاتا ہے کہ غربت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے بدلے میں تمہیں ایک دن جنت مل جائے گی۔ ساتھ ہی امیروں کو بھی تھوڑی بہت خیرات دینے کی مصلحت اور ضرورت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اس طرح در اصل مذہب اپنے زمانے میں قائم شدہ معاشی نظام کے لئے جواز بھی فراہم کرتا ہے اور اس کو استقلال بھی بخشتا ہے تاکہ مظلوم عوام کے استحصال کے لئے ایک سازگار ماحول مہیا ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں وہ مذہب کو عوام کے حق میں ایک ایسی افیون قرار دیتا ہے جس کے ذریعہ سے ان کے دماغوں کو بالکل ماؤف و مدہوش کر دیا جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتے کہ دنیا اور زندگی کی اصل حقیقت سے آشنا ہو سکیں۔ اپنے ایک مضمون میں مارکس اس طرح رقم طراز ہے کہ:

"مذہب مظلوم مخلوق کی ٹھنڈی آہ، ظالم اور سنگدل دنیا کا ایک احساس اور زندگی کے مردہ اور بے جان حالات میں ایک موہوم سہارا ہے۔ حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ عوام کے لیے ایک پینک اور ایک افیون ہے۔"
(منتخب مضامین از کارل مارکس)

مذہبی افیون کے مختلف مراحل

کارل مارکس کے اس عقیدے پر کہ "مذہب ایک افیون ہے"، اشتراکیت کے دوسرے تمام فکری راہنماؤں نے اپنی اپنی ہمت اور صلاحیت کے بقدر علمی اور منطقی تائید فراہم کرنے کی کوششیں تو کی ہیں لیکن مارکس کے خیالات کے ساتھ جوشِ عقیدت میں وہ اس درجہ بہک گئے کہ عقل اور منطق کا سررشتہ ان کے ہاتھ ہی نہ آ سکا۔ ان سب کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب تین وجوہ کی بنا پر افیون ہے۔

۱۔ سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ مذہب امیروں کو ان کے حقوق کی تلقین کرتا ہے۔ اس طرح وہ امیروں کے عزائم کو مزید تقویت فراہم کرتا ہے تاکہ وہ غریبوں کا استحصال کرتے رہیں۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مذہب غریبوں کو ان فرائض کی تعلیم دیتا ہے جو انہیں حکمران طبقے کے لیے ادا کرنے چاہییں۔ اس طرح وہ امیروں کے ہاتھوں ان کا استحصال کئے جانے میں مزید اعانت کرتا ہے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مذہب اپنی فطرت ہی کے اعتبار سے انسان کی ہر اس سرگرمی کا مخالف اور اس کو مٹا دینے والا ہے جو سرگرمی وہ اپنی معاشی بہتری کے لیے اختیار کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ

پہلے مرحلے میں مذہب جو امیروں کو ان کے حقوق کی تلقین کرتا ہے تو در اصل اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ امیروں کے اس عقیدے کو مزید پختگی عطا کرے کہ وہ غریب عوام کا استحصال کرنے میں حق بجانب ہیں۔ چنانچہ لینن اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

"جو لوگ دوسروں کی محنت کے پھل چھین کر اپنی زندگی کو خوشحال بناتے ہیں، مذہب انھیں یہ سکھاتا ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں کچھ خیر خیرات کرتے رہیں۔ اس طرح وہ انھیں ان کی پوری استحصالی زندگی کے لئے ایک اسنادِ جواز فراہم کر دیتا

ہے اور ایک مناسب قیمت پر انہیں جنت کا ٹکٹ بھی دے دیتا ہے۔" "لینن"

اینگلز کا اس ضمن میں یہ ہے کہ:

"مذہب حکمران طبقوں کی ایک مستقل جاگیر ہے جس میں کوئی دوسرا قدم نہیں رکھ سکتا۔ پھر یہ طبقے اس کو اپنی حکومت کے وسائل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تاکہ پسماندہ طبقوں کو ان کی حدود میں رکھا جائے۔"

"اینگلز"

بخارین ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ:

"عہد ماضی ہو یا زمانہ حال، مذہب ہر دور میں اہل ظلم کے لیے ایک موثر ہتھیار اور ایک طاقتور وسیلہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ وہ محنت کش عوام کو عدم مساوات، استحصال اور غلامانہ اطاعت کا خوگر بنائے رکھے۔" "بخارین"

دوسرا مرحلہ

۲۔ دوسرے مرحلے میں مذہب غریبوں کیلئے ذہنیت کی افیون ہے کہ وہ انہیں حکمران طبقے کی راہ میں فرائض ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر لاسکی اس طرح کرتا ہے کہ:

"مذہب کا اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ غریبوں میں اس بات کا حوصلہ پیدا کر دے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کی زبوں حالی پر قانع رہیں اور جتنی مصیبتیں بھی ان پر پڑیں انہیں پامردی کے ساتھ برداشت کریں تاکہ اس کے نتیجے میں انہیں آخرت کی زندگی میں بہترین اجر حاصل ہو سکے، اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہب انہیں اس بات کی تلقین بھی کرتا ہے کہ ان کے حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا

ہفت روزہ چٹان لاہور

ہے اور انہیں جملہ اختیارات بھی اللہ تعالیٰ ہی نے دیئے ہیں اس لیے ایسے حکمرانوں کی عدول حکمی یا ان کی مخالفت بہت بڑا گناہ ہے اور ان کے خلاف بغاوت کرنا تو گویا بدترین قسم کا کفر ہے۔" "پروفیسر لاسکی"

آگے چل کر مذہب کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے لینن اپنے اس عقیدے کا انکشاف کرتا ہے کہ:

"مذہب ایک طرح کا روحانی نشہ یا پینک ہے اور ایسی سخت پینک ہے کہ اس میں مبتلا ہو جانے کے بعد سرمایہ داری کے غلام اپنا سب کچھ اسی میں غرق کر دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی انسانیت اور بہتر زندگی بسر کرنے کی جائز تمناؤں کو بھی اسی پینک میں ڈبو دیتے ہیں۔" "لینن"

پھر یہی لینن دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کے عقیدۂ آخرت پر تنقید کرتے ہوئے اس طرح اظہار خیال کرتا ہے کہ:

"مظلوم طبقے اور تمام وہ لوگ جن کا استحصال کیا جاتا ہے جب اپنے ظالموں اور استحصال کرنے والوں کے خلاف جد وجہد کرتے کرتے عاجز آ جاتے ہیں اور کامیابی کا کوئی امکان اپنے بس میں نہ پا کر مایوس ہوتے ہیں تو اس بیچارگی کے عالم میں ان کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ جنم لیتا ہے اور وہ اس کے سہارے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں بہتر زندگی حاصل ہو جائیگی۔ جدید دور کے ان مظلوموں کی یہ صورتحال دورِ قدیم کے ان وحشیوں کے بالکل مماثل ہوتی ہے جو عالم فطرت کی قہرمانیوں کے خلاف جب عاجز ہو جاتے تھے تو معجزات، روح، شیاطین، معبودوں اور خداؤں پر یقین کرنے لگتے تھے۔"

"لینن"

اشتراکیت کے ایک اور شارح یاروسلاویسکی کا عقیدہ اس ضمن میں یہ ہے کہ:

"کوئی بھی معاشرہ جو طبقات میں منقسم ہو اور جس میں ایک جانب مظلوم، ستم رسیدہ اور وہ لوگ ہوں جن کا استحصال کیا گیا ہو اور دوسری جانب استحصال کرنے والے ظالم اور جابر لوگ ہوں تو ایسے معاشرے میں مذہب اور اس کے اکابر، ماضی اور حال، ہر زمانے میں ظلم اور استبداد کے سب سے بڑے پشت پناہ ہوتے ہیں۔"

"یاروسلاویسکی"

تیسرا مرحلہ

۳۔ تیسرے مرحلے میں مذہب عوام کے لیے اس لیے افیون ہے کہ وہ انسان کو ایک ایسے فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر قانع ہو جائے اور جس حال میں بھی ہو راضی برضا رہے۔ اس کی وضاحت میتھو نے اس طرح کی ہے کہ:

"مذہب انسان کو بالکل مجہول، معطل اور سہل پسند بنا دیتا ہے کہ زندگی خواہ کتنی ہی اجاڑ اور ویران کیوں نہ ہو اسے بہتری کے لیے کوئی سعی نہیں کرنا چاہیئے۔ اس ذہنیت کی مجہولیت اور تعطل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ جد وجہد اور بہتری کے لیے عمل کرنا مشیت ایزدی میں مداخلت کے مترادف ہے چنانچہ انسان کو جس قسم کی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے ان میں نمایاں طور پر صبر و قناعت، عجز و انکسار، رحم و کرم، ایثار و ہمدردی، عفو و درگزر، فیاضی، فروتنی، حسن سلوک اور خود اپنی ذات اور سچائی جیسے اوصاف شامل ہیں۔ الغرض مذہب کا جو آئیڈیل راہبر ہے

۲۵ مئی ۸۵ء

تصور ان کے سامنے رکھ جاتا ہے اسے سب سے بہتر طور پر انجیل میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"اگر کوئی تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے تو اپنا بایاں گال بھی پیش کر دے"

"میتھیو"

میتھیو کی اس وضاحت کی تصدیق خود لینن کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:

"غربت و افلاس کی بھٹی میں سسکتے رہ کر جو لوگ اپنی تمام عمر محنت و مشقت میں گذار دیتے ہیں، مذہب انھیں یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں اپنی اس زبوں حالی پر قانع رہیں تو انھیں اس کا بہترین بدلہ جنت میں مل جائے گا۔ یہ ہے وہ جھوٹی تسلی اور گھناؤنا فریب جو مذہب انسان کو دیتا ہے۔"

"لینن"

منفرد مثال

یہ ہیں وہ توضیحات و تفاسیر کارل مارکس کے عقیدے کی کہ مذہب ایک چینک اور افیون ہے لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے دنیا کو اس افیون سے نجات دلانا چاہیئے۔ لیکن اشتراکیت کے جن فکری سرچشموں نے مارکس کے اس عقیدے پر تعریف و تائید کے حاشیے چڑھائے ہیں اور ایک مہمل تخیل میں معنی بھرنے کی کوششیں کی ہیں ان میں غالباً میتھیو اس بات میں منفرد ہے کہ اس نے مذہبی لٹریچر کے عظیم انسانی ذخیرے میں سے کم از کم انجیل مقدس کی ایک آیت کا حوالہ دینے کی جسارت تو کی اس نے اسے اگرچہ بالکل غلط استعمال کیا ہے [illegible]

[illegible]

تائید میں تاریخ کا کوئی حوالہ نہ دے سکے۔

اصل تاریخی حقیقت

یہ پہلا موقع ہے کہ میتھیو ایک حوالے کے ساتھ اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا ہے اور مذہب کو مجہول اور معطل کر دینے والی چینک ثابت کرنے کے لیے ایک مذہبی کتاب کو درمیان میں لایا ہے۔ اس لئے ہم یہاں اتنا عرض کر دینے کی رخصت چاہیں گے کہ میتھیو اور اس کے حواریین کے پاس چونکہ اخلاق کا کوئی تصور نہیں ہے اس لئے وہ انجیل مقدس کے اصل مقصد کو نہ پا سکے۔ بہرحال اگر وہ مطالعہ کی زحمت گوارا فرما لیتے تو یہاں وہ دینی لٹریچر بھی موجود ہے جو تھپڑ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال پیش کر دینے کی بجائے ظالم کے ہاتھ سے ظلم کی سکت چھین لینے کی تعلیم بھی دیتا ہے اور جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت توڑ دینے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور صرف نرم و شیریں باتیں ہی نہیں سکھاتا بلکہ اپنے پیروؤں کے ہاتھ میں تلوار بھی دے دیتا ہے۔ نیکی کو قائم کرنے اور برائی کو مٹا دینے کا حکم دیتا ہے اور اس کے لیے اپنے بچہ بچہ کو میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ظالموں کا خون بہانے اور ان کے خون سے زمین کو رنگین کر ڈالنے کو افضل ترین عبادت قرار دیتا ہے اور ایسے معرکے میں اپنی جان دے دینے کو شہادت کا رتبہ عطا کرتا ہے۔

یہاں غار و کوہ میں جا بیٹھنے، تپسیا کرنے اور اپنے قوائے عملی کو شل کر لینے کی چینک نہیں پلائی جاتی بلکہ دنیا کے شاہوں، شہنشاہوں، جابر فرمانرواؤں اور دوسرے تمام کار پردازانِ عالم سے ان کے اچھے یا برے اعمال کا احتساب کیا جاتا ہے۔ مغرور قیصروں کی پیشانیوں کے تاج ٹھوکروں سے روند دیئے جاتے ہیں۔ مظالم داروں اور بے بنیاد کرداروں کے تخت الٹ دیئے جاتے ہیں۔ مظلوم طبقہ بے کس انسانیت کو جو روستم کی بھٹی سے نکالا جاتا ہے۔ کسریٰ اور کسانوں کی جگہ زمامِ اقتدار ہاتھ میں لی جاتی ہے۔ بے لاگ انصاف کیا جاتا ہے اور چھنے ہوئے حقوق واپس دلائے جاتے ہیں۔

مارکس، اینگلز، لینن اور میتھیو تاریخ کے نام پر دھوکے اور فریب کا دھندا کرنے کی بجائے اگر خلوصِ نیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کر لیتے تو مذہب کے خلاف بغض و عناد رکھنے کے باوجود کم از کم ایسی بے سروپا باتیں تو نہ لکھتے اور ارباب علم و فضل کی نگاہوں میں جو رسوائی اٹھائی ہے اس سے تو کسی قدر بچ جاتے۔

مذہب کا مستقبل

مارکس نے مذہب پر چینک اور افیون کی جو تہمت تراشی ہے اس کی پذیرائی میں اشتراکیت کے نظامِ فکر میں مذہب کے مستقبل اور اس کے مفروضہ انجام کے بارے میں بھی کچھ عقائد شامل کئے گئے ہیں تاکہ ہر اشتراکی ان مفروضات پر ایمان و یقین رکھتے ہوئے اشتراکیت کے پروگرام پر عمل پیرا ہو سکے۔ لہٰذا اشتراکی نقطۂ نگاہ سے مذہب کی حقیقت اور اس کے مقصد کا جائزہ لے چکنے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ مذہب کے مستقبل کے بارے میں اشتراکیوں کا عقیدہ اور منصوبہ کیا ہے؟ اور سرکاری طور پر عملاً اشتراکیت نے مذہب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ہے؟

جہاں تک مذہب کے مستقبل کا سوال ہے تو اشتراکیت اس بارے میں واضح طور پر یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ مذہب عوام کے استحصال کا ایک لازمی پرتو ہے۔ چنانچہ فطری طور پر یہ پرتو، بھی معاشرے میں اس وقت باقی رہے گا جب تک اصل استحصال موجود ہے گویا جب تک انسان ظلم اور استحصال کا نخچیر رہے گا اس وقت تک اسے مذہب کی افیون کی ضرورت لاحق رہے گی تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ حقیقت سے فرار حاصل کر سکے۔ مسرت اور آرام اگر انسان اس دنیا میں حاصل نہ کر سکے تو کم از کم اس کو اتنا یقین ہی دلا دیا جائے کہ اسے دوسری دنیا میں یہ چیزیں مل جائیں گی۔

انتقادیات

تبصرہ کے لئے
دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

اردو نامہ کراچی (خصوصی شمارہ)

ایڈیٹر : شان الحق حقی

ناشر: ترقی اردو بورڈ۔ کراچی

کچھ دنوں پہلے تک تین علمی و تحقیقی مجلے تھے۔ صحیفہ لاہور، اردو کراچی اور اردو نامہ کراچی۔ صحیفہ بعض افراد کی الم ٹپ پالیسی کی نذر ہو گیا۔ وہ علم و تحقیق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اب محض نام رہ گیا۔ اردو نامہ زندہ ہے اور علم و تحقیق کی زندگی کی تمام علامتوں کے ساتھ زندہ ہے۔ وہ اپنے مواد کی افادیت اور علمی معیار کے لحاظ سے پاکستان کا واحد پرچہ رہ گیا ہے جو گزشتہ تقریباً پندرہ سال سے پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ ترقی اردو بورڈ کا ترجمان ہونے کی حیثیت سے اس کے مضامین و مباحث کا اولین دائرہ لغات و لسانیات اور اس کے متعلقات رہے ہیں لیکن زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کے دوسرے گوشوں میں بھی اس کی خدمات وقیع ہیں۔

زیر نظر شمارہ اس کا پچاسواں نمبر ہے اور ادب، تنقید، ثقافت، شخصیات، سوانح، لسانیات، لغت وغیرہ موضوعات اور ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کے تذکرے میں ۲۵ مضامین پر مشتمل ہے۔ لکھنے والوں میں پاکستان کے بہترین اہل قلم شریک ہیں۔ ان میں عبدالرحمان چغتائی مرحوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، وقار احمد رضوی، ابو سلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر زمان فتح پوری، پیر علی محمد راشدی، آغا افتخار حسین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصی شماروں میں عام طور پر فرمائشی مضامین ہوتے ہیں لیکن اس میں ہر لکھنے والے نے فرمائشی موضوع کے بجائے اپنے پسندیدہ اور تحقیقی موضوع پر لکھا ہے اس لئے ہر مضمون کا علمی معیار بلند ہے۔ مراسلہ نگاروں تک میں ماہر القادری جیسے اہل قلم موجود ہیں اس لئے ان کی افادیت کا بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

گوشہ ممتاز حسن کے سوا تمام مضامین ٹائپ میں ہیں۔ طباعت اچھی اور کاغذ سفید ہے۔ تقریباً چھ سو صفحوں کے استنے اچھے مجلے کی قیمت ۱۲ روپیہ کم سے کم زیادہ نہیں۔

غزل (مجموعہ کلام)

شاعر: سیفی اکبرآبادی

مقام اشاعت: محمد ۲۸/۳ ماڈل کالونی۔ کراچی ۲۷

سیفی اکبرآبادی کا شمار کراچی کے چند اچھے نوجوان شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام اور شخصیت ہر دو لحاظ سے پسند کئے جانے والے شاعروں میں شامل ہیں۔ ان میں اساتذہ کی سی رعنائی فکر اور ندرت کلام تو تلاش نہیں کرنی چاہیئے لیکن ان کی عمر اور مشق کی مدت کو دیکھتے ہوئے ان کے کلام میں بیان کی رنگینی اور فکر کی رعنائی و تنوع کی سطح اس سے بہت بلند ہے جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی مشق جاری رکھی اور اساتذہ کے کلام کا کثرت سے مطالعہ کیا تو وہ بہت جلد صف اول کے شعرا میں اپنی جگہ بنا لیں گے۔ بہتر ہوتا کہ مجموعہ کلام کا نام کچھ اور ہوتا۔ بڑے سائز پر دو سو اسی صفحوں کی قیمت سات روپے مناسب ہے۔

سوج نسیم

شاعرہ: وحیدہ نسیم

ناشر: غضنفر اکیڈمی۔ کراچی ۴/-

وحیدہ نسیم صاحبہ پاکستان کی چند بہترین اور صف اول کی شاعرات میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان و بیان اور اسلوب و فکر کی تمام شاعرانہ خوبیاں اور ذوق و نظر کو تسکین دینے والے محاسن موجود ہیں۔ ان کے شاعرانہ مقام کے بارے میں جوش ملیح آبادی کا یہ اعتراف موجود ہے کہ وہ شاعرات میں سے ایک ہیں۔ شعر و ادب میں اپنا کوئی مستقل اور وقت کی پیشانی پر ہمیشہ دمکنے والا نقش چھوڑتی ہیں۔ تبصرہ نگار اپنے گوشہ عزلت سے کبھی نکلا نہیں اور کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکا اس لیے اس نے ڈ شاعرہ کو دیکھا نہ اس سے ملا صرف کلام کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے حسن کلام کا معترف ہے۔ جوش صاحب نے تعارف میں انہیں خرق عادت کا ایک قابل قدر نمونہ اور نجابات کی معزہ لکھا ہے۔ اس لیے انہیں دیکھ لینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ وحیدہ نسیم ایک اچھی شاعرہ کے علاوہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور ناول نویس بھی ہیں۔ انہوں نے بہت سے خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔ سوج نسیم کی کتابت، طباعت، کاغذ ہر چیز عمدہ ہے۔ کتاب مجلد، سرورق خوبصورت اور قیمت چودہ روپے ہے۔

افغانستان میں

- تخریبی تحریکیں ہر طرح کے وسائل و اسباب سے لیس ہیں
- اسلامی تحریک تہی دست اور تشدد و تعذیب کا شکار ہے

> یہ مضمون عربی ماہنامہ الغرباء کے شمارہ فروری ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے، جو لندن سے مسلم سٹوڈنٹ سوسائٹی کے زیر اہتمام نکلتا ہے۔ مضمون نگار افغانستان کا ایک نوجوان ہے جس کا نام الغرباء میں شائع نہیں کیا گیا تاکہ اس کے ملک میں اس کی شامت نہ آجائے۔ (غ ن)

افغانستان میں اسلامی تحریک پہلی مرتبہ ۱۹۶۸ء میں منظم طور پر کھلم کھلا منظر عام پر آئی۔ اس نے کابل یونیورسٹی کو اپنی تگ و تاز کا بنیادی مرکز قرار دیا۔ "شبنامہ جہاد" کے عنوان سے اس نے اپنا سب سے پہلا منشور جاری کیا۔ یہ منشور عوام الناس میں اور علی الخصوص یونیورسٹی کے نوجوان طلبا میں خفیہ طریقے سے تقسیم کیا گیا۔ اس میں تحریک کے اغراض و مقاصد اور اسے قائم کرنے کے وجوہ اور دعوت کے اصول و اسالیب بیان کئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان بالعموم اور طلبہ کے حلقے بالخصوص بائیں بازو کی تحریکوں اور شور شوں سے لرز رہے تھے۔ ان تحریکوں نے صرف جامعہ کابل ہی کو نہیں تمام تعلیمی اداروں کو اپنی تخریب کاریوں کی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ اُن دنوں طلبا کی طرف سے جتنے مظاہرے کئے جا رہے تھے اور جو کچھ مہمیں چلائی جا رہی تھیں ان کی قیادت انہی بائیں بازو کی تحریکوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور جامعہ کابل اور افغانستان کے تمام مدارس میں ہر نوع کی سرگرمیوں پر ان کا مکمل قبضہ تھا کوئی بھی گروہ یا ادارہ یہ ہمت نہ پا رہا تھا کہ اس سیلاب بلا کو روکے جو کچھ وہ تحریکیں چاہتی تھیں بلا روک ٹوک اسے نافذ کر رہی تھیں۔ اُن کے پاس ماسکو سے، پیکنگ سے، مشرقی جرمنی سے اور دوسرے اشتراکی ممالک سے ڈھیروں لٹریچر پہنچ رہا تھا اور وہ اسے دیہی بیمانے پر نوجوانوں کے اندر پھیلا رہی تھیں اور بھرپور طریقے سے نسل نو کے ذہن و فکر کو مسموم کر رہی تھیں۔ ان کے پاس جملہ مادی اور مالی وسائل بے پناہ حد تک موجود تھے، پروپیگنڈے کے اثرات اور مال و زر کی چمک دمک سے کمزور ایمان اور ضعیف اخلاص کے لوگ اور مال و جاہ کے بھوکے کثیر تعداد میں ان تحریکوں میں شامل ہوتے چلے گئے۔ حالت یہ ہوگئی کہ کوئی بھی مخالف رجحان اُن کے سامنے دم نہ مار رہا تھا۔ اور علی الخصوص طلباء کے حلقوں میں کوئی آواز اُن کے آگے نہ اٹھ سکتی تھی۔

ان حالات میں اسلامی تحریک کے نوجوان اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان میں اتر آئے۔ اُن کی زبان پر صرف ایک فقرہ تھا اور وہ یہ تھا "حسبنا اللہ ونعم الوکیل" تحریک کے ابتدائی ایام میں جن لوگوں نے اس میں کسی حیثیت سے حصہ لیا ان کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے متجاوز نہ تھی۔ ان دنوں بائیں بازو کی تحریکیں اپنی قوت کی بھرپور نمائش کر رہی تھیں اور موقع بے موقع جلوس نکال رہی تھیں۔ اسلامی تحریک نے بھی پہلی مرتبہ ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء کو ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ جلوس نکالنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ شرکائے جلوس نے جو چیز اٹھا رکھی تھی وہ ایک سبز کپڑا تھا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ یہ جلوس دوسرے جلوسوں اور جلسوں سے الگ ایک جگہ جا کر کھڑا ہوگیا اور دوسرے جلوسوں کے لاؤڈ اسپیکروں کی گونج اور بائیں بازو کے لیڈروں کے حق میں تالیاں بجانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے شور و غل میں اسلامی تحریک کے مظاہرے کی یہ پہلی صدا نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہ تھی۔

چنانچہ نوجوان اس ضعیف مظاہرے پر پھبتیاں اڑاتے رہے اور طرح طرح کے آوازے کستے رہے لیکن تحریک اس طرح کی باتوں سے قطعاً متاثر نہ ہوئی اور اس نے مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس روز بائیں بازو کے لوگ کوئی مظاہرے کرتے اسی روز اسلامی تحریک کی طرف سے بھی اسلامی جذبات کے اظہار کے لئے جلوس نکال دیا جاتا۔ یوں یہ تحریک روز بروز طاقتور ہوتی گئی اور آخر وہ دن آگیا جب یہ نہ صرف جامعہ کابل میں بلکہ جامعہ کے باہر بھی ایک بڑی طاقت بن گئی۔ بائیں بازو کے لوگ اپنے تمام وسائل لے کر اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ مختلف حکومتیں ان کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی تمام کاوشیں ناکام ہوتی رہیں۔ اسلامی تحریک جامعہ کابل پر بھی چھا گئی، دوسرے مدارس اور اداروں پر بھی اس کو غلبہ حاصل ہوگیا، اور اس نے مختصر سے عرصہ میں عوام کے دلوں کے اندر بھی گھر کر لیا۔ ۱۹۷۲ء میں جامعہ کابل کے اندر یونین کے جو انتخابات ہوئے ان میں اسلامی تحریک نے بڑے بڑے حریفوں کو چت کر دیا اور پچاس نشستوں میں سے چالیس نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال کی بات ہے کہ افغانستان پولیس نے جامع پل خشتی کے علماء پر

۵ مئی ۷۵ء

ہفت روزہ چٹان لاہور

حملہ کیا۔ انہیں جامعہ سے باہر نکال دیا اور جامعہ کو پولیس سنٹر میں تبدیل کر دیا۔ افغانستان کی حکومت نے اس قضیہ میں سخت تغافل برتا۔ اسلامی تحریک کے نزدیک یہ ایک خالص مذہبی مسئلہ تھا چنانچہ تحریک نے پولیس کی زیادتی اور حکومت کی سردمہری کے خلاف کابل میں ایک زبردست مظاہرہ کیا جس میں دس ہزار سے زائد نوجوان شریک ہوئے۔ اس مظاہرے نے حکمرانوں پہ یہ ثابت کر دیا کہ افغانستان کے نوجوانوں کی اکثریت اسلام کی شیدائی ہے اور کمیونزم اور الحاد کے داعی محض بیرونی طاقتوں کی شہ پر افغانستان میں خلفشار برپا کر رہے ہیں۔

اسلامی تحریک اپنی دعوت و تبلیغ اور اصلاح فکر و نظر کے لیے جن کتابوں سے زیادہ تر استفادہ کرتی رہی وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، استاذ شہید قطب اور محمد قطب اور بعض دیگر اسلامی رہنماؤں کی تصانیف ہیں۔ تحریک کے فعال ارکان کی تعداد اس وقت ایک ہزار سے زائد ہے۔ رہے حامی اور مددگار تو وہ بحمد اللہ ہزار ہا کی تعداد میں ہیں۔ تحریک کا رسمی نام "حرکت نوجوانان اسلام" ہے البتہ بائیں بازو کے عناصر اور خود حکومت کے لوگ بھی اس تحریک کو "اخوان المسلمون" کے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد تحریک کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے کی ترویج ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تحریک ہمیشہ اخوان المسلمون اور دوسری اسلامی تحریکوں کی حمایت میں آواز اٹھاتی رہی ہے اور خاص طور پر اخوان المسلمون کے خلاف جو غلط پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے اس کی تردید کرتی رہی ہے۔

افغانستان کے حالیہ داؤدی انقلاب سے پہلے اسلامی تحریک کی تمام تر توجہ نوجوانوں کی اسلامی تربیت پر مرکوز تھی۔ چنانچہ تحریک کے زیر اہتمام مسجدوں میں اور دوسری مناسب جگہوں پر حلقہ ہائے درس قائم کیے جاتے تھے۔ ان میں قرآن و حدیث اور فقہ و سیرت پر مشتمل تقریریں اور وعظ کیے جاتے تھے۔ جمعہ کے روز مختلف مسجدوں میں تحریک اپنے مقررین بھیجتی تھی جو عوام الناس کے سامنے موثر تقریریں کرتے اور انہیں دین کی پابندی کی دعوت دیتے اور ملک کے اندر کمیونزم کے نفوذ کے خطرات سے انہیں آگاہ کرتے تھے۔ تحریک کی طرف سے جگہ جگہ دار المطالعے بھی قائم کیے گئے اور پمفلٹ اور بیانات چھاپ کر بھی ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم کیے جاتے رہے! افغانستان کے اندر علمائے دین ایک بڑی طاقت رکھتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ عظیم طاقت جمود کی شکار تھی۔ تحریک نے علما سے رابطہ قائم کیا اور انہیں متحرک کیا اور ان کی اس بے پناہ مگر خفیہ طاقت کو سرگرم عمل کیا۔ چنانچہ افغانستان کے جلیل القدر اور مشہور و معروف علما کی اچھی خاصی تعداد تحریک میں شامل ہو گئی یا اس کی مؤید بن گئی۔

افغانستان کی اسلامی تحریک کا راستہ سنگین رکاوٹوں سے پٹا ہوا ہے۔ آغاز کار سے لیکر آج تک اُسے لامحدود مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کا مقابلہ اُن تخریبی تحریکوں سے ہے جو ہر طرح کے وسائل و اسباب سے لیس ہیں۔ جب کہ اسلامی تحریک تہی دست ہے اور اسباب ظاہر سے محروم ہے۔ البتہ اس کے پاس مقدس اور متزلزل نہ ہونے والے ایمان باللہ کا سرمایہ ضرور موجود ہے۔ دوسری طرف کمیونزم کے محاذ کی حالت یہ ہے کہ کیمونسٹ حلقے اپنے کارکنوں اور ایجنٹوں کو ہر طرح مال و زر سے نوازتے رہتے ہیں۔ انہیں اسلحہ دیا جاتا ہے، گشتی شفا خانے انہیں مہیا کیے جاتے ہیں، لٹریچر کی بارش کی جاتی ہے۔ اور بہت بڑی تعداد میں تعلیمی وظائف دیے جاتے ہیں۔ کیمونسٹ وزرا، اور ذمہ دار حکام اکثر افغانستان آتے رہتے ہیں اور تعلیمی وظائف سے استفادہ کرنے والے نوجوانوں کو خود منتخب کرتے ہیں۔ ان نازک اور کٹھن حالات میں اسلامی تحریک کے کارکن انتہائی جذبۂ قربانی اور فدا کاری کے ساتھ قافلۂ دعوت کو لیے بڑھ رہے ہیں۔ موجودہ انقلاب سے پہلے اسلامی تحریک بارہا آزمائشوں میں مبتلا ہوئی اور اللہ کی مدد و توفیق سے ہر بار کامیاب و کامران رہی۔

تحریک کے خلاف پے در پے سازشیں تیار کی گئیں۔ لیکن ناکام ہوتی رہیں۔ تحریک کے نوجوان متعدد مرتبہ جیلوں میں ڈالے گئے اور وہاں انہیں شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ برادر گل بدین اور سیف الدین کو قید کیا گیا۔ سید حبیب الرحمان اور مولوی حبیب الرحمٰن کو پا بجولاں کیا گیا۔ محمد کاظم اور ڈاکٹر محمد عمر اسیر زنداں ہوئے۔ الغرض اور بھی بہت سے نیک اور اسباز نوجوان اور اہل علم موجودہ انقلاب سے پیشتر قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اب بھی جیلوں میں ہیں اور ان کے ساتھ سینکڑوں ان کے حامی بھی دار و گیر کا نشانہ بن چکے ہیں۔ کچھ افراد ظلم و تشدد کا بے پناہ دور دورہ دیکھ کر ملک سے ہجرت کر گئے ہیں۔ مجملاً یہ کہ اسلامی تحریک ان دنوں جن مشکلات و مصائب کے نرغے میں ہے وہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ شدید اور سنگین ہیں۔ تحریک کے ارکان کا ملک کے گوشے گوشے میں تعاقب کیا جا رہا ہے۔ تعلیم سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ مدرسوں اور کالجوں سے ان کو نکالا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ سرکاری ملازمتوں میں تھے انہیں چن چن کر وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ جیل اور تعذیب روزانہ کا وتیرہ بن چکا ہے۔ غلام ربانی صاحب جو ایک سکول میں استاد تھے انہیں اس بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کہ انہوں نے میلاد النبیؐ کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت کے موضوع پر ایک تقریب میں تقریر کی تھی۔ ایک اور نوجوان گل محمد کو بھی اس لیے ملازمت سے چھٹی دے دی گئی کہ اس نے علی الاعلان کہا تھا کہ "اسلام مذہب بھی ہے اور سیاست بھی"۔ سید نور اللہ کو جو ایک سکول میں مدرس تھے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اور اس کے بعد انہیں دو سال قید با مشقت کی سزا اس جرم میں

دی گئی کہ انہوں نے رمضان المبارک میں ختم قرآن شریف کی رات کو مسجد میں تقریر کی تھی اور اس میں یہ کہا تھا کہ "مسلمان کا اخلاق یہ ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں رکھتا" ——— ایسے نوجوانوں کی ایک طویل فہرست ہے، جو تعلیم گاہوں سے اس جرم کی پاداش میں خارج کر دیئے گئے ہیں کہ ان کا اسلامی تحریک سے رشتہ تھا اور وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہیدؒ کی کتابیں جمع کرتے اور پڑھتے تھے۔

موجودہ ظالمانہ حکومت نے ابتدائی اسکولوں کے ننھے طلبہ پر بھی رحم نہیں کیا۔ چنانچہ بل خمری سے ایسے بارہ طلبہ کو گرفتار کیا گیا۔ اور انہیں سنٹرل جیل میں بند کر دیا گیا۔ جہاں صرف ان قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں اور جنہیں دس سال سے زیادہ عرصہ کی سزا دی جاتی ہے اسی طرح لغمان کے علاقے سے بھی ایک پرائمری اسکول کے بچے پکڑ لیے گئے اور سنٹرل جیل میں محبوس کر دیے گئے۔ ان بچوں کی عمریں دس اور گیارہ سال کے درمیان ہیں۔

تحریک کے نوجوانوں اور حامیوں کے ساتھ جیلوں میں انتہائی بدسلوکی اور تشدد و تعذیب کا رویہ برتا جا رہا ہے، انہیں جس طرح کا عذاب دیا جا رہا ہے، اس کی ہلکی سی ایک مثال یہ ہے کہ مجبور نظربندوں کے ناخنوں میں کیلیں چبھوئی جاتی ہیں، پیٹوں میں ہوا بھر دی جاتی ہے، اسے عزلی کی جاتی ہے۔ جسم کے بعض اعضا کاٹ دیئے جاتے ہیں، برقی رو کے ذریعہ اذیت دی جاتی ہے اور اس قصے کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ حکومت اسلامی تحریک کے لوگوں کے ساتھ ان جرائم کا ارتکاب کر رہی ہے اور پھر انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ کوئی ایسی خبر بیرونی دنیا کو معلوم نہ ہو۔ افغان پولیس جب کسی نوجوان کو گرفتار کرنا چاہتی ہے تو دن کے وقت اُسے گرفتار نہیں کرتی، بلکہ عین نصف شب کو پولیس کے جلاد گھروں پر حملہ کرتے ہیں جب کہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر جسے چاہتے ہیں، اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔

اسلامی تحریک نے یہ تمام مصیبتیں اور آزمائشیں بڑے صبر اور دل گردے کے ساتھ برداشت کی ہیں، اور انقلابی حکومت تحریک کو کچلنے اور نیست و نابود کرنے کے لیے جو مواقع تلاش کرتی رہی ہے، تحریک نے اُسے فراہم نہیں کیے۔ لیکن افغانستان کا صدر جب جون ۱۹۷۸ء میں روس کا دورہ کر کے واپس آیا تو اس نے آتے ہی اسلامی تحریک کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا اور اسے کلیتہً کچل دینے کا آغاز کر دیا، چنانچہ ابھی اسے دورۂ روس سے واپس آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے، کہ اس نے تحریک کے دو سو نمایاں اور فعال رہنماؤں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔

ان میں شریعت کالج کے سابق پرنسپل اور کالج کے شعبۂ حدیث کے موجودہ ڈین پروفیسر غلام محمد کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور دینی مدارس کے معلمین کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ کابل یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں پکڑ لیے گئے، یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ صرف کابل میں جو نمایاں اصحاب گرفتار کیے گئے، ان کی تعداد پچاس سے زائد ہے، دوسرے صوبوں میں پکڑ دھکڑ کا جو خونیں ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، اس کی خبریں بہت کم مل رہی ہیں، صرف تحریک کے ارکان ہی نہیں پکڑے جا رہے ہیں بلکہ جو اُن سے ملاقات کرتا ہے، اُسے بھی پکڑ لیا جاتا ہے۔ ایسے افراد بھی گرفتار کر لیے گئے ہیں جو تحریک کے گرفتار شدہ لوگوں کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ لیے گئے۔

حکومت افغانستان کی ان ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے ملک اب ایک آتش فشاں کے دہانے پر پہنچ گیا ہے، عوام الناس کے اندر حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو چکی ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اپنے آپ کو عوام کے انتقام سے بچانے کے لیے روسی ہوابازوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ یہ روسی ہواباز ضرورت پیش آنے پر اس امر سے بھی باز نہیں آئیں گے کہ بے گناہ لوگوں کے گھروں اور بستیوں پر بھی بمباری کر دیں اور عورتوں، بوڑھوں اور بچوں تک کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ برسر اقتدار گروہ کے پاس اب ٹینکوں، توپوں، ہوائی جہازوں اور روسی ماہرین کے سوا کوئی بھروسے کی بنیاد باقی نہیں رہی ہے افغان فوج بھی حالات سے سخت کبیدہ ہے اور نجات پانے کے وقت کے انتظار میں ہے لیکن روس کا نظام جاسوسی افغان فوج کی تمام حرکات و سکنات کی کڑی نگرانی کر رہا ہے، جب سے موجودہ گروہ فوجی انقلاب کے بل بوتے پر برسرِ اقتدار آیا ہے، کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا، جب فوج کے اچھے اچھے افسروں کی بھاری بھر کم تعداد کو گرفتار نہ کیا جاتا ہو۔ دو مرتبہ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ فوج کے متعدد افسران کو اسلامی تحریک سے تعلق رکھنے

نے دورۂ ماسکو کے بعد فوج کی تطہیر کی جو تحریک چلائی ہے، اُس میں آج تک سینکڑوں فوجیوں کو اسلامی تحریک سے محبت یا محض اسلام سے لگن کی پاداش میں نظر بند کیا جا چکا ہے۔

یہ مظالم رازداری کے کثیف پردے کے نیچے سرانجام دیئے جا رہے ہیں، افغانستان کے اندر اور افغانستان کے باہر اصل حقائق کو چھپایا جا رہا ہے، حکومت کے پروپگنڈے کے ناقوس ان واقعات کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے، گویا کہ کچھ ہوا تک نہیں ہے۔ افغان عوام موجودہ فاسد اور مخرب نظام کے خلاف غصے کی آگ میں جل رہے ہیں، لیکن بے بس ہیں اور مسلح تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حکومت کی پوری مشینری جاسوسی کے نظام میں تبدیل ہو چکی ہے بلکہ مرکزی ادارۂ جاسوسی کا نفوذ اور تسلط اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ملک کا پورا بجٹ وہی ہضم کیا جاتا ہے۔ وزارت داخلہ کے تحت بھی جاسوسی کا بھاری بھرکم نظام موجود ہے اور اس کے ساتھ وزارت مواصلات نے الگ جاسوسی کا نظام جاری کر رکھا ہے، ملٹری اینٹلی جنس کی زمام کار روسی ماہرین کے ہاتھ میں ہے اور وہ الگ مستقل ریاست کی شکل اختیار کر چکی ہے، یہاں تک کہ ہر کمیونسٹ وزیر نے اپنا جداگانہ جاسوسی نظام قائم کر رکھا ہے، ان تمام اداروں پر ایک غریب اور مسکین قوم کے خزانے سے بڑی فراخدلی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔

دوسری تمام وزارتیں استحصال اور فساد کے گڑھ بن چکے ہیں، علی الخصوص وزارت داخلہ، وزارت تعلیم، وزارت زراعت اور وزارت مالیات اس میں پیش پیش ہیں، نظم و نسق کی حالت نہایت ابتر ہو چکی ہے اور حکومت کا کوئی ادارہ بھی اب کارآمد نہیں رہا ہے، تمام سرکاری دفاتر میں رشوت وبائے عام کی طرح پھیل چکی ہے۔ اگر کوئی شہری کسی سرکاری ملازم کی چیرہ دستی پر اعتراض کرتا ہے تو بلا تاخیر اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، اور اُس مسکین کے رشتہ دار یہ تک نہیں پوچھ سکتے

ہفت روزہ چٹان لاہور

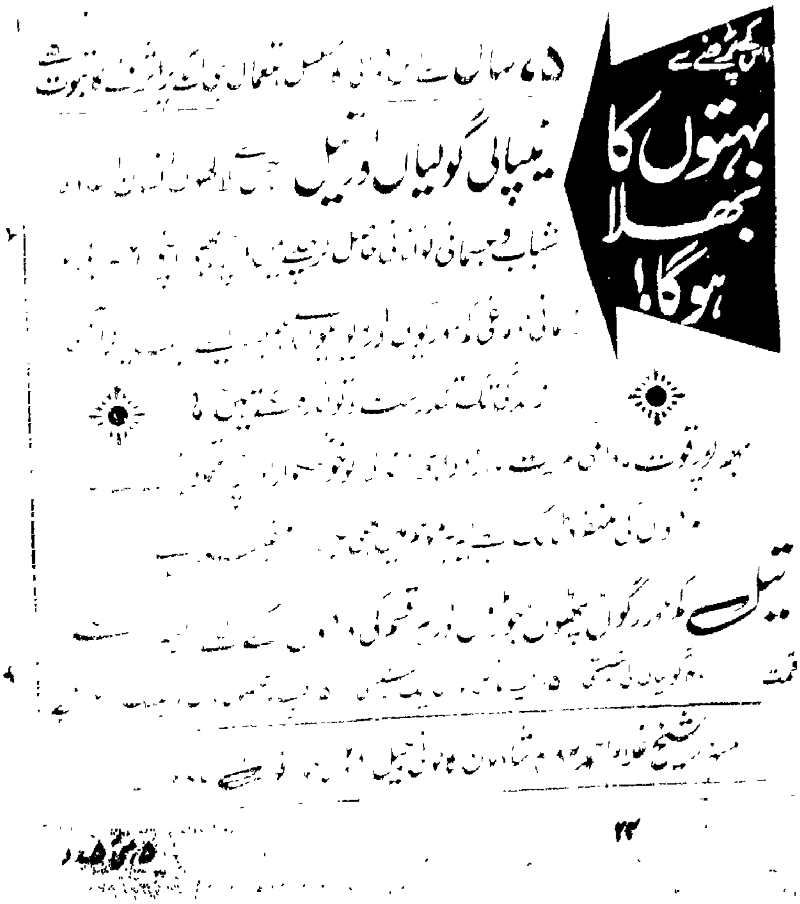
... صاحب ...

افغانستان کا صدر یہ یقین رکھتا ہے کہ لوگ اُسے سخت ناپسند کرتے ہیں، اُسے خوب معلوم ہے کہ لوگ اسے کمیونسٹ سمجھتے ہیں اور وہ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کرتا رہتا ہے کہ وہ پکا مسلمان ہے، گویا وہ اللہ اور اہل ایمان کو فریب دینا چاہتا ہے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے آپ کو خود دجل و فریب کا شکار کر رہا ہے، کئی مرتبہ وہ آپ ہی اپنی تکذیب کر چکا ہے، ایک مرتبہ اسے پولی ٹکنیک کالج سے فارغ ہونے والوں کا ایک گروہ ملا، جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ان میں اسلامی تحریک سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان بھی ہیں، تو ان سے کہنے لگا، کہ اس کا کسی تحریک سے (اشارہ کمیونسٹ تحریک کی جانب تھا) کوئی تعلق نہیں ہے، اُس کا عقیدہ اور نظریہ وہی ہے جو افغان عوام کی اکثریت کا عقیدہ اور نظریہ ہے، اس ملاقات کے بعد اُسے اسکاؤٹس کا ایک گروپ ملا، ان میں کمیونسٹ بھی تھے، اس لیے ان لوگوں سے کہنے لگا کہ اسلامی نظریات پر ایمان لانا کوئی ضروری نہیں ہے، البتہ اس ملک کے

لوگوں کو بیوقوف بنانا نہایت ضروری ہے، صدر افغانستان جب عوامی دباؤ کی شدت محسوس کرتا ہے تو اپنے مسلمان ہونے کے دعوے کرنے لگتا ہے اور جب حالات میں کچھ سکون پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اپنی گمراہی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

سردار داؤد خان اور اس کے کمیونسٹ رفقاء اپنے راستہ کا واحد روڑا اسلامی تحریک کو سمجھتے ہیں جو افغانستان میں اشتراکی نظریات کو نافذ کرنے کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماسکو سے آتے ہی اسلامی تحریک کو کچلنے کا پروگرام شروع کر دیا، اور اسلامی تحریک اس وقت موت و زیست کی جنگ لڑ رہی ہے

یہ بات واضح ہے کہ افغانستان مشرق کے اسلامی ممالک کے لیے سرخ خطرے کے مقابلے میں پہلی دفاعی لائن ہے، لہٰذا جو لوگ اس اسلامی ملک کی اہمیت و نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، ان سب حضرات سے افغانستان کی اسلامی تحریک یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اس ملک کے مسئلے سے دلچسپی لیں اور افغانستان کے نہتے مسلمانوں کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں (ترجمان القرآن)



محمد یوسف لدھیانوی

قسط (آخر)

انگریز نوازی —— حماقت یا بددیانتی؟

وہ اپنی مسیحیت کے دعویٰ
پر نسخ جہاد کا فتویٰ دیتے تھے۔ اور اس کے
مقابلہ میں کفر و ارتداد کو بھی قبول کرنے کے لیے
... رہتے، لکھتے ہیں:

"جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے، نہ مدینہ میں اور نہ سلطان روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں۔ پھر میں خود ... اپنے آرام کا دشمن بنوں۔ اگر اس سلطنت کے بارے میں کوئی باغیانہ منصوبہ مخفی رکھوں اور جو لوگ مسلمانوں میں سے ایسے بدخیال جہاد اور بغاوت کے دلوں میں مخفی رکھتے ہوں ان کو سخت نادان اور بدقسمت ظالم سمجھتا ... کیونکہ ہم اس بات کے گواہ ... اسلام کی دوبارہ زندگی انگریزی ... سلطنت کے امن بخش سایہ سے ... ہوئی ہے۔ تم چاہو دل میں مجھے ... کہو، گالیاں نکالو، یا پہلے کی طرح کافر ... فتویٰ لکھو، مگر میرا اصول یہی ہے ... ایسی سلطنت سے دل میں بغاوت ... کے خیالات رکھنا یا ایسے خیالات ... جن سے بغاوت کا احتمال ہو سکے، ... سخت بدذاتی اور خدا تعالیٰ کا گناہ ... بدتر سے ایسے مسلمانوں میں ... کبھی صاف نہیں ہوں گے۔ ... یکساں کا یہ ... معتقد ہو کر ... مہدی اور خونی مسیح کی حدیثیں تمام افسانہ اور کہانیاں ہیں۔"

(تریاق القلوب ص ۲۶)

مرزا صاحب انگریزی سلطنت کی طرف سے مسلمانوں کا دل صاف کرنے کے لیے دین و دنیا کی ہر نعمت کو خیرباد کہنے کے لیے آمادہ ہیں۔ حضرت مہدی اور حضرت مسیح سے متعلق متواتر احادیث جن پر خود مرزا صاحب کے اپنے دعویٰ کی بنا ہے انہیں بھی حرف غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے عقائد میں تبدیلی سے بھی انہیں گریز نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ مسلمان انگریزی سلطنت کی دائمی غلامی کو کسی طرح قبول کر لیں، خواہ انہیں مذہبی و سیاسی سطح پر اس کی کتنی ہی گراں قیمت ادا کرنی پڑے۔

مرزا غلام احمد صاحب انگریز کی مدح و ستائش اور خوشامد و تملق میں اتنے آگے نکل گئے تھے کہ غیروں کی نہیں بلکہ خود ان کے نیازمندوں کی جبینِ انفعال عرق آلود ہو جاتی تھی، مرزا محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا بیان ہے کہ:

"حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) نے فخریہ لکھا ہے کہ میری کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں میں نے گورنمنٹ (برطانیہ) کی تائید نہ کی ہو۔ مگر مجھے (مرزا محمود احمد صاحب کو) افسوس ہے کہ میں نے غیروں سے نہیں بلکہ احمدیوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ میں انہیں احمدی ہی کہوں گا، کیونکہ نابینا بھی آخر انسان ہی کہلاتا ہے۔ کہ ہمیں حضرت مسیح موعود کی اس تحریر پڑھ کر شرم آجاتی ہے۔ انہیں شرم کیوں آتی ہے اس لئے کہ ان کی اندر کی آنکھ نہیں کھلی (اگر انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا ہوتا تو انہیں اصل راز منکشف ہو جاتا کہ مرزا صاحب کا مسیح موعود کا دعویٰ ہی جذبہ جہاد کو مٹانے اور انگریزی اطاعت کو مذہبی فرض قرار دینے کی خاطر تھا۔ ناقل)"

(الفضل ۷، جولائی ۱۹۳۲ء)

کتنی عجیب بات ہے کہ آج پیغام صلح کو جو چیز حماقت اور بددیانتی نظر آ رہی ہے وہی چیز انگریز کے ظلِ حمایت میں لائقِ فخر و مباہات سمجھی جا رہی تھی۔

سوم: مرزا غلام احمد صاحب کے مشن کا تیسرا شعبہ ان مسلمانوں کی مخبری تھا جو گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف جارحانہ جذبات رکھتے تھے۔ مرزا صاحب بڑے حزم و احتیاط کے ساتھ سرکار دربار میں ایسے لوگوں کی خفیہ رپورٹ کرتے تھے جن سے گورنمنٹ کو اندیشہ لاحق ہو سکتا تھا۔ تعطیل جمعہ کے بارے میں ایک میموریل میں وہ گورنمنٹ کو توجہ دلاتے ہیں کہ:

"چونکہ قرین مصلحت ہے کہ سرکار انگریزی کی خیرخواہی کے لیے ایسے نافہم مسلمانوں کے نام بھی نقشہ جات میں درج کیے جائیں جو در پردہ اپنے دلوں میں برٹش انڈیا کو دار الحرب قرار دیتے ہیں۔ ..."

اس لئے ہم نے اپنی محسن گورنمنٹ کی
پولیٹکل خیرخواہی کی نیت سے اس مبارک
تقریب پر یہ چاہا کہ جہاں تک ممکن ہو
ان شریر لوگوں کے نام ضبط کئے جائیں
جو اپنے عقیدہ سے اپنی مفسدانہ حالت
کو ثابت کرتے ہیں۔۔۔ لیکن ہم گورنمنٹ
میں بادب اطلاع کرتے ہیں کہ ایسے
نقشے ایک پولیٹکل راز کی طرح اس وقت
تک ہمارے پاس محفوظ رہیں گے جب
تک گورنمنٹ ہم سے طلب کرے اور
ہم امید رکھتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ
حکیم مزاج بھی ان نقشوں کو ایک ملکی
راز کی طرح اپنے کسی دفتر میں محفوظ رکھے
گی اور بالفعل یہ نقشے جن میں ایسے
لوگوں کے نام درج ہیں گورنمنٹ میں
نہیں بھیجے جائیں گے، صرف اطلاع دہی
کے طور پر ایک سادہ نقشہ چھپا ہوا جس
پر کوئی نام درج نہیں۔ فقط یہی عنوان
درج ہے ہمراہ درخواست بھیجا جاتا
ہے اور ایسے لوگوں کے نام معہ پتہ
نشان یہ ہیں: نمبر شمار، نام مع لقب
و عہدہ۔ سکونت، ضلع، کیفیت"۔
(مجموعہ اشتہارات ص ۲۷ جلد دوم مطبوعہ ربوہ)

چہارم: مرزا صاحب کے مشن کا چوتھا شعبہ
یہ تھا کہ جو لوگ ان کے مشن سے وابستہ نہیں انہیں
نہ صرف سرکار دربار میں بدنام کیا جائے بلکہ ان
کی حوصلہ شکنی کے لیے ان پر طعن و تشنیع اور سب و شتم
کی ایسی بوچھاڑ کی جائے کہ انہیں اپنی عزت و آبرو
محفوظ رکھنا مشکل ہو جائے۔ ازالہ اوہام میں لکھتے
ہیں:

"سخت جاہل اور سخت نادان اور
سخت نالائق وہ مسلمان ہے جو اس
گورنمنٹ سے کینہ رکھے، اگر ہم ان
کا شکریہ نہ کریں تو پھر ہم خدا تعالیٰ کے
بھی ناشکر گزار ہیں کیونکہ ہم نے جو
اس گورنمنٹ کے زیر سایہ آرام پایا
اور پا رہے ہیں وہ آرام ہم کسی اسلامی
گورنمنٹ میں بھی نہیں پا سکتے، ہرگز
نہیں پا سکتے۔" (ص ۲۱ طبع پنجم)

اور تریاق القلوب کے ضمیمہ ۳ میں "حضور
گورنمنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست"
دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا فرض ہے جس کے ترک
سے وہ خدا تعالیٰ کے گنہگار رہیں گے
کہ اس گورنمنٹ کے سچے خیرخواہ اور
دلی جان نثار ہو جائیں اور جہاد اور
خونی مہدی کے انتظار وغیرہ بیہودہ
خیالات سے جو قرآن شریف سے
ہرگز ثابت نہیں ہو سکتے دست بردار
ہو جائیں اور اگر وہ اس غلطی کو چھوڑنا
نہیں چاہتے تو کم سے کم ان کا فرض
ہے کہ اس گورنمنٹ محسنہ کے ناشکر گزار
نہ بنیں اور نمک حرامی سے خدا کے
گنہگار نہ ٹھہریں" (ص ۳۰)

اسی درخواست میں وہ گورنمنٹ کی خدمت میں
استغاثہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب میں اس گورنمنٹ محسنہ کے زیر سایہ
ہر طرح سے خوش ہوں، صرف ایک
رنج اور درد و غم ہر وقت مجھے لاحق حال
ہے جس کا استغاثہ پیش کرنے کے لیے
اپنی محسن گورنمنٹ کی خدمت میں حاضر
ہوا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس ملک کے
مولوی مسلمان اور ان کی جماعتوں کے
لوگ حد سے زیادہ مجھے ستاتے اور
دکھ دیتے ہیں، میرے قتل کے لیے
ان لوگوں نے فتوے دیئے ہیں، مجھے
کافر اور بے ایمان ٹھہرایا ہے، بعض
ان میں سے حیا اور شرم کو ترک کرکے
اس قسم کے اشتہار میرے مقابل پر
شائع کرتے ہیں کہ یہ شخص اس وجہ
سے بھی کافر ہے کہ اس نے انگریزی
سلطنت کو سلطنت روم پر ترجیح دی
ہے اور ہمیشہ انگریزی سلطنت کی تعریف
کرتا ہے۔" (ص ۳۱)

مرزا صاحب کی خواہش تھی کہ کسی طرح انگریز
حکمرانوں کو اکسا کر مسلمانوں کا اسلامی لٹریچر ضبط کروا
دیں۔ "مسیح ہندوستان میں" نامی کتاب میں وہ
انگریزوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ "دیکھو فلاں مسلمانوں
کے گھر میں حدیث کی فلاں کتاب ہے جس کے
فلاں صفحے پر یہ لکھا ہوا ہے کہ جب مہدی علیہ السلام
تشریف لائیں گے تو ہندوستان کے بادشاہ۔ جو
بقول مرزا صاحب کے یقیناً انگریزی ہوں گے۔
ان کی خدمت میں قید کرکے لائے جائیں گے۔"

مثل مشہور ہے کہ اقتدار اندھا ہوا کرتا
ہے۔ وہ تو خیریت گزری کہ انگریز بہادر نے
مرزا قادیانی کی دانشمندانہ انگیخت کا نوٹس نہیں
لیا، ورنہ نشۂ اقتدار میں اگر وہ اس تمام اسلامی
لٹریچر کی ضبطی کا حکم دے دیتا جس میں حضرت
مہدی کا ذکر خیر ہے، تو سوچنا چاہیے کہ مرزا قادیانی
کے طفیل علمائے ہند پر کیا قیامت گزر جاتی۔ بہرحال
یہ قدرت کا معجزہ تھا کہ ایسا ہنگامۂ دار و گیر برپا نہ
ہوا ورنہ مرزا صاحب کے الطاف و عنایات نے
کسر نہیں چھوڑی تھی۔ فارسی شاعر کی زبان میں ؎

قتل ایں خستہ بہ دست تو تقدیر نبود
ورنہ از خنجر بے رحم تو تقصیر نبود

پنجم: مرزا صاحب کے مقدس مشن کا ایک
شعبہ یہ تھا کہ پادریوں کے مقابلہ میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام
کو اس قدر گالیاں دی جائیں کہ عام مسلمانوں کے
جذبات انگریز کے مقابلہ میں ٹھنڈے ہو جائیں۔
اور ساتھ ہی مرزا غلام احمد صاحب کو اسلام کی
وکالت کی سند بھی مہیا ہو جائے۔ مرزا صاحب نے

(باقی ص ۳۴ پر)

قسط (۴) — تحریر: شیخ محبوب علی اسسٹنٹ چیف انجنیئر
ٹیلیفون اسلام آباد

ہندوستان میں اسیری کے شب و روز

۴ فروری ۲ے۱۹ء میجر جنرل پی ایس بھگت کیمپ کے معائنے پر آئے، کہنے لگے کہ تمہارے کاہنو صاحب کسی قسم کی بات نہیں کرتے۔ ان کا مطلب ہمارے بتا دے کے بارے میں تھا، یعنی صاحب ڈسپرنٹنڈنگ انجنیئر پی ڈبلیو ڈی نے برجستہ جواب دیا۔

"جناب ان کے بارے میں تو آپ حضرات کو شکایت ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ باتیں کرتے ہیں۔"

بس پھر کیا تھا، ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور جنرل صاحب کھسیانے ہو کر اصل بات پر آگئے

"آپ لوگوں کو اس وقت تک یہاں رہنا پڑے گا، جب تک حکومت پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کر لیتی۔"

آدمی جتنے بڑے تھے، بات اتنی ہی گھٹیا کی، اور یوں ہم نے ان کے ظرف کا معائنہ کر لیا۔

۲۰ فروری ۲ے، میری تبلیغی نصاب کی کتاب ڈھاکہ میں رہ گئی تھی، اب اس کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی، اس کے لیے دوبارہ جے رام کی خدمات لینی پڑیں۔ اُسے چودہ روپے دیئے، کہ کسی طرح یہ کتاب کہیں سے خرید لائے۔ ساتھ ایک رقعہ بھی تھا۔ جے رام، روپے اور رقعہ مولانا سعید احمد صاحب کے پاس لے گیا، مولانا نے کتاب اپنے پاس سے دے دی۔ اور رقم واپس کر دی، کتاب کے ہمراہ ان کا خط بھی تھا

برادران اسلام و محبوب علی صاحب

السلام علیکم

عرض ہے کہ آپ کے حسب منشا پورا تبلیغی نصاب حاضر خدمت ہے پڑھ کر دعائے خیر میں بندۂ ناچیز کو یاد فرمائیں قیمت کوئی نہیں لی جاتی ہے اور جس کتاب کی آپ کو ضرورت ہو تو میں آپ کو وہ کتاب بھی انشاء اللہ دوں گا، اگر سہارنپور جانا ہوا تو حضرت مولانا ذکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور (مصنف تبلیغی نصاب) کی خدمت میں آپ کا سلام ضرور پیش کروں گا۔ یہ چودہ روپے آپ کے واپس ہیں، وصول فرمالیں۔

سعید احمد بقلم خود

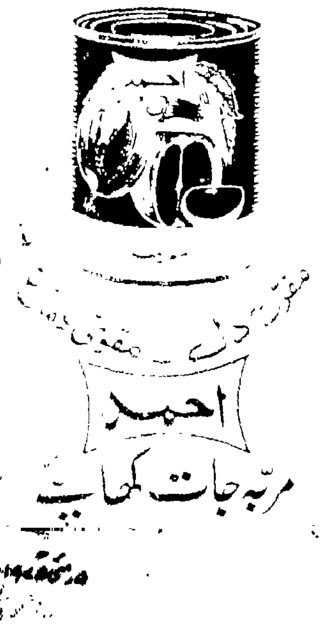
(ڈھنڈھیرہ)

جے رام نے کتاب، رقم اور خط لا کر دیئے تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ آنسو ممنونیت اور تشکر کے تھے، ایک اجنبی، غریب الوطن قیدی کے لیے ایثار کی یہ صورت محض اسلام کی بدولت ہے، کتنی بڑی نعمت کتنا مقدس ہے یہ رشتہ کاش ہم اس نعمت کی قدر کرتے، کاش اس رشتے کا احساس عام ہو جاتے۔

۲۵ فروری ۲ے، جے رام کا آج تبادلہ ہو گیا ہے۔

۲۶ فروری ۲ے، آج قرآن خوانی ہوئی، ختم قرآن کا سلسلہ کافی دنوں سے شروع ہے نماز باجماعت کا اہتمام بھی ہے، تقریباً سب جے سی او صاحبان جماعت میں شریک ہوتے ہیں کھانے کا انتظام لنگر کی صورت میں ہے پاکستانی فوجی خود پکاتے ہیں، اس کے لیے ایک کنٹین ہے جہاں ہفتے میں چار دفعہ جانے کی اجازت ہے ضرورت کی تمام چیزیں وہاں سے مل جاتی ہیں، کرنسی انڈین چلتی ہے، لوگوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر کچھ انڈین کرنسی حاصل کر لی تھی، ماہانہ الاؤنس کے بارے میں سنا کہ جوانوں کو چودہ روپے جے سی او سے کیپٹن تک ۹۲ روپے اور عام سویلین کو صرف پانچ روپے ملیگا۔

۲۷ فروری، کیپٹن عباسی صاحب کے سسر عبدالعزیز عباسی وفات پا گئے۔ تجہیز و تکفین قریب کی ایک مسلمان بستی بنگھیڑی میں ہوئی، بستی کے مسلمانوں سے ملاقات ہوئی، بڑی محبت سے ملے۔ قبرستان تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کی فوج میں مسلمان سپاہیوں کے لیے تھا، کتبوں پر



مختلف مقامات کے نام کندہ تھے، جن میں راولپنڈی سیالکوٹ، ایک پر لکھا تھا۔

"جمعدار یوسف شاہ
موضع کھروٹہ - ضلع سیالکوٹ"

وفات ۱۹۳۶ء

نگاہیں کتبے پر جم کر رہ گئیں اور دل سے بے اختیار ہوک اٹھی، آہ قدرت کتنی بے نیاز ہے اور موت کتنی ستم ظریف۔ کھروٹہ سیداں ہمارے قصبہ پسروریاں (ضلع سیالکوٹ) سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

بار بار خیال آتا ہے، کہ گھر والے ہمارے بارے میں کس قدر متفکر ہوں گے۔ والدہ کا کیا عالم ہوگا۔ والد اور بہن بھائی کی سوچوں کی کیا صورت ہو گی، ہم یہاں جس حال میں بھی ہوں، بے فکر اور مطمئن ہیں، مگر نہ جانے اُن پر کیا بیت رہی ہوگی ویسے اپنا اندازہ ہے کہ کم از کم اپریل کے وسط تک ہم اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔ اسیری کی مدت دو ڈھائی ماہ سے زیادہ نہیں رہے گی۔

یکم مارچ، رات کے پونے نو بجے کیمپ کے لاؤڈ سپیکر پر ہمارے قومی ترانہ "پاک سرزمین شاد باد" کی للکار سنائی دی، ویرانے میں جیسے بہار آگئی، مرد، عورتیں، بچے، جوان، سب یوں باہر نکلے جیسے شمع کی طرف پروانے امنڈتے ہیں، ترانہ ختم ہوا تو صدر پاکستان قوم سے مخاطب ہوتے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔

۴ مارچ ۱۹۷۲ء، گزشتہ رات کی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ پاک فوج کے چیف آف سٹاف جنرل گل حسن کی جگہ جنرل ٹکا خان کو چیف آف سٹاف بنایا گیا ہے آج ہندوستانی اخبارات اس خبر سے یوں ہراساں نظر آتے ہیں اور انہوں نے کچھ اس قسم کا واویلا مچایا ہے جیسے بستی میں شیر آگیا ہو۔

۶ مارچ، آج صبح ایک سردار جی لیفٹیننٹ کرنل ہرنام سنگھ تشریف لائے، خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے، کہنے لگے:

"دیکھیں ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ فوج میں مسلمان جرنل بھی موجود ہیں ہمارے ایک صدر مسلمان تھے، چیف جسٹس بھی مسلمان تھے، کیا پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے؟"

اس پر صدیقی صاحب نے جھٹ جواب دیا:

"چھوڑیں سردار جی! مسلمان ہیں ہی اس قابلیت کے۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا، اور سردار صاحب بھی مسکرا دیئے۔

۷ مارچ، موسم بہار کا آغاز ہے، نضی ملک نے ماشاء اللہ رنگنا شروع کیا ہے، حسب توفیق اپنے کمرے کے عزیز (یعنی غریب الوطن اسیران) یونس صاحب اور بٹ صاحب کو شیرینی کھلائی ہے سردی، کہر اور دھند کا زور ٹوٹ گیا ہے، ہمارے کیمپ کے شمال میں دور کھڑے برف پوش پہاڑوں کے دلکش نظارے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ اس حوالے سے جنت کا خیال آتا ہے تو بے چارگی کی حالت میں بھی دل مسرت و بہجت کی ان وادیوں میں مست سفر ہو جاتا ہے جہاں ہر نعمت کو دوام ہوگا، جہاں ہر حسن میں اضافہ اور پائیداری ہوگی، وہاں کی ہوا، وہاں کی مٹی، محلات، ثمرات

ہفت روزہ چٹان لاہور



قصور سے بھی زیادہ عظیم ہوں گے۔ مگر میں ان نعمتوں کو حاصل کرنے کیلئے کیا کر رہا ہوں ـــــ یہ سوچ مجھے افسردہ کر دیتی ہے اور میں بے قراری سے ٹہلنے لگتا ہوں۔

۲۳ مارچ ۷۲ء آج کا دن تاریخی دن ہے، اسی روز لاہور میں برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان بنانے کا عہد کیا تھا، مگر اس عہد کی تکمیل کے بعد چوتھائی صدی بھی نہیں گزری تھی، کہ وہ خواب منتشر ہو کر رہ گیا ـــــ اس احساس نے بار بار مجھے کچوکے لگائے، کہ کیا ہم اُسی قوم کے افراد ہیں، جس نے تاریخ پر اپنی اولوالعزمی کی دھاک بٹھا دی تھی،

آج ایک رقت انگیز منظر دیکھا، ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک صوبیدار برکت علی بیوی بچوں کے ہمراہ جیسور میں مقیم تھے، سقوطِ پاکستان کے وقت وہ اپنے گھرانے سے جدا ہو گئے اور بعد میں رنگیا کے کیمپ میں مقید ہو گئے۔ بیوی بچوں کا کچھ پتہ نہ تھا اور صوبیدار صاحب ان کے خیال سے دن رات روتے رہتے، حتیٰ کہ دماغی حالت بھی درست نہ رہی، بھارتی فوج کے ایک میجر سوری صاحب رنگیا کے کیمپ سے تبدیل ہو کر ہمارے کیمپ کی نگرانی پر آئے، تو تفتیش سے پتہ چلا کہ صوبیدار برکت علی کے بیوی بچے اس کیمپ میں ہیں، میجر سوری نے رنگیا میں صوبیدار صاحب کو اس کی اطلاع دے دی، دوسری طرف دہلی ہیڈ کوارٹر میں لکھ بھیجا کہ صوبیدار برکت علی کو گیا سے اپنے بیوی بچوں کے پاس ڈھنڈھیرہ بھیج دیا جائے، احکام مل گئے تو برکت علی کو یہاں پہنچا دیا گیا، رات انہوں نے جے سی او صاحبان کے پاس گزاری، صبح سویرے انڈین گارڈز نے انتظام کیا کہ ملنے سے پہلے یہ بچھڑا خاندان ایک دوسرے کو دیکھ لے، چنانچہ برکت علی کو ہماری بیرک کے مغربی طرف میں تاروں کے قریب کھڑا کیا گیا اور دوسری بیرک سے اس کے بیوی بچوں کو بلایا گیا، عجیب منظر تھا، صوبیدار کبھی ہنس پڑتا، کبھی رونے لگتا۔ دیکھنے والوں میں کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جو آنسوؤں سے تر نہ ہوئی ہو۔

اس خاندان کو ہماری بیرک میں ہمارے ساتھ ٹھہرایا گیا ہے۔ بچوں میں دو لڑکیاں ہیں، ایک لڑکا، ان کی حالت دیکھ کر بے اختیار والدین یاد آئے، نہ جانے وہ ہمارے بارے میں صوبیدار برکت ہی کی مانند کس قدر فکر مند ہوں گے۔

بعدالت رائے محمد ظفر بھٹی پی سی ایس سول جج چکوال

رحمت نور بنام عوام الناس

درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی

درخواست نمبر ۸ سال ۱۹۷۵ء

بنام عوام الناس

ہرگاہ مقدمہ عنوان بالا میں سائلان رحمت نور وغیرہ سکنائے بھکڑای تحصیل چکوال نے ایک درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی عدالت ہذا میں گزاری ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی عذر نسبت [illegible] سرٹیفکیٹ جانشینی جاری کرنے میں ہو تو بتقرر [illegible] ۷۵ء حاضر عدالت آ کر اصالتاً یا وکالتاً پیش [illegible] ورنہ کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۲ ماہ اپریل ۷۵ء کو ہمارے دستخط و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط سول جج

مہر عدالت

بعدالت جناب شیخ عبدالرزاق سول جج درجہ اول وزیرآباد۔ باختیارات جج فیملی کورٹ وزیرآباد۔

دعویٰ اعادہ حقوق زناشوئی

اکبر علی ولد محمد بوٹا قوم اعوان سکنہ جوکھیاں تحصیل وزیرآباد

بنام پروین اختر

بنام: پروین اختر دختر فیض احمد قوم اعوان ساکن کٹریالہ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعا علیہا کی تعمیل بطریق عام ہونی مشکل ہے لہٰذا مدعا علیہا کے خلاف اشتہار اخبار زیر آرڈر ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ مورخہ ۵ مئی ۷۵ء کو بمقام وزیرآباد بوقت ۸ بجے حاضر عدالت ہذا ہو کر جواب دہی دعویٰ کریں، بصورت دیگر آپ کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاویگی۔

آج بتاریخ ۱۸ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے و مہر عدالت کے جاری کیا گیا۔

دستخط سول جج درجہ اول

مہر عدالت

بعدالت جناب خان عبدالکریم خان کنڈی ڈسٹرکٹ جج صاحب بنوں۔

اپیل دیوانی ۱۱۱/۱۲ ۷۴ء

سرداز خان ولد شیر عباس خان قوم پشتون سکنہ بڈہ میر عباس تحصیل و ضلع بنوں

(مدعی اپیلانٹ)

بنام اکبر علی خان وغیرہ (رسپانڈنٹان)

اپیل بنا راضگی حکم و ڈگری مورخہ ۷۴-۱۰-۴ اجلاس جناب سینئر سول جج بنوں۔

اشتہار بنام: سردار خان ولد اکبر علی خان عرف اکبر خان سکنائے حسن خیل شبدیو تحصیل و ضلع بنوں۔ (رسپانڈنٹ)

بمقدمہ صدر رسپانڈنٹ نمبر ۲ کی تعمیل معمولی طریقہ سے ہونی مشکل ہے، لہٰذا رسپانڈنٹ نمبر ۲ کو بذریعہ اشتہار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ اپیل ہذا میں پکی تاریخ پیشی ۷ مئی ۱۹۷۵ء مقرر ہو چکی ہے برائے جواب دہی اپیل اصالتاً، وکالتاً، مختیاراً حاضر آویں۔ بصورت دیگر حسب ضابطہ کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۹ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء بہ ثبت دستخط ہمارے اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

ڈسٹرکٹ جج

مہر عدالت

خطوط

مکرمی ایڈیٹر صاحب

جب سے مرزائی امت کو خارج از اسلام کر دیا گیا ہے وہ وقتاً فوقتاً اپنے ناقوس "الفضل" میں اپنے آپ کو احمدی مسلمان لکھنے پر بضد ہیں اور مسلمانوں میں نام نہاد شمولیت کر کے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ظفر اللہ خاں لاہور چھاؤنی میں براجمان ہے اور مرزائی خصوصی ہدایات حاصل کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے ڈھب پر چلانے کی ناپاک سازش کر رہے ہیں۔ میں آپ کی توجہ ایک خصوصی واقعہ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ موضع و ڈاک خانہ موسے والا تحصیل ڈسکہ میں جو کہ مرزائیوں کے بقول ربوہ ثانی تھا۔ تقریباً ۴۰ سال سے مرزائی، مذہبی سیاسی اور اقتصادی معاملات میں مسلمانوں پر چھائے ہوئے تھے اور کسی مسلمان کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھا جا سکتا تھے۔ خدا کی قدرت کہ عرصہ سات سال سے تحریک ختم نبوت کی بنیاد اٹھائی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پودا تناور درخت بن گیا۔ اب جب کہ تمام ملک میں تحریک چلی تو موضع موسے والا میں باہر کے دیہاتوں سے مرزائی پناہ لینے کے لیے آ گئے لیکن وہاں کی مجلس عمل نے رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے کسی قسم کا مالی یا جانی نقصان نہ ہونے دیا۔ اب جب کہ مرزائی غیر مسلم اقلیت قرار پا چکے ہیں تو انہیں مسلمانوں کے معاملات میں قطعاً شمولیت کا کوئی حق نہیں۔

قبل ازیں مسلمانوں کے نکاح کا رجسٹرار بھی ایک مرزائی عبدالرحمٰن نامی تھا اور وہ مسلمانوں اور مرزائیوں کے نکاح ایک ہی رجسٹر میں درج کرتا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ معاملہ انتظامیہ تک گیا اور ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ نے مسلمانوں کو یہ رجسٹر دلا یا اور مسلمان نکاح رجسٹرار مقرر کر دیا گیا اور مرزائی نکاح رجسٹرار کا لائسنس منسوخ کر دیا۔

دوسرے نمبر پر مسلمانوں کی مسجد کا معاملہ ہے۔ اسی موضع موسے والا میں دیہات کے مرکز میں بڑی مسجد ہے جہاں پر تحریک سے قبل مسلمان اور مرزائی اکٹھے ہی نماز پڑھتے تھے۔ اب مسلمانوں نے فروری ۷۵ء کو مرزائیوں کو مسجد سے نکال باہر کیا اور مسجد پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن ڈسکہ کی انتظامیہ نے مداخلت کی اور ناجائز مرزائیت نوازی کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہی ہے کئی مسلمانوں کو گرفتار کر لیا اور بعد ازاں ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی مرزائیوں کی پشت پناہی کے لیے سیالکوٹ سے ظہور دین سینیٹر اور دیگر مرزائی نواز افسران کر رہے ہیں۔ مسجد کی انکوائری کا مقدمہ ریذیڈنٹ مجسٹریٹ ڈسکہ کی عدالت میں زیر تفتیش ہے۔ انتظامیہ کی دھاندلی ملاحظہ فرمائیں کہ مرزائیوں کو اذان دینے اور جماعت سے نماز پڑھنے کی اجازت ہے لیکن مسلمانوں کے سات آدمی نماز کے لیے پابند کر دیے ہیں اور اذان اور جماعت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمان افسران غیر مسلم اقلیت کو ناجائز رعایت سے نواز کر مسلم اکثریت کے دینی اور ملی جذبات کو مجروح کر رہے ہیں۔

بہرحال مسجد مسلمانوں کی ہے اور انشاء اللہ ہمیں مزید ملے گی۔ اس کے بعد قبرستان کے حصول کا مسئلہ ہے۔ ڈسکہ اور موضع بھروکے خورد میں مرزائیوں کے مردے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیئے گئے۔ انشاء اللہ اسی طرح موسے والا میں بھی وقت آنے پر مرزائیوں کا غرور خاک میں ملا دیا جائے گا۔

المخلص

صوفی محمد حسین

محترمی جناب ایڈیٹر صاحب

متاثرین اسلام آباد کی طرف سے ہم ایک مختصر سا وفد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں تاکہ آپ کو بالمشافہ ان ناانصافیوں کی طرف متوجہ کر سکیں جو اسلام آباد کا شہر آباد کرنے کے لیے ہم پر

یکم مئی کی تعطیل

ہم اپنے ان جذبات کا چند مختصر الفاظ میں اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ یکم مئی کی تعطیل کا پاکستان کی قومی روایت اور ملت اسلامیہ کی اپنی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، یہ اشتراکی دانشوروں کی ایک بے محل سیاسی اپج ہے، ہم صرف سرکاری حکم کے تحت چھٹی کرتے ہیں، ورنہ ہمارا دل اس دن کے احترام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہ ایک بے معنی اور بے تعلق تعطیل ہے۔ (ادارہ)

بعدالت جناب خان عبدالکریم خان کنڈی ڈسٹرکٹ جج بنوں۔

اپیل دیوانی ۷۵/۲۵

صالح خان ولد راست خان پشتون سکنہ خیرو خیل پکہ تحصیل لکی مروت ضلع بنوں۔ (اپیلانٹ)

بنام غلام محمد وغیرہ .... ریسپانڈنٹان

اپیل بنا راضگی ڈگری و حکم مورخہ ۷۵/۲/۲۴ اجلاس سینیر سول جج بنوں

اشتہار بنام (۱) غلام محمد ولد ابراہیم سکنہ شیشنگھ ضلع بہاولنگر (پنجاب) (۷) عبدالوہاب خان ولد عظیم خان قوم پٹھان سکنہ نارسنہ آدم زئی (۸) سیکرٹری بورڈ آف ریونیو پشاور (صوبہ سرحد) (۲۱) خانہ جان ولد محمد جان (۲۳) گلنامہ دختر محمد خان (۲۵) کالو خان ولد تاجو (۲۶) عبدالرحیم ولد امیر خان سکنہ سرگہ خیرو خیل مروت (۳۰) نیک بخت (۳۱) اقبال بی بی دختران شاہنواز سکنہ ونڈہ پنیالہ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان (۳۲) بہر دل خان ولد آیا نخان سکنہ دانڈہ شریت پنیرو تحصیل لکی مروت (۳۵) خان ولد گلمیر سکنہ خیرو خیل مروت (۳۷) نور بی بی بیوہ (۳۸) اکبر خان ولد پائندہ خان سکنہ سرگہ خیرو خیل مروت (۴۲) معراج بی بی دختر پائندہ خان سکنہ سرگہ خیرو خیل مروت (۴۳) عبدالرحیم (۴۴) عظیم خان پسران بادشاہ خان (۴۵) شیر زمان ولد سید خان سکنہ سرگہ خیرو خیل مروت (۴۷) خادم ولد گلباز (۴۸) یار احمد ولد لال خان پشتون سکنہ درہ پنیرو تحصیل مروت (A ۴۹) سردار خان ولد پائندہ خان سکنائے سرگہ خیرو خیل مروت (۴۶) خاندوران متوفی بقائمقامی (A ۴۶) سرور ولد پائندہ خان سکنہ سرگہ خیرو خیل تحصیل لکی مروت ضلع بنوں (۵۳) مسماۃ نباتی متوفی بقائمقامی (۵۳A) الف شاہ (۵۳B) فلک شیر (۵۳C) درے شاہ پسران لال شاہ سکنائے کاٹ گڑھ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان (۵۴) مسماۃ ملالہ متوفی بقائمقامی (۵۴A) الف شاہ (۵۴B) فلک شیر (۵۴C) درے شاہ پسران لال شاہ سکنائے کاٹ گڑھ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان (۵۵) مسماۃ نازو بیوہ گلو شاہ متوفی بقائمقامی (۵۵A) مسماۃ شاہ پری (۵۵B) پشاوری دختران گلو شاہ سکنائے گز شیر علی تحصیل ٹانک ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان (۵۶) مسماۃ زر بی بی متوفی بقائمقامی (۵۶A) الف شاہ، (۵۶B) فلک شیر (۵۶C) درے شاہ پسران لال شاہ سکنائے کاٹ گڑھ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان ....

(ریسپانڈنٹان)

مقدمہ صدر ریسپانڈنٹان بالا کی تعمیل معمولی طریقہ سے ہونی مشکل ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا ریسپانڈنٹان بالا کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اپیلانٹ نے عدالت ہذا میں درخواست بابت سرسبزی اپیل کی گزاری ہے۔ اگر کوئی عذر ہو تو بتاریخ ۳ مئی ۱۹۷۵ء اصالتاً وکالتاً مختیارتاً حاضر آویں بصورت دیگر حسب ضابطہ کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۵ ماہ اپریل ۷۵ء بہ ثبت دستخط میرے و مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط، ڈسٹرکٹ جج

(مہر عدالت)

روا رکھی جا رہی ہیں۔

جناب والی ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ یہی بات ملک کے ارباب اختیار سے دریافت فرمائیں کہ کیا انصاف کے کسی بھی قاعدے کی رُو سے یہ درست ہو سکتا ہے کہ ۱۹۷۴ء یا ۱۹۷۵ء میں ایک شخص سے جبراً اس کی جائداد چھین لی جائے اور اس کو وہ معاوضہ ادا کیا جائے جو اسے اس صورت میں ملتا، اگر وہ یہی جائداد ۱۹۵۴ء میں برضا و رغبت فروخت کرنا چاہتا۔ اسلام آباد کے لوگوں کے لیے معاوضہ کا یہی قاعدہ مقرر ہے۔ اور جو زمین رہائشی پلاٹوں کی شکل میں حال ہی میں سی ڈی اے نے ۰۰.۴۲ روپے فی مربع گز یعنی تقریباً ۰۰.۰۰۰.۲۲ روپے فی کنال قیمت وصول کر کے لوگوں کو فروخت کی ہے وہی زمین ہم سے سال ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ۰۰.۰۰۰.۷ روپے فی کنال سے لے کر کوئی ۰۰.۰۰۰.۶ روپے فی کنال کے حساب سے حاصل کی گئی اور حکومت کے خزانے میں رقم نہ ہونے کے عذر سے معاوضہ جات ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں بلا سود یا کسی اضافہ کے ادا کئے گئے ہیں اور ابھی تک مکمل نہیں ہوئے۔

بلاشبہ یہ قاعدہ ایوب خان کی حکومت میں مقرر ہوا تھا اور ۱۹۶۸ء میں اسی حکومت نے اس پر ۲۵ فیصد اضافہ کے لیے قانون میں ترمیم بھی کی، مگر موجودہ حکومت اس بے انصافی کا ازالہ کر سکتی تھی۔ ہم مطالبہ کرتے رہے ہیں، مگر غالباً صاحب اختیار لوگوں تک ہماری بات پہنچنے نہیں دی جاتی۔

ایوب کی حکومت نے منگلا اور تربیلا ڈیم، گوجرانوالہ اور الکاٹھ سکیم کے متاثرین کی طرح یہ قاعدہ بھی مقرر کیا تھا کہ جن لوگوں سے زمینیں حاصل کی جائیں ان میں سے ہر ایک کو کم از کم ساڑھے بارہ ایکڑ زمین پنجاب کے دوسرے حصوں میں قیمتاً مگر آسان اقساط پر الاٹ کی جائے۔ ۱۹۶۸ء کے ابتدائی حصہ تک اس طرح کی زمین الاٹ ہوتی رہی، مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ جن لوگوں پر عوام نے کہیں بڑھ کر توقعات رکھی تھیں جب اقتدار ان کے پاس آیا تو حکام نے اس رعایت کو بھی معطل کر دیا۔

جناب ہم آپ سے ملتمس ہیں کہ ہمارے مسئلہ کا مطالعہ فرمائیں اور اگر آپ کو ہماری مظلومیت کا یقین ہو تو اپنے موقر اخبار کے ذریعہ وزیراعظم پاکستان اور حکومت پنجاب کو اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائیں۔

آپ کا خادم

خان غلام مصطفٰے سیمبر (ریٹائرڈ)

آپ اپنی رقم ۲۱ سال میں
گیارہ گُنا کیجئے

۴۹ فیصد سے زائد بلا ٹیکس منافع

نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

بونس ڈپازٹ اکاؤنٹ

■ ملاحظہ کیجئے آپ کا ۱۰۰ روپیہ کس رفتار سے بڑھتا ہے

۲۱ سال میں ۱۱۳۹ روپیہ	۴۹٫۵	فیصد کی شرح سے	
۱۴ سال میں ۵۰۶ روپیہ	۲۹	فیصد کی شرح سے	
۷ سال میں ۲۲۵ روپیہ	۱۸	فیصد کی شرح سے	
۶ سال میں ۲۰۰ روپیہ	۱۶٫۶	فیصد کی شرح سے	

■ **پورے منافع پر ٹیکس معاف**
■ آپ اپنی رقم تین ماہ کے بعد جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں۔
■ ایک سال کے بعد روپیہ واپس لینے پر بھی آپ ۸ - ۱۵ فیصد منافع حاصل کر سکتے ہیں

قومی بچت کے مرکز۔ ڈاک خانے یا بینک میں تشریف لائیے۔

NATIONAL SAVINGS

United C.D.N.S 5/75 R.I.O (K) P.I.D

بقیہ: انگریز نوازی

عیسائیت کے رد میں جس تیزی و تندی کا مظاہرہ کیا ہے حضور گورنمنٹ عالیہ میں" اس کا فلسفہ پیش کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"مجھے (عیسائیوں کی) ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے یہ اندیشہ دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے، ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو، تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کے دبانے کے لئے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تو سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بد امنی نہ ہو، تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدزبانی کی گئی تھی، چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں کسی قدر بالمقابل سختی تھی، کیونکہ میرے کانشنس نے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں ان کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے کیلئے یہ طریق کافی ہوگا، کیونکہ عوض معاوضہ کے بعد کوئی گلہ باقی نہیں رہتا۔ سو میری پیش بینی کی تدبیر صحیح نکلی اور ان کتابوں کا یہ اثر ہوا کہ ہزار ہا مسلمان جو پادری عمادالدین وغیرہ لوگوں کی تیز اور گندی تحریروں سے اشتعال میں آ چکے تھے یک دفعہ ان کے اشتعال فرو ہو گئے۔ سو مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمت عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا"

(تریاق القلوب ضمیمہ ص۳)

مرزائی امت کو بڑا ناز ہے کہ مرزا جی نے شمشیر و سناں کے (معاذ اللہ) فرسودہ ہتھیاروں کو چھوڑ کر "جہاد بالقلم" کے معرکے انجام دیئے ہیں اور انگریزوں کے خدا (اور مسلمانوں کے ایک مقدس نبی) حضرت مسیح علیہ السلام کو پیٹ بھر کر گالیاں دی ہیں۔ مگر گزشتہ بالا معروضہ میں مرزا جی نے اپنی تبلیغی مہم اور "جہاد بالقلم" کی اصل علت بیان کر دی ہے کہ ان کی یہ ساری کارروائی جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے نہیں تھی بلکہ یہ "وحشی مسلمانوں" کے جوش کو فرو کرنے کی "حکمت عملی" تھی جو مرزا جی نے حکمران ٹولے کی خواہشات کی تکمیل کے لیے پاک اور صحیح نیت سے انجام دی تھی۔ تاکہ پادریوں کی یاوہ گوئی سے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف اشتعال پیدا نہ ہو۔

انگریز غداروں کی تلاش میں بڑا ماہر تھا، اس نے قریباً تمام اسلامی ممالک میں ایسے دانشور تلاش کر لئے تھے، جو اپنے ملک و ملت سے غداری کر کے برٹش راج کی بقا و استحکام میں ممد و معاون ہوں، اور جو ایسے انداز سے کام کریں، تحریکیں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ذہن کو مسحور کریں کہ کسی کو ان کی شخصیت پر شبہ تک نہ ہو۔ اگرچہ غلام ہندوستان نے بھی میر جعفر اور میر صادق ایسے بہت غداروں کی خدمات انگریزی اقتدار کے حوالے کیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریزی اقتدار کی جو گرانقدر مذہبی، سیاسی اور عسکری خدمات انجام دیں، ہندوستان کے سارے غدار مل کر بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ کسی کو مرزا صاحب کے اس "تمغہ امتیاز" میں شبہ ہو تو موصوف کی تصنیف "کتاب البریہ" کا صفحہ ملاحظہ کرے۔ جس میں مرزا صاحب نے تمام مسلمانوں کو چیلنج دیا مگر آج تک کسی نے ان کا یہ چیلنج قبول نہیں کیا۔ مرزائی اصطلاح میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ بھی "مسیح موعود" کا ایک معجزہ ہے۔ مرزا صاحب کی تحدی کے الفاظ یہ ہیں۔

"اس سترہ برس کی مدت میں جس قدر میں نے کتابیں تالیف کیں ان سب میں سرکار انگریزی کی اطاعت اور ہمدردی کے لیے لوگوں کو ترغیب دی اور جہاد کی ممانعت کے بارے میں نہایت موثر تقریریں لکھیں اور پھر میں نے قرین مصلحت سمجھ کر اسی امر ممانعت جہاد کو عام ملکوں میں پھیلانے کے لیے عربی اور فارسی میں کتابیں تالیف کیں جن کی چھپوائی اور اشاعت پر ہزارہا روپے خرچ ہوئے اور وہ تمام کتابیں عرب اور بلاد شام اور روم اور مصر اور بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سرکار انگریزی کی امداد اور حفظ امن اور جہادی خیالات کے روکنے کے لیے برابر سترہ سال تک پورے جوش سے پوری استقامت سے کام لیا

بقیہ: روزنامچہ

نہیں کیا، ساری اسمبلی کا فیصلہ ہے، ان کے خلیفہ کو شہادت کا پورا پورا موقعہ دیا گیا، سوالات کئے گئے اور دستوری فیصلہ اجماع امت کے مطابق ہے اگر قادیانی اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ دستور کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس دستور شکنی کے لیے وہ حکومت کے سامنے جوابدہ ہیں، ہم اس فیصلے کے بعد از روئے اسلام انہیں تحفظ دینا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں۔

آغا صاحب کی تقریر نے وجد و سرور کا ایک عجیب عالم پیش کیا، جب وہ تقریر کر چکے، تو پانچسو کے لگ بھگ آٹوگراف دیئے اور عوام کی محبت کا یہ حال تھا کہ وہ آغا صاحب کے رخصت ہونے تک اخلاص کا انتہائی مظاہرہ کرتے رہے۔

[illegible]

چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ — شمارہ ۲۰
۱۹ مئی ۱۹۷۵ء
قیمت — ایک روپیہ

وطن کی فکر کر ناداں

صوبائی قیادتوں سے ایک گذارش

ہم نے انہی کالموں میں پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کے متعلق کئی دفعہ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ملک جن حالات سے دوچار ہے ہم اُن پر کیونکر قابو پا سکتے ہیں اس دور کی سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہ ہے کہ انتہائی راز کی بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ خود رازدار ہی اُس کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیتے ہیں۔ اس عالمی دور میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی طاقتوں کے اسرار و احوال تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ اپنے ہی ملک کے اندرونِ خانہ سے اہلِ ملک ناواقف رہیں۔ پاکستان پر جو بیتی اور جو لگاتار بیت رہی ہے وہ کوئی مخفی راز نہیں۔ اُس کا لبِ لباب ہر اُس شخص کو معلوم ہے جو سیاست کے روزبازار سے گذر رہا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جس غیر متزلزل ایمان کے بل پر برعظیم کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی سیادت میں پاکستان قائم کیا تھا اور جس شیفتگی و وارفتگی سے برعظیم کے مسلمان اس کے والہ و شیدا تھے۔ اُس چراغ کی لَو نہ جانے کیوں مدھم ہو چکی ہے۔ بلاشبہ پاکستان کے فداکاروں کی تعداد اب بھی غالب ہے اور شاید ہی کوئی بدبخت انسان ایسا ہو جس کو اپنی سرزمین سے محبت نہ ہو۔ لیکن جو چیز کجلا چکی ہے اُس کی تفصیلات کو زیرِ بحث لانا سیاسی اعتبار سے درست نہیں تاہم اس شعر میں اس کے خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں ؎

دل کو تیری ذات سے جو ربطِ پنہاں تھا کبھی
ہے وہی اب بھی مگر اُس کی خوشی جاتی رہی

۲۔ اس حقیقتِ کبریٰ سے عقلِ عیار کی دسیسہ کاری کے باوجود انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے قائداعظم کے پاکستان سے دغا کی ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے سب سے بڑی مسلمان مملکت حاصل کی تھی لیکن ہم نے نہ اُن کی روح سے انصاف کیا نہ اُن شہیدوں کے خون کی لاج رکھی اور نہ اُن مسلمانوں ہی کی اُمید کا پاس کیا جو پاکستان کے لیے ہندوستان کی سرزمین میں موت کا شکار ہو گئے اور نہیں تو ہمیں اُن مغویہ بیٹیوں ہی کا احساس کرنا چاہیئے تھا جو پاکستان کے لیے ہوس کا نذرانہ ہو گئیں جن کے سینوں میں کلامِ الٰہی تھا لیکن شاید آج تک وہ اُن نامسلمانوں کے بستر پر شکنیں ڈالتی ہیں جن کی بہیمانہ حرکتوں نے پاکستان بنانے کے جرم میں انہیں شکار کیا۔

۳۔ اس وقت جو سیاسی فضا ملک کے طول و عرض کا مطلع و مقطع ہے اُس کے پیشِ نظر تاریخی تجزیے ناممکن ہو چکے ہیں۔ ہم خود بعض وجوہ کی بنا پر کئی چیزوں پر قلم اٹھانے سے ڈرتے ہیں لیکن یہ کہنا شاید گستاخی پر محمول کیا جائے کہ پاکستان کو اُن لوگوں نے فی الواقعہ کوئی نقصان نہیں پہنچایا جو تحریکِ پاکستان میں شریک نہ تھے اور جن کا سیاسی مسلک مسلم لیگ کے سیاسی مسلک سے مختلف تھا۔ پاکستان کو جو نقصان پہنچا قائداعظم کی رحلت کے بعد خود لیگ ہی کے مقتدر راہنماؤں سے پہنچا۔ قائداعظمؒ کی بے وقت موت پر شکر کا سانس کس نے لیا؟ لیاقت علی خان کی شہادت پر کس انداز سے پخت و پز ہوئی؟ حسین شہید سہروردی نے اپوزیشن کا پھریرا اٹھایا تو اُن کے خلاف دشنام وہی کہاں سے شروع ہوئی؟ خواجہ ناظم الدین کس کے ہاتھوں برخاست ہوئے اور کس جماعت نے اس کی توثیق کی؟ محمد علی بوگرہ کون تھے؟ کیا اسکندر مرزا کو مسلم لیگ نے ٹکٹ نہیں دیا تھا؟ چودھری محمد علی نے ملک کو آئین دیا پھر نہیں کس جماعت نے اڑنگے پر لاکر پنجنی دی؟ سہروردی کی وزارتِ عظمیٰ پر کس نے شب خون مارا؟ چند دیگر پہ کیا بیتی؟ فیروز خان نون کا حشر کیا ہوا؟ جمہوریت کی ناگہانی موت کا سبب کیا تھا؟ جسٹس منیر نے چیف جج کی مسند پر بیٹھ کر کیا گل کھلایا؟

ایوب خان کس کے آوردہ و پروردہ تھے۔ جب مادرِ ملت مس جناح نے اُن کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑا تو اُن کے خلاف کون لوگ صف آرا ہو گئے؟ اُن کا ہر دو ار یہ کیا تھا؟ پھر یحییٰ خان آئے تو اُن کے مشیرانِ کار کی فہرست پر نظر ڈال لیجئے۔ اُن کے شرمناک عہد میں ملک دولخت ہوا۔ وہ سب لوگ مسلم لیگ کے ساتھی یا مسلم لیگ کے نئے پالک نہ تھے؟ اور جو لوگ سرحد سے اُوپر آئے تھے اُن پر مسلم لیگ نازاں نہ تھی اور پہلے دن سے اُن پر مسلم لیگ کا سایہ نہیں تھا؟ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ تحریک پاکستان کے سیاسی مخالفوں یا قائد اعظمؒ کی سیادت کے نافرمانوں کی صف میں تھا۔

اس مرکزی صورت حال کے علاوہ پاکستان کے صوبوں میں ابتر سے ابتر حالات پیدا کرنے والا کون تھا؟ کیا سب کے سب مسلم لیگی نہ تھے؟ پنجاب میں لیگ کی ابتدائی لیڈر شپ تھی۔ نواب ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات ہر سہ کی روداد ملک کے سامنے ہے۔ سندھ میں اتنی وزارتیں بدلیں کہ دریائے سندھ نے بھی اپنی گزرگاہ اتنی دفعہ نہ بدلی ہوگی۔ صوبہ سرحد کو خان عبدالقیوم خان کی ہوسِ اقتدار کے افعال نے ہمیشہ کے لئے پرابلم بنا دیا۔ اگر مسٹر نورالامین (اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے) مشرقی پاکستان میں اپنے اقتدار کا شکنجہ نہ کستے تو ممکن تھا کہ وہ صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی جو تخریبی عناصر کے ہاتھوں بنگلہ دیش تک پہنچی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ مسٹر نورالامین اپنے طویل دورِ اقتدار کے بعد صوبائی انتخابات میں ایک طالب علم سے شکست کھا گئے تھے۔

غرض ؎

پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغدار شد

۴۔ جو لوگ سیاسیات کی سطحی فضا میں اپنے شب و روز بسر کرتے ہیں انہیں دھوکا دینا مشکل نہیں کیونکہ پاکستان میں اس قسم کی فصل بآسانی کاشت کی جا سکتی ہے۔ ہم ممنون ہوں گے اگر لیگ ہی کے مخلصین اپنے سچے دماغوں سے کام لے کر ہمیں مطلع فرمائیں کہ

ہفت روزہ چٹان لاہور۔

جو لوگ تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے اور برٹش امپیریل ازم کے خلاف تمام عمر جدوجہد کرتے رہے اُن میں سے کس نے پاکستان کو کیا نقصان پہنچایا اور اُس نقصان کا پاکستان کی سیاسی ترازو میں وزن کیا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہر دور کی حکومت نے اُن لوگوں ہی کو پاکستان سے غداری کا الزام دے کر قید و بند میں ڈالا ہے جو مسلم لیگ میں شامل نہ ہوئے اور برعظیم کی آزادی کے لیے برطانوی حکومت سے لڑتے رہے۔

۵۔ پاکستان کے موجودہ نازک حالات میں بھی لیگ کا ذہن بہ استثنا تاریخی کج رویوں کا شکار ہے۔ اس ذہن کے بیشتر افراد ابھی تک قبل از آزادی کی لیگی سیاست میں ڈنڑ پیل رہے ہیں اور اُن کے قلم و زبان سے اس طرح کے مضمون نکلتے ہیں کہ اُن کے دماغی افلاس پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کی دردناک علیحدگی کے بعد قومی فکر و نظر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور ہم تاریخ سے سبق لے کر اپنے اعمال و افکار پر نظر ثانی کریں گے لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حزبِ اقتدار نے پرانے دور کی شخصیات و تصورات کو منسوخ کر دیا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی گوشہ نشین ہو گئے جن کی دیانت و صداقت کی قسم کھائی جا سکتی ہے لیکن مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جیسے متحرک سیاست دان نے بھی ان کھنڈروں کو اپنی عمارتِ نو میں شامل کیا جن سے پاکستان کی خوبصورت عمارت میں شگاف پڑے تھے۔ اگر نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ہائی کمان میں تصادم نہ ہوتا تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خان عبدالقیوم خان کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوتی لیکن اس مردِ آہن نے شریکِ کابینہ ہو کر وہی سیاسی خلفشار پیدا کیا جس نے قائد اعظمؒ کے پاکستان کو برباد کر ڈالا۔ ہم کس سے کہیں اور کیونکر کہیں کہ ہر چیز ہمارے بس سے باہر ہے۔ اپنے رب سے دعا ہی مانگ سکتے ہیں کہ وہ ہم میں اتنی ہمت و استقلال پیدا کر دے کہ ہم اپنے ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن جائیں اپنی قوم کے لیے سرمایۂ نازش بنیں اور کچھ عرصہ کے لئے اُن تمام اختلافات کو آگ لگا دیں جو ملک کے استحکام کو مجروح کر رہے ہیں۔ ہم حزبِ اختلاف کے قابلِ احترام راہنماؤں سے عرض کریں گے کہ وہ اُس تقاضے پر چوٹ لگانے سے پرہیز کریں جس سے کہ یہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے بھی ادب کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اُن لوگوں پر انحصار نہ کریں جو اُن کی قیادت کے راستے میں اپنے وجود کی تعمیر کر رہے ہیں اور جن کی شخصیتیں مصنوعی ہیں۔ آج کوئی سی قوم سیاسی ذائقہ سے محروم نہیں کی جا سکتی لیکن حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کو اس امر کا ضرور احساس کرنا چاہیئے کہ جو قوم اپنی ہی غلطیوں سے بحران میں داخل ہو چکی ہو اُس کے لئے سیاسی تجربے کس قدر خطرناک ہوتے ہیں

بم کہاں سے آتے ہیں

پاکستان کے صوبائی اضلاع سے دوسرے تیسرے روز ایسی خبر ضرور آ جاتی ہے کہ فلاں جگہ بم پھٹ گیا۔ فلاں نقصان ہوا، اور اس کے اجزا بم کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے پولیس کی معرفت فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔ اس کے بعد معلوم نہیں ہوتا کہ ان اجزا کا تجزیہ کیا گیا۔ ہم حیران ہیں کہ پاکستان میں یہ وبا کیونکر پھوٹی؟ اور اس عوامی دور ہی میں اس کا آغاز و تسلسل کس حوصلے اور برتے پر ہے؟ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ ملک میں ناجائز اسلحہ کی بھرمار ہے اور اب تو جامعات کے طلبہ بھی فونٹین پن کے بجائے ریوالور رکھتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ناجائز اسلحہ کی برآمدگی کے سلسلہ میں پولیس گاہے گاہے جو نمائش کرتی ہے وہ بڑی حد تک مصنوعی ہوتی ہے اور بعض ایس پی اور یا ان کے افسر حکام بالا کی خوشنودی حاصل کرنے یا کسی انعام و اعزاز کی خاطر اس قسم کے کرتب رچاتے ہیں لیکن بموں کے دھماکے کئی اعتبار سے خطرناک ہیں۔ آخر اس گروہ کی تلاش میں حکومت ابھی تک کیوں ناکام ہے جو اس قسم کی مشقِ ناز میں مصروف ہے۔ ہم اپنے

طویل سیاسی تجربہ کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا ناٹک دایاں یا بایاں بازو کے لوگ نہیں کھیلتے۔ عموماً بایاں بازو کے شوریدہ دماغ نوجوان ان حرکتوں کے مرتکب ہوتے یا پھر گمراہ طبیعتوں کو اپنے ڈھب پر لا کر تخریبی عناصر اس طرز کے مظاہرے کرتے ہیں۔ یہ دھماکے اس لئے اور بھی افسوسناک ہیں۔ کہ پاکستان خود ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہم نہ تو اپنے ملک کو شل دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ وانا اسپند کی طرح کا رقص چاہتے ہیں جو آگ کی گرمی پا کر توے پر رقص کرتا ہے۔

مشرق بابت ۱۱ مئی کے صفحۂ اول پر اس خبر سے حیرت ہوئی کہ سکھر کے مہران مرکز میں مولانا غلام غوث ہزاروی کے جلسے میں دو بم پھٹے۔ نتیجۃً متعدد افراد زخمی ہوئے۔ اُن میں سے چند کی حالت نازک ہے۔ ایک شخص جمال الدین کو حراست میں لے لیا گیا۔ مولانا ہزاروی بال بال بچ گئے۔ جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ گئی۔"

اس قسم کے دھماکے کہاں نہیں ہوئے اور کہاں نہیں ہو رہے جیسا کہ عرض کیا پولیس کا فرض تھا کہ اب تک ان عناصر کا سراغ لگا چکتی لیکن ابھی تک اس کے قطعی نتائج سامنے نہیں آئے۔ یہ صحیح ہے کہ سرحد و بلوچستان میں اس طرز کے بعض تخریب کاروں کو سپیشل عدالتوں نے سزائیں دی ہیں لیکن پنجاب اور سندھ میں ہماری معلومات کے مطابق ایسا کوئی مجرم گرفتار نہیں ہوا۔ اگر لاہور کے شاہی قلعے یا سندھ کے کسی تہ خانے میں ایسا کوئی مجرم زیر تفتیش ہے تو ہم اپنی عدم واقفیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑی چیز جو ہمارا موضوع نہیں عرض کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔ وہ پولیس کی سپیشل برانچ کا نظم و نسق ہے۔ کیا یہ چیز معنوی اعتبار سے غلط نہیں کہ پولیس کے مناصب سیاسی طور پر تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ یا پھر پولیس افسروں کا تقرر و عزل ذاتیات کی چیز ہو چکا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں سپیشل برانچ دی۔ آئی۔ ڈی، کے سپرنٹنڈنٹ وہ لوگ ہوتے جو صوبائی اضلاع میں ایک مدت گزار کر

اپنے شعبے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوتے لیکن حالات کی ستم ظریفی ہے کہ انٹیلی جینس بیورو میں کئی ایک نوجوان غزل کا مضمون ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ملکی مفاد کی سراغرسانی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اب صرف پارٹی پالیٹکس ہی کو ملحوظ و مقدم رکھا جاتا ہے۔

"تاریخ سے فرقہ وارانہ مذاق"

اس ۹ مئی کو نیشنل سنٹر لاہور میں اس موضوع پر مذاکرہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اصل میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تحریک تھی، ہم نے اس کی روداد روزنامہ "مشرق" کے ایک کالم نویس کی معرفت دیکھی ہے اور اس تقریب کے محترم مقررین سے بہ ادب کہنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کو پامال نہ کیجئے۔ تاریخ صحافت نہیں تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ ایک بنیادی چیز یہ بھی ہے کہ جو اساتذہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ پڑھاتے ہیں وہ مورخ نہیں ہوتے۔ معلم ہوتے ہیں۔ یہ چیز بالکل غلط ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تحریک تھی۔ اولاً تو یہ موضوع ہی غلط تھا اور کسی تاریخی سچائی کے ساتھ اس کا تعلق نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ پروفیسر انجم رومانی نے جو ریاضی کے اُستاد اور مشہور شاعر ہیں اس کا انکشاف کیونکر کیا جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ کونسی کتاب ہے جس سے آپ نے یہ حوالہ اخذ کیا۔ اُس کا نام کیا ہے اور مصنف کون ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں کچھ یاد نہیں رہا اور کہا تو صرف اتنا کہ ہندوستان سے حال ہی میں ایک کتاب چھپی ہے تعجب ہے کہ جو چیز حال ہی میں چھپی ہے اور انجم رومانی صاحب تک حال ہی میں پہنچی ہے اُس کے مندرجات تو انہیں یاد رہے لیکن اُس کا نام اور اُس کا مصنف یاد نہ رہا۔ غالباً یہی چیز ہے جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا تھا کہ

رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

اگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جداگانہ قومیت کی تحریک ہوتی تو انگریز مصنف اس کا عنصر ضرور الاپتے کیونکہ اس وقت سے لے کر تحریکِ خلافت تک اُن کی سب سے بڑی ضرورت یہی تھی۔ ہم نے اس سلسلے میں انگریز مصنفین کی بہت سی کتابیں دیکھیں، میں اور اُن فوجی افسروں کی بعض یادداشتیں بھی مطالعہ کی ہیں۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی کو فرو کیا کسی نے اشارۃً یا کنایۃً اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ پروفیسر انجم رومانی نے محض ایک بے سروپا روایت کے غبارے اڑائے ہیں۔ اگر ہندوستان میں ایسی کوئی کتاب چھپی ہے تو کسی منگھڑنے کی احمقانہ تصنیف ہوگی۔ ورنہ ہندوستان میں اس سلسلے کی جس قدر کتابیں چھپی ہیں اُن میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔

افسوس ہوتا ہے جب دانشور کہلانے والے لوگ اس انداز کی پتنگیں اُڑا کر تاریخ کے چہرے پر کالک ملنے کی احمقانہ جسارت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اس ذہن کے لوگ کن خطوط پر کونسی تاریخ مرتب کرنا چاہتے ہیں۔

"دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ"

پچھلے دنوں آزاد کشمیر کے جمہوری صدر جناب منظر مسعود نے فرمایا تھا کہ سردار عبدالقیوم کے بارے میں عنقریب ایک قرطاسِ ابیض شائع کیا جائے گا جس سے معلوم ہوگا کہ وہ اپنے دورِ اقتدار میں کن بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ نے اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ سردار صاحب کی بدولت ایک کروڑ روپیہ سے زائد کی رقم بدعنوانیوں کی نذر ہوگئی۔ آج جناب سردار محمد ابراہیم نے راولپنڈی سے ایک بیان میں کہا ہے کہ دو تین روز میں سردار عبدالقیوم خان کی بدعنوانیوں سے متعلق متحدہ محاذ قرطاسِ ابیض شائع کر دے گا۔

واضح رہے کہ سردار ابراہیم چار جماعتی متحدہ محاذ کے اُمیدوار ہیں انھیں کشمیر کے عوام چاہیں یا نہ چاہیں لیکن صدارت کا قرعۂ فال انھیں کے نام نکلے گا کیونکہ اس سیاسی دور میں وہی سہاگن ہوتی ہے جس کو پیا

ہفت روزہ چٹان لاہور

چاہتا ہے۔ ہمیں آزاد کشمیر کے انتخابات میں کسی پارٹی یا اُس کے امیدوار سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا فیصلہ عوام کریں گے کہ اُن کے لئے کونسا صدر موزوں ہو سکتا ہے لیکن جب منظر مسعود اور سردار ابراہیم اپنے سابق لیڈر سے متعلق بدعنوانیوں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے کہ کیا یہ سب اور کیوں کہہ رہے ہیں جو چیزیں انھیں اب یاد آئی ہیں کیا اُس وقت اُن کے سامنے نہ تھیں جب وہ اقتدار میں تھے اور جب سیاست کی اڑانوں نے انہیں اقتدار سے محروم کر دیا تو اُن پر یہ سب بدعنوانیاں واشگاف ہوتی ہیں۔ یہ حسن و خوبی نہیں کہ جب کوئی شخص اقتدار میں ہو تو برہمن کے بُت کی طرح اُس کی پوجا کی جائے اور جب سیاسی آویزش کے باعث اقتدار سے محروم کر دیا جائے تو اُس کے خلاف ہر جرم اُبھر آئے۔ اس قسم کی چیزیں ان حالات میں کسی کے خلاف نہیں کہی جا سکتیں۔ ہم انتہائی ادب کے ساتھ یہ کہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ منظر مسعود اور سردار ابراہیم سیاسی اعتبار سے ابھی نابالغ ہیں وہ اس قسم کے بیان دے کر سری نگر ریڈیو کو آب و دانہ مہیا کر سکتے ہیں۔ کیا ہماری قوم میں اقتدار سے محروم ہونے کے بعد ہر شخص بددیانت نکلتا ہے؟ سردار ابراہیم سے کچھ عرض کرنا بے معنی ہے کیونکہ ہم اُن کے متعلق کچھ نہیں جانتے لیکن منظر مسعود سے یہ کہنا خلافِ ادب نہ ہوگا کہ وہ اس حقیقت پر تو غور کریں کہ سردار عبدالقیوم نے انھیں کب سہارا دیا؟ کیونکر سہارا دیا اور کہاں سے کہاں لے گئے؟ ایک عارضی لغزش میں بہک جانا جوانمردی نہیں۔ ابھی دن گذر رہے ہیں اقتدار کی غزالہ اور شاعری کی محبوبہ نے کبھی وفا نہیں کی دونوں جلد جلد آنکھیں پھیر لیتی ہیں ان کے وصال و ہجر میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ ایک فانی اقتدار کے لیے آپ لافانی قدروں کو جھٹلا رہے ہیں۔

ظفر اللہ خاں

ایک جابیا

قادیانی اُمت کے استعماری ناقوس چوہدری سر ظفر اللہ خاں نے اپنے سفید فام آقایان ولی نعمت کے دارالحکومت لندن کی ایک عدالت میں مجلہ رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے فاضل مدیر پروفیسر غفور احمد اور بعض دوسرے اکابر (اسمائے گرامی ابھی معلوم نہیں ہو سکے) کے خلاف اس امر کا مقدمہ دائر کیا ہے کہ ان کے متعلق رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں تقدّر و نظر کیا گیا اور جس جماعت کے وہ رکن رکین ہیں اس کو اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ ہم اس مقدمے کی تفصیلات کے امروز و فردا میں منتظر ہیں اور انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں ظفر اللہ خاں کے دعوے کی تفصیلات شائع کریں گے۔ لیکن حیرت ہے کہ لگ بھگ تین ماہ وہ پاکستان میں رہے تو یہاں ان کی زبان گنگ رہی۔ ایک دلچسپ صحافی کے سوا انہیں کسی مسلمان نے گھاس نہ ڈالی۔ وہ خانہ نشینی کے ایام گزار کر لوٹ گئے۔ کیا اب اپنے مسلمان ہونے کا فتویٰ انگریزوں کی عدالت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بے شک ان کا متنبی انگریزوں کی تصنیف تھا، لیکن انگریز چلے گئے۔ اب لندن کی عدالت سعودی عربیہ کے ایک فاضل ایڈیٹر پاکستان کے ایم۔ این۔ اے پروفیسر غفور احمد اور بعض دوسرے علماء سے متعلق کس قانونی یا اخلاقی بنیاد پر مقدمہ سماعت کر سکتی ہے یا کوئی فیصلہ دینے کی مجاز ہے؟ ہم ظفر اللہ خان سے فی الحال کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ گزارش ضرور کریں گے کہ وہ مقدمہ کا شوق رکھتے ہیں تو پاکستان میں آئیں یا سعودی عربیہ جائیں۔ وہ عالمی عدالت کے چیف جج رہے ہیں لیکن ہر اسلامی ریاست میں ان کی حیثیت ایک خارج از اسلام فرد کی ہے۔ حرمین شریفین میں ان کا داخلہ قرآن کی رو سے ممنوع ہے۔

ہمیں ظفر اللہ خاں صاحب کے اس مقدمے پر امیر حبیب اللہ مرحوم والیٔ افغانستان یاد آ گئے جنہیں مرزا غلام احمد نے اپنی نبوت پر ایمان لانے کے لئے خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ **ایںجا بیا**۔ مرزا صاحب نے سمجھا کہ امیر حبیب اللہ ان کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے۔ اپنا ایک قاصد بھیجا۔ جب مبلغ وہاں پہنچا تو سنگسار کر دیا گیا۔ ہم ظفر اللہ خاں سے عرض کریں گے کہ اپنے بارے میں سعودی عربیہ یا پاکستان کی عدالت سے فیصلہ حاصل کریں۔ باقی سب غلط ہے۔

ایران میں قادیانیت شجر ممنوعہ ہے

دو چار روز پہلے دنیائے اسلام کے فاضل اجل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک دل آویز کتاب "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" اُن کی جانب سے تحفۃً موصول ہوئی ہے۔ یہ ایک دل آویز سفر نامہ ہے جس میں آپ نے افغانستان، ایران، لبنان، دمشق، بغداد اور اُردن سے متعلق نہایت پُر معنی اور بصیرت افروز مشاہدات کے علاوہ تاریخی روایات کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کے اسلوب نگارش میں جو دلکشی ہے وہ اپنی ساحرانہ معراج کے باعث تمام اسلامی ملکوں میں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ مولانا اپنی عربی تصانیف کے باعث تمام عرب ریاستوں میں قبول عامہ کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان ریاستوں کے اہل قلم اور اہل علم میں آپ کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے۔ آپ نے ایران کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "ہمیں ایرانیوں کی دینی غیرت و حمیت دیکھ کر بھی خوشی ہوئی۔ وہ اسلام کے خلاف سازشی تحریکوں کے بارے میں خاصے حساس واقع ہوئے ہیں۔ بہائیت جو ایران ہی میں پیدا ہوئی۔ قانونی طور پر ممنوع ہے۔ اور بہائی مذہب کے ماننے والوں کو اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ **اسی طرح قادیانیت کو بھی خارج از اسلام فرقہ سمجھا جاتا ہے** اور اس سے دینی حلقوں میں خاصی نفرت پائی جاتی ہے۔ کمیونزم اور دہریت کے ساتھ دشمنی میں بھی ایرانیوں کی غیرت و حمیت اسلامی ملکوں کے لیے خاص طور پر پاکستان کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید ہے جس کے ایران سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔"

اقتباس بالا ہم سب پاکستانیوں کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کرتا ہے۔ ہمارے اکا دکا شیعہ بھائی جو تحریک ختم نبوت میں اپنی کسی ذہنی کمزوری کے باعث اگر مگر کے چکر میں تھے، ان کے لئے ایران میں قادیانیت کا خارج از اسلام ہونا ایک ایسی نظیر ہے کہ اس کے بعد کسی سیاسی مصلحت سے وابستہ ہونے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ہم اپنے سنی بھائیوں سے عرض کریں گے کہ وہ اپنے اندر وہی دینی غیرت پیدا کریں جو اُن کا سیزدہ صد سالہ اسلامی ورثہ ہے اور جس کی طرف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے الفاظ بالا میں اشارہ کیا ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

۱۹ مئی ۱۹۸۵ء

پنجاب یونیورسٹی کے ہنگامے

ہم نے ۱۴ اور ۱۵ مئی کے بعض اخبارات میں اس خبر سے ذہنی کوفت محسوس کی کہ یونیورسٹی نیو کیمپس کے ایک لیکچرار کی ایک غیر تعلیمی خلوت سے برافروختہ ہو کر طلبہ کے مابین ہوائی فائرنگ ہوئی جس سے یونیورسٹی کی فضا کشیدہ ہو گئی۔ طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے احتجاجی جلسہ کرنا چاہا تو ہوسٹل نمبر ۵ کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی اس پر پولیس کی بھاری جمعیت اور فیڈرل سیکورٹی فورس کے جوانوں کا بھرپور دستہ کیمپس پہنچا۔ ان ہوسٹلوں کی ناکہ بندی کر دی جہاں سے فائرنگ کی اطلاع ملی تھی۔ نتیجۃً فائرنگ بند ہو گئی۔ وہ لڑکے بھاگ گئے۔ جو فائرنگ میں ملوث تھے۔ ہوسٹل نمبر ۵ کے قریب کیاریوں کو دیکھا گیا تو ایک رائفل، دو خنجر، ایک پستول اور بارہ کارتوس پکڑے گئے۔ غرض ۱۵ مئی کو نیو کیمپس کے ہوسٹلوں میں طلبہ اور طالبات کے تحفظ کی خاطر پولیس اور سیکورٹی فورس کے بہت سے ٹرک موجود تھے۔

پنجاب یونیورسٹی یونین کے صدر مسٹر عبدالشکور نے نوائے وقت کے نمائندے کو بتایا کہ جب تک وائس چانسلر اس لیکچرار کی برطرفی کا اعلان نہیں کریں گے۔ طلبہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے لیکچرار کے متعلق مزید انکشاف کیا کہ اس نے اس سے قبل لڑکیوں کے ہوسٹل میں زبردستی گھس کر ہنگامہ کیا تو اس کو مارشل لاء کے تحت چھ ماہ قید کی سزا دی گئی۔ جو اس نے بھگتی۔ مسٹر شکور نے مزید بیان کیا کہ فائرنگ کرنے والوں کی نشاندہی وائس چانسلر اور پولیس کے اعلیٰ حکام کو کر دی گئی ہے۔ اب اس سلسلہ میں کارروائی کرنا ان کا کام ہے۔

ہم پنجاب یونیورسٹی کے حالات سے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں لیکن صرف اس لئے قلم نہیں اٹھاتے کہ ایک جامعہ کو رسوا کرنا کوئی مستحسن چیز نہیں مگر یہ

ہفت روزہ چٹان لاہور

عرض کرنا غلط نہ ہوگا کہ پنجاب یونیورسٹی اپنی انہی عقوبت کے باعث ایک خطرناک دہانے پر کھڑی ہے کیا جمہوری اقتدار جماعت یہ کہنے کی اجازت دے گی کہ اس کے سیاسی ذوق نے بعض مخصوص نوجوانوں کو بگٹٹ کر دیا ہے۔ آخر اساتذہ اور طلبہ میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ اس سوال پر یونیورسٹی کے محترم اساتذہ کو خود غور کرنا چاہیئے۔ ہم نہیں جانتے جس لیکچرار کی وجہ سے ہنگامہ پیدا ہوا اس کا قصور کس حد تک مجرمانہ تھا۔ اگر اس نے کسی طالبہ کے ساتھ غزل سرائی کی ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ خود ہی یونیورسٹی سے چلا جائے۔ اور یہ فرض حکومت کا ہے کہ وہ ایسے لیے پُرسکون تعلیمی فضا پیدا کرنے کا انتظام کرے۔ حالات انتہائی دردناک ہیں۔ جب تک غلط کاروں کو سزا نہیں ملے گی معاشرے کا صحت مند ہونا ناممکن ہے۔ ان اساتذہ کو کہیں اور بھیج دیجئے جو کتاب و نصاب کے بعد شراب و رباب سے اپنی تنہائیوں میں عمر خیام کی رباعیوں کا سروسامان کرتے ہیں۔

> باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
> بیٹھا ہوں میں گھر میں در و دیوار پہن کر

شیعہ و سنی مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں

دونوں اسلام کی وحدت کا ستون ہیں

خدائے لایزال کے لطف و کرم سے چٹان اپنی زندگی کا اٹھائیسواں برس گزار رہا ہے۔ اس دوران میں آزمائش و ابتلا کی ڈار لگی رہی اور قلم کے بہت سے معرکے رچانا پڑے۔ بسا اوقات دوستوں سے بھی نظری و فکری اختلافات میں تو تکار ہو گئی۔ ظاہر ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہیں لیکن قلم کے سفر میں اس قسم کی پگڈنڈیوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ ناز رہا ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی باہمی آویزش میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ ہم سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ بقول اقبال کہ

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

ہمارے نزدیک مسلمانوں کے تمام فرقے اپنے فروعی اختلافات کی وسعتوں کے باوجود ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں۔ ایڈیٹر چٹان توحید و رسالت کی حدوں سے باہر قدم رکھنا قرآن و سنت کے منافی سمجھتے ہیں۔ اللہ ایک ہے اور تمام عبادتیں اسی کے لئے ہیں۔ جو شخص شرک کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے اعمال و افعال کا خود ذمہ دار ہے لیکن قرآن کی دعوت یہی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ ہم سب کے آقا ہیں۔ ہم نے اپنے رب کو انہی کی معرفت پہچانا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ وہ محمد عربی ﷺ کے ننگ و ناموس اور تعلیم و دعوت پر اپنی جان نچھاور کرنے کا اعزاز حاصل کرے۔ خدا کے بعد ہمارے لئے سب کچھ آقائے دو جہاں ہیں۔

جن مقدس ہستیوں کو حضور ﷺ کے اہلِ بیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی محبت ہمارے لئے پختگیٔ ایمان کا سبب ہے اور جو لوگ حضور ﷺ کے صحبت یافتہ تھے ان کا سفرِ حیات ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ہمیں اُس وقت ذہنی طور پر شدید صدمہ ہوتا ہے جب بعض افراد حضور ﷺ کے خوشہ چینوں میں تفریق کرتے اور اُن سے متعلق سوءِ ادب کا شکار ہوتے ہیں۔

بلاشبہ شیعہ و سنی اسلام کے دو فرقے ہیں۔ اور یہ فرقے آج سے نہیں بلکہ تاریخ اسلام کی اقبال مندی کے دور سے ہیں۔ ان کے مابین اختلاف کا ایندھن ان لوگوں نے جمع کیا ہے جن کے سینے نورِ ایمان سے خالی ہیں۔ اور جو اپنے کارخانۂ ذہن میں اختلافی مباحث تیار کر کے بزعم خویش اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ وہ اہلِ علم میں سے ہیں اور اُن کے قلم یا زبان سے دینِ ابراہیم کو جِلا ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی پوری زندگی میں چٹان کے کسی صفحے کو شیعہ سنی تعصبات سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ایڈیٹر چٹان نے حنفی العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود آلِ رسول ﷺ کی مدحت کو اپنی روح کی غذا سمجھا۔ دل کی توانائی پایا اور دماغ کے لئے فکر انگیز! جس دن سے چٹان نکلا ہے اُسی دن سے لے کر آج تک — عشرۂ محرم میں بالخصوص ایڈیٹر چٹان نے اہلِ بیت کی مدح میں اتنی نظمیں لکھی ہیں کہ شیعہ مسلک شاعروں نے بھی شاید اتنی نظمیں نہ لکھی ہوں۔ ایڈیٹر چٹان کے پاس علامہ حافظ کفایت حسین، مولانا سید محمد دہلوی اور علامہ رشید ترابی کے وہ خطوط موجود ہیں جن میں انہوں نے ایڈیٹر چٹان کے عشقِ اہلِ بیت پر نہایت خوبصورت الفاظ میں تحسین و تبریک کی ہے۔ اب بھی نواب مظفر علی قزلباش، سید جمیل حسین رضوی، علامہ عقیل ترابی، سید ہادی علی شاہ اور سید مظفر علی شمسی اپنے اخلاص و احترام سے نوازتے ہیں۔ ایڈیٹر چٹان کی تمام زندگی اس طرح گزری ہے کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اُس کا ایمان ہے کہ جو شخص خواہ کسی مرتبہ و مقام پر ہو شیعہ سنی مسئلہ کو ہوا دیتا ہے۔ وہ اسلام کی وحدت کا دشمن ہے۔ مسلمانوں کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر پاکستان میں کوئی شخص اختلاف کی اس مجرمانہ حرکت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ ملک کی سالمیت کا دشمن ہے اور اصل دشمن سے کم خطرناک نہیں۔

چٹان کے سطور ستائیس برس اسی حقیقتِ کبریٰ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اب یہ سطور لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ راولپنڈی سے ایک کرم دوست نے مطلع کیا کہ ۱۷ مارچ کے چٹان میں ۲۹ ویں صفحہ پر "قومی ذہن کی تعمیر" کے زیرِ عنوان مقالہ نگار کا حوالہ دیئے بغیر ایک مضمون چھپا ہے جس میں شیعہ و سنی موازنے کے تحت اختتام میں دو چار فقرے ایسے ہیں جن سے اتحادِ ملّی کا ذائقہ خراب ہوتا ہے۔ ایڈیٹر چٹان جولائی ۷۴ء سے بیمار ہے اور اب اس جنوری سے افاقے کی صورت قائم ہوئی ہے لیکن ڈاکٹروں نے پڑھا لکھی سے منع کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہر ہفتہ اداریہ

باقی ص ۲۶ پر

ہفت روزہ چٹان لاہور

آخری قسط

الحاج شیخ ضمیر الدین
احمد فوڈ انڈسٹریز کراچی

قومی ملکیت

○ ایک تصور ○ ایک تحریک ○ ایک منصوبہ

اشتراکی تحریک اور اس کے نظریہ کی اس تفصیل سے بہر حال یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ "قومی ملکیت" کے نظریہ کی ابتداء اور منتہا کیا ہے؟ اور اس کے پیش نظر اصل مقصود کونسا ہے؟ اب اگر کوئی شخص پورے خلوص کے ساتھ ملحدانہ اشتراکی عقیدۂ زندگی قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور دو وقت کی روٹی کے بدلے میں اپنا دین و مذہب، تہذیب و شرافت، عزت و آزادی اور تمدن و ثقافت سب کچھ قربان کر دینے کے لیے بخوشی آمادہ ہے تو بلاشبہ ہمارے معاشرے میں اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مقصد کی خاطر "قومی ملکیت" کے تصور کی تائید کرے لیکن ساتھ ہی اس کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ ایک مرتبہ اشتراکی معاشرے میں پہنچ گیا تو پھر وہاں اس کو یہ حق حاصل نہیں رہے گا کہ اپنے ذہن سے کچھ سوچ سکے یا کسی پسندیدہ خیال کی تائید کر سکے یا جن دو روٹیوں کے لئے اس نے اپنی عزت و آزادی کا سودا کیا ہے ان پر بھی اپنا کوئی حق جتا سکے۔

لیکن وہ لوگ جنہیں اپنا دین، اپنی تہذیب اور اپنی آزادی عزیز ہے ان کے نزدیک "قومی ملکیت" کا تصور صرف مہمل ہی نہیں بلکہ قومی اور تہذیبی خودکشی کے مترادف ہے۔ اہل پاکستان کو اس معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے کہ ہمارا ملک خالص دینی نوعیت کا حامل ہے اور یہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جہاں آزادی سے قبل برِصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی۔ چنانچہ یہاں جو مملکت قائم ہوئی اس کی حدود جغرافیائی آثار کی متعین کردہ نہیں ہیں - نہ کسی خاص رنگ و نسل اور کسی مشترک زبان بولنے والوں کی آبادی پر یہ مملکت مشتمل ہے نہ کسی فوجی تسخیر کے نتیجے میں اس کا ظہور ہوا ہے بلکہ ان سب کے علی الرغم صرف ایک دینی اساس پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا ہے۔ پھر سب سے پہلی دستور ساز اسمبلی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق قرار دادِ مقاصد کے ذریعہ سے اس مملکت کی حقیقت اور مقصد بھی یہی متعین کیا کہ یہ اسلامی مملکت ہے اور ایک دینی معمل کی حیثیت سے وجود میں آئی ہے - ۱۹۷۳ء میں ہماری مملکت کا جو دستور وضع کیا گیا ہے اس کی رو سے بھی پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے اور یہاں کا سرکاری دین اسلام ہے - یہاں جو قانون سازی بھی کی جائے گی وہ قرآن اور سنت کے مطابق کی جائے گی اور یہاں جس طبقے کو بھی اقلیت قرار دیا جائے گا وہ لازماً غیر مسلم ہوں گے۔

پاکستان کی اس دینی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "قومی ملکیت" کے اس نظریہ کو جو خالصتاً اشتراکی ہے اور جس کی بنیاد الحاد اور مادہ پرستی پر رکھی گئی ہے کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے اور جب یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اشتراکیت کا اصل مقصد و منصوبہ ہمارے دین اور آزادی ہی کو ختم کرنا ہے تو پھر اس کی مخالفت نہ کرنا خود اپنی موت کے محضر نامے پر دستخط کر دینے کے مترادف نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

البتہ وہ لوگ جو مخلصانہ غلط فہمی کا شکار ہیں اور اپنے دین و مذہب کے تحفظ کے ساتھ ساتھ معیشت کی اصلاح کے بھی خواہشمند ہیں اس لیے وہ "قومی ملکیت" کو ایک علاج کے طور پر قبول کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان سے میری دردمندانہ گذارش یہ ہے کہ وہ اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ فرمائیں۔ انشاء اللہ ان کی تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ "قومی ملکیت" کے نظریہ کو بدرجہ مجبوری قبول کر لینے کی روش ہرگز ان کے شایانِ شان نہیں۔ آپ اپنا نظام قائم کیجئے جسے اللہ اور رسول ؐ کی تائید اور سند حاصل ہے اور اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو کم از کم غیروں کے غلط نظاموں کے آگے تو سر نہ جھکائیے۔ ایمان کا یہ کم سے کم نصاب ہے۔

ستر دینِ مصطفےٰ گویم ترا

ہفت روزہ چٹان لاہور

تاریخی سرگذشت

تحریر:- محمد اقبال ندوی

قبرص — سائپرس

پاکستان کے تمام روزناموں میں ۱۱ مئی کی صبح کے اخبارات میں قبرص سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی کہ وہاں یونانی غنڈوں نے مسلمانوں کے ۱۰۳ گاؤں اُجاڑ ڈالے اور ایک سو سے زائد مسجدیں اور درگاہیں ویران کر دی ہیں، قبرص کے بارے میں گاہے ماہے اس طرز کی خبریں آتی ہی رہتی ہیں، کہ وہاں نصرانی مسلمانوں کے بے اپنی اکثریت کے زعم میں کیونکر وحشیانہ حرکات کرتے ہیں۔ قبرص کے مفتیٔ اعظم مصطفیٰ رفعت نے پاکستان میں الاحیاء کے چودھری نذیر احمد کے نام ایک برقی پیغام میں اطلاع دی ہے کہ یونانیوں نے شدید لوٹ مار مچا رکھی ہے ہم قبرص سے متعلق ذیل کا مضمون دارالمصنفین اعظم گڑھ (انڈیا) کے مشہور مجلّہ معارف کے تازہ شمارہ سے نقل کرتے ہیں، یہ مضمون دارالمصنفین کے ناظر کتب خانہ جناب محمد اقبال ندوی کے قلم سے ہے اور اس میں قبرص کے تاریخی حالات کی مستند تفصیلات ہیں۔ (ادارہ)

قبرص بحر متوسط کے مشرقی حصہ میں ایک جزیرہ ہے، جس کا رقبہ ۹ ہزار ۲ سو پیاسی کلومیٹر ہے، اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ یونانی .... ۴۳ ہ ___ اور ترک ایک لاکھ ہیں، اس کا دارالسلطنت نیکوسیا ہے اور اس کے مشہور شہر لیماسول اور فاماگوستا FAMAGUSTA ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب شام پورے طور پر جب اسلامی حکومت کے دائرہ میں شامل ہو گیا اور حضرت معاویہؓ اس کے گورنر مقرر ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ رومیوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے مسلمانوں کو بحری طاقت حاصل کرنا ضروری ہے، لیکن عراق شام و مصر کے معرکوں میں بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور جاں باز سپاہی شہید ہو چکے تھے اور بڑی لڑائیوں کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ کی احتیاط پسند اور مآل اندیش طبیعت نے بحری لڑائی کی اجازت نہیں دی، چند برس میں اسلامی اقتدار مستحکم ہو گیا تو حضرت عثمانؓ کے دور میں بحری مہم کی اجازت مل گئی، حضرت معاویہؓ نے جنگی کشتیوں کا ایک بڑا زبردست بیڑہ تیار کیا، سائپرس (قبرص) بحر روم میں کلید کی حیثیت رکھتا تھا، اور شامی سرحد سے قریب تھا، مصر سے بھی آسانی سے مدد پہنچ سکتی تھی، اس لیے حضرت معاویہؓ نے اس طرف اپنے بیڑہ کو حرکت دی، مصر سے عبداللہ بن سعدؓ بھی کمک لے کر آ گئے، اور قبرص پہنچ کر اس کے ساحلی علاقہ پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن اہل قبرص نے جنگ کے بجائے سالانہ سات ہزار دینار ادا کرنے کے وعدہ پر صلح کر لی، یہی رقم وہ اس سے پہلے رومیوں کو دیتے تھے، اس کے ساتھ انہوں نے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے۔ اور ہمیشہ مسلمانوں کو رومی دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہیں گے۔

لیکن اس معاہدہ کے خلاف انہوں نے ۳۲ھ میں مسلمانوں کے خلاف جنگی کشتیوں اور اسلحہ سے رومیوں کی مدد کی، تو حضرت معاویہؓ نے ۳۳ھ میں قبرص پر دوبارہ چڑھائی کی، لیکن وہاں کے باشندوں نے پھر صلح کر لی، اس مرتبہ وہاں کا نظم و نسق قابو میں رکھنے کے لیے، امیر معاویہؓ نے بارہ ہزار تربیت یافتہ فوج روانہ کی، جنہوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور شہر آباد کئے۔ امیر معاویہؓ کی وفات تک وہاں کے باشندے خراج دیتے رہے، لیکن ان کے بعد پھر خراج دینا بند کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں تادیبی کارروائی کی جاتی رہی، اور بنو امیہ اور بنی عباس کے طاقتور عہد میں یہ جزیرہ اسلامی حکومت کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے پایا۔

جب بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی حملوں حملوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو ۱۱۹۱ء میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ سسلی سے شامی شہر عکا کی جانب روانہ ہوا تو تیز طوفانی ہواؤں نے اسے منزل مقصود کی بجائے جزیرہ قبرص کے ساحل پر پہنچا دیا۔ قبرصی حکمران اسحٰق کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو اس نے اس جنگی قافلہ کو گرفتار کرنے کا اور اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا۔ رچرڈ خود تو ہاتھ نہیں آیا، مگر اس کی "ملکہ" "بہن" اور اس کے خاوند گرفتار ہو گئے، رچرڈ بہت غضبناک ہوا، اور چند دنوں کے بعد قبرص پر فوج کشی کر دی۔ اور معمولی جنگ کے بعد قبرص کے دارالسلطنت

پرفا بض ہوگیا اسحاق نے اپنے آپ کو رچرڈ کے حوالے کر دیا، اس کے بعد رچرڈ قبرص کا انتظام ایک فوجی دستہ کے سپرد کر کے عکا کی جانب روانہ ہو گیا اور ایک عرصہ تک محاصرہ کے بعد جون ۱۱۹۱ء میں اسے فتح کر لیا۔

رچرڈ کی فتح کے بعد قبرص صلیبیوں کی تحریک کا مرکز بن گیا، جس کا اندازہ عکا کے محاصرہ سے ہوتا ہے، ابن اثیر کے قول کے مطابق وہ انگریزوں کی طاقت کا ایک عظیم مرکز ہو گیا"۔

پھر ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے جب بیت المقدس فتح کر لیا تو یہاں کا فرانسیسی حکمران لوزنجان قبرص چلا گیا، اس طرح قبرص فرانسیسی مملکت کا ایک حصہ ہو گیا، جس کی غمازی فرانسیسی تہذیب آج بھی کر رہی ہے، لوزنجان اور وہ فرانسیسی جو یہاں آباد ہوتے تھے، عرصہ تک مقیم رہے۔ عصر حاضر میں بھی شہر نکوسیا، مشہد اور اس کے گرد و نواح میں فرانسیسی معماروں کی تعمیر کردہ عمارتوں، محلوں اور کلیساؤں سے فرانسیسی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔

قبرص ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بحر روم کے دروازے مسیحی حملہ آوروں کے لیے کھل گئے اور اسلامی ممالک ان کے حملوں کی آماجگاہ بن گئے، چنانچہ ۱۳۶۵ء میں اسکندریہ پر شدید حملہ ہوا، یہ جمعہ کا دن تھا کسی حملہ کا خیال نہ تھا، لوگ نماز ہی میں تھے کہ عیسائی فوجیں اسکندریہ میں اتر گئیں اور بڑی بے دردی سے قتل و غارت گری کی، لیکن اس جنگ میں مال غنیمت کی کثرت اور مسلمانوں کے شدید نقصان کے باوجود پطرس کو لوٹ مار کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا، عباسی تو برائے نام خلیفہ تھے، مصر پر مملوک سلاطین کی حکمرانی تھی، چنانچہ ان کی طرف سے فوج بھیجی گئی، لیکن مسیحی حملہ آور اور ان کا سردار اس سے پہلے بھاگ چکے تھے۔ بقول نوبری کے پطرس چور کی طرح اسکندریہ میں داخل ہوا، اور چوری کر کے نکل گیا۔ اس کے بعد اگرچہ اس کا کوئی حملہ نہیں ہوا، مگر کھٹ پٹ کا سلسلہ بند نہیں ہوا اور مصر کے شمالی علاقہ میں رابر مسیحی حملہ کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

آخر ۱۴۲۲ء میں جب سلطان برسبائے مملوک سلطنت کا تخت نشین ہوا، تو اس نے گذشتہ اولوالعزم بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا، اور قبرص کو فتح کر کے از سر نو اپنی حکومت میں شامل کر لینے کا منصوبہ بنایا، وہ ارادہ کر ہی رہا تھا، کہ اچانک حالات نے اس کا موقع پیدا کر دیا، کہ ۱۴۲۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی کشتیوں کو ساز و سامان اور سوتے زائد مسافروں کے ساتھ گرفتار کر لیا اور قبرص کے حکمران نے بدایا دیگر اپنے قبضہ میں کر لیا تو برہم ہو کر اپنے ارادہ کو برسبائے نے مزید مستحکم کیا اور قبرص کو فتح کر لینا کا فیصلہ کیا۔

برسبائے نے جزیرہ قبرص پر تین مرتبہ فوج کشی کی، پہلی بار ۱۴۲۴ء میں حملہ کیا، ان کے جنگی جہازوں کو تباہ اور لیماسول کے بعض علاقو تاراج کرنے کے بعد قیدیوں کی بڑی تعداد اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ مصر واپس آیا۔

دوسرا حملہ پہلے کی بہ نسبت وسیع تھا، ۱۴۲۵ء کے موسم گرما میں مصری ساحلوں سے حملہ آور ہوا، اور بیروت، طرابلس و شام سے گذرتا ہوا، قبرص کے شمالی مشرقی ساحل قرباص کے بندرگاہ پر جا پہنچا اور وہاں فاجوستا کے جانب رُخ کیا، سوار اور پیدل فوج کے خشکی پر قدم رکھتے ہی فاجوستا کے حکمراں نے اختیار کر لی۔ شہر کے قلعہ پر فتح کا پرچم لہرانے کے بعد بادشاہ کو امان دی دی مسلمانوں نے چار روز میں قرب و جوار کے علاقہ کو فتح کر کے ملاحہ کا رُخ کیا، جہاں قبرصیوں کے ساتھ سخت معرکہ ہوا، اس جنگ میں قبرصیوں اور ان کے معاون انگریزوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا، مسلمان شکست فاش دینے کے بعد لیماسول پہنچے اور قلعہ کے ایک بڑے حصہ کو مسمار کر کے شہر کے اندر داخل ہو گئے اور قلعہ پر اپنا شاہی علم نصب کر دیا

باقی صفحہ ۲۵ پر



ہفت روزہ چٹان لاہور

از ڈاکٹر سید عبداللہ



نظریہ خودی کی سہل ترین تشریح

خودی کا سلسلہ عمل

ا۔ تخلیق مقاصد

خودی کا جوہر فطرتاً ہر شے میں (کائنات کی ہر شے میں) موجود ہے اور اس کی ترقی کے وسائل بھی ہر شے کو عطا ہوئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شے خود بخود بڑھتی جاتی ہے۔ جہاں خودی قوی ہو کر ارتقا کا باعث بن سکتی ہے وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ خودی بعض اسباب سے ضعیف ہو کر مر بھی جاتی ہے۔

نیچر کی حد تک اس کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان کی تشریح ارتقا کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ البتہ انسان کے معاملے میں خودی کے ضعف و استحکام کی گفتگو یہاں برمحل بلکہ ضروری ہے۔

خودی کا عمل تخلیق مقاصد سے وابستہ ہے یعنی اعلیٰ مقاصد حیات کی آرزو اور ان کے لئے جدوجہد خودی کا خلاصہ ہے۔ نیچر کی حد تک یہ مقاصد خود نیچر کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ انسان بھی نیچر سے آزاد نہیں بلکہ اس کے عمل کی حدیں بہت وسیع ہیں کیونکہ اس کی صلاحیتیں خصوصاً حرکت کی قوت اور تجزیے اور تنظیموں کی صلاحیتیں انسان سے مخصوص ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد حیات کی آرزو قلب انسانی میں پیدا کیوں ہوتی ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں۔

یہ آرزو دو طرح یا دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔

الف: اس قدرتی جوش حیات سے جو کائنات کے ذرے ذرے میں نظر آ رہا ہے۔ جو بیج سے درخت بناتا اور گل پھول لگاتا رہتا ہے اور نسل و تنوع کو بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ محرک فطری ہے۔ اسے اقبال کے قول کے مطابق نقطۂ نوری کہہ ڈالئے یا برگساں کے خیال کے مطابق جوشِ حیات کہہ دیجئے، یہ عطیہ ربانی ہے جو ہر شے کو عطا ہوا ہے۔ یہ آرزو کا منبع اول ہے۔ اقبال کے کلام میں عشق بھی اسی کا نام ہے۔

ب۔ دوسری شے جو آرزو کی خالق اور اس کو تقویت دینے والی ہے وہ انسان کا یہ احساس ہے کہ دنیا میں اس کے ہمسر اور بھی ہیں۔ ان سے فائق ہونے یا ان میں فائق ہونے کا جذبہ انسان کا ایک بنیادی جذبہ ہے۔ میکڈوگل نے انسانی جبلتوں کی جو فہرست تیار کی ہے اس میں غلبہ پانے کی جبلت بھی شامل ہے۔ یہ جبلت اپنی ابتدا میں فوقیت حاصل کرنے کے میلان کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ جبلت انفرادی ہونے کے باوجود دراصل اجتماع سے وابستہ ہے۔ دوسرے انسان نہ ہوں تو فوقیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ج۔ محض ٹکراؤ سے بھی ایک احساس پیدا ہوتا ہے (جسے پیکار کہا گیا ہے) مگر محض ٹکراؤ نچلی درجے کی زندگی کی خاصیت ہے۔ انسانی درجے میں فوقیت کا جذبہ موثر ترین محرک ہے۔ برتر انسانوں کے ٹکراؤ کے لیے جو ایک شعوری اور اخلاقی میلان ہے ذوق تسخیر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اپنی انتہا کے اعتبار سے معیوب بھی نہیں اور اس کے سلسلے میں جو پیکار لازمی ہو جاتی ہے اس میں تابعیت، توافق اور عادلانہ جارحیت تینوں شامل ہیں، تغلب یا میلان ظلم میں شامل نہیں۔ انسان ایک با اقتدار مخلوق ہے۔ نیچر کی طرح بے اقتدار نہیں یعنی نیچر حیات کی نچلی سطحوں کے لئے دیئے گئے قانون پر بے محابا عمل کرتی ہے۔ انسان کا عمل بے محابا نہیں ہوتا یہ بامقصد ضرور ہے مگر بے محابا نہیں، محکم ہے مگر ظالمانہ نہیں۔

خاص عنصر یہ کہ مقاصد کی آرزو انسان کی حیوانی فطرت کے علاوہ اس کی اجتماعی فطرت کا عنصر ہے۔ سو اس اجتماعی حس سے فرد واحد کی حد تک بھی مستفید ہوتا ہے اور جماعتی دائرے میں جو جماعتی مقاصد کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ اور جماعت اپنے مقاصد اپنے ماحول سے حاصل کرتی ہے۔

یہ حس قومی بھی ہو سکتی ہے اور مرکز دریا بھی۔ اسی طرح یہ حس اگرچہ جبلی اور فطری ہوتی ہے مگر ارادے اور شعور سے اس کا استحکام کی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اور استحکام کے ساتھ اس کی راہیں بھی متعین کی جا سکتی ہیں۔ یہیں سے تعلیم اور تربیت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے جو خودی کے استحکام اور اس کو عادلانہ عمل کی طرف لے جا سکتی ہے۔

۲۔ عشق

گذشتہ بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ خودی کا عمل، آرزو، عشق یا مقاصد کی لگن کا محتاج ہے۔ خودی میں زندگی کو ترقی دینے کی جو صلاحیت ہے اس کی محرک بھی آرزو ہوتی ہے۔ آرزو زندگی کی تکمیل کے عمل میں خودی کو رکاوٹوں سے برسرپیکار رہنا پڑتا ہے اور اس پیکار میں قوت بخشنے والی شے عشق ہے، عشق؛

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیکار ترقی کے لیے محض وسیلہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ اس کے مقابلے میں خودی کا جوہر عشق ہے اور یہ ایک مثبت قوت ہے جو مزاحمتوں کا مقابلہ کرتی اور آگے بڑھ جاتی ہے! یہ عشق کیا شے ہے؟ اس کی تفصیل لازمی ہے۔

عشق اس جذبے کو کہتے ہیں جو طالب کو مطلوب کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ اس کے سرسری معنے ہیں مگر اس جذبے کی ماہیت اور تاثیر کے بارے میں کئی تعبیریں کی گئی ہیں ان سب تعبیروں کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عام سائنسی نقطہ نظر سے عشق، زندگی کو بڑھانے دیا بقائے نوع (کا ایک ذریعہ ہے۔ نر اور مادہ کی باہمی کشش کا نتیجہ وصال اور اس کا نتیجہ تولید ہے۔ یہ بیالوجی یا حیاتیات والوں کی تفسیر ہے۔

۲۔ ڈارون کے نزدیک، میلان بقا و ارتقا کا نام عشق ہے۔

۳۔ صوفیوں کے نزدیک، عام معنوں کے علاوہ محبوب حقیقی سے محبت۔ احساس کی خاطر ہر شے سے محبت۔

۴۔ افلاطون کے ہاں عشق مطلق کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک باقی سب عشق مجازی ہیں۔ اصل چیز جو سرمدی یعنی ازلی ابدی ہے یہی مطلق عشق ہے۔

۵۔ فرائیڈ (جو تحلیل نفسی کا امام ہے) کہتا ہے کہ زندگی کی دو توانائیاں بنیادی ہیں۔ ایک تخریبی قوت جس کا دوسرا نام موت ہے۔ دوسری تعمیری قوت جس کا دوسرا نام عشق ہے۔ یہ دوسری قوت مرد و زن کی کشش سے شروع ہو کر تمام نوع انسان کی محبت تک ترقی کر جاتی ہے (تفصیل ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب فکر اقبال ص ۲۰۰-۲۰۱)

۶۔ عشق آرزو کا خالق جذبہ ہے اور آرزو کا وسیلہ بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ صوفیوں کے نزدیک، عشق ایک تاثراتی یا جذباتی معاملہ ہے۔ حکما کے نزدیک نظریاتی مسئلہ ہے۔

اقبال چونکہ رومی کے خیالات سے بہت متاثر ہیں (اور وہ ایک صوفی بزرگ تھے) اس لیے صوفیوں کے تصور عشق کی گفتگو اگر زیادہ پھیل بھی جائے تو مضائقہ نہیں۔

صوفیوں کا منتہائے مقصود وصال حقیقی ہے یعنی خدا تک پہنچنا اور اس میں جذب ہو جانا ہے۔ صوفی کے مسلک میں یہ سفر بڑا صبر آزما اور طویل ہے۔ مگر وہ جذبہ عشق کی مدد سے ان سب مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔

صوفی کا یہ جذبہ عشق عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ کوئی اندھی بہری قوت نہیں۔ یہ جہاں صوفی کے لیے لذت بخش اور مسرت آفریں ہے اور اس مسرت بخشی کے ذریعے اسے مشکلات سے پیکار پر ابھارتی ہے یہ بصیرت کا سرچشمہ بھی ہے۔ صوفی جب عشق کی منزلوں میں وجد و حال کی کیفیت سے لذت یاب ہوتا ہے تو ان حالتوں میں بسا اوقات اس پر علم کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ یہ علم عقل کی مدد سے حاصل کئے ہوئے علم سے زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔

خودی کے سلسلہ عمل میں مقاصد کی لگن (عشق) بھی ایک اہم چیز ہے یعنی مزاحمتوں کے مقابلے میں حوصلہ اور منزلوں کے لیے علم و بصیرت پیدا کرنے والی

(جاری ہے)

تحریر: اشتیاق اظہر

بشکریہ الجمعیۃ دہلی

بیگم نشاط النساء حسرت موہانی

جن کی ہمت کی مثال ہندوستان کی جدید تاریخ میں بہ مشکل ملے گی۔

برصغیر کی جدوجہد آزادی کا تذکرہ جن خواتین کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، ان میں جھانسی کی رانی اودھ کی حضرت محل، دکن کی سروجنی نائیڈو اور اور موہان کی نشاط النساء بیگم کا نام سرفہرست ہے جنہیں ارباب حریت بیگم حسرت موہانی کے نام سے جانتے ہیں، لیکن اگر ایثار و قربانی، جرأت و ہمت، شرافت و صداقت کے معیار کو مدنظر رکھا جائے تو بیگم حسرت موہانی کی انفرادی خصوصیت اور اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، خود مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ

ایثار، حیا، غیرت، مروت و محبت، فہم و فراست جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا حسن عقیدت، صدق نیت، خلوص، عبادت، حسن خلق، صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشق رسول ﷺ اور محبت حضرات کے لحاظ سے شاید عورتوں بلکہ مردوں میں بھی افراد ایسے موجود ہوں گے، جن کو بیگم حسرت سے بہتر بلکہ برابر جگہ دے سکیں، یہ رائے صرف مولانا حسرت موہانی کی ہی نہیں تھی، بلکہ اس دور کے اکابر مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ، سید سلیمان ندویؒ پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت کشن پرشاد بھی ان کی جرأت و ہمت سے معترف تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے بیگم صاحبہ کو لکھا تھا، تحریر کیا ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں اب تک خالی نہیں ہوئیں، یہ مقام یوسفی کا کامل ترین درجہ ہے، جب میں آپ کی ہمت و استقامت اور اس کے ساتھ آپ کی انتہائی و کسمپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا، کہ قلب کا کیا حال ہوتا ہے، یہ اللہ کی مدد ہے اور اس کی روح القدس کا فیضان جس نے آپ کو ان شدائد اور مصائب میں وہ درجہ عزم بخشا، جو کسی مرد کو بھی آج نصیب نہیں۔

سید سلیمان ندویؒ نے "حسرت کی سیاسی زندگی" کے عنوان سے جو مقالہ "نگار" کے لیے سپرد قلم کیا تھا، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفادار، شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، آج سے ۲۵ برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آئی تھیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں، شوہر کی قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلے کو نکل سکے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ "مولانا کی بیوی ایک نہایت دلیر خاتون تھیں" اور اودھ چیف کورٹ کے سابق جج پنڈت کشن پرشاد کول کا کہنا ہے کہ:

"یہ حسرت کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو بیگم حسرت کی سی رفیق زندگی میسر آئی، کہ حقیقی معنوں میں ان کی دمساز اور ساتھی تھیں۔ ان کی قید و مجبوری — مصیبت و عسرت میں نہایت حوصلہ اور خودداری سے زندگی بسر خندہ پیشانی سے ان کا ساتھ دیا، ان میں فضائل کے وہ تمام جوہر جو حسرت کی شخصیت کا خمیر تھے، موجود تھے۔ ایسی ہی سادگی، پاکیزگی، سچائی، کسر نفسی، ایثار، ہمت و دلیری اور وطن پرستی ان میں بھی تھی، کہ جیسے حسرت میں ان کے خلقی رجحان کے علاوہ حسرت کی صحبت نے انہیں چار چاند لگا دیئے تھے۔

"حالات حسرت" کے مصنف نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر بیگم صاحبہ کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہم خیالی شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم و ثبات کا شاید ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے"

بہرحال بیگم صاحبہ اس عہد حاضر کی ان خواتین میں ہیں، جن کے اگر حالات حیات پردہ راز سے باہر لائے گئے تو دنیا محو حیرت رہ جائے گی۔

مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ

"نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں، رہبر نسواں کانپور نے یقین کے ساتھ یہی سن پیدائش تحریر کیا ہے۔ اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ ان

۱۹ مئی ۸۵ء

[illegible]

کا عقد مولانا حسرت موہانی کی بڑی بہن سے بھی زمانہ میں ہو گیا تھا، چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے جاری رہا ہے، اس لیے محترمہ نشاط النساء بیگم قصبات الدعہ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ آپ کو مذہبی تعلیمات کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی ۔۔۔

زمانہ دو شیزگی میں آپ کا شغل یہ تھا کہ اپنے پسماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھی۔ اور آج آج موہان میں تعلیم نسواں کی جو جھلک نظر آتی ہے تو یہ محترمہ نشاط النساء بیگم کی کوشش اور عالی ایثار کا ثمرہ ہے۔"

اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ نشاط النساء بیگم حافظ سید شبیر حسن موہانی کی صاحبزادی تھیں جو رائے پور اور حیدر آباد دکن میں وکیل تھے، میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے انتہائی قریبی دوست تھے اور دونوں حضرت شاہ وجیہہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحبزادوں سید محمد اور شاہ وجیہہ کی اولاد میں خصوصیت حاصل تھی۔

مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ "اپنے زمانہ حیات میں بیگم حسرت کبھی کبھی راقم کے مقابلہ میں بطریق مزاح اپنی نسبی فضیلت کا دعویٰ کیا کرتی تھیں جن کا انہیں حق بھی تھا، اس لیے کہ وہ شاہ وجیہہ کی پانچویں پشت میں تھیں، جبکہ مولوی حیات الحسن و ابن الحسن کے علاوہ ان کے تمام معاصرین جن میں وہ خود بھی شامل تھے شاہ وجیہہ کی چھٹی اور ساتویں پشت میں ہیں

مولانا کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ "والدہ مرحومہ رشتہ میں والد کی چچا زاد بہن ہوتی تھیں اور مجھے ان کی واحد اولاد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ فرماتی تھیں کہ میں نے تمہاری ولادت کے وقت ہی دعا کی تھی کہ الٰہی اب مجھے دوبارہ اولاد کی تمنا نہیں ہے اللہ نے ان کی اس دعا کو شرف قبول بخشا اور پھر کوئی اولاد نہ ہوئی، میاں بیوی میں انس اور بے پناہ محبت تھی اور ان کی ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار تھی ۔۔۔

محترمہ نعیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ "دونوں کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے، لیکن کبھی کبھی پُرلطف نوک جھونک بھی ہوا کرتی تھی۔ مولانا کے کسی شعر پر تبصرہ فرماتی ہوئی والدہ یہ کہہ دیتیں کہ یہ شعر فلاں کے عشق میں کہا ہوگا بعض وقت وہ خود بھی چھیڑتے اور ان سے کچھ سننے کی خاطر اپنی غزلیں سناتے اور اسی اثنا میں کہتے کہ یہ اشعار کس کی یاد میں کہے گئے ہیں، بس مولانا کا اتنا کہنا انہیں بے چین کر دیتا، فوراً ہی برس پڑتیں، مگر یہ لڑائیاں معمولی نوعیت کی ہوتی تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں حسرت موہانی کی شادی موہان کے ایک معزز خاندان کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ دیہاتی ماحول میں پلی ہوئی لڑکی نہایت جری، باحوصلہ اور ہر طرح سے حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں ثابت ہوئی۔ حسرت

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

مولانا احتشام الحق تھانوی

ذیل کی نظم ایک نوجوان پروفیسر کے خامۂ عنبر شمامہ کی اڑان ہے ۔ وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۔ انہیں اندیشہ ہائے گوناگوں ہیں ۔ ان کی روایت یہ ہے کہ شیعہ سنی، اتحاد اسلام کی بنیادی ضرورت ہے اور جو شخص اس عنوان سے کوئی فتنہ پیدا کرتا ہے وہ ہر لحاظ سے گردن زدنی ہے۔ نصیر اجتہادی کراچی میں ایک لفاظ ذاکر ہیں ۔ انہوں نے محرم میں ٹیلی ویژن پر تبرا کیا۔ لیکن اب باہمی اتحاد کے لئے سرکاری کمیٹی میں شامل کئے گئے ہیں ۔ یعنی خود ہی مجرم اور خود ہی منصف ۔ علامہ رشید ترابی کے فرزند ارجمند علامہ عقیل ترابی نے تو ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کیا ہے ۔ لیکن مولانا احتشام الحق تھانوی نے ان سے معانقہ فرمایا اور ان کے ساتھ کمیٹی کے رکن ہوگئے ۔ نظم ذیل میں یہی استفہامیہ ہے ۔ ——— (ادارہ) ———

تھانہ بھون سے آپ کی نسبت بہ التزام ـــ ازراہِ التفات بتائیں گے احتشام ؟
اشرف علی کے ساتھ تعلق کہاں سے ہے؟ ـــ وہ تھے حضور سید کونین کے غلام ،
اُن پہ کھلے ہوئے تھے رموزِ شہ اُمم ـــ تھے اپنے بے نظیر محاسن سے نیک نام
اور آپ ایک واعظِ شیریں بیاں درست ـــ خوش پوش خوش مزاج خوش اندام خوش خرام
ہر دورِ اقتدار سے نزدیک تر خطیب ـــ زندہ دلانِ کوچہ و بازار کے امام
کھانے میں احتیاط پکانے میں احتیاط ـــ دونوں کے اُور چھور کا رکھتے ہیں اہتمام
ہم عاصیوں میں آپ کی سیرت کا تذکرہ ـــ رندانِ مے پرست میں ہر لحظہ دھوم دھام
قبلہ! بخطا معاف مجھے دیجئے جواب ـــ ازبسکہ یہ سوال نہیں ہے نوائے خام
اُس بدزباں کے ساتھ فروکش ہوئے ہیں آپ ـــ ٹیلی ویژن پہ جس کا تبرا تھا بے لگام
میں جانتا ہوں آپ ہیں وہ رندِ لم یزل ـــ کرتے ہیں جس کا شیشہ و مینا بھی احترام

لیکن حضور مصلحت اندیش ہوگئے
ہم سب کھڑے ہیں گور کنارے بیک مقام

باغ بیرون دہلی دروازہ

• جہاں خطابت ...

• ...العصر مولانا محمد علی...







اورنگ زیب کی مسجد شاہی

حکومت دفعہ ۱۴۴ لگاتی تو مسلمان ...

محرابوں سے للکار بلند کرتے تھے



نے آنکھیں کھولیں

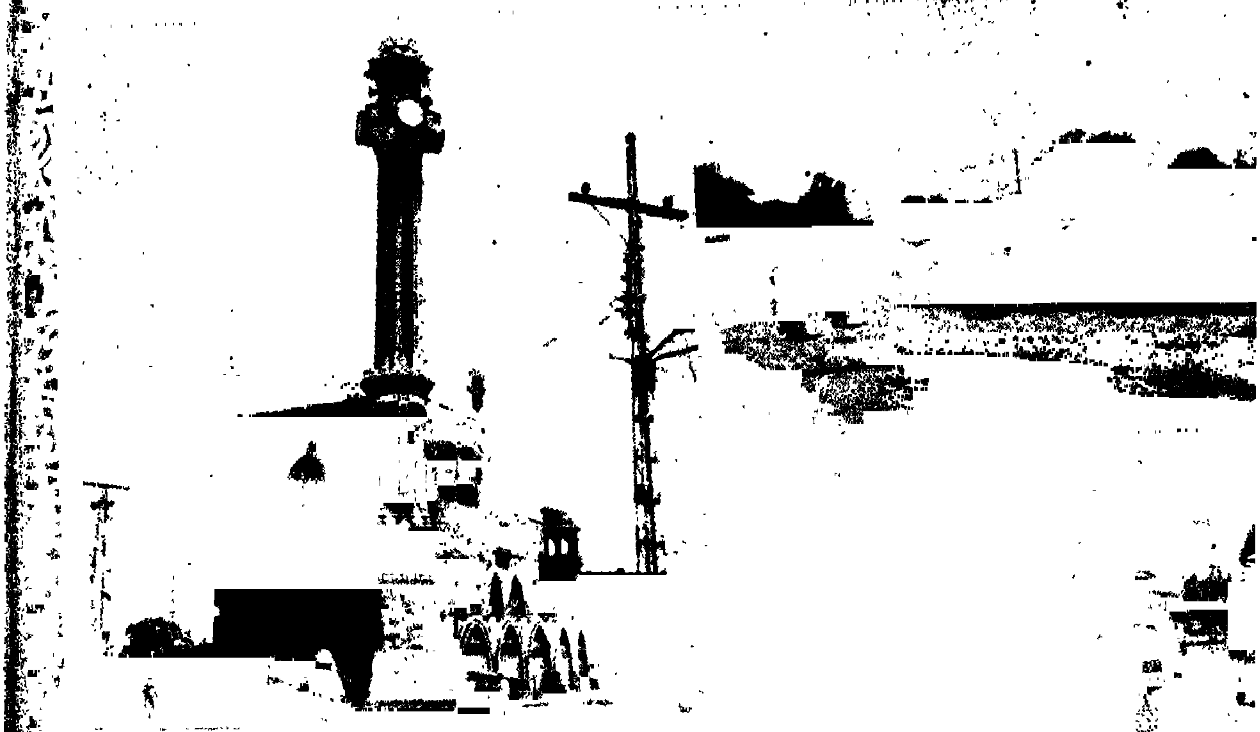
ر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تک

تصاویر

صلاح الدین چوہدری

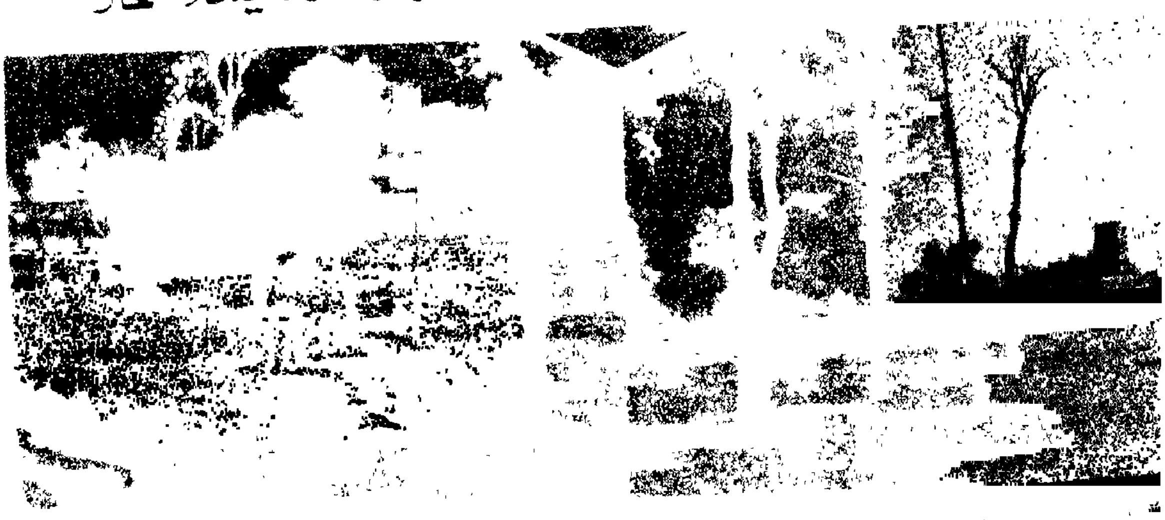
یہ مسجد شہدائے

تحریک ختم نبوت کی یادگار ہے



باغ بیرون موچی دروازہ

قائد اعظم ۔ علامہ اقبال ۔ مولانا ظفر علی خان کا میدان رستخیز



عبدالحکیم عامر

طالبات سادگی اپنا کر خود کو محفوظ کر سکتی ہیں

لاہور کالج کی طالبہ عزالہ لطیف کے قتل و دیگر طالبات کے زخمی ہونے اور اسلامیہ کالج کو پر بلڈ کی طالبات کی بس کے اندر گھس کر ہر جنہ رقص کرنے کے واقعات کے بعد رونما ہونے والے حالات کا تسلسل دو ہفتے بغور جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طالبہ ملک کا مظلوم ترین طبقہ ہیں جس کے ساتھ ہر عہد حکومت میں زیادتیاں ہوئیں نگران زیادتیوں کے ازالہ کے لیے کچھ بھی نہ ہوا کبھی ٹرکوں پر وحید و دیگر طلبہ کا خون بہایا گیا کبھی انہیں سر عام برہنہ کر کے پیٹا جاتا ہے بعض دفعہ تو یوں بھی ہو چکا ہے کہ پابند سلاسل طلبہ سے حوالات کی آہنی سلاخوں کے اندر تشدد کیا جاتا رہا کبھی برکات وحنیف و برکت کے خون میں ہاتھ رنگے جاتے رہے، کبھی طالبات کو اغوا کر کے ان کا مستقبل کیا جاتا رہا۔ اور اس سے بڑھکر افسوسناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک اوباش نوجوان ایک ہی جھٹکے میں نو طالبات کو چاقو کے پے در پے وار کر کے زخمی کر دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک معصوم طالبہ نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیے، اسی نوعیت کے دیگر مصائب طالبعلمی برادری پر وقتاً فوقتاً ٹوٹتے رہتے ہیں، مگر چند روز تک احتجاج کرنے کے بعد طلبہ صبر کرنے پر اکتفا کرتے رہے اور کر رہے ہیں، مقام افسوس ہے کہ صحیح ملزموں کی آج تک نشاندہی نہیں کی گئی، ماسوائے نشار گل کے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، یہی سنتا چلا آ رہا ہوں کہ پنجاب پولیس ہوا میں موجود خطرہ یا سازش کا سراغ بھی لگا لیتی ہے مگر تعجب ہے کہ طلبہ کے ساتھ زیادتیاں کرنے والے ملزم ہوا میں معلق ہیں اور نہ ہی ملک سے فرار ہو چکے ہیں بلکہ اس ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی سرکوبی نہیں کی گئی میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مختلف وجوہات کے علاوہ اہم وجہ یہ ہے کہ طلبہ مختلف حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں جس کے باعث ان کی قوت بھی پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ ایسے عالم میں جبکہ قوت منتشر ہو چکی ہو تو کیسے ان کی آواز یا احتجاج کا کوئی اثر ہو سکتا ہے جب تک تو طلبہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر کسی جدوجہد کا آغاز کرتے رہے، فتح و نصرت نے ہمیشہ ان کے قدم چومے، مگر اب جبکہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مختلف حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کی آواز میں کوئی جان پیدا ہو سکے، یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جب تک طلبہ ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو جاتے، ان کے ساتھ زیادتیاں ہوتی رہیں گی، قتل ہوتے رہیں گے۔ طالب علمی برادری کے درمیان پائے جانے والے نفاق کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اپنی ہی بہن عزالہ لطیف کے قتل کے خلاف اٹھنے والی آواز ایک پلیٹ فارم سے نہیں آ رہی بلکہ صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مختلف پلیٹ فارم استعمال کیے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی آواز میں کوئی محسوس نہیں ہوتا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اپنی بہن کے خون میں ہاتھ رنگنے والے ملزم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے طلبہ متحد ہو جاتے، مگر ان سیاستدانوں کا کیا کیا جائے، جو روپے اور بڑی اپروچ ہونے کے بل بوتے پر طلبہ کو متحد نہیں ہونے دیتے۔ طالب علم برادری سے اپیل کرتا ہوں کہ خدارا ہوش کے ناخن لیں اور اپنی بہن کے خون کو رائیگاں نہ جانے دیں، ایسا صورت ممکن ہو سکتا ہے جب طلبہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے علاوہ مفاد پرست سیاستدانوں کا محاسبہ کریں گے۔

عزالہ لطیف کے قتل کے بعد مختلف پلیٹ فارموں سے کئی آوازیں سننے میں آ رہی ہیں، ان میں سے ایک اہم مطالبہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، یہ مطالبہ طالبات کی طرف سے ہے کہ تمام زنانہ کالجوں کی طالبات کو جوڈو سکھانے کے علاوہ مسلح بھی کیا جائے، خدا شاہد ہے کہ اس مطالبہ نے مجھے نہایت کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا، اور مختلف سوالات نشتر بن کر میرے دماغ پر لگنے لگے۔

(۱) کیا حکومت لڑکوں اور لڑکیوں میں خون خرابہ کرانے کے لیے طالبات کو مسلح کر دیگی؟

(۲) کہیں طالبات کو جوڈو سکھانے سے ہر بس شاپ، تفریح گاہ اور تعلیمی ادارہ اکھاڑہ کا روپ تو نہیں اختیار کرے گا؟

(۳) کیا اسلام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہاتھا پائی اور مار کٹائی کی اجازت دیتا ہے۔

حکومت کو چاہیئے، ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جبکہ طالبات خود کو جوڈو سیکھنے اور مسلح ہونے پر مجبور پائیں، ان کی حفاظت کے لیے معقول انتظام کیا جائے اور آئندہ کے لیے غنڈہ گردی کی روک تھام کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ عریاں و فحش فلموں اور منشیات کے بڑھتے ہوئے رجحان پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے جس کے باعث نوجوان نسل تباہ ہوتی جا رہی ہے آخر میں اپنی نوجوان بہنوں سے معذرت کے ساتھ گذارش کرتا ہوں کہ خود کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر سادگی اپنائیں تو یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اوباش نوجوان بھی ان کے ساتھ غنڈہ گردی کی جسارت نہیں کر سکتا۔

خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام اور نظریہ پاکستان کے خلاف

مہم کا سختی سے نوٹس لیا جائے

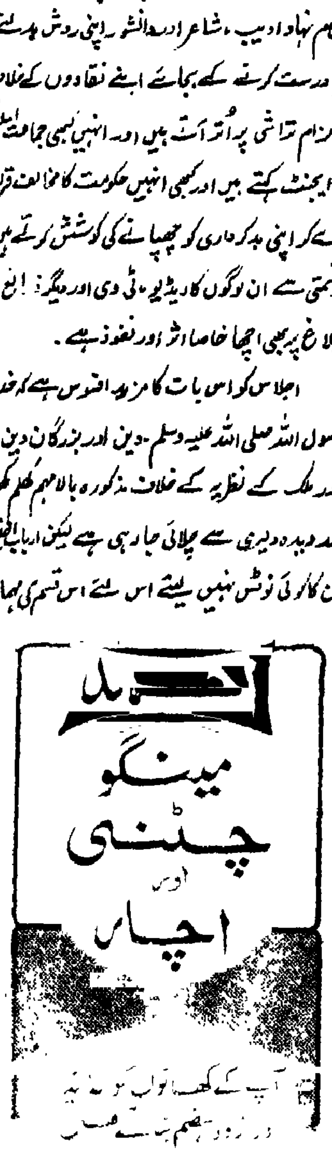
سندھ کے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی متفقہ قرارداد

سندھ کے ادیبوں، عالموں، شاعروں اور دانشوروں کا یہ نمائندہ اجلاس سندھی زبان میں شائع ہونے والے متعدد رسالوں، کتابی سلسلوں اور بعض کتابوں کی اس مہم کا سختی سے نوٹس لیتا ہے اور ان کی شدید الفاظ میں مذمت کرتا ہے جو ملک میں فحاشی اور عریانی کو پھیلانے، اسلام کی آفاقی اقدار کو مٹانے، مشاہیر اسلام کی تذلیل کرنے، مسلمانوں کے پاک دینی اور روحانی مراکز کی توہین کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے، نظریہ پاکستان کی نفی کرنے اور اکھنڈ بھارت کی حمایت کرنے کے سلسلے میں گذشتہ چند سالوں سے منظم اور مربوط طریقے سے چلائی جا رہی ہے۔

اس اجلاس کے سامنے ایسی بیہودہ باتوں کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً "موہن جودڑو" اور "اروڑ" کے کھنڈرات کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے تشبیہہ دینا۔ غازی محمد بن قاسم کو غاصب اور لٹیرا کہنا اور اس کے مقابلہ میں راجہ داہر کو ہیرو اور شہید قرار دینا اور اس کی موت کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے تشبیہ دینا۔ شاہ عنایت صوفی کو سندھ کے آخری پیغمبر کی حیثیت دینا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) مردہ کہنا اور تقسیم ہند کو غلط کہہ کر اسے ختم کر کے متحدہ ہندوستان کے تصور کا پرچار کرنا وغیرہ کی حرکتیں نہ صرف یہ کہ انتہائی افسوسناک ہیں بلکہ سندھ کے مسلمانوں کی دلآزاری کرنے والی اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے والی بھی ہیں۔

اس اجلاس کو یہ دیکھ کر بہت دکھ پہنچا ہے کہ جب کبھی کچھ غیور اور وطن دوست مسلمان ادیب اور دانشور ایسی حرکتوں پر تنقید کرتے ہیں تو اس قسم کے رسالوں، کتابی سلسلوں اور کتابوں کے ایڈیٹر، مصنف، ترجمان اور ان کی پشت پناہی کرنے والے نام نہاد ادیب، شاعر اور دانشور اپنی روش بدلنے یا درست کرنے کے بجائے اپنے نقادوں کے خلاف الزام تراشی پر اتر آتے ہیں اور انہیں کبھی جماعت اسلامی کا ایجنٹ کہتے ہیں اور کبھی انہیں حکومت کا مخالف قرار دے کر اپنی بدکرداری کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کا ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ پر بھی اچھا خاصا اثر اور نفوذ ہے۔

اجلاس کو اس بات کا مزید افسوس ہے کہ خدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، دین اور بزرگان دین اور ملک کے نظریہ کے خلاف مذکورہ بالا مہم کھلم کھلا اور دیدہ دلیری سے چلائی جا رہی ہے لیکن ارباب حل و عقد ان کا کوئی نوٹس نہیں لیتے اس لئے اس قسم کی مہمات چلانے والے عناصر کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں اور وہ اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کرتے چلے جا رہے ہیں



اس اجلاس میں شریک ارکان پورے وثوق اور دعوے سے کہتے ہیں کہ اس وقت سندھ سے تقریباً تیس ۳۰ ایسے رسالے، کتابی سلسلے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں جو مذکورہ بالا مہم کو چلانے میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں اس میں ماہنامہ "مہران"، ماہنامہ "سوجھرو"، ہفت روزہ "برسات"، کتابی سلسلہ "پیغام"، "اگتے قدم" اور کتابیں "جیساکہ میں نے دیکھا"، "سندھ جا سورما"، "سندھو دیش کیوں اور کس لئے" سرفہرست ہیں۔

اس اجلاس کے شرکا مذکورہ بالا تصانیف کو خلاف اسلام اور ملت دشمن ثابت کر دکھانے کو تیار ہیں۔

اس اجلاس کے شرکا کو معلوم ہے کہ مذہبی دل آزاری، فحاشی، عریانی اور نظریہ پاکستان کی مخالفت سنگین جرم ہے۔ لیکن ان جرائم پر گرفت کرنے کا حق از روئے قانون صرف اور صرف ارباب اختیار کو حاصل ہے اور عوام صرف شکوہ و شکایت کے یا ارباب اختیار کے سامنے آہ و فغاں کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اس لئے یہ اجلاس حکومت سے اخلاق، شرافت، دینی حمیت، ملکی حفاظت اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے نام پر مطالبہ کرتا ہے کہ:

۱۔ نظریہ پاکستان کے حامی اور اسلامی ذہن رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو سندھی زبان میں شائع ہونے والے جرائد اور کتابوں کا تفصیلی جائزہ لے کر حکومت کو رپورٹ پیش کرے اور حکومت اس رپورٹ کی روشنی میں مناسب اقدام کرے۔

۲۔ اسلامی ذہن رکھنے والے نظریہ پاکستان کے حامی اور صحت مند ادب کے طرفداروں کو ادبی رسالے نکالنے کے لیے ڈیکلریشن دینے میں فراخدلی سے کام لیا جائے تاکہ غلط اور بیہودہ نظریات کو مثبت انداز میں جواب دیا جا سکے۔

۱۔ ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل، نائب صدر جمعیت الشعراء سندھ۔

۲۔ پروفیسر غلام حسین جلبانی، سابق صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی۔

۳۔ سید سردار علی شاہ، ایڈیٹر روزنامہ مہران صدر مہران ادبی مجلس سندھ۔

۴۔ سید علی میر شاہ، صدر محمد بن قاسم سندھی ادبی سوسائٹی سندھ

۵۔ حضرت پیر محمد ابراہیم جان خلیل سرہندی۔ صدر بقا ادبی مجلس میرپور خاص۔

۶۔ جناب فیض بخشاپوری صدر "بزم فیض" کندھ کوٹ۔

۷۔ محترمہ نور شاہین۔ سب ایڈیٹر ماہنامہ "ادیون" کراچی۔

۸۔ جناب نعمت اللہ قریشی ایڈووکیٹ حیدر آباد۔

۹۔ جناب اسحاق اثر ایڈووکیٹ حیدر آباد

۱۰۔ جناب پیر محمد سلیم جان سرہندی حیدر آباد مانگی

۱۱۔ جناب غلام محمد کھوکھر ایڈووکیٹ حیدر آباد

۱۲۔ الحاج رحیم بخش قمر صدر لطیف ادبی مجلس نواب شاہ۔

۱۳۔ سردار اکبر اجن ایڈووکیٹ کنڈیارو

۱۴۔ جناب شیخ بشیر احمد رند، سیکرٹری بزم گلشن لطیف شکارپور۔

۱۵۔ جناب اصغر علی سومرو، صدر شاہ لطیف سندھی ادبی مجلس جیکب آباد

۱۶۔ جناب الحاج علی بخش جمالی لاڑکانہ

۱۷۔ جناب غلام قادر جتوئی سکھر

۱۸۔ جناب ایوب سندھی، سندھی اسکالر

بقیہ: بیگم حسرت موہانی

کی عمر اس وقت ۲۴ برس کی تھی اور وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ بیوی سے ان کو محبت بہت تھی بلکہ کسی قدر ڈرتے بھی تھے۔ بیوی کو بھی مولانا سے بہت محبت تھی اور جب بھی مولانا قید میں رہے انہوں نے وطن چھوڑ کر جیل سے قریب قیام کیا۔ حسرت نے اپنی رفیقہ حیات کے انتقال پر بہت سے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے شعر لکھے ہیں اور ایک زمانہ تک وہ کسی محفل شعر و سخن میں شریک نہیں ہوئے۔

مولانا کی مالی حالت تقریباً تمام عمر غیر یقینی رہی اس لئے وہ بھی لازماً عسرت کا شکار رہیں جس کی وجہ سے ان کی صحت پر اور برا اثر پڑا۔ پھر مولانا کی پے در پے گرفتاریاں قید کے دوران ان پر ظالم مقدمات کی پیروی میں وکلاء کا میسر نہ آنا پھر یہ کہ مولانا کی غزلوں کی اشاعت۔ جیل میں ان کو اخبارات اور مطلوبہ کتابیں بہم پہنچانا اور جس شہر میں وہ قید ہوں وہاں قیام کرنا ان سب چیزوں نے انھیں قبل از وقت ضعیف کر دیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی واحد اولاد کی تعلیم کی طرف سے بے توجہی نہیں برتی اور انھیں برابر امور خانہ داری کی تربیت دیتی رہیں۔ یہی نہیں بلکہ مولانا کی اچانک گرفتاری کے باعث خود اپنی نگرانی میں اپنی لڑکی کی شادی کی اور یہ فرض بھی بطریق احسن سرانجام دیا۔ ان کی علالت کا تذکرہ محترمہ نعیمہ بیگم اور مولانا حسرت موہانی نے ان کے سفر حجاز و عراق کے سلسلے میں کیا تھا۔ اب اس کی تفصیلات سنئے۔ محترمہ نعیمہ بیگم لکھتی ہیں کہ عراق سے واپسی پر بصرہ میں پھر وہ شدید علیل ہو گئیں یہاں تک کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں۔

آخر ۲۵ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

بعدالت جناب ملک مشتاق احمد سول جج درجہ اول مظفرآباد

نمبر مقدمہ ۳۱/۱ سال ۱۹۷۴ء

(۱) عنایت علی شاہ خاوند مسماۃ خورشید عالم متوفیہ (۲) مقبول حسین ضیائی (۳) انوار الحسن (۴) ذوالفقار علی شاہ (۵) اظہار الحسن پسران مسماۃ خورشید عالم متوفیہ (۶) زبیدہ خاتون (۷) مسماۃ نذیر اختر (۸) مسماۃ نسیم کوثر (۹) مسماۃ شوکت سلطانہ دختران مسماۃ خورشید عالم متوفیہ اقوام سید ہاشمی ساکنان موضع قیصر علی پور تحصیل علی پور (سائلان مدعیان)

بنام عوام الناس (مسئول علیہ)

درخواست جانشینی مسماۃ خورشید عالم متوفیہ

ہرگاہ سائلان مدعیان نے درخواست بابت حصول سرٹیفکیٹ جانشینی متوفیہ مسماۃ خورشید عالم عدالت ہذا میں گذاری ہے، لہٰذا ہر خاص و عام کو بذریعہ اشتہار اخبار ہذا مطلع کیا جاتا ہے، کہ اگر کسی شخص کو عذر نسبت درخواست مذکورہ بالا ہو تو وہ اصالتاً یا وکالتاً بتقرر ۹ جون ۷۵ء کو بوقت ۸ بجے صبح بمقام مظفرگڑھ حاضر عدالت ہو کر پیروی و جوابدہی درخواست کریں، وگرنہ ان کا کوئی عذر نسبت درخواست مذکورہ بالا قابل سماعت نہ ہوگا۔

آج بتاریخ ۹ ماہ مئی ۱۹۷۵ء کو بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج درجہ اول

مہر عدالت

مقبول انور داؤدی

ایک اہم قومی مسئلہ

پرائمری مدارس میں تدریسی و معاوناتی سامان کی بہم رسانی

کیا ان سے کام بھی لیا جائے گا؟

علم انسان کی بہت بڑی دولت ہی نہیں بلکہ ایک بڑی قوت بھی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں وہی قومیں سرفراز اور کامگار ہوئیں جن میں علم کا شوق اور لگن ہے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ بغیر علم کے زمانے میں ترقی کر سکے تو یہ محال ہی نہیں ناممکن ہے۔

اس ضرورت کا احساس کو ہر جگہ نظر آتا ہے ... صورت کے فقدان کے باعث، ہم ابھی تک تعلیم کے معاملے میں اپنے لیے کوئی راستہ متعین نہیں کر سکے، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ ہم بچوں کو تعلیم تو دیتے ہیں، مگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود علم سے بے بہرہ ہیں، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

، والدین کی اولاد کی طرف سے بے توجہی۔

، نصاب تعلیم کی خامیاں

۱) اساتذہ کی لاپرواہی اور تعلیم میں دلچسپی نہ لینا۔

یہ ایسے امور ہیں، جو تعلیم کا ستیاناس کر رہے ہیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ حکومت تعلیم کی اہمیت عمومی طور پر سمجھ چکی ہے، اور اس مقصد کے ... کے لیے وہ کروڑوں روپیہ بھی خرچ کر رہی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے صحیح استفادہ بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں حکومت نے پرائمری سکولوں میں تدریسی معاوناتی سامان مہیا کرنے کا وسیع پروگرام بنایا ہے جس پر لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس سلسلہ تعلیم کو بہتر بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک خوش آئند بات ہو گی، کیونکہ بچے کی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں، کہ ایک اُستاد کے دل میں سچی لگن اور تڑپ ہو تو اس معاوناتی سامان کے بغیر بھی اپنی خداداد ... سے اپنے ماحول سے ہی ایسے معاونات تیار کر سکتا ہے جو تعلیم و تدریس میں نہ صرف مفید ہو سکتے ہیں، بلکہ ان کے ذریعے طلبا کو جو تعلیم دی جائے گی، وہ غیر شعوری طور پر بچے کے ذہن میں ایسی نقش ہو گی، کہ عمر بھر مٹانے کی خواہش کے باوجود بھی نہ مٹ سکے گی، لیکن اگر لاکھوں روپے کا یہ سامان مدارس میں پڑا رہے اور اساتذہ اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں تو ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قومی ضیاع ہوگا۔

اگر کبھی پہلے اساتذہ کا ذکر کیا جائے تو آج اساتذہ فرماتے ہیں کہ صاحب وہ زمانے اچھے تھے، آج کل استاد کو ملتا کیا ہے؟ بلاشبہ ان کا یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے، لیکن جب انہوں نے خود یا کسی مجبوری کے تحت اس پیشے کو اختیار کیا ہے تو اس امر کی ضرورت ہے کہ کم از کم اپنے مفوضہ فرائض کو دیانتداری سے انجام دیں، اور اگر ان کو یہ پیشہ پسند نہیں، تو کوئی اور کام کریں، استاد ہیں تو ایک لگن اور شوق ہونا چاہیئے، اس صورت میں وہ بھی کیا ... کا حقدار ہو سکتا ہے، اور اگر وہ دفع الوقتی کے لیے ملازمت کرتا ہے تو یقیناً اس سے بڑھ کر قوم پر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔

ایک مجلس میں ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ ...



... اس کا کیا اثر ہوتا ہے جو طلب
... کی ذہنی کا اثر ایک حد تک محدود ہو گیا
موصوف نے ایک اور سوال جڑ دیا کہ اگر استاد خراب
ہو تو اس کا عوام پر کیا اثر ہوتا ہے، عرض کیا
گیا، اگر اُستاد اچھا نہ ہو تو تمام معاشرہ بلکہ نسل
خراب ہو جاتی ہے، انہوں نے اس سے اتفاق
کیا اور بڑے ہی دُکھ کے ساتھ کہا کہ ــــ
آجکل استاد بچوں کی تعلیم پر وُہ توجہ نہیں دیتے جو
ان کو دینی چاہیئے۔

اس سے مقصود یہ ہے کہ اُستاد ایک
بڑی شخصیت کا مالک ہوتا ہے، اس پر ایک قومی
ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض اچھی
طرح انجام نہیں دیتا، تو یقیناً وہ ایک بڑے قومی
جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اساتذہ کی اسی کیفیت
کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندیشے لاحق ہیں کہ
حکومت تعلیم کو بہتر بنانے کے جو
اقدامات کر رہی ہے، وہ سرے چڑھ
جائیں گے؟

علامہ شبیر بخاری محکمہ تعلیم میں جانے پہچانے
بزرگ ہیں، ڈائریکٹر تعلیمات ہوتے ہوئے بھی ان کی
زندگی بڑی سادہ ہے۔ مجھے یاد ہے
جب وہ ملتان میں ڈویژنل انسپکٹر تھے تو روپے
کی کمی کے باعث انہوں نے ایک گشتی سلسلہ
شروع کیا تھا، کہ جن مدارس میں سائنس کا سامان
نہیں ہے وہاں کم از کم ہر ماہ میں ایک بار اس
سامان کو بھیج کر بچوں کو ان معاوناتی سامان
سے باخبر کیا جاسکے، لیکن ان کے چلے جانے
کے بعد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا، انگریز کے دور ہی
سے سمعی و بصری معاونات کا سلسلہ شروع ہو

بشکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور

سکول از منش یہاں ناشتہ جرمنی سے کنڈرگارٹن کی
تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ انہوں نے اس
موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، وہ پرائمری
کلاسوں میں اس کو رواج دینا چاہتے تھے۔
میرے والد مرحوم سکول کے ہیڈ ماسٹر
تھے، انہوں نے بغیر سامان کے جغرافیہ کے متعلق
پہاڑ، ندیاں، نہریں، آب رسانی، فوارہ پن چکی
وغیرہ بغیر سرکاری امداد کے ماڈل تیار کیئے ــــ
دھوپ گھڑی بنائی، آپ یقین جانیئے، کہ اب
تک وہ اسباق یاد ہیں، والد صاحب کے شوق
کا یہ عالم تھا، کہ انہوں نے طلبہ کے ساتھ مل کر کام
کیا، ابتداء میں شلجم پر پن چکی کے تجربے کئے،
اور اس کے بعد لکڑی کی پن چکی بنوائی، جو نہر کے
پانی کے زور سے چلتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی
بیج کے اُگنے کے مشاہدات بھی تھے، مسٹر ران
ناتھ نے اس سکول کو دیکھ بے انتہا خوشی کا اظہار
کیا اور تحصیل کے اساتذہ سے کہا کہ وہ یہاں آکر
ان طریقوں کو سیکھیں اور انہیں اپنے مدارس میں

جاتی ہے، شاید یہ لوگ کنڈر گارٹن کے معنی بھی
جانتے ہیں،
حکومت کا پرائمری مدارس کے لیے تدریسی
معاوناتی سامان کا مہیا کرنا بڑی خوش آئند بات
ہے خدا کرے، ہمارے اساتذہ اپنے آپ کو
صحیح معنوں میں قوم کے معمار ثابت کریں۔ اوپر
کا واقعہ اس لیے تحریر کیا گیا ہے کہ اگر شوق ہو
تو ایک اُستاد اپنے گرد و پیش سے ہی تدریسی
سامان مہیا کر سکتا یا بنا سکتا ہے۔

بعدالت جناب زبدۃ الحسن سول جج / جج فیملی
کورٹ سمندری۔
مقدمہ نمبر ۲۲۱ ۱۹۷۴ء
محمد یسین بنام ثریا بی بی
(اعادہ حقوق زن شوئی)
بنام: ثریا بی بی دختر نواب دین قوم کمبوہ سکنہ
سیہوال ڈاکخانہ و تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ
مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسماۃ ثریا بی بی
دختر نواب دین تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز
کرتی ہے اور روپوش ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار ہٰذا
مسماۃ ثریا بی بی مذکورہ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ بتاریخ
تاریخ ۲۴ مئی ۷۵، بوقت ۸ بجے صبح اصالتاً
یا وکالتاً حاضر عدالت آوے، ورنہ کارروائی یکطرفہ
اس کے خلاف عمل میں لائی جائے گی۔
آج بتاریخ ۶ ماہ مئی ۷۵ء ۱۹ کو بدستخط ہمارے
و مہر عدالت کے جاری ہوا۔
دستخط: سول جج
مہر عدالت

یہ بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا، لیکن
نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس
مقصد محض غارت گری، مال و دولت
سوٹ نہ تھا بلکہ اس جزیرہ پر پورا تسلط
تھا، تاکہ دشمن اس کو مصر پر حملہ کا
یں، اس خیال کے مطابق ۱۴۲۶ء میں
لیا، لیمارسول کو فتح کر کے دشمنوں کی
کی، کہ پھر انہیں سر اٹھانے کی ہمت
سے فارغ ہو کر جزیرہ کے اندرونی
ل ہوا، لیکن قبرصی جانوس بھی خیروتیا
پانچ ہزار سواروں اور سات ہزار پیادوں
کے ساتھ مقابلہ کے لیے تیار تھا، دونوں
یقوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، آخر کار قبرصیوں
شکست ہوئی، اس لڑائی نے ان کا زور
توڑ دیا اور ان کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا،
جزیرہ کے دارالسلطنت کی جانب بڑھے، اب
ہیوں میں مقابلہ کی طاقت باقی نہیں رہ گئی
و، آسانی کے ساتھ نکوسیا فتح ہو گیا اور اس
کوچہ و بازار اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے
ان دیگر جمعہ کی نماز پڑھی گئی، پایہ تخت کے
ر، اہل علم اور پادری انجیل ہاتھ میں لے کر
کے طالب گار ہوتے، مسلمانوں نے ان
درخواست قبول کی اور امان عام کا اعلان کر
اس دن سے قبرص باضابطہ سلطان اشرف
باتے کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

مسلمان قاہرہ واپس ہوتے تو قبرصی سردار
اس تین ہزار قیدی اور بے شمار مال غنیمت تھا
میں ایک عظیم الشان نکالا گیا، یہ جلوس جب
جیل پہنچا تو جانوس اتر کر زمین بوس ہوا، پھر

کیا گیا تھا، شاہ اشرف برسبائے کی اس فتح نے
رنگوں کے جلے ہوئے دلوں پر مرہم رکھا اور ذلت
کا احساس دور کیا اور ان کے اندر نئے سرے
سے اعتماد پیدا ہوا، ازراہ کرم جانوس کو دو ہزار
دینار فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا، اس کے بعد
قبرص سلاطین مصر کی بقا رحکومت تک مصر کے
زیر اثر رہا، جب ۱۴۵۸ء اور ۱۴۵۹ء میں
ارکان سلطنت میں شدید اختلاف شروع ہو گیا
تو ۱۴۷۱ء میں بنادقہ پھر اپنا رسوخ قبرص پر وسیع
کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ جزیرہ کے والی ہو
گئے۔ ۱۵۱۷ء میں مصر ترکان آل عثمان کے قبضہ
میں آیا، اور سلطان سلیم اول کے دور خلافت عثمانیہ
کا آغاز ہوا، لیکن قبرص کی فتح دوسرے سلیم کی
منتظر تھی۔

جب سلطان سلیم ثانی نے یمن کو فتح کرنے
اور فرو کرنے کے بعد اطمینان کی سانس لی۔ تو
جزیرہ قبرص کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، اگست ۱۵۷۰ء
میں سپہ سالار مصطفیٰ ایک لاکھ فوج ساٹھ کشتیوں
اور ۳۰ جنگی جہازوں پر مشتمل عثمانی بیڑہ کے ساتھ
ایک قدیم شہر امانوست پہنچا ترک فوج کی مزید
کمک بھی جاری رہی۔ بنادقہ نے ۱۵۶۷ء میں
شہر کی دیواروں کو مضبوط کر دیا تھا، اس کے ارد
گرد خندق کھودی تھی، اور اس کی نگرانی اور حفاظت
کے لیے فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا تھا،
لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا دفاع کارگر
ثابت نہ ہوا، یہ محاصرہ عید تک ایک ماہ جاری رہا
لیکن ۹ ستمبر میں ترک شہر میں داخل ہو گئے، اس
جنگ میں تقریباً ۲۰ ہزار افراد قتل اور تقریباً ۲ ہزار
گرفتار کر لیے گئے، ایک ہفتہ میں پورا تسلط قائم ہوا
ترک فماگوستا کے علاوہ تمام شہروں پر قابض

پنے حامیوں ... ہزار تعداد سے کو مسلمان
پر ٹوٹ پڑا اور مسلمانوں کی پیش قدمی روک
دی۔ نیقولا نے حفاظت کی غرض سے شہر کی
دیواروں کو اور مضبوط کیا۔ اور اس کے چاروں طرف
خندق کھدوائی، لیکن غذا کی قلت نے شہر کو
مسلمانوں کے حوالہ کرنے پر مجبور کیا، انہوں نے
یہ شرط رکھی کہ سواروں اور پیادوں کو کاغیاتک
ترکی کشتیوں پر جانے کی اجازت دی جائے۔
لیکن مسلمانوں نے اس شرط کو تسلیم نہیں کیا اور
ان سب کو گرفتار کر لیا۔ نیقولا سارے ہنگامہ
اور کشت و خون کا ذمہ دار تھا، اس کی وجہ سے ہزاروں
شہریوں کی جانیں گئیں، اس لیے اس کی جان
بخشی نہیں کی گئی، اور قتل کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد قبرص عثمانی سلطنت کا ایک
جز رہا، اگرچہ اٹھارہویں صدی کے شروع سے دولت
عثمانیہ کی حالت کمزور ہونے لگی تھی اور یورپ کی
حکومتیں اس کی نقصان رسانی میں مصروف تھیں
اور آہستہ آہستہ یورپی مقبوضات ترکوں کے ہاتھ
سے نکلتے جا رہے تھے۔ جنگی اہمیت کی بنا
پر قبرص پر ان کی نظر تھی، وہ بحر روم کی کنجی سمجھا
جاتا تھا، لیکن ترکی حکمرانوں نے ۱۸۷۸ء تک اسے
ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا، ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید
تخت نشین ہوئے، اس وقت دولت عثمانیہ
بڑی مصیبت میں مبتلا تھی، یورپی حکومتیں ترکی
کی عیسائی رعایا کو بھڑکا کر جا بجا بغاوت کرا رہی
تھی اور چاہتی تھیں کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے
ہو جائیں۔

سلطان عبدالحمید نے قسطنطنیہ میں دول
یورپ کے نمائندوں کی کانفرنس بلائی تاکہ ان
کے مشورہ سے شکایت کا تدارک کیا جائے لیکن
ان لوگوں نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں کہ کوئی
باعزت حکومت انہیں قبول نہیں کر سکتی تھی۔

چھڑ دیا تھا، روس نے لشکر کشی شروع کر دی، بالآخر پھر صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور ۔۔۔۔۔

وسیع علاقہ سے ترکوں کو دست بردار ہونا پڑا۔

اس صلح نامہ کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس طرف روس کا اثر بڑھ جائے گا، اور امکانات آ گئے جن کے ترکوں کے مقبوضات خطرے میں پڑ جائیں۔ انگریزی حکومت نے اطمینان دلایا کہ روس کو اب پیش قدمی کا موقعہ نہیں دیا جائے گا، بشرطیکہ قبرص انگریزوں کو اس لیے دیدیا جائے، کہ وہاں ان کی فوجیں رہیں۔ اور روس کی پیش قدمی کو بروقت روک سکیں۔ اس ترکیب سے قبرص انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا، اس شاطرانہ چال کی کامیابی پر اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے ملکہ وکٹوریہ کو مبارکباد دی، کہ بحر روم کی کنجی ہمارے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

گو قبرص عملاً انگریزی علاقہ بن گیا تھا، مگر رسمی طور پر ترکی سیادت کا نام باقی تھا، پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے نام کی اس سیادت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا، اور ۱۹۱۴ء سے باضابطہ قبرص کو برطانوی شہنشاہیت میں شامل کر لیا۔ جنگ کے بعد ۱۹۲۴ء میں لوازن کی صلح کانفرنس نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

عرصہ تک یہ اس طرح برطانوی حکومت کے ماتحت رہا، لیکن رفتہ رفتہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی آزادی کی خواہش ہوئی، برطانیہ کی طرف سے کچھ عرصہ تک ٹال مٹول ہوتی رہی، پھر جب اس سے کام نہیں چلا، تو معمولی اختیارات دیئے گئے، لیکن وہاں کے باشندوں کا جذبہ آزادی اس سے ختم نہیں ہوا، مجبور ہو کر مزید اختیارات دیئے گئے، قبرص کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی دشواری وہاں کے باشندوں کا باہمی اختلاف تھا، جزیرہ کی آبادی میں عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اور ترک اقلیت میں ہیں، لیکن ان کی آبادی کا ایک مستقل علاقہ ہے، یونان قبرص عیسائیوں کا طرفدار تھا اور ترکی حکومت ترکوں کی حامی تھی بالآخر فروری ۱۹۵۹ء کو جنیوا میں یونان اور ترکی کے درمیان معاہدہ ہو گیا اور طے پایا، کہ دو سال کی مدت میں بحر روم کے مشرق میں برطانیہ کے جنگی مصالح اور جزیرہ میں ترکی کی اقلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس معاہدہ کو نافذ کر دیا جائے۔

پھر ۱۴ ستمبر ۱۹۵۹ء میں انتخابات ہوئے، جن کے بعد مکاریوس قبرص کے صدر اور ڈاکٹر کوتچوک نائب صدر ہوئے۔

لیکن اندرونی اختلافات رہ رہ کر ابھرتے رہے اور وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہے، آخر جولائی ۱۹۷۴ء میں صدر مکاریوس کی حکومت کا فوجی سرداروں نے تختہ الٹ دیا، مکاریوس بھاگ کر دوسرے ملک میں بھاگ کر پناہ لی، چونکہ یہ نئی حکومت یونانیوں کے زیر اثر تھی، اس وجہ سے ترکوں کو اپنے بارہ میں خطرہ محسوس ہوا۔ ترکی حکومت نے ان ترک باشندوں کی حفاظت کی خاطر اپنی فوج قبرص میں اتار دی۔ اس پر ادھر ادھر سے بہت لے دے ہوئی، مگر ترکی حکومت نے اس واویلا پر کان نہیں دھرا، اور صاف کہدیا کہ وہ ترکوں کو لاوارث نہیں چھوڑ سکتی، اور جب تک کوئی قابل اطمینان انتظام نہ ہو جائے گا، ان کی فوجیں اس علاقہ سے نہیں ہٹیں گی، اس صورت حال نے یونانی فوجیوں کو ڈھیلا کر دیا اور مکاریوس کی واپسی کی راہ صاف ہو گئی، چنانچہ چند ماہ ہوئے وہ قبرص میں آ گئے، مگر ان کا اثر عیسائی علاقہ تک محدود ہے۔ ترک فوج ترکی حصہ میں ڈٹی ہوئی ہے اور آئندہ نظام کے بارے میں بات چیت جاری ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

بقیہ : شیعہ سنی

نوٹس، کوئی مضمون اور نظم اعلا کراتے ہیں۔ دوسرا کوئی مضمون ان کی نگاہ سے نہیں گزرتا۔ مکرم دوست کی نشاندہی پر اڑھائی ماہ پہلے کی مذکورہ سطریں دیکھ کر انہیں افسوس ہوا۔ لطف یہ کہ وہ مضمون مولانا عبدالحق ایم۔این۔اے کے موقر ماہنامہ "الحق" سے ماخوذ تھا۔ اور اس میں سے مضمون کا وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس میں مذکورہ بحث تھی۔ ممکن نگاہ کے سہو، کاتب کی غلطی اور کاپی جوڑنے والے کی مقراض کے باعث دو چار سطریں رہ گئیں۔ اس سے اگلے ہی پرچے (۲۰ اپریل) میں ایڈیٹر چٹان نے مفصل اداریہ "شیعوں اور سنیوں میں کوئی جھگڑا نہیں" کے زیر عنوان لکھا جس میں اس نکتے پر زور دیا کہ جو لوگ شیعہ اور سنی تنازعہ پیدا کرتے وہ پاکستان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اسی شذرے میں تحریر کیا گیا کہ "ساری خرابی یہ ہے کہ اس فتنے کو ذاکر و ملا ہوا دیتے ہیں اور مارے جاتے ہیں غریبوں کے بچے! اگر اس ذہن کے ذاکروں اور ملاؤں کے شروع ہی میں کان کھینچ دیئے جائیں تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اور نہ حکومت کو طویل دردسری سے گزرنا پڑے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ جو ذاکر مجلس عزا میں عزاداری کے بجائے دل آزاری کا راستہ اختیار کرے۔ خود شیعہ نوجوان اس کا محاسبہ کریں۔ اور جو ملا شیعیت کے خلاف طعن و مدح کا الاؤ بھڑکائیں انہیں سنی نوجوان اٹھ کر سر مجلس تنبیہہ کریں کہ وہ اپنی مجنونانہ حرکت سے باز رہیں۔ آخر شیعہ و سنی یہ کیوں محسوس نہیں کرتے کہ ان کے خرمنِ وحدت کو مرزا غلام احمد کی امت آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی ہے"

ایڈیٹر چٹان نے اپنی ہزاروں تقریروں اور بے شمار تحریروں میں چالیس برس کے اپنے اسی مسلک کا اظہار کیا ہے۔ اس دفعہ استقبال محرم کا لاہور میں جلسہ ہوا تو ایڈیٹر چٹان نے طرفین کے اکابر کی زبردست تحریک پر صدارت کی۔ ایڈیٹر چٹان کی تقریر میں اول سے آخر تک شیعہ اکابر اشکبار رہے۔ لیکن عمر بھر کے کردار کو بھول کر شیعہ بھائیوں کے دو تین ہفتہ واروں نے ہم پر تبرّیٰ بازی کی ہے۔ ایڈیٹر چٹان ان کا ذکر کر کے انہیں عزت نہیں بخشنا چاہتے اور نہ وہ ان کی مدح و قدح کے محتاج ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کی فطرت میں تبرّیٰ ہو ان سے بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنا شوق پورا کر رہے ہیں۔ ہم انہیں مرفوع القلم سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں۔

۱۹ مئی ۱۹۷۵ء

قارئین کے خطوط

غنڈہ گردی — دو تجویزیں

اسباب و علل اور تشخیص و علاج

دو تجویزیں

لاہور کالج فار ویمن کی طالبہ غزالہ لطیف کے نشارگل کے ہاتھوں چاقو کی ضربیں سہہ کر رحلت کر جانے کا سانحہ پاکستان کے اسلامی معاشرے کے منہ پر غنڈہ گردی کا زبردست طمانچہ ہے۔ میں اس کے متعلقات پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن ایک چیز جو میرے ذہن میں رہ رہ کر ابھرتی ہے وہ ہمارے سماجی اخلاق کی ہولناک تباہی کا تصور ہے۔ ابھی اس حادثۂ عظیمہ کے زخم تازہ تھے کہ اسلامیہ کالج کوپر روڈ کی بس میں ایک فاتر العقل نوجوان الیاس نے داخل ہو کر برہنہ رقص کیا اور وہ بالکل الف ننگا ہو گیا۔ اس سے چند ماہ پہلے اخبارات میں خبر آئی تھی کہ میکلوڈ روڈ لاہور کے ایک ہوٹل کے مالک کی عفیفہ بیٹی کو جو لاہور اسلامیہ کالج کوپر روڈ ہی کے دوسرے سال میں پڑھتی تھی ایک اوباش نوجوان نے اپنے کے سریے سے لاہور ریلوے سٹیشن کے پل پر شدید زخمی کیا سال بھر مقدمہ چلتا رہا۔ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ لڑکی کے باپ کو ایک پولیٹیکل پارٹی کا سرگرم کارکن دھمکاتا رہا لیکن ...در بیٹی کے باپ نے جواب دیا کہ حکومت بڑی ...ز ہے لیکن غیرت اس سے کئی ہزار گنا بڑھی ...ے۔ کچھ دنوں بعد وہ سرگرم کارکن قدرت کے ...تقام کا شکار ہو گیا یعنی ایک ٹریفک کے حادثے میں مارا گیا۔ اب چار ہفتے پہلے اس لڑکی پر حملہ ...نے والے نوجوان کو فاضل عدالت نے ۱۰ سال کی عبرتناک سزا دی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ نشارگل اور الیاس سختی سے سخت اور قرار واقعی سزا پائیں گے۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ نہ صرف یہ کہ معاشرے کے لئے خوفناک روگ ہوتے ہیں بلکہ ان کا وجود انتظامیہ کے لیے نہایت پریشان کن ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں دو تجویزیں راقم کے ذہن میں ہیں۔

پہلی۔ تعزیرات پاکستان میں اس نوعیت سے ترمیم و اضافہ کیا جائے جس کی رو سے اس قسم کے مجرمانہ افعال کے مرتکبین کو زیادہ سے زیادہ سبق آموز سزا دی جا سکے اس کی انتہائی سزا موت ہونی چاہیئے اور کم سے کم سزا میں بید زنی ضرور شامل کی جائے۔

دوسری۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے اور جو لوگ علماء کی فوقانی اور تحتانی صف میں شامل ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ قومی اخلاق کی تربیت میں اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں۔

منظور حسین ملک

کرشن نگر لاہور

...سعود چوہان لاہور

سیاسی مسئلہ نہ بناؤ

طالبات سے دو اوباش نوجوانوں کی بدسلوکی نے لاہور کے طلباء میں احتجاجی طور پر سخت ہیجان برپا کر دیا ہے اس سلسلے میں طلبہ و طالبات کی طرف سے مسلسل مظاہرے اور مظاہرے ہو رہے ہیں۔ طلبہ کی سیاست کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسندی کی آڑ میں بعض آشفتہ مغز طالب علم نوجوان جن میں سے اکثر تعلیم سے سبکدوش ہو چکے ہیں اب یونیورسٹی کو اپنے سیاسی تجربات کا معمل بنا کر تعلیمی فضا کو درہم برہم کر رہے ہیں اور انہیں نئی نسلوں کے مستقبل کا ذرہ برابر احساس نہیں۔ لاہور میں طالبات سے دو سیاہ کار نوجوانوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کڑی سے کڑی سزا ملے گی۔ اس سلسلے میں ہم طالبات کے جذبات سے پورے طور پر آگاہ ہیں اور ہم ان کے ان مطالبے کی تائید کرتے ہیں کہ ملزموں کو ایسی ہولناک سزا دی جائے کہ یہ بدمعاش عناصر کے لئے عبرت کا باعث ہو۔ امروز ۸ مئی کی اشاعت میں سٹاف رپورٹر کے حوالے سے صفحہ آخر کے پانچویں کالم میں مقامی رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ مختلف زنانہ کالجوں کی نمائندہ طالبات نے ایک بیان میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ وزیر اعلیٰ کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ مجرموں کو پوری پوری سزا ملے گی اور آئندہ تعلیمی اداروں کے باہر موثر حفاظتی انتظام کیے جائیں گے کسی احتجاجی جلسے یا جلوس کی ضرورت نہیں۔ اسی بیان میں کہا گیا ہے کہ بعض طلبہ و طالبات سیاسی لوگوں کے ایما پر اس سانحے کی آڑ میں تعلیمی اداروں کا ماحول خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امروز ہی کی روایت کے مطابق ۷ مئی کو لاہور میں طلبہ و طالبات نے بائیں بازو کے ویمن فرنٹ کی قیادت میں ایک مختصر جلوس نکالا جس

میں بعض پیشہ ور لیڈر شامل تھے۔ شاہینہ پریکٹانی لاہور کی پیدا گرام پروڈیوسر فرخندہ عزیز اور طالب علم لیڈر زخمی پیش پیش تھے۔ اس سلسلے میں کسی گروہ یا فرد کو زیر بحث لانا مناسب نہیں لیکن ایک بیٹی کی حیثیت میں میں یہ کہنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ طالبات کے معاملات کو سیاسی گروپ بازی کے سلئے استعمال کرنا نا رنگل کے چاقو سے کم نہیں۔ اگر آشفتہ خو اور آشفتہ مغز طالب علم لیڈر اپنی بہنوں کو سیاسی مظاہروں سے الگ رکھیں تو ان کا ہم سب پر احسان ہوگا۔

ایک طالبہ

اسلامیہ کالج کوپر روڈ لاہور۔

دردمندانہ گذارش

میں مذہبی سیاست کے میدان میں قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی زبردست حامی ہوں۔ گو میرا سیاسی شعور زیادہ پختہ نہیں لیکن میرے دماغ میں نظریاتی طور پر یہ خیال نقش ہو چکا ہے کہ مسٹر بھٹو پاکستان کے موجودہ گرداب میں ایک ناخدا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مجھے صوبے کے وزیر اعلیٰ جناب حنیف رامے سے بھی ان کی شگفتہ تحریروں کے باعث عزت منانہ دلچسپی ہے۔ یہ پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ پرانی روایتوں کے برعکس اسے ایک ادیب وزیر اعلیٰ ملا ہے۔ میں ان دو قابل احترام ہستیوں سے غنڈہ گردی کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتی ہوں مجھے قلم پر قابو نہیں لہٰذا اگر کوئی غلطی ہو تو قبل از وقت معافی چاہتی ہوں۔

۱۔ جس پھرتی اور تیزی سے حکومت نے اپوزیشن کا ناطقہ بند کر رکھا ہے کیا اس جذبہ اور ارادہ سے ملک کے غنڈوں کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا؟

۲۔ غنڈے ہر شہر اور قصبے میں معلوم و معروف ہوتے ہیں ان سے پولیس اچھی طرح واقف ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے کہ جب عزالہ لطیف جیسی بیٹی کو حادثہ پیش آ جائے تو پولیس حرکت میں اگر چند غنڈوں کو گرفتار کر لے اور وہ غنڈے اس حال میں بھی محفوظ رہیں جو سیاسی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

۳۔ ہماری حکومت نے ملک کے سیاسی احوال کا مقابلہ کرنے کے لیے سیکورٹی پولیس کو جنم دیا اس سیکورٹی پولیس کو انگریزوں کی غلامانہ یادگار ملک حق نواز ٹوانہ آنجہانی نے تشکیل کیا تھا۔ اس پولیس کی خصوصیت پچھلے دو برس میں سامنے آ چکی ہے اور اس میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو انگریزوں کے لیے ہر مسلمان ملک میں خونریزی کر چکے ہیں۔ کیا اس پولیس سے پرانے اور نئے غنڈوں کی نسل مٹانے کا کام نہیں لیا جا سکتا؟

۴۔ جب سیاسی زندگی بال و پر سے محروم ہو جائے گی تو غنڈہ عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے ہماری نئی نسلیں ٹیلیویژن اور ریڈیو کی ہوس کاریوں سے ساقط الاخلاق ہوتی جا رہی ہیں۔

۵۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تعلیمی ماحول آوارہ فکر اور عیاش طبیعت اساتذہ نے درہم برہم کر دیا ہے۔

۶۔ میں خدا کو گواہ بنا کر معترف ہوں کہ مجھے قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو سے بے پناہ عقیدت ہے لیکن ان سے نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کروں گی کہ ان کی پارٹی میں نہ جانے کیوں غنڈہ عناصر کے ایک بہت بڑے تناسب نے پناہ لے رکھی ہے۔ انہیں جماعت سے خارج کر دیجئے۔ انتظامیہ کا حوصلہ بحال کیجئے تو غنڈہ گردی میں ۵۰ فیصد اضمحلال و انحطاط پیدا ہو جائے گا۔ انشاء اللہ

عذرا شاہین بی اے گلبرگ لاہور

ہفت روزہ چٹان لاہور

سرگودھا کا نام فیصل آباد رکھا جائے

مکرمی! سلام مسنون۔

بزم اصلاح و فلاح ضلع سرگودھا کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ صوبائی وزیر اعلیٰ جناب حنیف رامے سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ سرگودھا کے عوام کی خواہشات کے مطابق سرگودھا کا نام شاہ فیصل کی یاد میں فیصل آباد رکھنے کے احکام صادر فرمائیں، تو عوام ان کے شکر گذار ہوں گے۔

سید محمد حسن واسطی

سیکرٹری نشر و اشاعت بزم اصلاح و فلاح ضلع سرگودھا

حیا سوز فلمیں بند ہونی چاہئیں

مکرمی! پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور ہم نے اسے لاکھوں قربانیوں اور قیمتی جانیں دیکر حاصل کیا ہے اور پاکستان حاصل کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم اس میں اپنی سیاسی ثقافتی اور خاص طور پر مذہبی روایات برقرار رکھ سکیں۔

فلم ابلاغ عامہ کا ایسا ذریعہ ہے جس سے نئی نسل کے نوجوانوں میں تعمیری اور قومی جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن پاکستان ایسے اسلامی ملک میں آجکل فلمیں ان تمام روایات کا گلا گھونٹ رہی ہیں، پاکستان میں بننے والی تقریباً نوے فیصد فلمیں بے مقصد اور فضول ہوتی ہیں۔ لیکن ان فلموں میں چند حیا سوز مناظر دکھا کر فلم ساز سرمایہ دار اپنی تجوریاں بھر لیتے ہیں اور اس طرح یہ وطن دشمن فلمساز جو نئی نسل کے ذہنوں میں تعمیری اور قومی جذبہ پیدا کرنے کے بجائے چند کاغذ کے نوٹوں کی خاطر ان کے ذہن عریانی، اور فحاشی کے ذریعے مفلوج کر رہے ہیں یعنی وہ ذاتی مفاد کی خاطر قوم کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

لہٰذا میں آپ کے مؤقر جریدے کی وساطت سے سنسر بورڈ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ فحش اور حیا سوز فلموں پر بے دھڑک سنسر کی قینچی استعمال کی جائے اور عریانی اور فحاشی کا فوری خاتمہ کیا جائے۔

خواجہ راحت جمیل ۔ سیالکوٹ شہر

۱۹ مئی ۱۹۷۵ء

ایک مستحسن فیصلہ

محترمی! سلام مسنون

جامع مسجد نظامت رحیم یار خان کے امام وخطیب جو قریباً ۲۶ سال سے مفوضہ امور انجام دے رہے تھے، ان کو محکمہ اوقاف سے ۵۸ سال عمر ہونے کی وجہ سے ریٹائر کر دیا، حالانکہ شرعاً کوئی پابندی عمر کی نہیں ہے، مقتدیان نے احتجاج کیا لیکن کوئی اثر نہ ہوا، ۹ مارچ ۷۵ء کو مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر مذہبی امور و رابطہ عوام کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے تو مکاتیب فکر پر مشتمل علماء کا ایک وفد ان کو ملا اور ۵۸ سال عمر پر امام اور خطباء کو ریٹائر کرنے پر گفت گو کی، تو مولانا نے کہا کہ محکمہ نے قطعاً کوئی ایسی شرط عائد نہیں کی بلکہ علماء کی عمر جسقدر زیادہ ہو، ان کا علم پختہ ہوتا ہے اور قوم کی زیادہ بہتر طریق پر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

پھر مولوی صاحب کی درخواست پر ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ء کو لاہور میں حسب ذیل حکم صادر فرمایا:

یہ فیصلہ کہ ۵۸ سال کی عمر میں امام اور خطیب کو ریٹائر کر دیا جائے، محل نظر ہے۔ مرکزی وزارت مذہبی امور اس پر مختلف رائے رکھتی ہے — ازراہ کرم امام صاحب کی ریٹائرمنٹ روک دی جاوے جب تک اس سلسلہ میں اگلی اوقاف کانفرنس میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔

لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ صوبائی محکمہ اوقاف نے اس پر تاحال عمل نہیں کیا، کیا وزراء کے احکام کی یہ توہین نہیں اور انکو بے وقعت بنانا نہیں ہے؟

عبدالمقتدیر
رحیم یار خان

کونسل مسلم لیگ کے تحت یوم اقبال

مکرمی! السلام علیکم

ہفت روزہ چٹان کی ۲۸ اپریل کی اشاعت میں جناب عبدالسلام ملک کی رپورٹ (۲۰ اپریل کو یوم اقبال کی دو تقریبیں) پڑھی، میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے چٹان کی وساطت سے السلام ملک صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ ۲۰ اپریل کو قائد اعظم اور مادر ملت کی امانت یعنی کونسل مسلم لیگ کی لاہور شاخ کے زیر اہتمام بھی یوم اقبال منایا گیا تھا، میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس تقریب میں موجود تھا، مورخہ ۲۰ اپریل کے اخبارات نوائے وقت، مشرق، امروز، پاکستان ٹائمز، وفاق اور مغربی پاکستان میں اس تقریب کی اطلاع شائع ہوئی لیکن اخبارات میں دوسرے روز اس تقریب کی رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ حالانکہ ۲۰ اپریل کو عین اسی وقت چائنیز لنچ ہوم میں ایک دوسری سیاسی جماعت کا استقبالیہ کا پروگرام تھا، اس کی خبر اگلے روز اخبارات میں شائع ہوئی۔ بہرحال جناب ملک صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس تقریب کی صدارت مرکزی کمیٹی کے رکن جناب برکت علی عتیق نے کی، مقررین میں مرکزی جائنٹ سیکرٹری جناب اقبال احمد خان ایڈووکیٹ (لاہور)، چوہدری صادق علی (لائلپور) اور اے ایچ قادری صاحب کے علاوہ کونسل مسلم لیگ کے سربراہ میاں زاہد سرفراز نے بھی علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ گلبرگ کے ڈاکٹر یاور رفیق اور مشیر کاظمی نے اپنا کلام اس تقریب میں سنایا۔

سید زوار نقوی
ٹھاکر سٹریٹ۔ رام نگر لاہور

مرزائی ہیڈ مسٹریس کی چیرہ دستیاں

مکرمی! السلام علیکم

مہنگائی اور گرانی کے اس خوفناک دور میں ہم لوگ نہ جانے کیسے اپنا پیٹ کاٹ کر اور دوسرے اخراجات کو پس پشت ڈال کر اپنی بچیوں کو سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں، کتابوں اور کپڑوں کے واجبات پہلے ہی اتنے ہیں کہ کمر دوہری ہو گئی ہے، اس پر طرہ یہ کہ مقامی گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے سکول کی چار دیواری کی وسعت کے بہانے چندے بٹورنے کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے، کئی لاکھ روپے

ٹنڈر نوٹس

محکمہ عمارات پنجاب کے منظور شدہ ٹھیکیداران سے جنہوں نے سال رواں کی فیس تجدید فیس جمع کرا رکھی ہو مندرجہ ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹنڈر گیارہ بجے دوپہر کو مطلوب ہیں، ٹنڈر اسی دن حاضر ٹھیکیداران یا ان کے نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

ہر کام کے لیے الگ الگ سربمہر لفافہ ہونا چاہیئے جس پر کام کا نام درج ہو، جن ٹھیکیداران نے زر ضمانت جمع کرا دی ہو گی، کوئی بھی ٹنڈر بغیر زر ضمانت و بصورت ڈیپازٹ ریٹ کال خفیہ تار و ڈاک کے ذریعے وصول شدہ نامکمل مشروط قابل قبول نہ ہو گا، کاموں کے متعلق جملہ تفصیلات دفتر ہذا سے دفتری اوقات کار میں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ٹنڈر کسی فرم یا کمپنی سے صرف اسی صورت میں قبول کئے جائیں گے جب کہ اس کا صحیح مختار نامہ ٹنڈر کے ہمراہ منسلک ہو گا ——— زیر دستخطی اس کا مجاز ہے کہ کوئی بھی یا تمام ٹنڈر بغیر وجہ بتائے مسترد کر دے۔

نمبر شمار	نام کام	تخمینہ کام	زر ضمانت	معیاد	تاریخ وصولی
۱۔	آپ گریڈنگ سول ہسپتال چونیاں میں سٹاف کوارٹر، مینیل کوارٹرز، کچن بلاک وغیرہ کی تعمیر کا کام	۴،۵۰،۰۰۰/-	۹،۰۰۰/-	۴ ماہ	19-5-75

ایگزیکٹو انجینئر فرقہ پروونشل بلڈنگ ڈویژن۔ لاہور

IPL-۱۳۸۲

سے فنڈ اکٹھے [illegible] کے باوجود ان کا اخراج جاری ہے جو طالب علم چندہ نہ دے کر نہیں جاتی اس کو سکول سے خارج کر دینے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب خالص مرزائی ہیں۔ عوامی و سماجی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ چندہ جمع کر کے ربوہ بھیج رہی ہیں۔ ہیڈ مسٹریس خالص الفاظ میں کہتی ہے کہ جن ٹیچرز کے عزیزان نے تحریک ختم نبوت میں حصہ لیا تھا میں ان سے انتقام لوں گی۔ اس کی تازہ مثال یہ کہ معروف سیاسی کارکن چوہدری بشیر احمد خاور ایڈووکیٹ کی اہلیہ کو ایک دور دراز مقام پر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ خانیوال میں اس سلسلے میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ تمام مکاتب فکر کی مساجد میں گذشتہ جمعہ کو ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے مذموم رویہ کے خلاف قرارداد مذمت پاس کی گئیں۔

۲ مئی کے "امروز" میں کسی طالبہ کا مراسلہ ان کے اس شدید رویہ کے خلاف چھپا۔ مراسلہ کے آخر میں ایک طالبہ دہم سی کے الفاظ تھے۔ بس پھر کیا تھا، تمام دہم سی کی کلاس کو آدھا دن دھوپ میں سزا دی گئی۔ ہم آپ کے آزاد ہفت روزہ کی وساطت سے اہل خانیوال صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق اور ڈائریکٹر تعلیمات ملتان سے گزارش کرتے ہیں کہ اس مرزائی ہیڈ مسٹریس سے فنڈز کا حساب لیا جائے اور غریب والدین کی چندوں سے جان بخشی کرائی جائے۔

ظفر احمد بوٹا ایڈووکیٹ

بلاک نمبر ۱ — خانیوال

بقیہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

رہنما قوت ہے۔ یعنی یہ علم بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی عمل کی محرک بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی مدد سے حاصل کیے ہوئے علم میں یہ کمال نہیں ہوتا کہ خود ہی علم بھی ہو اور عمل بھی۔ وہ تو دور سے بیٹھ کر اشارے کرنے والا رہنما ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اشارے غلط ہوتے ہیں

ہفت روزہ چٹان لاہور

کیونکہ اس کا سارا سرمایہ نتائج، قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور قیاس بعض اوقات غلطی بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کے کلام میں (اور خود اقبال کے کلام میں)، عشق کو عقل اور علم دونوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ (عقل و عشق باہمی کے مقابلے کی مزید بحث عقل و علم کے عنوان میں آئے گی)

یہاں بحث خودی کے سلسلہ عمل کی ہو رہی ہے اور اس سلسلۂ عمل میں عشق ایک بنیادی اور ترقی دینے والا جذبہ ہے۔ اس لئے یہ ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ عشق کے جو معنے بھی لیے جائیں ان میں سے ہر ایک خودی کے سلسلۂ عمل میں مفید ہے۔ خودی کا عشق سے اتنا گہرا اور قریبی تعلق ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ خودی اور عشق دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں چنانچہ اقبال نے خود بھی بعض موقعوں پر یہی لکھا ہے۔

عشق کی صفات گوناگوں ہیں۔ عشق کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اسے خطرات کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کی دوسری سرشت بے غرضی ہے یعنی مقصد اعلیٰ کے سوا (جو خود ایک پاکیزہ نصب العین ہوتا ہے)، کوئی مادی یا جسمانی غرض نہیں ہوتی۔ (اسی لئے اقبال نے عشق اور فقر کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے ... فقر سے مراد یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اور ہر مادی شے پر قادر ہونے کے باوجود ہر شے سے بے نیازی ہو)

عشق کی خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ خود علم ہوتا ہے (جیساکہ پیچھے بیان ہوا ہے) وہ عقلی علم کا دشمن نہیں مگر اس کا محتاج نہیں ہوتا۔ البتہ عقلی علم اگر عشق کا رفیق بن جائے تو یہ بھی خودی (زندگی کی ترقی کی آرزو اور جد و جہد) کے لیے بہت مبارک بات ہے:

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم بر شود
نقشبند عالم دیگر شود
خیزد نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

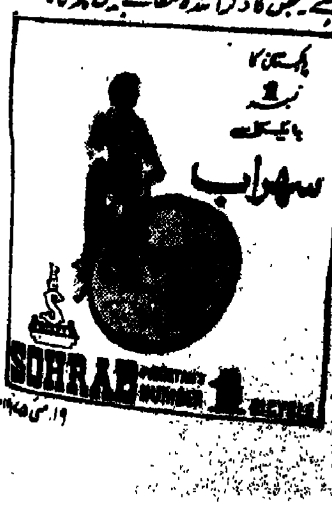
یعنی زیرکی (عقلی علم)، اگر عشق سے فیضیاب ہو جائے تو اس میں حق شناسی کا جوہر پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عقلی علم سے عشق کو بھی تقویت مل سکتی ہے۔

اس سے عشق کی ایک اور خاصیت کا پتہ چلا اور وہ ہے سچائی (حق) کی نگہداشت۔ اور حکما عموماً یہ کہتے ہیں کہ حق، خیر اور حسن ایک ہی قدر مطلق کے تین الگ الگ نام ہیں جہاں حق ہے وہاں خیر اور حسن بھی ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عشق صرف حسن ہی کا آرزومند نہیں بلکہ نیکی اور سچائی کا بھی طلب گار ہے۔ قوت کا سرچشمہ بھی ہے اور بصیرت کا منبع بھی آرزومند تو ہے مگر غیور و بے نیاز اور خوددار بھی ہے، خوف اس کی سرشت میں نہیں، خطر طلبی اس کا خاصہ ہے۔ مقاصد کی پیکار میں اسے لذت ملتی ہے، مصلحت اندیشی، شک اور تذبذب سے اسے چڑ ہے۔ وہ آرزو بھی ہے اور علم بھی... علم بھی ہے اور عمل بھی...! اتنی ہمہ گیر قوت و صلاحیت کو وجد کائنات کے اندر ہر جگہ پنہاں ہے، اگر حیات اور خودی کا جوہر کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے قدیم صوفیوں نے اور اقبال نے بھی جا بجا عشق کی برکات کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ پیکار

خودی کے سلسلۂ عمل میں تیسرا اہم نقطہ پیکار ہے۔ جس کا ذکر آئندہ مقالے میں ہوگا۔



۱۹ مئی ۱۹۸۵ء

فصیح الدین دہلوی

شط العرب — دجلہ و فرات کا سنگم

حال ہی میں ایران و عراق کے درمیان ایک باہمی سمجھوتہ طے پایا ہے، جس کی رو سے دونوں ملک اپنے صدیوں پرانے اس جھگڑے کو پُرامن طریقہ سے طے کرنے پر راضی ہوگئے ہیں جو دریائے شط العرب میں سرحدوں کے تعین اور حقوق جہاز رانی کے بارے میں چلا آرہا ہے۔ ذیل میں قارئین چٹان کی دلچسپی کے لیے دریائے شط العرب کے متعلق کچھ معلومات پیش خدمت ہیں۔

سرزمین عراق میں دو مشہور نہریں ہیں، ایک کا نام دجلہ ہے اور دوسری کا فرات۔ ان نہروں کی اہمیت تاریخ کا ایک مسلّم باب ہے اور ان سے بڑے مشہور واقعات وابستہ ہیں اور ان کی وادیوں میں جو تہذیب پروان چڑھی ہے، وہ ابتدائی تہذیبوں میں سے ایک ہے۔

عراق کو تاریخ میں "بلاد ما بین النہرین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، انگریزی میں اس کو موسوپٹامیا بھی کہا گیا ہے۔ ان ہی دونوں نہروں کے سنگم سے جو دریا وجود میں آیا ہے، اس کو شط العرب کہا جاتا ہے۔

بصرہ سے تقریباً ایک سو چالیس میل کی دوری پر ایک مقام ہے جس کا نام قرنہ ہے، یہاں آکر دجلہ و فرات دونوں مل جاتے ہیں اور ایک ساتھ بہتے ہیں۔ قرنہ سے جنوب مشرق کی سمت بل کھاتا، اور لہراتا ہوا یہ دریا بڑی تیزی سے بہتا ہے اس کی مجموعی لمبائی تقریباً ۲۰۴ کلومیٹر ہے، یہ دریا خلیج عربی میں پانچ کلومیٹر کی گہرائی تک اندر جا گرتا ہے یہاں خلیج میں نہ صرف دجلہ و فرات بلکہ نہر سویب و نہر کارون کا پانی بھی گرتا ہے، پانی کی جو مقدار شط العرب سے خلیج عربی میں گرتی ہے، اس کا اندازہ تقریباً ۳۵ ارب مکعب میٹر سالانہ ہے علاوہ اس کے لاکھوں ٹن ریت اور مٹی بھی گرتی ہے۔

قرنہ کے مقام سے لے کر خلیج عربی تک دریائے شط العرب کے دونوں کناروں پر کھجور کے تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ درخت ہیں، یہ گھنا نخلستان مشرق و مغرب دونوں سمت میں دو کلومیٹر سے چار کلومیٹر تک اندر چلا گیا ہے۔ دریا میں روزمرہ قدرتی طریقہ پر جو مدوجزر آتا ہے، وہی اس نخلستان کی آبیاری کا بہترین ذریعہ ہے، اس نخلستان کی سالانہ پیداوار تقریباً ایک لاکھ اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان ہے، دریا میں سے دونوں سمت چھوٹی چھوٹی نالیں ندیاں اور آبشاریں بہہ رہی ہیں۔ جن میں پانی داخل ہوکر کھجور کے درختوں کی پیاس بجھاتا ہے۔

دریائے شط العرب کی چوڑائی مختلف جگہ مختلف ہے، مثلاً شہر عشار کے پاس یہ چار سو میٹر چوڑا ہے اور دہانے پر یہ چوڑائی ڈیڑھ کلومیٹر ہوجاتی ہے، گہرائی بھی کم و بیش ہے، بڑے جہاز نو میٹر سے لے کر دس میٹر کی گہرائی تک ڈوب جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، دریائے شط العرب میں جو بڑی نہریں گرتی ہیں، وہ چار ہیں:۔

دجلہ، فرات، سویب، کارون،

دریائے کارون ایران کے بلند پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ایرانی علاقے سے بہتا ہوا شط العرب میں آکر گر جاتا ہے۔ (واضح ہو کہ شط العرب کے مشرقی کنارے ایران۔ اور مغربی کنارے عراق واقع ہے) لیکن جو چھوٹی چھوٹی نہریں، نالے اور ندیاں اور آبشاریں شط العرب سے نکلتے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے بعض

اعلان

گذشتہ ۵ ماہ سے پاکستانی خریداروں کی درخواست پر ہم برابر ان کے نام رسالہ دارالعلوم ارسال کر رہے ہیں ان سے نیز رسالہ دارالعلوم کے نئے خریداروں کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ مبلغ ۲۰/ روپے سالانہ چندہ مولانا سعید الرحمٰن الندوی مجلس دینی میں بازار سنت پورہ لائل پور کو ارسال کریں اور کوپن پر مولانا سے کہیں کہ یہ رسالہ دارالعلوم کا چندہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ڈاک کے مصارف بڑھنے کی وجہ سے رسالہ کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔

المعلن سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ "دارالعلوم" دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور انڈیا

ان میں سے مشہور یہ ہیں۔ مثلاً نہرالتنانی، نہرالاجذ، نہرالرباط، نہرالمشرق، نہرالعشار، انموزہ، والسراجی، میجران، جماران، الجدید، ابومغیرہ، ابوالخصیب۔ یہ سب مغربی کنارے پر ہیں۔ لیکن نہریں مشرقی کنارے پر ہیں، ان میں سے مشہور نہر گیتان، نہرالکاسی، شط العرب الصغیر اور بمین وغیرہ ہیں۔

شط العرب کے مغربی کنارے قریب سے ... کلومیٹر کی دوری پر ایک جھیل ہے، اس کا نام نہرالحمار ہے، یہ جھیل کافی بڑی ہے، اس میں دریائے فرات کا پانی اور شط العرب کا پانی جو دریا چڑھتے وقت آجاتا ہے، بہتا ہے۔

اس طرح شط العرب کے زیریں حصے کے بالمقابل بیس سے لے کر پچاس کلومیٹر کی دوری پر کچھ نشیبی علاقے ہیں۔ ان میں پانی برابر بہتا ہے یہ نشیب براہ راست خلیج عربی سے جا ملتے ہیں ان نشیبوں کے نام علی الترتیب "خورالزبیر" "خورعبداللہ" اور "خورشیطانہ" ہیں (عربی زبان میں لفظ خورشیطانہ ہیں) عربی زبان میں لفظ خور کے معنی نشیبی زمین کے ہیں، خورزبیر شط العرب کے مغرب میں صحرا کو چیرتا ہوا چالیس کلومیٹر کی دوری تک چلا گیا ہے، اور آخر میں جا کر ایک بڑے حوض کی شکل بن گئی ہے، جس میں نمکین اور کھارا پانی جمع رہتا ہے۔

جب بھی نہر دجلہ و فرات یا کارون وغیرہ میں سیلاب آتا ہے، تو دریائے شط العرب بھی چڑھتا ہے چنانچہ ۱۹۶۹ء میں یہ بہت چڑھا تھا، ایسی حالت میں جہاں شط العرب خلیج میں گرتا ہے، وہاں پانی کے نکاس کا درجہ ایک سکینڈ میں ساڑھے چار ہزار مکعب میٹر تک پہنچ جاتا ہے۔

دریائے شط العرب کی عمر ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ نہیں، اس لیے کہ قدیم تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نہر دجلہ و فرات علیحدہ علیحدہ ہی خلیج عرب میں جا گرتی تھیں اور ان کا سنگم جس طرح کہ اب ہے، پہلے نہیں تھا، اس طرح اس کا نام چوتھی صدی ہجری تک "دجلۃ العوراء" تھا، نہ کہ شط العرب۔ لفظ شط العرب کا سب سے پہلا اشارہ ناصر خسرو کے سفرنامہ میں ملتا ہے، اس نے لکھا ہے،

بصرہ شہر کی بڑی چہار دیواری ہے،
جس نے اس کو ہر طرف سے گھیر رکھا
ہے، سوائے اس سمت کے جو دریا پر
واقع ہے۔ اور اس دریا کا نام شط العرب
ہے۔

شط العرب کی بابت ایران و عراق کا جھگڑا تقریباً چار سو پرانا ہے، تاریخی دستاویزات اور پرانے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان (واضح ہو کہ عراق پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ تک سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں تھا۔

۱۵۵۴ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کی درمیانی مدت میں انیس معاہدے ہوئے، ان سب کا تعلق دریائے شط العرب پر سرحدی جھگڑے سے ہے یعنی اوسطاً ہر ۲۰ سال میں ایک معاہدہ ہوا۔ واضح ہو کہ الجزائر میں شاہ ایران اور عراق کے نائب صدر صدام حسین کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے، اس میں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۳ء کے معاہدوں کی بنیاد مانا گیا ہے۔

۱۹۱۳ء کا معاہدہ جو قسطنطنیہ پروٹوکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس پر ۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو آستانہ عالیہ (سلطنت عثمانیہ کے دارالخلافہ) میں دستخط ہوئے، یہ معاہدہ ایران اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان حکومت برطانیہ اور روس کی ثالثی سے طے پایا تھا، اس پر برطانیہ کی طرف سے سر لیس مالٹ نے، ایران کی جانب سے مرزا محمود خان قاجار احتشام سلطنت نے اور موسیو میشلی جیر نے روس کی جانب سے، نیز امیر سعید حلیم پاشا صدر اعظم اور وزیر خارجہ نے سلطنت عثمانیہ کی جانب سے دستخط کیے۔ (الجمعیت دہلی)

قسط ۵ —— تحریر: شیخ محبوب علی اسسٹنٹ چیف انجنیئر
ٹیلیفون اسلام آباد

ہندوستان میں اسیری کے شب و روز

ریڈیو سے جب بھی خبریں سنتے ہیں، توقع یہی ہوتی ہے کہ پہلی خبر ہماری رہائی کے بارے میں ہو گی۔ پھر مایوس ہو کر، منہ لٹکا کر واپس بیرک میں آ جاتے ہیں۔ ہاں، مگر اتنے مایوس نہیں، جتنے اہل دلی سمجھ رہے ہوں گے ہماری حالت وہی ہو گئی ہے کہ ؏

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خصوصاً فوجی جوانوں کی ہمتوں کا جواب نہیں کہتے ہیں ہماری وجہ سے حکومت پاکستان کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائے، نہ کوئی ایسا فیصلہ مانے جس سے ملکی سالمیت اور قومی وقار پر حرف آئے وہ خاطر جمعی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم یہاں ملکی عزت کی خاطر گلنے سڑنے کے لیے تیار ہیں ——

۲، جولائی ۱۹۷۲ء، جذبات کی عجیب حالت ہے، وقت کا بیشتر حصہ ریڈیو کے پاس سے گذرتا ہے، ہر شخص اس تجسس میں ہے کہ دیکھئے شملہ سے ٹھنڈی ہوا کب آتی ہے، تا حال ذاکرات معلق کا شکار ہیں، آج رات کھلنے کے بعد گفت گو کا آخری مرحلہ شروع ہوگا۔

۳، جولائی ۱۹۷۲ء، گذشتہ شب ایک بجے سارا کیمپ جاگ اُٹھا، معلوم ہوا کہ دونوں ملکوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے، اور یہ کہ بہت جلد قیدی رہا ہو جائیں گے۔ اور مقبوضہ علاقے خالی کر دیئے جائیں گے، اب بھلا نیند کس کو آتی، شکرانے کے نوافل پڑھے گئے، اور خدا سے خوب دعائیں مانگی گئیں۔

۲۰، جولائی ۷۲ء، مستقبل کی قیاس آرائیاں زوروں پر ہیں، ہر صبح خوشخبری کی انتظار لیکر آتی ہے کہ آج ہماری واپسی کے احکام آجائیں گے مگر شام کو رات ختم ہونے اور صبح آنے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے، حوصلوں پر چوٹ ضرور پڑتی ہے مگر یہ شکست سے دوچار نہیں ہوتے۔ لوگ شاعر کی اس نصیحت پر برابر کاربند ہیں کہ ؎

نہ بھول جائے تیرا دل بہار آزادی
پروں میں تاب شکست قفس نہیں نہ سہی

۱۴، اگست ۱۹۷۲ء، آج یوم آزادی اس حالت میں آیا ہے کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں اور پاکستان کا ایک حصہ خون میں نہایا ہوا غیروں کے قدم میں پڑا ہے، سوچتا ہوں، یوم آزادی کا استقبال کیسے کروں۔

میرے پاس رستے ہوئے زخموں، ٹوٹے ہوئے پروں، آہوں اور آنسوؤں کے سوا ہے کیا؟ آج میں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کھلی کتاب کی طرح دیکھ رہا ہوں، کتنی بھاری قیمت ادا کی تھی، ہم نے آزادی کی ——!

کروڑوں کو یرغمال بنا دے کر، لاکھوں کی قربانی پیش کر کے، لاکھوں عصمتوں کو بھینٹ چڑھا کر اور اربوں کھربوں کی جائیدادیں نثار کر کے ہم نے انہیں مقدس —— پاکستان —— حاصل کیا تھا مگر ہائے افسوس ہم آزادی حاصل کر کے اندھے بہرے بن گئے، نہ حالات سے سبق سیکھا نہ تاریخ کا شعور ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سونا اپنی ہی کمزوری ہوئی انتہا تک میں لٹک گئے اور ہاتھ پاؤں بھی تڑوا بیٹھے ؎

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روز سیاہ
خود دکھایا ہے میرے گھر کے چراغوں نے مجھے

۸، نومبر ۱۹۷۲ء، رمضان المبارک گزر گیا ہے آج عید ہے، سب لوگوں نے دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہن کر نماز ادا کی، معانقے ہوئے مبارکبادوں کے تبادلے بھی کئے گئے —— مگر قید کی عید میں شکوہ ملک و دیں کی صورت کیسے پیدا ہو —— علامہ اقبال نے شاید ہمارے لیے کہا تھا ؎

خزاں میں مجھکو رلاتی ہے یاد فصل بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں
پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

۲۶، نومبر ۱۹۷۲ء، آج سہ پہر کو بتلایا گیا، کہ کل شام تک عورتوں اور بچوں کو یہاں سے لے جایا جائے گا، خیال یہی ہے کہ یہاں سے دہلی اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز انہیں لاہور یا راولپنڈی پہنچایا جائے گا۔ سب نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔

۱، دسمبر ۱۹۷۲ء، آج پھر واپسی کے کاغذات پر دستخط کرائے گئے۔ معلوم ہوتا ہے، بھارتی حکام نے عورتوں، بچوں اور مردوں کو اذیت دینے کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ امید دلا کر مایوسی پیدا کرو، تاکہ حوصلے ٹوٹیں اور منفی جذبات پیدا ہوں مگر اب ہماری حالت بقول غالب یہ ہو گئی ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

...نکلیں اتنی پڑی ہیں کہ پرت سی ہو گئیں اسی لیے دستخط کرتے ہوئے اب ہم کسی اُمید یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتے اور جذبات نارمل حالت میں رہتے ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء، نئے سال کے آغاز پر ہمیں اللہ نے ایک بچہ عطا کیا ہے۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ نومولود ماں باپ کی نسبت کہیں زیادہ باغیرت واقع ہوا ہے۔ اس نے اسیری کی زندگی پسند نہیں کی اور دنیا میں آتے ہی منہ پھیر کر واپس چلا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ——— خدایا ہم تیری رضا پر خوش ہیں ہمیں استقامت عطا کر، صبر کی توفیق دے اور اتنا بوجھ نہ ڈال دے کہ ہم اُسے سہار نہ سکیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۷۳ء، عزیزوں اور دوستوں کے خطوط پاکستان سے برابر آرہے ہیں، ضروری اشیاء کے پارسل بھی ملتے رہتے ہیں، آج راولپنڈی سے خط آیا کہ میری اہلیہ کی والدہ وفات پاگئی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مختصر سے عرصہ میں اہلیہ کے لیے یہ دوسرا جانکاہ صدمہ تھا، مگر خدا کا شکر ہے، اس نے ان دونوں سانحوں کا مقابلہ صبر اور حوصلے سے کیا ہے۔ تاہم اس نے اپنے والد اور بہنوں کو جو خط لکھا، وہ درد اور سوز میں ڈوبا ہوا تھا تحریر تھا۔

"معلوم ہوا ہے کہ میری پیاری ماں اس دنیا سے چلی گئی، آپ کی بد قسمت بہن اپنی پیاری امی کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی، آتے وقت (یعنی ڈھاکہ روانگی سے قبل) مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی ماں کو آخری مرتبہ مل کر آرہی ہے، خدا بڑا بے نیاز ہے، اس کے آگے کوئی زور نہیں، آپ دو لو بہنوں کو آپس میں مل کر پھر بھی تسلی ہو گی، مگر یہاں پر میں اکیلی کانٹے دار تاروں کے اندر تڑپ رہی ہوں، باجی، امی کی قدر اب معلوم ہوئی ہے، جبکہ وہ دنیا سے چلی گئی، اب

ہفت روزہ چٹان لاہور

ان کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے"۔

۱۲ فروری ۱۹۷۳ء، مصر کے مجاہد عالم دین سید قطب شہیدؒ کی کتاب "معالم فی الطریق" کا ترجمہ "جادۂ منزل" زیر مطالعہ ہے، سید موصوف کی آخری نظم جو انہوں نے ایام اسیری میں کہی تھی، موضوع اور مناسبت کے لحاظ سے روح کی گہرائیوں میں اُتر گئی، نظم کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے

اے میرے ہمدم تو طوق و سلاسل کے اندر بھی آزاد ہے
اے میرے ہمدم تو آزاد ہے رکاوٹوں کے باوجود
اگر تیرا اللہ پر بھروسہ ہے
تو ان غلام فطرت انسانوں کی چالیں
تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں
برادرم تاریکی کے لشکر مٹ کر رہیں گے
اور دنیا میں صبح نو طلوع ہو کر رہے گی
تو اپنی روح کو ضوفشاں ہونے دے
وہ دور دیکھ صبح ہمیں اشارے کر رہی ہے
میرے رفیق! اگر میں احباب کو چھوڑ کر
موت کی آغوش میں چلا بھی جاؤں
تو کوئی خسارہ نہیں
میرے رب کے باغات ہمارے لیے تیار ہیں
ان کے مُرغان خوش نوا ہمارے اردگرد محو پرواز ہیں
اس ابدی دیار کے اندر ہم خوش و خرم ہیں

نظم کو بار بار پڑھا، عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی، یوں لگا کہ جیسے اندھیرے میں شمعیں جل اُٹھی ہیں۔

۲۳ فروری ۱۹۷۳ء، تبلیغی جماعت ہندوستان کے امیر مولانا انعام الحسن مدظلہٗ کا گرامی نامہ ملا، شروع کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، ہمارے مصائب و پریشانیوں کا سب سے بڑا سبب اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے مصائب سے نجات کی صورت تو بجز توبہ و انابت و رجوع الی اللہ اور اپنے کیے اور اپنی کمائی پر ندامت اور شرمندگی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

۱۰ مارچ ۱۹۷۳ء، آج کیمپ میں ایک مینا بازار کا اہتمام کیا گیا۔ ہمارے بعض ساتھیوں نے دہی بھلے، چاٹ اور دیگر چٹخارے کی چیزوں کے سٹال بھی تیار کیے، مگر ہم لوگ جانے ہی والے تھے کہ اچانک پورا کیمپ سائرنوں اور سیٹیوں کے شور سے گونج اٹھا، مینا بازار کا پروگرام ختم کر کے ہمیں فوراً قطاروں میں کھڑا ہونے کا حکم ملا، گنتی ہونے لگی، بھارتی سپاہیوں میں زبردست بھگدڑ مچی ہوئی تھی، سب رائفلیں لے کر ہمارے گرد اکٹھے ہونے لگے، ہمارے اندر اندر قسم قسم کی افواہیں گشت کرنے لگیں، جتنے منہ اتنی باتیں۔ تاہم بعد میں سنتریوں نے بتایا، کہ ایک پاکستانی قیدی ملٹری ہسپتال میں، انتہائی خطرناک بیماری (DANGEROUS ILLNESS) کی فہرست میں تھا، ہسپتال سے فرار ہو گیا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا، چنانچہ یہ سارا کھڑاگ انتظامی کارروائی کا حصہ تھا۔

۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء، پاکستانی قیدی کے فرار ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری 'عزت' پھر بحال ہو گئی ہے، یعنی رائفلوں پر پھر سنگینیں چڑھ گئی ہیں کہ کینٹین تک بھی جائیں تو ایک مسلح سنتری ہمارے پیچھے پیچھے رائفل تانے چلتا رہتا ہے، ورنہ پچھلے کچھ عرصہ سے یہ تکلف برطرف کر دیا گیا تھا۔

۲۹ مارچ ۱۹۷۳ء، آج ایک دوست کا خط ملا، اُس نے علامہ اقبال کی وہ نظم بھیجی ہے۔ جو علامہ مرحوم نے مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کی اسارت پر تحریر فرمائی تھی، اس نظم نے بھی زخموں پر خوب پھاہے رکھے ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

۲۹ مئی ۱۹۷۳ء

ہفت روزہ چٹان لاہور
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ــــ شمارہ ۲۰
۲۶ مئی ۱۹۷۵ء
قیمت ــــ ایک روپیہ

سنگین و رنگین سیاست

قوم کی ذہنی سرگذشت کے خطوط

ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ قائد اعظم کی رحلت . . . . . کا پاکستان اپنے واضح سانچہ میں نہیں ڈھلا تھا اور اس کی عمر ایک سال تھی۔ ہمارے لئے کئی مسائل کا باعث ہوئی۔ قائد اعظمؒ اچانک رحلت نہ کر جاتے تو ملک کو دستوری اعتبار سے بہترین شاہراہ مہیا کرتے اور داخلی و خارجی سیاست کے خطوط اس انداز سے بناتے کہ ہم اُن اندھیروں کے سپرد نہ ہوتے جنہوں نے ہمارے مقدر کو سیاہ کیا اور ہم روز بروز کمزور ہوتے گئے یا تماشا بن کر رہ گئے۔ سچائیاں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ ان کی شمعیں اس وقت روشن ہوتی ہیں جب ان کا وقت بیت جاتا ہے۔ پاکستان کے ہر دور میں سب سے بڑا جرم سچائی رہا ہے اور اب تو صورت حال بالکل پلٹا کھا چکی ہے۔ ایوب خاں کے زمانہ سے لے کر ہمارے نامور شاعر، معروف ادیب، معروف صحافی (الا ماشاء اللہ) حکومت کی داشتہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کی سب سے مظلوم شے راست بازی ہے ــــ لیکن مسئلہ زیر بحث یہ نہیں کہ اہل قلم یا اہل فکر یا اہل سیاست کس مقام پر ہیں۔ اصل مسئلہ ملک کے داخلی و خارجی حالات کی رفتار کا ہے۔

پاکستان بلاشبہ خدا کی نعمت تھا۔ لیکن ہم نے اس نعمت الہٰی سے جو سلوک کیا وہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اس المیہ کا مطلع و مقطع یہ ہے کہ ہم نے آج تک اس المیہ کے مرتکبین میں سے کسی کو سزا نہیں دی۔ بلکہ ان کی پرورش کی ہے اور ہمیشہ اُن لوگوں کو معتوب کیا ہے جو کسی رعایت یا کسی عنوان سے بھی اس کے مجرم نہیں۔ اگر مشرقی پاکستان کے المیہ پر مجرموں کو سزا دی جاتی اور اُن کے اعمال سے چشم پوشی نہ کی جاتی تو دوسروں کے لئے عبرت ہوتی اور اُن لوگوں کو تنبیہ ہو جاتی جو اپنے اغراض کے لئے پاکستان کی سالمیت اور پاکستان کے اقتدار کو استعمال کرتے اور خدا اور اس کی مخلوق کے خوف سے بے پرواہ ہیں۔

نہ حکمران حقیقی مجرموں پر توجہ کرتے اور نہ عوام ہی اپنے دشمنوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے عبقری و نابغہ ہونے کا دعویٰ ہے اور سیاست کے نباض ہیں۔ اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی ذہانت کی بولی دیتے اور خالی روحیں رکھتے ہیں ہمارے سامنے کیا نہیں؟ ہر چیز ہے۔ گو ہم اُن محلوں میں نہیں جہاں ملک کے احوال و وقائع ڈھلتے ہیں اور نہ ہم اُن بلندیوں پر ہیں جہاں سیاسی پتنگیں اُڑائی جاتی ہیں۔ لیکن ہم اُن پستیوں میں بھی نہیں کہ بہرے بھی ہوں اور ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ قمار خانہ میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ملک تجربات سے گزر رہا اور خدشات کی زد میں ہے ــــ ہم آج یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی صرف مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا نام ہے۔ اگر اس میں کچھ ذہین و فطین لوگ ہیں تو ان کی شخصیت صرف اُن کا علم و فہم ہو سکتا ہے۔ انہیں عوام میں رہنمایانہ رسوخ حاصل نہیں اور نہ سیاسی طور پر وہ ابھی بلوغ کو پہنچے ہیں۔ اور جو بالغ ہیں وہ پاکستانی قوم کی نفسیات سے الگ ایک جداگانہ فکر کی زندگی گزارتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی یہی دعوٰی کیا ہے اور اب بھی یہی عرض کریں گے کہ پاکستان ملکی غداروں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس ملک کے ہر غدار کو پھانسی پہ لٹکا دو ساری قوم کی یہی خواہش ہے۔ لیکن سیاسی اختلافات کی شدت و حدت کے تحت کسی کو غدار کہنا خود ملک کے لئے مفید نہیں۔ ہم منتظر ہیں کہ نیپ کے بارے میں سپریم کورٹ کیا فیصلہ دیتی ہے؟ لیکن ہم اس مقدمہ اور اس فیصلہ سے الگ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے اس قدر گزارش ضرور کیا چاہتے ہیں کہ وہ نیپ کے مسئلہ پر خان عبدالقیوم خان کی تُند دماغی اور زبان درازی سے الگ رہ کر غور فرمائیں کہ پاکستان میں مسائل کی ہر لحظہ گردش ملک کی دشمن ہے۔ پاکستان کو دشمنوں سے اس قدر خطرہ نہیں۔ جتنا ان مسائل سے خطرہ ہے کہ ۲۸ برس میں ہم عدالتوں سے پنپ نہیں

سکے یا ہم سے غدار سازی کا تحفظ ترک نہیں کیا۔ اس اندرونی خلفشار ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے داخلی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور خارجی مسائل پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔

اپوزیشن (ہمارے دوست معاف فرمائیں) محض اپوزیشن ہے جنہیں قید ہونا تھا وہ قید ہو گئے۔ اب اپوزیشن کا جمگھٹ بددیانت تو نہیں بے عمل ضرور ہے۔ نوائے وقت نے پیر پگاڑا شریف کے متعلق ایک اداریہ میں لکھا ہے کہ وہ سیاست کی طرف کم سے کم اتنی توجہ تو ضرور دیں جتنی انہیں ریس سے دلچسپی ہے۔ ہم معاصر موصوف کی اس رائے سے بھی متفق ہیں کہ پیر پگاڑا شریف ایک نامور خاندان کے سچے محب الوطن ہیں۔ اور ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپوزیشن نے انہیں جواب آں غزل کے طور پر صدر بنا رکھا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوں گے لیکن سیاست کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔ اگر اپوزیشن عوامی دور کو جاگیری دور کی طرف لے جانا چاہتی ہے تو وہ اپنے قول و فعل میں خود مختار ہے۔ لیکن پیر صاحب کی صدارت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپوزیشن میں کوئی سی سیاسی شخصیت نہیں یا اس کے ہفت رنگ عناصر کو اپنے سیاسی کالب میں کسی کی چمک دمک یا معلوم نہیں ہوتی — جب نقشہ یہ ہو تو صورت حال اس سے مختلف نہیں ہو سکتی جو ملک کو درپیش ہے۔

ابوظہبی میں قادیانی فتنہ

۱۸ مئی کے جنگ میں یہ خبر آ چکی ہے کہ ابوظہبی میں متحدہ عرب امارات کی پولیس نے پاسپورٹ آفس کے پیچھے قادیانیوں کے ایک مکان میں چھاپہ مار کر ۱۲ مرزائیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں نے گھر کے اندر اپنی مسجد بنا رکھی تھی۔ اور وہاں جمع ہو کر بیعت وغیرہ کرتے تھے۔ پولیس کو اس مکان سے بہت سا قادیانی لٹریچر ملا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ عرب امارتوں میں اسلام کے سوا ہر دوسرے مذہب کی تبلیغ ممنوع ہے۔ اور اس سلسلے میں خلاف ورزی کی زیادہ سے زیادہ سزا موت ہے۔ خبر یہ ہے کہ گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس بے شمار معلومات ہیں اور ہم ان معلومات کا ایک حصہ ابوظہبی کے فرمانروا کی خدمت میں بھیج چکے ہیں۔ واضح رہے کہ ابوظہبی کے فرمانروا عرب امارتوں کے سربراہ بھی ہیں۔ آپ نے ابھی چند دن پہلے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نامہ مبارک ایک کروڑ روپے دے کر حاصل کیا ہے جو حضورؐ نے روم کے بادشاہ ہرقل کے نام لکھا تھا۔ آپ کو سرور کائنات سے بے پناہ عشق ہے اور آپ ایسے کسی متنبی اور اس کی امت کو برداشت ہی نہیں کر سکتے جو حضورؐ کی ختم المرسلینی کا باغی ہو اور ملت اسلامیہ کی عالمی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا ارتکاب کرے۔ ہمارے پاس اس وقت چالیس ایسے قادیانیوں کی فہرست موجود ہے جو ابوظہبی میں مختلف فرائض انجام دے رہے ہیں اور ابوظہبی کی حکومت میں کسی نہ کسی واسطے سے دخیل ہیں۔ ان سب کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ یہ تمام اپنے خلیفہ ناصر احمد کی ہدایت پر اسرائیل کی ایجنٹی کرتے ہیں۔ آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کی ہدایت پر قادیانی محاسبہ کمیٹی کا ایک نمائندہ ابوظہبی روانہ ہو چکا ہے وہ امارات کا سفر کرے گا اور وفاق کے سربراہ شیخ زید بن سلطان کی خدمت میں تمام معلومات پیش کرے گا۔ ہماری مصدقہ اطلاع کے مطابق اس وقت چار پانچ سو کے درمیان قادیانی عرب امارتوں سے منسلک ہیں لیکن ان کا اصل کام استعمار و اسرائیل کی جاسوسی ہے۔ ان امارتوں میں آباد پاکستانی مسلمان ان سے واقف ہو چکے ہیں چنانچہ حال ہی میں پاکستان سنٹر ابوظہبی میں قادیانی امیدواروں کو شکست فاش ہوئی ہے۔ ڈاکٹر میجر مغل کی پارٹی نے قادیانی امیدواروں کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلے میں ہم ابوظہبی کے چیف جسٹس حضرت شیخ احمد بن عبد العزیز المبارک سے رابطہ پیدا کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ عرب امارتوں سے قادیانی رخت سفر باندھ کر رخصت ہو جائیں گے۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی کو اس سلسلے میں خصوصی توجہ کرنی چاہئے

ہفت روزہ چٹان لاہور

مولانا کوثر نیازی کی خدمت میں

مولانا کوثر نیازی وزیر مذہبی امور پاکستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے شب و روز مشغول ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں شیعہ سنی نمائندوں پر مشتمل کئی مجلسیں قائم کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ملک و ملت کے لئے ایک انتہائی مفید کام ہے۔ ان حالات میں اس کام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ربوہ کے عمرو عیار مسلمانوں کے بنیادی فرقوں کو آپس میں لڑانے کے لئے غلط اندیش اور خود فروش افراد سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

ہم مولانا کوثر نیازی کو ذاتی طور پر خط لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے لیکن واقعہ کی شدت کے پیش نظر ہم ان سے ان الفاظ کے ذریعے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ ان کمیٹیوں میں ان سنی اور شیعہ نمائندوں کو لیں جن کا دامن ہر شرارت سے پاک ہے کیا انھیں معلوم نہیں کہ نصیر الاجتہادی — کراچی کا ایک ذاکر ٹیلیویژن پر تبری کر چکا ہے اور عزا کی مجلسوں میں اپنی چند ملی ہوئی تقریروں کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے۔ آخر اس شخص کو کس سلسلے میں اتحاد کمیٹی میں شامل کیا گیا ہے؟ ہم ان سنی علماء کو بے حس سمجھتے ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ کمیٹی میں بیٹھنا گوارا کیا۔ اگر یہ شخص مجرم نہ ہوتا تو اس کی تردید کرتا اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں اپنی پوزیشن بتاتا لیکن اس نے چپ سادھی اور اس پر ناز کیا حتی کہ اپنے آوارہ شہزادوں سے گالیاں دلوائیں یہ شخص ۷ مئی کو لاہور وارد ہوا اور موچی دروازے کے ایک جلسے میں ہرزہ سرائی کی اور بعض شیعہ دوستوں

باقی صـ پر

۲۶ مئی ۱۹۷۵ء

پولیس کے خلاف عوام کا استغاثہ

پولیس کے خلاف ہر روز اخبارات میں اس قسم کی خبریں متواتر چھپتی ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زیادتیوں سے عوام نالاں ہیں۔ ابھی دو روز پہلے اخبارات میں خبر آئی تھی کہ سیالکوٹ میں ایک بچے کو پولیس نے پکڑ لیا اس کا والد مقامی کالج میں لیکچرار ہے۔ وہ بچے کے پیچھے پولیس اسٹیشن میں گیا تو اس سے زیادتی کی گئی۔ اس زیادتی کے خلاف کالج کے طلبار نے مظاہرہ کیا تو پولیس نے کئی ایک طلبا کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد سیالکوٹ سے ایک صاحب ہمارے پاس تشریف لائے۔ ان سے معلوم ہوا کہ پولیس گیارہ بارہ بچوں کو پکڑ چکی ہے اور دو ایک کی تلاش میں ہے ان کا بیان تھا کہ جن بچوں کو پکڑا گیا ہے ان میں سے اکثر کا جرم یہ ہے کہ وہ ہمعصر طلبا میں اپنی ذہانت کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں پولیس انہیں گرفتار کر کے کچھ اس انداز سے مطمئن ہے گویا اس نے چونڈہ کا مورچہ فتح کیا ہے۔ ہم بحث کو طول نہ دینے کی خاطر تسلیم کر لیتے ہیں کہ؛ طلبار نے مشتعل ہو کر پولیس کو رگیدا ہوگا لیکن پولیس نے اس پر غور کیوں نہیں کیا کہ:

طلبا کی عمر کیا ہوتی ہے ان کا ردِ عمل اُستاد کی بے عزتی کی وجہ سے قدرتی تھا اور پولیس کو یہ حق نہ تھا کہ وہ ایک استاد پر اپنے روایتی انداز میں طبع آزمائی کرتی، اس طرح پولیس کی عزت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ عوام میں اس تصور کو راہ ملتی ہے کہ پولیس اور عوام ایک دوسرے کی حریف طاقتیں ہیں۔ آج ۷ ارمئی کے لواسے وقت میں پشت کے صفحے پر پولیس سے متعلق اس طرز کی چار خبریں ہیں۔ ایک یہ کہ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس کرم الٰہی چوہان نے گجرات کے ایک شخص کی رٹ درخواست پر ایک ایس۔ آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کے خلاف ایس ایچ او تھانہ گجرات کو حکم دیا ہے کہ وہ ان دونوں کے خلاف شکایت درج کر کے کارروائی کرے۔ شکایت یہ ہے کہ ان دونوں پولیس اہلکاروں نے ۴ ر اپریل کو دو آدمیوں کو چوری کے شبے میں گرفتار کیا ان کی تلاشی لی تو ۴ ہزار نقد کے علاوہ ان کے کارخانے کا سامان اٹھا لیا۔ ان پر اتنا تشدد کیا کہ طبی معائنے کے مطابق ان کے جسم پر ضربات کے ۴ ا نشان تھے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس مسٹر ایم۔ ایس۔ ایچ قریشی نے ایک شخص کی درخواست پر اس کے نوجوان بیٹے کو رہا کر دیا اور پولیس سرجن کو ہدایت کی کہ وہ اس کا طبی معائنہ کر کے رپورٹ پیش کرے۔ عدالت عالیہ کے حکم پر بیلف تھانے میں پہنچا۔ اس کو برآمد کیا۔ اس کا بھائی اٹھا کر عدالت میں لایا وہ پولیس کے تشدد کی وجہ سے چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے ننگے جسم پر جگہ جگہ تشدد کے نشان تھے۔ اس نے عدالت کو بتایا کہ اسے اتنا مارا گیا ہے کہ پیشاب کے ساتھ خون آنے لگا ہے اس کے جسم پر ماچس کی تیلیاں جلا کر جگہ جگہ لگائی گئیں جسم جگہ جگہ سے جل گیا۔ ایس۔ ایچ او نے بیان دیا کہ اسے اس کی حراست کا علم نہیں۔ ایک دوسرا اے ایس آئی اس کو تفتیش کے لئے لایا تھا۔ فاضل جج نے کہا جب آپ کو یہ علم نہیں کہ آپ کے تھانے میں کیا ہو رہا ہے تو اپنے علاقے کے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے؟

تیسری خبر یہ ہے کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں تھانہ راجن پور کے ۳۰ پولیس اہلکاروں کو ضلع کے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے معطل کر دیا ہے اور شہریوں کو یقین دلایا ہے کہ پولیس والوں کے خلاف محکمانہ کارروائی کی جائے گی۔ پس منظر یہ ہے کہ مقامی کالج کے چار پروفیسر ایک ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے تو سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس ملازمان نے انہیں گالیاں دینی شروع کیں۔ ان کے حلیے کا مذاق اڑایا۔ پروفیسروں نے بھی جوابی طور پر یہی کیا جس سے فریقین میں جھڑپ ہوگئی۔ پولیس کے اہلکاروں نے پروفیسروں کو زدوکوب کیا۔ پکڑ کے تھانے لے گئے اور ان کے خلاف غنڈہ ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کیا۔ سارے علاقے میں ناراضی کی لہر دوڑ گئی تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ طلبا اور شہریوں نے جلوس نکالا۔ تھانے پر پتھراؤ کیا جس سے عمارت کے شیشے ٹوٹ گئے۔ چوتھی خبر ملتان سے ہے کہ وہاں صوبائی اسمبلی کی ممبر حسینہ بیگم کے مکان کو پولیس کی بھاری جمعیت نے رات کے وقت گھیرے میں لے لیا بلا اجازت گھر میں داخل ہوگئی۔ ایک پولیس انسپکٹر نے مجبور کیا کہ وہ اس بات کی تردید کرے کہ اس نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کی حمایت میں اپنا استعفیٰ پیش کیا ہے۔ حسینہ بیگم نے پولیس کے اس رویہ پر سخت احتجاج کیا تو انسپکٹر نے گندی زبان استعمال کی اور تھانے اٹھا کر لے جانے کی دھمکی دی۔ اس خاتون کے بیٹے جبار نے والدہ کی حمایت میں احتجاج کیا تو پولیس نے اس کو اٹھا لیا۔ حسینہ بیگم نے مزاحمت کی وزیر اعظم کو ٹیلیفون سے اطلاع دینا چاہی تو ان کے اے ڈی سی نے مداخلت کر کے ان کی جان چھڑائی حسینہ بیگم کا بیان ہے کہ چوہدری فرزند علی اور مسٹر جاوید اسماعیل نے جو صوبائی اسمبلی کے رکن ہیں انہیں یہ اطلاع دی ہے کہ پولیس نے ان کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔

حسینہ بیگم کا بیان درست ہے تو انتہائی شرمناک ہے۔ ایک جاگیردار باپ کی بیٹی نے یہ توہین کس طرح برداشت

کی؟ کیا اس کا خون سفید ہو چکا ہے؟ ہم وزیر اعلیٰ پنجاب سے مخلصانہ استدعا کریں گے کہ وہ اس معاملے کی تحقیق فرمائیں۔ اگر حسینہ بیگم کا الزام درست ہو تو اس انسپکٹر پولیس کو ایسی عبرتناک سزا دیں جو دوسروں کے لئے نظیر ہو جائے۔ حسینہ بیگم جس باپ کی بیٹی ہے اس باپ کو وزیر اعلیٰ بخوبی جانتے ہیں ان کے خاندان میں اس شخصیت کا بے پناہ احترام رہا ہے اگر یہ چیز کوئی معنی نہیں رکھتی تو اس لحاظ ہی سے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ حسینہ بیگم صوبائی اسمبلی کی ممبر ہیں اور ان کا تعلق وزیر اعظم کی پارٹی سے ہے۔ وزیر اعلیٰ اس پارٹی ہی کی طاقت سے برسر اقتدار ہیں۔ اگر پولیس کو اس راستے پر ڈال دیا گیا تو یہ اس کی عادت ہو جائے گی۔ آج جو چیزیں الف کے ساتھ ہو رہی ہیں وہ کل ب کو بھی پیش آسکتی ہیں بلکہ پیش آئیں گی۔

پولیس کی اس خو بو کے متعلق ہم تین چار باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی گذارش خود پولیس کے اہل کاروں اور ان کے اعلیٰ افسروں سے ہے کہ وہ عوام کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا عوام سے الگ۔ آخر انہیں یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا عوام کب تک اپنی قومی آزادی سے اس طرز کا مذاق گوارا کریں گے؟ پولیس کے بارے میں یہ تاثر عام ہو چکا ہے کہ اس نے عوام کو ان کی آزادی کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آزادی کے بعد پولیس اور عوام اپنے فرائض و حقوق سے تجاوز نہ کرتے۔ لوگ پولیس کو اپنا محافظ سمجھتے اور پولیس عوام کی دوست بن جاتی لیکن ہماری قومی آزادی نے اتنے زخم کھائے ہیں کہ پولیس اور عوام متحارب فریق ہو چکے ہیں۔ دوسری گذارش ملک کے ان سیاسی راہنماؤں سے ہے جو اس وقت برسر اقتدار ہیں۔ انہیں محسوس کرنا چاہیئے کہ اقتدار فانی شے ہے اس نے کسی سے دیر پا وفا نہیں کی۔ کل کلاں دوسروں کے ہاتھ میں بھی طاقت آسکتی ہے۔ اگر پولیس سے سیاسی کام لئے جائیں تو حالات اسی طرح بگڑتے ہیں

ہفت روزہ چٹان لاہور

طلباء میں اشتعال کا ذہن کس نے پیدا کیا؟ اب طلبا کی عادتیں پختہ ہو چکی ہیں۔ وہ پولیس سے جواباً غزل کے طور پر ڈنڈے سے لڑاتے ہیں نتیجۃً تصادم کی شکل پیدا ہوتی ہے اور حالات اس نہج پر آجاتے ہیں کہ سیالکوٹ اور راجن پور اس کا نشان ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کئی دفعہ لکھا ہے کہ پولیس کو پولیس ہی رہنے دو۔ اس سے اپنے سیاسی عزائم میں کام نہ لو۔ اس طرح اس کی عادتیں بگڑ کر خطرناک ہو جائیں گی تیسری التماس عوام سے ہے کہ وہ اپنے طریقۂ احتجاج کو بدلیں۔ محض شور مچانا یا گالی گلوچ کسی مرض کا علاج نہیں۔ جب قانونی عدالتیں موجود ہیں تو مقامی اور صوبائی وکلاء کے تعاون سے سنگدل اہل کاروں کے خلاف مقدمات کی اتنی بھرمار کر دیں: چاہیئے کہ انہیں اپنے فرائض و حدود کا احساس ہو اور وہ سنبھل جائیں۔

بقیہ: شذرات

کی ہدایت کے مطابق روزنامہ نوائے وقت اور ہفت وار چٹان پر تبرّیٰ کیا۔ ہمیں اس کی قطعاً پروا نہیں۔ یہ اس کا مذہب ہے جو شخص صحابۂ کرام کو گالی دے سکتا ہے وہ ہمیں گالی دیتا ہے تو ہمارے لئے باعث ثواب ہے لیکن ہم مولانا کوثر نیازی سے یہ ضرور عرض کریں گے کہ وہ اس شخص کے وجود سے اتحاد کمیٹیوں کو گدلا نہ کریں۔

افسوس ہے کہ اس سلسلے میں کسی بزرگ شیعہ راہنما اور معتبر عالم دین نے نصیر اجتہادی کو ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اس کے بعد وہ ہم سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ اہل بیتؑ ہم سب مسلمانوں کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ نصیر اجتہادی جیسے لوگ ان کے نام پر کاروبار کرتے ہیں۔ ہم اہل بیتؑ کے جانثار ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ ہم نے ہر دور کی کربلا میں پرچم حسینؑ بلند کیا ہے۔ نصیر اجتہادی کی طرح خون حسینؑ نہیں بیچا۔ جو شخص شیعہ سنی اختلاف پیدا کرتا ہے وہ اس ملک کا سب سے بڑا دشمن اسلام کا بدترین حریف اور مرزائیوں کا ایجنٹ نمبر ایک ہے۔

آزاد کشمیر کے انتخابات

بالآخر آزاد کشمیر کے انتخابات بخیر و خوبی ختم ہو گئے۔ نوائے وقت نے ۱۸ مئی کو اتوار کی اشاعت میں پہلے صفحے پر آزاد کشمیر کے متعلق سیاسی مبصر کا تبصرہ شائع کیا تھا جس میں ایک سرخی تھی: "نتائج کچھ بھی ہوں حکومت پیپلز پارٹی کی بنے گی سردار قیوم کو اقتدار کبھی راس نہیں آیا ان کی صلاحیتیں اپوزیشن میں زیادہ کھلتی ہیں۔ سردار ابراہیم کو اقتدار ہمیشہ گھر پر آکر سلام کرتا ہے"۔ اب آزاد کشمیر کے انتخابی نتائج سامنے آگئے ہیں یعنی سردار ابراہیم پیا کی سیج پہ سہاگن ہو گئے لیکن وہ کیا اور ان کی صدارت کیا؟ ہم انہیں ایک خوش قسمت انسان سمجھتے ہیں۔ کسی جدوجہد و قربانی و ایثار کے بغیر آزاد کشمیر کا صدر ہو جانا فی الواقعہ ان کے بخت رسا کی دلیل ہے۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ جب تک پیا چاہیں گے وہ سہاگن رہیں گے۔ جب پیا نے آنکھیں پھیر لیں تو وہ حسب سابق گوشہ نشین ہو کر مطالعہ کتب میں منہمک ہو جائیں گے ہمیں سردار صاحب کے متعلق چنداں معلومات نہیں اور نہ وہ کسی لحاظ سے آئیڈیل نوجوان ہیں ملکی سیاست کی ضرورتوں کو اس قسم کے نوجوانوں کی ضرورت رہی ہے اور یہ اس تناظر میں ٹھیک ٹھیک تل سکتے ہیں۔ بہرحال اب سردار صاحب صدر منتخب ہو گئے ہیں تو ہم ان کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں، خدا کرے انہیں کوئی ایسا دوست نہ ملے جس انداز کی دوستی انہوں نے سردار عبدالقیوم سے نبھائی ہے جاتی ہے منظر مسعود بھی منتخب ہو گئے اور چوہدری نور حسین بھی۔ پیپلز پارٹی نے ۴۰ میں سے ۱۲ نشستیں جیت لیں۔ مسٹر کے ایچ خورشید کی لبریشن لیگ نے پانچ اور ابراہیم کے گروپ نے چار اور بعض دوسرے صاحبان نے انفرادی طور پر ایک یا دو نشستیں حاصل کی ہیں۔ ہم ان سب کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے یہ نمائندے کشمیر کا مسئلہ کیونکر حل کرتے ہیں؟ ان کے ذاتی اور گروہی مسائل تو حل ہو ہی جائیں گے۔ انشاء اللہ

۲۶ مئی ۱۹۸۵

پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات

زاویہ ہائے نگاہ کے سیاسی فاصلے

پاکستان اور ہندوستان میں قبل از آزادی کے عہد کی سیاسی آویزش ابھی تک موجود ہے۔ اس کے اسباب و علل ڈھکے چھپے نہیں۔ انہیں زیر بحث لانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو کچھ بھی اندر خانہ ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ہم ایمانداری سے محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کشمیر پر قابض نہ ہوتا تو اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ نہ ہوتی۔ پھر مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کے روز و شب طلوع نہ ہوتے اور ہندوستان اس کی علیحدگی میں اس کا معاون نہ ہوتا تو پاکستان کے ہندوستان سے تعلقات مزید خوشگوار ہو جاتے اور گذشتہ آنچہ گذشت کے تحت ایک نیا سفر شروع ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ تقسیم کی تلخیاں بہت شدید تھیں اور ہندوستان کا مسلمان ہندوستان کی جن سنگھی ذہنیت کے ہاتھوں موت کے دروازہ پر کھڑا رہا۔ لیکن واقعات ہموار ہونے لگیں تو سیاست مزید پلٹا کھاتی ہے۔ وہ نسلیں اب بوڑھی ہو چکیں۔ جنہوں نے تقسیم کا مزہ چکھا۔ دوسرے مشہور مثل کے مطابق عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے وہ جو فضلے اب کمزور ہو گئے ہیں جن کے سامنے قیامت صغریٰ برپا ہوئی اور درندوں نے بہیمانہ مظاہرے کئے۔ ان ۲۷ برس میں جو نئی پود تیار ہوئی ہے وہ تاریخ کی ان تلخیوں کی سانح و قاری مزید ہے لیکن ان میں سے گذری نہیں۔ ان کے سامنے عالمی سیاست کے اتار چڑھاؤ ہیں اور وہ جانتی ہے کہ انسان پتھر نہیں اور نہ یکسانی خیال کا اسیر ہے۔ بلکہ انسان بقول غالب محشر خیال ہے۔ آج نئی نسلیں عالمی سیاست کے آئینہ میں اپنے اعمال و افکار دیکھتی ہیں اور اس کے مطابق اپنا نقشہ مرتب کرنا چاہتی ہیں۔ ہم ہندوستان سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جانبین تاریخ سے سبق لیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی بڑائی اور آبادی کی کثرت اس کے کام نہیں آسکتی اور نہ اس کو اس بنا پر غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا چاہیئے۔ آج کی جنگیں دو ملکی نہیں ہوتیں۔ آج کی لڑائیاں عالمی طاقتوں کی پشت پناہی سے ہوتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اب کوئی بڑی طاقت کسی چھوٹی طاقت یا کوئی بڑا ملک کسی چھوٹے ملک کو کسی زعم یا کسی بل پر شکست دے سکے یا اس پر چڑھ دوڑے اور اس کو اپنا تابع مہمل بنا لے۔ امریکہ نے ویتنام میں کیا حاصل کیا؟ دنیا کی عظیم طاقت دنیا کے مختصر ملک سے شکست کھا گئی۔ پاکستان کے بارے میں اگر کوئی ملک اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ اس کو محو کیا جا سکتا، شکست دی جا سکتی اور زیر کیا جا سکتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی بلکہ دماغ کا غدران ہے۔ پاکستان بے شک ہندوستان کے مقابلہ میں جغرافیائی اعتبار سے ایک چھوٹا ملک ہے اور اس میں بھی کلام نہیں کہ آبادی کے لحاظ سے بھی کمتر ہے۔ لیکن پاکستان ایک معنوی طاقت اور ایمانی حرارت کا نام ہے اس کو شکست دینا، محو کرنا یا نیچا دکھانا ممکن نہیں۔ جو شخص ایسا سوچتا وہ سیاسی واہمہ کا شکار ہے۔ ہم پاکستانی کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اس کے نباض کی حیثیت سے عرض کریں گے کہ مشرقی پاکستان اس لئے موجودہ حال کو نہیں پہنچا کہ ہندوستان نے ایسا چاہا اور وہ مسخر ہو گیا بلکہ صورت حال مختلف تھی۔ مشرقی پاکستان کی لیڈر شپ اور عوام کو مغربی پاکستان کے بعض نمائندوں سے ناراضی پیدا ہوئی اور وہ ناراضی مجسم ہو گئی۔ اس خطہ کے عوام نے تعاون نہ کیا۔ تو مغربی پاکستان کے اہل کاروں کا سفینہ ڈوب گیا۔ جس خطہ کے ایک فی صد باشندے بھی تعاون نہ کریں۔ وہاں نتیجہ اس سے مختلف نہیں ہوتا جو پیش آیا۔ جہاں مغربی پاکستان کا سوال جواب پاکستان ہے تو اس کے عوام کا مزاج دوسرا ہے۔ وہ اپنی حکومت سے ہزار اختلاف کریں اور اندر خانہ اس سے لڑیں لیکن پاکستان کو کسی بیرونی طاقت سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو ان کا بنیان مرصوص بن جانا تقدیر الٰہی ہے۔ اس وقت سب متحد ہو جاتے ہیں کہ ع

موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

پاکستانی اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں اور اس کے لئے تیار ہیں۔ لیکن وہ اپنی آزادی کے چہرے پر ہلکی سی خراش برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ انہیں جان لینے اور جان دینے کی ادائیں آتی ہیں۔ ہم اس روایت سے بے بس ہیں کہ ہماری آواز ہندوستان کی سیاست ساز قیادت تک پہنچ نہیں پاتی۔ اگر ہماری آواز اتنی رسا ہوتی تو ہم ہندوستان کے ان سیاستدانوں سے اپنی بات مزید عرض کرتے جن کا ضمیر اب بھی سچا ہے اور جو شدید حقائق کی سیاسی گہرائیوں سے آگاہ ہیں۔ ہم ان سے کہتے اور یہی بات ہم پنڈت جواہر لال نہرو کی عظیم بیٹی مسز اندرا گاندھی سے کہنا چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان سے متعلق اپنے نقطہ نگاہ پر نظرثانی کریں۔ پاکستان کی دوستی مفید ہو سکتی ہے۔ دشمنی نہیں اس کا نتیجہ دونوں ملکوں میں اختلال و انتشار کو ہوا دینے

باقی صفحہ پر

سیاسی لطائف

مقدّس بدمعاش

پچھلے دنوں اسلام آباد میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو عالمی سیاست کے طلوع و غروب پر نگاہ رکھتے اور ملک کے احوال و وقائع کی پہچان میں آمادہ ہیں۔ آپ نے کسی سلسلے میں فرمایا کہ فلاں شخص سے فلاں بات کہہ دیجئے۔ عرض کیا کہ اُن سے دوستانہ شُد بد ضرور ہے لیکن آپ اپنے خسر یار جنگ سے کہیئے کہ آجکل ان کی مُونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں۔ ہماری اس گزارش پر مسکرائے۔ فرمایا، بات آپ کی درست ہے۔ مجھے اپنی عزیزداری کا احساس ہے۔ فی الواقعہ رشتہ نازک ہے۔ لیکن میں اُن کی سفارش سے، اگر اس کا نام سفارش ہے تو کوئی رعایت حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اختیار ہے۔ عرض کیا وہ بھی تو اللہ والے ہیں۔ فرمایا۔ جی ہاں، کہلاتے تو یہی ہیں لیکن فی الواقعہ **مقدس بدمعاش** ہیں۔

غلطی نہ کرو بھائی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہاں ملتان میں ایک مرید حاضر ہوا اور لڈوؤں کی ایک بڑی ٹوکری پیش کی۔ شاہ جی نے کہا، کوئی خوشی میں لائے ہو۔ اُس نے کہا، حضرت میری عمر ۴۸ برس سے نکل چکی ہے۔ ۲۵ برس شادی کو ہو چکے ہیں، صرف دو لڑکیاں تھیں کوئی بیٹا نہیں تھا۔ میں نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولادِ نرینہ دی تو اپنے پیر کی خدمت میں پانچ سیر لڈوؤں کی شرینی پیش کروں گا۔ خدا نے اس عمر میں چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔ میں اپنی منت پوری کر رہا ہوں۔ شاہ جی نے مبارکباد دی۔ معلوم تھا کہ وہ پھیری لگا کر مزدوری کرتا اور غریب آدمی ہے، اس سے پہلے شاہ جی کچھ اور کہتے اُس نے جیب سے سو بیلے کا نوٹ نکالا۔ شاہ جی کی نذر کیا، شاہ جی نے پوچھا، یہ کیا؟ اُس نے کہا، میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہوا تو میں لڈوؤں کے علاوہ سو روپیہ اپنے پیر کی نذر کروں گا، شاہ جی کو معلوم تھا کہ وہ کیونکر زندگی گزارتا ہے۔ شاہ جی نے سو روپیہ کا نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر اُس نے کہا اور فرمایا اُس نے عرض کیا حضرت اب آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔ آپ زچہ اور بچہ کے لئے دعا کریں۔ شاہ جی نے طویل دُعا مانگی پھر لڈوؤں کی ٹوکری میں سے ایک لڈو خود کھایا دو چار تقسیم کئے باقی ٹوکرا اُس کو دے کر فرمایا کہ میری طرف سے اسی خوشی میں اپنے عزیزوں دوستوں اور محلہ والوں میں بانٹ دو۔ پھر سو روپیہ کا وہی نوٹ جیب سے نکالا کہ یہ تو میں نے تمہارا نذرانہ وصول کر لیا۔ اب اس رقم سے زچہ کے لئے گھی اور بادام لے جاؤ، میری طرف سے اپنی اہلیہ کو دو۔ اُس نے بہترے جتن کئے کہ شاہ جی رکھ لیں۔ لیکن شاہ جی نے دونوں چیزیں بہ اصرار حوالہ کیں اور فرمایا کہ میری مرضی کے مطابق عمل کرو۔ اُس نے کہا شاہ جی ایک بات اور ہے، اجازت بخش دیں۔ میں نے منت مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بچہ دیا تو اُس کا نام عطاء اللہ رکھوں گا۔ شاہ جی نے قہقہہ بلند کیا اور فرمایا:

"غضب کرتے ہو کیا اُس کے مقدر میں
قید و بند اور ابتلا و آزمائش کی صعوبتیں
رکھنا چاہتے ہو۔ میاں! اُس کا نام احتشام الحق
رکھو تاکہ خوشحال رہے اور دنیا پیدا کرے"

تمام حاضرین قہقہوں میں ڈھل گئے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی سے

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی باغ و بہار طبیعت کے انسان ہیں۔ قدرت نے آپ کو شاہانہ مزاج عطا کئے ہیں۔ جلال الدین اکبر کا دَور ہوتا تو مخدوم الملک ملا عبدالنبی کو شرمات دیتے۔ حضرت معاویہؓ کے جانشینوں کے عہد میں ہوتے تو شہنشاہیت کا جواز اس خوبی سے

باقی اگلے صفحے پر

ماہر القادری مرحوم

زبان و روزمرہ

دنیا میں جتنے بڑے ادیب اور عظیم شعرا گزرے ہیں وہ سب کے سب زبان و روزمرہ پر پوری قدرت رکھتے تھے ۔ برمحل الفاظ برتنے کا سلیقہ انھیں آتا تھا اور زبان کی نزاکتوں پر اُن کی نظر تھی۔ خیال کا درجہ زبان و اظہار کے بعد کا ہے ۔ بلند سے بلند خیال کو اگر مناسب و موزوں پیرایہ بیان نہ ملے تو اس خیال کی بلندی اور رعنائی غارت ہو جاتی ہے ۔

لغت اور زبان و روزمرہ کی تحقیق کا فن جتنا دلچسپ ہے اُس سے زیادہ مفید و کار آمد ہے ۔ اس شوق اور فن پر "لفظوں کی پرستش" کی پھبتی لکھے پڑھے آدمیوں کو زیب نہیں دیتی ۔ ویسے جس کے ہاتھ میں بھی قلم ہے وہ جیسی طنز و تعریض چاہے کرسکتا ہے۔

بے شک زبان جامد نہیں ہے یہ پھیلتی، بڑھتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ مگر اس کی حرکت و نمو کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اناڑی اور کم سواد لوگ زبان میں تصرف کرنے لگیں۔ فقہ کی طرح زبان میں بھی اجتہاد کے شرائط ہیں اور ہر ادیب و شاعر مجتہد نہیں ہوتا ۔

کوئی زبان داں اور لغت نگار اپنی تحقیق کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مطالعہ اور تحقیق کی کوئی حد و نہایت نہیں ۔ اس بحرِ بیکراں کا اور چھور کہاں ملتا ہے ؟ مطالعہ اور تحقیق کے بعد ہر صاحبِ تحقیق کو اپنی بے خبری کا احساس ہوتا ہے کہ فلاں بات کی بات کا ابھی تک علم ہی نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں زبان و الفاظ کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں ۔

راقم الحروف نے بچپن میں ایک لفظ "لنگھن" سنا تھا۔ لنگھن اور برت میں یہ فرق ہے کہ "لنگھن" فاقہ کو کہتے ہیں اور "برت" قریب قریب روزے (FAST) کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ گاندھی جی کے برت سیاسی دنیا میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔ اردو صحافت میں "برت" کو روزہ نہیں لکھا جاتا تھا مگر ۱۹۴۴ء میں جب راقم الحروف عراق گیا تھا تو بغداد کے اخباروں میں گاندھی جی کے برت کو "صوم غاندی" لکھا جاتا تھا۔ جس طرح عربی میں قاصد اور ایلچی کو "رسول" کہتے ہیں۔

ہاں ! تو بات "لنگھن" کی ہو رہی تھی اردو کی ایک مشہور کہاوت ہے :

"یا تو ہنسا موتی چگیں یا لنگھن کر مرجائیں"

یعنی ہنس یا تو موتی چگتے ہیں ورنہ پھر فاقے کرکے مرجاتے ہیں ۔ یہ ضرب المثل "وضعداری" کے لیے استعمال ہوتی ہے کہ شریف اور وضعدار لوگوں کی جو وضع، عادت اور چلن ہوتا ہے اُسے نہیں بدلتے چاہے ایسا کرنے میں انھیں کیسی ہی جوکھوں کیوں نہ اٹھانی پڑے ۔

اپریل ۷۵ء کے ماہنامہ تحریک (دہلی) میں ایرانی شاعر کا ایک شعر[1] درج ہے، جس میں "لنگھن" نظم کیا گیا ہے ۔ افسوس ہے اس شعر کی صحیح کتابت نہیں ہوئی ۔ کاتب صاحب نے کتابت میں دراندازی کی ہے اس مضمون میں جو یہ لکھا ہے ۔

"لنگھن روزۂ ہندواں"

وہ غلط ہے "لنگھن" برت کو نہیں "فاقہ" کو کہتے ہیں ! مضمون نگاروں کی اس قسم کی غلطیاں پڑھنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کردیتی ہیں ۔ اسی مضمون میں ایرانی شاعروں کے وہ شعر درج کیے ہیں جن میں اردو ہندی الفاظ ۔ چندن اور میدہ ۔ بھی نظم کیے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایرانی شعرا نے کسی نہ کسی حد تک اردو کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ "فاران" میں تبصرے کے لیے ایک کتاب ۔ سیرت یعقوب و مملوک ۔ آئی ہے ۔ پروفیسر مولانا نور الحسن شیرکوٹی اس کے مؤلف ہیں ۔ دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی وفات ۱۸۸۴ء میں ہوئی تھی ۔ راقم الحروف نے اس کتاب کو اِدھر اُدھر سے دیکھا تو زبان کے سلسلہ میں ایک کام کی بات مل گئی ۔ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے :

"کھٹ" کھاٹ (چارپائی) کو کہتے ہیں اور "مل" کے معنی پہلوان کے ہیں۔ کھٹمل یعنی کھاٹ کا پہلوان"۔

راقم الحروف نے پہلوان کے معنی میں "مل" (لام پر تشدید) ہی سنا ہے۔ پلیس کی ڈکشنری میں بھی یہ لفظ "مل" ([illegible]) اسی معنی میں مل گیا۔ مگر "ملّی" نہیں ملا۔ پہلوانی کو راقم الحروف کے وطن اور اس کے نواح میں "ملّی" بولا جاتا تھا ۔ یوں ۔

"پٹھان کا شر ذو ملّی (یعنی پہلوانی) کرتا ہے"

یہ تو کچھ جھلکیاں الفاظ و روزمرہ کی تھیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی چلتے چلاتے عرض کردوں کہ اردو نے دوسری زبانوں کے تلفظ اور معنیٰ تک بدل دیئے ہیں مثلاً عربی میں نائی (باربر) کو "حلاق" کہتے ہیں جو "حلق" سے مشتق ہے، حلق کے معنیٰ ہیں "سر مونڈنا"

---

[1] خوان اودائم بر نشاتر و بر عہاں
در حزیں باشد حقا کہ کند لنگھن

مگر اردو میں "حلاق" کی بجائے "حجام" بولا جاتا ہے اور "حجام" عربی میں پچھنے لگانے والے کے لئے بولا جاتا ہے۔ عربی میں "میّت" اور "سیّد" کی "ی" پر کسرہ ہے مگر اردو میں دونوں لفظ فتحہ (میَت، سیَد) کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ "فوق" خالص عربی لفظ ہے اور "تمبڑک" خبیث اردو لفظ ہے۔ ان کے درمیان اضافت نہیں آسکتی مگر "فوق الپھڑک" اردو میں درست ہے اور اس ترکیب کا کوئی دوسرا لفظ بدل نہیں ہے۔ انگریزی کے "انجن" (ENGINE) کو اردو میں "انجن" بولتے ہیں۔

جناب شورش کاشمیری کی مشہور کتاب — بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل — پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) نے لفظ "اژدہام" پر گرفت کی ہے۔

"ازدحام کا املا کئی جگہ اژدہام لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔"

اس سلسلہ میں راقم الحروف یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ جس طرح اردو میں غلط العام الفاظ درست سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح "ذخیرہ" کا املا "ذخیرہ" کیا جاتا ہے اور "ازدحام" کو "اژدہام" لکھتے ہیں۔ یہ دونوں رسم الخط کے غلط العام الفاظ ہیں جو اردو کی حد تک درست ہیں! حضرت جگر مراد آبادی نے بھی اپنے دیوان میں "اژدہام نظر" لکھا ہے۔ اس لئے میں عرض کروں گا کہ جناب شورش کاشمیری نے نے جو "اژدہام" لکھا ہے تو اردو کے "غلط العام املا" کے مطابق لکھا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ "غلط العام" کوئی اصول نہیں ہے جس کو سامنے رکھ کر دوسرے الفاظ وضع کئے جائیں۔ "فوق البھڑک" درست ہے۔ مگر "فوق البھنگ" غلط ہے۔ اسی طرح شاعروں "کو شعراؤں" بعض اہل قلم لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ جمع میں "شعراء" کا "ء" "ہمزہ" سے نہیں بدلا جاسکتا اور جیسے "نیل و مرام" (ذیل بروزن نیل) کو "بے نیل و مرام" (ذیل بروزن کیل۔ جیل) بولنا اور لکھنا جہالت کی دلیل ہے۔

جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اردو میں یہی دو لفظ۔ ذخیرہ۔ اور اژدہام۔ ہیں جن کا رسم الخط اردو میں بدل دیا گیا ہے اور یہ "غلط العام" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو حضرات ذخیرہ اور ازدحام لکھتے ہیں وہ عربی کے رسم الخط کے مطابق صحیح لکھتے ہیں۔

> محبت صلح بھی پیکار بھی ہے!
> یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
> غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
> تمنا بھی ہے دشوار بھی ہے!

بقیہ: سیاسی لطائف

پیدا کرتے کہ قرآن و حدیث منہ تکتے رہ جاتے۔ جنابِ لیاقت کے زمانہ میں ہوتے تو زبانِ دیانت کے دبستان میں سرورِ آوردہ ہوتے اور بادشاہی کی جامع مسجد کے امام ہوتے جو ان کا دم بھرتے۔ لیاقت علی خان کے زمانے میں طوطی شیریں مقال تھے۔ خواجہ ناظم الدین کے دور میں قصرِ اقتدار میں داخل ہو گئے، ملک غلام محمد کی رفاقت ہو گئے۔ اسکندر مرزا نے مصریٰ طرح خیال کیا۔ ایوب خان کے زمانہ میں نظم سوئی رہے۔ یحییٰ خان کے سوءِ استعمال سے جماعت اسلامی کا مقابلہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو "گوشہ نشین" ہو گئے اور مراقبہ میں رہے۔ مولانا کوثر نیازی نے وظائف و اوراد سے مشکلات رفع کیں۔ اب حضرت مولانا جو اقتدار کو بوسہ دیتے اور بابِ وزارت پر گریہ کرتے ہیں۔ مولانا دینی رائے کے آدمی ہیں، ہمیں ان کے متعلق یہ شبہ نہیں کہ سبزی اور دوپہلی مصلحتوں کے انسان ہیں۔ ان کا مزاج ہی ایسا ہے لیکن سرکاری کمیٹی میں نصیر اجتہادی کے ساتھ ان کی ہم نشینی بھیلی [illegible] کے مصداق ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے تو آپ نے اس لئے تعاون کرنے سے انکار کیا تھا کہ اپنی ریش مقدس ان کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے تھے (یہ الفاظ مولانا ہی کے ہیں اور ہم نے خود سنے تھے) لیکن نصیر اجتہادی جس نے صحابۂ کبار پر تبرا سے خشت باری کی ہے آپ کے پہلو میں اس طرح بیٹھا ہے جس طرح غنچوں پر باد صبحگاہی اوس کے موتی بکھیرتی ہے۔

بقیہ: پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات

کے مترادف ہے اور اس کا حاصل عالمی طاقتوں کے ہاتھ میں کھلونے بننے کی حماقت کے مصداق ہے۔ ہم اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کر سکتے ہیں لیکن فی الحال نہیں۔ ہندوستان کو یاد کرنا چاہیئے کہ ابتدائی دنوں ہی میں قائداعظمؒ نے ہندوستان کو پاکستان سے مشترکہ دفاع کی پیشکش کی تھی لیکن ہندوستان نے کان نہ دھرا۔ پھر لیاقت نہرو معاہدہ دوستانہ سفر کا پہلا قدم تھا مگر ناکام رہا۔ ایوب خان نے خوشگوار ہمسائیگی کی خواہش کی لیکن ہندوستان نے اثباتی جواب دینے سے پرہیز کیا۔ اب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے عوام کی سیاسی نکتہ چینی کے باوجود شملہ معاہدہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے عوام کو خوشحال و مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن آج ہی یہ خبر دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہندوستان اپنی دھن میں مگن ہے۔ آخر فضائی سلسلہ قائم کرنے میں کونسی ارچن مانع ہے؟ لیکن گنگا طیارے کا معاوضہ ارچن بن گیا ہے؛ بات معمولی ہے لیکن ایک بے معنی ضد ہے؛ جن لوگوں نے اس طیارے کا اغوا کیا وہ پاکستان لائے وہ پاکستانی نہیں تھے؛ ہندوستان کے شہری تھے؛ اگر انہوں نے ہندوستان کے نزدیک کوئی غلطی کی ہے تو پاکستان کس رعایت سے قصوروار ہے؟

بھول ہندوستان کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ وہ پاکستان سے ... بچا نہیں؟

[illegible] ہندوستان [illegible]

از: ڈاکٹر سید عبداللہ

۲۸ واں مقالہ

تصور خودی کی سہل ترین تشریح

خودی کا سلسلۂ عمل

(۳) پیکار

یہ تو معلوم ہو گیا کہ خودی ایک "نقطۂ نوری" ہے جو ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اور انسان کے باطن میں بھی موجود ہے۔ مگر اس میں گرمی، چمک اور قوت، آرزو، (عشق و محبت) پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عشق و محبت بڑا وسیع لفظ ہے، بڑے بڑے مقاصد کی لگن بھی اسی میں شامل ہے۔ انہی مقاصد کی لگن سے قوت عمل جاگ اٹھتی ہے اور فرد اور مجموعی طور پر ملت بھی، بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہے۔ اس کے دل سے غیر اللہ کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ بے خطر مشکل منزلوں کو عبور کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

خودی جب کسی آرزو کے تحت سرگرم عمل ہو جاتی ہے تو مقصد کے حصول کے لئے اس کی دو قوتیں آمادہ عمل دکھتی ہیں - ایک مثبت۔ یعنی یہی عشق (مقاصد یا ذوق تسخیر) اور دوسری منفی۔ یعنی راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی قوت یا پیکار (یا ذوق تخریب):

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

برکند بنیاد موجودات را
می دهد ترکیب نو ذرات را

یعنی جب فرد خود آشنا ہو جاتا ہے تو زمانہ خود بخود اس کے مزاج کا ہم رنگ بن جاتا ہے ورنہ وہ زمانے سے ٹکرا جاتا ہے اور ایک نئی دنیا وجود میں لے آتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ خودی کے عمل میں عشق اور پیکار دونوں کی ایک خاص حیثیت ہے۔ دونوں خودی کے محافظ بھی ہیں اور اس کی ترقی کا ذریعہ بھی۔ عشق کا عمل آگے بڑھنے کے شوق کو تیز کرتا ہے اور پیکار اس پیش قدمی کے دوران پیش آنے والی رکاوٹوں کو طاقت سے دور کرنے کی کوشش ہے۔

اقبال کے کلام میں ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ دونوں کی خودی سے اور دوسری طرف آپس میں بھی لازم و ملزوم کی حیثیت ہے۔ اس لئے ان کی تھوڑی سی تفصیل مفید ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:

"زندگی کے ارتقا کے لئے تصادم اور پیکار ناگزیر ہے یہ پیکار کبھی خارج میں ہوتی ہے اور کبھی باطن میں، کبھی فرد ماحول سے ستیزہ کار ہوتا ہے اور کبھی افکار باہم ٹکراتے ہیں حیات اور ترقی کا مدار انفس و آفاق کے مسلسل تصادم پر ہے۔" ص ۳۱۲

اقبال کے کلام میں پیکار کا بار بار ذکر آتا ہے اس سے بعض لوگوں کے دل میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اقبال جنگ جوئی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں، اقبال صرف یہ کہتے ہیں کہ:

۱- فطرت کے اندر ہر جگہ پیکار کا عمل جاری ہے۔ فطرت میں ترقی و ارتقا کا سارا سلسلہ اس اصول کے تابع ہے۔

۲- انسانی تاریخ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ تہذیب انسانی کی ترقی میں پیکار اور تصادم نے ہمیشہ حصہ لیا ہے۔

۳- مگر اقبال نے ملت اسلامیہ کو ایک برتر ملت قرار دے کر یہ واضح کیا ہے کہ اس ملت کا عمل فطرت کے عمل سے برتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ یہ ملت پیکار کے فطری اصول پر اونچے مقاصد کی خاطر کچھ پابندیاں عاید کرتی ہے۔

پہلی پابندی یہ ہے کہ پیکار کا یہ سلسلہ صداقت سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ دوسری پابندی یہ ہے کہ اس میں خوف حق ہر وقت موجود رہنا چاہیئے۔ بے غرضی یعنی بری اغراض سے پاک ہونا یہ بھی ایک بنیادی شرط ہے۔ اسی لئے اس جہاد کو جو ملک گیری کی ہوس کی وجہ سے کیا جاتے جہاد نہیں فساد کہا گیا ہے۔ جو پیکار اس قدر پاکیزہ ہو، اسے کوئی شخص برا نہیں کہہ

باقی صفحہ ۲۶

[illegible]

محمد عثمان فارقلیط

بشکریہ "ندائے ملت" لکھنؤ

فلپائن کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

حق خود اختیاری کی نعمت مسلمان ممالک کے دباؤ کا نتیجہ ہے

جنوبی فلپائن کے مسلمانوں نے

جنوبی فلپائن کے مسلمان اپنے علاقوں کے لئے خود مختاری حاصل کرنے کی غرض سے کئی سال سے سرکاری فوجوں سے لڑتے رہے۔ حکومت فلپائن اور اس کے صدر مارکوس نے مسلمانوں کو زیر کرنے اور تباہ کرنے کی پوری کوشش کی اور مسلمانوں کو مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے قتل کرایا مگر خود مختاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکا جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کی تعداد تو دس کروڑ نہیں صرف چودہ پندرہ لاکھ ہے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی خود مختاری پر اڑے رہے۔ اس دوران میں صدر مارکوس کو مسلم ممالک سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور یہ معاملہ حکومت انڈونیشیا کے سپرد کر دیا گیا۔ حکومت فلپائن کی مسلم دشمنی کا جذبہ برابر ترقی کرتا رہا اور فوج اور مسلمانوں کے درمیان خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ یہ مسلمانوں کی جرأت اور حوصلہ مندی کا نتیجہ ہے کہ صدر مارکوس نے مسلمانوں کے ایک اجتماع میں اعلان کیا کہ جنوبی فلپائن کے دو علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے انھیں نظم و نسق کی ذمہ داری دی جا رہی ہے۔ صدر نے وزارت میں حکومت فلپائن کی از سر نو تنظیم کا اعلان کیا اور یقین دلایا کہ جنوب کے دو علاقوں کا انتظام مسلمان گورنروں کے ہاتھ میں رہے گا۔

فلپائن کے مسلمانوں کو ان کی اس کامیابی پر جس قدر بھی مبارکباد دی جائے کم ہے یہ ان کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ فلپائن کی عیسائی حکومت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ ان ہی مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کی نعشوں کے انبار دیکھے اور جب ایک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے چالیس جانوں کو قربان کر دیا اور اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے حوصلوں اور عسکری اخلاق کو بلند رکھا تو اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا کہ باطل پر دبا ڈر پڑے اور حق کا بول بالا ہو۔ اگر فلپائن کے مسلمان فوج اور پولیس کی گولیوں سے برابر مرتے رہتے اور وہاں کے لیڈر صدر مارکوس سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کا رونا روتے اور ان کے سرکردہ عمائد دو چار شیلی گرام بھی صدر کی بارگاہ میں پہنچا دیتے اور وزیر داخلہ کو بھی نازک حالات سے مطلع کرتے رہتے اور نقصان اٹھانے والوں کے لیے چندہ کی اپیل کر ڈالتے اور حکومت سے نقصان کا معاوضہ طلب کرتے اور اخبارات میں مسلمانوں کی تباہی پر کوئی رپورٹ شائع کراتے تو کیا وہاں کے مسلمانوں کو نظام خود اختیاری میں حصہ مل جاتا؟ اور ان کے نقصانات کی تلافی ہو جاتی؟ کبھی نہیں ہرگز نہیں

صدر مارکوس جھوٹ بول کر عالم اسلام کو یقین دلاتے کہ مسلمانوں کی تباہی کے لئے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ دیکھو تو پولیس نے مسلمانوں کو بھی گرفتار کر لیا ہے وہ کسی مسجد سے عیسائیوں پر سنگ باری کرتے اور نہ اکثریت مشتعل ہو کر ان پر حملہ کرتی۔ فلپائن کے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوتا اور نئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے جاتے۔

فلپائن کی مسلم اقلیت نے اپنی بے پناہ قربانیوں کی بدولت جس حکومت خود اختیاری کا انعام حاصل کیا ہے وہ اسے کبھی حاصل نہ کر سکتی۔ اگر باہر کی مسلم حکومتیں اس کی امداد پر آمادہ نہ ہوتیں اور ان سب کا دباؤ حکومت فلپائن پر نہ پڑتا صدر مارکوس کو شکایت تھی کہ مسلم اقلیت کو باہر سے اسلحہ کی امداد مل رہی ہے اور مسلم حکومتیں ہمارے گھریلو معاملات میں مداخلت کر رہی ہیں اور یہ بات بالکل درست ہے کہ فلپائن کی مسلم اقلیت کو باہر سے امداد ملی اس کو سرمایہ بھی ملا اور فوجی سامان بھی۔ اگر باہر سے دباؤ کا سیلاب نہ آتا تو مسلم اقلیت اپنی جانیں ضائع کر کے بھی کچھ حاصل نہ کر سکتی، اسلامی سربراہوں کی کانفرنس نے فلپائن کے مسئلہ سے دلچسپی لی اور صدر مارکوس پر زور ڈالا کہ وہ مسلمانوں کا قتل عام بند کریں۔ عالمی رابطہ اسلامی کے کئی اجلاسوں میں مسلم اقلیت کا ذکر آیا اور پوری شدت کے ساتھ فلپائن کے عیسائیوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی تباہی کا سامان نہ کریں اور ان کے مطالبات پر منصفانہ انداز میں سوچیں ورنہ اس کے نتائج بہت تلخ نکلیں گے۔

مولانا بدر الحسن دربھنگوی فاضل دیوبند

علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ اور فتنہ قادیانیت

شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول ۵۸۷ھ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "حکمۃ الاشراق" کے اندر ایک جگہ بڑے اعتماد سے لکھا ہے کہ "العلم لیس وقفا علی قوم" یعنی علم و فن پر کسی شخص کے لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے بعد میں آنے والا شخص علمی قابلیت اور فنی لیاقت و صلاحیت میں اپنے بہت سے پیش روؤں پر بھی سبقت لے جائے۔

قریب قریب یہی بات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ نے بھی اپنے ایک مکتوب فارسی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے علمی تبحر اور دقت نظر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔ مولانا کے بعینہ الفاظ یہ ہیں:-

"تقدم و تاخر زمان را در اعتبار علم و عدم آں دخلے نیست۔ اگر مارا پر سند مارا ایں قدر ہرگز تامل نیست کہ شاہ صاحب قدس اللہ اسرارہٗ در فہم و دقائق از اکثر پیشیناں گوئے سبقت بردہ اند"

(قاسم العلوم مکتوب سوئم ص۲۴)

اور غالباً یہی مفہوم اس روایت کا بھی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "نہ معلوم میری امت کا اول بہتر ہے یا آخر" او کما قال۔

شاعرانہ حیثیت سے ابوالعلاء معری نے بھی اس مفہوم کو خوب ادا کیا ہے ؎

انی وان کنت الاخیر زمانہ
لآت بما لم تستطع الاوائل

متقدمین کے فضل و تقدم کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے اور تاریخی واقعات و شواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ بعد کے زمانوں میں وقفہ وقفہ سے بعض بڑی ہی فقید المثال اور نادرۂ روزگار شخصیتیں ابھری ہیں، جن کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علوم و فنون کی جامعیت، دقت نظر اور غیر معمولی تبحر اور استحضار کے لحاظ سے اپنے بہت سے پیشروؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

قریب کے زمانہ میں اس کی عمدہ مثال علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیری کی ذات ہے۔

جن کے بارے میں ان کے جلیل القدر معاصر اور اپنے عہد کے نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن الکوثری کی شہادت یہ ہے کہ:-

"علامہ ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متن احادیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے۔"

(مقدمۃ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح از شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ص۳۶)

محقق عصر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جنہیں شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت حاصل تھی، اپنی بلند پایہ کتاب "فتح الملہم" میں علامہ انور شاہ صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"نہ تو دنیا کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود انہوں نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا۔

(فتح الملہم جلد اول ص۳۲۵)

علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ کے علمی کارناموں کا دائرہ یوں تو بہت وسیع اور ان کی افادیت بڑی ہمہ گیر تھی، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کا وہ کارنامہ جو انہوں نے اصولی حیثیت سے دین کے بقاء و تحفظ کے لیے انجام دیا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں دو چیزوں کا زبردست احساس تھا۔ ایک تو الحاد و دہریت کا زور ہے، دوسرے مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ نبوت کا فتنہ۔ ان دو باتوں کے احساس نے ان کو کافی فکرمند کر رکھا تھا۔

اول الذکر فتنہ کے استیصال کے لیے ان کے پیش رو اور مجدد امام وقت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ نے اپنی تالیفات کے اندر گراں قدر مواد فراہم کر دیا تھا، پھر بعض وجوہ سے ان دنوں قادیانیت کے فتنہ نے زیادہ زور پکڑ لیا

کر لیا تھا، جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک چیلنج تھا، اس لئے علامہ نے زیادہ توجہ اس کے استیصال اور رامت کو اس کی تباہ کاری سے محفوظ رکھنے کے لیے مبذول رکھی۔

تاہم الحاد و دہریت کے سدباب کیلئے بھی آپ کے دو رسالے یادگار ہیں، ایک تو ضرب الخاتم جو حدوث عالم و اثبات وجود باری پر آپ کی بے مثال نظم ہے جو چار سو اشعار پر مشتمل ہے اس نظم کی فنی، فادیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا فلسفہ کا مبصر بھی اس نظم پر وجد کیا کرتا تھا۔

اس نظم کے اسناد کے لیے جہاں آپ نے صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ اور فرید وجدی اور بستانی کی دائرۃ المعارف کے بکثرت حوالے دیئے ہیں۔ امام وقت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی تقریر دلپذیر اور مکاتیب قاسم العلوم میں سے ساتویں مکتوب کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب "مرقاۃ الطارم" ہے یہ بھی حدوث عالم ہی کے موضوع پر ہے۔ اس کا ذکر پہلے ایک نوٹ میں آچکا ہے۔

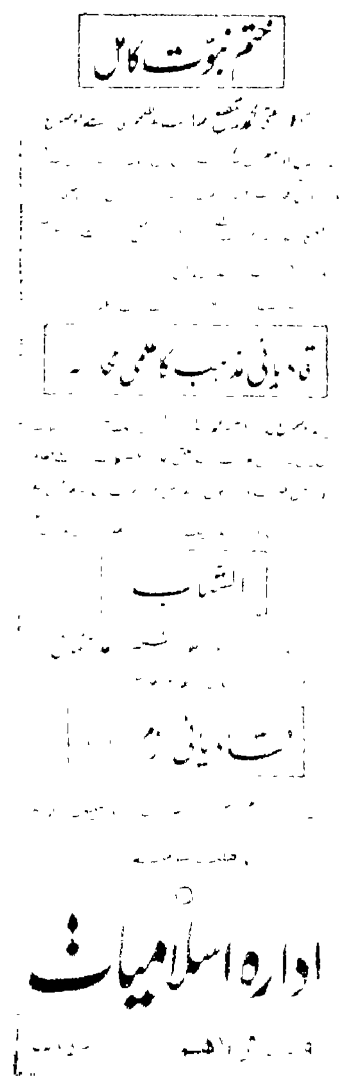
قادیانیت کے فتنہ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے کمال بصیرت سے یہ اندازہ فرما لیا تھا کہ اس کی فتنہ سامانی اور شر انگیزی دنیا کے تمام فتنوں سے بڑھ کر ہے چنانچہ اس کو مٹانے کے لیے پورے طور پر سرگرم ہو گئے۔ اپنے احباب اصحاب اور تلامذہ کو بھی اس کام کے لیے آمادہ کیا اور خود بھی تا دم مرگ اس مبارک کام میں مصروف رہے۔

آپ کے تلامذہ میں سے جن لوگوں نے آپ کے اس مشن کو کامیاب بنانے کی سعی کی ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد یوسف بنوری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کو اس فتنہ کی خطرناکی کا شدید احساس تھا اور اس وجہ سے مسلسل چھ مہینے تک انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے۔ حتیٰ کہ نیند تک اچاٹ ہو گئی تھی، جس کا صحت پر بھی ناخوشگوار اثر مرتب ہونے لگا تھا۔

اس شدت احساس ہی کا اثر تھا کہ تصنیف و تالیف کی طرف طبعی میلان نہ ہونے کے باوجود آپ نے قادنیت پر متعدد تالیفات کیں اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے انتہائی بیش قیمت علمی مواد فراہم کر دیا حتیٰ کہ بستر مرگ پر بھی آپ کو اسی کا خیال دامنگیر رہا۔ چنانچہ آپ کی



سب سے آخری تصنیف جو خاتم النبیین کے نام سے موسوم ہے۔ وہ عین مرض الموت کی یادگار ہے، اس کی تبییض بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

درس حدیث میں بھی موقع بہ موقع مرزا غلام احمد قادیانی کے استدلات کی کمزوری، اور اس کی محرفانہ سرگرمیوں پر متنبہ فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ فیض الباری کے ص ۲۷ جلد دوم، جلد چہارم ص ۱۳۹، جلد چہارم ص ۲۵ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔

آپ کے مجاہدانہ کارنامہ میں درحقیقت وہی روح کار فرما تھی جو ولی اللہی مکتب فکر کے سلاطین و اعیان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے عہد میں شیعیت کا فتنہ زوروں پر تھا جس سے دین کا بڑا حصہ متاثر ہو رہا تھا۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں نئے دور کے تغیرات کا اندازہ کر کے پورے دینی نظام کی اور حکیمانہ تشریح و ترجمانی فرمائی، وہیں دونوں بزرگوں نے شیعیت کا زور توڑنے کے لیے بھی بھرپور سعی کی، جس کا اندازہ ازالۃ الخفاء اور تحفہ اثنا عشریہ جیسی محققانہ کتابوں سے ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے عہد میں شرک و بدعت کا زور تھا، اس لیے جہاں انہوں نے سید احمد شہید کی قیادت و رفاقت میں دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی وہیں مسلمانوں کی زندگی سے شرک و بدعت کے مہلک جراثیم دور کرنے کے لیے بھی انتہائی جد و جہد فرمائی اور ایضاح الحق الصریح اور تقویۃ الایمان جیسی محققانہ اور اثر انگیز کتابیں تحریر فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے عہد میں ایک طرف تو کفر و الحاد کا زور اور جدید عہد کے تقاضے تھے۔ اور دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی مشترکہ یورش نے ہندوستان میں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

جمیل قدوائی

خطوط راس مسعود — بنام اقبال

علامہ اقبال اور سید راس مسعود کے درمیان معمولی محبت نہ تھی بلکہ ہر دو ایک دوسرے کے دالہ و شیدا تھے۔ کم از کم موخر الذکر کو علامہ سے عشق تھا۔ ثبوت کے لیے "اقبال نامہ" (مرتبہ شیخ عطاء اللہ) ملاحظہ ہو۔ علامہ اقبال کے خط مورخہ ۱۰ جون ۳۴ء مطبوعہ صفحہ ۳۵۷ میں اپنے بچوں جاوید اور منیرہ کے چار گارڈینوں میں سے ایک کے لیے موصوف نے راس مسعود کا نام تجویز کر کے ان کی منظوری طلب کی۔ جواب میں مسعود نے اس تجویز سے بوجوہ اتفاق نہیں کیا اور مشورہ دیا کہ پنجاب ہی کے کوئی صاحب مقرر کیے جائیں مگر انہوں نے علامہ سے اصرار کیا کہ "وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملے میں جہاں تک منیرہ اور جاوید سلمہا کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے ہی مطلع کیا جاؤں، کیونکہ جب تک ان دونوں کی انشاء اللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔" دو اعشاریہ کہ مسعود کا اسی سال ۳۰ جولائی کو انتقال ہو گیا۔ اس جملہ کے فوراً بعد مسعود نے لکھا "یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔" کچھ ہی آگے چل کر تحریر کیا "اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمہارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلہ میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے کتاب مذکور صفحات ۳۸۸-۳۸۹) کیوں نہ ہو، مسعود جیسے اعلیٰ ترین اور حقیقی ماہر تعلیم کے عشق کا اظہار اس سے بڑھ کر اور کس شکل میں ہو سکتا تھا۔

اُدھر اقبال کو سید مسعود سے جو عقیدت تھی اور ان کی سیرت و شخصیت کے بارے میں وہ جو رائے رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس تعزیتی خط سے ہوتا ہے جو موصوف نے موخر الذکر کی وفات پر لیڈی مسعود کو تحریر کیا، یہ سارا ہی خط (کتاب مذکور۔ مورخہ یکم اگست ۱۹۳۷ء صفحہ ۳۹۱) اقبال کے شیشۂ دل کی بھرپور شکست کی آواز ہے مگر اس کے یہ حصے خاص طور پر غور طلب ہیں "میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیوں کر کروں جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے مرحوم سے جو میرے قلبی تعلقات تھے، اُن کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اس بنا پر صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں افسوس کہ آپ بھی اس حادثے کے بعد زیادہ دن تک زندہ نہ رہے اور کم و بیش آٹھ ماہ بعد مسعود سے جا ملے) غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دلنوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔۔۔۔۔۔ مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا اس نے قسمت سے دادا کا دل، باپ کا دماغ پایا تھا اور جب تک جیا اس دل و دماغ سے ملک و ملت کی خدمت کرتا رہا۔" لیڈی مسعود کے علاوہ علامہ نے بیگم جسٹس محمود کو جو تار بھیجا اور مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ غلام السیدین، ممنون حسن خان اور نہ جانے کن کن دوستوں کو اس زمانے میں جو خطوط لکھے اس میں مسعود کی ناگہانی وفات کے حادثہ کو بڑی حسرت اور مایوسی کے ساتھ یاد کیا۔

ان تحریروں کے ساتھ اگر دماغ کو پاش پاش اور دل کو زیر و زبر کر دینے والی وہ نظم پیش نظر رکھی جائے جو علامہ نے مسعود کی وفات پر کہی، اور جس کے حسب ذیل اشعار غیر فانی ہو چکے ہیں

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود !
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیدردی
فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود !

"ورے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است"

نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ علامہ نے اپنی لوح مزار کے لیے ذیل کی جو رباعی تصنیف کی تھی وہ بے اختیار مسعود کے کتبہ تربت کے لیے:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

ان الفاظ کے ساتھ کہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے" اور متبادل صورت میں یہ مطلع تجویز کیا ہے

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

تو علامہ کے دل میں مسعود کی وقعت اور ان کی وفات پر علامہ کی روح کے کرب کا صحیح صحیح احوال معلوم کیا جا سکتا ہے۔

انہیں گہری قلبی تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ غیر معمولی روحانی موافقت کا نتیجہ تھا، کہ ہر دو بزرگ ایک اور بلند پایہ اسلامی مفکر و عالم دین علامہ سید سلیمان ندوی کو اپنے ساتھ لے کر نادر شاہ شہید کی دعوت پر ۱۹۳۳ میں افغانستان کے لیے تعلیمی اصلاحات کی تجاویز مرتب کرنے کی غرض سے کابل تشریف لے گئے، اور مسعود نے جب وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر ریاست بھوپال میں وزیر معارف و تعمیرات رہے۔ علامہ اقبال کو بار بار بلا کر اپنے پاس رکھا اور ان کے گلے کی بیماری کا مسلسل علاج کرایا، یہ بات بھی الم نشرح ہو چکی ہے کہ علامہ کے لیے ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں والی ریاست مذکور کی طرف مبلغ پانچسو روپے ماہوار کا وظیفہ حاصل کرنے میں سید راس مسعود کی کوششوں ہی کو دخل تھا۔

"اقبال نامہ" میں مسعود کے نام اقبال کے جو خطوط درج ہیں، ان میں سے زیادہ تر مندرجہ بالا امور ہی کے بارے میں ہیں۔ اس سلسلہ میں مسعود کی طرف سے علامہ کے صرف ایک خط کا جواب بھی شامل ہے جس کے کچھ اقتباسات میں نے اپنی اس تحریر کی ابتداء میں پیش کئے [illegible]

ہیں خوش قسمتی سے مجھے سید راس مسعود کے کاغذات میں ان کے چھاپے خطوط کی نقلیں مل گئیں جو یا تو اقبال کے مندرجہ بالا خطوط میں سے بعض کے جوابات ہیں یا جن کے جواب میں علامہ نے مسعود کو خطوط لکھے، یہ سب انگریزی میں ہیں جن کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

ریاض منزل (۱)
بھوپال سی آئی
۳۱ مارچ ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

مجھے تمہارا خط ۲۹ مارچ اسی لیے ملا اور تمہاری اس شکایت پر کہ میری طرف سے تمہیں کوئی خبر نہ ملی، تعجب ہوا، میں تمہیں خط کی ایک نقل بھیجتا ہوں جو یہاں سے تمہارے نام ۲۵ مارچ کو ڈاک میں ڈالا گیا اور جو تمہیں ۲۹، سے جب تم نے مجھے اپنا موجودہ خط لکھا، بہت پہلے مل جانا چاہیئے تھا

جہاں تک تمہارے ذاتی معاملے کا تعلق ہے۔ میں سر دست اپنے پہلے خط کے مضمون میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ اپریل میں کسی وقت ہم قطعی نتیجے پر پہنچ سکیں گے ہز ہائی نس سے زیادہ تمہاری بہتری کا کوئی خواہشمند نہیں ہے اور میں پھر کہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں جو کچھ ان سے ممکن ہے کر رہے ہیں۔

میں نے ۲۵، مارچ کو مولوی غلام محی الدین صاحب کو حسب ذیل مضمون کا تار بھی بھیجا تھا۔

"افسوس کہ غیر متوقع مصروفیات کے سبب ہز ہائی نس اس بار سالانہ جلسے میں شرکت نہیں کر سکتے۔ آئندہ سال شرکت کی توقع رکھتے ہیں۔ یہی مضمون اقبال کو بھی لکھ بھیجا ہے۔"

جہاں تک یہاں کے شرائط تقسیم اراضی کا تعلق ہے۔ میں اس سلسلے میں ضروری کاغذات تمہیں بھیج رہا ہوں۔

آج میں سرکاری کام سے پانچ دن کے لیے اندر جا رہا ہوں اور واپسی پر تمہیں پھر خط لکھوں گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور مایوس نہ ہونا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جتنی کچھ بھی کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا نتیجہ قابل اطمینان نکلے گا۔

صمیم قلب کے ساتھ
تمہارا ہمیشہ سید راس مسعود
ڈاکٹر سر محمد اقبال نائٹ
بار ایٹ لار۔ میکلوڈ روڈ لاہور
(نقل خط منسلک)

ریاض منزل (۲)
بھوپال سی آئی
۲۵ مارچ ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

میں علیگڑھ سے آج ہی صبح واپس آیا اور [illegible]
اس مشفقانہ خط کے جواب میں جو مجھے علیگڑھ [illegible]

سہیلی بوجھ پہیلی

اپنے کئے دھرے پر اصرار کر رہے ہو — ان کرسیوں کی خاطر تکرار کر رہے ہو
عقلِ سلیم اس پراگندگی سے دو سراں ہے — باہم دگر الجھ کر یلغار کر رہے ہو
مَیں خوب جانتا ہوں رازِ درونِ پردہ — اپنے عمل سے اس کا اظہار کر رہے ہو
اسلام کے لہو سے تشنہ لبی مٹا کر — دُردی فروش رندو انکار کر رہے ہو
دانشوروں کا حلقہ بدنام ہو چکا ہے — ان سب کی معصیّت کا اقرار کر رہے ہو
پیرِ مغاں کی صحبت بے فیض ہو چکی ہے — رندانِ میکدہ کو ہشیار کر رہے ہو
اے حال کے اسیرو، اے خامکار لوگو — ماضی سے نسلِ نو کو بیزار کر رہے ہو
اُردو زباں کا لہجہ، نظمِ نوی کے تیور — یورپ کے آب و گل سے تیار کر رہے ہو

ان بتکدوں میں رہ کر تکبیر کی صدائیں
شورش عجیب باتیں اے یار کر رہے ہو

—— شورش کاشمیری



ضلع کچہری لاہور میں حصول انصاف کے مرحلے





(۱) قیدیوں کو جیل سے لانے والی گاڑیاں (۲) وکلاء کی دھوپ اور بارش سے پناہ گاہیں
(۳) (۴) ضلع کچہری کی عمارت کے دو مختلف زاویے (۵) ڈسٹرکٹ بار روم کی زیر تعمیر عمارت
(۶) مختلف مقدمات میں ضبط شدہ مال — سرکاری تحویل میں
(۷) دو ملزم —— ایک سپاہی
(۸، ۱۰) انصاف کے طالب —— سائے سے بھی محروم
(۹) پولیس کانسٹیبل کے سامنے میز گداگری۔

(تصاویر صلاح الدین چوہدری)


1

2

5

6



ولی عہد سعودی شہزادہ فہد کا انٹرویو

● تیل کی قیمتیں ● مشرق وسطیٰ کے لئے منصفانہ حل ● مصر اور سعودی عرب

● امریکہ سے تعلقات ● تیل پر پابندی کا باعث — ایک مقدس اور عظیم مقصد

شہزادہ فہد سعودی عرب کے ولی عہد اور وزیر اعظم ہیں۔ حال ہی میں آپ نے سنڈے ٹائمز کے ہیرز فاکس کو جو انٹرویو دیا تھا۔ وہ قارئین چٹان کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں موصوف نے سعودی عرب کی نئی حکومت کی پالیسیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں شاہ فیصلؒ کی تمام پالیسیوں کی چھاپ موجود ہے۔

فاکس: تیل کی قیمتوں کے بارے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں، کیا وہ بہت کم یا بہت زیادہ ہیں؟

شاہزادہ: سعودی عرب اس وسیع و عریض دنیا کا ایک حصہ ہے۔ اس سے خود بھی متاثر ہوتا ہے اور اس بدلہ میں اسے متاثر بھی کرتا ہے۔ اسی یقین کی بناء پر میں یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، میرا ملک جو دنیا بھر میں پٹرول کے سب سے بڑے ذخائر کا مالک ہے۔ بین الاقوامی نظام یا خوشحالی کو کمزور کرنے کی ذمہ داری نہیں لے گا۔ اسی ہی بناء پر ہم بقیہ دنیا کے ساتھ متحد ہو کر ایسا حل تلاش کرنے میں کوشاں ہیں۔ جو تہذیب انسانی کی ترقی اور پیشرفت میں معاون بن سکے۔ اگر نوع انسانی کی مسرت تیل کی قیمتوں میں اضافہ کی راہ سے آئے تو ہم ایسے اضافہ کا مطالبہ کرنے میں تذبذب محسوس نہیں کریں گے۔ لیکن بہر حال اگر صداقت اس کے برخلاف ہو تو بھی ہم قیمتوں میں کمی کا مطالبہ کرتے وقت ذرہ بھر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ بین الاقوامی مسرت میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے ہم واقعی سنجیدہ ہوں۔

فاکس: مشرق وسطیٰ میں منصفانہ قیام امن کے لیے کیا اب آپ امریکہ پر زیادہ دباؤ ڈالیں گے۔

شاہزادہ: سعودی عرب نے کسی ایسے حل کی کوشش کی بھی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا کہ جس سے فلسطینیوں کو ان کے حق کی ضمانت حاصل ہو اور اس کے نتیجہ میں اسرائیل عربوں کے تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دے۔

فاکس: امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر کسنجر کی قیام امن کی کوششوں کی ناکامی کے بعد اب آپ کے نزدیک واقعات کیا رُخ اختیار کریں گے۔

شاہزادہ: جس چیز کو کسنجر کے قیام امن کی کوششوں کی ناکامی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر کسنجر کو کرنی چاہیئے۔ اگلا قدم مشرق وسطیٰ کے لیے پر امن ذرائع سے منصفانہ حل تلاش کرنے کے لیے جنیوا کانفرنس ہو گا۔

فاکس: جلالۃ الملک شاہ فیصل شہید علیہ الرحمۃ اور صدر انور السادات کے درمیان گہرے تعلقات عرب اتحاد کی کلید تھے۔ کیا آپ کے نزدیک شاہ فیصل مرحوم کی شہادت کے بعد عرب اتحاد کو کوئی خطرہ درپیش ہے۔

شاہزادہ: میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا کہ آپ کا سوال مصر اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات کے بارے میں ہوتا۔ میرا جواب صاف ہے۔ سعودی عرب، مصر اور دیگر عرب بھائیوں کے ساتھ تھا ہے اور رہے گا۔

فاکس: ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان آئندہ تعلقات کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں۔

شاہزادہ: اپنے ملک اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان آئندہ تعلقات کے بارے میں پُر امید ہوں۔ یہ تعلقات باہمی دوستی اور مفاہمت کی ایک طویل تاریخ کے بعد گہرے ہو گئے ہیں۔

عام طور سے تاریخ پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتی۔ جہاں تک اسرائیل کے لیے امریکی مدد کا سوال ہے ہم اس پر معترض ہیں، جس کی وجہ سے اسرائیل عرب علاقوں پر اپنا قبضہ مسلسل جمائے جانے کے قابل ہوا ہے۔

فاکس: مشرق وسطیٰ میں ایک اور جنگ برپا ہونے پر کیا سعودی عرب ایک مرتبہ پھر مغرب کے خلاف تیل کے حربے یعنی تیل کی فراہمی پر پابندی کا طریقہ اختیار کرے گا

شاہزادہ: میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں [illegible]

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ۔۔ راس مسعود بنام اقبالؔ

میں اس وقت ملا تھا جب میں بھوپال کے لیے روانہ ہو رہا تھا میں نے ایک تار بھیجا ہے جس میں تمہیں والدہ صاحب کی حالت سے مطلع کیا ہے انشّل اور میں سخت فکرمند اور پریشان رہے اور بارہا علیگڑھ کا سفر کرنے اور وہاں سے واپس آنے کے سبب تھک کر چور ہو گئے ہیں۔

آج صبح ہزہائی نس نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ مگر تمہیں مایوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت اپنی چند در چند غیر متوقع اہم مصروفیات کی وجہ سے امسال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت نہ کر سکیں گے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تمہیں مطلع کر دوں، اگر کوئی ناگہانی مجبوری نہ آ پڑی تو وہ انجمن کے اجلاس ۱۹۳۶ء میں تم سب کے ساتھ موجود ہونے کی پوری کوشش کریں گے لہٰذا تمہیں "دیر آید درست آید" کی مثل کی صداقت پر یقین رکھنا چاہیئے، اس لیے کہ مجھے یقین ہے۔ انشاءاللہ جب آئندہ سال اعلیٰ حضرت لاہور تشریف لائیں گے تو وہ تم سب کے لیے اپنی آمد کو حقیقی مسرت کا موجب بنا دیں گے۔

اب سنو "معاملہ زمعلومہ" کی بابت۔ بس کچھ ہی دن کی بات ہے۔ ذرا اور انتظار کر لو کیونکہ ہزہائی نس تمہیں کوئی قابل اطمینان بات اپریل کے مہینے میں کسی وقت لکھ سکیں گے۔ اعلیٰ حضرت تمہارے لیے وہ سب کچھ رہے ہیں جو ایک انسان سے ممکن ہے اور میں تو کم از کم نتیجہ کی طرف سے پُر امید ہوں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے اجازت نہیں تمہارے ان محب صاحب نے جن کی طرف سے خلیفہ عبدالحکیم نے تمہیں اطمینان دلایا تھا، معلوم ہوتا ہے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ ... جلسہ آمد آج سے شروع ہو گیا۔ ... تم میں سے جو لوگ تمہارے ... لیے اپنی امکانی کوشش نہیں کی ... یقین دلاتا ...

ہوں کہ آج دنیا بھر میں ہزہائی نس نواب صاحب بھوپال سے بڑھ کر تمہارا کوئی بہی خواہ موجود نہیں ہے۔ میں نے حقیقتاً یہ خط خوشی کی کیفیت میں لکھا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم ہماری تجویز نمبر ۲ کے نتیجے کے بارے میں ذرا بھی مایوسی سے کام لو۔

میری ابدی محبت اور میری والدہ صاحبہ کی تمہاری بحالی صحت کے لیے بہترین دعاؤں نیز انشّل کی نہایت مؤدبانہ تسلیم کے ساتھ۔

میں ہوں تمہارا ہمیشہ چاہنے والا

سید راس مسعود

بخدمت سر محمد اقبالؔ، نائٹ

بیرسٹرایٹ لاء۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

بھوپال (۳)

۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمہارا مہربانی نامہ مورخہ ۱۴ اپریل مجھے ابھی ابھی ملا ہاں بہاولپور خط بھیجے جانے کی خبر درست ہے۔ تمہاری دوست مسز ڈکو برسن کے کاغذات بھی مجھے مل گئے ہیں جن کا میں توجہ کے ساتھ مطالعہ کروں گا۔ میں متعدد امور میں بُری طرح الجھا ہوا ہوں۔ ہزہائی نس کے بھوپال واپس آجانے کے بعد میں اُن سے تمہاری خط کشیدہ الفاظ پر تبادلۂ خیال کروں گا۔ مگر مجھے نہیں معلوم موصوف کی اس کے بارے میں کیا رائے ہوگی، میں سمجھتا ہوں۔ نئے دستور کے سلسلے میں طریق کار کی کسی تبدیلی کے لیے اب بہت تاخیر ہو چکی۔ تم ہمارے پاس اپنا علاج جاری رکھنے کے لیے کب واپسی کا ارادہ رکھتے ہو؟ امید ہے کہ جیسا میں نے پچھلے خط میں عرض کیا تھا۔ تم علیگڑھ جاؤ گے۔

محبت کے ساتھ

ہمیشہ تمہارا مخلص دوست

سید راس مسعود

ریاض منزل (۴)

بھوپال۔ سی۔ آئی

۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمہارے محبت نامے کا شکریہ! مجھے افسوس ہے کہ تم علیگڑھ نہ جا سکے اور یہ معلوم ہو کر کہ تم

صاحب صحت علیل میں تکلیف ہوئی۔ تم نے محترمہ کی بیماری کی نوعیت نہیں لکھی۔ ایسی حالت میں اتنے فاصلے سے صحت یابی کی دُعا کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔

تمہارے ذاتی معاملے کی بابت صورت حال ذرا کچھ اور واضح ہو تو خبر دوں گا۔ پچھلے چار روز سے میں خود ملیریا کے شدید حملہ کی وجہ سے بستر پر پڑ گیا اور اس نے جاتے جاتے مجھے کچھ اور نڈھال کر دیا۔ مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ اپنا علاج جاری رکھنے کے لئے یہاں کس تاریخ کو پہنچ رہے ہو۔

امتل کی طرف سے مؤدبانہ سلام اور لیڈی اقبال کے لئے دعا قبول کرو۔ میری طرف سے علی بخش کو سلام اور جاوید کو دعا۔

ہمیشہ تمہارا چاہنے والا

سید راس مسعود

ڈاکٹر سر محمد اقبال

بار ایٹ لا

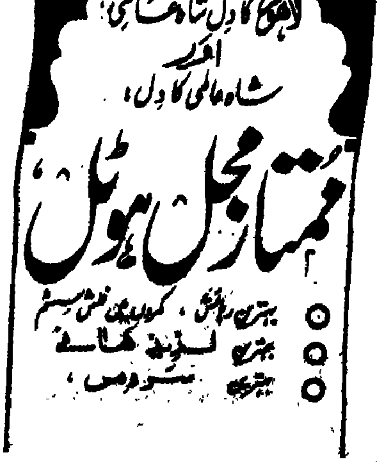
میکلوڈ روڈ۔ لاہور

بھوپال ۵

۹ مئی ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

تمہارے نہایت پیارے خط مورخہ ۲ مئی کو



پاکر مجھے بڑا اطمینان ہوا جس میں یہ خوشخبری تھی کہ خداوند تعالیٰ کی مہربانی سے تمہاری نیک بیگم صاحبہ کا آپریشن کامیاب رہا۔

ہاں مئی کے آخر تک یہاں ضرور آ جاؤ اور اپنا علاج جاری رکھو۔ شاید یہاں میری بیوی امتل سے تمہاری ملاقات نہ ہو اس لیے کہ کم و بیش اسی زمانے میں وہ اندور چلی جائیں گی اور اس کے بعد جلد ہی مجھے بھی ان کے پاس چلا جانا ہوگا مگر میں نے ہز ہائی نس سے ساری باتیں کر لی ہیں اور انہوں نے فرمایا کہ وہ تمہیں بڑی خوشی سے اپنا مہمان بنائیں گے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اعلیٰ حضرت بہ نفس نفیس یہاں تمہارے قیام کا آرام دہ مناسب انتظام فرمائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں، اس امر کا زیادہ امکان نہیں ہے کہ ہز ہائی نس مسلم یونیورسٹی کی چانسلری سے اپنے استعفیٰ پر نظر ثانی کریں گے۔ اعلیٰ حضرت کسی کام میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ اپنی رائے نہیں بدلیں گے تم چانسلری کے لیے جس شخص کو مناسب سمجھو، اس کی سفارش کر دو۔

ہز ہائی نس اپنی چھوٹی شہزادی کو سوئٹزرلینڈ رخصت کرنے کے لیے جہاں انہیں بغرض علاج جانا پڑ رہا ہے، بمبئی تشریف لے گئے ہیں، ان کی واپسی پر مجھے معلوم ہو سکے گا کہ تمہارا معاملہ کس مرحلے میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کا تصفیہ ابھی تک نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہز ہائی نس اور مرا سلہ نہا کے ادنیٰ رکن سے زیادہ کوئی اور دو اشخاص اس معاملے میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔

مکرر آ براہ کرم علی بخش کو میرا سلام پہنچائیں اور ان سے کہیں کہ جتنی گرمی پیارے لاہور میں لگ رہی ہو گی یہاں اس کی آدھی بھی نہیں۔

بہترین پیار کے ساتھ

تمہارا ہمیشہ

سید راس مسعود

بھوپال سی آئی [illegible]

۲۰ مئی ۱۹۳۵ء

میرے نہایت پیارے اقبال

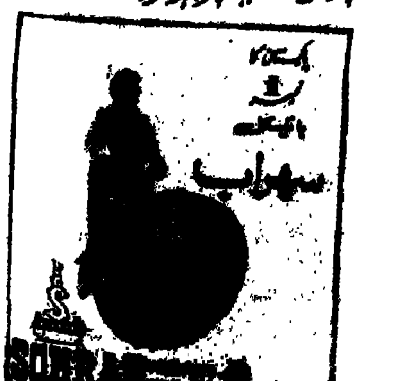
مجھے تمہارے ۱۲ اور ۱۳ مئی ۱۹۳۵ء کے خطوط ملے۔ ہز ہائی نس کل ہی سہ پہر کو واپس تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ مجھے تمہارے معاملہ پر اعلیٰ حضرت سے تبادلہ خیال کا وقت نہیں ملا مگر اس ہفتے بالمشافہ کا موقع مل جانے پر جلد ہی اس سوال کو اٹھاؤں گا۔ میں تمہارے دونوں خط اعلیٰ حضرت کے ملاحظہ میں گزاروں گا، اس لیے کہ ان میں تم نے جو تجویز پیش کی ہے اس سے مجھے کلی اتفاق ہے میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے تمہیں ایسی خبر سنانے کے قابل بنائے جس سے تمہاری موجودہ مشکلات رفع ہو جائیں۔ خدارا کوئی اور دس دن صبر سے کام لو۔

امتل کے بارے میں یہ ہے کہ انہیں ابتدائے ماہ جون میں اندور ضرور چلا جانا ہے اور میں غالباً ان تک ۱۲ کے لگ بھگ پہنچ جاؤں گا۔ یہاں تمہارے پر آسائش قیام کے سلسلے میں جیسا کہ میں اپنے ۹ مئی کے خط میں لکھ چکا ہوں، ہز ہائی نس صاحب مناسب انتظامات فرمائیں گے براہ مہربانی مجھے اپنی متوقع آمد کی صحیح تاریخ سے مطلع کریں۔

صمیم قلب کے ساتھ تمہارا ہمیشہ

سید راس مسعود

مکرر۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہز ہائی نس چند دن کے لیے پھر باہر تشریف لے جا رہے ہیں۔



بقیہ: فتنہ قادیانیت

اسلام اور مسلمانوں کے لیے انتہائی سنگین اور نازک صورت حال پیدا کر دی تھی۔

اس لیے انہوں نے ایک طرف تو حقائق و معارف کے بیش بہا اصول مدون کئے اور علم کلام کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی، جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بقول تا قیامت کارآمد رہیں گے۔

دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کا جم کر مقابلہ کیا اور علمی حیثیت سے ان کے سارے استدلات کی کمزوری واضح کر دی۔

علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کے زمانے میں قادیانیت کا فتنہ اسلام کے لیے سب سے بڑا چیلنج اور نبی کریمؐ کے دین مجید کے خلاف ایک منظم بغاوت تھی۔ اس لیے انہوں نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور اس موضوع پر ایسی فاضلانہ اور تحقیقی کتابیں تصنیف فرمائیں جو ان کی علمی عظمت اور غیر معمولی عبقریت کا لازوال شاہکار ہیں۔ بقول مولانا محمد یوسف بنوری اگر علامہ نے اپنی زندگی میں اور کوئی کام انجام نہ دیا ہوتا، صرف ردّ قادیانیت پر آپ جو کام کیا ہے، وہی ایک عمل آپ کے نامۂ اعمال میں ہوتا تو آپ کو زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کو اس فتنہ کی فتنہ سامانی کا احساس بڑا شدید تھا، اس لیے آپ کی اس سلسلہ کی تمام تحریروں سے خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ایمانی غیرت و حمیت اور جوش و خروش کا اندازہ ہوتا ہے۔

مستقل طور پر اس موضوع پر آپ کی پانچ کتابیں یادگار ہیں۔

(۱) "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح"

یہ اپنے موضوع پر سب سے جامع ترین کتاب ہے، اس کے اندر آپ نے نزول مسیح سے متعلق احادیث و آثار جمع کئے ہیں، اس کی جامعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاضی شوکانی جیسے وسیع النظر محدث نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو انہیں کل ۲۹ حدیثیں مل سکیں۔ جبکہ علامہ انور شاہ صاحبؒ نے ستر نہایت ہی واضح اور صریح روایتیں جمع کر دی ہیں۔

کتاب پہلے مفتی محمد شفیع کے مقدمہ کے ساتھ ہندوستان میں چھپ چکی تھی، اب عالم اسلام کے نامور محقق شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی تعلیقات نے کتاب کی افادیت دوچند کر دی ہے۔

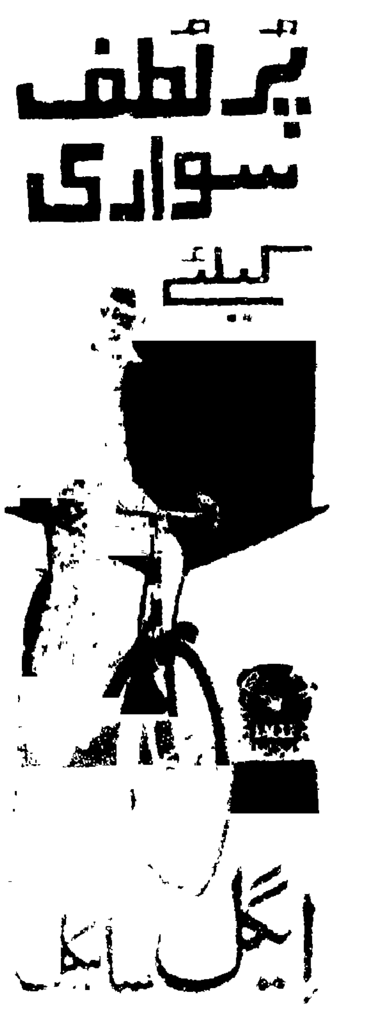
(۲) "اکفار الملحدین"

یہ اس سلسلہ کی دوسری اہم اور محققانہ تصنیف ہے، تکفیر کا مسئلہ بڑا ہی نازک اور دقیق ہے، اس طرح کے پیچیدہ مسئلے کے بارے میں معجزانہ اور فیصلہ کن رائے دینا انور شاہ صاحب جیسے عبقری وقت ہی کا حصہ تھا، آپ نے پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی کہ کسی شخص کو دین سے خارج کب متصور کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے لئے اصول و ضوابط کیا ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کسی مسلمان کی تکفیر ایک سنگین جرم ہے، اسی طرح کسی ایسے شخص کو دین کی بیخ کنی پر آمادہ ہو، اور ضروریات دین کو بھی بے چون و چرا تسلیم نہ کرتا ہو بلکہ شریعت کے واضح احکام و ہدایات کو اپنی تحریف و تاویل کا نشانہ بناتا ہو اسے بدستور مسلمانوں کے زمرہ میں شامل سمجھنا اور اس کی تکفیر کے سلسلہ میں ایسی احتیاط برتنا جس سے دین کی بنیاد منہدم کرنے والوں کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا اور موقع ملے، بدترین قسم کی مداہنت ہے۔ شریعت کی رو سے اس کا جواز ہرگز نہیں ہے۔

علامہ سید محمد انور شاہ نے مسئلہ کے ہر پہلو پر قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی سیر حاصل بحث کی ہے اور تمام سربرآوردہ مفسرین اور محدثین اور فقہاء و متکلمین کی شہادتیں اس سلسلہ میں جمع کر دی ہیں۔ اور محققین کی کتابوں کے بعض ایسے ابواب سے مواد اکٹھا کر دیا ہے جہاں عام طور پہ دوسروں کا ذہن منتقل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سے پہلے امام غزالی جیسا یگانۂ روزگار، اور امت کے بعض دوسرے اساطین نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ "فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" امام غزالیؒ کی مشہور کتاب ہے خود علامہ انور شاہ صاحبؒ نے بھی اس کا جوہری خلاصہ اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ "اکفار الملحدین" کے مصنف کی ذہنی پرواز کتنی بلند ہے۔ بعد میں آنے والوں کے اس طرح کے



تالیفِ مقالات جب سامنے آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ "کم ترک الاول للآخر" فجزاہم اللہ عن المسلمین خیر الجزاء۔

(۳) "عقیدۃ الاسلام"

اس کتاب کا اصل موضوع خود علامہ کی تحریر کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی حیات اور ان کے دوبارہ نزول کے بارے میں قرآن حکیم کے بیان کردہ دلائل کو جمع کرنا ہے۔

لیکن ضمنی طور پر اس کتاب میں اتنے اہم اور گرانقدر مسائل زیر بحث آئے ہیں، جن کا احصا بھی مشکل ہے۔

(۴) "تحیۃ الاسلام"

یہ سابق الذکر کتاب پر خود علامہ کے قلم سے انتہائی بصیرت افروز اور محققانہ حاشیہ ہے اس لئے ان دونوں کتابوں کو ایک بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

علامہ نے یہ کتاب کس تحقیق و تدقیق کے ساتھ تصنیف فرمائی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔۔۔۔ عقیدۃ الاسلام اور تحیۃ الاسلام میں بلاواسطہ جن کتابوں کا حوالہ مذکور ہے ان کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے جن میں تفسیر و حدیث فقہ و اصول، تصوف و حقائق، لغت و نحو، معانی و بیان، تاریخ و سیر، فلسفہ حتیٰ کہ عہد نامہ عتیق سب ہی طرح کی کتابیں شامل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ، فرید وجدی اور بستانی کی دائرۃ المعارف، شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ جیسی کتابوں کا ایک ایک صفحہ علامہ کی نظروں کے سامنے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ شیخ زاہد بن الحسن الکوثریؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے ارباب علم و فضل نے اسے اپنے موضوع پر منفرد کتاب تسلیم کیا ہے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنی تفسیری فوائد میں لکھتے ہیں

"اس موضوع پر میری نظر میں ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی۔"

ہفت روزہ چٹان لاہور

(ترجمہ شیخ الہند ؒ صفحہ)

خود شاہ صاحب کی زندگی میں ایک وسیع النظر عالم جو جرمنی وغیرہ میں بھی رہ چکے تھے۔ جب ان کی نظر سے یہ کتاب گذری تو انہوں نے خاص اس غرض سے دیوبند کا سفر کیا اگر دنیا میں اس پایہ کا کوئی محقق موجود ہے تو اس کے شرف ملاقات سے ہمکنار ہونا چاہیئے۔

(۵) "خاتم النبیین"

مذکورہ بالا کتابوں کے برخلاف اس کی زبان فارسی ہے جو آپ نے خاص اپنے وطن کشمیر کے لوگوں کو قادیانیوں کی تلبیس سے بچانے کے لیے تصنیف فرمائی تھی۔

اس کتاب کا اصل موضوع آیت ختم نبوت کی تفسیر ہے یہ رسالہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ دقیق ہے، علامہ کی دوسری تصانیف کی طرح اس سے بھی صحیح معنوں میں علماء ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ تمام کتابیں ردِ قادیانیت کی غرض سے تالیف کی گئی ہے لیکن ان کی حیثیت محض مناظرانہ کتابوں کی نہیں ہے بلکہ صحیح علمی ذوق رکھنے والوں کو بسا اوقات ان کتابوں کا ایک صفحہ پڑھ کر ایسی نادر تحقیقات، علمی نکات و لطائف اور اچھوتے افکار ہاتھ آتے ہیں جو ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی بمشکل مل سکتے ہیں۔

بہرکیف! اس وقت مقصود صرف یہ تھا کہ قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کے کارنامہ کا مختصر تعارف کرادیا جائے۔ اگر توفیق نے مساعدت کی تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور علامہ سید محمد انور شاہؒ کے اچھوتے اور نادر علمی تحقیقات سے آئندہ لوگوں کو روشناس کرنے کی سعی کروں گا۔ واللہ الموفق و بیدہٖ ازمۃ التحقیق۔ ۱۲

(۲) ائمہ فن کے فکر و نظر کی بلندی اور علم کی گہرائی کو جانچنے کا معیار محض تصانیف کی عددی کثرت ہرگز نہیں ہے بلکہ اصل چیز کیفیت ہوتی ہے، کمیت نہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری نے اس سلسلہ میں بڑا ہی پُر لطف استدلال کیا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی انتہائی کثیر التصانیف ہیں۔ اس کے برخلاف امام ابن دقیق العیدؒ کی اصل تصانیف کل دو ہیں ان میں بھی ایک تو دستیاب ہے اور دوسری کے منتشر اور نا تمام اقتباسات ائمہ فن کی کتابوں میں ملتے ہیں، مگر اس کے باوجود ابن دقیق العید کی دقتِ نظر پر شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی کثرت تصانیف کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اس سلسلہ کا یہ واقعہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ کہ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبریؒ نزیل قاہرہ جو اپنے زمانے کے بلند پایہ متکلم تھے، عربی اور ترکی زبانوں میں ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ انہیں ۱۳۵۷ھ میں جب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے علامہ سید انور شاہ صاحبؒ کا مختصر رسالہ "مرقاۃ الطارم علی حدوث العالم" پیش کیا تو انہوں نے اس رسالہ کو پڑھ کر فرمایا کہ

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں اس پایہ کا محقق بھی ہو سکتا ہے"۔

پھر صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ (جس کے صفحات ہزاروں تک پہنچتے ہیں) کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "میں اس چند ورقی رسالہ کو اس کتاب پر ترجیح دیتا ہوں"۔

(مقدمہ عقیدۃ الاسلام صفحہ ۸)

یہ واقعہ خود شیخ مصطفیٰ صبری کی عظمت کا بھی آئینہ دار ہے کہ ان کی حقیقت میں نظروں میں محض کاغذ کے پشتاروں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اصل چیز علمی گہرائی اور فکر و نظر کی پختگی ہے۔

۲۶ مئی ۲۰۰۵

بقیہ : فلپائن

مکہ مکرمہ سے اخبار عالم اسلامی ہفت روزہ شائع ہوتا ہے اس نے فلپائن کے مسلمانوں کو اپنا موضوع بحث بنا لیا۔ کوئی اخبار ایسا نہیں جس میں فلپائن کے مسلم مجاہدین کا تذکرہ نہ ہو اور ان کی تباہی اور بربادی کا نقشہ نہ کھینچا گیا ہو، یہاں ہم صرف ایک اخبار سے ناظرین کو متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ ۳۰ اپریل ۷۵ء کے اخبار پر نظر ڈالیئے اس کے تین صفحات میں مسلمان شہدا کی نعشوں کا انبار دکھایا گیا ہے۔ فرداً فرداً مسلم قائدین کی نعشوں کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ ۴۲ عنوانات میں سے چند عنوان یہ ہیں۔

۴ ہزار مسلمانوں کا قتل، صرف صوبہ کوٹا باٹو میں مسلمانوں کی چھ ہزار جائیدادوں کا انہدام۔

مساجد اور مدارس میں مسلمان، بچوں اور عورتوں کا قتل فلپائن کے مسلمانوں کے خلاف صلیبی اور صیہونی غارت گروں کا اقدام۔

گویا مسلم ممالک نے حکومت فلپائن کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور فلپائن کی عیسائی حکومت کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اگر مسلم ممالک فلپینی مسلمانوں کی پشت پناہ بن کر کھڑے نہ ہو جاتے اور خود مسلمان جان ومال کی قربانی کیلئے تیار نہ ہوتے بلکہ غدار مسلمانوں کی ٹولیاں حکومت کے مظالم کی سیاہی نہ دھوتے رہتے تو آج صدر مارکوس کو مسلم مجاہدین سے باعزت ملاقات نہ پڑتا اور دو علاقوں کا نظم ونسق مسلم اقلیت کے حوالہ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

مسلم ممالک کو قدرت نے انشراح صدر عطا فرمایا ہے وہ اپنی تمام رعایا کے حق میں انصاف اور رواداری کا سلوک کرتے رہتے ہیں، آٹھ نو سال ہوئے، استنبول میں چند ارمن عیسائیوں کے خلاف ایک معمولی فساد برپا ہوا، کچھ دکانیں لوٹی اور جلائی گئیں، حکومت ترکی اس حادثہ پر چراغ پا ہو گئی۔ اس نے فسادیوں کو ایک ایک کر کے گرفتار کیا اور ارمن عیسائیوں کے مالی نقصان کا پورا معاوضہ دیا اور ساتھ ہی وہاں کے گورنر کو فوراً معطل کر دیا اور اس پر فساد کو نہ روک سکنے کی ذمہ داری عائد کر دی۔ یہ معاملہ اگرچہ معمولی تھا، بلقان کے عیسائی پریس نے اس پر حاشیہ آرائی کی دوسرے ہی روز پریس کا رُخ پلٹ گیا اور تمام اخبارات نے حکومت ترکی کے عاجلانہ اقدام کی بے حد تعریف کی اور عیسائی دنیا ترکی حکومت کی بیدار مغزی پہ حیران رہ گئی۔

جس حکومت کو اپنی اقلیتوں کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے وہ ان کے ساتھ انصاف کرنے میں ایک روز کی تاخیر نہیں کرتی اور پولیس اور فسادیوں کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتی۔ مصر میں قبطی عیسائیوں کے مذہبی تہوار پر گرجاؤں کو کچھ نقصان پہنچایا گیا۔ زغلول پاشا زندہ تھے انہوں نے فوراً عیسائیوں سے معذرت چاہی اور تین روز کے اندر گرجاؤں کی اصلاح کر دی گئی اور بارہ لاکھ روپیہ بغیر کسی مطالبہ کے عیسائی چرچوں کے نام وقف کر دیا گیا، زغلول پاشا نے علاقے کے گورنر کو پادریوں کے پاس بھیجا اور سرکاری طور پر ان سے معافی چاہی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مصر میں کبھی کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا نہیں ہوا۔

فلپائن کی مسلم اقلیت قتل وغارت گری سے بھی محفوظ نہ رہتی، یہ مسلم ممالک کا دباؤ تھا کہ صدر مارکوس کو اپنا انجام نظر آ گیا اور مسلم سربراہوں کا مقابلہ نہ کر سکا، جب تک کسی ملک کی مسلم اقلیت کو مسلم ممالک کی مالی اور فوجی امداد نہ ملے گی اس کا وجود ہر وقت خطرہ میں رہے گا۔ وہی اقلیت آگے بڑھ سکتی ہے

بعدالت جناب زبدۃ الحسین سول جج صاحب سمندری۔

مقدمہ نمبر ۴۲ ۱۹۷۵ء

تنسیخ نکاح

منیر بیگم بنام اگرا

بنام، اگرو ولد گہنا قوم جرپور، ساکن موضع کوٹ پٹھانہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ، ضلع لائلپور (مدعا علیہ)

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعا علیہ مسمی اگرو ولد گہنا قوم جرپو تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار مسمی اگرا مذکور کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ مقررہ تاریخ تک یعنی ۷ جون ۷۵ء تک حاضر عدالت اصالتاً یا وکالتاً آوے وگرنہ اس کے خلاف کارروائی یک طرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ ۷ ماہ مئی ۱۹۷۵ء بدستخط ہمارے و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

مہر عدالت

بعدالت جناب سول جج چکوال

درخواست نمبر ۱۱ سال ۱۹۷۵ء

درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی

سیدہ بیگم وغیرہ بنام عوام الناس

ہرگاہ مقدمہ عنوان بالا میں سائلان سیدہ بیگم وغیرہ سکنائے چک عمرا تحصیل چکوال نے ایک درخواست برائے حصول سرٹیفکیٹ جانشینی نسبت ترکہ محمد وارث متوفی عدالت ہذا میں گذاری ہے۔

لہٰذا بذریعہ اشتہار اخبار ہذا ہر خاص وعام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی عذر نسبت سرٹیفکیٹ جاری کرنے میں ہو تو بتعریخ ۶ جون ۱۹۷۵ء حاضر عدالت ہذا آ کر اصالتاً یا وکالتاً پیش کریں، ورنہ کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جاوے گی

آج بتاریخ ۱۶ ماہ مئی ۱۹۷۵ء کو ہمارے دستخط و مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

مہر عدالت

جن کی پشت پر مسلم ممالک کی طاقت ہو اور وہ خود بھی جان سے کھیل جاتے۔ جہاں یہ بات نہیں وہاں کی مسلم اقلیت اگر نو دس کروڑ بھی ہو تو وہ آہ و بکا کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور جس ملک میں خدا مسلمان بھی موجود ہوں وہاں کے مسلمانوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

بقیہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

سکتا۔ بلکہ بنی نوع انسان کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے تاکہ باطل اور ظلم کی قوتیں غالب نہ آجائیں۔

نیچر بھی قانون پر عمل کرتی ہے مگر نیچر کے قانون میں لچک ہوتی ہے۔ (میں اسے بے رحمی

بعدالت جناب شیخ عبدالرزاق سول جج درجہ اول وزیر آباد۔

شفع اراضی

نصراللہ خان ولد محمد علی جٹ سکنہ لدھیوالہ وڑائچ تحصیل وضلع گوجرانوالہ

بنام فتح محمد

بنام، فتح محمد ولد غلام محمد قوم جٹ چیمہ سکنہ بھوپال بانڈہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعا علیہ کی تعمیل بطریق عام ہونی مشکل ہے۔ لہٰذا مدعا علیہ کے خلاف اشتہار اخبار زیر آرڈر ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ مورخہ ۲۹ مئی ۷۵ء کو بمقام وزیر آباد بوقت ۸ بجے حاضر عدالت ہذا ہو کر جوابدہی دعویٰ کریں بصورت دیگر آپ کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۱۳ ماہ مئی ۷۵ء ہمارے دستخط اور مہر عدالت کے جاری کیا گیا۔

دستخط: سول جج درجہ اول

مہر عدالت

نہیں کہتا اگرچہ بعض لوگ اسے بے رحمی کہتے ہیں) نیچر اندھا دھند دگر ایک بنے بنائے قاعدے کے تحت، پیار کا عمل جاری رکھتی ہے۔ مگر انسان کا برتر قانون اپنے اندر لچک بھی رکھتا ہے۔ عدل و رحم دونوں کا پاس دار ہے۔ اور سچائی اور نیکی کی اقدار کو پھیلانا اس کا ایک شعوری نتیجہ ہے۔

یہ تسلیم کہ تمام کائنات میں پیار کا قدرتی عمل جاری ہے۔ مگر مردِ حق جس پیار میں سرگرم ہوتا ہے وہ نیچر کی طرح اندھا دھند نہیں بلکہ اخلاقی نصب العین کے تابع ہے۔ مردِ حق کے پیار کا ایک مرحلہ جذب و تسخیر ہے۔ یعنی بزور نہیں بلکہ جذب و کشش کے ذریعے غیر کو اپنا بنا لیا جائے۔ اور یہ بھی پیار کا ایک حصہ ہے۔ اس کی تفصیل عشق کی تشریح میں آئے گی۔

مقصد یہ کہ اقبال کے نزدیک برتر انسان کے پیار کی نوعیت نیچر کے پیار سے برتر اور مختلف ہے۔ اسی لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اقبال محض جنگ و جدل کا شاعر ہے۔ صحیح یوں ہے کہ اقبال ذوقِ تسخیر کا شاعر ہے۔ اور اس تسخیر میں محبت اور استیلا (زور و غلبہ) دونوں شامل ہیں۔

نیچر میں جو پیار جاری ہے اس کی تشریح فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اپنے اپنے طریقے سے کی ہے۔ جرمن فلسفی ہیگل کہتا ہے کہ زندگی ایک سلسلہ جدل (جدل کے معنے بھی لڑائی اور پیار ہیں۔ ہیگل کے ان تصورات کو جدلیات کہا جاتا ہے) کا نام ہے۔ اسی جدل سے ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ ایک شے یا جزئی اپنے مخالف شے سے ٹکراتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے ایک نئی شے یا جزئی وجود میں آتی ہے۔ پھر یہ نئی شے اپنے ماحول میں مخالف جزئی سے ٹکراؤ پیدا کرتی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ زندگی اس پیار کی بدولت نت نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔

یہ تو تھی پیار کی فلسفیانہ توجیہہ۔ سائنس دانوں میں سے بعض نے اشیاء و اجسام کے مشاہدے اور ان کے خواص کے تجزیے سے یہ معلوم کیا ہے

کہ کائنات میں غیر محسوس طور پر ایک جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ اپنی حیات اور بقا کے لئے ہے (تنازع للبقا) اس جنگ میں جو اجسام زیادہ مضبوط ہیں وہ دوسروں کو (جو نسبتاً کمزور ہیں) مغلوب کر کے یا تو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں یا فنا کر دیتے ہیں اور زندہ وہی رہتے ہیں جو زندہ رہنے کی قوت اور صلاحیت سب سے زیادہ رکھتے ہیں (بقائے اصلح)

انسان بھی چونکہ فطرت کا ایک جزو ہے اس لئے اس کے اعمال و افعال (جو اس کی سرشت میں) مذکورہ بالا فطری اصول یا صلاحیت موجود اور کارفرما ہے۔ لیکن چونکہ انسان ایک برتر مخلوق ہے اور ہزارہا برسوں کے تجربے سے اس نے زندہ رہنے کے لیے فطرت سے بلند تر کچھ قوانین اور کچھ ہدایات کئے ہیں یا وضع کر لیے ہیں اس لیے اس کے پیار کے عمل میں اخلاقی نصب العین موجود رہتا ہے یا رہنا چاہیئے۔ وہ حیوان نہیں انسان ہے اس لئے اس کے اصول پیار حیوان کے اصول نہیں ہونے چاہئیں اگرچہ اس حیوانی صفت کی موجودگی اس کے لیے لازمی ہے کہ زندگی کے لئے پیار ایک بنیادی شے ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی شکل حیوانی پیار سے جدا ہو سکتی ہے۔

بقیہ شہزادہ فہد

جو اصولوں کے سلسلے میں پہلے سے دھمکیاں دیتے اور پھر سودے بازی کرنے پر یقین رکھتے ہوں اور نہ ہی میں اس قسم کا آدمی ہوں جو منفی دباؤ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، آپ کے دماغ میں جو کچھ بھی ہو لیکن میں یہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اکتوبر کی جنگ کے بعد عربوں نے تیل پر جو پابندی لگائی تھی وہ اس مقدس اور عظیم مقصد پر توجہ مبذول کرنے کے لیے تھی جس کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ ہے فلسطینی عوام کا کاز جو پچھلی ایک ربع صدی سے خانماں برباد ہیں۔

عرب لیگ

مجلس اقوام متحدہ سے بھی پہلے وجود میں آنیوالا بین الاقوامی ادارہ
پچھلے ماہ اس کی تیس سالہ سالگرہ منائی گئی

۲ قوموں کے درمیان باہمی تعاون واشتراک کی بنیاد پر کام کرنے والے جو بین الاقوامی ادارے اس وقت قائم ہیں، ان میں سے ایک عرب لیگ بھی ہے یہ ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی تھی اور اس نے گزشتہ ماہ اپنی تیس سالہ سالگرہ منائی ہے۔

یہ ادارہ دنیا کے سب سے بڑے بین الاقوامی ادارہ مجلس اقوام متحدہ سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔

عرب لیگ کے منشور کے مطابق اس کے اغراض ومقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ ممبر ملکوں کی آزادی وخود مختاری کا بیرونی حملہ سے تحفظ کیا جائے عرب ملکوں کے درمیان باہمی اشتراک وتعاون کو فروغ دیا جائے۔ اور عرب ملکوں کے مفادات کی حفاظت کی جائے۔

جب سے عرب لیگ وجود میں آئی ہے۔ اس کا کام یہ رہا ہے کہ بین الاقوامی میدان میں اس کے ممبروں کی پوزیشن کو مستحکم کیا جائے اور رابطہ بڑھایا جائے۔ افرو ایشیائی ممالک اور ترقی پذیر ملکوں سے روابط کو مضبوط کیا جائے نوآبادیات کے خلاف آزادی کی جد وجہد کو بڑھایا جائے۔

اخوت بھائی چارہ مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر امن عالم کو مستحکم بنایا جائے سماجی اور اقتصادی میدان میں آزادانہ بین الاقوامی تعاون کو فروغ دیا جائے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

عرب لیگ کے تحت گیارہ خصوصی ایجنسیاں اور ادارے کام کر رہے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻

آبادی کا اندازہ

عمان	۷۵۰,۰۰۰
قطر	۱۷۰,۰۰۰
سعودی عرب	۸,۴۴۳,۰۰۰
سوڈان	۱۶,۹۰۱,۰۰۰
صومالیہ	۲,۹۴۱,۰۰۰
شام	۶,۸۷۹,۰۰۰
تیونیسیا	۵,۵۰۹,۰۰۰
متحدہ عرب امارات	۳۲۵,۰۰۰
عرب جمہوریہ یمن	۶,۰۶۲۰۰۰
عوامی جمہوریہ یمن	۱,۵۹۰,۰۰۰
الجزائر	۱۵,۷۷۲,۰۰۰
بحرین	۲۲۴,۰۰۰
مصر	۳۶,۰۰۰,۰۰۰
عراق	۱۰,۴۱۲,۰۰۰
اردن	۲,۵۷۷,۰۰۰
کویت	۸۸۳,۰۰۰
لبنان	۲,۶۰۰,۰۰۰
لیبیا	۲,۲۵۷,۰۰۰
ماریطانیہ	۱,۱۸۰,۰۰۰
مراکش	۱۶,۳۰۹,۰۰۰

عرب تعلیمی ثقافتی اور سائنٹیفک تنظیم

یہ تنظیم ۱۹۶۴ء میں قائم ہوئی تھی اور اس کا مقصد عربوں کے ثقافتی اتحاد کے اصولوں اور نظریات کو فروغ دینا ہر ممبر ملک اس تنظیم کو ایک سالانہ رپورٹ بھیجتا ہے۔ جس میں تعلیمی، ثقافتی سائنسی امور میں ترقی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

عرب ممالک کی نشریاتی یونین

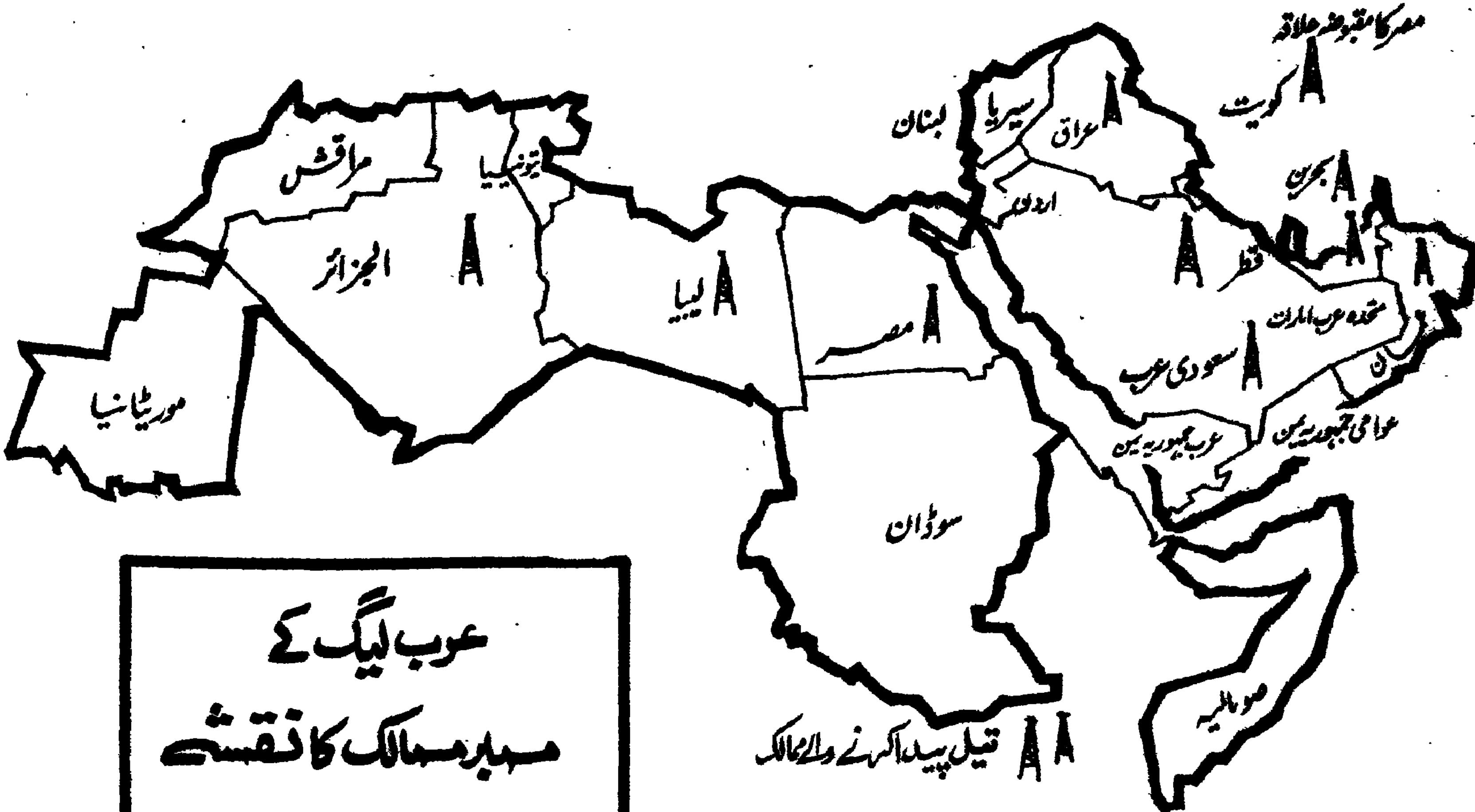
یہ تنظیم ۱۹۶۹ء میں وجود آئی تھی اس کے قیام کا مقصد عرب ملکوں کے نشریاتی امور کا مطالعہ اور ان میں رابطہ پیدا کرنا ہے۔ ماہرین فن کا تبادلہ اور ٹیکنیکل امور میں تعاون قائم کرنا ہے۔ اس تنظیم میں ۱۹ عرب ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن اور چار غیر ملکی ساتھی ممبران شامل ہیں۔

عرب لیبر تنظیم

یہ تنظیم ۱۹۶۵ء میں قائم کی گئی تھی اور اس کا منشا عربوں کے لیبر مسائل میں تعاون اور یکساں لیبر قوانین کی تیاری ہے۔ جس میں کام کی شرائط اور انشورنس وغیرہ

عرب سول ایوی ایشن کونسل

اس تنظیم کا قیام ۱۹۶۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ تاکہ ممبر ملکوں کے درمیان فضائی نقل وحمل کی ...



عرب لیگ کے
ممبر ممالک کا نقشہ

اور اقتصادی امور کو بہتر بنایا جا سکے۔

سیکرٹریٹ

یہ ادارہ عرب لیگ کے ایڈمنسٹریشن کے روزمرہ کے کاموں کا نگراں اور ذمہ دار ہے۔ اس کا سربراہ عرب لیگ کا سیکرٹری جنرل ہوتا ہے آجکل اس عہدہ پر ڈاکٹر محمود ریاض فائز ہیں، آپ اس سے پہلے عرب جمہوریہ مصر کے وزیر خارجہ تھے، سیکرٹریٹ میں اقتصادیات۔ سیاسیات۔ قانون۔ ثقافت اور سماجی امور کے شعبے ہیں، مالیات۔ فلسطین۔ پٹرولیم۔ صحت اطلاعات۔ مواصلات اور روابط کے محکمے بھی قائم ہیں

کونسل

اس تنظیم میں جو عرب لیگ کے ممبر ملکوں کی سپریم باڈی (اعلیٰ ترین ادارہ) ہے۔ بیس ممبر ملکوں

ٹنڈر نوٹس

پبلک ہیلتھ انجنیئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جنہوں نے سال ۱۹۷۵ء کی انلسمنٹ فیس جمع کرادی ہو، حسب ذیل ورکس کے لیے پرسنٹیج / آئٹمز ریٹس کے ٹنڈر مطلوب ہیں۔ یہ ٹنڈر ہر کام کے سامنے ذیل میں درج شدہ تاریخ کے گیارہ بجے قبل دوپہر کو مذکورہ بالا تاریخ اور وقت پر حاضر ہونے والے خواہشمند ٹھیکیداروں یا ان کے با اختیار ایجنٹوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

ٹنڈر فارم دفتر ہذا سے بقیمت -/۵ روپے (ناقابل واپسی) فی فارم ٹنڈروں کے وصول ہونے کی تاریخ سے ایک دن قبل تک جاری کیے جائیں گے۔ ٹنڈر کھلنے کی تاریخ کو کوئی ٹنڈر فارم فروخت نہیں کیا جائے گا۔

ٹنڈروں کے ہمراہ زر ضمانت پاکستان کے کسی شیڈول بنک سے چالان خزانہ ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں منسلک ہونا چاہیئے۔ اس کی عدم موجودگی میں ٹنڈر قبول نہیں کیے جائیں گے — مشروط یا بذریعہ تار ارسال کیے گئے ٹنڈر زیر غور نہیں آئیں گے۔ شیڈول آف ریٹس۔ اضافی شرائط اور ڈرائنگز وغیرہ دفتر ہذا میں کسی یوم کو دفتری اوقات کے دوران دیکھے جا سکتے ہیں — دستخط کنندہ ذیل کو پورا حق حاصل ہے کہ بغیر کوئی وجہ بتائے کسی ایک ٹنڈر یا تمام ٹنڈروں کو مسترد کر دے۔

نمبر شمار	نام تفصیل	تخمینہ لاگت	زر ضمانت	مقررہ مدت	ٹنڈر کھلنے کی تاریخ
۱	۱۔ دیہی سیوریج اینڈ ڈرینج سکیم قصبہ شاہکوٹ ضلع شیخوپورہ تعمیر سیکر ٹینگ چیمبر کو لیکٹنگ ٹینک اور پمپنگ چیمبر معہ انٹرکنکشن ایک دوسرے سے ڈسپوزل ورک کے لیے اور بچھانا پائپ اور جوڑ لگانا اور ٹیسٹ کرانا ۵ انچ قطر کی پریشر پائپ اور ۴ انچ قطر کی پریشر ٹائپ آر سی سی پائپ سیور (.B .S.S) و دوسرے تمام متعلقہ کاموں کے۔	-/۵،۹۳،۰۰۰	-/۱۱،۸۶۰	۱۲ ماہ	۲۸-۵-۷۵
۲	دیہی سیوریج ڈرینج سکیم قصبہ مار برٹن ضلع شیخوپورہ۔ تعمیر چیمبر کو لیکٹنگ ٹینک اور پمپنگ چیمبر معہ انٹرکنکشن ڈسپوزل ورک کیلئے اور پاسٹ لے اور بچھانا جوڑنا اور ۴ انچ قطر کی لائن پریشر اور ۸ انچ قطر کی پریشر ٹائپ آر سی سی و بعد تمام دوسرے متعلقہ کاموں کے	-/۳،۶۳،۰۰۰	-/۷،۲۶۰	۱۲ ماہ	۲۸-۵-۷۵

زیر دستخطی مہتمم ایل او ٹی پبلک ہیلتھ انجنیئرنگ ڈویژن لاہور ۲۴۳۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور۔

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب شہزادہ کبیر احمد صاحب سول جج لاہور

۲۴۸/۱

۷۴ء

محمد شفیع وغیرہ بنام کارپوریشن وغیرہ

بادعویٰ استقرار حق

بنام (۱) محمد عاشق سکنہ ٹھینڈیا نوالہ ضلع شیخوپورہ (۲) علم دین (۳) امام دین (۴) محمد حسین پسران شہاب (۵) خوشی محمد ولد عمر دین (۶) امام دین ولد سراج (۷) محمد حسین (۸) محمد حسن ولد بدر دین (۹) جلال دین ولد مہر (۱۰) بشیر احمد (۱۱) محمد حنیف (۱۲) عبدالحفیظ ولد محمد لطیف (۱۳) محمد دین ولد حسن دین (۱۴) محمد شفیع (۱۵) غلام رسول (۱۶) چراغ بی بی (۱۷) تاج بی بی دختر خیر دین (۱۸) میراں بخش (۱۹) محمد الدین ولد شہاب (۲۰) امام دین ولد نور دین (۲۱) امام بی بی زوجہ نور دین (۲۲) احمد دین ولد مہر دین (۲۳) حسن دین ولد عمر دین (۲۴) محمد بشیر (۲۵) محمد جہانگیر (۲۶) محمد شفیق پسران غلام نبی (۲۷) الٰہی بخش تاج بی بی ساکنان بھائی گیٹ لاہور (۲۸) امام دین (۲۹) محمد الدین (۳۰) معراج دین ولد اسماعیل (۳۱) جلال دین ولد پیر بخش (۳۲) شہاب دین (۳۳) امام دین (۳۴) سلام دین پسران نبی بخش سکنہ موضع مزنگ تحصیل و ضلع لاہور

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمیان مدعا علیہم مذکوران تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتے ہیں اور روپوش ہیں اس لیے اشتہار ہذا بنام مدعا علیہم مذکوران جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم مذکور تاریخ ۲۶ ماہ مئی ۱۹۷۵ء کو حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوں گے۔ تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔

آج بتاریخ ۱۲ ماہ مئی ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط: سول جج

(مہر عدالت)

۲۶ مئی ۱۹۷۵ء

اور فلسطین کے نمائندے شامل ہیں۔

اقتصادی کونسل

یہ کونسل ۱۹۵۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ ممبر ملکوں کے وزراء امور اقتصادیات یا ان کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

عرب اقتصادی کونسل!

یہ ادارہ ۱۹۶۴ء سے قائم ہے اقتصادی امور کی اس کونسل کے مقاصد میں داخلی پابندیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا درآمدی و برآمدی محاصل پر نظر رکھنا اور بیرونی محاصل میں یکسانیت پیدا کرنا۔ سرمایہ اور محنت کی آزادانہ نقل و حرکت اور یکساں اقتصادی پالیسیاں بنانا شامل ہے۔

عرب شہری تنظیم

یہ تنظیم ۱۹۶۷ء میں قائم ہوئی تھی اور اس کے مقاصد میں سائنسی۔ ثقافتی اور سماجی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ٹاؤن ڈیولپمنٹ کا کام ان کی منصوبہ بندی اور ایڈمنسٹریشن شامل ہے۔ اس کی رکنیت بڑے بڑے عرب شہروں کی کونسل کے لیے کھلی ہے۔

مشترکہ دفاعی کونسل

اس ادارہ کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا تھا۔ تاکہ مشترکہ دفاع کو جامہ عمل پہنایا جا سکے۔ اس میں عرب وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع یا ان کے نمائندے شرکت کرتے ہیں۔

سماجی تحفظ کی بین الاقوامی عرب تنظیم

یہ تنظیم تین شعبوں پر مشتمل ہے جس میں بیورو آف کریمنل پولیس، جرائم کی روک تھام اور منشیات شامل ہیں۔

عرب لیگ کے نیویارک اور اس کی شاخیں شکاگو، واشنگٹن، سین فرانسسکو (ڈلاس) جنیوا۔ بون۔ ایرانی جنیوا۔ لندن۔ نئی دلی۔ روم ماناوہ، بیونس آئرز۔ ٹوکیو، پیرس۔ ڈاکر اور نیروبی میں دفاتر قائم ہیں۔ مدریس ابابا۔ انقرہ۔ لاگوس۔ کوپن ہیگن۔ اور میڈرڈ میں دفاتر قائم کرنے کا ارادہ ہے۔

تحریر: شیخ محبوب علی اسسٹنٹ چیف انجنیئر
ٹیلیفون اسلام آباد

ہندوستان میں اسیری کے شب و روز

۸ مئی ۱۹۷۳ء بارش نہ ہونے کی وجہ سے ابھی شدید گرمی پڑنے لگی ہے، دوپہر اور سہ پہر کو وہ حالت ہوتی ہے، کہ الامان والحفیظ۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے، ہم تین چارپائیوں سے وقت کے لحاظ سے مختلف کام لیتے ہیں شاید ہی کوئی ماہر تعمیرات اتنے تھوڑے وسائل سے موسم کے مطابق گھر بنانے کا فن جانتا ہو، صبح یہ چارپائیاں ایک حالت میں ہوتی ہیں، دوپہر کو ان کی ہیئت بالکل بدل جاتی ہے اور ایک ائرکنڈیشنڈ مکان بنا لیا جاتا ہے، جب کہ رات کو یہ ایک بالکل مختلف منظر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔

۱۲ مئی ۱۹۷۳ء دودھ لانے کے لیے ہمیں کیمپ کے اندر ہی کچھ فاصلے پر جانا پڑتا ہے، بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے، آیئے آپ بھی لطف اندوز ہوتے جائیں:۔

"ابھی آیا جناب" میں بھاگا بھاگا کمرے میں گیا کہ بچوں کیلئے دودھ لانے کی باری میری تھی بالٹی لی، گیٹ پر پہنچا۔ اکرام سپاہی بالٹی لیے پہلے ہی میرے انتظار میں تھا، وہ میس میں تیار ہونے والی چائے کے لیے دودھ لایا گیا، اکرام آگے بڑھا، "میجر جی دو آدمی دودھ کے لیے" اُس نے گیٹ پر کھڑے لانس نائیک سے عرض کیا، "ٹھہرو، کتاب پر چڑھا لوں" لانس نائیک نے شروع کیا، "دو ایک سویلین ایک فوجی"۔ پھر قریب کھڑے گارڈ سے مخاطب ہوا، "اُستاد تیار ہو جاؤ۔"

گارڈ نے کمر میں لٹکی ہوئی بیونٹ اتاری اور رائفل پر چڑھا لی۔ بٹ بائیں ہاتھ میں، بیرل دائیں ہاتھ میں۔ ایک زنجیر سے رائفل کو کمر سے باندھا ہوا ہے، مبادا کوئی قیدی چھین لے۔

"اُستاد گیٹ کھولو" نائیک نے گیٹ کے سپاہی کو حکم دیا۔

اُستاد نے چابی لی اور گیٹ کھولنے لگا "کیا ہو گیا تالے کو" استاد بڑبڑایا، اور دو تین گالیاں بغیر کی کوروسے دیں (شاید وہ تالے سپلائی کرتے ہوں) بڑی کوشش سے گیٹ کھلا۔ ہم دونوں بالٹیاں لیے گیٹ سے باہر آ گئے۔ گیٹ فوراً بند کر دیا گیا۔

"چلو" ہمارے ساتھ جانے والا گارڈ بولا ہم آگے بڑھے۔ گارڈ ہم سے دس قدم پیچھے سنگین چڑھائے، رائفل تانے چلنے لگا ہم سینہ تانے فضا میں گھورتے چلے گئے تاکہ دور پہرہ اس قوم کی زبردست احتیاط سمجھیں یا انتہائی بزدلی قرار دیں، دائیں طرف خاردار کی دو قطاریں، دس دس فٹ کے فاصلے پر ہمیں احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور ان دو قطاروں کے ساتھ مسلح سپاہی چوکس کھڑے ہیں۔

دوربین لگائے کئی سپاہی ہماری حرکت کو بغور دیکھتے۔

سٹور بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ پر تھا پانچ سات منٹ میں وہاں پہنچ گئے، راستہ میں بلاک نمبر ۳ بلاک نمبر ۲ اور بلاک نمبر ۱ پڑتے ہیں، ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ ہو گیا، اتنے قریب رہتے ہوئے نگران میں سے کسی سے میل ملاقات یا تعارف نہیں ہوا۔ پھر بھی اشاروں، کنایوں سے سلام دعا اور خیریت پوچھ لیتے، بعض اوقات گارڈ زیادہ ہی فرض شناس مل جاتے تو اشاروں کنایوں پر بھی پابندی لگ جاتی۔

اچھا تو دودھ لانے والی لبس جاتے ہی آ گئی، دودھ کے ڈرم اتارے گئے۔ میس کیلئے ۲ لٹر (ایک پیمانہ جو تقریباً ایک سیر کا ہوتا ہے۔) اور بچوں کے لیے ۲ ½ لٹر دودھ ملا۔ بس کام ختم ہوا، اردگرد دیکھا، ساتھ آنے والا سپاہی بغور ہمیں دیکھ رہا تھا، ہمارا اِدھر اُدھر دیکھنا بھی اسے ناگوار گزرا اور فوراً واپسی کا حکم دیا۔

واپسی بھی اسی شان سے ہوئی، آگے ہم پیچھے مسلح محافظ۔

اپنے بلاک کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رُک گئے۔ لانس نائیک نے رجسٹر اُٹھایا اور کچھ اندراج کرنے کے بعد گیٹ کھول دیا گیا دوسرے لمحے ہم دوبارہ اپنے ساتھیوں سے آ ملے۔ گیٹ بند ہو گیا۔

یکم جون۔ تقریباً دو ہفتے سے منصوبہ بن رہا تھا کہ ہم اور سی صاحبان کو بلاک نمبر ۳ میں منتقل کر دیا جائے اور وہاں کے سویلین قیدیوں کو یہاں بھیج دیا جائے۔ بیسیوں انجنیئرز کے سپاہی تاریں لگانے میں مصروف رہے، بالآخر آج کام مکمل ہو گیا اور ایک بجے دوپہر سے منتقلی شروع

ہوئی، ڈیڑھ سال اکٹھے رہتے ہوئے در و دیوار مانوس ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ ہمارے مخلص، غمگسار اور درد مند بھائی۔ ہمیں ان کی وجہ سے ڈھارس رہتی اور وہ ہمارے اور بچوں کیساتھ مل بیٹھ کر غم غلط کر دیتے۔ آج دونوں طرف غمناک فضا چھا گئی۔

۲۴ جون۔ محترم حفیظ احمد صدیقی صاحب پہلے صرف ہماری بیرک کے کمانڈر تھے سجے سی او کے جانے کے بعد وہ پوری بیرک کے کمانڈر بنا دیئے گئے۔ لوگ بہت خوش تھے کہ صدیقی صاحب جیسا ہمدرد اور خیر خواہ انسان کمانڈر بنا ہے مگر آج انہیں اطلاع دی گئی، کہ اب وہ اس عہدے پر نہیں رہے۔ آج سے ایک ایسا شخص کمانڈر بنا دیا گیا ہے، جو اگرچہ پاکستانی ہے مگر اس سے ہر نفس کو دلی نفرت ہے یہ شخص پہلے بھی ہمارا کمانڈر رہا ہے۔ اس بدبخت کے ہاتھوں ہم مسلمان اسیروں کی نہ عزت محفوظ تھی نہ جان یہ ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ مل کر راشن گھی، آٹا، چینی، سبزی اور دودھ میں بے تحاشا خیانت کرتا، خواتین کی طرف للچاتے ہوئے کتے کی طرح دیکھتا، خدا کا خوف یا وطن کا احساس کے قریب سے چھو تک نہ تھا، ایک مرتبہ اس نے ایک لڑکی سے چھیڑ خانی کی، لڑکی کے ایک رشتہ دار نوجوان نے اُسے ٹوکا تو اس ظالم نے ہندوستانی گارڈ سے ساز باز کر کے بغیر کسی قصور کے گولی مروا دی —— یہ شخص پھر ہمارا کمانڈر۔ قیدیوں نے پاکستان واپس آکر سرحد پہ ہی اس شخص کے ظلموں کی داستان سنا کر اسے گرفتار کرا دیا تھا، نہ معلوم بعد میں اس کا کیا بنا۔ بنا دیا گیا۔ خدا اس کے شر سے محفوظ رکھے۔

۱۵ جون۔ قید کے تسلسل نے طبیعتوں میں افسوسناک قسم کی تنگی پیدا کر دی ہے یہاں پر اب قیام کرنا اور قید کی سختیاں اتنی ٹھلا

آزمائش نہیں، جتنی بڑی مصیبت ساتھیوں کے ساتھ وقت گزارنا۔ خود غرضی، سنگدلی اور تنگ نظری کے وہ مظاہرے ہوتے کہ نگاہ شرم سے جھک جاتی اور دل جل جاتا تھا، کسی کا تھوڑا ذرا زیادہ استعمال کر لیا جائے، کسی کا ایک کیل اٹھایا جائے، ایک منٹ کسی چارپائی پر بیٹھنے کی غلطی ہو جاتے، یا لٹی استعمال کر لی جاتے تو بے اختیار ماتھوں پر تیوریاں چڑھ جاتی، آنکھیں باہر کو ابل آتی۔ خدایا ہم پر رحم فرما ہم اتنے بے مثال عذاب کے بعد بھی انسانی و اخلاقی تقاضوں کو اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

۱۱ ستمبر، آج بیماروں کی فہرست کی تیاری کا حکم دیا گیا تاکہ انہیں پاکستان بھیجا جاتے، ہر بیمار اپنی بیماری پر خوش ہے، عام حالات میں یہ بیماری کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے مگر آج لوگ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے ہیں اور بیماروں کو رشک سے دیکھ رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں کہ وہ صحت دے کر سکون چھین لے اور کبھی بیماری دے کر ساحل مراد سے ہمکنار کر دے۔

۱۲ ستمبر، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کا سمجھوتہ تو چند روز پہلے ہو گیا تھا، آج پتہ چلا ہے کہ ۱۸ ستمبر سے ہوائی جہازوں کے ذریعے پاکستان اور بنگلہ دیش قیدیوں کا تبادلہ شروع کر چکے ہیں اور ہندوستان ۱۸ ستمبر سے اس سلسلے کا آغاز کر رہا ہے، رات بیت گئی اور صبح کے آثار نظر آنے لگے، آزادی کا تصور عجیب سرور دے رہا ہے۔

۲۵ ستمبر، آج شام کو گنتی کے وقت بتایا گیا کہ قرآن مجید کے سوا کسی قسم کا تحریری مواد پاکستان لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ خطوط بھی روک لیے جائیں گے۔ لہٰذا چار سو کے قریب خطوں کو نذر آتش کر دیا۔

۲۸ ستمبر، آج ماہ رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا، کل پہلا روزہ ہوگا۔ قیدیوں کا ایک گروہ بھی آج وطن واپس پہنچ گیا۔

یکم اکتوبر، آج ہمارے کچھ ساتھیوں نے قیمت دے کر باہر سے مُرغ منگائے، جب ایک آدمی مُرغ لے کر آیا تو عجیب لطیفہ ہوا۔ بیرک کے سب بچے پکار اُٹھے، کتے آئے کتے آئے، جب مُرغے مختلف لوگوں کے حوالے کیے گئے تو بچے انہیں ہاتھ لگا کر کہنے لگے، یہ میرا کتا ہے، یہ اس کا کتا ہے۔ اس دلچسپ اور عبرتناک صورت حال کا سبب یہ تھا کہ دو سال سے بچوں نے سوائے ان کتوں کے جو باڑے کے نیچے سے خوراک کی تلاش میں کیمپ آ جاتے تھے، کسی جانور یا حیوان کو نہیں دیکھا تھا، اور ان کے نزدیک ہر انسان کے سوا ہر جاندار کتا تھا —— یہی منظر ایک اور موقع پر دیکھنے میں آیا، ہم لوگ ایک مرتبہ ہسپتال جا رہے تھے مسلح گارڈ بھی ساتھ تھے راستے میں بچوں نے ایک بھینس کو دیکھا تو حیرت سے چیخ اُٹھے، 'دیکھو کتنا بڑا کتا ہے'۔

۸ اکتوبر، آج شام خبر سنی کہ آگرہ اور رڑکی سے علی الترتیب ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸ اکتوبر سے ایک ایک ٹرین پاکستان جائے گی، ہر ٹرین میں ۸۴۰ قیدی ہوں گے۔

۱۴ اکتوبر، آج تیاری کا حکم مل گیا، سامان جمع کرا دیا گیا۔

۱۹ اکتوبر، دوپہر ایک بجکر ۴۴ منٹ پر کیمپ میں خیر باد کہا، دوستوں نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا، ڈونڈھیرو سٹیشن تک ٹرکوں پر آئے —— کرنل ہرنام سنگھ الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے، پونے پانچ گاڑی چلی، ہمیں فرسٹ کلاس کی ایک بوگی میں جگہ ملی۔ دو سال کی جانگسل اسیری کے بعد ہمارا کارواں سوئے آزادی رواں دواں تھا، کھانا کیمپ ہی میں تیار کرا لیا گیا تھا۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

نقد و نظر

تین کتابیں

"GLIMPSES OF ..."

مصنف : سید عبدالواحد معینی

ناشر : اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی

ضخامت : دو سو چالیس صفحے

قیمت : دس روپے

زیر نگاہ کتاب سید عبدالواحد معینی کے بیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ آپ نے پچھلے چند برسوں میں ان مقالات کو بزبان انگریزی حوالۂ قلم کیا ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اکثر مقالات کا بعض رسالوں اور اخباروں نے اُن کی افادیت کے پیش نظر ابلاغِ عامہ کی خاطر ترجمہ کیا۔ ہر مقالہ فکر انگیز پُر معنی اور معلومات افروز ہے۔ سید صاحب کو علامہ اقبالؒ سے والہانہ عشق ہے۔ آپ نے پاکستان بن جانے کے بعد حکیم مشرق کے افکار و مطالب کو مغرب کے علمی حلقوں میں عام کرنے کی ابتدار کی۔ مغربی جرمنی میں بون یونیورسٹی کی اُستاد ڈاکٹر شمل آپ ہی کی بدولت یومِ اقبالؒ میں شرکت کے لئے پاکستان آئیں اور اپنے بصیرت افروز مقالے سے مرکزیہ مجلسِ اقبال کے سالانہ اجلاس میں اہلِ لاہور کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ سید صاحب نے انگلستان، فرانس اور امریکہ کی مختلف علمی مجلسوں میں کلام اقبالؒ پر مختلف لیکچر دے کر فکرِ اقبالؒ کی انتہائی خدمت کی ہے۔ زیر نگاہ بیس مقالات میں پہلا مقالہ "اقبال اور ان کی شاعری" پر ہے۔ دوسرا مقالہ "اقبال اور راٹلی" کے زیر عنوان ہے۔ تیسرا مقالہ "اقبال مشرق و مغرب کے مابین ایک پُل" کے موضوع پر ہے۔ چوتھا مقالہ "اقبال اور سیاست" پر ہے۔ پانچواں مقالہ "اقبال شاعرِ پاکستان" کے زیر عنوان ہے۔ چھٹا مقالہ "اقبال اور افکار مغرب" پر ہے۔ ساتواں مقالہ "اقبال کے عبقری ارتقا" پر ہے۔ آٹھواں مقالہ اقبال کی غنائیہ شاعری سے متعلق ہے۔ نواں باب "اقبال بحیثیت اُستاد" ہے۔ دسویں باب میں اقبال کی شاعری کے تراجم پر گفتگو کی گئی ہے۔ گیارھواں باب "اقبال اور پاکستان" کے زیر عنوان ہے۔ بارھویں باب میں اقبال اور اُس کے نقادوں پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ تیرھواں باب "اقبال اور افغانستان" کے عنوان سے ہے۔ چودھواں باب "اقبال معمار پاکستان" کے زیر عنوان ہے۔ پندرھواں باب کارنامۂ اقبال کا جائزہ ہے۔ سولھویں باب کا عنوان ہے "اقبال - پاکستان کا روحانی باپ"۔ سترھویں باب میں اقبال کے انسانی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ اٹھارواں باب اقبال کی تاریخ پیدائش سے متعلق ہے اور اُنیسویں باب میں پروفیسر آربری - اقبال کا ایک عظیم طالب علم کے زیر عنوان توضیحی مقالہ ہے۔

سید صاحب کو قلم پر قدرت حاصل ہے وہ انگریزی زبان شُستہ اور رُفتہ اسلوب میں لکھتے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک اقبالی کو انتہائی خوشی ہوتی ہے اور وہ مطالعہ کی صحبت میں بہت سی نئی باتیں حاصل کرتا ہے۔ اقبال کے ناقدوں پر بیرھویں باب میں سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ عالمانہ لہجے میں سچائی کا اظہار ہے۔ بہتر ہوتا اگر سید صاحب اقبال کے اُن دوستوں پر بھی قلم اٹھاتے جو اُن کے افکار و سوانح کی کمین گاہ میں بیٹھ کر افکارِ اقبال کے بلند پرواز طائروں کا شکار کرتے اور اپنی کوتاہ فکری کو سوانح اقبال سے منسوب کرتے ہیں۔ سید صاحب اگر "فکرِ اقبال" (مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم) اور "شعرِ اقبال" (مصنفہ سید عابد علی عابد) کو بھی انتقاد کی ترازو میں تولتے تو صرف سوانح و افکارِ اقبال کی عظیم خدمت بجا لاتے بلکہ نسلِ نو کو بھی اُن گمراہیوں سے بچا لیتے جو اقبال کے نام پر مرحوم دور کے بعض بزرگوں اور جدید عہد کے بعض نوجوانوں نے پیدا کی ہیں۔ بہرحال سید صاحب کے مقالات کا یہ مجموعہ فہم اقبال میں آسانیاں پیدا کرنے کا ایک علمی ارمغان ہے اور ہم شیفتگانِ اقبال سے اس کے مطالعے کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

نام : مسیح موعود کی پہچان

مصنف : حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی

ناشر : مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

قیمت : ایک روپیہ پچیس پیسے

اس مختصر کتابچے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی نے قرآن و حدیث کے وہ تمام فرمودات جمع کر دیئے ہیں جو مسیح موعود کے متعلق کلام اللہ اور احادیث نبوی میں ہیں۔ کُل ۱۷۷ روایتیں ہیں جن میں ۴۹ قرآن مجید سے ہیں اور باقی تمام حدیثیں ہیں ابتداء میں ساڑھے پانچ صفحے کا مختصر دیباچہ ہے۔ آخر میں دو صفحے کی تشریحات ہیں پھر تقریباً آٹھ صفحوں میں مرزائیوں سے چند سوال کئے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی رُو سے جن روایتوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن ایک سو ستر نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی مرزا غلام احمد کے وجود میں تھی؟ جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے بلاشبہ یہ کتابچہ حضرت مفتی صاحب کی عالمانہ نگاہ کا شہ پارہ ہے۔ اس قسم کے کتابی مقالوں کی دینی حلقوں کو ضرورت بھی ہے۔ لیکن ہمارا یہ حقیر سا عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا تذکرہ قلم کا اسراف ہے وہ تو برطانوی استعمار کا مہرہ تھا وہ بس۔

نام کتاب : سیرت یعقوب و مملوک

تالیف : پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹی

ناشر : مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

قیمت : پندرہ روپے پچھتر پیسے۔

یہ کتاب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور اُن کے والد ماجد حضرت مولانا مملوک علی قدس سرہ کے علمی، روحانی، اخلاقی اور ادبی سوانح حیات پر

مشتمل ہے۔ پروفیسر صاحب نے فاضلانہ انداز میں دارالعلوم دیوبند کے اِن دو مایہ ناز بزرگوں کی سرگذشت حوالۂ قلم کی ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر صاحب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی سوانح عمری لکھ کر خاصی شہرت پا چکے ہیں۔ انہی کے قلم سے سید الطائفہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی سوانح عمری بھی حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی مساعی جمیلہ سے منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ غرض ملک کے دینی حلقے اُن تمام اہلِ قلم کے شکر گزار ہیں جن کی بدولت اُن بزرگ ہستیوں کے سوانح افکار ہمارے سامنے آ رہے ہیں جن کا وجودِ برعظیم میں مسلمانوں کے لئے آیات من اللہ تھا۔ مولانا محمد یعقوب علیہ الرحمہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے اُستاد مولانا مملوک علی صدر شعبۂ علوم شرقیہ دہلی کالج کے فرزندِ ارجمند حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد رشید حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ مجاز، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے ہم عصر و ہم راز تھے۔ آپ ایک بہت بڑے عالم، بہت بڑے فاضل، بلند مرتبہ محدث و فقیہہ، کامل درجے کے مُرشد و شیخ اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ اس پائے کے انسان ہی ناپید ہو چکے ہیں۔ قدرت نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں اس قسم کے انسان ڈھلا کرتے تھے۔ اب اس سیاہ رات میں ایسی کوئی روشنی نہیں۔ اگر چند بزرگ بقیدِ حیات ہیں تو وہ بھی عمرِ طبعی کے آخری مرحلے میں ہیں ورنہ اس زمانے میں منبر و محراب کی مخلوق نے اپنے علم و تقویٰ کے خرمن کو خود آگ لگا دی ہے۔ کبھی اس خطہ میں علم و فکر اور ایثار و استقامت کو دیوبند پر ناز تھا۔ اب ان محاسن و کمالات کی ہستیاں ہی ناپید ہو چکی ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی کی روحیں مولوی غلام غوث ہزاروی کی سیاست پر سوچتی ہوں گی کہ ہمارے شاگرد ایسا بھی ہیں۔ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی روح بھی مولوی احتشام الحق تھانوی کے منبر و محراب پر غور کرتی ہوگی کہ مسندِ رسول اس شخص کے تصرف میں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا ماضی برعظیم میں تاریخ اسلام کا سرمایۂ عظیم ہے۔ ان کے اکابر کی پُر جہد علمی زندگی اور بے مثال علمی شب و روز کے مطالعے سے قلب و نظر کو وسعتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن جب سونے کی اس طویل زنجیر میں تانبے کے حلقے نظر آتے ہیں تو اپنی بدنصیبی پر ملال ہوتا ہے کہ ہم کس زمانے میں پیدا ہوئے۔ بہرحال یہ کتاب ایک عمدہ کاوش ہے۔ ہم فاضل مصنف کو مبارکباد پیش کرتے اور دیوبند کے مدرسۂ فکر کے وابستگان سے اس کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

بقیہ: اسیری

راستے میں قہوے اور چائے کے دَور چلے۔ سہارنپور انبالہ اور آخر میں امرتسر ہوتی ہوئی گاڑی ۱ اکتوبر کو صبح چھ بجے اٹاری کے مقام پہنچ گئی۔ جہاں سے ہم ٹرکوں پر واہگہ پہنچے، اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ ساڑھے ۹ بجے ہماری باری آ گئی، اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وطنِ پاک کی سرزمین پر آ گئے۔

بھارتی سامراج سے وابستہ قصۂ الم آپ سن چکے۔ اب منہ کا مزہ بدلنے کے لیے چند لطائف بھی سُن لیجیے۔

ایک دفعہ میں نماز پڑھ کر مُصلی پر بیٹھا ذکر کر رہا تھا کہ ایم ای الیس کا ایک سکھ حوالدار آیا، اور میری طرف اشارہ کر کے یونس کے کان میں کہنے لگے،

"ملا جی کالا علم بھی جانتے ہیں؟"

ایک سفر ہم کینٹین گئے، سخت گرمی پڑ رہی تھی، صوبیدار برکت ہمارے ساتھ تھے۔ پسینے میں شرابور ہو کر بولے: "لالہ جی ہمیں جلدی فارغ کرو، ہمارا تو تیل نکل رہا ہے"۔ تیل نکلنے کا سنتے ہی لالہ جی کا رنگ فق ہو گیا کام چھوڑ دیا، اور لگے ہماری قطار کے پیچھے دیکھنے۔ ہم حیران کہ بات کیا ہوئی، صوبیدار صاحب پھر بولے: "لالہ جی جلدی کریں تیل نکل رہا ہے"۔ اس پر لالہ جی بولے "ابھی میں نے کل ہی تو ڈرم میں ویلڈ لگایا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیل نکل جائے۔ ہم نے جو مڑ کر دیکھا تو ہماری حالت ہنستے ہنستے غیر ہو گئی۔ لالہ جی مٹی کے تیل پر نظریں گاڑے ہوئے تھے

صوبیدار برکت علی دلچسپ قسم کے وضعدار انسان تھے، ایک دفعہ کسی بات پر کہنے لگے۔ ہم کوئی انوکھے قیدی تھوڑے ہوئے ہیں، ساری دنیا قید ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ انہی صوبیدار کی صاحبزادی لیٹرین جاتے ہوئے ڈر رہی تھی، کیونکہ اس وقت بجلی بند تھی، صوبیدار صاحب کڑک کے: "جاؤ کیوں ڈرتی ہو وہاں تو ساری دنیا بیٹھی ہوئی ہے"۔

ایک بھارتی صوبیدار جاگیر سنگھ اپنی حرکتوں کی وجہ سے سارے کیمپ میں ڈنگر سنگھ کے نام سے مشہور تھے۔ اس لقب پر وُہ خود بھی بہت خوش تھے اور ساتھیوں کو فخریہ انداز میں بتاتے تھے کہ دیکھا میرا نُور۔ ایک روز گنتی کے وقت انہوں نے سب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"منہ کھول کر میری بات سُن لو"

کیا مجال کہ ہنسی نکلی ہو کہ مخاطب ڈنگر سنگھ تھا"

ایک روز گنتی کے وقت میں وضو کر رہا تھا اس لیے تھوڑی سی دیر ہو گئی، جب سردار ڈنگر میرے پاس پہنچے تو میں پاؤں دھو رہا تھا، اس پر وہ گویا ہوئے،

"ملا جی آپاں منہ وی بھی نہیں دھوتا۔ تسیں پیر دھوندے او"

(ختم شد)

۲۹ مئی [illegible]

چٹان
ہفت روزہ لاہور
مدیر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ ——— شمارہ ۲۳
۹ جون ۱۹۷۵ء
قیمت ——— ایک روپیہ

اپوزیشن کے نام

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے

جب متحدہ اپوزیشن قائم ہوئی تھی تو ہم نے اسی وقت بعض مخلص دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ ہمارا بنیادی خیال یہ تھا کہ متحدہ محاذ مجموعہ اضداد ہے اور یہ رائے کسی اختلاف کی بنا پر نہ تھی بلکہ امر واقعی کا اظہار تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اپوزیشن میں بہت سے راہنما اپنے وطن کی محبت کے باعث لائق احترام ہیں۔ ان کی سیرت سیاسی آلائشوں سے بے داغ ہے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعی امر ہے کہ ایک جمہوری ملک کی اپوزیشن میں جو توانائی ہونی چاہیے متحدہ محاذ میں نہیں اس کے بعض مخلص راہنما شعلہ جوالہ ہیں۔ انہوں نے مخاصمت مانشوں میں انتہائی جوانمردی کا ثبوت دیا ہے لیکن پاکستان جن حالات میں گزر رہا ہے اور اس کے لئے جس تب و تاب کے تدبر کی ضرورت ہے اس سے اپوزیشن کے جیب و داماں خالی ہیں۔ ہم نے پہلے ہی دن عرض کیا تھا کہ برسر اقتدار جماعت سے ذہنی اختلافات جمہوریت کا شعار ہے لیکن صرف اس بنا پر اکٹھا ہونا کہ برسر اقتدار پارٹی کو حکومت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ ایک صحیح اپوزیشن جب اس اپوزیشن نے بعض بنیادی مسائل میں حکومت سے تعاون کیا اور دستور بنانے کے وقت یکجا ہو گئے۔ یعنی حزب اقتدار اور حزب اختلاف نے متفق ہو کر دستور بنایا اور اس پر دستخط کئے تو پھر اختلاف کی سرگزشت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اختلاف جڑ یا بنیاد میں نہیں شاخوں اور دیواروں میں ہے۔ اپوزیشن کی شکایت سے کہ حکمران پارٹی نشہ اقتدار میں اس کی جائز شکایات اور اتنی ہی جائز مشکلات پر توجہ نہیں کرتی۔ ہم خود حیران ہیں کہ وزیر اعظم بھٹو ایک متحرک سیاستدان کی حیثیت میں ان شکایات اور ان گزارشات سے کیوں عہدہ برآ نہیں ہوتے اس کے پس منظر کی بعض سنگینیوں کو جانتے ہیں لیکن زبان قلم پر اس لئے نہیں لاتے کہ ہم ملک کو جو بحران در پیش ہے اس کی روشنی میں ہم تو ضعیف دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہم میں غیر ملکی طاقتوں کا بازیچہ بننے کا حوصلہ ہے۔ یہ چیز نظر انداز کرنے کی نہیں کہ مسٹر بھٹو اور اپوزیشن میں کٹا چھنی ہے۔ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم اصلاح احوال کا نقشہ پیدا کرتے۔ ہم نے بار بار لکھا ہے اور اپنی اس رائے کو چھپا نہیں سکے کہ وزیر اعظم بھٹو سنگین حالات میں برسر اقتدار آئے تھے۔ انہیں داخلی و خارجی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ خان عبدالقیوم خان کو شریک وزارت نہ کرتے تو ملک کے حالات آج سے بہتر ہوتے اور یہ صورت حالات کبھی پیدا نہ ہوتی جو سرحد و بلوچستان میں رونما ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خان عبدالقیوم خان نے ملک کی سیاست میں ابتری پیدا کی ہے۔ وہ کسی کریکٹر کے انسان نہیں اور کسی اقتدار کے خلاف اُن میں میدان لڑنے کا حوصلہ بھی نہیں۔ یہ چیز خوبصورت نہیں کہ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کو برسر اقتدار جماعت سے لڑا دیا جائے اور ذوالفقار علی بھٹو کو خان عبدالولی خان سے بھڑا دیا جائے ہم بھی اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص ملک کا غدار ہے یا اسلام کا وفادار نہیں وہ کڑی سے کڑی سزا کا مستحق ہے۔ ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے اپنی بات کرتے ہیں کہ ایڈیٹر چٹان بھی اگر اپنے ملک اور اپنے دین سے غداری کا مرتکب ہو تو گولی سے اڑا دینے کے لائق ہے۔ اور جو حکومت اس کو یہ سزا نہیں دیتی وہ ملک پر فرمانروائی کی اہل نہیں۔ اگر خان عبدالولی خان غدار ہیں تو پھر وہ خود کہہ چکے ہیں کہ مجھے کھلی عدالت میں لا کر تختہ دار پر کھینچ دیجئے لیکن خدا اور رسولؐ گواہ ہیں کہ خان عبدالقیوم خان نے ان کے خلاف جو فرد جرم بنائی ہے اس کو ہمارا ضمیر نہیں مانتا۔ ہم اپنے رب کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ ہمیں خان عبدالقیوم سے کوئی ذاتی عداوت نہیں۔ ہم ان کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ آج سے نہیں اس دن سے جب وہ کانگرس میں تھے اور انہوں نے پنجاب کے مہاجاتی

جلسہ میں پارلیمنٹ کی صدارت ... ایک ایم این
جو کسی انتخابات سے کوئی کریکٹر رکھتا ہو۔ ہمارے لئے قابل احترام نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو آجکل خانہ ساز مسلم لیگ میں اس کے مصاحب ہیں۔

ہمارے لئے ذہنی المیہ کا باعث صرف ایک چیز ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے نوجوان فہم نے اس گرگ باراں دیدہ بوڑھے کی ذات پر حسن خوبی کے باعث اعتماد کیا؟ ہمارا خیال ہے کہ خان عبدالقیوم خان وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اپوزیشن سے لڑائی کی یہ شکل نہ ہوتی؟ باقی اصل حقیقت سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہیں۔ لیکن دوسری چیز جو ہمارے نزدیک سیاسی انتشار کا باعث ہے وہ پیپلز پارٹی میں اوپر کی سطح پر باہمی انتشار ہے۔ ہم سرحد، بلوچستان اور آزاد کشمیر کی پیپلز پارٹی کو صرف سندھ کی ٹکڑی سمجھتے ہیں۔ ان علاقوں کے چند گنے چنے افراد کو چھوڑ کر باقی سب اقتدار کے دوست ہیں۔ آج بھٹو اقتدار میں ہیں یہ ان کے ساتھ ہیں کل کوئی اور آجائے تو یہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اسی قسم کے سیاسی گرگٹوں ہی نے پاکستان کو دولخت کیا ہے۔ اگر پاکستان کے سیاسی مزاج میں تلون نہ ہوتا تو پاکستان اس حال کو ہرگز ہرگز نہ پہنچتا۔ ہم عقل و فراست کی ہزار توجیہوں کے باوجود پنجاب و سرحد کی حکمران جماعت کے باہمی تصادم پر کوئی حسن ظن قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ خوشگوار چیز نہیں کہ پیپلز پارٹی آپس میں دست و گریباں ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہم کہاں ہیں اور کہاں جائیں گے۔ کبھی کبھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاید پارلیمانی نظام کو رد کیا جا رہا ہے اور جب یہ چیزیں مختلف واقعات کی روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہمیں اپوزیشن کے خدوخال پر افسوس ہوتا ہے۔ اپوزیشن کا سب سے بڑا خلا یہ ہے کہ وہ تضادات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے پارٹی کی مرکزی حیثیت ہی نہیں کا فقدان ہے۔ قیادت میں جو صاحب ہوں گے ان کی حالت دلوں کی نمائندگی نہیں کرتے وہ پاکستان کی سیاسی فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اگر متحدہ اپوزیشن کسی قد آور سیاسی شخصیت کی مالک ہوتی تو ہم اتنی سی بات کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اس کے صدر پیر پگاڑا شریف نہ ہوتے۔ ان کے والد بڑے نامور بزرگ تھے۔ اُن کا خاندان ایک عظمت کا حامل ہے لیکن موجودہ پیر صاحب اپنی تمام وجاہت کے باوجود سیاسی آدمی نہیں ہیں اور شاید انہیں سیاست کے ابجد سے بھی واقفیت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اپوزیشن نے انہیں جواب آں غزل کے طور پر صدارت سونپ رکھی ہے۔ اگر پیر صاحب متحرک سیاسی شخصیت ہوتے تو صورت حالات مختلف ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان بھی متحدہ اپوزیشن کے بارے میں حرف قلندرانہ زبان پر لانے کی جرأت کر رہے ہیں۔ کل ہی متحدہ جمہوری محاذ کے جلسے میں ایک طالب علم راہنما نے اپوزیشن کے سیاسی راہنماؤں پر نکتہ چینی کی اور ان کی سیاست کے طریق کار کو نوجوان نسل کے لئے ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا اگر ہمارے یہ راہنما ہمیں شعور نہیں دے سکتے تو پیچھے ہٹ جائیں۔ آپ نے ان راہنماؤں پر تنقید کی جو کبھی حکومت سے منسلک رہے تھے اور اب کرسیوں کے پیچھے سیاست کر رہے ہیں۔ ملک محمد قاسم نے اس طالب علم راہنما کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جن بزرگوں کی طرف نوجوان مذکور نے اشارہ کیا ہے انہوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ اور اپنے رویہ پر نادم ہیں۔

ملک صاحب ہمارے دوست ہیں ہم اُن کی تردید نہیں کرتے لیکن نوجوان مذکور کے جذبات بڑی حد تک درست ہیں۔ کیا ملک صاحب محترم اور اُن کے دوسرے واجب الاحترام ساتھی ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیں گے کہ موجودہ اپوزیشن اپنے اندر کوئی تب و تاب نہیں رکھتی۔ اس کے راہنما جگہ داران ہیں۔ سالار کارواں نہیں۔ وہ نہ اپوزیشن کرتے ہیں اور نہ اپوزیشن بیچ رہے ہیں۔ پوری سیاست میں ... جو شخص حکومت سے نکالا جائے وہ اپوزیشن کی گود میں آجائے۔ اتنی سی بات ہمارے پیارے دوست نوابزادہ نصراللہ خان بھی جانتے ہیں کہ متضاد عناصر جمع ہو کر ایک سمت نہیں بن سکتے۔ جب اپوزیشن کے لیڈر خود اپنے ساتھیوں سے وفا نہیں کی اس سے عوام کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس تلخ نوائی کے لئے اپنے دوستوں سے معافی چاہتے ہیں۔

"مولانا کسی کو معاف کردیں"

مولانا غلام غوث ہزاروی نے ٹانک میں تقریر کرتے ہوئے مفتی محمود پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اپنے نو ماہ کے دور وزارت میں دو لاکھ دس ہزار روپے کی ناجائز اراضی حاصل کی ہے جو مولانا صدر الشہید اور مولانا زاہد کے نام پر منتقل کی گئی ہے۔ مولانا ہزاروی نے مزید الزام لگایا کہ مفتی صاحب دن کو اسمبلی کا بائیکاٹ کرتے اور رات کو وزیر اعظم سے ملاقات کرتے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ مفتی محمود نے وزیر اعظم سے استدعا کی ہے کہ انہیں وفاقی وزیر بنا دیا جائے تو وہ عبدالولی خان کی بھرپور مخالفت کریں گے۔"

مولانا غلام غوث ہزاروی کے یہ "ملفوظات عالیہ" جنگ کراچی کے حوالے سے امروز لاہور کے صفحہ اول کے ساتویں کالم میں ایک کالمی سرخی سے شائع ہوئے ہیں (بابت ۳ جون) حقیقت یہ ہے کہ مولانا غلام غوث ہزاروی مرفوع القلم ہو چکے ہیں۔ اُن کی زبان شریعت ترجمان سے کوئی دینی وجود محفوظ نہیں رہا۔ ہم ان سے یہ سوال کرنے کی تاب نہیں رکھتے کہ آپ کے میدان محشر میں کون شخص پاک دامن ہے؟ مولانا نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اسلام کے ساتھ جو سلوک کیا وہ لرزہ خیز ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی آپ کے حریم خیال میں شروع سے مجرم ہیں۔ آپ کے بس ہوتا تو آپ انہیں پھانسی دے چکے ہوتے

خدا کا شکر ہے کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو شہنشاہ جلال الدین اکبر نہیں ورنہ آپ کی ناک انگلی دونوں جاتے کیا گل کھلاتی۔ آپ نے انتخابات میں اپنے سوا دیوبند کے علماء کو رسوا کیا۔ حضرت مفتی محمود آپ کے ساتھی تھے اُن کا یہ جرم آپ کے نزدیک ناقابلِ معافی ہو گیا کہ وہ نیشنل پارٹی سے مل کر صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ہو گئے پھر اپوزیشن کی ہم نوائی میں عبدالولی خان کا ساتھ دیا۔ اب اگر حضرت مفتی صاحب بھی بددیانت ہیں تو ہم مولانا ہزاروی سے درخواست کریں گے کہ از راہِ کرم ہم گناہ گاروں کو علماء کی ایک ایسی فہرست مہیا کر دیں جو آپ کے نزدیک راست باز اور دیانت دار ہیں۔ فی الحال تو ہمیں آپ کی ذات کے سوا پورے ملک میں کوئی شخص ایماندار نظر نہیں آتا اور اگر اسلام کی نمائندگی آپ کرتے ہیں اور آپ ہی کے کردار و گفتار کا نام اسلام ہے تو ہم نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں یا شیخ العصر! اسلام کو دس ہزار سلام! آپ کے اسلام سے ہمارا کفر اچھا ہے۔ اُس شخص کی دوستی پر کون اعتبار کر سکتا ہے جو سیاسی اختلاف کی اساس پر اپنے اُن ساتھیوں کو بھی نہیں چھوڑتا جو عمر کا بہت بڑا حصہ جدوجہد اور ابتلاء کے زمانے میں اُس کے ہم سفر و ہم رفیق رہے ہیں۔ مولانا عمر کی آخری منزل میں ہیں۔ ہم اُن سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی باقی زندگی اللہ کی یاد میں گزاریں۔ یہ کوئی عمدہ چیز نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور عیب ہی عیب گوئی اور عیب جوئی کا پشتارہ لے کر حاضر ہوں۔

"عبدالقیوم خان بنام دفعہ ۱۴۴"

خان عبدالقیوم خان نے کراچی میں اپنی خود ساختہ لیگ کی کنونشن کے آخری اجلاس میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت ملک گیر پابندیوں کا غیر مختتم سلسلہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ اس طرح مختلف سیاسی جماعتوں کو عوام کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع مل سکے گا۔ باوجودیکہ ہم نے یہ خبر پڑھی تو ہمیں اعتبار کرنے میں توقف ہوا اور یہی خیال کیا کہ خبر رساں ایجنسی نے خان صاحب کا نام نامی و اسم گرامی غلطی سے سے کریڈٹ "CREED" کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خان صاحب اور شہری آزادی دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس طرح مولانا غلام غوث ہزاروی کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلام پر قائل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خان عبدالقیوم خان کی زبان اقتدار ترجمان سے شہری آزادیوں کا راگ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ اخباری روایت کے مطابق خان صاحب کی جماعت کو (اگر وہ کوئی جماعت ہو تو) کراچی میں جلسۂ عام کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو انہوں نے اپنی جماعت کے مخصوص چہروں کو خوش کرنے کے لئے پولیٹیکل میوزک اختیار کیا۔ دفعہ ۱۴۴ کا ہٹایا جانا فی الواقعہ شہری آزادیوں کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ایک ایسی حکومت جس کو عوام پر اعتماد ہو اس قسم کے سہارے نہیں لیتی۔ انگریزوں کے زمانے میں ملک کی بڑی بڑی تحریکیں طوفان کی شکل اختیار کر گئی تھیں لیکن انہوں نے اپنے اقتدار کے چل چلاؤ میں بھی دفعہ ۱۴۴ کا سہارا نہ لیا۔ یہ شرف قومی آزادی کے عہد اقتدار کو حاصل ہے کہ اس نے دفعہ ۱۴۴ کو جزو زندگی بنا رکھا ہے۔ لیکن خان عبدالقیوم خان دفعہ ۱۴۴ ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ع

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مولانا احتشام الحق تھانوی نے خط لکھا

چٹان کے پچھلے دو تین شماروں میں ہم نے مولانا احتشام الحق تھانوی سے گزارش کی تھی کہ وہ جس مسند پر فروکش ہیں اُس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کم سے کم اُن لوگوں سے حکومت کے اشارۂ ابرو پر معانقہ و مصافحہ نہ فرمائیں جو اپنی بد عقیدگی کے باعث صحابہ کرام کی شان میں بدزبانی کرتے ہیں۔ ہم نے واضح طور پر نصیر اجتہادی کا نام لیا تھا۔ مولانا احتشام الحق آجکل افریقہ میں ہیں۔ آپ نے ایڈیٹر چٹان کو وہاں سے ایک خط لکھا ہے جس میں نصیر اجتہادی کی بدگوئی کا اعتراف کیا ہے۔ ہم مولانا کا یہ نامہ گرامی آئندہ اشاعت میں درج کر رہے ہیں اور ان سے دوبارہ ملتمس ہیں کہ وہ نصیر اجتہادی سے تعاون کے مسئلہ پر نظرثانی کریں۔ اس کے سوا ہمیں اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

ریلوے مال برداری کا کرایہ

مسٹر ممتاز علی بھٹو نے ۲۰ جون کو ریلوے بجٹ پیش کرتے ہوئے مال برداری کے کرایہ میں ۱۵ فی صد اضافے کا اعلان کیا ہے۔ ہم نے بجٹ کا سرسری مطالعہ کیا ہے اور اجتماعی طور پر ہمارا خیال ہے کہ بجٹ غیر متوازن نہیں بلکہ مفید ہے۔ مسٹر ممتاز علی نے آئندہ مالی سال کے دوران ریلوے کے ترقیاتی پروگرام پر خرچ کرنے کے لئے ۴۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی ہے۔ اس سلسلے میں ریلوے ملازمین کو اقامتی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے دو کروڑ روپیہ ریزرو کیا گیا ہے۔ وزیر مواصلات نے یہ بھی بتایا ہے کہ بناسپتی گھی کی نقل و حمل کیلئے ۱۲۵ ویگن تیار کر لئے گئے ہیں۔ اسی ماہ بیس نئے الیکٹرک انجن بھی پاکستان لائے جا رہے ہیں۔ جن ریلوے ملازموں کی مدت ملازمت تین سال ہو چکی ہے انہیں مستقل کر دیا جائے گا۔ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا ہے کہ ریلوے میں مسافروں کے کھانے پینے کی گاڑیوں کا ٹھیکہ طویل عرصہ کے لئے دیا جائیگا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن جب تک ریلوے کی مشینری درست نہ ہوگی اُس وقت تک کوئی سا بھی عمل مفید نتائج نہ پیدا کر سکے گا۔

ہم سب سے پہلی چیز جس کی طرف وزیر مواصلات کی توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ مختلف ریلوے اسٹیشنوں،

باقی صفحہ ۳۴ پر

ہفت روزہ چٹان لاہور

خودی کا سلسلۂ گل

(۴) پیکار اور ابلیس

گزشتہ بحث سے پیکار کی بنیادی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ پیکار کی اہمیت اس میں ہے کہ اس میں مزاحمت و مخالفت کی صورتیں موجود ہیں مزاحمت پیکار کی روح ہے۔ جس قدر مزاحمت زیادہ ہوگی۔ پیکار بھی اتنی ہی شدید ہوگی اور اسی نسبت سے خودی کو اپنا جوہر دکھانے اور زندگی کو ترقی دینے کا موقع بھی زیادہ ملے گا یہ ایک ازلی قانون ہے اور فطرت میں ہر جگہ کارفرما ہے۔

خاص انسان کے تعلق میں دینی کتابوں میں (قرآن مجید میں بھی) آدم کے راستے میں مزاحمت پیدا کرنے والے ایک وجود کا ذکر آیا ہے۔ جس کے کئی نام ہیں۔ ابلیس، شیطان، خناس وغیرہ۔ ان میں دو اول الذکر زیادہ مشہور ہیں۔ کلام اقبال میں بھی ابلیس کو مزاحمت کے نمائندے کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور چونکہ فکر اقبال میں پیکار کی خاص اہمیت ہے اس لیے ابلیس کی بڑی اہمیت ہے۔

ابلیس کیا ہے؟ کون ہے؟ کہاں ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب مختلف دیئے گئے ہیں۔ دینی توجیہات کے مطابق ابلیس ایک باغی فرشتہ ہے۔ جس نے آدمؑ کی فضیلت تسلیم نہ کی اور خدا کی نافرمانی کے جرم میں ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہوگیا آدم کو جنت سے نکلوانے والا، گناہ پر آمادہ کرنے والا اور آدم کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اسے بہکانے والا ابلیس ہی تھا۔ اب وہ ہر لحظ انسان کے درپے رہتا اور اسے بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا ہے یہ اس کا مستقل مشغلہ ہے اور انسان کو حکم ہے کہ ہر وقت استغفار پڑھے اور اس کی گمراہیوں سے بچنے کی دعا کرتا رہے۔ گویا انسان کو اپنے اس حریف سے ہر لحظ جنگ درپیش ہے

فلسفیانہ انداز میں سوچنے والوں نے ابلیس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اسے زندگی کا ایک مظہر بلکہ ایک صفت قرار دیا ہے۔ ابلیس شر کی علامت ہے اور الگ ہستی نہیں بلکہ زندگی میں ہر جگہ خیر کے مقابلے میں مزاحمت پیدا کرنے والی قوت ہے جو نظام عالم کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے خیر ہی کی طرح ناگزیر ہے۔

بعض صوفیوں کے نزدیک ابلیس پکا موحد تھا اور یہ مصلحت ایزدی تھی کہ اس نے انکار اور استکبار کیا۔

معتزلہ (مسلمانوں کے مشہور عقل پسند گروہ) کے نزدیک یہ تخریب انگیز میلان کا نام ہے چنانچہ خود حدیث میں آیا ہے۔ کہ ہر آدمی کا شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے محی الدین ابن عربی نے کہا تھا کہ شیطان کی گردن مارنے کی ضرورت نہیں اسے مسلمان بنانے کی ضرورت ہے۔

بہرصورت ابلیس کے بارے میں بے شمار توجیہات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس بات کی موید ہے کہ ابلیس:

۱۔ مزاحمت کا نمایندہ ہے۔

۲۔ شر کا نمایندہ ہے۔

۳۔ انکار، نفی اور تشکیک کا نمائندہ ہے۔

۴۔ عقل محض کا نمایندہ ہے۔ (خدا سے اس کا مکالمہ (آدم کے باب میں) منطق کی پوری پوری نمایندگی کرتا ہے)

بعض حکمانے اسے مادیت کا نمائندہ بھی قرار دیا ہے اور موجودہ مغرب کے قول و عمل کے نقطہ نظر سے شاید درست بھی ہے مگر زیادہ وجدیہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کا بڑا کام نفی، تشکیک اور مزاحمت ہے خواہ یہ مزاحمت مادی اسباب سے ہو یا محض فکر و استدلال سے یا ترغیب سے یا وسوسہ اندازی سے۔ بہرحال مزاحمت اس کا کام ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کو ابلیس کے کردار میں کشش محسوس ہوئی ہے۔ چنانچہ قدیم اطالوی شاعر ڈانٹے نے اپنی کتاب ڈیوائن کامیڈی میں، انگریز شاعر ملٹن نے اپنی نظم میں اور جرمن شاعر گوئٹے نے اپنے منظوم ڈرامے میں ابلیس کی تصویر پیش کی ہے جس سے ابلیس کے کردار کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

اقبال نے متعدد نظموں میں (خصوصاً فارسی جاوید نامہ میں) ابلیس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے

باقی صفحہ ۳۲ پر

ہندوستانی سیاست کے سربستہ راز

ہندوستان کے سبکدوش کمانڈر انچیف مانک شا کی زبانی

- **بنگلہ دیش میں مکتی باہنی کہاں سے آئی ؟**

- **میں نے اپنی زندگی میں دو عورتوں کا حکم مانا ہے، ایک اپنی بیوی دوسری اندرا گاندھی (فیلڈ مارشل مانک شا)**

ہندوستان کے ہفتہ وار "نئی دنیا" دہلی نے ۱۹ مئی کے شمارہ میں صفحہ اوّل پر فیلڈ مارشل مانک شا سے متعلق ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ وہ آجکل تامل ناڈو میں کنور سے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنی سبکدوش زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور کسی کتاب کے عنوان سے ان تمام رازہائے سربستہ کو ٹیپ ریکارڈ کرا رہے ہیں جو ان کے سینہ میں ہندوستانی سیاست کے مخفی راز کی حیثیت میں محفوظ ہیں۔ مانک شا کے متعلق اس اخبار کی روایت کے مطابق یہ حکایت ہے کہ ہندوستان سے کشمیر کے "الحاق" میں انہی نے اہم رول ادا کیا تھا اور اس زمانہ کے بہت سے راز اُن کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۷ء میں بھارتی بنگال کی حکومت مارکس وادی کمیونسٹوں نے بعض دوسرے عناصر سے مل کر قائم کی تو اس حکومت کو ختم کرنے کے لیے کیا پلٹ گئی تھی ... مانک شا اس سلسلہ میں بعض انتہائی پردہ حقائق کو جانتے اور ان کی چھپا شائع کیا جا سکتے ہیں۔ مانک شا نے ایک جریدہ ہفت روزہ چٹان لاہور سے انٹرویو میں کہا ہے کہ ان کا ٹیپ ریکارڈ جب کتاب کی شکل میں چھپ کر دنیا کے سامنے آجائے گا تو معلوم ہوگا کہ مکتی باہنی کیا تھی؟ اس میں کون لوگ شامل تھے؟ اور بنگلہ دیش کی پیدائش میں اس کا رول کیا تھا؟

واضح رہے کہ مانک شا نے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو اپنی کمان میں حاصل کیا تھا۔ وہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک مشرقی کمان کے کمانڈر رہے پھر ہندوستان کے کمانڈر انچیف ہو گئے اور بنگلہ دیش قائم ہو جانے کے باعث انہوں نے ہندوستانی عوام میں خاصی شہرت پائی۔ انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز پدم بھوشن دیا گیا۔ وہ شاید پہلے بھارتی جرنیل تھے جنہیں فیلڈ مارشل بنایا گیا۔ وہ عقیدۃً پارسی ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۱ سال ہے۔ ان کا پورا نام

ہرمس جی افرام جی جشید جی مانک شا ہے

ان کے متعلق خیال تھا کہ اندرا گاندھی نے اپنے ایک بڑے معتمد کی حیثیت سے انہیں اعزازات سے نوازا۔ اور خیال تھا کہ وہ پس پردہ رہ کر ہندوستانی سیاست میں اہم کردار ادا کریں گے لیکن جب انہیں یکایک سبکدوش کر دیا گیا تو وہ خود ششدر رہ گئے۔ انہوں نے نئی دنیا کی روایت کے مطابق بعض لیڈروں کے چہروں سے نقاب اٹھانے کا نجی محفلوں میں ذکر شروع کیا۔

مانک شا کی دو لڑکیاں ہندوستان سے باہر رہتی ہیں۔ وہ اپنے باپ کے ٹیپ ریکارڈ کو کتابی شکل میں شائع کرائیں گی جنہیں "نئی دنیا" صفحہ اوّل کے اس مضمون میں لکھتا ہے کہ:

> "ہندوستان میں جو کرپشن اور بدعنوانی ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے صرف سرکاری افسر ہی نہیں بلکہ گاندھی واری لیڈر بھی رشوت لیتے ہیں اور یہ رشوت صرف نوٹوں کی شکل ہی میں نہیں بلکہ شراب کی بوتلوں اور خوبصورت لڑکیوں کی شکل میں بھی لی جاتی ہے۔ اخبار ان سے صرف اس لئے پردہ نہیں اٹھاتے کہ وہ سرمایہ داروں کے تصرف میں ہیں"

امریکہ کا رسوائے عالم ادارہ ——— سی، آئی، اے

- وزیروں اور افسروں کی خرید و فروخت کس طرح کرتا ہے
- مختلف ملکوں میں چھ ہزار آدمی اس کے ایجنٹ ہیں

۲

اور چھوٹے اخبارات زبان کھولنے کی جرأت کریں تو ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جب انتخابات ہوتے ہیں تو عوام سب سے زیادہ بدعنوان، عیاش اور شیطان صفت افراد کو ووٹ دیتے ہیں۔"

اخبار مذکور شاکی ہے کہ ملک میں کسی عیاش، بدعنوان اور کرپٹ کے لئے کوئی سزا نہیں، اس کے برعکس انگلستان میں وزیر اعظم میکملن کے وزیر جنگ پرفیومو کو کرسٹائن کیلر نام کی ایک طوائف سے تعلقات کے باعث الگ ہونا پڑا۔ اور خود میکملن مستعفی ہو گئے۔ امریکہ کے ایک نائب صدر اگینو نے صرف اس بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا کہ اس نے کافی عرصہ قبل ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔

مانک شا اپنے بارے میں عند الملاقات معتمد ملاقاتیوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ "ہندوستانی سیاست کے بے شمار پیچیدہ رازوں سے واقف ہیں، انہیں ایسے ہندوستانی واشگٹن کا علم ہے کہ اگر ان سے پردہ اٹھایا گیا تو صرف ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔"

مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی نے جو کچھ کیا وہ تو ظاہر ہے لیکن ابھی تک مکتی باہنی کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیونکر تیار ہوئی اور اس کے ارکان کا بیشتر حصہ کہاں سے تھا۔ مانک شا کے اشارات سے

ایک حد تک سراغ ملتا ہے کہ مکتی باہنی کے "افراد" ہندوستان کے شہری تھے۔

مانک شا راوی ہیں کہ جب اول اول کشمیر پر ہندوستان نے قبضہ کیا تو اس کے کاغذات اس وقت کے سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر وی پی مینن کے ساتھ لے کر وہ سری نگر پہنچے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے دستخط حاصل کئے تھے مگر اس سلسلہ میں کئی ایک راز زبان زد عوام ہیں لیکن ابھی بہت سے راز ان کے سینہ ہی میں ہیں۔

مانک شا کہتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں صرف دو عورتوں کا حکم مانا ہے۔ ایک اپنی بیوی کا، دوسرا وزیر اعظم اندرا گاندھی کا۔ ان کے علاوہ ان کی زندگی میں دوسری کوئی عورت دخیل نہیں ہے۔

اخبار مذکور نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ ٹیپ ریکارڈ کب مکمل ہو گا اور وہ کتاب کہاں چھپے گی؟ اور کب تک چھپے گی؟ بہرحال اس کتاب کے مندرجات کا دلچسپی سے انتظار رہے گا۔

امریکہ کے مشہور ادارہ سی آئی اے کے متعلق خود امریکی روزنامہ نیویارک ٹائمز نے لکھا ہے کہ سی آئی اے کی سرگرمیوں کا ذریعہ مختلف ملکوں میں امریکہ کی تجارتی فرمیں اور ان کے ذرائع ہیں۔ ان فرموں کے بزنس

ایگزیکٹو، سیکرٹری اور دیگر افسران سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔ ان کمپنیوں کے عہدیدار متعلقہ حکومتوں کے اعلیٰ عہدیداروں کو بڑی بڑی رقوم دے کر ان سے راز حاصل کرتے۔ ان سے ملی بھگت کر کے اور امریکی مصنوعات کی خریداری کے لیے آرڈر حاصل کرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک ان کمپنیوں کی معرفت سی آئی اے کی کارگزاریوں میں حصہ لیتے اور مصنوعات کے علاوہ اسلحہ تک خریدتے ہیں۔

نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق مختلف امریکی کمپنیوں میں ۲ سو سی آئی اے کے ایجنٹ اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں اور غیر ممالک میں مختلف کاموں کے لیے سی آئی اے کے چھ ہزار مقامی افراد ہیں۔ ہندوستان میں ۴۰ امریکی کمپنیاں ہیں۔ یہ کمپنیاں بڑے بڑے عہدیداروں کی مختلف واسطوں سے خرید و فروخت کرتی ہیں اور مختلف سیاسی پارٹیوں کو چندے دے کر حکومت اور پارلیمنٹ میں دخل انداز ہوتی ہیں۔ ان کمپنیوں کا ایک کام یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے عہدیداروں کو شراب سپلائی کرتیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹلوں میں رنگین پارٹیاں دے کر حصول مقصد کرتی ہیں اور جب افسر اعلیٰ ملک سے باہر جاتے ہیں تو ان کی خاطر مدارات کرتی ہیں۔

عبدالعزیز خالد "انسان کامل کی تلاش میں"

عبدالعزیز خالد کا شمار بجا طور پر اُردو زبان کے ان عظیم شاعروں میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اردو شاعری کو نئے معانی دیئے۔ اسے ایک انوکھے اسلوب بیان سے بہرہ مند کیا۔ اس کے ذخیرہ الفاظ میں نہ صرف دنیا کی مشہور زبانوں کی نادر تعبیرات اور کلمات کو سمویا بلکہ ان کے لازوال گنج ہائے معانی کو بھی منتقل کر دیا۔

عبدالعزیز خالد کا ہر نیا مجموعہ کلام اردو پڑھنے والوں کے سامنے فکر و فن اور حروف و معانی کا ایک نیا جہان وا کرتا ہے۔ اس کی نظر لا انتہا وسیع بھی ہے اور بے حد عمیق بھی۔ وہ دنیا کے سب ادبی و فکری شہ پاروں پر عبور رکھتا ہے۔ ان سے انمول موتی چنتا اور انہیں بڑے سلیقے سے سجا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ پورے عالمی ادب کے سمندر کا شناور ہے اور اس کے مطالعہ کی کوئی حد نہیں۔ اس کو مشرق اور مغرب کے ادب پارے ازبر ہیں اور جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اس کے فکر خلاق کے رُوبرو حاضر ہیں۔ چنانچہ خالد کی شاعری کا مزاج اور لہجہ خالصتاً انسانی اور روحانی ہے اور اس کی اساس ان آفاقی صحیفوں اور عظیم دانشوروں کے افکار پر قائم ہے جو قرنہا قرن سے فکر انسانی کو متاثر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر خالد کا طائر تخیل ان فضاؤں میں محو پرواز ہے جہاں صرف معدودے چند انسانوں ہی کی رسائی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد کی شاعری میں فلسفہ و حکمت، تاریخ و تہذیب اور علم و فن کے [illegible] نشیب و فراز کے واضح اشارے ہی نہیں ملتے بلکہ جہاں گزران کی شاخ در شاخ پھیلی ہوئی داستان بھی ملتی ہے۔ القصہ تاریخ و تہذیب کی اس گم شدہ میراث اور انسان کامل کی جستجو میں وہ ہر اس مقام فکر و دانش سے گزرتے ہیں جہاں تک اُن کی ذہنی رسائی اور قلبی واردات انہیں لے جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ خالد کی زندگی علامہ اقبال کی مانند "کبھی سوز و ساز رومی" اور کبھی "پیچ و تاب رازی" کی کشمکش سے نہ گزری ہو۔ مگر میں یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ بحیثیت مجموعی ان کے کلام پر علامہ اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

خالد کی شاعری اردو شاعری کے کسی روایتی ادبی دبستان کی پابند نہیں اس نے ایک ایسے انداز نگارش کی بنیاد رکھی ہے۔ جس نے اردو زبان کے دامن کو ان زبانوں جو کلاسیکی ادب کی حامل ہیں کے اسلوبوں سے ہم کنار کر دیا ہے۔

شاعری کے باب میں خالد کی اس کاوش فکر اور طرز سخن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو بحیثیت ایک زندہ زبان کے بلاشبہ عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور ہندی کے ہم سر اور ہم پلہ ہی نہیں بلکہ اپنے اندر دیگر زبانوں کے الفاظ کو سمونے کی کشش بھی رکھتی ہے اور کشادگی بھی۔ اور اب یہ کام قلم کاروں کا ہے کہ وہ اس اثاثہ بیان کو کس قدر معقول بناتے ہیں۔

خالد اپنی شاعری کا ناطہ اس قدیم شاعرہ سے جوڑتے ہیں جسے سقراط نے "حسین سیفو" کے نام سے پکارا تھا اور تونیس لارشیس نے یہ کہہ کر زندہ جاوید بنا دیا کہ "متی لین کی مغنیہ کو مُردہ نہ کہو"۔ ایسا کوئی دن طلوع نہ ہوگا جس میں نغمہ ریز سیفو کا نام روشن نہ ہو"

عظیم سیفو کے بارے میں اس حوالے سے خالد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کائنات میں وہ عظیم ترین ہستی کون ہے جس کی آمد سے دنیا کی تاریکی چھٹی اور ہر سو روشنی پھیل گئی۔ خالد اس عظیم المرتبت شخصیت کی تلاش میں نکلتا ہے جو جمیل و جلیل بھی ہے اور حلیم و بشیر بھی اور جس کی پاکیزگی کی قسم خود خالق کائنات نے کھائی ہے۔ اس محترم و مقدس وجود کی تلاش میں خالد آسمانی صحیفوں کی ورق گردانی کرتا ہے جو انبیاء کرام کی وساطت سے نسل انسانی کو پہنچے۔ وہ یونانی حکما اور فلاسفہ کے افکار سے ستاروں کی گزرگاہوں میں اس انسان کامل کے نقش پا کو تلاش کرتا ہے۔ جس کے لئے کائنات معرض وجود میں آئی۔ وہ کتاب مقدس میں نغمہ سلیمان سے متاثر ہوتے ہوئے اس انسان کامل کو ڈھونڈ نکالتا ہے جس کی پیشوائی کے لیے ایک عظیم انسان مصلوب ہو گیا تھا۔ چنانچہ "فارقلیط" کا لفظ نشان منزل بن کر اس کے فکری سفر کی سمت رسول صلعم کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو اسی انسان کامل کے بارے پیشین گوئی ہے جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا۔ وہ اس بات پر نازاں و شاداں ہو جاتا ہے کہ اس کے وجود کا تعلق اور رشتہ بھی اسی عظیم المرتبت انسان کی اُمت سے ہے اور یہ احساس اس کے عقیدے کو اور مضبوط [illegible]

ہاں مجروح وشکستہ روح کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ

میں فرش نشیں ہوں تو مستند کلام ہے

میں سانسوں کا مجمع ہوں تو عروج ہوا ہے

شہنشاہ ارلاک و مولا ئے مورد

ترے میرے تخیل سے بھی ماورا ہے

خالد نے یہ سب کچھ اپنی فکری کاوشوں اور عملی تگ و دو سے حاصل کیا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت سیرت اور افکار عالیہ کے حوالوں سے اپنے اشعار کو سنوارنے اور نکھارنے کا بیڑا اٹھایا مگر اسے اسی بات کا کامل احساس ہے کہ

کہاں نعت و نام رسول تہامی

کہاں وہ زبان جو کہ لکنت زدہ ہے

خالد کی شاعری کا سب سے بڑا کمال جو بعض کے نزدیک اس کا عیب ہے۔ اس کے نئے اور دقیق غیر مانوس الفاظ کا سیلاب اور زور بیان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہاں قلم سے الفاظ فوارے کی طرح پھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور شعر میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ ایسے سجتے ہیں جیسے

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اردو شاعری میں اس کی مثال مرزا غالب، علامہ اقبال، ظفر علی خان اور جوش ملیح آبادی کے کلام میں ملتی ہے اور اردو نثر میں اس قسم کے انداز تحریر کے مالک مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جو اردو کے چند جملے ہی لکھ پاتے ہیں کہ فارسی اور عربی کا ہم معنی شعر یا جملہ سامنے آ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ عربی ترکیب یا فارسی شعر کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے اہل قلم کا فارسی اور دیگر علوم کا وسیع مطالعہ ان کے دماغ میں اس قدر رچ بس گیا ہوتا ہے اور وہ ان زبانوں اور مختلف مضامین پر اس قدر حاوی ہو چکے ہوتے ہیں کہ انہیں یہ تخصیص نہیں رہتی کہ یہ لفظ کس زبان کے قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور یہی ان کی قادر الکلامی کی دلیل اور زبان اردو کی عظمت ہے۔

اور نئے فن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ ان کا قاری کس ذہنی یا علمی سطح کا مالک ہے۔ وہ تو دریا کی اپنی موج کی طرح "نیوٹن کے کام" کی مانند آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں نہ تو مسلک کی پرواہ ہوتی ہے نہ تنقید کا خوف اور نہ ستائش کی تمنا!

خالد اور ابوالکلام آزاد میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ عظمت رفتہ کی یاد ہے۔ دونوں نے غیر معمولی حافظہ پایا ہے۔ دونوں نے اپنے ہم جماعتوں اور اساتذہ کرام کو متاثر کیا اور ان سے بہت آگے نکل گئے۔ اس ضمن میں مولانا آزاد لکھتے ہیں

"میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔"

(غبار خاطر)

اور خالد لکھتے ہیں کہ جب میں نے پانچ جماعت میں

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کی تشریح کی تو ڈویژنل انسپکٹر سکول کرنے کا بھی چاہتا ہے اس لڑکے کو ڈبیا میں بند کر کے جیب میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔

(نئی تحریریں)

اور کسے خبر تھی کہ ایک دن وہی بچہ آسمان علم و ادب پر مہ درخشاں بن کر چمکے گا اور انسان کامل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و رفعت اور شان و شوکت پر ایسے قطعات و رباعیات اور منظومات لکھے گا جو رہتی دنیا تک زندہ جاوید رہیں گی اور اس بات کا خود خالد کو بھی احساس اور یقین ہے کیونکہ وہ برملا کہتا ہے کہ:

خالد، ملک الکلام خالد

مشہور انام، نام اس کا

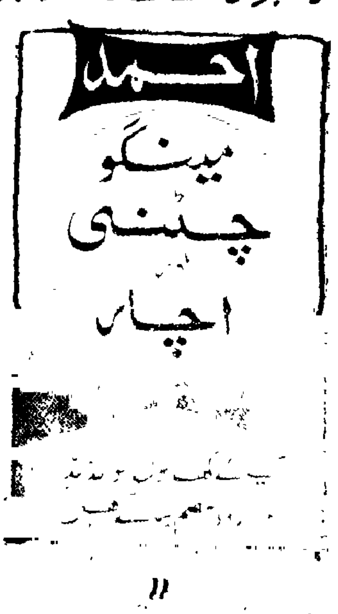
(پاکستان نیشنل سنٹر لاہور میں پڑھا گیا)

بشکریہ روزنامہ چٹان لاہور

رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

پس چہ باید کرد

شہر لاہور میں ہفتۂ گزشتہ، بند قبائے تعزیرات پاکستان سے دفعہ ۱۴۴۔ الف کے یوں اُبھرنے کے "آٹو ڈون" کا مجموعہ تھا۔ جیسے کسی ناکتخدا زیرِ نظر مفلوک الحال مجبور دبے بس کا سولہ سال پندرہ سالہ تاریکیوں کا منہ چڑھا رہا ہو، جیسے کوئی فرہاد، کوئی مایوسِ وفائے شیریں، جوئے شیر ترسیدہ کو پتھروں سے الٹ رہا ہو۔ کہ گدایانِ مہر و وفا کے لیے شاہراہِ عظمت جبر و ستم تعمیر کی جا سکے۔ کوئی مؤذن سحر کسی مخمورِ شب کے ہوش میں آ جانے کا اعلان کر رہا ہو۔ جیسے کوئی زنّار پوش صراحیِ مئے شبانہ سے ٹپکتے ہوئے قطروں پر شکست اپنے رشتۂ تسبیحِ شیخ کا شمار کر رہا ہو، جیسے کوئی عیاش عوضانۂ مستیِ شب سے منکر اپنی تمام تر عیاری کو مجتمع کیے بہانۂ خوب تر کی تلاش میں کسی کا فردا کو بہشت بریں میں زندگیِ اُخروی کی آسائشوں سے لطف اندوز خیالی و لفظی تصویر دکھا رہا ہو۔ جیسے کوئی زن گزیدہ مادرِ متوفیہ کے اوصاف بیان کر رہا ہو، جیسے کوئی بیٹی بھائی جن رہی ہو، بہو کے ہاں دیور جنم لے رہا ہو، جیسے کسی جہانگیر کو انصاف کی زنجیر سے بندھی ہوئی گھنٹی سے انارکلی کی پازیب کی جھنکار سنائی دے رہی ہو۔ جیسے کسی نے کعبۂ دل میں خانۂ بوجہل کا چراغ لا جلایا ہو۔ جیسے اشاعتِ قناعت ابولہب کے پاؤں چوم رہے ہوں۔ جیسے موسیٰؑ و فرعون ایک ہی حمام میں غسل کر رہے ہوں، جیسے بارالعوام میں رقصِ جام کو مزید دلکش بنانے کے لیے غوّاص نے اندوہناک دُھنیں چھیڑ دی ہوں۔ جیسے خانۂ عزیز میں زُہدِ حسنِ یوسف سے انتقام لینے کے لیے زلیخا نے اپنا کرتۂ عصیاں پوش کا دامن پیش چاک کر لیا ہو۔ جیسے کوئی لقمان اپنے بیٹے کو ایف۔ ایس۔ ایف میں بھرتی کروا رہا ہو۔ جیسے قافلۂ حسین حسین بتوسطِ شمر معاہدۂ فروری میں ترامیم پیش کر رہا ہو۔ جیسے انتباہ شاہ فیصل ذریت اسرائیل سے مذاکراتِ امن نبھا رہا ہو، جیسے خانۂ لوطؑ کے باہر آلِ لوطؑ فرشتوں کے خروج کی منتظر ہو۔ جیسے دزدِ عوام سے شہری آزادیوں کی ضمانت مانگی جا رہی ہو۔ مقام حیرت ہے کہ اس مادر پدر آزاد اور پسر تمام کنندہ شاہ نواز معاشرہ میں بھی اہلِ دانش کو شکوہ ہے کہ انہیں شہری آزادیاں درکار ہیں۔ ان فرنگی اسلام کے شیدائیوں سے قلم تو ہر یاں خیال میں بھی گرم حمام کے ننگے دن کی، پھر اس نکلنے کے لیے آزادیِ اجماع



کو اپنے معیار کے مطابق خیال نہیں کرتے انہیں بھی یہ گلا ہے کہ شاہ کے ہاں سے بخشی روٹی کے حصول سے پیشتر ہی جو قصیدے ان نے رقم کر رکھے تھے انہیں بہ آوازِ مترنم سنانے پر کوئی قدغن موجود ہے ان کی "تو سلامت رہے ہزار برس" کی لوریاں ادھوری رہ گئی ہیں ان کا جو گنبد "موثر ہے ذوالفقار علی خان کا کیا خموشی کے مصرعہ کو بہ بانگِ دہل بانگ صدا قرار نہیں دے سکتا" تیرا بندہ پھرے ننگا تیرا نوکر اور کھائے ادھار" دوہرا کر امپورٹ لائسنس یافتہ اپنے فکر ہائے حرص و آز آلود کی تشہیر کرنے سے قاصر ہے۔ احسان اللہ کا یہ مظہر بظاہر منکر اور بہ باطن تکبیر ہونے کے باوجود ابھی تک منت کش عطائے استقلال ہے یہ فکر تو انہیں ہونے چاہیے جو جانتے ہیں کہ انسان پر انسان کی حکومت کے نظام کی شریعت کا بنیادی اصول ہی انسانی آزادیوں پر مضبوط و مستحکم قدغن ہے۔ اللہ کی حاکمیت سے انکار انسانی آزادیوں کے گرد ایسے حصار لا کھڑے کرتا ہے کہ ان میں آج تک نہ کوئی ناطق برآمد ہوا ہے، نہ بینا نہ بے حسی، بے شعوری اور بے نظمی و بد اسلوبی ان مضبوط حلقوں کا دستور اندرون ہے اور بے حیائی، بے فکری۔ بے لگامی، دہشت پسندی عدم رواداری، لاقانونیت و عدم تحفظ ان کی

عبدالعزیز خالد

نازش شعر و ادب ہے عظمت پنجاب ہے
اس کی ہستی سربسر مہر و وفا کا باب ہے

اس کی پیشانی سے اس کے دل کے جلوے آشکار
اس کے الفاظ و معانی ہیں بہار اندر بہار

صاحب فکر و قلم بھی صاحب اخلاق بھی
زندگی میں سوز بھی ادراک میں اعماق بھی

ہے بلند اس کا تخیل اور جواں اس کا قلم
ہر زمین شعر میں دیکھا رواں اس کا قلم

صرف گردش اس کے ابلاغ جنوں کا جام ہے
ہے یہ خوش کردار اس کی روح میں اسلام ہے

اپنے کار منصبی میں کامگار و کامیاب
شاعری ہے اس کی صنعت، اس کا سرمایہ کتاب

ایک اعلیٰ منصرم ہے ایک دانا آدمی
مدتوں میں یہ زمیں دیتی ہے ایسا آدمی

احسان دانش

ہدایت ہیں۔ نہ بندوں کے عقول اور تجربات ان سے بہتر کسی تہذیب کا سرمایہ نہیں کہلا سکتے۔ شہری آزادی اس درویش کے نزدیک بندے کے ذمے اللہ کے لگائے ہوئے فرائض کو بلا رکاوٹ بجا لانے کی آزادی کا ترکیبی مختلف نام اور بندے کو حق ہے کہ وہ اہلیان اقتدار وغیرہ سے مطالبہ کرے کہ اُسے ان افعال روکنے کے لیے جو ایسی نظام میں دائرۂ نہی میں آتے ہیں۔ قوانین وضع کروائے۔ ان پر عمل کروائے اور میزان جزا و سزا مقرر کرے۔ کسی انسانی حاکم قانون، برادری یا معاشرہ کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی انسان کو احکام الٰہی کی بجا آوری سے منع کرے اور اس سلسلہ میں اس کی تقریر و تحریر و عمل پر کوئی قدغن لگائے۔ اسلامی آئین و قانون میں شہری آزادیوں کا معیار روما کی نشان دہی کرتے ہوئے اور دیگر مکاتیب فکر سے ادھار لیے ہوئے آئین و قانون کے معیار سے بہت بلند و بالا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر وہ کیفیت، فرائض کے زمرے میں آتی ہے، جسے انسانی عقل کی بھٹکائی ہوئی دانش انسانی حقوق کہہ کر پکارتی ہے، یہ مفروضہ کہ فرائض و حقوق متوازی مدارج رکھتے ہیں۔ انتہائے حماقت در ماریت ہے حقیقت یہ ہے کہ ادائیگی فرض ابتدائے افعال انسانی ہے۔ اور حقوق ان کی تکمیل کامیاب کے بعد عطا شدہ انعام کے اصول دائرہ کار کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مادر پدر آزادی کی کیفیت میں حقوق انسانی کی شکل قطعی مسخ ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ درویش "ناخدایان خرد" سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اُسے آزادی کے ساتھ بلا رد و کد اپنے فرائض ادا کرنے دو اور وہ تمہیں حق حکمرانی دیتا ہے حق حاکمیت نہیں کہ حاکمیت کسی اور کی ہے۔ اس کے اور اس کے اللہ کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے

ڈنڈے نہ لہراؤ۔ اپنی طاقت و مقبولیت کی بڑ نہ ہانکو، زور سے نہ دہاڑو۔ کہ یہ ملک ہے چڑیا گھر یا جنگل نہیں۔ چلاؤ نہیں، یہ سرزمین وطن ہے اصطبل نہیں۔ اور تم کوئی سانڈ نہیں چیتے نہیں۔ بھیڑیے نہیں۔ ہاں! ہاں! کلمۂ حق میرا فرض ہے اور ادائے فرض مجھ پر لازم ہے۔ بلا جبر سے غیرے ادا کرا ہے اور بعد از ادائے کلمۃ الحق سنو۔ مجھے اس ہوائی جہاز کی قسم جو پستیوں کو بلندیوں پر لے جاتا اور پھر بلندیوں سے پستیاں وارد کرواتا ہے۔ اُس ہیلی کاپٹر کی سوگند، جس سے اتر کر ہر جب فرنگ بے نکلی اور لغو عبادت مصرعۂ غالب معلوم ہوتی ہے۔ ان جگنوؤں کی قسم جن میں بغرض فائع

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

"پاکستان کی واحد سرکاری زبان اُردو ہوگی"

قائد اعظمؒ

خطبہ استقبالیہ جو ملک محمد الطاف نائب صدر مرکزی انجمن نوائے اسلام پاکستان نے قومی زبان کانفرنس (زیر اہتمام انجمن نوائے اسلام سیالکوٹ منعقدہ ۲۴، ۲۵ مئی ۱۹۷۵ء) کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا۔

مکرم و معظم ڈاکٹر صاحب

ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت پر اس اردو کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی اور ہمارے شہر میں تشریف لائے۔ ان سے انجمن نوائے اسلام کے کارپردازوں کے علاوہ شہر اقبال (سیالکوٹ) کے سب لوگوں کو خوشی ہوئی ہے اور فخر محسوس کیا ہے۔ آپ ہمارا شکریہ قبول کریں۔

ہم نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ یہاں تشریف لا کر قومی زبان اردو کے سلسلے میں ہماری راہ نمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ ہم اپنی حد تک اپنے علاقے میں قومی زبان کی کس طرح خدمت بجا لائیں۔

جناب والا ہم سمجھتے ہیں کہ سیالکوٹ کو شہر اقبال ہونے کی وجہ سے یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ یہ قومی زبان کا مرکز بلکہ قلعہ ہو ——— علامہ اقبال جو ہمارے شہر کے قابل فخر سپوت تھے اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اب اگر گیسوئے اُردو کو سنوارنے کا کام شہر سیالکوٹ اپنے ذمے لے لے تو بالکل بجا بات ہوگی۔

آپ کو معلوم ہوگا سیالکوٹ کھیلوں کے سامان کی تجارت کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ مگر قدرت کے کھیل دیکھئے کہ گذشتہ تاریخ میں اس شہر کے فرزندوں نے علم کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ سے بڑھ کر کس کو علم ہوگا۔ اب اس شہر کے لوگوں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنے پیشوا اور راہ نما اقبال کی نصیحت اور وصیت کو پورا کریں اور دنیا کو دکھا دیں کہ اس بستی کی مٹی میں بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس علاقہ کا بچہ بچہ اُردو کی خدمت کے لئے سرگرم ہی نہیں سربکف بھی رہےگا۔

آپ اس سلسلے میں جو حکم دیں گے ہم اس پر عمل کر کے دکھا دیں گے۔

پاکستان میں اُردو کے مسائل کیا ہیں ہم ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے ان کے متعلق رہنمائی کرنا آپ کا کام ہے ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ کا جو حکم ہوگا ہم اسے بجا لائیں گے۔

ہمیں اتنا معلوم ہے کہ قائد اعظم نے صاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ

"پاکستان کی واحد سرکاری زبان اُردو ہوگی"

افسوس ہے کہ پاکستان کے ایک حصے کے لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا، اس کا جو نتیجہ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ پاکستان کے لوگ اس سے سبق سیکھیں گے اور اُردو جیسی نعمت کی قدر کریں گے

ہمارے ملک میں انگریزی کا عاشق طبقہ بھی ہے جو اُردو کو کمزور کرنے کے درپے رہتا ہے۔ ہم لوگ یوں سوچتے ہیں کہ انگریزی سے ایک خاص حد تک فائدہ اٹھایا جائے لیکن انگریزی کو ملک کی بادشاہ زبان نہ بنایا جائے۔

ہم لوگ اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ بے ضرورت باتوں میں انگریزی کے رواج کو کم کیا جائے۔ سائن بورڈ اردو میں لکھوائے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے کاروبار میں اردو ہی سے کام لیں۔ اس کے علاوہ بھی جو پروگرام تجویز ہوگا ہم اس پر عمل کریں گے۔ صرف آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہماری رہنمائی کے لئے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں۔

★

قومی زبان کانفرنس سیالکوٹ

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ناظم انجمن ترقی اردو لاہور

صدر استقبالیہ، خواتین و حضرات!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے دعوت دے کر شہر اقبال کی زیارت کا موقع دیا یہ وہ شہر ہے کہ اس کی ہر گلی کی خاک سرمۂ چشم عارفاں ہے۔ علامہ عبدالحکیم سے لے کر محمد علی سائح تک روشن ضمیروں کی ایک قطار ہے جو دانش و بینش کے ایوان میں بہ صد تمکنت جلوہ فرما ہے۔ اور جب انقلاب زمانہ نے شوکت و سلطنت اسلامی کی بساط الٹ ڈالی اور ملک بھر میں علوم و فن کے مکتب ویران ہو گئے تو سیالکوٹ پھر بھی آباد رہا۔ اس کے آسمان پر میر حسن اور ابراہیم میر جیسے آفتاب علم چمکے اور ایک ستارہ جو اپنی ذات میں آفتاب فیض ہے۔ اب بھی آسمان فضیلت پر ضوفگن ہے۔ اور ان چند ناموں پر کیا منحصر ہے یوں تو اس ملک کے جس شخص میں ذہانت نظر آتی ہے کوید نے پر وہ اکثر سیالکوٹی نکلتا ہے۔

تو ایسے شہر دلبری میں آپ نے مجھے بلا کر بڑا احسان کیا ہے۔ ان گلیوں کو دیکھنے سے عمر بھر کی آرزو پوری ہوئی۔ چنانچہ میں بھی شمس تبریز کا ہم نوا ہو کر نغمہ سرا ہوتا ہوں:

ساربانا بار بکشا ز اشتراں
شہر تبریز است و کوئے دلبراں

خواتین و حضرات۔ اب دلبروں کی باتیں چھوڑ کر کچھ ہمسروں کی باتیں کرنے دیجئے۔ پہلی گزارش یہ ہے کہ محترم عبدالحفیظ کھوکھر قول کے بڑے پکے نکلے۔ انہوں نے قومی زبان کانفرنس راولپنڈی کے موقع پر اپنے شہر میں کانفرنس منانے رچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ آج پورا ہو رہا ہے۔ اگر اس ملک میں ان جیسے چار پانچ اور مستقل مزاج اور اولوالعزم حضرات نکل آئیں تو قوم کے بہت سے فراموش شدہ اور بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔ مجھے نوائے اسلام پاکستان کے کارکنوں کی یہ خو پسند آئی ہے کہ ان میں وفاداری بھی ہے اور استواری بھی، اور قابل صد ستائش امر یہ ہے کہ وسائل کی کمی کے باوجود کانفرنس جیسی مشکل مہم سے یہ اہل ہمت بکمال سرخروئی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کا شکر گزار بھی ہوں۔

حضرات! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ہر کانفرنس کے موقع پر کوئی نہ کوئی مژدہ سنانے کے قابل ہو جاتا ہوں۔ ابھی دو ماہ قبل میں نے راولپنڈی میں یہ اچھی خبر سنائی تھی کہ کاروباری اور تجارتی حلقوں میں اردو پہلے سے زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ اور ایک اطلاع لندن سے یہ آئی تھی کہ انگلستان میں انگریزی کے بعد سب سے زیادہ جو غیر ملکی زبان مقبول اور رائج ہے۔ وہ اردو ہے، اسی طرح عرب اور سواحلی علاقوں میں ایشیائی لوگ مقامی زبانوں کے بعد سب سے زیادہ کام اردو سے لیتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اردو کی علمی کتابوں سے اب مغرب کے لوگ استفادہ کرنے لگے ہیں۔

یہ سب خوش خبریاں پنڈی میں سنا چکا ہوں۔ اب اس اردو کانفرنس سیالکوٹ کے لیے بھی میں ایک نئی خوش خبری لایا ہوں جو اگرچہ بالکل تازہ نہیں پھر بھی خاصی تازہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ پنجاب کی صوبائی کابینہ کے ایک فیصلے کے مطابق تمام سرکاری محکمے خاص طور سے بلدیاتی ادارے، محکمہ اوقاف اور عام نظم و نسق کے شعبہ شکایات وغیرہ اپنا سارا کام اردو میں انجام دیا کریں گے۔ پبلک کی طرف سے آنے والے تمام خطوط کے جوابات اردو میں دیے جائیں گے۔ کابینہ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ہر وزیر کے دفتر میں ایک اردو ٹائپسٹ مقرر کیا جائے گا جس کے پاس اردو ٹائپ مشین بھی ہوگی اور وہ اردو خط و کتابت میں مدد دے گا۔ اس مقصد کے لئے سروسز اور جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمے کو مزید اردو ٹائپ رائٹر خریدنے کی ہدایت کر دی گئی ہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ بڑی حوصلہ افزا خبر ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب اس اہم مسئلے کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عزم رکھتی ہے، اور یہ بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ موجودہ حکومت پنجاب اس معاملے میں اپنی دفتر شاہی کے چکر میں نہیں پھنسی اور اگرچہ راقم الحروف اس گندہ کے شلیے یا متعصّ کے بارے میں کسی خوش فہمی میں اب بھی مبتلا نہیں تاہم دو وجہ سے مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اب اردو کا راستہ نہ روک سکیں گے ایک تو اس وجہ سے کہ اردو کا سیلاب اب تیز ہوتا جا رہا ہے۔

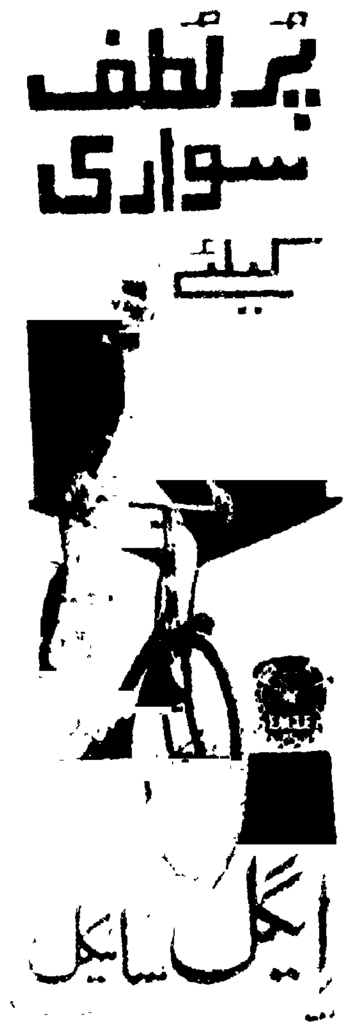
دوسری وجہ یہ کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب محمد حنیف رامے جو مجلس زبان دفتری کے صدر بھی ہیں اُردو کے بارے میں بے حد مخلص اور پُرجوش ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں دفتری سطح پر دو اہم اقدامات کر چکے ہیں جن میں سے ایک یہی ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

میں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی اُردو کا کام دفتروں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اردو بلوچستان اور صوبہ سرحد کی عدالتوں اور دفتروں میں کہیں کلی طور پر کہیں جزوا ہمیشہ رائج رہی ہے اب اس کے عمل دخل کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔

آپ یہ سن کر مزید خوش ہوں گے کہ بلوچستان کے بہت سے ادیب اور اہل علم اردو سے گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور اگر تنگیٔ وقت مانع نہ آتی تو آپ بہت سے بلوچوں اور پٹھانوں کو اس کانفرنس میں بھی موجود پاتے۔ بالآخر یہ بات اس ملک کے ہر آدمی کی سمجھ میں آتی جاتی ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں اپنی زبانوں کی فطرتی محبت کے باوجود ملک کے وسیع تر دائرے میں باہمی ارتباط و الفت کی زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے اکثر پٹھان اور بلوچ بھائیوں سے محض متحنا پوچھا۔ کیا آپ انگریزی کو رابطے کی زبان بنانے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ میرے لئے انتہائی خوشی اور فخر کا مقام ہے کہ ہر محب وطن بلوچ اور پٹھان بھائی نے متفق اللفظ ہو کر ایسے کسی خیال کو ختنے تک سے انکار کر دیا اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب۔ ہم نے عظیم قربانیوں سے انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات حاصل کی ہے۔ کیا ہم ایسے بے عزت ہیں کہ پرانے آقا کی لسانی اور کلچرل غلامی کا طوق پھر گلے میں ڈال لیں گے۔ کیونکہ لسانی اور کلچرل (معاشرتی) غلامی سیاسی غلامی سے بدتر ہوتی ہے اور اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک بار پھر سیاسی محکومی کی زنجیریں ہمارے پاؤں میں پیوست نہ ہو جائیں۔

میں پٹھانوں اور بلوچوں کی اس بصیرت سے بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے یہ سچی بات کہہ دی کہ لسانی اور



کلچرل غلامی بدترین محکومی ہوتی ہے۔

میں آج اردو کے علمی و تعلیمی مسائل کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ اتنا عرض کرنے میں کچھ ہرج نہیں کہ اب عالم لوگ، سائنس دان، فلسفی، ٹیکنیکل علوم کے ماہرین بڑے اعتماد کے ساتھ اردو میں لکھنے لگے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں وہ اینگلو محمڈن قسم کے لوگ جو اردو کی تحریر یا کتاب کو پڑھنا اپنی توہین سمجھتے تھے، اب اردو کی کتابیں بر ضا و رغبت پڑھنے لگے ہیں۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس ملک کے ۹۰ فیصد اخبار بین اردو کے اخبار پڑھتے ہیں اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔

انگریزی مجالس کی زبان کی حیثیت سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اب صرف وہی لوگ مجالس میں انگریزی پر اڑتے ہیں جن کی نفسیات میں کچھ بگاڑ ہے یا جو اپنی بے علمی کو چھپانے کے لئے انگریزی کا رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔

بہرحال ملک بھر میں اردو کا رواج وسیع ہو رہا ہے۔ ایجنسیوں میں، آزاد کشمیر میں، صوبہ سرحد میں، بلوچستان میں، پنجاب میں۔ ہر جگہ، اور پنجاب کا ذکر تو میں تکلفاً کرتا ہوں ورنہ یہ انتخاب ہفت کشور خطہ تو اردو کا منبع و مرکز ہی نہیں دنیا بھر میں اس زبان کو پھیلانے والا ایک اشاعت کدہ بھی ہے۔ اسے شہر سیالکوٹ تجھ پر خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں کہ تیری خاک سے ایشیا کا سب سے بڑا شاعر اور حکیم پیدا ہوا جو اردو کا بھی سب سے بڑا شاعر ہے۔

حضرات۔ یہ قومی زبان کی باتیں تھیں۔ ان باتوں سے دل بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ محبت کی باتیں ہیں۔ ملکی وحدت کی باتیں ہیں، ربط و ضبط قومی کی باتیں ہیں، عقل اور نفس مطمئنہ کی باتیں ہیں۔

مگر کچھ لوگ جن کے عرفان کو میں جھٹلا نہیں سکتا ایسے بھی مجھ سے ملتے ہیں جو میری باتوں کو ادھورا اور کھوکھلا قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں قومی زبان سے پہلے کسی قوم کا ہونا ضروری ہے۔ اور ادھر پاکستان میں حال یہ

سمجھتا کہ جغرافیے کی مخصوص لکیروں کے سوا دیا قائداعظم کے کچھ ارشادات کے سوا کہ مقدس تر ہیں ، ہمیں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے ہم خود کو ایک قوم سمجھنے پر مطمئن ہو سکیں۔

ایسے صاحبانِ بصیرت کا کہنا یہ ہے کہ قومیت کے داخلی نشانات اپنی جگہ تسلیم مگر اس کے کچھ ظاہری نشانات بھی تو ہونے چاہئیں۔

ان نشانات میں سب سے نمایاں قومی کلچر ہوتا ہے جس کا ایک مظہر قومی لباس ہے مگر پاکستان میں دانشور طبقہ جب کسی قومی کلچر کی موجودگی ہی سے انکاری ہے تو قومی لباس کی ضرورت کا کیونکر قائل ہو سکتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ پاکستان فی الحال صرف جغرافیے کی معین حدود کا نام ہے اس کے سوا کوئی بات داخلی یا خارجی ایسی نہیں جو اسے دوسرے ممالک سے ممیز کر سکے۔ کچھ لوگ موہنجوڈارو کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے ذہنوں سے زمانی لحاظ سے اتنے دور کا علاقہ ہے کہ اس کا مفہوم آسانی سے گرفت میں نہیں آ سکتا۔ نہ اس کی کسی طرزِ معیشت کو ہم آج اپنے لیے مشعلِ راہ یا دستور العمل بنا سکتے ہیں۔

ہم ایک طرف تو موہنجوڈارو کو اپنا قبلہ و کعبہ بناتے ہیں دوسری طرف عملی طور سے اپنی طرزِ معیشت میں فرنگی تہذیب کو اپناتے ہیں، لہٰذا کوئی بتائے کہ اتنے دور کے جوڑ ملانے سے ہماری قومیت کا تشخص کس طرح ہو سکتا ہے۔

یہ استدلال کتنا مضحکہ خیز ہے کہ پاکستان کی آبادی کروڑوں مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن اسے ذہنی فیض اور روحانی سیرابی کے لیے یا تو ہزار سال پرانے رقاصائی اساطیری دور کی خاک چھاننی پڑے یا ہزاروں میل دور۔ سات سمندر پار کی ایک اجنبی تہذیب کے بوٹ چاٹنے پڑیں۔ ہمارے پاس گویا اپنا کچھ موجود نہیں ہم گویا آج ہی آسمان سے ٹپکے ہیں۔ اور خالی ہاتھ اور خالی دامن ہیں۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ یہ پاکستان کے ساتھ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ بانیٔ پاکستان اور مصورِ پاکستان دونوں نے کہا تھا ہم ایک باثروت تہذیب کے مالک ایک عظیم کلچر اور معنی دار معاشرت کے وارث ہیں۔ ان دلیلوں کی بنا پر الگ قوم ہیں اور ایک الگ وطن عقیدہ کے حقدار ہیں۔

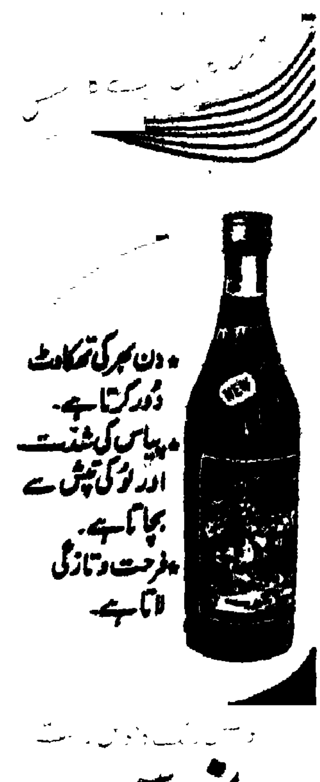
بالیقین دانشوروں کی تازہ ایجاد منطق پاکستانی قومیت کے وجود کے انکار کے مترادف ہے۔

میں نے اتنی طویل گفتگو اس لئے کی ہے کہ ہمیں اس منطق کا شکار نہیں ہونا چاہئیے۔ اپنی قومیت میں گہرا یقین رکھنا چاہئیے، اپنی معاشرت کے قدرتی عناصر کو (جو اسلام اور قرآن کے عطا کردہ سماجی احکام پر مبنی ہیں) مجتمع کر کے انہیں استوار کرنا چاہئیے اور اس سلسلے میں قومی لباس کا تعین کر کے قومیت کے اس ظاہری نشان کو اپنی قومیت کی پہلی ظاہری علامت بنا کر قومی تشخص کو زندہ کرنا چاہئیے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ انگریزی لباس کو بالکل ترک کر دیں لیکن آہستہ آہستہ چینیوں کی طرح کسی قومی لباس پر اتفاق کر لیں اور اس میں شرم کی بات اس لیے نہیں کہ چینی بھی یہی کرتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ آخر شلوار قمیص یا ساڑھی میں کیا برائی ہے۔ شلوار مردوں کے لئے بہترین لباس ہے۔ خصوصاً خواتین کے لئے موزوں ترین اور زیبا ترین ہے اسے بھی سب مشرف فرمائیں تو پتلونوں کی تنگی سے بچ جائیں گے۔ اور کچھ حیاداری کے پہلو بھی نکل آئیں گے، قومی لباس کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف مشورہ ہے اس ملک کے غیور لوگوں کو آہستہ آہستہ اپنی ہستی اور انفرادیت کی دیواریں تعمیر کرنی پڑیں گی۔ یہ کام آہستہ آہستہ اور بتدریج سے سہی مگر ہونا ضرور چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی قومی ادب بھی ہونا چاہیئے مگر قومی ادب کی بات آئندہ کسی موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

قومی زبان و ادب سے قومی کلچر اور قومی لباس تک میری یہ گفتگو کچھ برمحل کچھ بے محل سہی مگر میں نے جو کچھ کہا ہے خلوص سے کہا ہے امید ہے آپ ناخوش نہ ہوں گے اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آجکل اس قسم کی باتیں پسند نہیں کی جاتیں کیونکہ ہمیں فرنگ کی غلامی خوش آگئی ہے۔ لیکن کچھ لوگ ضرور اس رمز کو جانتے ہیں کہ غیروں کی زنجیریں طلائی بھی ہوں تو زنجیریں ہی ہیں۔ آخر میں ایک بار پھر جناب صدر استقبالیہ اور جناب عبدالحفیظ اور اہلِ سیالکوٹ اور خواتین و حضرات آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے تلطف سے کام لیا اور مجھے ممنون فرمایا۔ میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں اور گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔



حالات کی رفتار

دیکھتا ہوں کیا سے کیا ہر روز ہر اخبار میں — ٹوٹکے پیدا ہوئے حالات کی رفتار میں
ان قلمکاروں میں کوئی شاعر فرد انہیں — ہمہمہ آئے کہاں سے شوخیٔ افکار میں
اب کسی سود و زیاں کا ولولہ باقی نہیں — ایک وحشتناک منظر ہے بھرے بازار میں
منجمد ہے خامۂ عنبر شمامہ کی اڑان — بانکپن مفقود ہے آزادیٔ اظہار میں
گردشِ گردونِ گرداں سے عزیزانِ چمن — مست ہو کر رہ گئے پیمانۂ گفتار میں
داغ پیدا ہو گئے چہروں کی آب و تاب پر — کوئی صیقل ہی نہیں آئینہ کردار میں
اُٹھ گئے یارانِ محفل جہدِ آزادی کے بعد — اب وہ رونق ہی نہیں قربانی و ایثار میں
اب کہاں سید عطاء اللہ شاہؒ ایسا خطیب — اِک خلا ہے جانثارانِ شہِ ابرارؐ میں

تذکرہ عہدِ سلف کا ہے مرا مضمونِ خاص
قرنِ اوّل کی روایت ہے مرے اشعار میں

شورش کاشمیری

مسٹر جی ڈبلیو کے قلم سے

The Last Days of United Pakistan

متحدہ پاکستان کے ایام آخر

کیا اردو زبان اسی طرح مفلس رہے گی جیسا کہ آج ہے۔ پاکستان اس ۱۴ اگست کو ۲۸ برس کا ہو جائے گا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اردو ادب سیاسی اعتبار سے تہی دامن ہے۔ اس کا سرمایہ تاریخ نہایت قلیل ہے۔ اس عنوان سے کہ ہم اپنی آزادی تک کیونکر پہنچے؟ ہم نے پاکستان کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ ہماری اس تاریخ کے محرکات کیا تھے؟ ہمارا کارواں کس طرح چلا؟ اس کارواں کا سالار کون تھا؟ اس کے سوانحی خطوط کیا ہیں۔ اس کی سیرت کے اوصاف کیا تھے؟ پھر آزاد ہونے کے بعد ہم پر کیا بیتی؟ ہم نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں؟ ہمارے اعمال کیا رہے؟ ہم نے کیا نتائج حاصل کئے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں اردو انتہائی بے سروسامان ہے۔ اگر پانچ دس کتابیں دستیاب ہوتی ہیں تو وہ تاریخ کے مزاج سے محروم ہیں۔ ان میں صحافتی روایتیں ہیں اور اخباری لہجہ ہے۔ وہ سیاسی پلیٹ فارم کی چیز ہیں۔ وہ یک طرفہ کاروائی ہیں ان کے مصنف بجز ایک کے سوا اس روایت سے اجنبی ہیں کہ ان کا تحریک سے براہ راست کبھی تعلق نہیں رہا۔ انہوں نے مصنفوں میں شامل ہونے کے لئے قلم اٹھایا یا ناشروں کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ آخر کتنی کتابیں ہیں جن کے متعلق یہ کہا جائے کہ ان کے مصنفوں نے ایک قومی ضرورت کا احساس کیا ہے۔ جو لوگ قائد اعظم کے ساتھ تھے وہ ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ لیکن قومی تاریخ اور قومی زبان ان کے رشحات قلم سے محروم رہی۔ چودھری

ہفت روزہ چٹان لاہور

خلیق الزمان نے شاہراہ پاکستان حوالہ قلم کی لیکن وہ ان کے ذاتی تجربات اور شخصی سوانح کا مجموعہ ہے۔ اس کی بنا پر جو کتابیں نکلنی چاہئیں تھیں ان پر کسی نے غور ہی نہ کیا۔ ابھی چند سال پہلے تک اکثر راہنما زندہ تھے۔ وہ تحریک میں اپنے شمول اور قائد اعظم سے اپنی رفاقت کا تاریخی تذکرہ قلمبند کر سکتے تھے۔ مس فاطمہ جناح اپنی بہت سی ناراضیوں کے باعث قائد اعظم کے متعلق کسی فرد کو اعتماد میں لے کر وہ یادداشتیں نہ دے سکیں جو قائد اعظم کے سوانح حیات کا سرمایہ تھیں اور جن کے بارے میں وہ خود فرماتی تھیں کہ اس سے قائد اعظم کے سوانح حیات اور ان کی جدوجہد کی مکمل داستان منظر عام پر آسکے گی۔ وہ رحلت کر گئیں تو ایوب خان کا عہد ان کی اقامت گاہ پر قابض ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ قائد اعظم کی سوانحی یادداشتیں حکومت نے اٹھا لی ہیں۔ پھر کہیں سے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ چیزیں کہاں ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ اس کا تذکرہ کرتے تھے وہ رفتہ رفتہ واصل بحق ہو گئے۔ علامہ اقبال کے سوانحی خطوط اور دعوت افکار سے جو سلوک ہو رہا ہے سب کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال سے متعلق ۲۷ برس میں بہت کچھ چھپا ہے۔ لیکن اقبال جس غرض سے سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کے نشیب و فراز گزارتا رہا وہ عمداً چھپایا گیا۔ اس کا تذکرہ ہوا تو بہت کم۔ یوم اقبال فی الواقعہ سالانہ عرس ہو کر رہ گیا۔ پھر جو لوگ مسلمانوں کی ملی غیرت کے ترجمان تھے اور عمر بھر استقامت و ایثار کے چراغ روشن

کرتے رہے۔ ان کے لئے پاکستان تنگ دامن رہا جو لوگ انگریزی استعمار سے ربط رکھتے رہے وہ پاکستان کی ذہنی لعنت میں آج تک غدار رہیں اور جن لوگوں کے سوانح زندگی میں جدوجہد کے ایام اور قید و بند کی صعوبتیں ہیں وہ تحریک پاکستان میں رہ کر بھی تاریخ پاکستان کے متروکات میں سے ہیں۔ جگر مراد آبادی محض شاعر تھا اس کے نام پر پاکستان میں سڑک ہے لیکن حسرت موہانی کے نام پر کٹیا بھی نہیں۔ مولانا ظفر علی خان نہ ہوتے تو پنجاب عوامی توانائی کے اعتبار سے بلوچستان ہوتا لیکن ظفر علی خان کے ساتھ پاکستان اور پنجاب نے بے اعتنائی و بے وفائی کی انتہا کر دی۔ ایک معمولی سڑک بھی ان کے نام سے منسوب نہ کی۔ زمیندار کا دفتر انکم ٹیکس کی خاطر نیلام ہو گیا۔ اس کا پس منظر کیا تھا کہ میرزائی حکومت میں دخیل تھے اور حکومت کے بزرجمہر مولانا ظفر علی خان کے نام اور کام کی شمع روشن کر کے قادیانی امت کی خوشنودی سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ سرکاری ایوانوں میں یہ ہوتا رہا کہ محمد علی بوگرہ وزیر اعظم ہوا تو اس کے والد کی تصویر ملت اسلامیہ کے محسنوں کی فہرست میں ابھار کر چھاپی گئی۔ اردو لٹریچر میں تاریخ احمدیت کی گیارہ جلدیں چھپیں۔ میر نور احمد مرحوم نے سرکاری خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد مارشل لا سے مارشل لا تک لکھی۔ بیگم شاہنواز نے اپنے والد سر شفیع کے سوانح حیات شائع کئے۔ اور جو لوگ قائد اعظم کے نورِ چشم تھے یا علامہ اقبال

[illegible]

[illegible]

PASSIVE VOICES

متحرک آوازیں

پچھلے ہفتے لاہور میں مسٹر کے ایل گابا کی ایک کتاب PASSIVE VOICES (غیر متحرک آوازیں) سے متعلق ایک تقریب منائی گئی۔ جس میں اس کتاب کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کی داستان پیش کی گئی۔ ہم نے اس تقریب کے مختصر احوال ایک مقامی اخبار میں دیکھے تو ہمیں قدرتاً مطالعہ کا شوق ہوا، دوسرے دن یہ کتاب ایک پبلشر سے حاصل ہوگئی۔ مسٹر گابا نے ۱۹۷۱ء میں شائع کی۔ اب پاکستان میں پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں طبع ہوا ہے۔ اس کتاب کے ۴۶ باب اور ۳۹۶ صفحات ہیں۔ مؤلف نے جو کچھ لکھا اپنی طرف سے افسانہ سرائی نہیں کی بلکہ سرکاری اعداد و شمار کے ساتھ مستند حوالوں سے باوقار لہجے میں مستند باتیں سپرد قلم کی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سرگزشت فی الحقیقت ایک دلگداز المیہ ہے اُن کے ساتھ آزادی کی آمد پر جو سلوک شروع ہوا وہ ہر اُس شخص کے لیے اندوہناک ہے جو اپنے دل میں انسان کا سچا دل رکھتا ہے اگر ہندوستانی مسلمانوں کا یہ قصور تھا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی تو یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا اس کا رد عمل یوں نہ ہونا چاہیے تھا جو ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ بہرحال یہ ایک دوسرا بحث ہے اس کتاب سے ہماری دلچسپی کے بہت سے اسباب ہیں اولاً ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہمارے ہم مذہبوں پر ہندوستان میں کیا گذر رہی ہے۔ لیکن کے ایل گابا کے نام سے ہمارے سامنے ایک تصویر آئی۔ مسٹر گابا پنجاب میں اس وقت کے رئیس التجار لالہ ہرکشن لال کے دوسرے بیٹے ہیں۔ لالہ ہرکشن لال امتداد زمانہ کا شکار ہو کر دیوالیہ ہوگئے، ان کی عزت کو شدید صدمات سہنا پڑے۔ آپ انگریزی عہد میں پنجاب کی ابتدائی کابینہ میں وزیر تھے لیکن جب آپ کا سورج گہنا گیا تو آپ کو مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مسٹر ڈگلس ینگ ان دنوں پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جج تھے، ان کا لالہ جی سے ٹکراؤ ہوگیا۔ خواجہ نذیر احمد بار ایٹ لاء قادیانیوں کی لاہوری جماعت کے سرگرم ممبر تھے انہیں سر ڈگلس ینگ نے لالہ جی کی جائیداد کا لیکوی ڈیٹر مقرر کیا آج کل جس جگہ طالبات کے لئے فاطمہ جناح میڈیکل کالج ہے یہاں لالہ جی کا محل نما بنگلہ تھا خواجہ صاحب نے اس کی ہر چیز کوڑیوں کے مول فروخت کیا اس وقت کی روایتوں کے مطابق نہ صرف خود مالا مال ہوئے بلکہ سر ڈگلس ینگ کے ذوق کی پذیرائی کرتے رہے۔ لالہ ہرکشن کے لیے یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔ اس دھاندلی کے خلاف لالہ ہرکشن لال کی امداد صرف ایک اخبار نے کی اور وہ سید حبیب شاہ کا روزنامہ سیاست تھا، سید حبیب شاہ کے چھوٹے بھائی سید عنایت شاہ اخبار کے ایڈیٹر و پرنٹر تھے۔ سر ڈگلس ینگ نے انہیں توہین عدالت میں طلب کر لیا سید عنایت شاہ نے چیف جسٹس سے کہا کہ 'سیاست' میں جو کچھ لکھا گیا وہ درست ہے۔ سر ڈگلس ینگ اس جواب سے چڑ گئے انہوں نے شاہ صاحب سے کہا آپ غیر مشروط طور پر معافی مانگنے کے لیے تیار ہیں۔ شاہ صاحب نے انکار کیا، اس پر انہیں ایک ماہ قید اور بہت بڑی رقم میں جرمانہ کر دیا گیا۔ شاہ صاحب نے نہایت بہادری سے قید کاٹی اور دیہاتی مکان بیچ کر جرمانہ ادا کیا اس طرح قلم کی آبرو رہ گئی لالہ ہرکشن لال نے سر ڈگلس ینگ کے رویّے سے تنگ آ کر سرِ عدالت آنکھیں چار کیں۔ ینگ بھنا اٹھا اور لالہ جی سے کہا کہ اپنے الفاظ کی معافی مانگیں۔ لالہ جی نے کہا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ینگ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ہرکشن لال نے کھری کھری سنائیں، اس پر ان کو ینگ نے اس وقت کے لیے قید کر دیا جب تک لالہ جی معافی نہ مانگیں۔ لالہ جی جیل چلے گئے۔ آخر گورنر کی مداخلت پر ینگ نے خود ہی قانونی حیلہ پیدا کر کے کچھ عرصہ بعد لالہ جی کو رہا کر دیا لیکن لالہ ہرکشن لال کو اس رسوائی کا اس قدر صدمہ تھا کہ وہ چند دن بعد ۱۹۳۰ء میں انتقال

تھا۔ آپ ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور لندن سے بار کرکے آئے تھے۔ آپ کا بیاہ راولپنڈی کے مسٹر عبدالاسلام علی خان کی بیٹی حسن آرا سے ہوا تھا۔ جب لالہ ہرکشن لال مرگئے تو مسٹر کے ایل گابا نے اسلام قبول کیا آپ کا نام خالد لطیف رکھا گیا مسلمانوں نے زبردست جلوس نکالا۔ انہیں دنوں آپ نے "پیغمبر صحرا" کے نام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر انگریزی میں کتاب لکھی۔ سنٹرل اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلمانوں نے سر میاں فضل حسین کے نامزد امیدوار حاجی رحیم بخش ریٹائرڈ سیشن جج کے مقابلہ میں آپ کو کھڑا کیا۔ آپ غیر معمولی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے "نیو میگنا چارٹا" کتاب لکھی۔ سر ڈگلس ینگ آپ کے پیچھے پڑ گیا۔ یاد نہیں رہا غالباً توہین عدالت کے جرم ہی میں سر ڈگلس ینگ نے آپ کو جیل بھجوایا۔ ایڈیٹر ان دنوں جیل ہی میں تھا۔ گابا صاحب سے دوستی ہوگئی۔ ایڈیٹر چٹان کی پہلی زندانی کتاب "قیدی کا روزنامچہ" کا آپ نے دیباچہ لکھا لیکن اس وقت کی سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ مرزا معراج الدین نے مسودہ اور دیباچہ ضبط کرلیا۔ مسٹر گابا کی پہلی کتاب "انکل سام" تھی جو مس میو کی کتاب "مدر انڈیا" کے جواب میں لکھی گئی اس کے علاوہ بھی آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

بعض سیاسی پیچیدگیوں کے باعث آپ برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہی بمبئی چلے گئے اور اب تک وہیں رہ رہے ہیں، اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ آجکل آپ کے حالات کیا ہیں؟ لیکن دو برس پہلے سنا تھا کہ آپ کا صاحبزادہ بمبئی کے کسی انگریزی روزنامے میں اسسٹنٹ

معلوم ہوا کہ آپ بقید حیات ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ مسٹر گابا لاہور سے بمبئی چلے گئے۔ تو یہاں بعض اخباروں میں

(باقی صفحہ)

بقیہ: متحدہ پاکستان

سے فیض حاصل کیا، وہ آج تک منقارِ زیرِ پر ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان میں اکثر اشخاص قلم پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اور سب کچھ لکھتے ہیں لیکن جس کی ضرورت ہے اس پر قلم نہیں اٹھاتے؟ کیوں؟ اس کا جواب وہی دے سکتے ہیں ہم اس صورتِ حال ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنی قریبی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں۔ اور کچھ نہیں جانتے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ لیاقت علی کی داستانِ شہادت کیا ہے؟ اگر ہم تاریخ کو اس کی سچائیوں کے ساتھ محفوظ کیے جاتے تو مشرقی پاکستان کے سقوط پر پیشہ ور دانشور یہ لکھنے کا حوصلہ نہ کرتے کہ لاہور ریزولیوشن میں State کا لفظ نہیں States کا لفظ تھا۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم اپنے دو لخت ہونے کی داستان حمود الرحمٰن کمیشن کی معرفت بھی نہیں سن سکے۔ آخر پاکستان سے باہر ہماری تاریخ کہاں جا رہی ہے؟ کیا ہمارے ہاں خلوتیانِ راز نہیں یا اہلِ قلم عنقا ہیں؟ اگر اپنی کہانی ہمیں باہر کے دانشوروں یا کبیدہ خاطر مصنفوں سے سننی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ نہ تو ہم تاریخ سے انصاف کر رہے ہیں اور نہ نئی پود سے مخلص ہیں۔ ان حقائق کو اخفا میں رکھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ جو نسلیں پاکستان میں جوان ہوئی ہیں اور جن کا شعور اب تاریخی راہ پر آیا ہے وہ تذبذب کا شکار ہو کر اپنے ہی وجود سے منحرف ہوا چاہتی ہیں اور یہ پاکستان میں قومی وجود کے لیے نفع بخش نہیں ہے۔

ہم نے ان دنوں ایک دوست کے پاس ایک "متحدہ پاکستان کے ایام آخر" The Last days of United Pakistan دیکھی۔ اس کے ۲۳۹ صفحے ہیں۔ ہرسٹ اینڈ کمپنی لندن نے شائع کی ہے۔ دس باب ہیں۔ پہلا باب بنگالی نیشنلزم کے نشوونما پر ہے۔ دوسرا ایوب کے زوال پر، تیسرا یحییٰ اقتدار کے آغاز پر، چوتھا انتقالِ اختیارات پر۔ پانچواں پہلے اور آخری جنرل انتخابات پر، چھٹا سہ جماعتی مفاہمت پر، ساتواں مذاکرات ڈھاکہ پر، آٹھواں سول وار پر، نواں پاکستان کے دو لخت ہونے پر، دسواں اس دور کے خاتمہ پر۔

ہم نے ایک ہی نشست میں اس کتاب کو پڑھا۔ بعض چیزیں ہمارے لیے نئی تھیں، بعض افسانہ معلوم ہوئیں۔ بعض میں غلو تھا اور بعض حقیقت تھیں۔

مسٹر جی ڈبلیو چودھری (مصنف) ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے شعبہ میں صدر تھے۔ پھر ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک پاکستان کی وزارت خارجہ میں ریسرچ کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۹ء سے لے کر فروری ۱۹۷۱ء تک مواصلات کے مرکزی وزیر رہے۔ آج کل ۱۹۷۲ء سے نارتھ کارولینا سنٹرل یونیورسٹی اور ڈیوک یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان میں سے تقریباً نصف کتابیں لندن میں شائع ہوئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان سے متعلق تاریخ کے عالمی مطالعہ کو ہمیں غیروں پر چھوڑ دینا چاہیے یا ہمارے رازدارانِ سیاست بھی قلم اٹھانے کی اہمیت سے بہرہ مند ہیں؟

ہمارے لیے شرم کا مقام ہے کہ جسمانی مَس کا شہپر تو ہمارے ہاں عام ہو رہا ہے اور سیاسی تاریخ کے سلسلہ میں ہم بدستور بے خبری کا شکار ہیں۔
پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغ داغ شد

معریٰ نظم

عنوان چشتی

اُردو میں "بلینک ورس" کا تذکرہ پہلے پہل حالی نے کیا۔ انہوں نے "بلینک ورس" کا ترجمہ غیر مقفیٰ نظم کیا۔ لکھتے ہیں کہ یورپ میں بھی آجکل بلینک ورس یعنی غیر مقفیٰ نظم کا بہ نسبت مقفیٰ کے زیادہ رواج ہے۔" مگر خود غیر مقفیٰ نظم نہ لکھ سکے۔ ۱۸۸۸ء میں عبدالحلیم شرر نے بلینک ورس کو "نظم غیر مقفیٰ" قرار دیتے ہوئے لکھا۔

سردست ہم نظم کی ایک نئی قسم کی طرف توجہ کرتے ہیں، جو انگریزی میں بکثرت موجود ہے مگر اردو میں بالکل نئی اور عجیب چیز نظر آئے گی مشرق کی شاعری میں ردیف وقافیہ بہت ضروری اور لازمی قرار دیئے گئے ہیں۔ مگر انگریزی میں ایک جداگانہ وضع کی نظم ایجاد کی گئی ہے۔ جس کو "بلینک ورس" کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا نام "نظم غیر مقفیٰ" رکھا جائے تو شاید مناسب ہوگا۔

شرر نے نظم غیر مقفیٰ کو رائج کرنے کے لیے باقاعدہ مہم شروع کی تھی اور بعد میں مولوی عبدالحق کے مشورے سے اس کا نام "نظم معریٰ" کر دیا تھا۔ نئے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں شرر لکھتے ہیں:۔

غیر مقفیٰ نظم کو ہم آئندہ سے نظم معریٰ ہی لکھا کریں گے، ہمارے لائق اور معزز دوست جناب مولوی عبدالحق ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ حیدر آباد نے اس نظم کے لیے یہ نام تجویز فرمایا ہے جو ہمیں بہت پسند آیا۔

اس طرح فروری ۱۹۰۱ء میں "نظم غیر مقفیٰ" "نظم معریٰ" بن گئی۔ دلگیر اکبر آبادی نے ۱۹۰۹ء میں "بلینک ورس" کی حمایت میں آواز اٹھاتے ہوئے اسے "نظم معریٰ" قرار دیا، مگر شرر کی تحریک اور مولوی عبدالحق کے تجویز کردہ نام کا ذکر نہیں کیا۔ دلگیر نے لکھا ہے کہ انگریزی میں ایک خاص قسم کی نظم ہے، جسے "بلینک ورس" کہتے ہیں، اس کا صحیح و فصیح ترجمہ "نظم معریٰ" کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۹ء کے بعد بھی "بلینک ورس" کو اکبر الٰہ آبادی نے "بلا قافیہ" عظمت اللہ خان نے "بے ردیف وقافیہ" کہا ہے۔ نجم الغنی نے اگرچہ "بلینک ورس" کو نظم تسلیم نہیں کیا، تاہم حالی کی تردید میں "غیر مقفیٰ" لفظ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن اُردو میں قبول عام کی سند "نظم معریٰ" کی اصطلاح کو ہی ملی ہے۔

انگریزی میں عام طور پر قافیہ کی بنیاد صوتی آہنگ ہے۔ اُردو میں حروف وحرکات پر ہے انگریزی میں بھی قوافی کے اصول ہیں مگر وہاں اتنی سخت گیری نہیں جتنی اردو کے اصول قوافی میں ہے۔ انگریزی شاعری میں قوافی کی قسموں میں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سی ایسی چیزوں کو جائز کر لیا ہے۔ جنہیں اُردو علم قافیہ ناجائز ٹھہراتا ہے۔ انگریزی کے شاعروں نے محض قافیے کے دائرے میں آزادی اور لچک کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا بلکہ ایک منزل پر قافیہ کی قید سے یکسر نجات حاصل کر لی جس کے نتیجہ میں "بلینک ورس" وجود میں آئی۔

انگریزی میں "بے قافیہ آئمبک پنٹا میٹر" کو بلینک ورس کہتے ہیں "پنٹا میٹر" کو سمجھنے کیلئے انگریزی عروض کی مبادیات سے واقفیت ضروری ہے۔ انگریزی میں چار قسم کی بحریں ہیں، اجزائی بحر، تاکیدی بحر، تاکیدی اجزائی بحر، تاثراتی بحر

"اجزائی بحر" میں ہر مصرع کے ارکان کی تعداد کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس بحر میں لہجہ کی تاکید یا زور مصرع کی بنیادی عروضی ڈھانچے کا معیار نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ذیلی یا اتفاقی ہوتی ہے اس بحر کا عیب یہ ہے کہ مصرع کے ارکان کی تعداد پوری ہو جانے کے بعد، قاری کو غیر فطری وقفہ پر رکنا پڑتا ہے۔

"تاکیدی بحر" میں لہجہ کی تاکید یا زور کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں تاکیدوں کا ایک مخصوص نظام ہوتا ہے۔ اس بحر میں ہر مصرع کے ارکان کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے مگر تاکیدوں کا نظام نہیں بدلتا۔

"تاکیدی اجزائی بحر" میں مندرجہ بالا دونوں بحروں کی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس میں لہجہ کی تاکیدوں اور ارکان کی گنتی کی جاتی ہے اس میں لہجہ کی تاکیدوں پر ترتیب کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں حذف واضافہ بھی ہو سکتا ہے مگر مصرع کے ارکان کی تعداد میں تغیرات

اور انحراف کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس پابندی سے تاکیدی اجزائی بحر میں ایک طرف سختی اور جمود پیدا ہو جاتا ہے مگر دوسری طرف اس کی ایجازی قوت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

اُردو میں معرا نظم نے "بلینک ورس" کی ایک خصوصیت کو اپنایا اور دوسری سے انحراف کیا۔ جس خصوصیت کو اپنایا ہے وہ قافیہ سے انحراف کی خصوصیت ہے۔ اور جس کو اپنایا نہیں وہ ایک بحر کا تعین اور اس کی پابندی ہے۔ سب سے پہلے عظمت اللہ خان نے اس طرف توجہ دلائی انہوں نے "بلینک ورس" کی بحر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

انگریزی میں بے قافیہ نظم کے متعلق عام قاعدہ سا ہو گیا ہے کہ بے قافیہ نظم عموماً انگریزی عروض کی ایک لطیف اور مقبول عام بحر آئمبک پنٹا میٹر میں لکھی جاتی ہے۔ اس بحر کو اُردو میں "فَ علُ" پانچ بار کہا جائے گا۔

چونکہ آئمبک پنٹا میٹر کی اجزائی ترتیب خفیف طویل یا غیر تاکیدی اور تاکیدی ہے۔ اس لئے عظمت اللہ خاں کے مخصوص عروضی نقطہ نظر کے تحت اس کا وزن "فَ عل" قرار پاتا ہے لیکن "فَ عل" کو پانچ بار دہرانے سے کوئی سریلا وزن نہیں بنتا اس لیے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

بہتر ہوگا کہ اس کے لیے کوئی خاص بحر مخصوص کر لی جائے۔ میرا اتفاقی خیال ہے کہ اُردو میں فعولن پانچ بار وہی کام دے گا۔ جو انگریزی میں "فَ عل" پانچ بار سے لیا جاتا ہے۔

"فعولن" بحرِ متقارب کا رکن ہے، روایتی عروض میں "فعولن" پانچ بار کوئی مخصوص وزن نہیں ہے۔ یہ عظمت اللہ خاں کی جدت طرازی ہے۔ اس وزن میں ایک خاص آہنگ ہے جو بحر متقارب کے آہنگ سے مختلف ہے۔ اس وزن پر نظم کا یہ انداز ہوگا۔

اُدھر امن ساحل، اِدھر تند طوفان غضب ہے
خدا جانے کشتی پہ ہر کس کا احسان غضب ہے

(عنوان چشتی)

مگر اس وزن میں عظمت اللہ خاں یا دوسرے شعرا کے یہاں کوئی معرا نظم نہیں ملتی۔ اُردو شاعروں نے معرا نظمیں مختلف بحروں میں لکھی ہیں۔ ایک بحر کی پابندی کے اصول کو عملاً مسترد کر دیا ہے، چند ابتدائی معرا نظموں کے اوزان پیش کیے جاتے ہیں۔

ہنگامۂ ہستی کو | گر غور سے دیکھو تم
مفعول مفاعیلن | مفعول مفاعیلن

(بحر ہزج مربع اخرب)

("جغرافیہ کی پہیلی" محمد حسین آزاد)

اے چھوٹے چھوٹے تارو | کہ چمک دمک رہے ہو
فعلات فاعلاتن | فعلات فاعلاتن

(بحر رمل مربع مشکول)

("چھوٹے چھوٹے تارو" اسمٰعیل میرٹھی)

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف

("......" اکبر الٰہ آبادی)

جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ اک میں ہوں کہ دل
کو قرار آتا نہیں، اُلجھن ہے، بیتابی ہے اور
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن!

(بحر رمل مثمن محذوف)

("مستلوم ڈراما" عبدالحلیم شرر)

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ابتدا ہی سے اردو شاعروں نے نظم معرا کے لیے کسی ایک بحر کو مخصوص نہیں کیا بلکہ مختلف بحروں کو اپناتے رہے۔ اُردو شاعری میں یہ روایت آج تک جاری ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک ہی پل کے لیے بیٹھ کے پھر اُٹھ بیٹھی
آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نظر بند ہے

("لب جوئبارے" میرا جی)

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

("تنہائی" فیض احمد فیض)

سیاہ پیڑ ہیں اب اپنی آپ پرچھائیں
زمیں سے تا مہ انجام سکوت کے مینار

("پچھلی رات" فراق گورکھپوری)

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے!

("تبدیلی" اختر الایمان)

ذرا ٹھہرو کدھر ہم جا رہے ہیں
اُدھر اس چار دیواری کے پیچھے

("بلاوا" مخمور سعیدی)

اُردو میں معرا نظم کے لیے کوئی ایک بحر مخصوص نہ کرنے کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ شروع میں اردو شعرا انگریزی عروض خاص طور پر آئمبک پنٹا میٹر کا شعور نہیں رکھتے تھے، اور انگریزی کی اس بحر کی خصوصیات سے آگاہ نہیں تھے۔ "بلینک ورس" کے نام سے محض یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض قافیہ سے عاری ہوتی ہے اس لیے اُردو شاعری نے ابتداً قافیہ سے نجات حاصل کر کے یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے "بلینک ورس" کا حق ادا کر دیا۔ دوسرے یہ کہ کسی ایک بحر کا مخصوص کرنا کسی ایک آدھ شاعر کا کام نہیں ہوتا، خود انگریزی میں ایک زمانے تک بلینک ورس میں آئمبک پنٹا میٹر کا استعمال نہیں ہوا، رفتہ رفتہ شاعروں کے تجربوں نے مخصوص بحر آئمبک پنٹا میٹر کا تعین کیا۔ میرے خیال میں اُردو کی معرا نظم کے لیے کسی ایک بحر کا مخصوص نہ ہونا نیک شگون ہے

باقی ص ۲۲ پر

پاکستانی معاشرے کو بدعنوانی سے نجات کیونکر مل سکتی ہے

چند مفید اور قابل عمل تجاویز

لاہور ہائیکورٹ کے سابق جج مسٹر جسٹس شیخ شوکت علی نے اپنی ایک حالیہ پریس کانفرنس میں پاکستانی معاشرے سے بدعنوانی کا قلع قمع کرنے کے لئے نہایت مفید و مثبت تجاویز پیش کی ہیں جو قارئین چٹان اور خاص کر متعلقہ مقتدر حضرات کے مطالعہ کے لئے شائع کی جا رہی ہیں۔

(ادارہ)

وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک پریس کانفرنس منعقدہ ۱۶ مئی ۱۹۷۵ء میں اس امر کا اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ملک سے بدعنوانی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

قیام پاکستان سے لے کر اب تک معاشرے کے مختلف الخیال طبقوں اور مقتدر شخصیتوں کی طرف سے اس ضمن میں متعدد بار بلند بانگ دعوے کئے گئے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ دلکش الفاظ کا ہیر پھیر ہی ثابت ہوئے۔ مقام افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں کبھی کوئی قابل عمل اور ٹھوس حل پیش نہ کیا گیا اور نہ ہی اس سمت میں کوئی مثبت قدم اٹھایا گیا۔ ظاہر ہے ملک و قوم کو درپیش ایک ایسے سنگین مسئلہ کے لئے جب تک کوئی قابل عمل حل تلاش نہ کیا جائے۔ اور معاشرے کے دیانتدار اور مخلص افراد کی صلاحیتوں کو بدعنوانی اور بددیانتی کے مکروہ اثرات کو ختم کرنے کیلئے بروئے کار نہ لایا جائے۔ یہ مصیبت ہمارے سروں پر لٹکتی ہی رہے گی۔ مشکل جو اس ضمن میں درپیش ہے، وہ یہ کہ ہماری سوسائٹی کی موجودہ صورت حال نے ہر کسی کو خوف و تہدید اور ترغیب و تحریص کا تابع بنا دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بدعنوانی کے خاتمہ کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جائے، جنہیں مکمل تحفظ حاصل ہو جو خوف و تہدید سے گھبرائیں نہیں اور جو اتنے مخلص اور بے لوث ہوں کہ کوئی ترغیب و تحریص انہیں متاثر نہ کر سکے۔

میں وزیر اعظم کے بیانات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے بدعنوانی کی بیخ کنی کے لیے انتہائی سنجیدگی اور خلوص سے سوچتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ مرض اسی دور میں شدت اختیار کر گیا ہے۔ اور ماضی میں موجود نہ تھا۔ بلکہ ہمارے معاشرے کا یہ ناسور ہمیشہ سے اسی طرح رہا ہے۔ حتیٰ کہ مارشل لاء کے زمانے میں بھی بدعنوانیوں کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں اب مقتدر حضرات کا روٹ اور ٹریکٹروں کے پرمٹ دینے، اراضی کے پلاٹوں اور فلیٹوں کی الاٹمنٹ کا فیصلہ روزمرہ کی مصلحتوں کے پیش نظر کرتے ہیں۔ ان حالات میں وزیر اعظم کا بیان اور بھی توجہ طلب ہو جاتا ہے اور میری تجویز ہے کہ سب سے پہلے ہمیں ذاتی طور پر اپنا تجزیہ کرنا اور اپنے اعمال و افعال پر غور کرنا چاہیے یہ جاننے کے لئے کہ کون بدعنوان ہے اور کون دیانتدار، زندگی کے ہر شعبے سے نمائندوں کا انتخاب کرنا چاہیئے یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم انتظامیہ کے لامحدود اثر و رسوخ کے خلاف ان منتخب نمائندوں کو مکمل تحفظ دے سکیں۔ کوئی معجزاتی حل پیش کرنا تو ناممکن ہے لیکن بنیادی طور پر ایسا حل تو تلاش کیا جا سکتا ہے جو اس ضمن میں ہماری قومی ضروریات کے قریب سے قریب تر ہو۔ مثلاً یہ کہ مرکزی اور صوبائی سطح پر ایسے ٹریبونل قائم کئے جائیں جو صرف بدعنوانی کے معاملات کی چھان بین کریں۔ ٹریبونل کے ممبران معاشرے کے مختلف حصوں کے نمائندوں پر مشتمل ہونے چاہئیں، ہر ٹریبونل میں اعلیٰ درجہ کی عدلیہ، ہنرمند، وکلاء اور مقننہ کا ایک ایک منتخب نمائندہ شامل ہونا چاہیئے۔ ٹریبونل کے ممبران کو تحفظ دینے کی خاطر ان کی شرائط ملازمت میں اس امر کی ضمانت ہونی چاہیئے کہ وہ صرف استعفیٰ دیکر یا بیماری کی بناء ملازمت سے ہٹائے جا سکتے ہیں اور ان کی مدت ملازمت ۶۵ سال کی عمر تک ہو گی۔ ایسے ٹریبونل کو اختیار حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے ممبران کے معاملات کی بلا لحاظ عہدہ و مرتبہ چھان بین کر سکے اور یہ کہ متعلقہ افراد کو صفائی کے مناسب مواقع مہیا کرنے کے بعد، یہ ٹریبونل بدعنوانی کے تمام مقدمات کا فیصلہ کریں، انہیں سول اور کریمنل دونوں اختیارات حاصل ہونے چاہئیں اور ان کی سرگرمیوں کو "قانون شہادت" کے ذریعہ محدود کر دینا چاہیے ان کا فیصلہ آخری متصور ہونا چاہیئے۔ اور اس کے خلاف رٹ کی گنجائش بھی نہیں ہونی چاہیئے ٹریبونل بشمول بینک یا سرکاری محکمہ کو مناسب تفتیش کے لیے طلب کرنے کا مجاز ہونا چاہیئے اور اسے جرمانہ عائد کرنے جائیداد ضبط کرنے اور ... سال سے عمر قید تک کی سزا دینے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے

تل ابیب کے صیہونی دورخی پالیسی پر کاربند ہیں

شیخ عبد العزیز
پلیس انفارمیشن آفیسر عرب لیگ

اب جبکہ عرب کاز ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے امن پسند عوام کے سامنے ہمارے علاقے کے بارے میں اصل صورتحال واضح ہو جانی چاہیئے ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقوام جنہوں نے ہمیشہ ہماری جدوجہد کی حمایت کی ہے ان کو مزید پرجوش حمایت کرنی چاہیئے تاکہ ان حقوق کی بحالی ہو جو سلب کر لئے گئے ہیں اور ان علاقوں کی واپسی ہو جن پر طاقت کے بل پر قبضہ کیا گیا۔

مغربی ایشیا میں بگڑتی ہوئی صورت حال کی خاص وجہ اسرائیل کی ہٹ دھرمی ہے جس نے عالمی برادری کی خواہشات کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ اسرائیل چونکہ ایک فوجی اسٹیٹ ہے اس لئے اس کے حکمران کا انداز فکر صرف طاقت پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صیہونی تحریک کے اصل مقاصد کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ جب تک کہ اس کی پشت پر طاقت، تشدد اور دہشت انگیزی نہ ہو۔ اگر ہٹلر کا یہ خیال تھا کہ صیہونی الجھن کو حل کرنے کا آخری حل یہ ہے کہ یہودیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے تو اس معاملے میں بھی صیہونی ہٹلر سے کہیں بازی لے جا سکتے ہیں اور بدتر ہیں کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ایک قوم کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ کوشش دنیا بھر میں کرنی چاہیئے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں صیہونی دہشت انگیزی کے مرتکب ہیں۔

اسرائیلی ہٹ دھرمی ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچی۔ جب کہ روشن خیال عالمی لوگوں کو یہ مکمل یقین ہو گیا کہ اسرائیل نے اپنی صیہونی تحریک کے مقاصد کو حل کرنے کے لئے طاقت کے استعمال کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ اسرائیل یہ بھول گیا ہے کہ گو طاقت کا استعمال مقاصد کے جائز یا ناجائز ہونے کے باوجود ان کو حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اس کامیابی کی کبھی بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ ایک تاریخی اصول ہے۔ آپ حملہ کر سکتے ہیں لیکن آپ کبھی بھی اس پر مستقل قبضہ کی ضمانت نہیں دے سکتے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

شاید اسی زمرے میں اکتوبر جنگ کے بارے میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اکتوبر جنگ کے نتیجہ میں اسرائیل ایک خوفزدہ طاقت کے روپ میں ابھر کر سامنے آیا۔ جب کہ عرب ایک لازوال فوجی طاقت، اکتوبر جنگ کے سبب اسرائیل کے غیر یہودی دنیا سے تعلقات بگڑ گئے۔ اس کے برعکس عربوں کے تعلقات غیر عرب ملکوں سے تیزی سے خوشگوار ہو گئے۔ اکتوبر جنگ تاریخی اعتبار سے منفرد تھی، کیونکہ اسرائیل نے جنگ کا راستہ بجائے امن کے اختیار کیا اور حقوق کی بحالی کے بجائے تشدد کو اپنایا اور اس کے علاوہ نیکی کے راستہ کو چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کیا۔

اکتوبر جنگ اس معنی میں منفرد تھی کیونکہ عرب اور روشن خیال عالمی رائے عامہ نے اسرائیل کے رویہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تل ابیب کے صیہونی دورخی پالیسی پر کاربند ہیں ایک طرف وہ امن کی بات کرتے ہیں تو وہ دوسری طرف جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس اسکیم کے پس پشت خاص وجہ خود صیہونی فلسفہ ہے جو اپنے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے غیر انسانی افعال کا مرتکب ہے۔

دوسری وجہ اسرائیلی ڈھانچہ کا وہ عظیم ساخت ہے جس کی باگ ڈور جرنیلوں کے ہاتھوں میں ہے۔

اکتوبر جنگ کے اختتام پر اسرائیل کی برتری اور صلاحیتی داستانیں مٹی میں مل گئیں اور ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ مسئلہ فلسطین پر بحث میں حصہ لینے کے لئے فلسطین تنظیم آزادی کو مدعو کیا جائے یہ فیصلہ حقیقتاً ہمارے فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی کے لئے طویل جدوجہد میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ یہ فیصلہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈہیم کے قول کے مطابق اقوام متحدہ کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ہے جب کہ اس فیصلہ کا دنیا بھر میں خیر مقدم کیا گیا مگر اسرائیلیوں نے اس کے خلاف اظہار افسوس کیا۔ ان کے افسوس کی وجہ جیسا کہ ایک اہم اسرائیلی روزنامہ نے لکھا ہے یہ ہے کہ فیصلہ باہری دنیا میں اس غلط فہمی کو دور کر دے گا جو کہ اسرائیل نے دنیا بھر میں پھیلا رکھی ہے

ان حقیقی صورت حال کے باوجود اسرائیل جو اکتوبر جنگ کے نتیجہ میں خوفزدہ قوت ابھر کر سامنے آیا ہے تاحال سلب حقوق کو بحال کرنے کی اپیل کو ٹھکراتا ہے۔

یہ صورت حال لازمی طور سے دشمنانہ کارروائیوں کو ہوا دے گی جو جنگ کا روپ اختیار کر سکتی ہیں۔

بقیہ:- معرا نظم

"بحر" شعری آہنگ کا خارجی عنصر سہی، مگر یہ مواد پر اوپر سے نہیں لاد دی جاتی بلکہ یہ موضوع و مواد کی مناسبت سے، شعری تجربہ کی بنیادی خصوصیت سے ہی ابھرتی ہے۔ اس لیے ہر نئے شعری تجربے کے لیے نئی بحر اور اس کی ذیلی صورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اردو میں معرا نظم کے لیے ایک مخصوص بحر کا تعین ہو جاتا تو وہ اپنی بندشوں کا شکار ہو کر جامد ہو جاتی اور تخلیقی و جمالیاتی تجربہ کی تازگی و شادابی کو نقصان پہنچا۔ اس لیے اردو میں ہر ایک ایسی نظم خواہ کسی بحر میں ہو نظم معرا کہلاتی ہے جس میں قافیہ نہ ہو، اور مصرعوں کی تعداد کم سے کم تین ہو، دو مصرعوں پر فرد کا گمان ہوتا ہے اور فرد کو معرا نظم نہیں کہا جا سکتا اس میں وحدت خیال اور تسلسل موضوع کی شرط لازمی ہے۔

۹ جون ۱۹۷۵ء

از عبدالحکیم عامر



ذکر اِک تقریب کا

جمعیت کے زیرِ تسلط شعبۂ صحافت میں صوبائی سیکرٹری اطلاعات کی آمد

پنجاب یونیورسٹی میں ایک عرصہ سے اسلامی جمعیۃ طلبہ کی حکمرانی ہے، یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی اکثر تقاریب میں بحیثیت مہمان خصوصی اپوزیشن سے تعلق رکھنے والی شخصیات مدعو کی جاتی ہیں اور پھر وہ مہمان خصوصی حضرات اپنی تقریروں میں حکومت کے خلاف زہر اُگل کر طلبہ کو بھڑکاتے رہتے ہیں، مگر اس کے برعکس شاذ و نادر ہی کوئی ایسی تقریب یا موقع دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومت سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو بحیثیت مہمان خصوصی یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا ہو، جب سے سابق گورنر پنجاب نواب صادق حسین قریشی نے جاوید ہاشمی کے زمانے میں یونیورسٹی میں آنے کا خمیازہ بھگتا ہے۔ آج تک حکومت سے تعلق رکھنے والے ہر اہم شخص امیر ہو یا وزیر یونیورسٹی کی کسی تقریب میں شرکت کرتے ہوئے کتراتا ہے۔ اس حقیقت سے مجھے انکار نہیں کہ آجکل جامعہ پنجاب کی باگ ڈور حکومت کے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جامعہ پنجاب میں حکومت کے حامی طلبا اور اساتذہ کی بھی کافی تعداد موجود ہے لیکن تعجب ہے کہ اپوزیشن کے رہنماؤں کو تو بڑے شوق سے مدعو کیا جاتا ہے مگر حکومت سے وابستہ اشخاص کا یونیورسٹی میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے اس بارے میں بارہا اپیل کر چکا ہوں کہ خدارا یونیورسٹی کو سیاسی پلیٹ فارم نہ بنایا جائے۔ اوّل تو سیاسی شخصیات کو یونیورسٹی میں مدعو نہ کیا جائے اگر ایسا ممکن نہیں تو کم از کم ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ حزب اقتدار اور حزب مخالف سے وابستہ افراد بلاخوف و خطر یونیورسٹی میں آ جایا کریں۔ جب سے پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی تقریب حلف برداری میں بحیثیت مہمان خصوصی مولانا مودودی کو شرکت کرنے سے روکا گیا جمعیت سے وابستہ اراکین سخت مضطرب دکھائی دے رہے تھے ایسے حالات میں کسی حکومت سے وابستہ شخصیت کا بحیثیت مہمان خصوصی یونیورسٹی میں تشریف لانا اور پھر تقریب کا پُرامن رہنا ناممکن تھا مگر شعبہ صحافت کے طلبہ و اساتذہ نے ۲۶ مئی کو ان مخصوص حالات کو بدلنے کی کوشش کی اور اس عملی اقدام میں کامیاب ہوئے۔ شعبہ صحافت جسے جمعیت کا گڑھ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے طلبہ کی اکثریت جمعیت سے وابستہ ہے۔ انجمن طلبہ شعبہ صحافت کے تمام عہدیداران جمعیت تعلق رکھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ سٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر منظور خان بھی اسی شعبہ میں سال اول کے طالب علم ہیں۔ جمعیت کے زیر تسلط شعبہ میں حکومت کے کسی فرد کا بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لانا نہایت حیران کن بات ہے (اصل حقائق صرف خدا یا پروفیسر وارث میر جانتے ہیں)

۲۶ مئی ۷۵ء بروز سوموار شام ۵ بجے انجمن طلبائے صحافت کے زیر اہتمام سال اول کے طلبہ کی طرف سے سال آخر کے طلبہ کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد ہوئی، تقریب کی چند اہم خصوصیات یہ تھیں کہ

صوبائی سیکرٹری اطلاعات شیخ حفیظ الرحمٰن (سرکاری نمائندہ) بحیثیت مہمان خصوصی تقریب میں شریک تھے، شعبہ صحافت کے مستقل اور غیر مستقل تمام اساتذہ شریک محفل تھے خاص کر اس تقریب میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی موجودگی سے سخت حیرت ہوئی (اپنی اس حیرت کا اظہار میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے بھی کر دیا)

نیو کیمپس کے وحید شہید ہال میں شام ۵ بجے تلاوت کلام مجید سے تقریب کا آغاز ہوا سب سے پہلے صدر انجمن طلبہ مس راحت آرا نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے مہمان خصوصی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے کہا کہ عموماً حکومت اور صحافیوں کی آپس میں ان بن رہتی ہے، مگر شیخ صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ صحافی ان سے پیار کرتے ہیں۔ سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے ہی انہوں نے شعبہ صحافت کے گھسے پٹے مسائل کا ذکر کیا۔ یعنی شعبہ سے اخبار کا اجرار کیا جائے۔ ویگن مہیا کی جائے۔ اور تصویروں کی لیبارٹری بنائی جائے وغیرہ۔

اس کے بعد صدر شعبہ صحافت پروفیسر وارث میر نے نہایت اچھے انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ چند طلبہ کو اعتراض تھا کہ عہدہ کرسی کے

نمائندے کو اپنی تقریب میں مدعو کیا جاتے
مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ شیخ
صاحب بیک وقت شخصیت ضرور ہیں مگر ان کی
شرافت و مقبولیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں
خصوصی شعبے کے عہدیداروں سے اتفاق کرتے ہوئے آج
استدعا کی ہے کہ وہ ہماری فریاد حکومت کے ایوان
تک پہنچائیں کہ شعبہ صحافت کے مسائل کی طرف
بھی توجہ مبذول کی جائے (موصوف نے بھی
مخصوص مسائل کا ذکر کیا) ہم نے تو مہمان خصوصی
کو کلیجہ نکال کے دکھا دیا ہے کہ کہیں بعد میں وہ
یہ نہ کہیں کہ مجھے خبر ہی نہ تھی۔ اس کے بعد شعبہ
صحافت کے قابل و ذہین طلبہ میں انعامات اور
تعریفی اسناد تقسیم کی گئیں۔ تقسیم انعامات کی رسم
مہمان خصوصی نے ادا کی۔ انعام یافتگان میں
مس راحت آرا، عبدالحکیم عامر، عزواللہ نثار، سجاد
شفیق، صفیہ چوہدری اور سلیم احمد کشفی شامل ہیں۔

تقسیم انعامات کے بعد مہمان خصوصی صوبائی
سیکرٹری اطلاعات نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"شعبہ صحافت کے طلبہ کی مشکلات دور کرنے میں حکومت ہر ممکن تعاون کرے گی اور اس شعبہ کو دنیا کی دیگر ایسی یونیورسٹیوں کی طرح جہاں صحافت کا مضمون پڑھایا جاتا ہے، سہولتیں مہیا کرانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اس شعبہ کے طلبہ کی عملی تربیت کے لئے شعبہ صحافت کا اپنا روزنامہ یا ہفتہ وار اخبار ضروری ہے اور میں اس ضمن میں شعبہ کو ضروری امداد دلوانے کے لئے حکومت سے گزارش کروں گا۔"

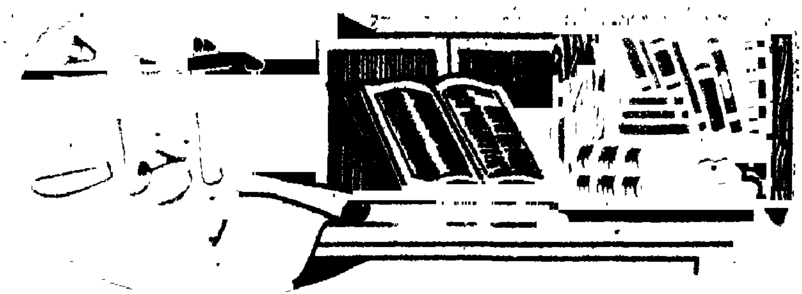
صوبائی سیکرٹری کا بحیثیت مہمان خصوصی شعبہ صحافت کی تقریب میں شرکت کرنا اور پھر تقریب کا امن و امان کے ماحول میں پایۂ تکمیل تک پہنچنا صدر شعبہ جناب وارث میر کو یہ ڈور یا کہہ کر بعض معتبر صحافتی "حلقے" پروفیسر موصوف کو سرکاری دربار کا استاد سمجھنے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے حضرات وارث میر کی صلاحیت فنی کا منہ بولتا ثبوت ہونا چاہیئے کہ وہ جامعہ پنجاب کے کمرہ میں ایک صنم کدہ کو کر کے انہیں خیریت سے واپس بھجوانے میں کامیاب رہے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

بقیہ: سیاسی ڈائری

عوام عوام کالانعام کی حاجات زیر دفعہ پر بھی ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کر دی جاتی ہے کہ اگر کوئی رنی میرا حد پر آپ آپ برائے پیش آپ بھی جلسہ گاہ سے اٹھے تو سادہ لباس میں پستول بدست کارکن سرکار حکم صادر کرتا ہے بیٹھ جاؤ۔ دوران تقریر جان گسل کسی دلپذیر پر آمادہ ہو رہے ہو۔ غدار معلوم ہوتے ہو کسی بیرونی طاقت کے گماشتے ہو، جوانمردی مجبوری کا بہانہ بنا رہے ہو ورنہ ارادے تمہارے خطرناک ہیں...... اُن تنخواہ داروں کی قسم کہ تقریر دونوں کانوں سے سننا، اور پھر آہ نہ بھرنا جن پر فرض ہے۔ قسم ان پٹواریوں کی۔ کہ زندہ لاشوں کے ٹرک بھر کر جلسہ گاہوں تک لے جانا جن کا حسن کارکردگی شمار ہوتا ہے جن پر تعزیر ہے۔ کہ جمع کرو اور پھر تا اختتام تقریر "بندی" بنا رکھو۔ کہ اسی کو جمع بندی کہتے ہیں...... میرے اردگرد رہو کہ یہی فن گرد آوری ہے...... قسم اُن بیرو مینوں کی جن کو بے راہ روی راس آگئی ہے...... میں حلف لیتا ہوں ان عوامی نمائندگان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر جو اپنی ہی ضمیر کا گلا دبانے میں اس قدر ماہر ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی ان کی وفاداری کی قسم پیچھے میں رکھ کر کھا سکتا ہے...... ان بازوؤں کی قسم جو کٹے ہوئے بازو کو علیحدہ اور آزاد جسم تسلیم کر لینے کے لیے کند بھیڑ کی طرح اٹھے۔ قسم ان درسگاہوں کی۔ جو قومی تحویل کے بہانے ادبی شنڈوں کے ہاتھوں میں دی جا کر لبتہ در بغل کی بجائے طمنچہ و خنجر در بغل کا درس دینے پر مصر ہیں...... قسم اس آئندہ نسل کی جو زندگی بھر اپنی نسل پیشرو کا ماتم کرے گی، قسم اس حقیقت پسندی کی کہ باپ مفروضہ نظر آنے لگے اور اس کا صرف ماں کا خاوند ہونا ہی تسلیم ہو......

قسم اُن کارخانوں کی جن کے مزدوروں کے سینوں میں "پس چہ باید کرد" کی آتش دوزخ نفس تک اٹھی ہے۔ قسم ہے مجھے کھلی کچہریوں کے اس ریٹھ کی۔ جس کی شرائط ملازمت میں یہ مضمون ابھر رہا ہے۔ کہ دباؤ اوپر سے نہیں نیچے سے ہونا چاہیئے۔ ہر چند عقل سرگردان ہے۔ ماتھا پیٹ رہی ہے۔ کہ دباؤ نیچے سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ تاوقتیکہ نیچے آتش فشاں اور اوپر پہاڑ نہ ہو۔ اور تباہ کن زلزلہ تقدیر ارض زیر عتاب قرار نہ پا چکا ہو۔ تاہم اس کلیہ کے ناکارہ ہونے پر دلیل تو وہ لائے۔ جسے تجربہ نہ ہوا ہو...... قسم ہے، مجھے ان استعفاجات کی۔ جن کو اعلیا رحمل بھی مخفی رکھنے پر مجبور ہے...... ہائے یہ مخفی استعفیٰ...... ہائے وہ داستان شب ناراضی...... اُف یہ تقریب صبح آئندہ...... قسم ہے مجھے اس دعویٰ کی، کہ اقتدار رہے نہ رہے۔ رشوت، بد عنوانی، غنڈہ گردی، بے راہ روی، دہشت انگیزی، نہیں رہے گی۔ جیسے اعلان خودکشی کیا جاتا ہو...... اعلان کچھ بھی ہو۔ سن لیجیئے کرو اور تسلیم کر لو کہ تاریخ کبھی احتساب سے فارغ نہیں ہوتی۔ کبھی غافل نہیں ہوتی اور جو لوگ اپنے شہری فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ مرتی ہے بلکہ وہ زندہ بھی رہا، تو کیا۔



انجمن ترقی اُردو کہاں سے کہاں پہنچی

بھوپال کے شیش محل میں یوم اقبال

انجمن ترقی اُردو کا سفر نامہ

انجمن ترقی اُردو دہلی نے بعض کتابوں کی کرر اشاعت کے سلسلہ میں رُوحِ اقبال کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے زیر صدارت ۱۹ اپریل کو ایک تقریب منعقد کی۔ جناب سروپ سنگھ سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی جنہیں اُردو سے والہانہ عشق ہے، اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے، جو گیارہ کتابیں انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہیں، ان میں ۴ کتابیں بابائے اُردو عبدالحق مرحوم کی ہیں، جناب خلیق انجم نے اپنی فاضلانہ تقریر میں، انجمن کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے جو کچھ بتایا وہ ہم اس لیے نقل کرتے ہیں کہ قارئین چٹان انجمن کی تاریخ سے آگاہ رہیں کہ اس کے سفر کی روداد کیا ہے، محترم خلیق صاحب کے الفاظ میں:

انجمن کا قیام ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دلّی میں ہوا تھا اس زمانے میں اس کا صدر مقام علی گڑھ میں تھا۔ انجمن کے پہلے صدر علی گڑھ کالج کے مشہور انگریز پروفیسر ٹامس آرنلڈ ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے استاد تھے۔ سر ٹامس آرنلڈ کے بعد سر تیج بہادر سپرو کے صدر ہوئے۔ سپرو صاحب کے بعد ہردے ناتھ کنزرو انجمن کے صدر ہوئے اور ان کے بعد اُردو کے بیباک مجاہد پنڈت آنند نرائن ملا نے کرسی صدارت سنبھالی اسی طرح انجمن کے سب سے پہلے جنرل سیکرٹری مولانا شبلی نعمانی تھے۔ ان کے بعد مولوی حبیب الرحمان شروانی انجمن کے جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا تو اسی سال ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس رنگون میں عزیز مرزا انجمن کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، مگر وہ دوسرے ہی سال فوت ہو گئے ۱۹۱۲ء میں کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں جو میجر سید حسن بلگرامی کی صدارت میں منعقد ہوا صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی تجویز پر اتفاق رائے سے مولوی عبدالحق انجمن کے جنرل سیکرٹری مقرر کئے گئے اور برصغیر کی تقسیم تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۱۳ء میں مولوی صاحب نے انجمن کا دفتر علیگڑھ سے اورنگ آباد منتقل کر دیا جہاں وہ ریاست حیدر آباد کے محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا صدر مقام دلّی مقرر ہوا اور مولوی صاحب جو ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے انجمن کے دفتر سمیت دلّی آ گئے۔ نمبر ۱ دریا گنج والے مکان میں (جو انصاری صاحب کی ملکیت تھا) انجمن کا دفتر اور مولوی صاحب کی رہائش تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے فساد میں انجمن کا دفتر بھی تباہ ہوا سارا سامان لٹ گیا اور اس کا ایک کارکن اور اس کے بال بچے قتل کر دیئے گئے۔ مولوی صاحب پاکستان ہجرت کر گئے، اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

مولوی صاحب کے بعد قاضی عبدالغفار صاحب انجمن کے سیکرٹری ہوئے۔ ان کے بعد پروفیسر آل احمد سرور۔ سرور صاحب نے ایک طویل مدت تک انجمن کی قابل قدر خدمت کی اس کے بعد انجمن کا اعتماد مجھ خاکسار کو حاصل ہوا...... بابائے اُردو کے ایک خواب کی نامکمل تعبیر (اردو گھر) کے ساتھ!

یوم اقبال شیش محل میں

ہماری زبان دہلی کے شمارہ ۲۲ مئی کی روایت کے مطابق بھوپال مرحوم کے شیش محل میں جہاں

اقبال سے وابستہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ گزشتہ سال یوم اقبال کے موقع پر اس تقریب میں مقامی فضلاء نے تحریک کی کہ شیش محل کو علامہ اقبال سے منسوب کر کے ایک لائبریری قائم کی جائے، جس میں ایک ادبی مرکز ہو جس کی ضرورت ہماری زبان سے ماخوذ ہے۔

گزشتہ اتوار کو بھوپال کی اس تاریخی شیش محل میں جہاں علامہ اقبال مقیم رہے ہیں۔ اقبال لائبریری کے زیر اہتمام ایک بڑا جلسہ عام منعقد ہوا۔ جس میں علامہ اقبال کے عقیدت مندوں کے علاوہ شہر کے دیگر معززین اور تعلیم یافتہ حضرات نے شرکت کی کرنل شیو کمار صاحب بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور مختار الدین صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی پروگرام کا افتتاح علامہ اقبال کی نظموں سے ہوا اس کے بعد جناب ممتاز علی قصور صاحب اور جناب بھیا حسین ضیاء نے علامہ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

نثری پروگرام میں پروفیسر سید عباس رضوی نے کلام اقبال کو وطنیت، ملت اور انسانیت کا ایک حصہ قرار دیا۔ آپ نے کہا کہ اقبال کا درجہ یہ ہے کہ مبصران پر قلم اٹھا کر خود کو متعارف کراتا ہے۔ اقبال کی نثر و نظم دونوں میں انسان، خدا اور کائنات کے رشتوں کا جائزہ لیا گیا ہے آپ نے کہا کہ وطنیت فکر اقبال کا آغاز ہے اور انسانیت نقطہ عروج اس کے بعد مولانا آصف شاہمیری صاحب نے اقبال کی حب الوطنی پر مفصل مضمون پڑھا۔ آپ نے کہا کہ آجکل نقاد علامہ کے بعض اشعار کو غلط نقطہ نظر سے جانچ رہے ہیں علامہ نے کبھی بھی اپنے وطن کے خلاف نہیں لکھا، انہوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو امن و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ ان کی نظم و نثر دونوں میں ایک ولولہ انگیزی ہے جو خون میں حرارت پیدا کرتی ہے اور جس سے احساس خود بیدار ہوتا ہے وہ نقاد جو علامہ پر تنقید کر رہے ہیں خود اپنے افکار میں ایسے الجھے نظر آتے ہیں کہ اس کا کسی منزل پر

ہفت روزہ چٹان لاہور

پیچیدہ مشکل نظر آتا ہے۔ شاہمیری صاحب کے بعد حلیم حسین صاحب نے اقبال کی شاعری کے مختلف زاویوں کو کھولنے کی کوشش کی آپ نے فرمایا کہ اقبال کی شاعری ایک چیلنج ہے۔ اس کے بعد جناب ممنون حسن خاں جن کا کچھ وقت علامہ کی خدمت گزاری میں بھی صرف ہوا، اور اپنے مخصوص انداز میں علامہ کی زندگی کے کچھ حالات بیان فرمائے۔ بالخصوص وہ واقعات جن کا تعلق علامہ اقبال کے اس دور سے تھا جب وہ شیش محل میں مقیم تھے۔ ان واقعات کے اظہار کے بعد ممنون صاحب نے فرمایا کہ وطنیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک جغرافیائی دوسرا سیاسی۔ جسے انگریزوں نے پیش کیا۔ حب الوطنی پر آپ نے علامہ کی ایک فارسی نظم کا ترجمہ پیش کیا۔ جس پُر اثر انداز میں لوگوں کو وطن سے محبت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ آپ کی تقریر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ نے علامہ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا جبکہ آپ شاعر نہیں ہیں۔ اس کے بعد ممنون صاحب نے گزشتہ سال یوم اقبال پر پاس کی گئی اس تجویز کا ذکر کیا جس میں شیش محل کو محفوظ کر کے لائبریری کو دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ چونکہ باوجود کوشش بسیار کے اس سلسلہ میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے اس لیے اس تجویز کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ آپ نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ کیا اچھا ہو کہ اس عمارت کے کم از کم اس حصے کو تو ضرور محفوظ کیا جائے۔ جس میں یہ عظیم ہستی رہ چکی ہے، تاکہ ایک ادبی مرکز یہاں قائم ہو سکے اور ایک یادگار بنائی جا سکے۔ آپ نے کہا کہ یہ سرکار کا ایک بہت بڑا کام ہو گا اور ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی پوسٹ ماسٹر جنرل شیو کمار صاحب جن کو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ تشریف لائے اور اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ واقعی اقبال بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں معنویت ہے اور انسانیت کے لئے ایک پیغام ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے ان کے دل میں ایک تڑپ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کا مرتبہ بلند ہو، آخر میں آپ نے شیش محل کو محفوظ کیے جانے کی تجویز کی حمایت کی۔ اس کے بعد صدر جلسہ مختار امیر نصر صاحب نے اقبال کی عظمت سے متعلق کچھ واقعات بیان کئے اور بتایا کہ وہ اپنے دور میں کس قدر ہردلعزیز تھے اور عوام ان کا احترام کرتے تھے۔

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب آفتاب سرور کاشمیری صاحب، سول جج درجہ اول جج فیملی کورٹ و رینٹ کنٹرولر سرگودھا۔

دعویٰ دیوانی

رحم ولد مولو قوم بلوچ سکنہ چک نمبر ۵۲ جنوبی تحصیل و ضلع سرگودھا (مدعی)

بنام فتح بی بی عرف فتیں زوجہ رحم قوم بلوچ سکنہ چک نمبر ۵۲ جنوبی تحصیل و ضلع سرگودھا

دعویٰ اعادہ حقوق زن و شوئی

رحم بنام فتح بی بی عرف فتیں زوجہ رحم قوم بلوچ سکنہ چک ۵۲ جنوبی تحصیل و ضلع سرگودھا

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسماۃ فتح بی بی مذکورہ تعمیل سمن سے دیدہ دانستہ گریز کرتی ہے اور روپوش ہے اس لیے اشتہار ہذا بنام مسماۃ فتح بی بی مذکورہ جاری کیا جاتا ہے کہ اگر فتح بی بی مذکورہ تاریخ ۱۸ ماہ جون ۱۹۷۵ء کو حاضر عدالت ہذا نہیں ہو گی تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آئے گی۔

آج بتاریخ ۲۷ ماہ مئی ۱۹۷۵ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط سول جج درجہ اول

مہر عدالت

ریاض میں سادات، اسد اور شاہ خالد کی کانفرنس

مشرق وسطیٰ کے لئے نیا لائحہ عمل

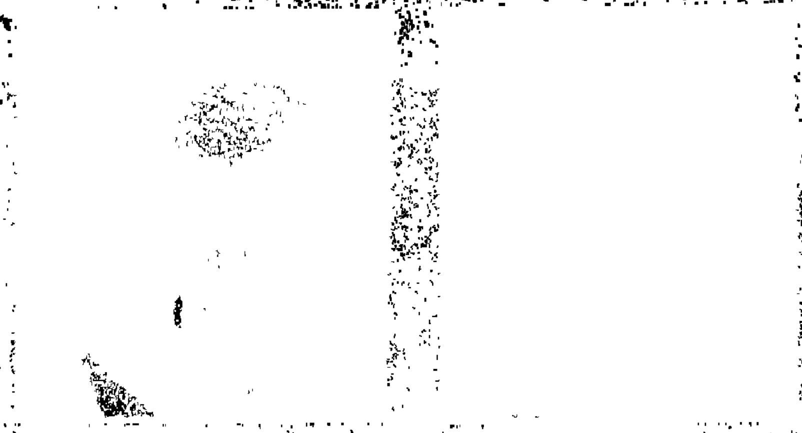
عمان کے آزاد اخبار "الدستور" کی رپورٹ کے مطابق اسرائیل نے اردن اور شام کی سرحدوں پر اپنی فوجیں اکٹھا کرنی شروع کر دی ہیں۔ اردن کے مقبوضہ مغربی کنارے پر اسرائیلی ٹینکوں اور توپوں اور میزائیلوں کی نقل و حرکت دیکھنے میں آ رہی ہے ۱۹۷۳ء کی جنگ کے خاتمہ کے بعد اسرائیلی ریزرو فوج کے ہزاروں نوجوانوں کو چھٹی دے دی گئی تھی۔ لیکن اب انہیں دوبارہ سروس پر واپس بلایا گیا ہے اور انہیں فوجی ٹرکوں میں بھر کر تیزی سے شام اور اردن کی سرحدوں پر روانہ کیا جا رہا ہے۔

نئی جنگ کا خطرہ

شام اور اردن کی سرحدوں پر اسرائیلی فوجی نقل و حرکت دیکھتے ہوئے عرب ممالک یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک بار پھر اسرائیل سے ایک خطرناک جنگ لڑنی ہو گی۔ وہ اسرائیلی نقل و حرکت سے غافل نہیں ہیں بلکہ وہ ... کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں ان ... اسرائیلی وزیر دفاع شیمن پریس کا بیان بھی ہے۔ اسرائیلی وزیر دفاع نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسرائیل کو بہت جلد جنگ کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور مصر پر الزام لگاتے ہوئے کہا تھا کہ مصر سوئز نہر کے دوسرے کنارے پر زبردست جنگی تیاریاں کر رہا ہے اسرائیلی وزیر دفاع کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے۔ جیسے اس طرح کے الزامات لگا کر اسرائیلی حملے کے لیے پہلے سے زمین ہموار کر رہا ہے۔

گہری سازش

مشرق وسطیٰ کی سیاست کے ماہرین کو اس بات پر بیحد حیرت ہے کہ اسرائیل، اردن کے مغربی کنارے پر اپنی فوجیں کیوں اکٹھی کر رہا ہے۔ حالانکہ اردن سے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسرائیلی فوجی جنرل اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر مشرق وسطیٰ میں نئی جنگ ہوئی بھی تو گزشتہ جنگ کی طرح شاہ حسین اردن کا محاذ ... ہوں گے اس یقین کے باوجود اسرائیل خصوصی توجہ کیوں صرف کر رہا ہے۔ اسرائیل کے اس عجیب و غریب اقدام میں سیاسی ماہرین کسی گہری سازش کی بو سونگھ رہے ہیں۔ انہیں اس وجہ سے اور بھی شبہ ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ اسرائیلی فوجیں اردن کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں شاہ حسین بات چیت کے لیے واشنگٹن تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی معمول سے زیادہ آؤ بھگت ہوئی، امریکی حکومت نے انہیں نہ جانے کیا سبق پڑھایا کہ وہ بڑے خوش اور مطمئن گھر واپس لوٹے اور دوسرے ہی دن اخباروں میں یہ خبر آئی کہ امریکا اردن کو ہتھیار سپلائی کرے گا۔ ایک طرف اردن پر حملے کا پلان تیار ہے اور دوسری طرف امریکا شاہ حسین کو ہتھیار دے رہا ہے۔ آخر اس کے پیچھے کیا راز ہے۔ ہمارے سیاسی مبصرین کا تجزیہ ہے کہ ایک طرف اردن کی سرحدوں پر فوجیں اکٹھا کر کے اور دوسری طرف شاہ حسین کے ساتھ دوستی مضبوط کر کے اور انہیں ہتھیار سپلائی کر کے امریکا نے دو زبردست خطرناک چالیں چلی ہیں۔



سادات اور اسد کا سیاسی قتل

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد اپنی زبردست کامیابیوں کی وجہ سے صدر سادات اور حافظ الاسد پورے عالم اسلام کے ہیرو بن گئے تھے انہیں مشرق وسطیٰ کی سیاست میں خاصا وزن حاصل ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد سادات اور حافظ الاسد کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ نوجوان ٹی شرٹ پر ان کی تصویر لگائے پھرتے تھے امریکا نے پہلے تو ان دونوں ابھرتی ہوئی شخصیتوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ حافظ الاسد کو تو وہ امریکا نواز بنانے میں کامیاب نہیں ہوا لیکن کسنجر کے ذریعے وہ سادات پر ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہو گیا سادات جنہیں جنگ کے دوران روس سے مدد ملی تھی۔ امن کے دوران انہوں نے امریکا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور امریکا کی مداخلت سے عرب اسرائیل تنازعے کو حل کرنا چاہا لیکن تقریباً دو سال تک کسنجر کے چکر میں پڑے رہنے کے بعد انہیں احساس ہو گیا کہ انہوں نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا اور اگر انہوں نے بہت جلد امریکا پر انحصار ختم نہیں کیا تو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اسی دوران شاہ فیصلؒ کا قتل ہوا اور قتل میں امریکی سازش کے شبہے نے امریکا پر ان کے اعتماد کو مزید متزلزل کر دیا اور وہ اب چینی سے کسی نئے راستے کی تلاش کرنے لگے چنانچہ گزشتہ مہینے ریاض میں سادات، اسد اور شاہ خالد کی کانفرنس ہوئی، جس میں مشرق وسطیٰ کے لیے نیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ نئی پالیسی یہ تھی کہ عرب ممالک امریکا پر انحصار ختم کریں اور روس کے ساتھ اپنے تعلقات سدھاریں، نیز دوسرے یورپین ممالک سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس نئی پالیسی کے نتیجے میں روس اور عرب ممالک کے درمیان تیزی سے لیڈروں اور ڈیلیگیشنوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔

عربوں کے اور خاص کر سادات کے روس کی طرف رجحان کو دیکھتے ہوئے امریکا کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ مشرق وسطیٰ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اب اس نے ایک نئی پالیسی بنائی ہے کہ سادات اور اسد جیسے لیڈروں کی پوزیشن گھٹانے کے لیے اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں انہیں بے وزن بنانے کے لیے کسی ایسی شخصیت کو ابھارا جائے جو پوری طرح امریکا نواز ہو۔ گویا امریکا سادات اور اسد کو سیاسی طور پر قتل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس کے سامنے شاہ حسین سے بہتر اور کوئی شخصیت نہیں ہے۔ امریکا شاہ حسین کو ہتھیار سپلائی کر کے انہیں مصر اور شام کے مقابلے میں مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ تاکہ مشرق وسطیٰ میں وہ سادات اور حافظ الاسد کا مقام حاصل کر لیں اردن کی سرحد پر اسرائیلی فوجوں کی نقل و حرکت دیکھتے ہوئے یہ بھی امکان ہے کہ اسرائیل اردن پر حملہ کر دے گا۔ اور اردن امریکی ہتھیاروں کے ذریعے اسرائیل کو پیچھے دھکیل دے گا اس طرح شاہ حسین عالم اسلام کے ہیرو بن جائیں گے اور سادات اور حافظ الاسد خود بخود سیاسی طور پر قتل ہو جائیں گے۔

امریکا کی دوسری چال یہ ہے کہ وہ اسرائیل اور اردن کے درمیان جنگ چھیڑ کر درمیان میں فلسطینیوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اس سے قبل بھی شاہ حسین کی بندوقوں سے ہزاروں فلسطینیوں کا سینہ چھلنی ہو چکا ہے، امریکہ ایک بار پھر اس کو دہرانا چاہتا ہے اگر اسرائیل اور اردن کے درمیان جنگ چھڑی تو نہ اس سے اسرائیل کو نقصان پہنچے گا نہ اردن کو، صرف فلسطینیوں کو پہنچے گا۔ فلسطینی مظلوم پناہ گزین سامنے اور پشت دونوں طرف سے مارے جائیں گے اگر جنگ میں اسرائیل کو مقبوضہ مغربی کنارہ خالی کرنا پڑا۔ تو بھی اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسے بہرحال مغربی کنارہ خالی کرنا ہے اگر وہ مصالحت کے ذریعے علاقے خالی کرے تو مغربی کنارے کے مالک فلسطینی ہوں گے اور اگر اردن کے ساتھ جنگ میں وہ علاقے خالی کرے گا تو یاسر عرفات کی بجائے شاہ حسین فلسطینیوں کے مختار بن جائیں گے جو اسرائیل اور امریکا دونوں کے مفاد میں ہے۔

فلسطینیوں کے قتل عام کی کوشش اس سے قبل لبنان میں بھی کی جا چکی ہے۔ لبنان فلنجسٹ پارٹی (کتائب پارٹی) نے فلسطینیوں کا قتل عام کر کے انہیں تشدد کے لیے اکسانے کی سعی کی تھی۔ تاکہ فلسطینیوں کے خلاف طویل جنگ شروع ہو جائے اور پورے لبنان میں ان کا قتل عام ہو، مگر فلسطینی مجاہدوں نے اس بات کو سمجھ

ہفت روزہ چٹان لاہور

THE MOST ELUSIVE SPY.

انتہائی عیار جاسوس

میں نے جگہ اور وقت کا انتخاب گیانی پر چھوڑ دیا اور صرف اسی صورت میں کسی تبدیلی کی خواہش کا اظہار کرتا۔ اگر مجھے محسوس ہوتا کہ یہ جاسوس کو کامیابی سے زغے میں لینے کے لئے موزوں نہیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ گیانی کو میرے سے زیادہ مضطرب ہونے یا کوئی غلط بات کرنے سے میرے متعلق کسی قسم کا شبہ گزرے۔ ایک سراغرساں، ایک فقیر کی طرح پسند و ناپسند کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ تاآنکہ اس کا مشن ہی ناکامی سے دوچار ہونے کے خطرے میں نہ ہو۔ میں نے ہر اُس چیز سے اجتناب کیا جس سے میرے اشتیاق کی فراوانی کا اظہار ممکن ہو۔ اور سارے طریقۂ کار کو متذکرہ صورت حال کے پیش نظر اس درجہ قدرتی اور لطیف رنگ دیا جتنا کہ انسانی طور پر ممکن تھا۔ میں نے گیانی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ شہر اور اسد گرد کے لوگ مرے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ دراصل میں صحیح نشانے پر تیر لگانے کا آرزومند تھا۔ عجائب سنگھ کو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اور اُس کی جو وضاحت اسماعیل نے بیان کی تھی اُس کی روشنی میں تیر کے خطا ہونے کا اندیشہ تھا۔ مزید برآں یہ سارا علاقہ سکھوں کا تھا۔ اور لمبی داڑھیاں یا لمبے بال کسی بھی سکھ علاقے میں اس قدر عام ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کا امتیاز آسان کام نہیں ہوتا۔ قدرت اگرچہ دو چہرے من وعن ایک جیسے تو نہیں بناتی۔ لیکن وہ سکھوں کے معاملہ اپنی اس صنعت میں کافی یکسانیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی اکثریت ایک دوسرے کا مثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ رات کے وقت تو اُن کی پہچان اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور جب تک کہ آدمی کسی سکھ کو بالمشافہ دیکھ نہ لے یا اُس کی آواز نہ سُن لے، اُس کی شناخت ممکن نہیں۔ اسی صورت حال کے پیش نظر مجھے یہ شبہ تھا کہ عجائب سنگھ کی سُنی سنائی شکل وشباہت یا اُس کی ایک تصویر سے اپنے ذہن میں بنائی ہوئی جسمانی ہیئت مرے لئے کامیابی کا ذریعہ بن سکے گی۔ لہٰذا میرا یہ خیال تھا کہ اگر وہ رات کے وقت گیانی کے ساتھ اکیلا آئے گا تو اُسے پہچاننے میں اس لئے بھی آسانی ہو گی کہ گیانی چھ فٹ کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا اور یہ قد وقامت اتنی عام نہیں۔ اب تو میں گیانی کا کُلی کُنا اور اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ میں نے اُس سے عرض کیا۔

میں: گیانی صاحب! بہتر ہو کہ آپ بھی اُس کے ہمراہ آئیں۔ آپ اتنے پیارے ہیں اور میں آپ کی ہم نشینی کا اس درجہ مشتاق ہوں کہ اس طرح مجھے ایک بار اور آپ سے ملنے کا موقع نصیب ہو جائے گا۔ باور کیجئے یہ نہ تو خوشامد اور نہ محض تعریف وستائش بلکہ آپ کو دوبارہ ملنا مرے دل کی بھرپور خواہش ہے۔ آپ ہمارے مشن کی نوعیت سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا میں سٹیشن کی کسی تاریک نکڑ میں چھپ کر بیٹھوں گا۔ آپ اور عجائب سنگھ جب ویٹنگ ہال (انتظارگاہ) میں داخل ہوں تو پانی کے نل کے نزدیک بچھے بنچ پر تشریف رکھیں اور مجھے کسی فرضی نام سے باآواز بلند پکاریں تو میں وہیں ادھر اُدھر سے نکل آؤں گا۔

گیانی: مجھے منظور ہے! میں عجائب سنگھ کے ساتھ ہی آؤں گا اور تمہیں "رام پرکاش" کے فرضی نام سے آواز دے کر اپنی آمد سے مطلع کر دوں گا۔

میں: آپ کی اس درجہ دلچسپی کا شکریہ! اب میں رخصت چاہوں گا۔ آپ تیسرے درجے کے ویٹنگ ہال میں ضرور پہنچ جائیے۔ میں بھی مقررہ جگہ سے بالکل قریب ہی کسی خفیہ جگہ پر موجود ہوں گا۔

گیانی: اب چار بجے ہیں۔ باقی وقت تم کہاں رہو گے؟ کیوں نہیں یہیں آرام کرتے!

میں: آپ کی اس درجہ مہمان نوازی کا شکریہ! میں عجائب سنگھ کو بتاؤں گا کہ آپ اپنے پیشے اور شہرت کے مطابق نہایت ہی اچھے آدمی ہیں۔ میں اُسے آپ جیسے نگہدار، ہمدرد اور محب وطن کا اعتماد وتعاون حاصل کرنے پر مبارک باد دوں گا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ جب مجھ ایسا ایک اجنبی آپ سے ملنے کے لئے آیا اُس وقت آپ کے دوپہر کے کھانے



بتک دیا۔ آپ شرافت و نجابت کی آن صورت سے
بھی متجاوز ہیں جہاں میرا دل آپ کو سنت وردو شی
سیوا سنگھ کہہ کر پکارنے کو چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ
آپ جانتے ہیں میں اپنے ملک کی خاطر جان کی بازی
لگائے پھرتا ہوں اور مجھے اسی طرح گھوم پھر کر ہی
وقت کاٹنا چاہیئے۔ میں ایک جگہ پر بہت مختصر قیام
کرتا ہوں اور اسی لئے اب مجھے ایک منٹ بھی
آپ کے گھر پر ٹھہرنا نہ چاہیئے۔ مجھے امید ہے
آپ میرے مزید قیام سے انکار یا شام کو آپ
سے ملاقات کے درمیانی وقت کا استعمال بتانے
سے انحراف کو بُرا نہیں منائیں گے۔ بہرحال یہ
ہماری پہلی ہی ملاقات تو ہے اور جیسا کہ آپ
کو علم ہے میں اپنے سائے سے بھی گریزاں ہوں۔
میں توقع کرتا ہوں کہ آپ میری صاف گوئی کو محسوس
نہ کرتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دیں گے۔
میں مجاہب سنگھ کے ساتھ ریلوے سٹیشن پہ آپ
سے ملاقات کا منتظر رہوں گا۔
دگیانی رضامند ہو گیا اور مرسے حذبِ الوطنی

گیانی کے ساتھ بے حد پیار اور محبت سے
تھی جس میں قریب منٹ کے وقت تک گرم
گفت بات چیت ہوتی رہی۔ ایک پولیس افسر کو
اس قسم کے سابقہ کی صورت میں اپنے آپ پر
مکمل قابو رکھتے ہوئے فوری جواب دینے کی اہمیت
کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ میں گیانی کے انتہائی نازک
سوالوں کی متعدد یلغار سے بڑے عزم و احتیاط کے
ساتھ عہدہ برا ہوا۔ اس نے میری شخصیت کا تار و پود
بکھیرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور اپنے دیئے
ہوئے قہقہوں کی زد پر لا کر مجھ سے غلطی کا ارتکاب
کرانے کی سعیٔ لا حاصل ہے۔ جو کچھ مجھے علم تھا
اس سے کہیں بڑھ کر بھرپور سوالات اس نے
مجھ سے کئے اور اس نے میرے حواس خمسہ کو
بالعموم اور زبان، کان اور آنکھوں کو بالخصوص
حیرت انگیز طور پر مصروف رکھا۔ میں خوش تھا کہ گیانی
میرے بے داغ مالۂ اور ساملیہ سے مطمئن ہوا۔
اور یہ کہ جو کچھ میرے پاس موجود تھا اس میں سے

بہت ہی تمام شعار سے مجھ سے منسلک کیا۔

بقیہ :- متحرک آوازیں

کسی واسطے سے یہ خبر چھپی کہ آپ نے دوبارہ
ہندو دھرم قبول کر لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوا تو
یہاں کئی دوستوں کو خط لکھا اور وہاں اخبارات
میں بیان دیا کہ میں نے پاکستان اس لئے نہیں
چھوڑا کہ میں ہندو مت کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں
میں مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گا، میرا دین
کسی خطے کی سیاست سے وابستگی نہیں ہے۔
جہاں تک زیرِ تذکرہ کتاب کا تعلق ہے
اس کے بعض حصے ہم آئندہ اشاعتوں میں
مطالعہ کی دلچسپی کے لیے نذرِ قارئین کریں گے
لیکن ایک چیز ہی سے اندازہ کر لیجیے کہ
ہندوستانی مسلمان کن حالات سے گزر رہے ہیں
گاباصاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء میں جب
ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہوئی تو ڈاکٹر
ذاکر حسین ہندوستان کے نائب صدر تھے لیکن
ان کے متعلق یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ پاکستان کو
معلومات مہیا کرتے ہیں۔ جب ذہنی سانچے
اس طرح ڈھلے ہوں تو ہندوستانی مسلمانوں پر جو
بیتتی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔
گاباصاحب نے حکومت کے مختلف شعبوں
میں مسلمانوں کی حالتِ زار اعداد و شمار کی روشنی
میں پیش کی ہے اور جو تصویر کھینچی ہے پوری
ذمہ داری سے کھینچی ہے جو لوگ ان کے طرزِ
تحریر کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان
کے قلم میں رنگینی ہے لیکن اس کتاب میں
انہوں نے انشاء پردازی نہیں کی، حقائق سرائی
کی ہے۔ ایک دوست کی روایت ہے کہ حکومت
ہند نے اس کتاب کو ضبط کرنے کی نادانی نہیں
کی، لیکن پبلشر سے تمام نسخے خرید کر موقوف
کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی اخبارات
میں کتاب کا ذکر تک نہیں ہوا۔

بشکریہ "الجمعیۃ" دہلی

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کا مجسم نمونہ تھے ملک کو غیر ملکی پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لیے قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا اور ہر قسم کی قربانیاں کو لبیک کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں نہ صرف غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف وہ ہمیشہ نبرد آزما رہے بلکہ خود اپنوں کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں کا بھی نشانہ بنے رہے۔ لیکن ان میں یہ خوبی تھی، کہ ان کو صبر کے ساتھ برداشت کرے اور خندہ پیشانی کے ساتھ پریشان کن حالات کا سامنا کرتے تھے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے میری سیاسی تربیت اور رہنمائی پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی، غلطیوں پر تنبیہ اور صحیح عمل پر داد تحسین سے ہمت افزائی ان کی خاص عادت تھی۔ وہ بلا کسی جھجک کے حق گوئی میں پس و پیش نہ کرتے تھے وہ صاحب رائے سیاستدان اور مستقل مزاج رہنما تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ قدرت نے انہیں بصیرت، تدبر، معاملہ فہمی اور دور بینی کی اعلیٰ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔

انہوں نے مجلس احرار ہند کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض کو جس طریقہ سے پر انجام دیا اور ضبط و نظم کو جس صورت میں قائم رکھتے ہوئے مخالفتوں کے طوفانوں کا مقابلہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان کے تعلقات بہت زیادہ گہرے تھے اور حضرت شاہ صاحب ان کی رہنمایانہ صلاحیتوں سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اس لیے ان کی رائے کے مطابق عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے آج بھی میرے کانوں میں حضرت شاہ صاحب کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر حضرت مولانا صاحب کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ

"مولانا حبیب الرحمٰن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کردار کا عکس ہیں"

میرا متعدد بار کا مشاہدہ ہے کہ احرار کے اجتماعات کے موقعہ پر ہنسی مذاق ہو رہا ہے کہ حضرت مولانا تشریف لائے تو سب مؤدب ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ پوری مجلس ان کے رعب اور بزرگی سے متاثر ہے۔

درحقیقت مولانا مرحوم کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے ان کا سیاسی کردار بے داغ اور اتنا اعلیٰ تھا کہ اس کی بنا پر ان کا مقام، ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں کی صفِ اول میں رہا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مہاتما گاندھی ہوں یا پنڈت نہرو، مولانا آزاد ہوں یا سبھاش چندر بوس، سردار پٹیل ہوں یا ڈاکٹر راجندر پرشاد ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا اور مولانا مرحوم حسب عادت ان سے صاف گوئی کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔

اس موقعہ پر ایک واقعہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانہ میں لکھنؤ سے ملک احمد مرحوم نے تار دیکر بلایا اور بتایا کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ قدوائی صاحب سے میری ملاقات۔ انہوں نے فرمایا کہ اس تحریک میں احرار بھی حصہ لے رہے ہیں لیکن ان باتوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، میری رائے اور مشورہ احرار لیڈروں تک پہنچا دیا جائے۔ جس کا میں نے وعدہ کیا اور لدھیانہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر میری جو گفت گو ہوئی تھی عرض کی۔ تب مولانا مرحوم نے ان لیڈروں کے اجتماع کا لاہور میں انتظام فرمایا کہ جو جیل سے باہر تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد قدوائی صاحب سے مل کر مزید گفتگو کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ حضرت مولانا مرحوم اور میرے یہ کام سپرد کیا گیا لیکن واپسی پر میں بیمار ہو گیا اور سہارنپور سے حضرت مولانا پہلے لکھنؤ جا کر قدوائی سے ملے اور پھر قدوائی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ سے ملے۔ اور پھر قدوائی صاحب نے مولانا آزاد علیہ الرحمۃ وغیرہ سے جو جیل میں تھے۔ مولانا مرحوم کی ملاقات کا انتظام کرایا۔ چنانچہ بات چیت کے بعد ایک مسودہ تیار ہوا جس کی آخری منظوری گاندھی جی سے منگانے کا پروگرام بنا۔ ان تجاویز میں ایک بات یہ بھی طے پائی تھی کہ غیر ملکی حکومت سے اگر کسی وقت کوئی گفت گو ہوگی تو اس میں احرار کا نمائندہ بھی شامل کیا جائے گا۔ لیکن اس گفتگو کی بات الہ آباد سی آئی ڈی کو معلوم ہو گئی۔ چنانچہ مولانا مرحوم کو واپسی پر لاہور میں، اور قدوائی صاحب کو لکھنؤ میں گرفتار کر لیا گیا۔

مولانا مرحوم کی کئی اہم موقعوں پر رہنمایانہ سرگرمیوں کی اور بھی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایام ماضی کا تصور کرتا ہوں تو بہت سے واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں کبھی فرصت میں ضرور لکھوں گا انشاء اللہ!

فرائض منصبی انجام دہی کی مصروفیات سے اتنا وقت بھی بمشکل نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں۔

بقیہ :- ڈاکٹر سید عبداللہ

اور اسے حرکت، حرارت، ذہانت، اضطراب اور بے تابی کی صفات سے متصف کیا ہے۔ اور یہ بھی بعض نظموں میں ہے کہ اس کا وجود نفی و مزاحمت کا وسیلہ ہے، جس کا مقابلہ خیر اور اثبات کو کرنا پڑتا ہے۔

اقبال کی بعض نظموں اور شعروں میں ابلیس کی جس طرح تعریف کی گئی ہے۔ وہ کھٹکتی ہے مگر یہ امر ہر حال میں مدنظر رہے کہ اقبال کی ابلیس کی تعریف کر کے بھی آدم ہی کی برتری جتاتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ آدم ابلیس ایسے زیرک، ذہین، سرگرم اور چالاک حریف سے محض عشق کی بدولت بازی لے جاتے ہیں۔ اور اب بھی اس کی طرف سے جو عیاری اور چالاکی اور مزاحمت ہے وہ ابن آدم کے جوہر عشق کو آزمانے اور اس کی ترقی کے راستے صاف کرنے کی خاطر ہے۔ غرض یہ مزاحمت اور پیکار اس کی خودی کے استحکام کا ذریعہ ہے۔

بقیہ :- شذرہ

کی حالت زار ہے۔ جتنی گندگی اب ان ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتی ہے آزادی سے پہلے اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک برانچ لائنوں کا تعلق ہے ان کی حالت انتہائی ناقص ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لاہور جیسے شہر میں جو پاکستان کا دل ہے۔ بعض ریلوے پل پیپلز پارٹی کے آغاز اقتدار سے بن رہے ہیں لیکن ابھی تک مکمل نہیں ہو سکے اور نہ جانے کے برس تک مکمل نہ ہو سکیں گے۔ خدا گواہ ہم بالکل نہیں جانتے کہ ریلوے کے ٹھیکیدار کون ہیں؟ لیکن ہم وزیر مواصلات اور ان کی وساطت سے وزیر اعظم کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ ریلوے کے رنگا رنگ لیکن مستقل ٹھیکیداروں سے قومی معاشیات کو نجات دلائی جائے۔ جب تک یہ لوگ ریلوے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں ریلوے کا محکمہ اپنے اندھیروں سے باہر نہیں آسکتا۔ دوسری چیز جو ہمیں وزیر مواصلات سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ از راہ کرم وہ کسی جاندار، محنتی، پر استقلال اور ذہین آدمی کو ریلوے کا پبلک ریلیشنز آفیسر مقرر کریں اور موجودہ پبلک ریلیشنز آفیسر کو ترقی دے کر کسی اور عہدے پر فائز کر دیں۔ اپنی طبعی افتاد کے باعث موجودہ صاحب امیر مینائی کی غزل کا بلا مطلع معلوم ہوتے ہیں۔

بقیہ : مشرق وسطیٰ

سازش کا خطرہ محسوس کر لیا اور اپنے دفاع کے علاوہ انہوں نے خطرناک قدم نہیں اٹھائے اور اس طرف اپنے آپ کو جنگ کے خطرہ سے بچا لیا۔

اب اسی طرح کا خطرہ فلسطینیوں کو دوبارہ درپیش ہے۔ یاسر عرفات کے دورہ روس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس خطرہ سے باخبر ہیں۔ وہ روس کے ذریعے دباؤ ڈلوا کر جنیوا کانفرنس میں فلسطین کے مسئلے کو حل کرانا چاہتے ہیں۔

عالم اسلام اور خاص کر فلسطینیوں سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال ضرور آئے گا۔ کیا شاہ حسین امریکی چالوں سے باخبر ہیں کیا وہ جان بوجھ کر اپنے مفاد کے لیے عالم اسلام سے غداری کر رہے ہیں۔ یا انہیں یہ علم نہیں ہے کہ امریکا انہیں کن مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

آج جب کہ سادات، حافظ الاسد، یاسر عرفات اور شاہ خالد مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، شاہ حسین اس متحدہ محاذ سے بالکل باہر ہیں۔ نہ تو انہوں نے ریاض کانفرنس میں شرکت کی اور نہ ہی وہ مستقبل قریب میں ہونے والی دمشق کانفرنس میں شرکت کریں گے حالانکہ جنیوا کانفرنس میں عربوں کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ آپس میں کس قدر متحد

باقی

چٹان
ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۲۸ — شمارہ ۲۴
۱۶ جون ۱۹۷۵ء
قیمت — ایک روپیہ

بنیادی اقدار کے انہدام پر

تن آسانوں کی فریاد و فغاں

ایک مدت سے یہ چیز اسلامی فکر کے ممتاز حلقوں میں نوکِ زبان ہے کہ فلاں فلاں دوائر میں اشتمالی ذہن کے علمبردار پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو متزلزل کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض اُن لوگوں پر کیا جاتا ہے جو پاکستان میں اقتدار کی معرفت اپنے اشتمالی افکار کا راستہ صاف کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جن شخصیتوں کے دم خم سے پاکستان کا نظری محاذ قائم ہے اُن شخصیتوں کے سوانح و افکار کو عقیدت کی آڑ میں سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اقبال کا صد سالہ جشن منانے کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی جس کے ارکان میں صوبائی وزرائے اعلیٰ کے علاوہ بعض معروف شخصیتوں کو شامل کیا گیا۔ اس کی صدارت خود وزیر اعظم نے سنبھالی، لیکن کنوینر کے فرائض وزارت تعلیم کے مرکزی سیکرٹری پروفیسر اجمل خاں کو تفویض کئے گئے۔ ہم پروفیسر صاحب کے بارے میں کسی حد تک یہ ضرور جانتے ہیں کہ وہ ایک فاضل شخصیت ہیں۔ اور اُن کی طبیعت میں کسی عنوان سے کوئی شر نہیں۔ لیکن اقبال کے بارے میں وہ کچھ جانتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان سے متعلق کوئی حسن ظن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اقبال سے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ انہیں وزارت تعلیم کا سیکرٹری ہونے کی وجہ سے اقبال کی صد سالہ کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اقبال کمیٹی کے اجلاس میں ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال نے مولانا کوثر نیازی کو کنوینر بنانے کی تجویز کی تو وزیر اعظم نے صاد کیا اور اُن لوگوں کو بھی اپنی کمیٹی میں شامل کر لیا جو علامہ اقبال سے فکری شیفتگی رکھتے اور ان کے متعلق قلم اٹھا کر افکارِ اقبال کی صحیح روح پیش کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس کمیٹی نے بغیر اجلاس مشہور صحافی صفدر میر المعروف زینو کو اقبال سے متعلق کتاب لکھنے پر مامور کیا۔ لیکن وہ معترضین کے اعتراض کی نذر ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صفدر میر ایک اچھے صحافی ہیں اور انگریزی زبان میں اپنے مخصوص ذہن کے ساتھ خوب لکھتے ہیں یعنی انہیں قلم پر اور قلم کو ان پر اعتماد ہے لیکن ہمارے اشتمالی دوست ہم سے ناراض نہ ہوں تو ہم ان سے یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ صفدر میر اقبال کی فکر سے مخلص نہیں۔ وہ اقبال سے کہیں بڑھ کر مارکس کے وفادار ہیں۔ انہیں خود ہی انکار کر دینا چاہئے تھا کہ وہ اس سلسلہ میں معذرت خواہ ہیں۔ جب ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال کے شارح نہیں ہو سکتے تو اس سے مقصود اُن کی توہین نہیں اور نہ ان کے قلم کی سبکی ہوتی ہے۔ اس میں غایت صرف یہ ہے کہ جس فکر یا شخصیت سے اُن کا ذہنی رابطہ نہیں۔ اس کے متعلق وہ کیا لکھ سکتے ہیں؟ جس طرح ہیکٹر بولیتھو شاہی سوانح نگار ہو کر قائد اعظم کی سوانح عمری سے انصاف نہیں کر سکے۔ اس میں صرف زبان کا چسکہ ہے۔ اسی طرح صفدر میر اقبال کے سوانح و افکار سے انصاف نہیں کر سکتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قلم کی اڑانیں دکھا سکتے ہیں۔

لیکن ہم اس طرز تنقید کے سخت خلاف ہیں۔ ہم نے خود اقبال سے کیا انصاف کیا ہے کہ ہم اُن لوگوں کے قلم اٹھانے پر اعتراض کریں جو ہمارے نزدیک اقبال کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ آخر وہ لوگ جو اقبال کے صحبت نشین اور خوشہ چیں رہے۔ مدت العمر زندہ رہے اور اپنی عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن میں سے کچھ لوگ ابھی حیات ہیں۔ انہوں نے اقبال کے سوانح و افکار سے کیا انصاف کیا ہے کہ ان لوگوں کے قلم اٹھانے پر نعل در آتش ہوتے ہیں جنہیں اقبال کے سوانح و افکار سے ان کی رائے میں کوئی علاقہ نہیں۔ کیا ان لوگوں نے خلیفہ عبدالحکیم کی مختصر کتاب پر اقبال پر

[illegible]
لازمی ہے کہ اقبال سوشلزم کے شیدائی تھے کتابچوں سے عیاں ہو رہے ہیں۔ اقبال نے سوشلزم کے طنزیہ دفاع میں لکھا ہے ؎

پھر وہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

جو لوگ افکار اقبالؒ سے سوشلزم کا جواز ڈھونڈتے ہیں وہ اپنے دفاع میں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

شاعر اسلام کے افکار میں ملا کشی
کل روا رکھی تھی تم نے ہم روا رکھتے ہیں آج

اور جو لوگ اشتراکی نہاد دانشوروں سے پریشان ہیں ہم ان کے اخلاص میں شک نہیں کرتے حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام سے مخلص ہیں اور انہیں سیاسی طور پہ پاکستان کے لیے اشتراکیت غلط در غلط محسوس ہوتی ہے لیکن ایک لمحہ کے لئے وہ خود ہی غور کریں کہ ان کی تنقید ان کے احتجاج اور ان کی جھنجھلاہٹ آج تک مفید ہوئی ہے؟ اس سے کسی نے کوئی اثباتی تاثر لیا ہے؟ جب ایسی کوئی چیز نہیں تو وہ پاکستان کے اسلامی ذہن کی معنوی طاقت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ آخر وہ شاعر، ادیب، قائد، خطیب، واعظ، ذاکر، ملا اور پیر کیوں اپنے ایمان کی شمعیں روشن نہیں کرتے جو اسلام و پاکستان کے شیدائی و فدائی ہیں۔ آج کتنے شاعر اسلام کے لئے نغمہ سرا ہیں؟ کس قدر ادیب اسلام کی داستانیں سناتے ہیں۔ وہ قائد اسلام کے لیے سینہ سپر کیوں نہیں ہوتے؟ جنہیں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

کبھی ان خطیبوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ نئی پود کن بیابانوں میں داخل ہو چکی ہے جن کی شعلہ نوائیاں توحید و رسالت کے باب میں گل کھلا چکی ہیں۔ واعظ گنبدوں سے کیوں نہیں نکلتے؟ ذاکر کس سرگرمی کا شکار ہیں۔ ملا کس فصل کی آبیاری کر رہے ہیں اور پیر کن حجروں میں محو استراحت ہیں۔

عوام کی زبانوں پہ قلم بازی اشتعال انگیزی نہیں آتا بلکہ اسلام کی یہ سب طاقتیں ہیں جو حکومت آ جائیں تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ پاکستان سے جو چیز نہیں مٹائی جا سکتی وہ اسلام ہے۔ اسلام زندہ باد

مسٹر رامے کی خوبصورت تقریر

پنجاب کے جواں سال وزیر اعلیٰ مسٹر حنیف رامے نے پنجاب اسمبلی میں صوبائی میزانیہ پیش کرتے ہوئے انتہائی خوبصورت تقریر کی ہے، وہ اس لحاظ سے شہ پارہ ہے کہ اس کے خوبصورت فقرے ان کے ادبی ذوق کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ان کا بجٹ فی الحقیقت جدوجہد کا بجٹ ہے۔ اور اپنے بعض مندرجات کے اعتبار سے داد و تحسین کے لائق ہے۔ انہوں نے ایک نئے عزم اور ایک نئے حوصلہ کے ساتھ پنجاب کی بعض ترقیاتی سکیموں کی منصوبہ بندی کو پروان چڑھانے کے لیے بڑی بڑی رقمیں مخصوص کی ہیں۔ آئندہ اچھے کارکن مل جائیں تو پنجاب کی ترقیات میں رونق پیدا ہو سکتی ہے۔ انہوں نے نقل و حمل کے لئے ساڑھے اکتالیس کروڑ، تعلیم و تربیت کے لئے ۴۴ کروڑ، صحت عامہ کے لیے ۱۵ کروڑ اور تعمیراتی پروگرام کے لیے ۲۵ کروڑ روپیہ مخصوص کیا ہے۔ صوبے کے ترقیاتی منصوبوں پر اضافی ۸ کروڑ روپے صرف کئے جائیں گے۔ اقامتی سہولتیں مہیا کرنے پر ۴۰ کروڑ خرچ ہوں گے۔ زراعت کی ترقی کے لیے ۲۷ کروڑ روپے کی رقم ریزرو کی گئی ہے۔ مسٹر رامے کے بجٹ پر معاشی نقطۂ نگاہ سے ایک جامع تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ حنیف رامے اس متوازن بجٹ کے لیے، جیسا کہ عرض کیا فی الواقعہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن بعض جزئیات سے قطع نظر جو چیز ہمارے لئے دل آویز ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ مسٹر رامے نے بجٹ کو اپنی اردو تقریر سے بالا کیا ہے۔ انکی تقریر زبان اردو کے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے۔

۲۔ ان سے پہلے آج تک کسی صوبائی وزیر نے اس لب و لہجہ کے ساتھ اردو میں میزانیہ پیش نہیں کیا بلکہ کسی دوسرے وزیر کو اردو میں بجٹ پیش کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ مسٹر رامے نے اپنی اس خوبی سے اردو کے اعتماد میں اضافہ کیا جس کے لیے زبان اردو ان کی شکر گزار ہے۔

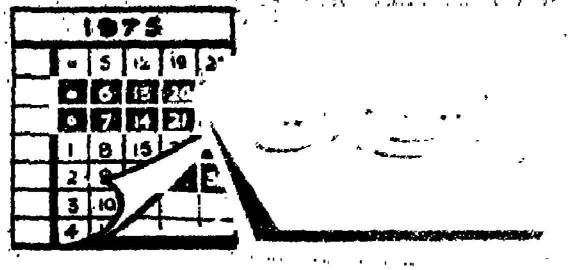
مسلم لیگ ہے کہاں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ کے مخلص کارکن اسلامی و صوبائی طور پہ پاکستان کی صورت حال کے اتار چڑھاؤ سے بُری طرح متاثر ہیں اور انہیں قائداعظمؒ کے پاکستان کی بحرانی ضربات سے قلق ہوتا ہے۔ ان کے خلوص میں شبہ کرنا ہمارے نزدیک ایک مجرمانہ فعل ہے۔ لیکن ہم اپنے ان دوستوں سے یہ سوال کرتے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ایک لمحہ کیلئے اس نکتہ پہ غور کریں کہ ان کے ساتھ جو ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ سیاسی حادثہ نہیں کہ جن بڑوں کو حضرت قائداعظمؒ کی عہد کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ انہوں نے کبھی دور میں بھی کسی

باقی صفحہ ۹ پر

ضیاگوک الپ

اتاترک کے عہد کا انقلابی



پاکستان میں وزارت مذہبی امور کے ماہنامہ فکر و نظر نے اپنی اشاعت بابت جون ۱۹۷۵ء میں تاریخی مادیت اور عمرانی تصوریت کے زیر عنوان ضیا گوک الپ کے ایک مضمون کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ مترجم ہیں جناب ثروت صولت۔ ابتدا ان کے قلم سے ایک مختصر نوٹ ہے۔ سرورق کے صفحہ دوم پر ہر ماہ دو سطری نوٹ ہوتا ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی یا وزارت مذہبی امور کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان تمام افکار و آرا سے متفق بھی ہو جو رسالہ کے مندرجہ مضامین میں پیش کی گئی ہیں۔ ان کی ذمہ داری خود مضمون نگار حضرات پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح خود قارئین فکر و نظر کے لیے لازم نہیں کہ وہ مندرجہ مضامین کی افکار و آرا کے علاوہ ان کی صحت و توانائی سے متفق ہوں۔ فاضل مترجم نے ضیا گوک الپ کے مضمون کا ترجمہ نہایت عمدگی سے کیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ایک خاص ذہنی پس منظر کے تحت بعض الجھنوں کو صاف نہیں کیا۔ یا ان کی نکتہ رس نگاہ بھی بچا اپنی علمی مصلحت کے تحت بٹا لکھا گئی ہے۔

ضیا گوک الپ دیاربکر میں پیدا ہوئے ان کا سن پیدائش ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء ہے۔ ان کا خاندان حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ انہیں ادب و ریاضی کا خاص ذوق تھا اور تاریخ سے بھی ایک گونہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اسکول ہی میں مشرقیات کے علاوہ فرانسیسی کی تعلیم حاصل کی اور کئی ایک مفکرین اسلام غزالی، رومی، ابن عربی، ابن رشد، ابن سینا، اصفہانی وغیرہم کے سوانح و افکار کا مطالعہ کیا۔ بالخصوص غزالی کے المنقذ من الضلال سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلاب فرانس کے افکار و خیالات ترکی کی جدید نسل کے خون میں جوش پیدا کر رہے تھے۔ ضیا کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر ان افکار و خیالات سے بے حد متاثر تھا ادھر ترکی کے جلاوطن راہنماؤں کا ایک گروہ دیاربکر میں موجود تھا۔ ضیا نے ان سے روابط پیدا کئے۔ نامق کمال، ضیا پاشا، احمد مدحت آفندی وغیرہ کے مضامین پڑھے۔ پھر عبداللہ جودت کی آمد پر ان کی خفیہ تحریک سے ارتباط بڑھا لیا۔ ڈاکٹر عبداللہ جودت کرد تھا اس کے خیالات ملحدانہ تھے۔ وہ ہیکل، نٹشے، اسپنسر اور بی لوان سے متاثر تھا۔ ضیا میں ابھی دنوں ایک یونانی استاد کی بدولت عقیدے اور عقلیت کی کشمکش پیدا ہوئی تو اسلامی فکر کے بجائے ریت ایمنت کا شکار ہو گیا ۱۸۹۶ء میں وہ قسطنطنیہ گیا۔ اس کو ویٹرنری کالج میں داخلہ مل سکا۔ لیکن وہ تعلیم سے زیادہ سیاست کا دلدادہ تھا۔ اس نے انجمن اتحاد و ترقی سے رابطہ پیدا کیا اور اس کا ممبر ہو گیا جو ان دنوں فری میسن کی طرح خفیہ کام کرتی تھی۔ بعض باغیانہ تحریروں کے باعث کالج سے نکالا گیا۔ پھر گرفتار ہو گیا۔ جب رہا ہوا تو دیاربکر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں اس نے گہرا اور مفصل مطالعہ کیا۔ بالخصوص فرانسیسی فلسفہ، سائیکالوجی اور سوشیالوجی کے مطالعہ نے اس کے ذہن کی سمتیں قائم کیں اور وہ دیاربکر کے حریت پسند عناصر کی مرکزی شخصیت بن گیا۔ اس گروہ نے ۷-۱۹۰۶ء میں اس کے زیر قیادت جابرانہ نظام کی انتظامی مشینری کے خلاف بغاوت کی پھر سلطان عبدالحمید خان ۱۹۰۹ میں معزول ہو گئے تو ضیا، اور اس کے ساتھیوں کو آزادی سے کام کرنے کا موقع ملا اس نے دو اخبارات جاری کئے جن میں ایک کا نام "پیام" تھا۔ ضیا نے سالونیکا میں مستقل قیام کیا تو ایک قوم پرست لیڈر بن گیا۔ اس دوران اسے روشن خیال ترکوں اور مغربی فاضلوں سے زیادہ قریب رہنے کا موقع ملا جس سے اس کے ذہن میں ترکی قومیت کی بنیاد پر اتحاد و تنظیم کے تصور نے نشو و نما پائی۔ ظاہر ہے کہ اس تصور میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا پھر جب جنگ بلقان سے لے کر جنگ عظیم اول تک عثمانی سلطنت سے اسلامی ممالک نکلتے گئے اور عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تو ترک قومیت کی تحریک قوی و مستحکم ہو گئی۔ ترکی کی نئی نسل پر گوک الپ کا ذہنی اثر اس وقت بہت مستحکم اور وسیع ہو گیا جب وہ ۱۹۱۵ء میں بغیر کسی علمی سند و فراغت کے اپنی ذاتی قابلیت کے بل پر استنبول یونیورسٹی میں علوم عمرانیہ کا استاد اول مقرر ہوا۔ تو ۱۹۱۸ء میں دوسرے محب وطن ترکوں کی طرح اس کو بھی استنبول چھوڑنا پڑا پھر جب ۱۹۲۱ء میں مصطفےٰ کمال نے یونیورسٹیوں پر فتح حاصل کی تو آزاد ہو گیا اور ۱۹۲۲ء میں شعبۂ تالیف و ترجمہ کا صدر بنا۔ وہ مصطفےٰ کمال کا پُرجوش حامی تھا۔ ۱۹۲۳ء میں کمال پارلیمنٹ میں دیاربکر کا نمائندہ تھا لیکن ۱۹۲۴ء کے آغاز میں بیمار ہو کر ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اڑتالیس یا انچاس سال کی عمر میں وفات پا گیا اور مقبرہ سلطان محمود میں دفن ہوا۔

ضیا گوک الپ کے مندرجہ بالا حالات اسرائیل یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر [illegible] کی کتاب "ترکی قومیت کی بنیادیں"

Translation of Turkish [illegible]

[illegible]

سے ماخوذ ہیں۔ جناب ثروت صولت نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ضیا گوک الپ کی مطبوعہ کتابوں کا کوئی مکمل مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن ترکی سے باہر امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر نے اُن کا سب سے مکمل مطالعہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیا گوک الپ نے نہایت بلند آہنگی اور کامل جوش کے ساتھ ترکی کو اپنے ماضی سے الگ ہو جانے اور خالص قومی اور مادی بنیادوں پر تشکیل جدید کی دعوت دی ہے۔ اُن کا بنیادی نقطہ نگاہ یہ تھا کہ ترکوں ہی نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے افکار کا خلاصہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب دراصل اس قدیم تمدن کے استداد و تسلسل کی ایک شکل ہے اور مذہب و تہذیب دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضیا گوک الپ ترکی جدید کے فکری معماروں میں اہم ترین حیثیت رکھتا تھا۔ پروفیسر نیازی برکس نے اُن کے منتخب مضامین کو مرتب کیا اور اُس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر ضیا گوک الپ کے اندازِ فکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ضیا گوک الپ اتاترک کی انقلابی اصلاحات کے ابتدائی دور ہی میں وفات پا گئے۔ لیکن اُن کے خیالات انقلابیوں کی سیادت کرتے رہے اور مصطفیٰ کمال کا عہد اُن سے بے حد متاثر ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکی ہی وہ سب سے پہلا مسلمان ملک ہے جس کو مغرب و مشرق کی کشمکش کے معرکہ خونی سے گزرنا پڑا۔ اور اُس نے مغربی تمدن کی نقل مطابق اصل شروع کی۔ لیکن اس میں ذرا برابر بھی کلام نہیں کہ ترکی کے عوام کا اجتماعی ضمیر اسلام کے تابع رہا۔ اُن کی لیڈر شپ کو بلاشبہ ایک عظیم صدمہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں عرب ضیا [illegible] نے اُن سے رشتہ [illegible] منقطع کر لیا اور [illegible] کے زیر حکمران مسلمانوں

بقیہ صفحہ [illegible]

نے اُن کے خلاف انگریزوں کی سرپرستی میں بغاوت کی اور عمل اپنی طبعی عمر گزار کر ختم ہو گیا اور اب ترکی یورپ میں اپنے تابناک ماضی کا بیانیہ کار ہے۔

بقیہ: شذرات

کریکٹر کا چراغ روشن نہیں کیا اور ان کے کردار کا خوف ہماری قوم کے سیاسی انحطاط کا باعث ہوا ہے۔

• **میاں ممتاز دولتانہ** نے اپنے انتخاب تک اپنے ساتھیوں کو پیپلز پارٹی سے نبرد آزما رکھا لیکن جب پیپلز پارٹی کی ملازمت کا شرف حاصل کیا تو رسید تک نہ دی۔ کیا اس کا نام سیاسی کریکٹر ہے؟

• **خان عبد القیوم خاں** قائد اعظم کی اطاعت کے بعد لیاقت علی خاں کا سرحد میں نورہ مستانہ تھے۔ جب اقتدار سے محروم ہوئے تو کس دور میں عوام کا ساتھ دیا۔ انہوں نے یحییٰ خاں کی شہ پر مسٹر بھٹو کے خلاف کیا ڈنڑ نہیں پیلے؟ لیکن جب مسٹر بھٹو اقتدار پر فائز ہوئے تو خان عبد القیوم کس طرح ان کی چوکھٹ پر پلکوں سے جاروب کشی کرتے ہوئے حاضر ہو گئے۔

• **سردار شوکت حیات خاں** ہمارے دوست ہیں۔ ہمارے دل میں ان کا دوستانہ احترام ہے لیکن انہیں اپنی ذہانت پر اس طرح ناز ہے کہ نہ حکومت کے ساتھ ہیں نہ اپوزیشن کے۔ اب لندن جا رہے ہیں کہ

ان کی بلا سے بزم بلے یا ہمارے ہے

حقیقت یہ ہے کہ حکومت انہیں رسید نہیں دیتی اور اپوزیشن ان کے مزاج سے اکھڑے

• ہماری نوجوان امیدوں کا محور علامہ اقبال کے فرزند **ڈاکٹر جاوید اقبال** تھے اُن کے اخلاص و علم میں شبہ نہیں لیکن ہم نیاز مندی سے یہ عرض کریں گے کہ انہوں نے ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہو کر پنجاب کے نوجوان حوصلوں میں ولولہ پیدا نہیں کیا۔

• **مسٹر یحییٰ بختیار** بلوچستان میں مسلم لیگ کی آواز تھے انہوں نے کس تیزی سے پلٹا کھایا اور

اب کس قابلیت سے عدالت عالیہ میں حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جب اس پائے کے لوگ مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ گئے اور قائد اعظم کی سیاسی سیرت کے اخلاص کو برقرار نہ رکھ سکے تو کیا ذہن کانپ گیا کہ اُس پر دوسرے لوگوں نے چھاپہ مارا ہے۔ ہمارے نزدیک شر گر یہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے سچ کہا تھا ؎

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

ٹریفک کے روزمرہ حادثے

ہر روز اخباروں میں ٹریفک کے کسی نہ کسی دردناک حادثے کی خبر ضرور ہوتی ہے۔ بڑے حادثے اخباروں میں چھپ چھپا جاتے ہیں لیکن اکا دکا حادثے جو مختلف اضلاع میں روزمرہ ہوتے ہیں، عموماً چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں کئی دفعہ لکھ چکے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ ان حادثوں پر قابو پانے کے لیے صوبائی حکومتوں کو متعلقہ افسروں پر مشتمل کانفرنس کرنی چاہئیں اور ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے جو ان حادثوں کے سدِ باب کا موجب ہو سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ:

۱۔ ڈرائیور اپنی گاڑیوں کی مقررہ رفتار کا احترام نہیں کرتے اور باہمی ریس کے عادی ہو چکے ہیں۔

۲۔ ڈرائیوروں کو اپنے کئے دھرے کے لیے کسی سبق آموز سزا کا خوف نہیں۔

۳۔ جن لوگوں کو ڈرائیونگ کے لائسنس دیئے جاتے ہیں ان کا نصف اناڑی افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ رشوت دے کر لائسنس حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ ٹریفک پولیس کا غالب حصہ رشوت خوروں کی منڈلی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں رشوت کا بازار جوبن پر ہے۔ اب ٹریفک میں افراد کا تقرر ماہانہ رشوت پر ہوتا ہے۔

بعض ناشروں کی چوری اور سینہ زوری

سیرۃ النبی کراچی کے ایک ناشر نے کس برتے پر چھاپی ہے

ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ کا نامہ گرامی

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی واحد یادگار دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور معارف کے مدیر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ایک نامہ گرامی ہم نے چٹان کی اشاعت مجریہ میں شائع کیا تھا۔ اب ایک اور خط جو انہوں نے ۲۰ مئی ۱۹۷۵ء کو تحریر کیا اور ۷ جون کو اپنے دو ملکی سفر کے بعد ہم تک پہنچا، نذر قارئین ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایک بلند پایہ مصنف ہونے کے علاوہ برِ عظیم کے مسلمانوں کے علمی قرطبہ کی یادگار شخصیت ہیں۔ آپ کا یہ خط پڑھیئے اور درد دل کا اندازہ کیجیے۔

کتابوں کی آمدورفت کا سلسلہ ایوب خان کے عہد میں رُکا تھا۔ ہم دار المصنفین کے علمی مفاد اور اسلامی ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور کن لوگوں کی وجہ سے ہوا؟ بہرحال جو کچھ ہوا غلط ہوا۔ اگر ایوب خان کے گرد و پیش کی فضا کو ہندوستانی مسلمانوں کی حیرانی کا احساس ہوتا تو ممکن تھا وہ اپنے اقدام پر نظرثانی کرتے۔ ان کے بعد یحییٰ خان کے زمانہ میں اس اقدام پر نظرثانی کا سوال ہی نہ تھا۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں ہندوستان و پاکستان کے روابط کی بحالی کا سلسلہ چلا ہے مگر گذشتے بعض سیاسی اڑچنوں کے باوجود صاف نہیں ہو رہے۔ ان کی تفصیلات سے متعلق گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں۔ لیکن پاکستان کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیئے کہ علم و نظر اور دین و ادب کے کئی ایک دائرے ہندوستان میں ہیں اور ان کی نگاہیں قدرتی طور پر اس طرف اٹھتی ہیں۔ ہم کسی طرح بھی اپنی ملی تاریخ میں سے علی گڑھ، جامعہ ملیہ دیوبند، ندوہ، تحقیقات و نشریات اسلام اور دار المصنفین کو خارج نہیں کر سکتے۔

اب بھی ان اداروں سے علم و سیاست اور دین و ادب پر جامع و مانع اور اعلیٰ مقدمہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ہم ان سے اس باب میں بیچارے ہیں۔ لیکن کیا یہ ظلم نہیں کہ ان اداروں پر ستم توڑا جائے۔ ان کی سرپرست اسلامی ریاستیں تباہ ہو گئیں۔ جن تجارت پر ان کا انحصار تھا اُن کا بڑا حصہ پاکستان اُٹھ کے آگیا حتیٰ کہ دو ملکی کتابوں کی آمدورفت موقوف ہو گئی۔ اس صورت حالات سے بعض ناشروں نے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدیں کراچی کے ایک ناشر

محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل

مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر ا پاکستان

نے چھاپ لی ہیں۔ اس کی پانچ جلدیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ ناشر نے سرورق کے صفحۂ ثانی پر لکھا ہے۔

جملہ حقوق بحق ناشر حسب اجازت حکومت پاکستان
NOR '6(16)PB-73/1055 DATED
(2/4/73 تمام وکمال محفوظ ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کا نام ہے چوری سینہ زوری ہم نہیں کہہ سکتے کہ ناشر نے حکومت پاکستان کے کس شعبہ سے اجازت لی؟ اُس شعبہ نے کس استحقاق کی بنا پر اجازت دی اور ادارہ ہی کو اجازت کیوں دی گئی؟ افسر مجاز کون تھا؟ جہاں جہاں یہ کام ہوا ہر لحاظ سے غلط ہوا؟ اس سلسلہ میں وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کو متوجہ کرنا ہمارا فرض ہے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس چوری سینہ زوری کے خلاف ایکشن لیں گے۔ اُن کے جس محکمہ نے اجازت دی ہے اور جس افسر نے ایسا کیا ہے ہمارے نزدیک وہ مخلص نہیں۔ ہم یہ شبہ کریں کہ اس کی سنہری اور روپہلی مصلحتوں نے گل کھلایا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اُدھر ناشر نے دولت کمانے کی چمک میں ستم یہ ڈھایا ہے کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی چھپوں جلدوں کا فوٹو سٹیٹ لے کر کتاب چھاپی ہے اور اس طرح کتابت کے اخراجات میں سہولت پیدا کی ہے۔ ہم فی الحال کراچی کے دینی حلقوں سے متوقع ہیں کہ وہ ناشر کے متعلق فیصلہ کریں کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ ناشر کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اُن کی رحلت ہو گئی ہے۔ ہم ان کے بیٹوں سے یہ سوال کرتے ہیں

حق بجانب ہیں کہ انہوں نے اس طرح اپنے لئے توشۂ آخرت مہیا کیا ہے ؟

محترم سید صباح الدین علیہ الرحمۃ کا خط درج ذیل ہے۔

دار المصنفین اعظم گڑھ

۲۰ مئی ۱۹۶۵ء

جناب شورش صاحب السلام علیکم،

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۹ مئی چٹان کے تراشے کے ساتھ موصول ہوا۔ اس سے پہلے چٹان بھی مل چکا تھا۔ آپ نے اپنے ہفتہ وار اخبار میں میرے مراسلہ کو جس نمایاں طریقہ سے شائع کیا ہے۔ اس کے لئے پورا ادارہ شکر گزار ہے۔ یہ اس قلبی لگاؤ کا اظہار ہے جو آپ کو اس ادارہ کے ساتھ ہے۔

گذشتہ دس سال سے انتظار تھا کہ پاکستان سے جب باضابطہ تجارت شروع ہوگی تو ہماری مطبوعات کی مانگ وہاں بدستور سابق جاری ہو جائے گی۔ مگر اس امید پر پانی پھر گیا جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کے یہاں کے کچھ ناشروں نے ہماری مطبوعات چھاپ لی ہیں اور وہ ہمارے یہاں سے کتابیں منگوانے سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ان کے اخلاق کی بلندی کا تقاضا تھا کہ ہم کو کم از کم اطلاع تو دے دیتے وہ ہماری مدد نہیں کر سکتے ہیں تو ہم کو نقصان بھی نہ پہنچائیں۔ اگر تجارتی بندش کی مجبوری سے انہوں نے ہماری مطبوعات چھاپ لی تھیں تو اب جب کہ تجارت کھل گئی ہے یا کھل رہی ہے تو وہ آسانی سے ہماری کتابیں منگوا سکتے ہیں۔ کیا پاکستان کے لوگ اس کو پسند نہیں کرتے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی ادارے اچھے حال میں رہیں یا جو نصف صدی سے زیادہ مفید کام انجام دے چکے ہیں۔ وہ ختم ہو جائیں۔ اگر وہ واقعی چاہتے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی، ذہنی، علمی اور ثقافتی نشوونما خاطر خواہ طریقہ پر ہوتی رہے تو وہ ان کے مفید اداروں کو زندہ رہنے کا حق دیں۔ پہلے بے شمار انفرادی خریدار ہماری کتابیں وی پی کے ذریعہ سے منگوایا کرتے تھے جس سے بڑی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔

وی پی کا کام اپنا چلتا تو فوراً منگوا لیتے اور تاجر ہماری کتابیں منگوایا کرتے تھے۔ مگر تجارتی بندش کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب وہاں کے تاجروں نے ہماری کتابیں چھاپ کر ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ ہمارے ادارہ کا مستقبل بہت ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان میں اردو کتابوں کی فروخت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری کتابوں کا تو بہت بڑا مارکیٹ پاکستان میں تھا۔ جو وہاں کے تاجر ہماری کتابیں چھاپ کر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر مالی دشواریوں میں مبتلا ہو

کر ہمارا ادارہ ختم ہو گیا تو اس کی تاریخ میں یہ لکھا جائیگا کہ پاکستان کے کچھ ناشر اور تاجر اس کی تباہی اور بربادی کا باعث ہیں

شورش صاحب اگر پاکستان کے تاجروں کو یہ خیال ہو کہ بعض ملکی سیاسی پیچیدگیوں سے ہماری مفید کتابوں کا وہاں پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے جس سے وہاں کے لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو ہم لوگ اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ کے یہاں کی کوئی لمیٹڈ کمپنی یا تاجروں اور ناشروں کی ایک بڑی جماعت مل کر ہمارے ادارہ کی ساری مطبوعات پاکستان کے لئے حق طباعت و اشاعت خاطر خواہ رقم دے کر خرید سکتی ہے۔ لیکن یہ کام سرکاری سطح پر ہو تاکہ اس ادارہ کو یہ رقم قانونی اور جائز طریقہ پر یہاں مل جائے ہماری مطبوعات کی تعداد ڈیڑھ سو سے اوپر ہے۔ ان تمام کتابوں کا حق طباعت کتنا ہونا چاہیئے وہ گفت و شنید سے طے ہو سکتا ہے۔ صرف سیرۃ النبی کی فروخت سے وہاں کے تاجر دو چار سال میں لاکھوں روپے پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ سودا ہو جائے تو ہمارا ادارہ اس خاطر خواہ رقم سے اپنی مالی حالت کو درست کر سکتا ہے۔ آپ بھی غور کریں کہ کیا ایسی مناسب صورت ممکن ہے ؟

آپ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے ارباب حکومت سے بات کریں۔ ہم ان سے صرف انصاف چاہتے ہیں۔ اگر وہاں کے ناشر اور تاجر اپنے کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو بھی زندہ رہنے کا حق دیں۔ آپ جناب مولانا کوثر نیازی صاحب کی بھی توجہ اس طرف دلائیں۔ وہ دار المصنفین کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہاں دار المصنفین کے ہمدرد اس کے لئے جو کچھ کریں گے ادارہ ان کا بے حد شکر گزار ہوگا۔

ہماری کتابوں کا پارسل آپ کی خدمت میں پہنچا ہوگا۔ معارف ہر مہینہ آپ کے پتہ پر بھیجا جا رہا ہے۔

والسلام

احقر

سید صباح الدین عبدالرحمن

ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ

۱۲ جون ۱۹۶۵

ہفت روزہ چٹان لاہور

فدا کارِ حریت بھگت سنگھ کی ماں

موت کی آغوش میں

پچھلے ہفتے ہندوستانی اخبارات میں یہ پڑھ کر یادوں کی ایک دنیا تازہ ہو گئی کہ فدائی وطن بھگت سنگھ کی ماتا جی اپنی طبعی عمر گذار کر سورگباش ہو گئی ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک مایہ ناز دیوی تھیں۔ بھارتی پنجاب نے ان کے ماتم میں جس عقیدت و ارادت کا مظاہرہ کیا وہ ہر لحاظ سے اس کی حقدار تھیں۔ انہوں نے ایک ایسا فرزند پیدا کیا جس نے برِ عظیم کی سیاسی تاریخ میں ایک ولولہ و ارتعاش پیدا کیا۔ اس عظیم بیٹے کی بدولت دو چیزیں برِ عظیم میں پیدا ہوئیں ایک یہ کہ دہلی سے لے کر خیبر تک برطانوی سامراج ہل گیا اور نوجوان پود کی زبردست اکثریت آزادی کی طلب میں دیوانہ ہو گئی۔ دوسری چیز بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا بے پایاں جذبہ تھا جس میں تختۂ دار تک کم نہ کر سکا۔ ان کے ایک ساتھی جتندر ناتھ داس نے طویل بھوک ہڑتال کر کے جانِ شیریں جان آفریں کے حوالے کی۔ دوسرا کمال ان کا یہ تھا کہ جب اس پر [illegible] کے تحت جگر بھگت سنگھ کو دو ساتھیوں [illegible] گرو اور سکھ دیو سمیت تختۂ دار پر لے گئے ان کے چہرے بشاش تھے اور زندگی کا ہلکا سا [illegible] ان کے خد و خال پر نہیں تھا۔ انگریزوں نے [illegible] انسانیت کے خلاف جیل مینوئل کے ضابطے [illegible] پھر دیا اور بہرے۔ نوجوانوں کو رات کے [illegible] پھانسی دی۔ [illegible] نے پھانسی پاتے وقت [illegible] کا نعرہ لگایا اور جب [illegible] جیل حکام نے [illegible] ان کی [illegible]

نعشوں کو گورا سپاہی دریائے ستلج کے کنارے حسینی والا کے مقام پر لے گئے وہاں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور مٹی کا تیل ڈال کر ان کی بریدہ نعشوں کو جلا دیا اور بچے کچھے ٹکڑے دریا کی نذر کر دیئے۔ ادھر یہ خبر جنگل کی آگ ہو کر شہر میں پھیل گئی۔ آزادی صحافت کا زمانہ تھا تمام اخباروں نے ضمیمے نکالے۔ نتیجۃً عورتیں بچے، مرد اور لڑکے دیوانہ ہو کر بازاروں میں آ گئے۔ ادھر آدمیوں کا ایک قافلہ خفیہ اطلاع پر دریائے ستلج کی طرف روانہ ہو گیا وہاں جلی کٹی انگلیوں اور راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ لوگ یہی نشانی لاہور لے آئے۔ اس کی ارتھی بنا کر جلوس نکالا۔ تمام کالج اور سکول بند ہو گئے۔ منٹو پارک گراؤنڈ میں جہاں آج یادگارِ پاکستان کا عظیم مینار قائم ہے۔ تقریباً ایک لاکھ افراد کا اجتماع ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے قائدِ جلوس کی حیثیت سے اس مجمع کو خطاب کیا۔ راقم نے ذیل کا شعر پہلی دفعہ یہیں آپ کی زبان سے سنا تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ لوگ ان فدایانِ وطن کی یاد میں اشکبار تھے۔ مولانا نے فی البدیہہ چند اشعار سنائے۔ دو تین شعر حسب ذیل ہیں ؎

توانائی کے بس میں ہے جب سرمایۂ حقارت ہے
[illegible] ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
بہا دینا کسی کی نعش کو ستلج کی موجوں میں
کسی بے کس کو ساری عمر آنسوؤں سے رلانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
پڑا ہو جس کو آپ اپنی رعایا ہی سے ٹکرانا

مولانا نے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں پر کئی نظمیں کہیں جن میں سے ایک نظم کا مطلع بہت مشہور ہے ؎

شہیدانِ وطن کے خون ناحق کا [illegible] تھا
تو اس کے ذرے ذرے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

بھگت سنگھ کی اس فداکاری پر سید سلیمان ندوی نے بھی زمیندار میں ایک طویل نظم لکھی۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی سات شعر کہے۔ بھگت سنگھ موت سے بے پرواہ نوجوان تھے۔ جب اس کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی غالباً بیس سے بائیس برس کے درمیان ہو گی۔ وہ ہمیشہ عدالت میں مسکراتے پیش ہوتا اور ہر بات خندہ روئی سے کرتا۔ راقم کے فاضل دوست جناب مقبول انور داؤدی جو بے شمار اسلامی اور دینی کتابوں کے مصنف ہیں اُن دنوں لاہور نیوز ایجنسی کے ملازم تھے۔ وہ شروع سے آخر تک اس مقدمے کی رپورٹ مسلمان اخباروں کے لئے مرتب کرتے رہے کل ہی سنا رہے تھے کہ میں نے رپورٹنگ کی پوری زندگی میں ایسا بہادر، دبلا پتلا اور بے خوف نوجوان نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ

باقی صفحہ [illegible] پر

اس کے دیوان میں گجرات اور خاندیس کا ذکر ملتا ہے، مگر دونوں میں کسی سے اس کا وطنی تعلق نہیں تھا، خاندیس میں وہ دکن سے گیا تھا، (اور جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، اس کا قیام وہاں عارضی رہا ہوگا) جیسا کہ وہ کہتا ہے:[1]

نوزیں دگر از دکن بخاندیس   از بہر حسن محمد آمد

گجرات کے متعلق اس کے خیالات اچھے نہ تھے، مثلاً[2]

منصبش دادہ گوجراتی را   کہ نداند محمد ز دادائی

اس سے پوری طرح واضح ہے کہ نوزیں کا وطنی تعلق گجرات سے نہ تھا، ممکن ہے وہ ایرانی الاصل ہو، اس سے زیادہ اس کے وطنی تعلق کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اس کے دیوان میں خاندان کے متعلق بعض جزوی تفصیلات ملتی ہیں، مثلاً

۱۔ نوزیں کے تین اور بھائی بہن تھے، لیکن اس کی ماں نوزیں کو سب سے زیادہ چاہتی تھی،[3]

سہ تا داشت فرزند جز من ولی   ہمیشہ مرا خواستی زاں سہ تا

چونکہ فرزند کا اطلاق اولاد ذکور و اناث دونوں پر ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھائی کے تھے اور بہنیں کتنی، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک بھائی اور ضرور تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۲۔ ماں کا انتقال ۹۱۰ھ میں ہوا، اس سلسلے میں اس کا ایک مفصل قطعہ ہے جو شاعری کا اچھا نمونہ ہے، اس لیے اس کے اکثر اشعار درج ذیل ہیں:[4]

چو رفت از جہاں حضرتِ والدہ   جہاں گشت تاریک در چشم ما

چو ماتا کہ اندر جہاں زندہ بود   بشادی و غم داشت شکر و ثنا

---

[1] دیوان ورق ۴۷ب [2] دیوان ورق ۱۷۹ [3] دیوان ورق ۱۸۳ [4] ورق ۱۸ب - ۱۸۳

اگر مریم و را بہ خوانمش — یقین دان کہ گفتم خطا نی خطا
بقدر غم خویش اگر فی المثل — زمانی شویم اشکبار از بکا
بنوعی زند جوش طوفانِ آب — کہ دروی خورد نہ فلک غوطہ ہا
غمِ ما اگر چرخ را در و ہد — فتد برزمین کوہ آسا زہا
چو برق آہ ما گر درخشد درابر — بود شعلہ را صد حذر از گیا
اگر کوہ اندوہ ما بشنود — نگوید بجز آہ گاہ صدا
سہ تا داشت فرزند خرمن ولی — ہمیشہ مرا خواستی زاں سہ تا
اگر داشتی جان و دل صد ہزار — بیکبار برمن نمودی فدا
چو کردی مخاطب مرا آں زماں — دمی عمر گفتی دمی جاں مرا
ز نطق آنچہ من یادش کردمی — نکرد دست با غنچہ باد صبا
بچشمی کہ از گریہ کردم سفید — زخاک مزارش کشم توتیا
روم گر بگلشن پی دفع غم — شود سنبلش افعی جاں گزا
زہم بگسلد جسم زارم چو تار — گرم در بر خویش گیرد قبا
بیامد دگر کاہ را برگرفت — اگر افتدم سایۂ کہربا
ہر آہی کہ از سینۂ من جہد — چو عیسیٰ فرا شد بفوق سما
ہر اشکی کہ از دیدۂ من چکید — چو قارون فروشد بہ تحت الثرا
بخواب اندرم نیم شب آمدہ — لب آہم پی گفت وگو کردوا
بگو بہر تاریخ من مصرعے — کہ ہم از احبا و ہم ز اقربا
. کی گو ، رت ، آ ذ ر ، آ ذ ں — نکی گو بدت مرحبا مرحبا

چو گفتی تو تاریخ گفتم باد	ز دار الفنا شد بدار البقا ۱۰۱۹ھ
چو بشنید این مصرع دلپسند	ز شادیش بالید سر تا بپا
پس آنگه سر و چشم بوسید و گفت	ترا باد حافظ خدا و الدعا

۳- اس کا ایک بھائی ۱۰۳۹ھ میں جوان عمری میں مرا، اسکی موت پر یہ اشعار کہے تھے:-[1]

در دا کہ برادر عزیزم	یکبار چگونہ از جہان رفت
تاریخ وفات او نوشتم	افسوس کہ از جہاں جواں رفت ۱۰۳۹ھ

۴- نورس کی تین اولادیں تھیں، ان کے لیے فرزند کا لفظ استعمال کیا ہے، معلوم نہیں ان میں لڑکے کتنے تھے اور لڑکیوں کی تعداد کتنی تھی، شاعر نے تینوں کی تاریخ ولادت کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے[2]،

حضرت دادار جہاں آفریں	کرد سہ فرزند عنایت مرا
سال ولادت زپی ہر یکی	خواستم از ہاتف مشکل کشا
زد دہماں لحظہ بگوش دلم	گفت غنا و غنی و اغنیا

غنا سے ۱۰۵۱ھ، غنی سے ۱۰۶۰ھ اور اغنیا سے ۱۰۶۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اس سے واضح ہے تینوں فرزندوں کی تاریخ پیدائش علی الترتیب یہی تھیں، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قطعہ تاریخ ۱۰۶۲ھ یا اس کے فوراً بعد کا ہوگا، تیسری اولاد کی پیدائش پر یہ قطعہ نظم کیا گیا ہوگا۔

۵- اپنے بھائی کے ترکے کے سلسلے میں اس کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا، وہ گجرات میں مقیم تھا اور کافی سرمایہ چھوڑ کر مرا تھا، دفعتاً اس کے انتقال پر لوگوں نے اسکی جائداد پر قبضہ مخالفانہ کرلیا، نورس نے قاضی وقت کی خدمت میں ایک منظوم قطعہ پیش کیا، اس سے جہاں اور کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں

---

[1] دیوان ورق ۱۰۴-۱۰۵ [2] ورق ۱۰۸

وہاں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ گجرات سے عازم وطن تھا، گو وطن کا معاملہ تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو اس قطعہ کے ابیات یہ ہیں[1] :-

ای نائب محمد مرسل درین دیار　　شرع از تو روشن است چو از آفتاب ماہ
در خدمت تو مظلوم آید بصد نشاط　　زیرا کہ پیش تست برابر گدا و شاہ
بشنو خدا ای را لنفس ماجرای من　　گر نشنوی تو پیش کہ گویم؟ چہ سازم؟ آہ
گجراتیاں کہ نیست بمن اختلاط شان　　کردند روز در نظر من چو شب سیاہ
بود از برادر من بسیار نقد و جنس　　از خرمنش بمن نرسیدہ بنیم کاہ
تسلیم می نمودندی پیش ازین بعجز　　مبلغ ہزار ہون بمن خانمان تباہ
راضی گشتم و نگرفتم دروغ نیست　　دارم ز فاضلان زمانہ دو کس گواہ
حالا چہ شد کہ چون نروم من بنزد شاہ　　سویم نگہ کنند بسر کردہ کج کلاہ
بہر خدا معاملۂ من بخاطر آر　　بر حکم شرع مصطفوی کن مرا نگاہ
پسند کنہ دیار تو سوی دیار خود　　من نا امید گشتہ گذارم قدم براہ
تا ماہ و سال ہست گیتی نشستہ باد　　بر صدر شرع ذات شریعت بعز و جاہ

اس قطعہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ دنوں گجرات میں رہا ہوگا، مگر گجرات اس کا وطن نہ تھا، البتہ بھائی کے ترکے کی وجہ سے اس کو وہاں سے تعلق رکھنا پڑا ہوگا۔ گجرات کے لوگوں کے برتاؤ سے اس کو بڑی نا امیدی ہوئی، اس لیے وہ نہ گجرات کو پسند کرتا تھا اور نہ گجراتیوں کو جیسا کہ محمد عادل شاہ کے وزیر خواص کے ہجو یہ قطعہ سے واضح ہوتا ہے۔

پادشاہا خواص خاں ماری است　　در جہاں در کار و بار دنیائی

[1] دیوان، ورق ۷۹ / ب

چو گفتی تو تاریخ گفتم باد | ز دار الفنا شد بدار البقا ۱۰۱۹ھ
چو بشنید این مصرع دلپسند | ز شادیش بالید سر تا بپا
پس آنگہ سر و چشم بوسید و گفت | ترا باد حافظ خدا و الدعا

۳۔ اس کا ایک بھائی ۱۰۳۹ھ میں جوان عمری میں مرا، اس کی موت پر یہ اشعار کہے تھے[1]:۔

دردا کہ برادر عزیزم | یکبار جگونہ از جہان رفت
تاریخ وفات او نوشتم | افسوس کہ از جہان جوان رفت ۱۰۳۹ھ

۴۔ نورس کی تین اولادیں تھیں، ان کے لیے فرزند کا لفظ استعمال کیا ہے، معلوم نہیں ان میں لڑکے کتنے تھے اور لڑکیوں کی تعداد کتنی تھی، شاعر نے تینوں کی تاریخ ولادت کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے[2]؛

حضرت داور جہان آفرین | کرد سہ فرزند عنایت مرا
سال ولادت ز پی ہر یکی | خواستم از ہاتف مشکل کشا
زود ہمان لحظہ بگوش دلم | گفت غنا و غنی و اغنیا

غنا سے ۱۰۵۱ھ، غنی سے ۱۰۶۰ھ اور اغنیا سے ۱۰۶۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اس سے واضح ہے تینوں فرزندوں کی تاریخ پیدائش علی الترتیب یہی تھیں، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قطعہ تاریخ ۱۰۶۲ھ یا اس کے فوراً بعد کا ہوگا، تیسری اولاد کی پیدائش پر یہ قطعہ نظم کیا گیا ہوگا۔

۵۔ اپنے بھائی کے ترکے کے سلسلے میں اس کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا، وہ گجرات میں مقیم تھا اور کافی سرمایہ چھوڑ کر مرا تھا، دفعتاً اس کے انتقال پر لوگوں نے اس کی جائداد پر قبضہ مخالفانہ کر لیا، نورس نے قاضی وقت کی خدمت میں ایک منظوم قطعہ پیش کیا، اس سے جہاں اور کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں

---

[1] دیوان ورق ۴۴ – ۱۰۵ [2] ورق ۱۰۸

وہاں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ گجرات سے عازم وطن تھا، گو وطن کا معاملہ تشنہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس قطعہ کے ابیات یہ ہیں[1]:-

ای نائب محمد مرسل درین دیار — شرع از تو روشن است چو از آفتاب ماہ
در خدمت تو مظلوم آید بصد نشاط — زیرا کہ پیش تست برابر گدا و شاہ
بشنو فدای ر انفس ماجرای من — گر نشنوی تو پیش کہ گویم؟ چہ سازم؟ آہ
گجراتیان کہ نیست بمن اختلاط شان — کردند روز در نظر من چو شب سیاہ
بود از برادر من بسیار نقد وجنس — از خرمنش بمن نرسیدہ بغیر کاہ
تسلیم می نمودندی پیش ازین بعجز — مبلغ ہزار ہون بمن خانمان تباہ
راضی گشتم و نگرفتم دروغ نیست — دارم ز فاضلان زمانہ دو کس گواہ
حالا چہ شد کہ چون نروم من بنزد شاہ — سویم نگہ کنند بسر کردہ کج کلاہ
بہر خدا معاملۂ من بخاطر آر — بر حکم شرع مصطفوی کن مرا نگاہ
پسند کن دیار تو سوی دیار خود — من ناامید گشتہ گذارم قدم براہ
تا ماہ و سال ہست بگیتی نشستہ باد — بر صدر شرع ذات شریعت بعز و جاہ

اس قطعہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ دنوں گجرات میں رہا ہوگا، مگر گجرات اس کا وطن نہ تھا، البتہ بھائی کے ترکے کی وجہ سے اس کو وہاں سے تعلق رکھنا پڑا ہوگا۔ گجرات کے لوگوں کے برتاؤ سے اس کو بڑی ناامیدی ہوئی، اس لیے وہ نہ گجرات کو پسند کرتا تھا اور نہ گجراتیوں کو جیسا کہ محمد عادل شاہ کے وزیر خواص کے ہجو یہ قطعہ سے واضح ہوتا ہے،

پادشاہا خواص خاں ماری است — در جہ در کار و بار دنیائی

---

[1] دیوان ورق ۷۹ | - ب

از ڈاکٹر سید عبداللہ

اڑتیسواں مقالہ

"خودی کا استحکام ـــــ تعلیم و تربیت"

تحلیلِ مقاصد کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ خودی کا منبع عشق (آرزو یا جوشِ حیات) ہے۔ اس آرزو کے راستے میں پیکار لازمی شے ہے۔ عشق کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہے اور پیکار بھی حیات کا ایک ناگزیر اصول ہے۔ اس کا اطلاق کائنات کے سب شعبوں کی طرح انسان پر بھی ہوتا ہے۔

کائنات کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں انسان کو کچھ تفوق حاصل ہیں دہریوں کے برعکس میں اُسے خدا کی خاص مہربانی اور کرم خیال کرتا ہوں۔ غور کیجئے تو آخر بات خدا تک ہی پہنچتی ہے) انسان کا ایک تفوق یہ ہے کہ اسے عقل اور زیرکی دی ہے۔ اسے اپنے آپ کو بدلنے اور بہتر بنانے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ اور تعلیم و تربیت اور عقل و تجربہ کے بہتر استعمال سے اسے نیچر کو مسخر کرنے اور اس کے اٹل قوانین کے باوجود اس کے فیصلوں کو بدل دینے یا کم از کم ان کا رخ موڑ دینے کی قوت عطا کی ہے۔ انسان نیچر سے دشمنی نہیں کر سکتا مگر اس کے قوانین کو متبادل عمل سے بے اثر بنا سکتا ہے۔

عقل کی بحث اپنے موقعے پر آئے گی۔ اجمالاً یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ کلامِ اقبال میں عقل و عشق کے مقابلے میں عقل کے خلاف بہت کچھ ہے مگر یہ مخاصمت عقلِ محض کی ہے۔ جو زندگی کے عادلانہ عمل میں اعتقاد نہیں رکھتی ورنہ میری نظر میں اقبال عقل کو خودی کے استحکام کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں۔

بہرحال یہ ذکر آگے آئے گا۔

خودی کی تربیت عقلی تعلیم کے مقابلے میں اندر [illegible] ہے کی جبلتوں کو قابو میں لانے سے ہو سکتی ہے۔ عقلی تعلیم بھی جبلتوں کا خیال رکھتی ہے مگر اس کا کام اصولوں اور تجربوں کی آموزش ہے۔ نفوس کو معتدل بنانا اور جبلتوں کے عمل میں ایسی ہمواری پیدا کرنا کہ وہ زندگی کی ترقی کے عادلانہ عمل میں مدد ہو، عقلی تعلیم کے دائرے میں بطورِ خاص شامل نہیں۔ یہ اسباب ہے کہ آجکل عقلی تعلیم کے علم بردار اس کے مدعی ہیں۔ اور یہ بھی اسباب ہے کہ تربیت نفوس میں عقل کی مدد بھی شامل ہو سکتی ہے۔

اندر کی جبلتوں کو قابو میں لانا خودی کی تربیت کا مرحلہ اول ہے۔ اس کی پہلی منزل اطاعت ہے اور دوسری منزل ضبطِ نفس۔

اطاعت سے مراد یہ ہے کہ تربیت کرنے والا جو ہدایات دیتا جائے یا جو فرائض سپرد کرتا جائے بے چون و چرا ان پر عمل ہوتا رہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں اونٹ کی مثال دی ہے اور لکھا ہے کہ اونٹ کا شیوہ خدمت و محنت اور صبر و استقلال ہے۔ وہ چپ چاپ منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے

> **کلیم اختر کا مضمون تھا**
>
> پچھلے شمارہ میں ایک مضمون بہ عنوان "عبدالعزیز خالد انسان کامل کی تلاش میں" شائع ہوا تھا۔ سہو کے سبب سے صاحبِ مضمون کا نام درج ہونے سے رہ گیا۔ یہ مضمون جناب کلیم اختر کے قلم سے تھا۔ قارئین نوٹ فرمائیں۔
>
> (ادارہ)

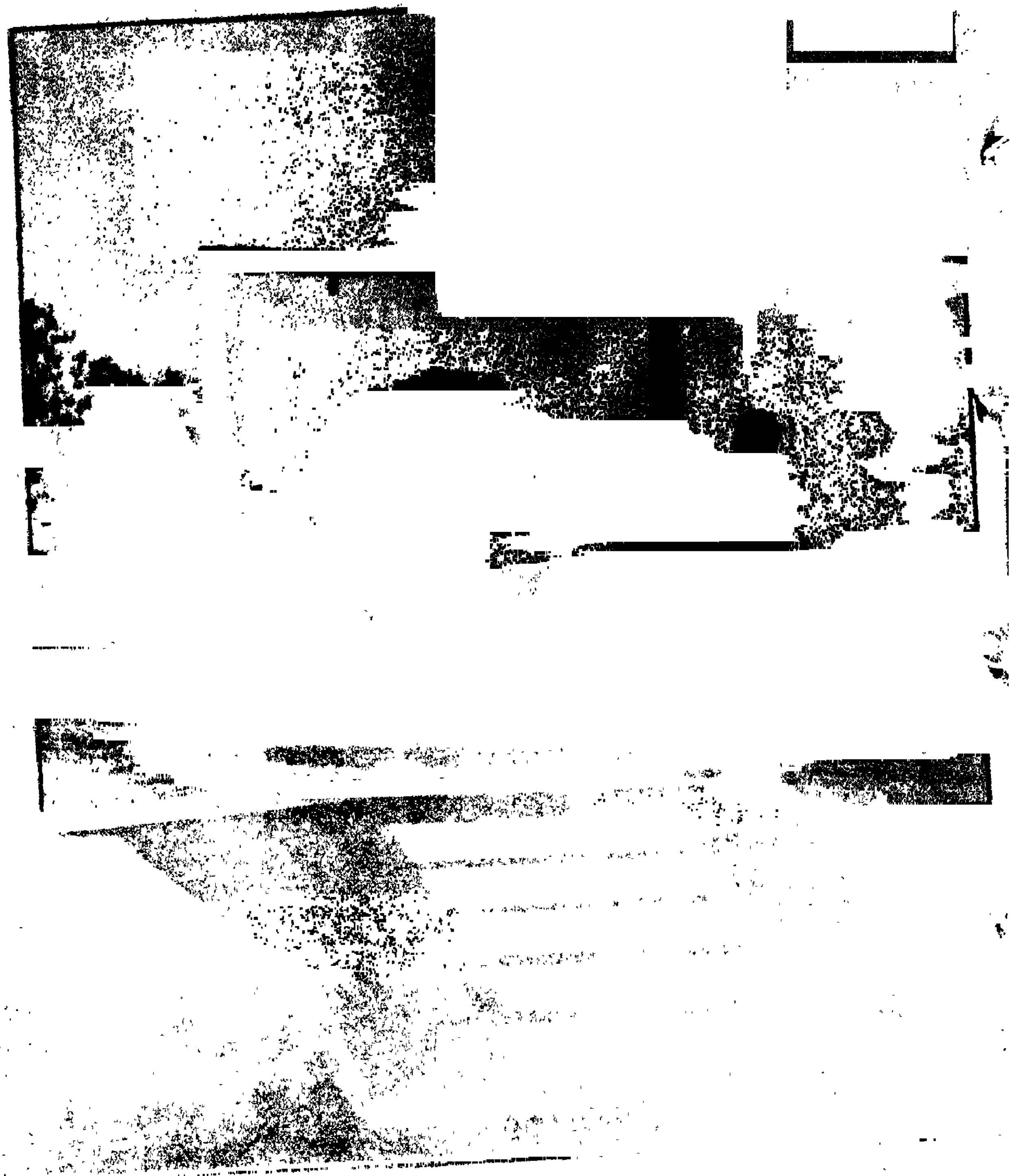
کم خور و کم خواب و محنت پیشہ۔ بڑی صابری سے اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔

اقبال اس سلسلے میں اطاعت سے مراد آئین کی پابندی لے رہے ہیں۔ یہ آئین کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے اس سے مراد زندگی کی ہموار ترقی کیلئے انسان کو حاصل شدہ جملہ قاعدے، اصول اور دستور ہوں گے جو انسانی تہذیب نے اسے سکھائے۔ جہاں تک اقبال کے خطابِ خاص کا تعلق ہے۔ اس سے مراد وہ آئین ہے جو ہادی برحق نے دنیا کو دیا۔ اور جو خدا کا آخری اور مکمل ترین آئین ہے

بیاز اسے آزاد دستور قدیم
زینت پا کن ہمیں زنجیر سیم
شکوہ سنج سختی آئین مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیرون مشو

یعنی اسے وہ کہ اپنے آپ کو اس آئین قدیم سے آزاد سمجھتا ہے یا اس سے نکل بھاگنا چاہتا ہے پھر اسی زنجیر کا اسیر ہو جا۔ اس کی سختیوں کی شکایت نہ کر اور حضرت مصطفیٰ کی حدود سے باہر نہ نکل۔

قرآن مجید کا عادلانہ قانون تمام دنیا کے لیے ہے جو لوگ اس پر عقیدہ نہیں رکھتے عملاً ان کا عمل (اگر وہ عادلانہ ہے تو) اسی کے مطابق ہے۔ ـــــ تمام دنیا اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے اور ایک حد تک اٹھا بھی رہی ہے۔ [illegible] کہ اقبال کی ذہنی اصطلاحوں میں [illegible] آئین [illegible]

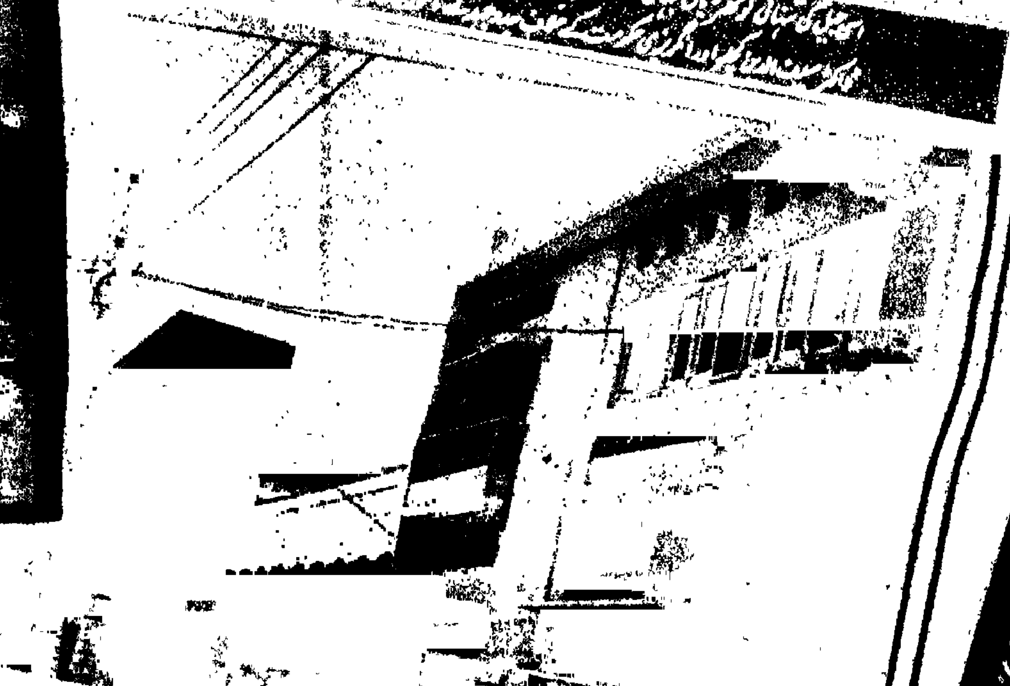


لاہور سنٹرل جیل ــــ کبھی اس کے تختہ دار پر ہم پہنچے تھے

آج سے ۴۰ برس پہلے کی تصویر، شورش کاشمیری اپنے فدائی ساتھیوں کی روحوں کو جو اس پر لٹک گئے
ــــ سلام کہہ رہے ہیں



[illegible]



ٹھیک اسی جگہ یہ بنگلے ایستادہ ہیں لیکن یہاں کسی حریت پسند کو مکان بنانے کے لئے جگہ نہیں ملی ہے۔


یہ سنٹرل جیل کا صدر دروازہ تھا اور اب اس کی جگہ
یہ خوبصورت سڑک آخر تک جگمگا رہی ہے



۲۷۵ میل
کا سفر

| یا پھر یوں کہئے | ۴۴۴ کلو میٹر

ناپ تول کے انٹرنیشنل سسٹم کے نفاذ کے بعد مناسب ہے کہ آپ اپنا حساب درست کرلیں۔ اب لاہور سے پشاور کا فاصلہ تقریباً ۴۴۴ کلو میٹر ہے۔
(۱ میل = تقریباً ۱٫۶۰۹ کلو میٹر)
کیا آپ نے آئل ٹنکی میں ۱۱ گیلن پٹرول لیا ہے؟ خوب!
تو آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی گاڑی ۱ گیلن میں کتنا فاصلہ طے کرتی ہے۔
لیکن نہیں۔ گیلن کا رواج تو اب ختم ہو رہا ہے۔
آپ نے صحیح معنی میں ۵۰ لیٹر ڈالا ہے (۱ گیلن = تقریباً ۴٫۵۴۶ لیٹر)

لمبائی

وزن

حجم

پاکستان، ناپ تول کا انٹرنیشنل سسٹم بڑی تیزی سے اپنا رہا ہے
انٹرنیشنل سسٹم تجارت و صنعت میں یکم جنوری ۱۹۷۶ء سے رائج ہو جائیگا

شعبۂ صنعت، حکومت پاکستان

لیبیا کے مردِ آہن ـــ کرنل معمر القذافی

جنہیں دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہے

کرنل قذافی پاگل ہے، قذافی میں
یطان کی روح حلول کر گئی ہے۔ معمر قذافی ایک
تھا اور پاکباز مسلمان ہے۔ قذافی کمیونسٹوں کا
امی ہے، قذافی رجعت پسند ہے، قذافی انقلابی
ہے، قذافی مصر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، قذافی
ر سے اتحاد چاہتا ہے، قذافی اسرائیل کا سب
ے بڑا دشمن ہے، قذافی نے جنگ رمضان
عربوں کا ساتھ نہیں دیا۔ قذافی امریکا کا
سے بڑا دشمن ہے۔ قذافی سی آئی اے
ینٹ ہے۔ قذافی پوری دنیا میں اسلامی
ت کا قیام چاہتا ہے۔ قذافی اسلامی اتحاد
ے ٹکڑے کرنے کی کوشش کر رہا ہے
وغیرہ۔

لیبیا کے مردِ آہن کرنل معمر القذافی کے بارے
متضاد باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ اتنی
کے کسی دوسرے قومی رہنما کے بارے
میں نہیں آئیں۔ انڈونیشیا اور بنگلہ دیش
الجزائر تک دنیا کے کروڑوں مسلمانوں
قذافی کو زبردست مقبولیت حاصل ہے
م اسلامی ملکوں کے رہنما، سیاستدان اور
قذافی کے دشمن ہیں وہ انہیں نفرت
ت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دنیا بھر کے
اخبار، ریڈیو [illegible] قذافی کے خلاف
[illegible]
[illegible]
ہیں جس سے دنیا کے زیادہ تر لوگ
تھے۔ قذافی کے بارے میں کچھ
باتیں متضاد باتوں کی روشنی میں کچھ
ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان میں کس حد
تک سچائی ہے، اور کہاں تک جھوٹ؟

مصر پر قبضہ کرنے کی سازش

مصر کے ایک ہفت روزہ "روض الیوسف"
نے دعویٰ کیا ہے کہ معمر القذافی مصر پر حملہ کر کے
اس پر قبضہ کرنے کا پلان بنا رہے ہیں۔ وہ اسرائیل
کی بار لیو لائن کے انداز پر مصر لیبیا سرحد پر ایک
مضبوط دفاعی لائن تیار کر رہے ہیں جسے پار کرنا
مصری فوجوں کے لیے ممکن نہ ہو سکے۔ اس دفاعی
لائن کو تیار کرنے میں لیبیا کو بلغاریہ سے مدد مل
رہی ہے۔ اس کے علاوہ قذافی مصری علاقے
میں رہنے والے بدو قبائلیوں کو بھی سادات
کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں
ان قبائلیوں کو مصری حکومت کے خلاف بغاوت
کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس کے
علاوہ اس اخبار نے اس بات کا بھی انکشاف
کیا ہے کہ مصر کی واحد سیاسی جماعت عرب
سوشلسٹ یونین کے تین اہم ممبروں کو مصر لیبیا
سرحد کے قریب بغاوت کے الزام میں گرفتار
کر لیا گیا ہے۔ یہ لوگ قذافی کے ایک پلان پر عملدرآمد
کرنے کی سازش میں مصروف تھے اس اخبار
نے الزام لگایا ہے کہ قذافی ایک طرف مصری
علاقے میں بغاوت کرا کے اور دوسری طرف
اپنی فوجیں بھیج کر آہستہ آہستہ مصر پر قبضہ
کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے پہلے معمر قذافی پر یہ الزام لگ چکا
ہے کہ انہوں نے صدر سادات کو قتل کرنے کے
لیے کچھ کرائے کے لوگ مصر بھیجے تھے لیکن
ان قاتلوں کو بروقت گرفتار کر لیا گیا اور اس
طرح صدر سادات کی جان بچ گئی۔

قذافی ایٹم بم خریدنا چاہتے تھے

مصر کے مشہور اخبار نویس محمد حسنین ہیکل
نے اپنی تازہ کتاب "جنگِ رمضان کی راہ پر"
میں کرنل قذافی کے بارے میں کچھ انکشافات
کیے ہیں۔ صدر ناصر اور قذافی کے درمیان ہونے
والی بات چیت کو انہوں نے مکالموں کی شکل
میں کچھ اس طرح لکھا ہے :۔

کرنل قذافی: "نہیں، ہمیں اسرائیل کے خلاف
مکمل جنگ شروع کر کے اسے پوری طرح تباہ و
برباد کر دینا چاہیے۔"

سادات نے جواب دیا۔ یہ ناممکن ہے
بین الاقوامی صورت حال انہیں اس کی اجازت
نہیں دے گی۔ نہ تو روسی اور نہ ہی امریکی ایسی
صورت حال پیدا ہونے کی اجازت دیں گے۔
جس میں ایٹمی جنگ کا خطرہ ہو۔"

کرنل قذافی نے پوچھا کیا اسرائیل کے پاس
ایٹم بم ہے؟"

سادات نے جواب دیا "بہت ممکن ہے
کہ اس کے پاس ایٹم بم ہو۔"

قذافی: "کیا ہمارے پاس ایٹم بم ہے؟"

سادات: "نہیں ہمارے پاس نہیں ہے۔"

اس ملاقات کے چند دن بعد قذافی
کے نائب میجر جلود سادات کے پاس آئے اور
کہا کہ "ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں۔" میجر

جلود نے یہ بھی کہا "ابھی معلوم ہے کہ امریکہ یا روس ایٹم بم بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے لیکن شاید چین تیار ہو جائے"۔

صدر سادات نے جواب دیا "جہاں تک مجھے علم ہے ایٹم بم بکنے کے لیے نہیں ہوتے"۔

آورہ میجر جلود نے کہا "نہیں۔ ہم فالتو ایٹم بم نہیں چاہیئے۔ ہم تو صرف معمولی قسم کا ایٹم بم چاہتے ہیں"۔

میجر جلود نے اپنے لیبین پاسپورٹ کو مصری پاسپورٹ میں تبدیل کرایا اور پاکستان اور ہندوستان سے ہوتے ہوئے خفیہ طور پر چین پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے چینی وزیر اعظم چو این لائی سے ملاقات کی۔ چو این لائی اور میجر جلود کے درمیان ہونے والی گفت گو بھی ہیکل نے مکالمہ کے انداز میں اس طرح لکھا ہے جیسے وہ اس وقت وہاں خود موجود تھے۔

میجر جلود نے چو این لائی سے کہا "چین پورے ایشیا کا وقار ہے۔ آپ نے پسماندہ ممالک کی مدد کی ہے اور ثابت کر دیا ہے۔ کہ آپ بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنا کہ مغرب اس لیے ہم لیبیا سے آپ کے پاس مدد کے لیے آئے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ان چیزوں پر بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں۔

چو این لائی نے چینی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت نرمی اور اخلاق سے جواب دیا "ایٹم بم بیچنے کے لیے نہیں ہیں۔ البتہ چین بخوشی اس معاملے میں ریسرچ کے کام میں مدد دینے کے لیے تیار ہے۔ جیسا کہ چین نے چند برس قبل مصر کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ چین لیبیا کے سائنسدانوں کی پوری پوری مدد کرے گا لیکن ایٹمی ہتھیار انہیں خود ہی تیار کرنے ہوں گے"۔ اس طرح جلود چین سے

خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

ہم سب پاگل ہیں

ہیکل نے اپنی تازہ کتاب میں قذافی کو جاہل اور بیوقوف ثابت کرنے کے لیے بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ جب اردن کے شاہ حسین اردن میں فلسطینیوں کا قتل عام کرنے میں مصروف تھے تو قذافی نے عرب سربراہوں کو مشورہ دیا کہ وہ مل کر اردن پر حملہ کریں اور شاہ حسین کو گرفتار کر لیں — "ہمیں شاہ حسین جیسے پاگل کو جو خود اپنے عوام کا قتل کر رہا ہے۔ گرفتار کر کے ہتھکڑیاں ڈال کر کسی پاگل خانے میں بھجوا دینا چاہیئے"۔

اس پر مرحوم شاہ فیصل نے جواب دیا، "میرے خیال میں تمہیں کسی عرب بادشاہ کو پاگل نہیں کہنا چاہیئے"۔

کرنل قذافی "لیکن اس کا رویہ تو پاگلوں جیسا ہے۔ اس کا دماغ درست نہیں ہے"۔

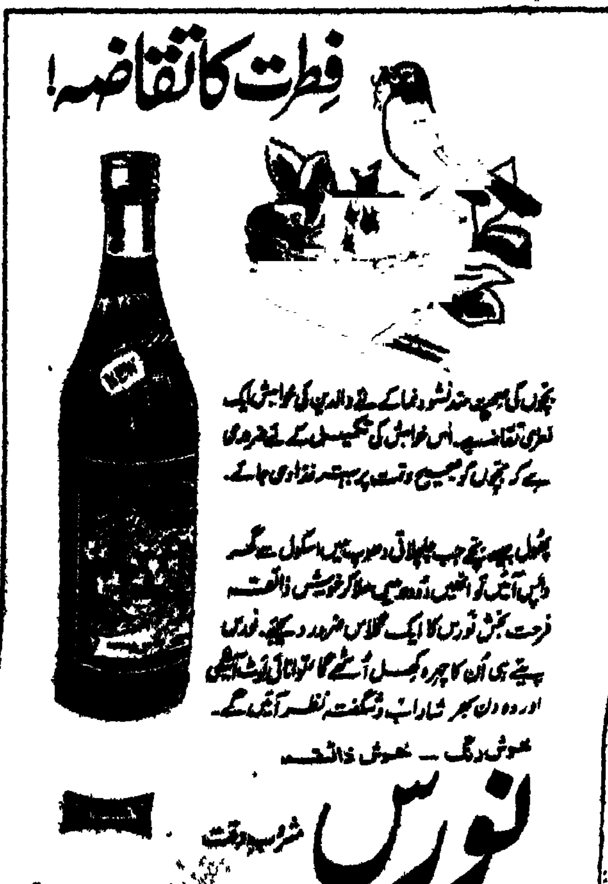
شاہ فیصل "میرے خیال میں ہم سب ہی پاگل ہیں"۔

ایک دوسرے واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہیکل لکھتے ہیں کہ ایک بار ناصر نے قذافی کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے میں سب سے پہلے شریمپ (کیکڑے جیسی ایک مچھلی) پیش کی گئی۔

قذافی نے حیرت اور خوف سے اپنی پلیٹ کی طرف دیکھا اور کہا "یہ کیا ہے؟ کیا آپ لوگ مصر میں ٹڈے کھاتے ہیں" اس پر ناصر بہت ہنسے اور کہا "نہیں یہ ٹڈے نہیں ہیں شریمپ ہے"۔

"شریمپ کیا ہوتا ہے؟" کرنل قذافی نے پوچھا۔ ناصر نے انہیں سمجھایا یہ ایک قسم کی مچھلی

باقی صفحہ ۳۱



خطوط

فحاشی و عریانی

میں آپ کے جریدہ فریدہ کی معرفت وزیراعظم
بھٹو کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے فحاشی و
عریانی کے خلاف صوبائی حکومتوں کو اس امر کی ہدایت
دی ہے کہ وہ اس کا انسداد کریں۔ چنانچہ جناب حنیف رامے
وزیراعلیٰ پنجاب نے اس سلسلے میں بعض قابل تعریف
ایکشن لئے ہیں۔ مثلاً لاہور پولیس نے بعض سینماؤں
سے عریاں بورڈ اتارے اور فحش مناظر سے فحش
حصے نکلوا لئے گئے اور اخبارات کو ہدایت کی گئی
ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے فرائض کا احساس کرتے
ہوئے عریانی و فحاشی سے اجتناب کریں اور اس
کے تدارک میں حصہ لیں۔ میں اس سلسلے میں آپ
کے موقر رسالہ کی معرفت وزیراعظم اور وزیراعلیٰ
کی خدمت میں چند ضروری تجویزیں پیش کرنے کی
اجازت چاہتا ہوں۔

۱۔ جو انگریزی فلمیں درآمد کی جاتی ہیں انہیں سنسر
کرتے وقت سختی برتی جائے کیونکہ ہماری نئی
نسلوں کے اخلاق کی تباہی میں سب سے زیادہ
حصہ ان انگریزی فلموں کا ہے۔

۲۔ جو فلمیں پاکستان میں بن رہی ہیں ان کا بھی
سختی سے سنسر کیا جائے۔ فلم سازوں
کو اس وقت ہدایت کر دی جائے کہ وہ
حدود کا احترام کریں اور اس طرز کی
فلمیں تیار نہ کریں جن سے معاشرے میں اخلاقی
پریشانی ... ہو۔
خرابیوں کو شہ ملتی ہے۔

۳۔ ہم نہیں جانتے کہ سنسر بورڈ کے ارکان کون
ہیں؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب موجودہ حکومت
کا آغاز ہوا تو طائفہ نوازی کے تحت بعض
ایسے لوگ بھی سنسر بورڈ کے ممبر بنا دیئے گئے
جو خود اخلاقی قدروں کے بہت بڑے مجرم تھے
اگر یہ لوگ اب بھی سنسر بورڈ میں شامل ہیں تو
انہیں حذف کر دیا جائے۔ ان کی خصوصیات
سے حکومت آگاہ ہے۔

۴۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ بعض جرائد و رسائل
عریانی اور فحاشی کی مسلسل اشاعت کا حوصلہ
رکھتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی مرکزی یا صوبائی وزیر
کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے یا وہ کسی مرحلے پر
کوئی منفی سیاسی کام سرانجام دیتے ہیں ورنہ دوسرا
کوئی رسالہ یا اخبار اس کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

۵۔ اس وقت ملک میں جو اخبار بلیک میلنگ کر
رہے ہیں ان کا سرپرست بھی کوئی نہ کوئی وزیر
ہے۔

۶۔ یہ حقیقت ہے کہ سرکاری حلقوں کے محبوب
چھاپہ خانے دوسرے پریسوں کی پرنٹ لائن دیکھ
کر عریاں لٹریچر چھاپتے ہیں۔

شہیر تابانی
۴۴ میکلوڈ روڈ لاہور



ابوظہبی میں پاکستان سینٹر

آپ کے رسالے میں جنگ کے حوالے سے پارہ
قادیانیوں کی گرفتاری سے متعلق جو خبر چھپی ہے وہ
سو فیصد درست ہے لیکن پاکستان سینٹر کے انتخاب
سے متعلق روداد کا یہ حصہ غلط ہے کہ میجر ڈاکٹر مغل
برسرِ اقتدار قادیانی گروپ کو شکست دے کر صدر منتخب
ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر مغل کا پورا نام نامی حسین علی ہے اور
آجکل لیفٹیننٹ کرنل ہیں۔ آپ پہلے سینٹر کے نائب صدر
تھے اور اس وقت موجودہ نائب صدر جناب شیخ الحفیظ
اڈیٹر تھے۔ ان دونوں اصحاب کا پورا گروپ فضل تعالیٰ
مسلمان ہے۔ چٹان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ
وہ ایک ثقہ رسالہ ہے اور اس میں ہر خبر خوب تحقیق
کے بعد شائع کی جاتی ہے۔ جانے یہ خبر آپ تک کیسے

[illegible] قادیانی مسلمان ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔

مخلص

اسے عزیز لیر
طارق ورکس پاکستان فورس ابوظہبی

چٹان کی گزارش

(اس سلسلے میں ایڈیٹر چٹان کو ابوظہبی سے کئی ایک درد رس خطوط موصول ہوئے دو تار آئے اور ایک صاحب نے فون پر گفتگو کی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان دفتر چٹان میں تشریف لائے اور بتایا کہ وہ ابوظہبی سے آئے ہیں۔ انہوں نے یہ تمام داستان سنائی اور اس سلسلے میں روایت کی کہ ڈاکٹر مغل قادیانی عناصر کو شکست دے کر پاکستان سینٹر کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اب اس تردید کے بعد اس واقعہ کی تصحیح کرنا ہمارا اسلامی اور صحافتی فرض ہے جن دوستوں کو پریشانی ہوئی ہم اصولاً ان کے جذبات کا احترام ہے۔ چٹان کی پالیسی بالکل واضح ہے کہ وہ بیرون پاکستان کے تمام مسلمانوں کی بلا تفریق عقیدہ و خیال خدمت بجا لانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ:

بیرون ممالک بہرحال میں اپنے ملک کی عزت و وقار کو برقرار رکھا جائے اور ایسی چیز کبھی نہ پیدا ہونے دی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ پاکستانی مسلمانوں میں کسی عنوان سے کوئی ذہنی آویزش ہے۔ باقی ہر پاکستانی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قادیانی اُمت کی نگرانی کرے کیونکہ اس کے افراد عرب ریاستوں میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ (ادارہ)

مشرقی پاکستان کی جلاوطن حکومت

آغا صاحب محترم! میں کچھ عرصے سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے چٹان میں ہماری جلاوطن حکومت کا خط شائع کیا جس سے ہمیں کافی تقویت پہنچی۔ ہفت روزہ چٹان لاہور کی لندن سے اس خط کی اشاعت کے بعد پاکستانیوں کے خطوط ہمارے پاس آئے ہیں ایک صاحب نے کراچی چٹان کا تراشہ بھیجا ہماری حمایت کے لئے خط لکھا۔ جناب کرم الٰہی بھٹی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ نے بھی بیرسٹر عباس اور مجھے خطوط لکھے ہیں جن میں چٹان کے کالم سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ تمام بنگالی برطانوی پاکستانی جو مشرقی پاکستان کے باشندے ہیں اور متحدہ پاکستان کے لیے کوشاں ہیں اور لندن میں مقیم ہیں آپ کے بیحد ممنون و مشکور ہیں۔ میں اُن کی طرف سے آپ کو سلام کہتا ہوں۔

پچھلے دنوں مجیب الرحمٰن جیل سے ڈھاکہ واپس جاتے وقت لندن ایئرپورٹ پر دو گھنٹے رُکا تھا تو مشرقی پاکستان کے نوجوانوں نے مسٹر حمید الرحمٰن وزیر خزانہ جلاوطن حکومت کی زیر قیادت سیاہ جھنڈوں مخالفت احتجاجی پوسٹروں اور پاکستانی پھریرے کی اڑانوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ وہ ہمارے احتجاجی جلوس سے گھبرا گیا اور اس کو ایئرپورٹ سے باہر آنے کا حوصلہ نہ ہوا حالانکہ ایک بیرونی ہوٹل میں اس کے لیے دو گھنٹے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صرف پانچ بنگلہ دیشی اس کی خاطر وہاں گئے تھے جن میں دو ہندو تھے۔

بیرسٹر عباس السانؔ کی جلاوطن حکومت کے چند وزراء آئندہ دسمبر میں مغربی پاکستان کا دورہ کریں گے انشاء اللہ! ہماری جلاوطن حکومت عنقریب بہ اقبال عازم ہے۔ ہمارے دلوں میں آپ کے لیے بڑی محبت ہے ہم سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

والسلام
محمد خورشید عالم
جلاوطن حکومت مشرقی پاکستان لندن

خبردار ہوشیار

آغا صاحب ہم آپ کی وساطت سے حکومت کے [illegible]

[illegible]

۱۔ [illegible] تمام مسلمانوں [illegible] کے ایک ادارہ میں پاکستان کا [illegible] میں وہ [illegible] ان میں جنہیں پچھلے سال دستور کی رُو سے مسلمانوں سے خارج کر دیا ہے جب قادیانی ملت اسلامیہ کا جزو نہیں رہے تو انہیں مسلمانوں کے روپ میں اسلامی ریاستوں میں جانے کا حق نہیں۔ یہ ایک اصولی اور دستوری بات ہے۔

۲۔ ابھی چند دن پہلے چند قادیانی نیشنل سیمنٹ فیکٹری قطر میں گئے ہیں یہ سب ربوہ کے باشندے تھے اپنا ایڈریس کراچی لکھوا کر انہوں نے قطر کا رُخ کیا ہے براہ مہربانی حکومت قطر کو ان کے بارے میں تفصیلات مہیا کر دی جائیں۔ (ان کے نام اور کوائف حکومت قطر کو ارسال کر دیئے ہیں۔ چٹان)

۳۔ آرمی فارم کھڈ کی ضلع بدین صوبہ سندھ کا منیجر جس کا نام حمید احمد کیلی بیان کیا جاتا ہے ایک روایت کے مطابق شاہ پور ذخیرہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے متعلق یہ شکایت ہے کہ اپنی ملازمت کا بڑا وقت قادیانی تبلیغ میں صرف کرتا ہے۔ آرمی فارم کی جیپ جس کا نمبر [illegible] ہے اکثر قادیانی تبلیغ کے استعمال ہوتی ہے۔

محمد [illegible]
[illegible]

تجزیہ: قومی لباس

...ساختہ کردار و تمدن۔ شاندار تاریخی ورثہ اور عظیم دینی اقدار سے تقریباً نابلد ہونے کی وجہ سے یورپ کی موجودہ مادی ترقی کی عارضی چکا چوند سے جس کے متعلق شاعر مشرق علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس قدر مبہوت و مرعوب ہے کہ بدکاری اور حرام کاری کی گھناؤنی سڑاند میں سڑتے ہوئے گناہ اور بدی کے دلدل میں دھنسے ہوئے آبرو باختہ یورپ کے پاپی معاشرہ کو "ننگ انسانیت" کے بجائے "ترقی یافتہ" تصور کر کے زبردستی کے احساس کمتری میں مبتلا ہے ——— اور ——— قانون مکافات عمل کی گرفت سے گھبرایا ہوا مغربی ذہن بہ سخت روحانی کرب اور بے چینی کے عالم میں "اصلاح باطن" کی بجائے "ظاہر کو سنوارنے (بگاڑنے اور بگاڑنے)" کی حماقت میں مبتلا ہو کر روز [illegible] نت نئے فیشن ایجاد کرتا اور پھر اس میں سکون نہ پا کر اسے ترک کر کے کوئی اور نیا بہروپ بھر لیتا ہے۔ ہمارے یہ بیچارے احساس کمتری کے شکار نوجوان بھی ان وحشت کے ماروں کو [illegible] کی معصیت و کشمکش میں گرفتار ہو رہے ہیں [illegible] "قبلہ گاہ ثانی" FATHER OF THE SON کے آفاقی نظریہ حیات [illegible] کر کے یورپ کے حیوانی معاشی [illegible] کے [illegible] ذمی" SON OF THE SON یعنی "ابو قلب" ہونے [illegible] مبتلا ہیں ——— قومی قرآنی [illegible]

وہ شاہراہ سے [illegible] و مقصد زندگی سے ناآشنا قدم قدم پر بھٹکتی، ٹھوکریں کھاتی ہوئی [illegible] محسوس کرنے والی ہماری نئی نسل ہماری ماضی اور حال کی مجرمانہ کوتاہیوں کا اور غفلتوں کا زبانِ حال سے ماتم کرتے ہوئے شکوہ کر رہی ہے کہ ؎

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اب بھی وقت ہے کہ ہم ہوش میں آئیں اور ماضی کی غلطیوں کا فوری ازالہ کر کے۔ اگر پوری قوم کے لئے نہیں، تو کم از کم پاکستانی نونہالوں کے لیے ملکی جغرافیائی حالات اور قرآنی نظریۂ پوشاک کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جلد از جلد ایک مناسب "قومی لباس" تجویز کر کے آئندہ تعلیمی سال سے تمام درسگاہوں میں اس طرح قانوناً نافذ کر دیا جائے کہ کوئی تعلیمی ادارہ کسی صورت میں بھی مستثنیٰ نہ رہ سکے۔ تاکہ مشرقی اور مغربی لباس کے جداگانہ اثرات سے پیدا ہونے والی مزاجی دو رنگی کا فوراً خاتمہ ہو کر یکساں "پاکستانی قومی لباس" پاکستانی نونہالوں میں یکساں قومی مزاج اور ملی جذبات کو جنم دے کر ان میں حقیقی معنوں میں "ملی یکجہتی" اور فکری یک رنگی پیدا کر سکے اور ہماری نئی نسل اپنے درخشاں ماضی اور اعلیٰ قومی روایات و کمالات کی حامل بن کر جلد از جلد زندہ قوموں کی صف اول میں کھڑی ہو کر اپنے شاندار مستقبل کی تعمیر کر سکے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

جمعۃ الوداع، لیلۃ القدر، ۲۷ رمضان المبارک (جو عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب تھی) کو کفرستان ہند کا کلیجہ چیر کر مالک الملک نے جو خطۂ ارض پاکستان بننے کے لیے منتخب فرمایا، اس کے موجودہ صوبوں کے عوام کا متفقہ مقامی لباس کرتا اور شلوار ہے۔ سرحدی بھی یہی پہنتے ہیں۔ بلوچی بھی اسی کو زیب تن کرتے ہیں، سندھیوں کو بھی یہی پسند ہے اور پنجابیوں کو بھی یہی پیارا پیارا ہے۔ یہ سیدھا سادا، آرام دہ، دیدہ زیب لباس یہاں کے جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے لحاظ سے ہر طرح موزوں ہے جو یقیناً مقامی زندگی کے طویل تجربات کے بعد یہاں کے بزرگوں نے اپنایا ہوگا، اور دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ اقتصادی حالات کے پیش نظر سیدھا سادا اور کم خرچ بھی ہے نیز پوشاک کے متعلق آیات قرآنی کے منشا و مقاصد کو بھی پورا کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے کہ:۔

اے بنی آدم! ہم نے تم پر پوشاک
اتاری تاکہ تمہارا ستر ڈھانکے اور
تمہارے بدن کو زینت دے اور
تقویٰ کا لباس! کیا ہی بہتر لباس ہے
یہ بات اللہ کی نشانیوں میں سے ہے
تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل
کریں۔ (اپ۔ ۲۶)

——— لہٰذا ——— ہماری تجویز و گزارش یہ ہے کہ اسی پاکستانی عوامی لباس کو "پاکستان کے قومی لباس" کی قانونی حیثیت دے کر آئندہ تعلیمی سال کی ابتدا ہی سے کرتا، شلوار "ہر پاکستانی درسگاہ کے طلباء کا لازمی یونیفارم" قرار دے دیا جائے۔ تعلیمی اداروں اور درسگاہوں میں اس کا فوری نفاذ اس لیے بھی نہایت ضروری ہے کہ ؎

قسمت نوع بشر تبدیل ہوتی ہے یہاں
اک مقدس فرض کی تکمیل ہوتی ہے یہاں

اگر اب بھی ان نونہالان ملت کو صحیح مشرقی ماحول و تربیت میں پروان چڑھنے کا موقع فراہم کر دیا جائے تو ———

خوشی ہے کہ اسپیکر اقبال احمد خان جنہوں نے ... ایوان میں کئی بار کہا ہے کہ سیکرٹری صاحب نے مقررہ مدت میں کوئی تجویز پیش نہیں کی اور ہمیں یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو دل رکھتا ہے فوری طور پر ہماری اس مخلصانہ تجویز کی ہر ممکن تائید و حمایت کرے گا اور قوی امید ہے کہ ———— ہماری موجودہ عوامی حکومت کے ارباب حل و عقد ہماری اس اپیل پر فوری خصوصی اور فوری توجہ فرمائیں گے اور جس طرح موجودہ عوامی دور میں ہمارے وفاقی اور صوبائی وزراء نے عام پبلک جلسوں میں عوام کے ساتھ فرش نشینی کی اعلیٰ مثال قائم کرکے عوامی مساوات کا نمونہ پیش کیا ہے اور شیروانی پاکستانی لباس میں اہم جلسوں سے خطاب اور جلوس کی قیادت کرکے گویا ایک طرح سے عملاً ہماری اس تجویز کی تائید و توثیق کی ہے۔ جلد از جلد اس پاکستانی قومی لباس کا قانوناً اعلان کرکے ملک و ملت پر احسان کریں گے۔



بقیہ : ...

کی سرزمین میں ترقی و خوشحالی کی بنیادیں نہیں پڑیں اور نہ عوام الناس کو اجتماعی طور پر ترقی کی آمد و رفت سے کوئی دلچسپی رہی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس خیال کی تکرار کو حقیقت مطلقہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کی ذات ہی پیپلز پارٹی کی روح رواں ہے اگر پیپلز پارٹی ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک کا سیلاب نہ ہوتی اس تمام جدوجہد کے تسلسل کا حق ہوتا تو ملک کے حالات کبھی سازگار نہ ہوتے اور ہم بیابانوں کے سفر میں تشنہ لب نہ رہتے۔

چونکہ ملک کے تمام فرائض کی ذمہ داری مسٹر بھٹو پر عائد ہوتی ہے اس لیے ہم ان سے یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اپنی پارٹی کو صاف ستھرا کریں، اس کی عنان سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں دیں۔ بے شک انہیں لوگوں کو آگے رکھیں جو ابتلاء و آزمائش میں ان کے ساتھ تھے لیکن پارٹی سے ان عناصر کو ضرور نکال دیں جن کی صورتیں اور سیرتیں پردہ اپنی مختلف تقریبوں میں عوام الناس

کے سامنے ... ہیں ... دو دس ... سے کسی ... نہیں ... سکیں ... کے سیاسی حالات سے ... کے لئے وفاقی پولیس قائم کی ہے اور ملک کے سیاسی حالات سے باخبر رہنے کے لیے ان کے پاس اطلاعات کے ذرائع کا لامتناہی سلسلہ موجود ہے تو کیا وہ یہ نہیں کرسکتے کہ اپنے سب سے زیادہ معتمد اور وفادار افسروں کی معرفت پیپلز پارٹی کے ان اراکین کے متعلق وہاں اور شب و روز کا پتہ چلائیں جن کا وجود سیاسی قدروں سے محروم اور اخلاقی قدروں سے بیگانہ ہے۔ ہم سے بہتر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اس تاریخی صداقت سے واقف ہیں کہ جن لوگوں کے پرسنل کریکٹر میں جھول ہو ان کا پولیٹیکل کریکٹر کبھی روشن نہیں ہوتا اور وہ ابتلاء و آزمائش کے مرحلوں میں دغا دے جاتے ہیں۔ اقتدار آنی جانی چیز ہے اس نے تاریخ میں کسی سے وفا نہیں کی اور نہ کسی کے لئے اس کی فطرت بدل جاسکتی ہے۔ ایوب خان نے اپنے اقتدار کے لئے سبھی کچھ کیا اور دس برس تک اس طمطراق سے حکومت کی کہ ان کے خلاف کسی فضا کا پیدا ہونا ناممکن تھا لیکن جو نہی سامنے آئے تحریک بنی پھر کئی چیزیں ... جو گئیں اور ایوب خان اس طرح دستبردار ہو گئے جیسے ... ایوب خان کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کے ذہین لوگوں کو ... لیکن ان کے ساتھ چونکہ عوام نہیں تھے اس لئے ...

[illegible]

تعلق، ثابت قدمی، ہمت و عزم اور ایمان و
یقین کے لحاظ سے یہ لوگ نہایت اونچے
مرتبے کے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے
کہ وہ اس چیدہ گروہ کے ذریعہ ابھی دین کو
سربلندی عطا فرمائے گا۔ اس گروہ پر شدید آزمائشیں
وارد ہوئی ہیں۔ مگر تمام ہتھکڑیوں، ظلم و طغیان،
اور فجور و عصیاں کے مقابلے میں اس گروہ
نے دین سے وفاداری میں کوتاہی نہیں کی ہیں
ابھی ابھی مصر سے آ رہا ہوں۔ میں نے شہر
میں اخوانیوں کو بھی دیکھا ہے جو ۱۹۵۲ء سے
جیلوں میں رہ رہے تھے۔ میں تو ۱۹۵۲ء میں
ازہر سے فراغت حاصل کر کے کویت آگیا تھا
مگر وہ لوگ جیلوں میں چلے گئے تھے۔ یہ لوگ
دنیوی عہدوں میں گھر گئے مگر ان لوگوں نے
آزمائش و ابتلا پر صبر و ثبات کی اعلیٰ ترین
سند اللہ سے حاصل کر لی۔ اب میں نے انہیں
۱۹۷۵ء میں جا کر دیکھا ہے اور حقیقت یہ
ہے کہ یہ لوگ مجھے مرد نظر آئے میرا اب
نہ صرف مصر کے اندر بلکہ ارض عرب کے اندر
یہ لوگ دین حق کی ترقی کے لیے ایک امید کی
کرن ہیں۔" (تحریر ۲۸ مئی ۱۹۷۵ء)
اخوان المسلمون کی اس دوبارہ زندگی سے



بقیہ: انوار السادات

حملہ کا منصوبہ اس نے اپنے طور پر تیار
کیا تھا۔ اور ایک اور بیرونی طاقت کے
اشارہ پر اس نے نافذ کیا تھا۔ تحقیقات
کے دوران صالح عبداللہ سریہ نے اس
طاقت کا نام بھی ظاہر کر دیا ہے جو اس
منصوبے کے پیچھے بتائی جاتی ہے۔
تحقیقات کے دوران اخوان المسلمین کی اہم
شخصیتوں کے بیان بھی لئے گئے ہیں۔
ان میں اخوان کی مرکزی انتظامیہ کے سابق
رکن شیخ محمد الغزالی، اخوان کے ایک اور
سابق رکن سید سابق۔ اور جمعیت مسلمات
کی سربراہ محترمہ زینب الغزالی شامل
ہیں۔ ان سب حضرات نے اس امر کی
تردید کی ہے کہ صالح عبداللہ سریہ کا
اخوان سے کوئی تحریکی یا تنظیمی تعلق تھا
چنانچہ مصر کے اخوان المسلمون کیسا تھ
اس حادثہ کے وقوع سے لے کر عدالتی
احکام کے اجرا تک کوئی تعرض نہیں
کیا گیا اور خود مصر کے ذمہ دار حکام
نے بروقت اس امر کی وضاحت کر دی
تھی کہ اخوان کا اس سازش سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ لبنان کے عیسائیوں
اور کمیونسٹوں اور خود مصر کے سوشلسٹ
عناصر اور اسرائیل کے ذرائع ابلاغ نے
بہت کوشش کی تھی کہ اس حادثے میں
اخوان کو ملوث کیا جائے مگر ان کی یہ
خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اخوان اور
سادات کے تعلقات برابر استوار رہے
اور اب تک استوار ہیں۔ آج ہی (۱۳ مئی
۱۹۷۵ء) کویت سے آمدہ ایک خط کے
ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ:-
"اخوان مصر میں لیاقت ہیں۔ دین سے

اشتراکی اور عہد ماضی کے بہت سے عناصر اندر سرگرم ہیں اور ان کی طرف سے بار بار یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح ان لوگوں پر دوبارہ عرصۂ حیات تنگ کیا جائے۔ اس لیے جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اسے فوراً اخوان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اخوان اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اور وہ دشمنوں کو ایسا موقع فراہم نہیں کرنے دیتے جو ملک و وطن کے لیے نقصان دہ ہو۔

۴۔ صالح عبداللہ سریہ نے تحقیقات کے دوران جو بیانات دیے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ عرب ممالک کی کئی تنظیموں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ مصری اخبارات کے موجب اس نے فدائین کی جماعتوں کے اندر بھی کام کیا ہے۔ عراق کی حزب البعث کے ساتھ اس کا رشتہ رہا ہے۔ عرب ممالک کی ایک خفیہ تنظیم حزب التحریر کا بھی وہ رکن رہا ہے۔ حزب التحریر کے بارے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ ایک ایسی خفیہ تحریک ہے جو اسلام کے نام پر اسلامی نظریات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہے اور جب کبھی کسی جگہ اسلامی تحریک کے احیا اور غلبہ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں یہ اپنے خفیہ سرگرموں کے ذریعہ حالات کو خراب کرنے کے لیے سرگرم ہو جاتی ہے۔ اس کے حامی با معموم نوجوانوں کو کھوکھلی نظریاتی بحثوں میں الجھاتے رہتے ہیں۔ اس کے بانی کا نام تقی الدین النبہانی بتایا جاتا ہے جو مدت سے روپوش ہے یہ تقریباً تمام عرب ممالک میں خلاف قانون ہے۔ بعض محققین کے مطابق اس تنظیم کے پیچھے یہودیوں کا ہاتھ ہے۔ دو سال قبل جب ترکی میں اسلام پسند نوجوانوں

کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا تھا اس وقت بھی اس تنظیم کو بعض افراد نے اسلام کے نام پر دہشت پسندانہ کاروائیاں شروع کر دی تھیں اور ان کے نتیجے میں بہت سے اسلام پسند نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ تنظیم ہمیشہ زمین دوز کام کرتی ہے اور اسلام کا جو تصور پیش کرتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ، اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے انفرادی یا اجتماعی طور پر زندگی میں کسی عملی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔

صالح عبداللہ سریہ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ مدت تک حزب التحریر کے اندر کام کرتا رہا ہے۔ اخوان المسلمون کے حلقوں کے ساتھ بھی اس نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ روابط شخصی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ چنانچہ اخوان کے تمام زعماء نے اخوان کے ساتھ اس کے تعلق کی تردید کی ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۷۵ء کے اخبار الیوم کے مطابق اکیڈیمی کے حادثہ سے پہلے صالح عبداللہ سریہ لیبیا میں تھا اور کرنل معمر القذافی کا قرب اسے حاصل تھا اور اس کے بیان کے بموجب وہ قذافی صاحب کے مشورے ہی سے مصر آیا تھا۔ چنانچہ عدالتی فرد جرم میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ صالح عبداللہ کی سازش میں لیبیا کے بعض عناصر کا ہاتھ ہے۔

۵۔ مصر میں ان دنوں عہد گذشتہ کے حالات کے خلاف شدید ردِّ عمل پایا جاتا ہے مصری عوام اشتراکیت اور قومیت کے بجائے اب اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں "العودۃ الی اللہ" (اللہ کی طرف رجوع) کے عنوان سے

ایک تحریک شروع ہو چکی ہے دوسری طرف حکومت کی طرف سے سوشلسٹ پارٹی کے سوا کوئی سیاسی تنظیم قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے مختلف افراد سے اشتراکی اور الحادی سرگرمیوں کے بل پر ان حالات سے استفادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ المصور کے مطابق صالح عبداللہ بھی بعض کالجوں کے جوشیلے نوجوانوں کو

اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور وہ نوجوان اس شخص کے ماضی اور مشکوک حالات کو سمجھے بغیر اس کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے ایسی حرکت کر ڈالی جسے کوئی ذی شعور انسان پسند نہیں کرتا۔ اس حرکت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ایک طرف انور السادات کی حکومت کی مشکلات میں اضافہ کیا جائے اور کمیونسٹ عناصر کی طرف سے اس کی توجہ اسلام پسند عناصر کی طرف منعطف کرائی جائے اور دوسری طرف اخوان المسلمون کی شہرت اور کردار کو خراب کیا جائے جسے انہوں نے قربانیوں کے بے پناہ سرمایہ سے حاصل کیا ہے۔

جہاں تک اخوان المسلمون کا تعلق ہے وہ اس وقت مصر کے اندر اپنی قربانیوں اور بے داغ کردار کی وجہ سے مقبول ترین گروہ سمجھا جاتا ہے۔ عوام ان پر فریفتہ ہیں اور ان کے شاندار ماضی کے مداح ہیں۔ بالخصوص نوجوان طبقہ پر ان کے کردار کا گہرا اثر ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخوانی ڈاکٹر نے عام چیلنج کیا تھا۔ کہ کوئی شخص یہ ثابت کرے کہ اخوان کا ایک معمولی فرد بھی جیل سے معافی مانگ کر رہا ہوا ہو۔ اس چیلنج نے وہاں کے پڑھے لکھے طبقے کے اندر ہلچل برپا کر دی تھی۔ انور السادات نے زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد ایسے تمام اخوانیوں کو رہا کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ جو نظر بندی کے ایام گزار رہے تھے اخوان محبوسین کے آخری گروہ کے ۵۰ افراد تھے جو ابھی تک رہا نہیں ہوئے۔ اس گروہ نے گزشتہ ماہ مصر کی اعلیٰ عدالت کے اندر رٹ دائر کر دی اور اس کے نتیجے میں عدالت میں اس موضوع پر بحث ہونے سے پہلے ہی حکومت کی طرف سے انہیں رہا کر دیا گیا۔ اور اب مصر حکومت کی جانب سے مصر کی دو بدنام جیلیں جن میں برسہا برس تک مصری باشندوں کو عذاب دیا جاتا رہا ہے۔ منہدم کر دی گئی ہیں۔ ایک قاہرہ کی فوجی جیل اور دوسری لیمان طرہ کی جیل۔۔ یہ لیمان طرہ کی جیل وہی ہے جس میں ناصر کے عہد میں ایک ہی دن میں چالیس اخوانیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔

اخوان المسلمون کے لوگ انور السادات کی موجودہ داخلی سیاست کی تائید کر چکے ہیں

اور انور السادات نے انہیں اپنی تنظیم قائم کرنے کی اجازت نہیں دی ہے مگر یہ اخوان علی طور پر مصری حکومت کے اندر اسلام کی آواز کا مظہر بن چکے ہیں۔ مصر کے سابق اٹارنی جنرل محمد عبدالسلام نے اپنی تازہ تصنیف میں واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ

سید قطب کو جب گرفتار کیا گیا۔ اور ان پر حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگایا تو ان کا مقدمہ جب اٹارنی جنرل کے پاس آیا اور اسے کہا گیا کہ قطب کو موت کی سزا دلوائی جائے تو اس نے حکومت کو مطلع کر دیا کہ سید قطب کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں اور ان کے لیے جو دلائل دیے گئے ہیں ان کے بل پر تو عدالت کے ذریعہ انہیں معمولی سزا بھی نہیں دی جا سکتی کجا یہ کہ انہیں موت کی سزا دی جائے

چنانچہ حکومت نے اٹارنی جنرل سے مقدمہ واپس لے کر اسپیشل ملٹری کورٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ جس کا صدر کرنل دجوی تھا۔ اس کورٹ نے تحقیقات اور شہادتوں کا تکلف کئے بغیر انہیں ۵ منٹ کے اندر موت کی سزا سنا دی۔ یہ تمام تفصیلات انور السادات کے ذاتی روزنامہ "اخبار الیوم" نے بیان کی ہیں۔ صدر انور السادات اخوان کے پچھلے تمام کارناموں سے بخوبی آگاہ ہیں، اور اب خود مصری حکومت



کے نمایاں افراد حتیٰ کہ "اخبار الیوم" کے ایڈیٹر مصطفیٰ امین "المعتوز" کے مصنف صالح جودت اور عام قانون دان حلقے اخوان کو بے گناہ قرار دیتے ہیں۔ اور ان پر جو کچھ بیتی ہے اسے ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔

بقیہ: بھگت سنگھ کی ماں

عدالت سے خطاب کرتا اور اپنی دھن کا پکا تھا۔ بھگت سنگھ نے ایک دن اسپیشل ٹریبونل کے

بعدالت جناب خان عبدالکریم خان کنڈی ڈسٹرکٹ جج بنوں۔

اپیل دیوانی ۱۴۷/۱۳ سال ۱۹۷۵ء

باقی جان وغیرہ

بنام سنٹرل گورنمنٹ وغیرہ

اشتہار بنام (۱) سنٹرل گورنمنٹ آف پاکستان بذریعہ ڈپٹی کمشنر بنوں۔

بہ اختیارات ڈی آر سی (ڈپٹی آبادکاری کمشنر بنوں) (۴) یعقوب خان (۵) ایاز خان پسران مقرب خان (۶) گل خان ولد سودان۔ سرفراز خان ولد بلند خان اقوام پشتون سکنائے دولت خیل زئی تحصیل مروت ضلع بنوں۔

مدعا علیہم ریسپانڈنٹان ملاحظہ تا ۶

بمقدمہ صدر چونکہ ریسپانڈنٹان بالا کی تعمیل معمولی طریقہ سے ہونی مشکل ہے۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا مشتہر کیا جاتا ہے کہ ریسپانڈنٹان بالا اصالتاً، وکالتاً یا مختیارتاً برائے پیروی اپیل مورخہ ۲۰ جون ۱۹۷۵ء کو بوقت ۸ بجے قبل از دوپہر حاضر عدالت ہذا ہوں ورنہ یکطرفہ کارروائی ہوگی۔

آج بدستخط ہمارے اور مہر عدالت کے مورخہ ۲۹/۵ کو جاری کیا گیا۔

ڈسٹرکٹ جج

مہر عدالت

ایک دن اسپیشل ٹریبونل مجسٹریٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "جناب والا ہم جانتے ہیں کہ ہمیں پھانسی دی جائے گی۔ ہمیں اس کا ذرہ برابر ملال نہیں کیونکہ ہم اپنے نصب العین کا پرچار کرنے کے لئے مدتوں کا کشٹ اٹھا چکے ہیں یا پھانسی کا تختہ۔ آپ مادر ہندوستان کے فرزند ہیں۔ ہماری التجا ہے کہ آپ اس ٹریبونل میں بیٹھ کر ہماری موت کے پروانے پر دستخط نہ کریں۔ اس سے مادر ہندوستان کو دکھ ہوگا۔ بھگت سنگھ نے یہ الفاظ اس لہجے میں کہے کہ آغا حیدر نے پانچ منٹ ماتھے پر شکنیں ڈال کر سوچا پھر ایک سفید کاغذ اٹھا کر اس پر ٹریبونل سے دستبرداری کی تحریر لکھی۔ دستخط کئے اور منیر جج جو ایک انگریز تھا کے حوالے کی پھر اٹھی سلیے اور گھر چلے گئے۔ بھگت سنگھ کے غالباً چار بھائی اور ایک بہن تھی ان میں سب سے بڑے کلبیر سنگھ تھے دوسرے کلتار سنگھ۔ دونوں راقم کے ساتھ قبل از آزادی جیل خانے میں رہے۔ کلبیر سنگھ ہو بہو اپنے بھائی کی تصویر تھے۔ "پس دیوار زنداں" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلبیر میں کسی عنوان سے تعصب کا شائبہ تک نہ تھا وہ صرف انسان تھے اور طلوع آزادی کی آلودگیوں کے زمانے میں بھی انسان ہی رہے۔ جب پاکستان اور ہندوستان قائم ہو گئے تو وہ ابتدائی دو برس میں راقم سے ملنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اب ۲۵ برس سے کچھ معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اُن کی ماتا کے انتقال کی خبر سے ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب ہم جیل میں تھے تو ان کی ماتا ہمارے لئے گنے کا رس اور موسم کے پھل مہیا کرتی تھیں ان کی محبت کا سمندر بیکراں تھا۔ وہ سچائی، اخلاص قربانی، بے تعصبی اور پیار کا مجسمہ تھیں۔ ان کے بیٹوں نے ایک ایسا چراغ روشن کیا جس سے قومی تحریک کی اندھیری راتوں کی ظلمت دور ہو جاتی۔ کلبیر سنگھ اور اس کے بھائی کہاں ہیں لیکن راقم ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بقیہ کرنل قذافی

ـتی ہے۔ لیکن کرنل قذافی نے اسے کھانے
ے انکار کر دیا۔
"میں مچھلی نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ اسے
سلامی طریقہ سے حلال نہیں کیا جاتا۔"

کیا جھوٹ اور کیا سچ

ان میں زیادہ تر الزامات بے بنیاد معلوم
ـتے ہیں۔ قذافی کا لیبیا مصر سرحد پر دفاعی
ـرچے تیار کرنا اس بات کی علامت نہیں ہیں
ـ وہ مصر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لیبیا کے
ـاع کے لیے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ بارلیولائن
ـم کے مورچے دفاع کے لیے تیار ہوتے ہیں
ـ کر حملہ کے لیے۔ مصر سے زیادہ لیبیا کو حملے کا
ـطرہ ہے جب کہ مصر کی آبادی کئی کروڑ ہے
ـیبیا کی آبادی صرف ۳۰ لاکھ ہے۔ مصر کی فوجی
ـاقت لیبیا کے مقابلے میں کم از کم دس گنا ہے
ـس وقت ساٹھ ہزار سے زائد بے روزگار
ـری انجینئروں اور ڈاکٹری کو لیبیا نے اپنے
ـاں روزگار دے رکھا ہے۔ اس حالت میں
ـیا مصر پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔
ـں تک اس سرحد پر بسنے والے قبائلیوں
ـوال ہے وہ ہمیشہ ہی قاہرہ کے خلاف
ـت کرتے آئے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات
ـہے۔
ـمصر قذافی کے خلاف سادات کے قتل
ـش کے الزام کو کبھی ثابت نہیں کر سکا۔
ـ مصر کو چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اس الزام
ـت کر دے تو قذافی ہر طرح کی سزا
ـتیار ہے۔
ـبات بھی سچائی پر مبنی نظر
ـہے کہ ہیکل ہر جگہ موجود
ـھے کیا جائے کہ نامونے

قذافی یا جلود میں ہونے والی تمام ملاقاتوں میں
ہیکل موجود تھے تب بھی یہ بات کسی طرح سمجھ
نہیں آتی کہ چو این لائی اور جلود کے درمیان ہونے
والی ملاقات کا باقاعدہ مکالموں کی شکل میں
ہیکل کو کس طرح علم ہوا۔ جب کہ خود ہیکل کا
کہنا ہے کہ جلود کا چین کا سفر بالکل خفیہ تھا۔
انہوں نے جلود اور چو این لائی بات چیت کو کچھ
اس طرح لکھا ہے جیسا کہ وہ خود وہاں موجود تھا
دوسرے قذافی اگر عرب ملکوں کے لیے ایٹم بم
چاہتے بھی ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں
ہے کہ وہ اسرائیل پر ایٹم بم مارنے کا ارادہ
رکھتے تھے یا رکھتے ہیں۔ اس طرح سے وہ عربوں
کی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتے ہیں تاکہ کسی بھی
جنگ کے وقت عربوں کے دل میں یہ خوف
نہ رہے کہ ان پر اسرائیل ایٹم بم گرا دیگا۔
اس طرح کی باتیں مغربی دنیا میں قذافی کو بدنام
کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔

قذافی کی مخالفت کیوں؟

سیاسی دنیا میں قذافی کی مخالفت کی بنیادی
وجہ ان کی اصول پسندی ہے۔ قذافی کبھی اپنے
اصولوں کو سیاست کی بھینٹ چڑھانے کے
لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہی قذافی کی سب سے
بڑی خوبی ہے۔ جس نے انہیں پوری دنیا کے
عوام میں مقبول بنا دیا ہے اور یہی ان کی سب
سے بڑی خامی ہے جس کی وجہ سے وہ سیاسی
دنیا میں حقارت اور خوف کی نظر سے دیکھے
جاتے ہیں۔
قذافی پر ناصرازم، اسلام اور سوشلزم کا
گہرا اثر ہے۔ ان کے اصول ان تین نظریات کا
ردّ عمل ہیں انہوں نے اسلام کو اپنے نظریات
اپنی زندگی اور اپنے ملک کی سیاست اور سماج
کی بنیاد بنایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں
مغربی سائنس، سماج اور نظریات کی فائدہ مند

چیزیں اپنانے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس
نہیں ہوئی۔ انہوں نے مغربی سائنس، صنعت
اور تعلیم کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ہے
جب کہ مغربی معاشرت اور طرز زندگی کو اپنے
ملک سے بالکل بے دخل کر دیا ہے۔ دوسری
طرف زیادہ تر عرب ممالک نے مغربی زندگی تو
اپنا لیا ہے لیکن مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی سے
کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا۔
قذافی عرب دنیا میں کٹر ترین سامراج دشمن
ہیں انہیں یقین ہے کہ جب تک مغربی سامراج
کے اثر سے مکمل آزادی نہیں حاصل ہو جاتی۔
وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ اسرائیل کو عرب دنیا میں
سامراج کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے
کہ جب تک اسرائیل کا مکمل خاتمہ نہیں ہوگا اس
وقت تک عرب مکمل آزادی حاصل نہیں کر سکتے
اسی لیے وہ امریکی سامراج سے کسی بھی قسم کی
دوستی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے
کہ ہو سکتا ہے امریکا سے دوستی میں کوئی ترقی
پیدا ہو جائے۔ لیکن آخر میں اس سے نقصان
ہی اٹھانا پڑے گا۔ سامراجی اور صیہونی مفاد
امریکہ کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے
سکتے کہ وہ عربوں کے مفاد میں کوئی کام کرے
یہی وجہ ہے کہ قذافی مصر کی امریکہ نوازی کی
زبردست مخالفت کرتے ہیں۔ مصر اور اردن جیسے
عرب ممالک نے اسرائیل کے وجود کو اب تقریباً
تسلیم کر لیا ہے۔ وہ صرف اپنے علاقے واپس لینے
کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ بنیادی طور پر اس
سوال کو لے کر قذافی اور سادات کے درمیان زبردست
اختلاف پیدا ہو گیا جبکہ سادات عربوں کے دور رس
مفاد کو غیروں کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ قذافی
عرب دنیا کے مفاد کی خاطر اپنا وقتی مفاد قربان
کرنے کو تیار رہیں۔ قذافی چاہتے ہیں کہ عرب اپنی
پوری طاقت سے اسرائیل کے خلاف مکمل جنگ
لڑیں۔

دوسری طرف قذافی روس کو بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عرب دونوں بڑی طاقتوں کے اثر سے آزاد رہیں۔ البتہ وہ روس کو عرب ممالک کے لیے اتنا بڑا خطرہ تصور نہیں کرتے جتنا کہ امریکا کو۔ ویسے قذافی چین سے دوستی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ چین کو ایشیائی ملکوں کا عظیم قائد اور سامراجیت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں ویسے آجکل لیبیا کے تعلقات روس سے بہتر ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں وزیراعظم جلود ماسکو گئے تھے اور اب خبر ہے کہ اگلے ماہ روسی وزیراعظم کوسیگن لیبیا کے دورے پر آئیں گے۔

قذافی مکمل معاشی اور سماجی مساوات میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ چین اور ویت نام کی طرح لیبیا میں مکمل سماجی برابری دیکھنے میں آتی ہے۔ حکومت ہر شخص کو روزگار، تعلیم، رہائش اور زندگی کی دوسری ضروریات مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ملک کے صدر اور ایک معمولی مزدور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قذافی آج بھی بالکل معمولی سپاہیوں کی طرح ایک فوجی بیرک میں رہتے ہیں ان کے دوسرے انقلابی ساتھی بھی بالکل نوجوان ہیں۔ ان کے دست راست عبدالسلام جلود کی چند برس قبل شادی ہوئی۔ شادی کے بعد جلود ایک چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ قذافی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ البتہ انہوں نے جلود سے کچھ نہیں کہا اور ان کو پندرہ دن کی چھٹی دیکر اپنی بیوی کے ساتھ گھومنے باہر بھیج دیا۔ جلود کی غیر موجودگی [illegible] دن انہوں نے ان کا سامان واپس فوجی بیرک میں پہنچا دیا۔

قذافی دوسرے عرب ممالک کے سربراہوں اور حکمرانوں کی تکلف پسندانہ زندگی کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور صاف طور پر ان کے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور

[illegible] لیبیا [illegible] قذافی نے بہت ناپسند کیا [illegible] مصر کو [illegible] سے ملنے والی امداد پر گزارہ کرنا [illegible] کسی طرح سے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ اس کے حکمران عیش و آرام کی زندگی بسر کریں قذافی کی اس نکتہ چینی کی وجہ سے بیگم سادات بہت ناراض ہو گئی تھیں اور مصر لیبیا تعلقات سرد ہونے میں ان کا بھی کافی ہاتھ ہے۔

قذافی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی انقلابی ہیں اور دنیا بھر کے انقلابیوں، ظلم اور جبر کے خلاف جنگ کرنے والے مجاہدوں [illegible] حمایت کرتے ہیں آئرلینڈ کے انقلابیوں سے لے کر ویت نام اور فلپائن تک انقلابیوں کے لیے قذافی کا خزانہ اور ہتھیاروں کا بھنڈار ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ انگلینڈ کی حکومت نے پچھلے ماہ ایک پارلیمانی وفد قذافی کے پاس بھیجا۔ اس وفد نے انہیں یقین دلایا کہ اگر وہ آئرلینڈ کے انقلابیوں کی مدد کرنا بند کر دیں تو انگلینڈ انہیں بڑے پیمانے پر ہتھیار بیچنے کو تیار ہے ___ حالانکہ اس وقت قذافی کو ہتھیاروں کی شدید ضرورت ہے کیونکہ ان پر روس اور امریکا دونوں ہی کے دروازے بند ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے اصولوں کی خاطر یہ رشوت لینے سے انکار کر دیا کہ وہ آئرلینڈ کے انقلابیوں کی مدد نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا: دنیا کے ہر مظلوم کی مدد کرنا میرا بنیادی فرض ہے۔ میں اپنے اس فرض سے منہ نہیں موڑ سکتا۔

سائپرس کے سوال پر ترکی کی حمایت کرنے والا واحد عرب ملک لیبیا تھا۔ لیبیا نے ترکی کو کافی معاشی امداد بھی دی ہے جس کی وجہ سے قذافی آج ترکی میں مقبول ترین عرب لیڈر ہیں

بقیہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

کہ اطاعت نوع کی تربیت بلکہ تربیت یافتہ فرد کا پہلا فرض ہے۔ [illegible] کی پابندی انسان ہی نہیں کائنات کی ہر شے کر رہی ہے۔ ذرہ [illegible] ہے کہ وہ اطاعت ایک خود کار جبری عمل ہے (یعنی جہاں تک ہم نیچر کے اصول کو جان سکے ہیں)۔ انسان ایک اکتسابی حیوان ہے جو دوسرے حیوانات کے مقابلے میں زیرکی کے زیادہ سرمائے سے بہرہ ور ہے اس کا اکتسابی عمل شعوری طور پر تربیت چاہتا ہے ...... تاہم انسان کو اس مرحلہ اول تک نیچر کی اشیاء کی طرح اپنے اوپر جبری تربیت نافذ کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ ماحول کی فضا اور آب و ہوا سے مانوس ہو کر اسے ترقی دینے کے قابل ہو سکے۔ ماحول کا رہا ہوا قانون (داخلی و خارجی) اس کی فضا اور اس کی آب و ہوا ہے اس سے توافق پیدا کیے بغیر وہ ترقی کا ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جس طرح نیچر کی اشیاء خیر سے پیکار کے باوجود پہلے اپنے ماحول سے توافق پیدا کرتی ہیں۔ بہرحال اطاعت زندگی کی تربیت و ترقی کا پہلا اصول ہے۔

ضبط نفس

[illegible] جبلتیں (جو خود حفاظتی جبلت کی کارندہ ہیں) یعنی خوف اور طمع (ہر چیز کے خلاف خطرے کا احساس اور خوشگوار چیز کے حاصل کرنے کی خواہش (حب [illegible]) نفس انسانی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں انسان ان سے بہت کام لیتا ہے مگر بعض اوقات ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کی ہموار ترقی اور عادلانہ عمل میں اس کے باعث بہت خلل واقع ہوتا ہے۔ بے جا خوف اور بے جا طمع سے انسان کی ذاتی زندگی اور جماعتی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ بے جا خوف سے

بندگی اور نسل میں تنگ دلی اور کمینگی پیدا ہوتی ہے
خوف بے جا طمع سے نزاکت، مکاری، بد اخلاقی،
خود غرضی، غضب، اعیاری، ذخیرہ اندوزی،
اور خلاف قوانین جیسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں
گویا خوف اور طمع پر زندگی کے نظم اور حسن و
اعتدال کو بگاڑنے کی شدید ذمے داری عائد
ہوتی ہے۔ نیچر طور اس نظم وحسن کی خاموشت
پر کرتی رہتی ہے۔ مگر انسان حرکت کی صلاحیت
بھی رکھتا ہے اور عاقل بھی ہے اس لیے
اس کو خدا نے یہ سہولتیں اور اختیارات دے
کر اس پر بڑی ذمہ داری عائد کی ہے لیکن
انسان تجاوز کر جاتا ہے اور ان سہولتوں سے
بعض اوقات ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔۔۔
ظلوماً جہولاً کی تہدید اسی لیے تو اسے سننی پڑی۔
اس وجہ سے دین اور تصوف دونوں نے
خوف اور طمع کو ایک قاعدے کے اندر رکھنے
کی بڑی تاکید کی ہے۔۔۔۔۔ اقبال نے بھی
اس پر زور دیا ہے۔۔۔۔۔ اطاعت کے
عمل سے نفس اپنے معلم، اپنے ہادی اور اپنے
آئین کی ہر بات ماننے کا خوگر ہو جاتا ہے۔
اسے تسلیم کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ پھر
وہ ان اندیشوں اور خوشیوں کو بھی نظر انداز کرنے
کا عادی ہو جاتا ہے۔ جن کے ہیچ ہونے کا
یقین آئین میں موجود ہوتا ہے (غیر اللہ کا خوف
اس کے دل سے نکل جاتا ہے) اور ان چیزوں
کی محبت (اور طمع) جو اس کے لیے باعث
کشش نہیں رہتی جو آئین زندگی اور آئین
الٰہی کے تقاضائے حسن وعدل کے خلاف
ہیں۔ اطاعت میں اس کا نفس اور اس کا خود
اتنا ڈسپلن حاصل کر لیتا ہے کہ وہ جبلتوں پر
قادر ہی نہیں ہو جاتا بلکہ ان کے میلان سے
ہٹا لینے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔ خوف ایک
جبلی میلان ہے لیکن اطاعت کے ذریعے
سے جو یقین حاصل ہو گیا ہے اس کی بدولت
نفس مومنہ بچائی ہے۔

وہ طبیعت کی جبلت پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ اللہ
کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔۔۔۔۔۔ اور
اللہ کا ڈر بھی نوامیس عدل وغیرہ کی خاطر ہے۔
بے مقصد ڈر نہیں ہوتا۔
وہ اشیاء مرغوب (شہوات) کی حب کی
جبلت پر بھی قابو پا لیتا ہے۔ اس کے عام
قاعدے کے برعکس (یعنی کچھ لے کر خوش ہو
کی بجائے) کچھ دے کر خوش ہوتا ہے۔۔۔
اور یہ عجیب فضیلت ہے انسان کی کہ وہ
اپنی جبلت کے برعکس زکوٰۃ دے کر، خیرات
وصدقات سے اور ایثار اور قربانی کر کے
خوش ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پھر کیوں نہ وہ نیچر
سے فائق ہو جانے کا دعویٰ کرے کہ اس
نے اپنی جبلت کا رُخ موڑ دیا۔
یہی وہ فقر ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فخر کیا تھا اور یہی وہ فقر ہے،
جو اسے اطاعت وضبطِ نفس کا دیا ہوا ہے
۔۔۔۔۔۔ اور جو فرد یا افراد کا مجموعہ ایسا
ہو اس کی طاقت اور قدرت کا انکار کیسے ہو
سکتا ہے۔۔۔۔۔ نظم حیات اور عدل زندگی
کی خاطر جو لوگ ان کمالات کے مالک ہو جاتے
ہیں۔ ان کے نائب الٰہی ہونے میں کیا شک
ہے اور یہیں سے نیابت الٰہی کا مقام شروع
ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ ان افراد کو حاصل
ہوتا ہے جو اطاعت اور ضبط نفس کی ریاضت
کر کے ناظم کائنات کی نیابت کے حقدار بن
جاتے ہیں اور خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب
کر کے دنیا میں نظم وعدل وغیرہ کے وہ سلسلے
قائم کرتے ہیں۔ جو خدا چاہتا ہے اور دنیا کو ترقی
کے راستے پر اس طرح چلاتے ہیں جس طرح
خود خدا کا منشا ہے (یعنی زندگی عدل کے
مطابق چلے بھی اور حسین تر ہوتی جائے اور
خدا کی صفات زیادہ سے زیادہ خدائی میں
جلوہ گر ہوتی جائیں)

از رموز جزو و کل آگہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود
یعنی وہ ہر جزو کل کے بھیدوں سے واقف
ہوتا ہے اور دنیا میں وہ مستقلاً قائم و منتظم
ہوتا ہے گویا "امر ربی" اس کا رفیق ہے
وہ معجزے دکھا سکتا ہے اس کی ایک بات
سے انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔
وہ قادر مطلق تو نہیں مگر قدرت کے بے کراں
وسیلے اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔
نیابت الٰہی کے بارے میں طرح طرح
کے سوال اٹھائے گئے ہیں۔ ایک بڑا سوال یہ
ہے کہ نیابت کے لیے کوئی ایک فرد مخصوص
ہوتا ہے یا ایک زمانے میں ایک سے زیادہ
بھی اس کمال سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔
جواب یہ ہے کہ نیابت کا کامل ترین نمونہ تو
ایک فرد ہی ہو سکتا ہے۔ باقی درجہ بدرجہ کم و
بیش اس کمال میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔
اقبال کی اصطلاح میں نبی نائب حق ہوتا
ہے اور آنحضرتؐ کی ذات اس نیابت کا نمونہ
اکمل ہے۔ اقوام الٰہی فیض یافتہ افراد سے تربیت
کا سبق سیکھتی ہیں اور انہی کے ذریعہ آیا ہوا
آئین اطاعت کے لیے دستور العمل بنتا ہے۔۔
مرد مومن! وہ اس دستور العمل میں عقیدہ بھی
رکھتا ہے اور اپنی لیاقت کے مطابق اس پر عمل
بھی کرتا ہے۔ مرد کامل، وہ ان افراد میں سے
زیادہ سے زیادہ، نائب حق کی سیرت سے متاثر
ہوں۔ اور اس کی پیروی کامل سے اس کے
نقش اپنے اندر جذب کر سکیں۔ نائب حق۔ وہ
کامل ترین مظہر انسانی اور عکس صفات ربانی جو دنیا
کے نظام کی ہمواری اور اس کی ترقی کی ذمے داری
قبول کرتے ہیں۔ زمانے کی سلطانی ان کے پاس
ہوتی ہے مگر وہ خود اس میں فقیرانہ بسر کرتے
ہیں۔ آنحضرتؐ کی ذات مبارک اور خلفائے راشدینؓ
کی زندگیاں ایسی ہی تھیں۔

۱۲ / جون ۱۹۷۵ء

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ

ٹینڈر نوٹس

محکمہ ہذا کے منظور شدہ ٹھیکیداران سے ذیل میں دیئے گئے کام کے لیے دفتر ہذا [illegible] سربمہر شرح فی صد یا آئٹم ریٹ ٹینڈر [illegible] کے سامنے لکھی گئی تاریخ کو گیارہ بجے دن تک مطلوب ہیں۔ ٹینڈر اسی دن اور اسی وقت حاضر آمدہ ٹینڈر دہندگان یا ان کے با اختیار نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ فرموں اور کمپنیوں کی صورت میں پارٹنرز کے درمیان رجسٹرڈ پارٹنرشپ ڈیڈ کی نقل فراہم کرنا ہوگی۔ بصورت دیگر ٹینڈر پر غور نہیں ہوگا۔

ٹینڈر کے ساتھ چالان خزانہ یا ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت زر ضمانت فراہم کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ٹینڈر جاری نہیں کیا جائے گا۔

ٹینڈر ایسے ٹھیکیداران کو جاری کیے جائیں گے جو اپنے ساتھ اندراج/تجدید کی فیس کا ضروری ثبوت فراہم کریں گے اور جنہوں نے سال ۱۹۸۵ء کے لیے فیس اندراج/تجدید جمع کرا دی ہو۔ ٹینڈر فارم ہیڈ کلرک سے پانچ روپے فی فارم (ناقابل واپسی) کے عوض حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

یہ ٹینڈر ہر کام کے سامنے لکھی گئی تاریخ کو جاری کیے جائیں گے اور اس سے پہلے یا بعد کوئی ٹینڈر جاری نہیں ہوگا۔ مشروط/تار کے ذریعے ٹینڈر پر غور نہیں ہوگا۔ زیر دستخطی بغیر وجہ بتائے کسی بھی یا تمام ٹینڈرز کو مسترد کر سکتے ہیں۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زر ضمانت	تاریخ اجراء ٹینڈر	تاریخ وصولی ٹینڈر	مدت
(۱)	پتوکی ضلع لاہور میں سیوریج سکیم کی فراہمی پی ایل آف آر سی سی پائپ سیور [illegible] کلاس وانگ اے ایس ٹی ایم تصریحات سی ۷۶ کلاس [illegible] اور ایس ایس (ہر طرح سے مکمل) تصریحات کے مطابق					
	(الف) ۱۲" اور ۱۵" قطر کے اور منظور شدہ ڈیزائن کے مطابق ڈسپوزل ورک کی تعمیر	۱۲.۵۰ لاکھ روپے	۰.۲۵ لاکھ روپے	۳ ۷/۸۵	۴ ۷/۸۵	۱½ سال
	(ب) ۱۲"، ۱۵"، ۱۸" اور ۲۱" قطر	۱۵.۰۰ لاکھ روپے	۰.۳۰ لاکھ روپے	۳ ۷/۸۵	۴ ۷/۸۵	۱½ سال
(۲)	چیانگا میں واٹر سپلائی سکیم پمپنگ مشینوں کے ایس اینڈ آئی سروٹری (R.C.C.) کے ذریعے ایک کیوسک ٹیوب ویل کی تنصیب	۵.۵۰ ہزار روپے	۱۱۰۰/- روپے	۱۳ ۶/۸۵	۱۴ ۶/۸۵	چار ماہ
(۳)	واٹر سپلائی سکیم رائے ونڈ روٹری ریگ ایس اینڈ آئی آف پمپنگ مشینوں کے ذریعے ایک کیوسک ٹیوب ویل کی تنصیب	۰.۸۸ لاکھ روپے	۱۷۶۰/- روپے	۱۳ ۷/۸۵	۱۴ ۷/۸۵	چار ماہ
(۴)	نیاز بیگ میں واٹر سپلائی سکیم کی فراہمی (ڈسٹری بیوشن سسٹم) (بقایا کام)	ایک لاکھ روپے	۲۰۰۰/- روپے	۱۳ ۷/۸۵	۱۴ ۷/۸۵	تین ماہ
(۵)	[illegible] ضلع لاہور میں واٹر سپلائی سکیم [illegible] ڈسٹری بیوشن سسٹم [illegible]	ایک لاکھ [illegible] روپے		۱۳ [illegible]	۱۴ [illegible]	چھ ماہ
	[illegible]	[illegible]		۱۳ [illegible]	۱۴ [illegible]	چھ ماہ
	[illegible]	[illegible] روپے		۱۳ [illegible]	۱۴ [illegible]	[illegible] ماہ
	[illegible]	[illegible] روپے		۱۳ [illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]		۱۳ [illegible]	۱۴ [illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]			[illegible]	[illegible]

VOL. [illegible]
No. 25

Weekly Chatan Lahore

Phones: 51056?
510?68

16 [illegible] 1975

Regd. No L. 5417



[illegible]

سید قاسم رضوی [illegible]